

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222991

UNIVERSAL
LIBRARY

کلامِ ہمایوں

پیغامِ عمل

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ہے رہنمائے خلاق عمل جس کے نیک ہوں

کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دین دار ہو

بہتر ہے گر عمل سے عقیدہ ہٹا کرے

ایسے سبق ہمیں نہ پڑھایا کرے کوئی

ہمایوں! تیرے مدفن پر بنائیں مقبرہ کیوں ہم؟

یہاں حُسنِ عمل ہے سب سے بہتر یادگاروں میں

حضرت ہمایوں (مرحوم)

۳۱ اگست ۱۹۳۶ء : پنڈت جواہر لال نہرو کا رسالہ "زبان کا مسئلہ" شائع ہوا۔
 ۳۰ : برہما کیٹی کے سلسلے میں مولوی عبدالحق اور واجندر بابو کا مشترکہ بیان
 ۱۶ اکتوبر : آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ لکھنؤ کی قراردادوں میں سے تعلق۔
 ان واقعات کے ساتھ ساتھ اردو ہندی میٹروں کی ٹوٹو میں برابر جاری رہی۔

گاندھی جی کی کارروائیوں کو دیکھ کر بالہ سندھ لال جی نے ایک خط ان کے نام لکھا جس میں ان پر واضح کیا کہ اردو اکثر ہندوؤں کے گھر کی زبان ہے اور وہ ہندی جسے گاندھی جی اور بعض اور ہندو لیڈر رائج کرنا چاہتے ہیں فقط ایک کتابی اور مصداق زبان ہے جو کہیں بولی نہیں جاتی۔
 سینہ محدود کے جواب میں پنڈت جواہر لال نے لکھا کہ زبان کے سوال کو خواہ مخواہ ایک فرقہ وارانہ سوال بنایا گیا ہے اور یہ بھی لکھا کہ خود میری زبان اردو ہے۔
 ڈاکٹر مانجندکی "اردو ہندی" کے مقابل میں مولانا ابوالقاسم نے اپنی ٹھٹھٹ اردو کی لکھت رکھ دی اور پھر اپریل ۱۹۳۷ء میں مہاتما جی سے بھی ایسی ہی دو دو ٹھٹھ باتیں کر کے اردو کے تین صفحوں اور انگریزی کے سو صفحوں میں لکھوا کر پیش کر دیں۔ اسی وعدہ جو سنے اس "ہندی کی چندی" کی آخری لا جواب قسط مولانا نے پھر ڈاکٹر صاحب کے نام نشر کی ہے۔ انہوں نے اپنے ایکٹ، کو لال، رکت، سمبندھ، دشا کی بابت لکھا تھا کہ ہماری طوٹ ہر شرار کا ڈوں میں لوگ انہیں بولتے اور سمجھتے ہیں۔ انہوں نے الہ آبادی ہندوؤں سے پوچھا تو وہ کلاں پر ہاتھ دھرنے لگے کہ ہم نے یہ مشبہ ذکھی دیکھ نہ سنے۔ مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو یہ تکار پوچھا ہے کہ آخر میری اردو صحت مند اور درست زمین کھتے تھے یہ مصیبت آپ دی کہ اس کی جگہ اسے ایک جتنائی سی زبان کہنے لگے۔ اب "مقصد کی جگہ کیوں" زمین نے لے لی؛ اخیر میں مولانا نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ایک کمیٹی ہندو مسلمانوں کی بنائی جائے جس میں فریقین ایک دوسرے کے مشکل نقطوں کی جگہ آسان عام فہم لفظ تجویز کریں اور یوں ایک قومی سمجھوتے پر پہنچ جائیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے زبان کے مسئلے کا جو حل پیش کیا ہے وہ کو بظاہر مستقل مسلم ہوتا ہے مگر مولوی عبدالحق صاحب نے خوب لکھا ہے کہ پنڈت جی بھی ہندی والوں کے ہنگامے سے متاثر ہیں اس کے علاوہ یہ غلط ہے کہ ہندوستان میں صرف وہ ہار نہ بانی ہی بنائیں کبھی چاہیں جو ہر صاحب نے گواہی دی ہے۔ یہ درست ہے کہ اردو شعروں کی اردو ہندی حیثیت کی زبان ہے۔ اور اصطلاحاً اس کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ آخر میں مولوی صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو کی کتابیں لازم ہے کہ اردو کے ادیب ہی تیار کریں ورنہ خواہ مخواہ زبان خراب ہو جائے گی اور تنبیہ کی ہے کہ حیثیت کی قربان گاہ پر کلک کی ترقی کو مصیبت نہ چڑھا دینا چاہئے۔

جناب سکرٹری صاحب! آج ترقی کی اردو مبارک باد کے تحت ہیں کہ انہوں نے گذشتہ سال میں میرا اس اور طیارہ اور بارہا لودنا گھور اور گھنواور کئی اور مقامات کا دورہ کر کے ہر جگہ اردو کی بنیادیں مضبوط کیں۔ مانا کہ ہندی والے روپے پیسے والے ہیں اور اردو والوں کے ہاں چھوٹی کوڑیاں ہی ہیں لیکن دنیا دیکھے گی کہ اردو اور اردو والوں کے دل کھرے ہیں اور اگر قدرت کو ہمارے وطن کی بتری منظور ہے تو یہ کئی ترقی کی نذر وہ میں ضرور پورے اتریں گے۔

انجمن اُردو پنجاب نے بھی اپنی بساط کے مطابق پچھلے پورے دو سال میں کچھ نہ کچھ کام کیا۔ کم از کم ۲۳ جلسے ہوئے اور ۲۶ ہارڈ یوٹیو پر تقریریں بھی ہوئیں۔ علاوہ بریں، اخبارات و رسائل میں مضامین شائع ہوئے اور مذاکرے اور مختلف اُردو سامعی ہوتی رہیں۔ اُن مذکورہ کے لئے ارادہ ہے کہ اُردو کا عوام سے ایک زیادہ گہرا تعلق پیدا کیا جائے اور انشا پر دوازل کو پیش اور پیش موجود تحریکات کی طرف متوجہ کیا جائے۔

پچھلے سال ہمارے ملک میں جمہور سیاسی تبدیلیاں ہوئی ہیں اس کا ہمارے ادب پر نمایاں اثر پڑا ہے۔ کئی ادیب ادب کا چولا اُتار کر سیاست کے میدان میں اُتر آئے ہیں اور کچھ تعجب کی بات نہیں۔ نپولین نے جب جرمنی پر حملہ کیا اور وہاں کی قومی زندگی میں ایک پھیل چڑھ گئی تو کئی جرمن ادیب ادب کو چھوڑ کر سیاست میں حصہ لینے لگے۔ ہم یہ تو نہیں چاہتے کہ ہمارے ادیب اُردو سے دامن چھوڑ کر اپنے گلے سے صرف سیاسی پھندا اٹھا لیں کیونکہ ادب بھی آخر ملکی وادانی زندگی کا ایک منظر ہے لیکن ایسے وقت میں جب ملک کی تمام زندہ قومیں اس کے سیاسی محاذ پر جمع ہو رہی ہیں ادیبوں کا اپنی قوم کے گھرے پر لبیک کہنا مناسب و فزول ہے۔ ہاں یہ ہرگز نہ جونا چاہئے کہ اس بغیر جانبِ ادب کا پاکیزہ دامن کسی سطحی اور منافصت سیاست کے آلودہ ہو جائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُردو کے علمی وادبی رسالے کا گھسی، اور لٹری، اور اتحادی، بن رہے ہیں۔ خدا کرے یہ سب قوم کے مختلف فزول کو یکجا نگاہت کی راہ دکھائیں اور اس سرد مزاجی اور متعوتیت سے کام لیں جو سچے ادیبوں کی شان کے شایاں ہو۔

ہالوں کے صفحات ہمیشہ ہر خیال کے ادیبوں کی مقبول جولاہیں کے لئے کھلے ہیں۔ زبان کے معاملے میں ہالوں عوام رہے لیکن اُردو کی ہمداشت کرنے میں اُس کا اعتقاد ہے کہ "وفا داری بشرط استواری اہل اہل ہے" اگر اُردو رسالے ہی علمی طور پر اُردو کی حمایت نہ کریں گے تو ہمیں زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس کے علاوہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اُردو اور صرف اُردو ہی ہندوستان کی ملکی زبان ہونے کی حمایت کرتی ہے؟ یہ درست ہے کہ مسد مخالفین فضول خاک اڑا رہے ہیں لیکن "کیس خاک ڈالے سے چھٹتا ہے چاند؟" البتہ ہندوستان کی دوسری زبانیں اس چاند کے ساتھ تاسے بن کر چکیں تو ہمارے سرانگھوں پر!

گزشتہ سال ہالوں میں "پنجاب میں ہن کے ترانے" اور لالہ طور کے ہندی ترجمہ "کیلاش کنول کی اشاعت" کے ہمارا رومیہ صاف ظاہر ہے۔ پنجاب کی علمی وادبی زبان اُردو ہے بہت سے پنجابیوں کی بولی پنجابی ہے۔ اور ہندی اُردو کی چھوٹی بہن ہے۔ اُردو کا حلقہ اتنا وسیع ہے کہ اگر یہ زبانیں اپنی اپنی نظری اور مخصوص مہموں میں کام کرتی رہیں تو اُردو اور یہ سب کی سب اُردو کی رہنمائی میں، ملک و قوم کی بڑی خدمت سرانجام دے سکتی ہیں۔

بشیر احمد

جہاں نما

- ۱۹۳۷ء کے اہم واقعات یہ تھے :-
- یکم جنوری :- جناح کی اپیل ہندو مسلم اتحاد کے لئے۔
- ۲۴ :- فرانس اور ترکی کا سمجھوتا اسکندریہ کے تعلق۔
- ۳۱ :- ماسکو میں یہ تو کمزور کرپھانسی کی سزا۔
- ۱ :- کونسلوں کے انتخابات میں ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگریس کی فتح۔
- ۲۴ اپریل :- حبشہ میں اطالویوں کے ہاتھوں چھ ہزار باشندوں کا قتل۔
- یکم اپریل :- نئے دستور کے نفاذ پر ہندوستان میں ہڑتال۔
- ۱۲ مئی :- شاہ افغانستان کی تاج پوشی۔
- ۲۷ :- مصر لیگ کا رکن بنا۔
- ۱۲ جون :- کمال اتاترک نے اپنی ساری جائیداد قوم کی نذر کر دی۔
- ۲۴ :- فلسطین کی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔
- ۷ جولائی :- کانگریس نے ہمدے قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔
- ۳۱ :- انڈمان کے قیدیوں کی بھوک ہڑتال۔
- ۴ اگست :- گاندھی جی کی دوا سرائے سے ملاقات۔
- ۹ :- جاپانی فوجیں سپینگ میں داخل ہوئیں۔
- ۳۰ :- چین اور روس کے درمیان ایک غیر جارحانہ معاملہ ہوا۔
- ۱۹ ستمبر :- امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ دوسری فوجوں کی لڑائی میں حصہ نہ لے گا۔
- ۲۶ :- سری لنکا اور ہنگری کی ملاقات۔
- ۴ اکتوبر :- انگلستان اور فرانس نے اطالیہ سے درخواست کی کہ وہ چین سے اپنے رضا کار واپس بلا لے۔
- ۶ :- لیگ کمیشن نے رپورٹ کی کہ جاپان چین پر زبردستی کر رہا ہے۔
- ۱۵ :- آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کنکٹون میں منعقد ہوا۔

- ۵ نومبر :- اطالیہ اور جرمنی اور جاپان نے آپس میں ایک معاہدہ کیا۔
- ۲۸ ۔ :- فرانسیسی وزیروں نے لندن میں آکر برطانیہ سے بین الاقوامی حالات کے متعلق گفتگو کی۔
- ۲۹ ۔ :- گائے کی مخالفت کے لئے ایک آل انڈیا انسانی کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی۔
- ۱۰ دسمبر :- جاپانیوں نے چینوں کو زبردستی شکستیں دے کر ناکمن کو فتح کر لیا۔

اس نقشے پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ سال کے قابلِ غور اور اہم ترین واقعات یہ ہیں :-

ہندوستان میں کانگریس کی کامیابیوں کی وجہ سے ایک نئی صورتِ حالات پیدا ہو گئی۔ فلسطین کی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق فلسطین کی موجودہ تقسیم سے ساری اسلامی دنیا میں الجھن مچ گئی۔ جاپان نے دنیا بھر سے بے پرواہی کے ساتھ برصغیر و ابلول دنیا ہمسائیہ میں اشتراکیت اور فاشیت کی جنگ شد و مد سے جاری رہی۔ دوں خطے کے دورے کر رہے بن گئے، ایک طرف جرمنی اطالیہ اور جاپان اور دوسری طرف فرانس اور غالباً انگلستان۔ اور حسد رقابت خود غرضی اور شیطنت کی تارکیوں میں ایک نئی آنے والی جنگِ عالمگیر کی جھیلیں دورِ افق پر چمکنے لگیں۔

اب مختلف ملکوں پر نظر ڈالو کہ ان کا کیا حال رہا؟

انگلستان اپنے نئے بادشاہ کو تخت پر بٹھا کر اپنی وسیع سلطنت کے بچاؤ کے لئے جو طرہ و ذکر تار رہا۔ کبھی اطالیہ سے کلکتہ و شنیہ کمی جرمنی سے بات چیت، کبھی فرانس سے صلاح و مشورہ اور اندری اندر خدا جانے کس کس سے کیا باتیں مگر سب کا مدعا صرف ایک ہی کہ کسی طرح بغیر لڑے جلا وطنی سلطنت قائم رہے۔ غالباً انگلستان جرمنی کو چند نوآبادیات دینے پر کم از کم دل میں راضی ہو چکا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک عرصے سے گلبریز دل کی قومی حکومت میں کمزوری اور خستہ ہر اس کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور جنگی تیاریاں محض مجبوراً کی جا رہی ہیں۔ انگلستان کی سلطنت اتنی وسیع اور اس کی ذمہ داریاں اتنی سخت ہو گئی ہیں کہ انگلستان کی حکمتِ عملی مضبوط اصول پر قائم نہیں رہی۔

فرانس انگلستان سے بھی زیادہ بزدلی سے کام لے رہا ہے۔ وقت یہ ہے کہ فرانس میں حسبِ معمول پارٹی بازی جاری ہے اور لوگوں وہاں کی حکومت آج کل اشتراکی ہے لیکن ساڑھے چار کروڑوں سے دو کروڑ باشندے شہنایت کے سخت مخالف ہیں۔ اس اختلاف کی قومی طاقت میں منفی پیدا ہو گیا ہے۔

روس میں شہنایت کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں اور گاہے گاہے عجیب غریب سازشوں کا اگلاشت ہوتا ہے اور حکومت جبروتِ مادی پر بھی اتنا ترستی ہے لیکن دسمبر ۱۹۳۷ء کے نئے جمہوری نظام کے لٹانے نص میں فرو کی آزادی اور دیہاتوں کے متعلق کو خاص طور پر غور رکھا گیا ہے حکومت کو اندیشہ ہے کہ ملک میں اور تین دنوں میں ہر طرح کی بغاوتیں ہوں گی۔ ۲۰ کروڑ گھرانے اشتراکِ طبقاتِ امریکی میں جوں کا توں ۲۸ کروڑ ایکڑ زمین ہے چند ماہ ہونے ایک

پادری نے لکھا ہے کہ یہ خیال کہ روس کی تہذیب مصلحتی ہے غلط ہے مثلاً وہاں یہ خلافت تہذیب سمجھا جاتا ہے کہ کوئی زیادہ مصلحتیہ نہ ہو یا غلط رہے۔ بدکاری کا پیشہ نام کو مانتی نہیں رہا مردھور کے تعلقات شریفانہ ہیں، خاندانی زندگی مضبوط ہے، بچوں سے لگاؤ ہے، انوجوان صفائی پسند ہیں۔ روس کے اخلاق، ان کی بنیادیں کہ انقلاب جمہوریت کے بغیر نہیں چل سکتا اور روسوں کا خیال ہے کہ انقلاب کے بعد بھی انسانی فطرت کی قدرتی نیکی دوسرے بھلائی پر قائم رکھے گی۔ روس میں شادی جرہی کے ذریعے یا فریقین کی رضامندی سے ہو سکتی ہے۔ ناجائز بچے ناجائز نہیں سمجھے جاتے لیکن اس کے باوجود ان کی کثرت نہیں ہے۔ البتہ نئی آزاد طرز زندگی کی وجہ سے روسی سوسائٹی میں بھی کئی خرابیاں موجود ہیں جن کا خود کوئی فسر یا ننگو نے اپنے ایک مقالے میں اعتراف کیا ہے اور روسیوں کو تنبیہ کی ہے کہ انہیں دور کریں۔ روسی حکومت کم از کم اپنے نظام کی اصل کو تائید کرتا ہے اور کہیں چھپائی کیونکہ اس کی سڑے میں ان کا چھپا نا روس میں اشتراکیت کو بکلیہ مضبوط کرنے کے کردار کے گارنٹوں میں پسند نہیں ہو سکتا لیکن موجودہ حالات کے پیش نظر، جنگی تیاریوں میں ان رات مشرف ہے۔ اس وقت فوج کی تعداد اس کے علاوہ اس کے علاوہ ایک کروڑ سپاہی بوقت ضرورت طلب کئے جاسکتے ہیں۔ روس کی ہوائی طاقت نہایت بڑھ رہی ہے۔ ہوائی بازی بہت بڑھ کر مزید ہے۔ سسٹم کے پہلے چھ ماہ میں ۱۰،۵۰۰ غیر فوجی ہوائی جہازوں سے بیٹھے کوئے۔ فوجی ہوائی جہازوں کی تعداد اسی وقت تک لگ بھگ ہے۔ امریکہ میں بڑے بڑے سربازوں کی مخالفت کے باوجود پریذیڈنٹ ڈولٹ کا انتخاب عام کے جمہوری خیالات کی کامیابی کا مظاہرہ ہے۔ روسیوں کے "بوسلے سرے" دی کا محافظ اور صحیح فہم کی جو رویت کا علم دہا ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں روس کی حکمت عملی اچھن میں پڑی ہے۔ اور وہ کسی جنگ میں حصہ لینا نہیں چاہتی اور عہد چالان کی برصغیر میں ہوتی طاقت اسے اور سطح اور مضبوط ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔

جرمنی میں شہری آزادی کا جنازہ کبھی سے شہر کے کندھوں پر نکل چکا ہے۔ قیدی باڈیل میں مسمی تصور کی بنا پر موت کی سزا مل سکتی ہے۔ مشہور جرمنی صنعت ایل ڈوگ نے نال میں لکھا ہے کہ سارے اعلیٰ ترین مفکروں کو دس لاکھ دیا جا چکا ہے اور جرمن آزادی کی ولایت کا باقاعدہ قلع قمع کیا گیا ہے۔ جرمن بچوں میں کس طرح فوجی خیالات ٹھونسنے جاتے ہیں اس کی ایک مثال جرمن سکولوں کی ایک حساب کی کتاب میں دیکھیں جس میں ایک یہ سوال درج ہے کہ جنگ عالمگیر میں جرمنی اور اس کے حلیفوں ۱۰،۰۰،۰۰۰ سپاہی تیار کئے اور جرمنی کے دشمنوں نے ۴،۰۰،۰۰،۰۰۰ تیار کر کے محاذ پر جنوں کے ہروس سپاہیوں کو کتنے اتحادیوں کا سامنا کرنا پڑا؟ یورپ میں جرمنی مرکزی اور مشرقی یورپ میں اقتدار برعنا اور چین سے خام پیداوار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یورپ کے باہر وہ اپنی کھوئی ہوئی نوآبادیات کو بحال کرنا چاہتا ہے۔ آسٹریا اس کے زیر اثر ہے۔ چیکو سلوکیا اس سے ڈرتا ہے۔ انگلینڈ گاہے گاہے اس کے ساتھ ساز باز کرتا ہے اور طلباء اور بچوں کے ساتھ اتحاد ہونے کی وجہ سے اس کی قوت اور عجب میں واقعی خاصا اضافہ ہو گیا ہے اور وہ روس پر علانیہ دانت پس رہا ہے۔ لیکن ہمنوں کا خیال ہے کہ یہ مصلحتیہ نہیں ہیں اور جرمنی کی نامدنی حالت ابھی نہیں!

اطالیہ ہمیشہ کو ظلم و تعدی سے دبا رہا ہے۔ سپین میں وہ فاشیت کا جھنڈا اڑا رہا ہے اور بحیرہ روم میں اپنی بحری دہائی طاقت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ وہ اور جرمنی دونوں کا ایک ساحل ہے۔ دونوں کے الٹے الٹے آزادی پسند ہے لیکن باہر دنیا میں وہ مطلب آپنا دیکھا جا رہا ہے۔ ان دونوں کی خوشحالی کو فیکو کر چلاتے ہیں کہ ہم حزب بین سے پیٹھیں گے اور پیٹھیں دیں گے کہ اس مدلی کی کو

مار میں جس پر کپ اپن اورٹ لٹکی کے ساتھ قابض ہیں میں بھی حصہ دیا جائے۔

جاپان اب اس قدر طاقتور ہے کہ اُسے کسی کی پروا نہیں۔ وہ اطالیہ اور جرمنی کا ہم خیال ہے اور صلیب، یورپ دُور بننے نہایت ہیں غرق ہے یہ ادھر بھاری بھر کم چین کی گت بنانے میں مصروف ہے۔ وہ کم از کم مشرقی ایشیا کا رہنما اور عالم بننا چاہتا ہے۔ جاپان نے برطانت بڑی محنت سے حاصل کی ہے۔ جاپان کے ۹۹ فی صدی بچے تعلیم پاتے ہیں۔ مشرق سے اور مغرب سے جو کچھ بھی جاپانی دیکھ سکتے ہیں وہ سیکھنے میں مصروف ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں طلبہ سال میں تقریباً ۵۰۰۰۰ دن سکول جاتے ہیں جاپان میں ۲۲۰۰۰ سے لے کر ۲۲۰۰۰ دن تک اُن پر بوجھ اتنا ہے کہ سال بھر میں ۳۰۰۰ جاپانی طلبہ خود کشی کرتے ہیں مگر اس پر بہت قوم کو اس قربانی کی پروا نہیں۔ پچھلے سال میں اس جھگڑا شنگائی قوم نے دروز اور یا منسٹے اپنا قدار اوسطاً ایک انچ بڑھا لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اس قوم کو کئی دوسری کالی گوری یا بلی قوم متبادل نہیں کر سکتی۔ جاپانی جانتے ہی نہیں کہ سردی، بھوک یا ٹھکان کیا چیز ہے۔ حیف ہے کہ ایک ایسی عظیم الشان قوم ایک کمزور پردی کو اپنے پاؤں تلے روندنا اپنے لئے باعث تنگ نہ خیال کرے!

چھوٹی قوموں میں ترکی نہایت استقلال کے ساتھ اپنے کمال کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے اور کمال کی دُور اندیش مکتے انڈستان ایران اور عراق کے ساتھ مل کر اسلامی ریاستوں کے ایک ایسے اتحاد کی بنیاد رکھی ہے جس سے اسلام کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر جمع ہو رہا ہے۔ فلسطین کی مجوز تقسیم نے اسلامی دُنیا میں ایک پہل چا دی ہے۔ برطانیہ کی یہود فو زار پالیسی نے یہودیوں کو دُنیا کے کونے کونے سے لاکھ فلسطین کے ساحلوں پر لا ڈالا ہے اور اب وہ لاکھ عربوں کے مقابل میں اُن کی آبادی پانچ لاکھ کے گنگ بنگ ہے۔ ملک کا زخمیہرہ ساحلی حصہ بیشتر یہودیوں کو بخش دیا گیا ہے۔ صحرائی علاقہ عربوں کی نذر کیا گیا ہے اور بیت المقدس کا علاقہ انگلستان کے تسلط میں رکھا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ انگلستان کی شمشاد بیت کے لئے فلسطین کی ہندو گاہیں اور ہوائی مرکز ضروری ہیں۔

چین کو اکیلا پار جاپان اُس پر محیط پڑا ہے۔ چین اتحاد و تنظیم کا سبق پڑھ رہا ہے لیکن بہت دیر میں۔

ہندوستان کی پچھلے سال کا پلٹ گئی ہے۔ کانگرس اب سات صوبوں میں مکران ہے اور گورکھالوں کی اکثریت اُس کے ساتھ نہیں۔ اس میں شہ نہیں کہ اُس نے شمشاد بیت کے زور توڑنے اور ایک جمہوری سی حکومت قائم کرنے میں بجا بھاری مٹی کا مہر اِخام دیا ہے۔

دُنیا کا تہذیبی اس وقت ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ سیاسی اور معاشی اور معاشرتی اور اخلاقیات کی نئی روش دُنیا کو لگ آ رہی ہے۔ جنگ کے بعد کئی چھوٹی قوموں کو آزادی کی نعمت ملی لیکن پچھلے چند سالوں سے طاقتور قوموں میں طاقت اور رعزت کا ایسا ضبط سایا ہے کہ کمزور قوموں کے لئے مصروفیات تنگ ہو رہا ہے۔ پچھلے عرصہ میں اب چین بوٹ رہا ہے کہیں چیکو سلوویکیا کا رہا ہے کہیں ترکی نے جہاز خیزہ ہا ہے کہ مراد کوئی بد دماغ آدھلے۔ پھر ایک طرف اشتراکیت کی دھمکیاں دوسری طرف فاشیت کے دوسرے ہیں اور پاس ہی جمہوریت اور شمشاد بیت اپنی دلائل اور فریبکاریاں پیش کر رہے ہیں۔ ان سب میں ایک عالمگیر نتیجہ خیز جنگ

آج

(فُروز)

آج ہیں ہوں اُور میری زندگی
زندگی، خوشدگی، تابندگی!

سامنے پھیلا ہوا ہے اک جہاں

آج میں ہوں اور زمین و آسمان
دیکھ اے دل دیکھ افق کی سمت تو

ہے طُورِ آفتاب آرزو

کیا ہوا کیا روشنی ہے کیا فضا

رُوح پروردل کُشا جنت نما

آگیا بس آج جینے کا مزا

زندگی ہے اک نظر آج کا

دل میں اٹھتی ہیں منگیں صد ہزار

زندگی! اے بحرِ ناپیدِ کنار

بشیر احمد

اُستاد اور شاگرد

اُستاد نے گھڑکی دی اور غائب ہو گیا کم از کم اس تصویر میں غائب ہے اور شاگرد کوئی حیران ہے کوئی خفا ہے اور اکثر ڈر گئے ہیں، جھجک رہے ہیں۔ ادھر دنیا اب محض جو رہا استاد وہ زہر پیر، کدہ کرملین نہیں ہو جاتی بلکہ دیکھنے والے زیادہ تر اس حیرانی اور غشکی اور ڈر اور جھجک کے سمجھنے والے ان سے ہمدردی رکھنے والے اور ان کی مدد کرنے والے ہیں۔

وہ زمانہ گلیا کہ جناب استاد کی سخت کلامی اور سخت گیری آسانی رہنمائی سے تعبیر کی جاتی تھی اور ماں باپ بھی اپنے بچے کو بٹپتے دیکھ کر اسے ایک دعائیہ ریاضت جان کر باعثِ سعادت تصور کرتے تھے۔ اب تو ایک غلط انداز نظر بھی استاد کے لئے ایک گناہ کیونکہ سمجھی جاتی ہے کبھی استاد کی مطلق انسانیت تھی اب شاگرد کی آزادی کا زمانہ ہے۔ اُس وقت شاگرد کو قدم قدم پر استاد کے تیرور دیکھنے پڑتے تھے۔ اب استاد کو بات بات میں شاگرد کا بغض شناس بننا پڑتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اب وہ استاد کی شاگردی کا زمانہ ختم ہو چکا، اب استاد ایک ہمدرد رہنا ہے جسے خود روز بروز نظر شناسی کا سبق پڑھنا ہے اور سبق وہ شاگرد کے ذریعے سے پڑھتا ہے اور یہ شاگرد اس کے لئے قدرت کی ایک نڈیا کا مقدس نصیب ہے جس کا ایک ایک سبق دیکھنے والے کے لئے روپوشی اور سنہری ہے۔ نہیں استاد شاگرد بلکہ شاگرد انسانیت کے دو فرد ایک بڑا دوسرا چھٹا، بڑا تجربہ کار اور شایعہ خوار چھٹا، ازل اس احساس اور یقیناً معصوم، پھر بڑے کو چھوٹے پر فوقیت کیسے ہو سکتی ہے؟ اُسے غر کرنا چاہئے کہ اُسے اس کی خدمت و رہنمائی کا موقع ملے۔

یہ ہیں شاگردوں اُستادوں کے لئے حقوق و فرائض لیکن کو خیالات اکثر نئے ہوئے ہیں اہل ابھی، کم از کم ہماری نیم پرانی دنیا میں پڑانے خیالوں ہی پر ہے۔ اس لئے زیرِ نظر تصویر ہمارے حالات کے عین مطابق ہے۔ اُستاد نے گھڑکی دی اور محض فراموشی کے لئے مزہ پیر اور اب جو پھر کھینچا اور شاگردوں کے چہروں کو دیکھ کر تو خود پھر ایک گھڑکی دیجا اور یہ گھڑکیوں اور شاگردوں کا سلسلہ بونہی جاری رہے گا۔ اور کہا جائے گا کہ ہمیشہ سے بونہی تھا ہے اور رہے گا!۔ اس ہمیشہ نے اس پڑانے پر تجربے نے اس انسانی فطرت نے نوع انسان کو اس تھوڑے گنگ کیسے کہ گنگ کیسے کہ گنگ آمد انسان نے خود اپنی فطرت پر گولہ باری شروع کر دی ہے کیا یہ بدلے کا تباہ ہو جائے اور فطرت جو زندہ رہنا چاہتی ہے جو زندہ رہنے کے لئے بنی سے بدل سکتی ہے بدلنا چاہتی ہے بدل رہی ہے اور بدل کے بیگی۔

اس کے علاوہ فطرت کر کسی نے ٹھیک سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، جو مٹی سی بات سمجھیں آگئی بس اسی کو پتہ کی کیر سمجھ لیا لیکن اب تو بات بات میں ایک بیل نظر آنے لگی ہیں اب تو پانی کی دھار سے پتھر کی کیریں بھی بٹنا چاہتی ہیں!

شاگرد اپنے اپنے آنے والی باتوں کے ہمدرد استاد اور شاگرد بن گئے۔ اسے سچ کے استادوں! ان کے رہنماؤں کے بگے لب زبانی جیسے بات کر رہا!

بشیر احمد

ہمایوں گولڈمیڈل مشاعرہ

ایم بی جٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں مہم کی یادگار

۱۹ فروری ۱۹۷۳ء (جمعہ) کی شام کو وائی ایم سی۔ ۱۰ سے لاہور کے ایچ این ایکٹیم الشان انعامی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت آئینہ سربل سرور نے فرما دی۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ کالجوں کے طلبہ کو اس انعامی مقابلے میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ اور بہترین نظم کیلئے میاں بشیر احمد صاحب سٹراٹ لارڈ ایڈیٹر ہمایوں نے اپنے والد محترم کی یادگار کے طور پر ہمایوں گولڈمیڈل کے نام سے ایک طلائی تمغہ پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ وائی ایم سی۔ ۱۰ کے کمرٹس ایک فنکار نے اس طلبہ کو دیاجائے گا جس کی نظم کو عازین ہلکہ کثرت بار سے بہترین قرار دیں گے۔ جلسہ کی کھردوانی شروع ہونے سے پہلے حاضرین کی اپنی ریلے میں درج کرنے کے لئے کاغذات تقسیم کر دیئے گئے تھے۔

سب سے پہلے صدر محترم نے ہزہل جٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم کے متعلق ایک تعزیریکی جس میں مدوح کی زندگی کے اخلاقی، علمی و ادبی پہلو پر روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد میاں بشیر احمد صاحب نے "کلام ہمایوں" کے چند نمونے پیش کئے جن سے حاضرین بہت مہلکوا ہوئے۔

پھر ان ہی مقابلے کی دس بہترین نظمیں پڑھی گئیں۔ طلائی تمغے کے متعلق تین جملوں نے جلسے سے پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا۔ جلسے میں صرف اس کا اعلان کیا گیا۔ "نقزائی تمغے" کے متعلق آرا شاعری کی گئی اور جناب صدر نے فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے مندرجہ ذیل طلبہ کو انعامات دیئے۔

- ۱۔ "طلائی تمغہ" (راؤل انعام) : سید ضمیر حفیظی اسلامیہ کالج لاہور۔ نظم "گاؤں کی ایک شام"
- ۲۔ "عذبات ہمایوں" (دوسرا انعام) : برہندہ سنگھ سیال دیال سنگھ کالج لاہور۔ نظم "بھائی کا فوجہ"
- ۳۔ "نقزائی تمغہ" (سومین انعام نمبر ۱) : سید فیضی جالندھری سابق متقدم گورنمنٹ کالج لاہور۔ نظم "تھوار"
- ۴۔ "عذبات ہمایوں" (سومین انعام نمبر ۲) : اشرف ریاض قبلی سابق مسلم گورنمنٹ کالج لائل پور۔ نظم "درہ خیبر میں چند لمحوں"

مشاعرہ غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ حاضرین کے فیصلے پر انعام دیئے جانے کی عذبت کو بہت لپٹ بک گیا جس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ کاپی رہنے کا اعلان کرنے کے لئے سامعین کثیر تعداد میں تشریف لائے تھے اور اہل میں بل دھرنے کو ملکہ نہ تھی۔ اس مشاعرہ کی چند نظمیں ناظرین ہمایوں کی دلچسپی کے لئے آئندہ صفحات میں درج کی جاتی ہیں۔

(دی۔ ایل۔ ریڈی ادم جرنل سیکریٹری وائی ایم سی۔ ۱۰ لاہور)

گاؤں کی ایک شام

از سید ضمیر صاحب حفیظی

آسمان پر منتشر یہ نغمی نغمی بدلیاں
غرق شہریت ہوائیں، بے خودی پروردگار

لہلہاتے کیسٹ اور اُن پر شفق کی ٹہریاں
اک کبھ امیدان تا مگر نظر پھیلا جوا

اک طرف تھے کبڈی کھیلنے والوں کا شور
ڈاٹ پر مصوم و سادہ لڑکیوں کی ڈلیاں
پانی بہنے والوں کے پاؤں کی یہ نرم چاپ
دھندلی دھندلی میز پر ڈائریں یہ گیسے کے کھان
ڈٹی پینے کی یہ آوازیں، یہ تھوڑی سی آگ
دور قربان سے یہ میرا گانے کی صدا
شام اور یہ شام کی دلکش ملاحت رینیاں
یہ ہرے کھیتوں پر اک دمانیت چھائی ہوئی

کاش ان لمحات میں وہ انجمن آرا بھی ہو
لعل نظرارہ ہے جب وہ جان نظرارہ بھی ہو

لہ ایک شعر کا نام

آہ ماں جایا!

(راز ہندرسنگو صاحب سیال)

جاننے کیا ہوا ہے کب دل کو آج کچھ بھی نہیں مجھے سمجھتا
جام و مینا کو کب کروں بہم دل میں وہ دلوں میں پاتا
لٹ گئی دولت شکست قرار صبر کرتا ہوں، پڑھیں آتا
بروش بھی آہ ہو گیا رخصت عشق کے دلوں کو ٹھکراتا
آج آنسو ہی بن رہے ہیں شعر
ورنہ کچھ بھی نہیں کہا جاتا
اے کم بخت مانتا ہی نہیں جی کو باتوں سے کیسے ہلاکت
غم کا دور یا چن چن ہوا ہے آج کیوں نہ دل کو وہیں ڈھونڈوں
درد کی داد کون دیتا ہے کس کو سیسے کے طغ و کھلاؤں
دل صد چاک کی زبوں حالی کوئی ٹٹے ہے، کس کو سمجھائیں

آج کچھ لطف ہے تو رونے میں
کاش میں اس شک بن کے جاؤں
زیست میں درد ہے صدفی ہے ایسی باتوں سے کب رہائی ہے
نام ہی نام ہے خدا کا حفظ اہل میں موت کی خدائی ہے
بیکسوں پر جھانپیں جھانپتے ہیں کیا یہی شان کبریا ہے
حسن میں کسی شباب بٹا درد نے آگ سی لگائی ہے
ہم سے سُن اُس کا شریہ بہم
مرنے والا ہمارا بھائی ہے
اُس کی باتوں میں پلج تھا کالج وہ زباں، وہ دین، وہ لب شہیہ
اُس کی آنکھوں میں کھلے تھی دلی بانی کے آہ و بزم ہے

کیا کہیں ہم اُسے بھلا نہ سکے

اُس نے گوہر سے ہمیں نہیں

مئے اُلفت کا ایک حلا حلا حُسنِ فطرت کا ایک شیدائی

پاکبازی میں ایک سیدِ اکی طبعِ سادہ میں ایک سحرانی

درد و غم میں ہر ایک کا ہمدِ میرا بھائی امرا جوں بھائی

موت کے استخوانِ ہائے آہ اُن گئی زندگی کی وصالی

اُس کے دم توڑنے کا حال پوچھ

بھکیاں لے رہی تھی برائلی

زلیت کو ہر قرار سننے دے

میرے پروردگار سننے دے

ستم بے شمار سننے دے

یازب ایسی ہمار سننے دے

آہ! یہ اشکِ بادیاں کب تک

دل پہ کچھ اختیار رہنے دے

بل گئے اُس کے گھٹکر لے لالِ مذہبے پایا کا سببِ مذہبے

اُسے وہ اُس کے چلیے چلیے اکتہ کس طرح میں کہوں کہ اب مذہبے

رنے والوں کی خیریاں بے سود

آہ بچارے آپ جب مذہبے

وہ پاک بھی نہیں جھکتا اب گویا زکس کی ہلک لیس انگلیں

سُرخ دُوروں میں بھر گیا پانی برس گئیں اُسے وہ حیدر انگلیں

چہرہ زرد اُس کا سونا تھا اور اُس پر حقین دو گئیں انگلیں

موت نے اُن کو کوہِ پابے نور اب دیکھیں گے دلِ نشین انگلیں

تجہ کو تیری خدائی کی کو گند

اُس کو جھینے نے، یہ شباب کے دن

ایک مستانِ شہاب کے نیر

خونِ حسیتِ داد اور بیمِ خزاں

تلوار

(از سیدِ دفعی ہالندِ صری)

خون کی دھاریں چھپی ہیں اس کی نوکِ تیغ میں

لشکرش سے زندگانی کو دلاقی ہے سہاوت

زندگی کو موت کا رستہ بتا دیتی ہے یہ

اس کی سُرخ سی جگہ ہاتھ تین تاریکی مروت

اس کی آچھیں سرور کو دیتی ملن کا میں سناگ

بھلیاں کیساں برستی ہیں طربِ دستِ پم

علم سے لیتی ہے یہ اپنی روانی کا خصلِ ان

آسمانی تھر ہے اس کی دگِ ضرورین میں

دہر ووں پرست کر دیتی ہے یہ راہِ حیات

شیرے کو ایل جواؤں کو سہا دیتی ہے یہ

خونِ انسانی سے بھرتی ہے یہ اپنے غزوت

میریں میں اس کی پوشیدہ ہے تاثیرِ بھاگ

اس کا سینہ بڑھا جاتا ہے جب جنگاہ پر

کا شینے لگتے ہیں اس کے نام سے اونگے تلخ

ہر طرف ایجاد کرتی ہے گلستان لالہ رنگ
جنگ کی حدت ہے اس کے شعور زخا میں
اس کے زیر و بم پہ ہوتا ہے قیامت گاماں
یوں چمکتی ہے جہنم مرجب کئے لگیں
بزدلوں کی ہے یہ دشمن، سورماؤں کی نصیحت
برق کی تندہی رگ وریشہ میں اس کے عالم ہے
حاکموں کو یہ سکھاتی ہے حکومت کا شعور
اس طرح پھرتی ہے میدانوں میں بل کھاتی ہوئی
انشاء اس خشک بجلی کے لہراتے شرار
نذر نہیں ہے پیدا المی کی ہر جھڑکار سے
میں خوں کے سپینتی ہے سرزمین جنگ کو

گو غریب شکل ہے، غمے غرو ساند نہیں
کٹ میں اس کی رعایت کا کوئی فائدہ نہیں

درہ خیبر میں چند لمحے

(از اشرف ریاض صاحب جیلی)

شام کا نگیں سماں اور مٹی شفق ہنگامہ خیزند
شام کی دھندلاہٹوں سے بڑھ رہی تھی آسپ حُسن
ہر چکے تھے کیفیت زانوں کے ہنگامے غموش
تمی نکل رہی ہے خود خاموش منظر کی بہار
بار ہے تھے کھیت کے دہقان بستی کی طرف
بے خود و مسموم نفسیں منتظروں کو چمتی
بار بار تھا سہ صدی افغان پار و عہد و جلال
کار و بولی کا پٹا سینے سے لٹکائے ہوئے

جھک گیا قشاشم سجدے میں ہوا مٹی طریب
پی رہا تھا آنکھ سے سٹا شراب، ناپ حُسن
بڑھ رہا تھا دشت میں ہرست سٹاؤں کا جوش
سوچے تھے مست جنگل کے سٹائے شاہک
کہ ابھی مٹی خاموشی گرد و ن سے بستی کی طرف
اس نرشتوں کی زمیں میں پار و عہدیں گومتی
ایک کاندھے پر مٹی بہت لقی ایک کاندھے پر کدال
زندگی کو زندگی کا رافہ بھابھے ہوئے

دل میں آزادی کا جذبہ جسم پر مسیلا لباس
 کالجوں کے شوق لوگوں کو تھا نکلتا اس طرح
 ریل گاڑی کو تھا سامانِ تفتیشِ جانست
 ظاہر آزاد باطن مہو کسا مارا ہوا
 مجھ پہ اس منہموم منظر سے ہوا گہرا اثر
 گرد مانے کا یونہی بڑھت گیا کبر و غرور
 منہموں کے آج تک سستے چلے آئے جوناںز
 بھوک اور افلاس کا زوندا ہوا چہرہ اُداس
 حاکموں کو بے گنہ مجبور قیدی جس طرح
 اپنی آزادی غلامی سے بڑی گردانتا
 دل میں حسرت لب پہ مرگ ناگہانی کی دُعا
 ایک بھڑ آئے مری آنکھوں میں اُس کو دیکھ کر
 عرشِ تنگ ہوگی رسائی ان کے نالوں کی ضرور
 پاس تیرے کچھ نہیں ان کے لئے اُکے کرنا
 کھول دے اُن پہ بھی اب تو باپِ حرمت کھول دے
 موتیوں کے ساتھ ان کے آنسوؤں کو تول دے

کوئل

ایک طویل نظم ہے اقتباس :-

(از محمد نواز صاحب قریشی مازم الماشی)

سُن لی گئیں دنیا کی دُعا میں چلنے لگیں پورے پہاڑیں
 یوں اُمٹیں ساون کی گھنٹیں جیسے ناگ کسیں لہریں
 لنگھوں سے بھر پور فضا ہے ٹکڑے ٹکڑے چاند ہوا ہے
 فوج نہیں لنگھوں کی یہ آئی اُڑتے میں دودھ اور دھلائی
 بادل جگمگے ہیں ہم جولی بل کر کھیلیں آنکھ جولی
 گاؤں میں جتنے پھٹے بٹے ہیں سب میدان میں آ پہنچے ہیں
 آڑ میں ہو کر چپ کرنا چکر تاک کے وہ گئے کے سر پر
 نیلے اندھے چوڑے ہیں جینے کا جاؤ توڑ رہے ہیں
 چھوٹے بچے بھولے بچالے گوسے گوسے کالے کالے
 چھوٹے چھوٹے بل ہیں ان کے پھول سے ناز گل میں ان کے
 ہر ہضمہ اور اک رشتہ ہر دم ٹھٹھکا گندم اور بس

ایک لنگوٹی اور اک کرتا ہے اُن کا بس سارا بانا
 ہاتھ میں چکر گھوم رہا ہے پہلو میں دل مجوم رہا ہے
 اُٹا ہوا ہے حن کا دیا ڈھونڈ رہا ہے پریم کی نیا
 سنہ سے خالی ساز ہے دُیا ساز اک بچے آواز ہے دُنا
 حن ہے راگ اور فتن گیتا لیکن سُنتا، محو و محبت
 دیکھو یہ آواز ہے کسی دد میں ہے نڈو بڑی بڑی
 سینے سے منہ کو دل لپکا کوئل بولی - ہاں میں سمجھا
 کوئل ہاں آموں کی رانی کوئل ہاں - سادوں کی جوانی
 جس کو آپ سنیں نازاں کوئل ہے وہ سنگ گان

بیٹھی ہے آسموں کی گنجائیں مست ہے بس بھگوں کہتے ہیں
 دُنیا والے لو بھی بندے تن کے چنگے من کے گنہے
 لو بھر ہے اورا پر ادھر دُنیا شرم و حیا کی سادھ ہے دُنیا
 طرب ہے اس دُنیا کا کمینہ غرق ہے یاں نیکی کا سفینہ
 اللہ کے دل میں گھر کر لو
 پھر ساری دُنیا سر کر لو

کُل ہے یا جو گن کوئی پریم روگ کی روگن کوئی
 چھوڑ چکی دُنیا کے دمنے توڑ چکی لالچ کے پھندے
 دُنیا من سے بھلائے جھٹے ہے تو مولا سے لگائے جھٹے ہے
 ہمنسوں سے دور پڑی ہے پریم نئے میں چور پڑی ہے
 گیتوں میں دریا کی روانی سُن سُن کر موجیں ہوں پانی
 اور آواز میں مریے ایسا دم ہے جو مولا والوں کا

طاہر نقض نصیب سے

(از روشن لال ٹنڈن روشن کو درسی)

باغ کی پیاری فضا میں گھومتا رہتا تھا تو
 کینت بے محمود کرتی تھی تجھے کالی گھٹ
 بال و پر پھیلنے کے سطح پر پڑتا تھا تو
 منہ اندھیرے جب کبھی گھٹت کو جاتا تھا تو
 جب زرخیزوں کی گنتی چھاؤں میں سو جاتا تھا تو
 زور برساتا تھا ہر دم آسمان تیرے لئے
 گلستاں تیرے لئے اک حُسن کا بازار تھا
 اپنی میٹھی تان سے جب ٹوٹتا تھا لہار
 رشکِ فردوس میں تھا تجھ کو اپنا آشیان
 تو بلائے رنج و غم سے بے خبر تھا شاد تھا
 غنچہ ہائے خوب رو کو چومتا رہتا تھا تو
 شاخ پر مجھولا جھلکتی تھی تجھے ٹھنڈی ہوا
 جس طرف جی چاہتا تھا اُس طرف مڑتا تھا تو
 فرش اک سبزے کا زیر پا بچھا پاتا تھا تو
 عشرتِ دُنیا سے بیگانہ سا ہو جاتا تھا تو
 گیت گاتی تھیں خوشی سے ندیاں تیرے لئے
 ہر گلِ حسن ترا محبوب تھا دلدادہ تھا
 بیگماں ہوتا تھا شب کو آئی سادوں کی بیمار
 پتہ پتہ معین گلشن کا تھا تیرا راز داں
 دھیر دھیر شادوب کی ہر قید سے آزاد تھا

کب کب کو یہ معلوم تھا ہو گا تو پابستِ نقض
 چھوٹ جائیں گے کسی دن تجھ سے تیرے ہم نقض

سایہ شمشاد میں جو سرو قد استادہ ہے دیکھ! وہ سب سے بڑا ہمیں برابر زادہ ہے
 اس کے چھوٹے چھوٹے بھائی اس میں محو سیر ساتھ ان کے میرے بچے ہیں نہیں یاں کی غیر
 دیکھ! کیسے شاداں میں میرے یہ دونوں بھانجے غیرت شاداں میں میرے یہ دونوں بھانجے
 جن سے والدین مخاطب ہمارے بہنوئی ہیں ابن عم بھی ہیں انہیں کتا ہوں دلا بھائی ہیں
 بھائی صاحب ہو رہے ہیں اتھ منہ دیکھ اس طرف کارنامے ان کے ہیں روشن کن نام سلف
 والد ماجد سے ہے ہم سب کی یہ لاری نمود اس وجود پاک پر نازاں ہمارا ہے وجود
 ہم پر کب پڑتی نہیں ان کی نگاہ التفات ہم ہی ہیں ان کی نظر میں باقیات الصالحات
 مرکز طلعت ہے "پیری کا یہ نورانی فروغ" یاں نظر آتا ہے کامل ہم کو انسانی فروغ

"اجتماعی زندگی" میں "انفرادی شان" دیکھ

خاندان میں اس "بزرگ خاندان" کی آن دیکھ

علی منظور

حیدرآبادی

زینبو

(۱)

کے احق ہو۔ اوسے کا اگر شادی کا ارادہ نہ ہو تو وہ کیوں تمہیں یوں مُنہ لگائے۔ ماں انگریزوں باب پارسی، اچھا سودا کرنا ان کے ہائیں ہاتھ کا کرتی ہے۔

ثاقب۔ واشر مجھے تم سے اس قسم کی باتوں کی توقع نہ تھی۔ ساری دنیا تمہاری خوش مذاقی کی مداح ہے۔ جو ہے سر مجھے مبارک باد دیتا ہے کہ ناہید جیسی روشن خیال آزاد مزاج بہن کے بھائی ہونے کی مجھے عزت حاصل ہے اور تم سے جو دل کی بات کی تو تم نے وہی شادی کا چرچہ چلا دیا۔

ناہید۔ سنئے قومیاں! روشن خیالی آزاد مزاجی محض مشعل الطاف کی باتیں ہیں۔ یہی صرف کہنے کے لئے جہاں بقاء کے نسل کا سوال ہو وہاں آزاد خیالی کا کیا دخل۔ بھلا سوچو تو کہ ہمارا اور اوسے کے بچے ہم لوگوں کے بچوں کے کیا ہیں گے؟ ہنیک گھر بہت صاف ہوگا۔ اچھے بہت گورے چٹے ہوں گے مگر ان کی زندگی کیا ہوگی؟ مسجد کے پاس سے سوا فرنگی بن کر گور جائیں گے۔ بلا سے ہم لوگ متحد ہی مگر مسلمان تو ہیں۔

ثاقب۔ مولانا حاجی ناہید صاحبہ۔ اگر آپ کے دعوے کا یہی رنگ ہے تو میری طرف سے شادی کو طلاق ہے۔ یہ خوب رہی کہ بچے تو ہم پیدا کریں اور کام وہ اور لوگوں کے نہیں۔

ناہید۔ تو میری بات ٹھیک نہ تھی، ناکہ تم شادی پر آمادہ ہو کیا اوسے سے تم نے سوال کر دیا ہے؟

ثاقب۔ جینہ تو سہی بن بیٹھتی ہیں مگر اوسے کی بات ہی اور ہے۔ ناہید۔ اس میں کیا اٹکھاپن ہے؟

ثاقب۔ عورت کیلئے پیاری داؤل فامرت ہے۔ بن بکتے چلے جاؤ۔

ناہید۔ تقویٰ۔ تم جس پر مرتے ہو تعریفوں کے پُل بانہہ دیتے ہو۔ ان! تو کیا اب اوسے سے شادی کا ارادہ ہے؟

ثاقب۔ بھڑی گنوار بن کی بات! شادی کا کیا تذکرہ ہے؟ بلکہ تم بھی دیکھو لوٹ لوٹ ہو جاؤ۔

ناہید۔ تم تو کوئی جاٹ کی بھی بیاد لاؤ تو اُس پر بھی میں خدا ہوں گی۔ مجھے باپ دادا کا گھر آباد کیسنے کی آرزو ہے۔

ثاقب۔ لاجل دلاقوہ۔ ہندوستانی عورت کبھی عورت بن نہیں سکتی۔ ہمیشہ نانی دادی چھوٹی خالہ بننے کی آرزو میں آتی رہتی ہے۔ تم تو مجھ سے بڑی ہو، اماں، اشر بڑھ چڑھ کے فیشن ایل ہو اور ہمارا بھی وہی دقیقہ خیال ہے کہ باپ دادا کا گھر بچوں کی چپاؤں پیٹوں سے خالی نہ ہو۔

ناہید۔ اچھا میں گنوار ہی سی مگر جو اوسے نے تم سے شادی کی عثمان لی تو پھر کیا کر گئے؟

ثاقب۔ دیکھ تال کے بعد یہ تو تم نے بڑی سنانی کرنا دیکھی میں یہ کڑوسی نہ ہوگی۔

ناہید۔ سچ کتنی ہوں کہ میں اگر گنوار ہوں تو تم پرے دے

ناہید۔ ضرور پہلے آ جاؤ۔ میں تو خود باہر جا رہی ہوں بشکل ساڑھے بارہ گھنٹہ واپس آؤں گی اور وہاں یہ تو کتنا بھول ہی گئی کہ کیا کوٹھے وہ جو ہماری پھوپھی زاد بہن میں وہ بھی آ رہی ہیں اور تنہا رٹینس کا دیوانہ مشرک لمبی سی آ رہا ہے ثاقب۔ کون پھوپھی زاد بہن؛ کیا مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؛ ناہید۔ تم کہاں سے دیکھتے۔ والدہ رحمہ کی پھوپھی زاد بہن کی بیٹی فییمہ ہے۔ کالج سے ابھی نکلی ہے۔ شاید ولایت کی بھی سیر کر آئی ہے۔

ثاقب۔ کیسی ہیں؛ بیٹی شہزادہ پرورش مولوی ہیں کہ کچھ اس زمانے کی بھی ہوا لگی ہے؛

ناہید۔ دو سال ہوئے دیکھا تھا، سولہ سال کے لگ بھگ سنی۔ شکل بھی کچھ خاص طور پر عذیبہ تھی۔ خدا جانے ان دو سال میں کیا تغیر ہوا؛ اور تمہیں اس سے کیا؛ تم ہو گے ٹوسی ہو گئی گویا باقی دنیا نہ ہونے کے برابر ہو گئی۔

ثاقب۔ چھپو خانہ میں بڑی اُستادہ ہو۔ لوجا بارہ ہوں۔ وہاں یہ تو بتا دو کہ دنیا میں جو دو چار ہمارے رشتہ دار ہیں وہ سب سب پنجاب ہی میں کیوں نازل ہوئے؛

ناہید۔ بزرگوں کی غلطی اگر تم اس کی کوپرا کر دو بیٹی اور بیٹی پر سے لندن تک رشتہ ڈھونڈو۔

(۲)

پرنے ایک بچہ کا وقت ہے۔ ناہیدہ کا گول کر۔ خوبصورت مڈول سرفہ جھوم سے زندہ ہو رہا ہے۔ ایک ناہیدہ کیا کہ تم ہی کس کے پہلو میں ٹوسی!! چروں پرنسٹون کی لٹینا نیال، انگلیں صرف اول سرفہ کر کے

ثاقب۔ قسم لے لو ابھی تک *repose* کیا ہو مگر ایسی مغضب کی پیاری پیاری باتیں کرتی ہے کہ اگر دس پندرہ دن تک یہی یہی کیفیت رہی تو راجحک جاؤں گا۔

ناہید۔ تمہیں شرم تو نہیں آتی کہ کہنے کو یوں میرا دم بھرتے ہو کہ آپا میری جان ہے اور آپا میرا ایمان ہے مگر آج تک میرے ہاں نہ لے آئے کہ میں بھی دیکھ لیتی۔ لوگوں سے منہ کی کٹھو اور ٹوسی یہاں گئے، وہاں گئے، دس دفعہ ناچے، بیس دفعہ سینا گئے مگر مجھ سے پردہ ہی رہا۔ یہاں لے آتے تو میں کیا اسے کاٹ کھاتی؟

ثاقب۔ چلو چھو تو تمہاری ڈانٹ ڈپٹ سے ڈرتا رہا۔ ناہیدہ۔ جھوٹ کہیں کا! اچھا آج تلخ پراسے لاؤ۔ مگر دیر نہ کرنا۔ اور سوچی شادی کے متعلق تین تین آزادی ہے۔ مین پیس دھل دینے والی کون۔ پوری پسند ہے مقدم ہے۔

ثاقب۔ ارے لو گھڑی کرے میں چھوڑ آیا۔ کیا دقت ہے؛ ناہیدہ۔ (گھڑی دیکھ کر) دس بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ ثاقب۔ (جلدی سے اٹھ کر) مجھے تو دس بجے ٹوسی کے ہونٹ جانا تھا۔

ناہیدہ۔ تو کیا بڑا پندرہ منٹ دیر تو کوئی بات نہیں اور ویکہ گیارہ بجے سے پہلے ملتا ہوگی۔

ثاقب۔ یہ نہ کہو! ہلا کی پھٹتی ہے۔ ناہیدہ۔ اچھا غصیاک پونے ایک بجے پہنچ جانا۔ میں پانچ منٹ بھی انتظار نہ کروں گی۔

ثاقب۔ ضرور پونے ایک بجے ہم دونوں آنکلیں گے بلکہ کہو تو پہلے ہی آ جائیں۔ جہاں مرنے سے باتیں کریں گے۔

سی رسیلی آواز سنائی دی۔

”آپا، آداب“

یہ نغمہ تھی۔

ناہیدہم اندر سہم اشکرتی جاتی ہے گلے لگا کر پیار کرتی ہے اور پھر تعارف کراتی ہے ”میں لوسی پیشین جی سے ملنے بیٹھ کر ملکت ہیں“ یہ ثابت ہے۔

نغمہ۔ ”اؤ ڈو ڈو ڈو“۔ لوسی سے ”آپ ہیں نہیں کے دانتا“ (سرکھکے)، اور ثابت ہے ”آداب، امی کی نظر سے دعا پیار۔

ثاقب۔ اور تہاری طرف سے۔

نغمہ۔ آداب۔

ثاقب۔ ہرودی ہشیار گر تہا نام بڑا اقیل ہے۔

نغمہ۔ مجھے تو سہمی تہو کہتے ہیں۔ آپ بھی نغمہ کہنے کا کھٹ نہ کیجئے۔

ثاقب۔ اچھا بس نیو۔

نیو۔ جی بھائی شے!

ثاقب۔ (حاضر جوابی سے بے انتہا غرض ہو کر ہمارے کنبے ہیں سبھی کی زبان گزبھر کی ہے۔

اس پر نیو عجیب انداز سے منہ چڑاتے ہوئے سرخ چلی

گیلی سی زبان لہنی باہر نکالتی ہے اصدناق سے کتی ہے۔

نیو۔ تم سے تو چھوٹی ہی ہے۔

ثاقب۔ درمست ملاقات کو نہیں ہوئے اور منہ بھی چڑانے

لگیر۔ تیر جی گردن مروڑوں گا۔

استے میں ناہیدہ لہی۔ ”لوگو میرا تو بھوک کے مائے

بڑا حال ہے چلو کھانا کھاؤ۔

پہلے لوسی، پھر نیو، ناہیدہ، ملک اور ثاقب یکے بعد دیگرے کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتے ہیں۔ ثاقب نیو

کی سبک رفتاری کو غور سے دیکھ رہا ہے اور پھر دل ہی دل میں محسوس کرتا ہے کہ جس وقت سے نیو کمرے میں داخل ہوئی اس وقت سے اب تک اس نے لوسی سے نہ کوئی بات کی نہ اس کی طرف دیکھا۔ اب دیکھتا سانس لوسی کی طرف ہے مگر نگاہ نیو کے دوپٹے پر الجھ کر رہ گئی۔ وہاں سے پہلی تو لوسی چٹیا میں لگی۔

ناہیدہ۔ لوسی تم ہاں بیٹھو۔ ثاقب میرے بائیں لوسی کے پاس بیٹھو۔ ملک میرے دائیں اور نیو تم وہاں۔ غلو ابھی آتا ہی ہوگا۔ بس چلی جاؤ۔

دو دھڑنگار کھانا لائے تھیں کہ اتنے میں غلو *Heady*

Heady کہہ کر اپنی کرسی پر بیٹھنے کو کہے کہ بائیں طرف نگاہ نیو پر پڑی اور نیو نے جھک کر کہا۔

”آداب، آکا میاں“

غلو۔ (جلدی سے گلے لگا کر، پیشانی پر پیار کر کے) نیو! بلاؤ کتنی لمبی ہو گئی ہے، کہو آئی اچھی ہیں!

نیو۔ جی ہاں دُعا دیتی ہیں۔

کھانا شروع ہو گیا۔ ثاقب نے ایک آدھ بات لوسی

سے کی اور پھر لوسی نے غلو سے کہا۔

لوسی۔ آپ سے تول پل جی تھی۔ آپ کی نگیم سے سچ ملی ہوں میری بڑی خوش قسمتی ہے۔

ثاقب۔ قیوم تم بیل سے آئی ہو؟

نیو۔ موڑے۔

ثاقب۔ کتنی دیر لگی؟

نیو۔ ۱۰ میل سے کچھ زیادہ ہے۔ سست چلاتی رہی۔ دو گھنٹے لگ گئے۔

ثاقب۔ کیا تم خود تمام رستہ چلاتی رہیں؟

نیو۔ جی ہاں، موڑ چلاتی ہی میں بیٹی رہی۔ کہیں بھی اتر کر دھکا دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

ثاقب۔ اگر تم تیز چلاؤ تو گھنٹے بھر میں کتنے میل کر لیتی ہو؟

نیو۔ پینتالیس بھی۔ اڑتالیس بھی۔ سر دھک پر منحصر ہے۔

ثاقب۔ کیا کار بے تھری؟

نیو۔ آج تو بیک (Back) لائی ہوں مگر عام طور پر فوروڈ

(Forward) ہی استعمال کرتی ہوں۔

ثاقب۔ سائوسی تم نے؟ یہ سب آف اے گرل ساٹھ سینچ

میل کی رفتار سے موڑ چلاتی ہے اور تم لوگ مجھے کہتے ہو

کہ چالیس سے زیادہ نہ چلاؤ۔

لوسی۔ نیو تم سے ڈرائیور بھی تو ابھی ہوگی یہ تم چلاتے کدھر

ہو دیکھتے کدھر ہو؟

علو۔ لوسی تم پاس ہو تو نگاہ کا جھکننا معمولی بات ہے۔

اس پر غصہ قہقہہ ہوا اور بات کہیں اور نکل گئی مگر ثاقب

کی نگاہ دو پہرے قہقہے سے نہ پھٹی۔ اس نے محسوس بھی کیا کہ

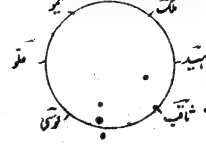
دائیں ہاتھ بہن کی طرف اور دائیں ہاتھ لوسی کی طرف اس نے

کم تو جھکی مگر اس وقت اسے یہ غور کرنے کا موقع نہ ملا کہ کھانے

کی میز جب گول ہو

اور نشست یوں

ہو کہ تیرے تھوڑے سا منہ پر



تو بے توجہی خاص مجرم نہ تھا۔ انسانوں میں دل نگاہ کا غلام ہے

ایک لمحہ 'مٹی' تو تیر کی جانب، جنم جھکتا تو اس نے کی طرف، دل بچا

کیا کرتا؟ بڑھا، جھکا، تڑپا۔

(۳)

لح ختم ہونے پر کھانے کے کمرے سے پہلے غائب

اور پھر سگڑوں سے ٹکے ہوئے تین نوجوان گول کمرے میں داخل

ہوئے۔

علو۔ آؤ بھئی کچھ کھلیں!

ثاقب۔ جی نہیں۔ ہم تو dance (رقص) کرنا چاہتے ہیں،

ہیں نالوسی! ذرا گراموفون تو منگواؤ ناہیدہ!

ناہیدہ۔ گراموفون تو آج ہی مرستے کے لئے دکان پر بھجوا رہی ہے۔

ثاقب۔ بڑی پھوڑا ہوتی ہو!

نیو۔ تو بھائی ضرور لوسی سے dance کیجئے۔

ثاقب۔ موسیقی کے بغیر تو پاگن چاہتے ہیں۔

نیو۔ آپ بہ قالین اور میز تو مٹائیے۔

(یہ کہتی ہے اور کمرے کے کونے میں ہوشاندار

پیانو رکھا تھا اُسے بجانا شروع کرتی ہے)

قالین میز وغیرہ مٹ گئے۔ راک بلامتہ گیا۔

لوسی کی نازک کمر میں ثاقب کا ہاتھ، خوبصورت مٹا کر چار

پاؤں کی گھماکیوں کا منمن ہوتا۔

جو پہلی راک ختم ہوا تو لوسی بے اختیار جا کر نیو سے مل

گئی۔ "تھینک یو ڈارلنگ"۔ "یو اینٹیل ڈارلنگ"۔ کتنی بات

مٹی اور پیار کرتی جاتی تھی۔ ثاقب بھی بے مدد سرور تھا مگر

ناچ کے بعد جب اس نے لوسی اور نیو کے چہرے پر

نیمو۔ (اندر سے) لڑن دس۔ ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔
 ثاقب۔ (اندر سے) تیری گھڑی غلط ہے۔ جلدی کرو میں تیری
 راہ دکھا رہا ہوں۔

نیمو۔ (اندر سے) اچھا ابھی آئی۔
 اور تھوڑی دیر کے بعد نکل آتی ہے۔
 ثاقب۔ ماشا اللہ ساڑھی باندھنی بھی آتی ہے۔
 نیمو (اضطراب سے) کیا سچ میری گھڑی غلط ہے۔
 ثاقب۔ یہ تو محض میرا ہمانہ تھا۔ ابھی تو کھانے میں بہت
 دیر ہے۔ چلو تھوڑی دیر ہو اٹھا آئیں۔
 نیمو۔ برے حضرت ہو۔ مجھے واقعی یقین ہو چلا تھا کہ کہیں
 میری گھڑی غلط نہ ہو گئی ہو۔

ثاقب۔ اچھا معاف کر دو۔ مگر چلو ضرور۔
 نیمو۔ جو آپ کی خوشی۔

چلتے چلتے ایک دلغریب مقام پر پور ٹروک لی گئی۔
 تنہائی تھی۔ تاریکی نہ تھی۔
 ثاقب۔ یونی بیٹھے بیٹھے اس خلعبورت منظر کا لُٹکا
 اٹھاؤ گی یا کچھ چلو پھرو گی بھی۔

نیمو۔ جی ہاں۔ ضرور چلے۔ بیٹھے بیٹھے کیا کریں گے۔
 دونوں خلام خلام پہلو پہلو ادھر ادھر گھومتے ہیں۔
 ثاقب۔ بہتر تشریف ہے اور نیمو کیا قطعی بے خبر علمی باتوں
 کا سلسلہ جاری ہو کر رک جاتا ہے۔ "ہمارے قدر پر لکھتے"
 "یہ دم سی روشنی روح افزا ہے"۔ اس سکوت میں زندگی
 کے نئے معنی ہیں۔

آخر ثاقب بھی کروا کر کے نیمو کے سامنے کو ہر کر کھڑا ہو

دیکھتے تو اس کی آنکھوں سے ٹپا پڑا ہوا سا اٹھ گیا۔ کہاں یا ٹرو
 اور کیم کی ایک خوشنما تصویر یعنی لوسی کا چہرہ اور کہاں کیف رتی
 گلاب مگر ساتھ ہی اس کے دل میں لوسی کی عورت بے انتہا
 بڑھ گئی کہ کس گر جوشی اور دلی نلوں سے اُس نے نیمو کا شکریہ ادا
 کیا۔ ثاقب کو یہ غور کرنے کا موقع نہ تھا کہ یہ اہل قانون فطرت
 ہے کہ مُنہ بہ جاتی ہے تو عورت ہی اس کی جانیں ہوتی ہے
 چنانچہ اس جھوٹے سے ڈراما کے بعد پہلا فقرہ جو اس نے لوسی
 کو کہا وہ بچائے معمولی بے تکلفی کے ادب و احترام کا پہلو لئے ہوئے
 تھا۔ "جی کامیاب ہو میں تمہیں کہتا ہوں مجھے بچائے" لوسی، یو فُل لکھنے
 کے اس نے "لوسی ڈیر" کیوں کہا۔ نیک نہاد تھی تجربہ کار یعنی
 بھانپ نہ سکی کہ لوسی کا پتنگ کٹ چکا۔

ناچ کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ لوسی نے
 ثاقب سے کہا۔ "چلو مجھے پہنچا آؤ۔"

ثاقب۔ تو کیا تم یہاں صاف (ٹینس) نہ کھیلو گی؟
 لوسی۔ برے شوق سے کھیلتی مگر کچھ ضروری کام ہے۔
 ثاقب نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا اور ابھی آتا ہوں
 کہہ کر لوسی کے ساتھ چل دیا۔

(۴)

اسی شام ٹھیک آٹھ بجے نیمو کے کمرے کے باہر ثاقب
 کھانے کا لباس پہنے ہوئے دروازے کو انگلیوں سے کھٹکاتا
 رہا ہے۔ اندر سے نیمو آواز دیتی ہے "کون ہیں؟"
 ثاقب۔ میں ہوں ثاقب۔

نیمو۔ (اندر سے) کیسے خیر تو ہے؟
 ثاقب۔ کیا تم سو رہی ہو تو مجھے واہے ہیں، کیا کھانے پر لگی؟

ثاقب۔ اگر حسین صرف حسین ہی ہوتے ہیں۔ تم جن میں محمّد ہو، وہی جن پر تمکuran ہو۔ جن تھا سے کہنے میں ہے، تم اس سے بالاتر ہو۔

نیمو۔ یونہی باتیں مالتے ہو۔ چلو گھر چلیں۔

(۵)

اسی رات کھانے کے بعد اپنی کوٹھی واپس جانے سے پہلے ثاقب اپنی ہنسیو ناہید کے کمرے میں دواخانے بند کر کے یوں گفتگو شروع کرتا ہے۔

ثاقب۔ نیدو، تمہیں کچھ مدّت تاریخ سے بھی سب سے؛

ناہید۔ اخبار پڑھتی ہوں، کبھی کسی ریڈیو کی خبر بھی سن لیتی ہوں۔

ثاقب۔ آج کی تازہ ترین خبر یہ ہے کہ تمہارے بھائی ثقلو نے شادی کا سوال کر دیا اور اسے مگسا جواب مل گیا۔

ناہید یہ سن کر کھڑا ہی جاتی ہے۔ اور پھر نہایت اضطراب سے کہتی ہے۔

ناہید۔ لہجے کے بعد جب تم تو سی کو پہنچانے گئے تو اس وقت تم نے اس سے سوال کیا ہوگا، کیا کہہ کر اس نے ٹھاکر کیا؟

ثاقب۔ واللہ بے انتہا کو مضمر ہو۔ تو سی ہماری کا کیا تذکرہ تھا۔ یہ قصہ تمہاری اس بلانے جان ہوگا ہے۔ کھانے

سے پہلے اسے مروٹے ملے گیا۔ نہر کے کنارے سوال کیا اور اس نے مجھے مذاق مذاق میں جتلا دیا کہ میں نہایت

احسن ہوں۔

ناہید۔ واللہ بڑے زمانائی گدے ہو۔ ثقلو تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ تمہاری ایک دن کی ملاقات، میری وہ مہمان

جاتا ہے۔ تیرا بھی جھجک کر رک جاتی ہے۔

ثاقب۔ (لوکھڑاتی زبان سے) یہ کہنا فنون ہے کہ تم کا بیاب ڈاکو ہو۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ موقع دو کہ زندگی بھر شش محنت، محنت تمہاری نذر کرتا رہوں۔

نیمو۔ تو کیا آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟

ثاقب۔ اگر تم قبول کرو۔

نیمو۔ (مسکراتے ہوئے) میں سمجھتی کہ آپ شاید کہیں اور سوال کرنے کی مشق کر رہے ہیں اور ابھی مجھ سے پوچھیں گے کہ کیا انشاء عشق کا میں اچھا انکڑ ہوں۔

ثاقب۔ (اسی لوکھڑاتے لہجے میں) نیمو! تمہو! خدا کے لئے میری زندگی کے پاکیزہ ترین لمحہ کو یوں فقرے بازی کی خاک میں ملاؤ۔ کیا تمہیں اصل اور نقل میں فرق کرنے کی تمیز نہیں؟

نیمو۔ انداز سے تو سچے معلوم ہوتے ہو مگر کسی کے ل کا کیا پتہ؟

ثاقب۔ تمہارا دل کیا کہتا ہے؟

نیمو۔ میرا دل بعض دفعہ یہ کہتا ہے کہ مہم (محنت) سے زیادہ ذلیل حرکت دنیا میں کوئی نہیں جیسے دیکھو مہم کا شکار رہے۔ میں مہم کا شکار رہنا پسند نہیں کرتی۔ بچے دل دماغ پر میں خود ہی مسلط رہنا چاہتی ہوں۔

ثاقب۔ تم بے انتہا ہمارے ہو۔

نیمو۔ یہ کیا کوئی بڑی یا انکی بات ہے، قد ہو، شکل ہو، سنگینی ہو، لباس ہو، تو جو کوئی بھی ہو پیاری معلوم ہوگی۔

ثاقب۔ تم یہ سب کچھ کہتی ہو اور اس سے بھی بہت کچھ یادہ نیمو۔ وہ کیا؟

میری بن جائے۔

ناہید۔ شرم تو نہیں آتی۔ اپنا کام مجھ پر ڈالتے ہو۔ اپنے آپ کو اس قابل کیوں ثابت نہیں کرتے کہ وہ خوشی تجھے قبل کرے۔

ثاقب۔ یہ تو کروں گا ہی مگر تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔

(۶)

دوسری صبح تیار، ناہید اور ثاقب موٹر میں سیالکوٹ روانہ ہوئے۔ ثاقب رات بھر نہ سویا تھا۔ موٹر کوئی آٹھ دس میل لاہور سے نکلی ہوئی کہ سو گیا۔ تیار موٹر چلا رہی تھی اور اس کا بائیں کندھا گویا ثاقب کے سر کے لئے تکیہ بن گیا۔ ناہید چپکی یہ تماشہ دیکھتی رہی۔ اتنے میں دونوں بیران ہو گئیں کہ ثابت سوتے سوتے بہت ہی رساں رساں کوئی نام لے رہا ہے۔ یہ نام

تیار

تھا۔ دھنڈہ تیار کا چہرہ تیار تھا۔ فتح یابی کی وہ مسرت جناب کا خاصہ ہے اس کے چہرے پر چپکی مگر باوجود بوجھ محسوس کرنے کے اس نے کندھے کو پرے نہ کیا۔ جو کام ثاقب جاگئے ہیں نہ کر سکتا تھا وہ اس نے گہری نیند کی حالت میں کر لیا۔ سیالکوٹ پہنچ کر تیار کی والدہ کو ناہید اور ثاقب نے آداب کیا۔

بیکم۔ (ناہید اور ثاقب کو مخاطب کر کے) بسم اللہ۔ بہت ہی اچھا کیا کہ تم دونوں آگئے۔ آنکھیں ترس گئی تھیں۔ ثاقب۔ پورچی اماں۔ تیار کی باتوں میں نہ آئیے۔ یہ تو میں انہیں ملایا ہوں۔ یہ گھر سے کب نکلتی ہیں۔

ہم دونوں کو وہ کس قدر کینہ خیال کرتی ہوگی۔ کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں کہ مسلمان خاتونیں قطعی آزاد ہو کر بھی شاذ اسلام سے غالی نہیں۔ میں صبح اسے کیسے نہ دکھاؤں گی؟

ثاقب۔ غلطی ہو گئی سو ہو گئی اور تم نہ دکھاؤ یا نہ دکھاؤ میں صبح ناشتہ کے لئے یہاں موجود ہوں گا اور اگر تم نہ ملو گی تو میں کہہ دوں گا کہ تمہیں یہ سیالکوٹ اپنے گھر لے چلے شام کو واپس آجائیں گے۔ تیار سے تم نے میری شادی نہ کرائی تو

ناہید۔ (ہات کاٹ کر) اب تو تم جاؤ۔ صبح دیکھا جائے گا۔ ثاقب۔ رات بھر مجھے نیند منظور ہی آئے گی۔

ناہید۔ خدا کے لئے اب جاؤ۔ غلط طریقہ خود اختیار کرتے ہو الزام ہن کے سر سے پتے ہو۔ شادی کرنی ہے تو اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کرو۔ نہ کہ یہ کہ تو تیار تم پر مارتا ہوں اس لئے مجھ سے شادی کر لو۔

ثاقب۔ محبت کو تو تیار ایک ذلیل حرکت قرار دیتی ہے۔ ناہید۔ تمہاری محبت واقعی ایک ذلیل حرکت ہی ہے۔

ثاقب۔ تیار ڈارلنگ۔ جس طرح ہو میری مدد کرو۔ دراصل تیار تمہارا ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں کہی نہ بتایا کہ مسلمانوں میں بھی ایسی لڑکیاں ہیں جو کافی نہیں ہیں۔

ناہید۔ یہ تو میں تب کہتی جب مجھے یقین تھا کہ مسلمان لڑکے کا نہیں نہیں۔ میں تو تیار سے ریت جسے دیکھتی ہوں گا ہی پاتی ہوں۔ کوئی رو پیہ کے پیچھے مڑے تو کوئی فیشن کے پیچھے۔ ایک بھی نہیں جو شرافت اور مسرت کا پرکھتا ہو۔

ثاقب۔ اپنے وعظ اب رہنے دو اور کوئی ترکیب سوچو کہ تیار

آج پورے چھ مہینے ہوئے کہ تیر کو پہلی دفعہ دیکھا نہیں ملا ہے۔
 ہے۔ چلے اس کی آواز سنیں اور پھر اسے دیکھا۔ اس کا وہ ایک لفظ
 "آداب" اور تائید کی خیریت ص کی بسم اللہ گویا دو جاوہل گئے۔
 قہقہہ کی تارک کہ لڑکوں کے اندر سبکی سی چکی اور میں جواکھ لکھنا
 تھا مسلمان ہو گیا۔ وہ کہہ کر خیال آتا تھا کہ اگر کوئی سے شاہی کی
 تو میرے بچوں کو دنیا بھر کی دولت غریب ہوگی مگر انہیں کوئی
 اس محبت سے "بسم اللہ" کہہ گاجن محبت سے تائید نے
 نیر کو بسم اللہ کر لی۔ بچوں کو بسم اللہ کی دولت سے محروم رکھنا مجھے
 سب سے بڑا جرم معلوم ہوتا تھا۔ خود بخود میرا دل یہ کہنے لگا کہ
 جن بچوں کی دل مسلمان نہیں وہ نہ "آداب" کہہ سکتے ہیں نہ "بسم اللہ"
 سن سکتے ہیں۔ اندہ ہی اندہ کشمکش ہی ہفت اندر کشمکش رہی۔
 کہ پرائی اہم اپنی کوششوں سے بڑوں کو وہ عجز انسانی خون چوس
 عقل سے زیر نہ ہوا۔ اس بار کے مسلمان غلام نے بسم اللہ کو
 بسم اللہ کی آواز سننے سے نہ دبا پر نہ دبا۔ لوگ محنت لگے پیچھے
 میانی ہر جاتے ہیں۔ میں دو دیکش جہوں کی صداؤں کے لئے
 مسلمان رہ گیا۔

دوست۔ جب تیر نے اپنے کندھے سے ہتھار نہ ہٹایا اور اس
 کے بعد اس نے ہوشیارم سے خاص محبت کا مسلک کیا تو
 اب تک تھاری نسبت کا اعلان کیوں نہیں ہوا؟
 ثاقب۔ پھر وہی افادہ نویسوں والے مستعار بھدا جانے
 آپ حضرات یہ کیوں نہیں سمجھ سکتے کہ زندگی پہلی عملی
 زندگی، انفرادی کی قیود سے آزاد ہے۔ ہنہ خدا اتنا تو
 سوچو کہ تیر مجھ سے کیوں کہنے لگی کہ میں نے یزید سر جاننا ہے
 کہ کندھے سے لٹکا رہے ہوں۔ یا تیر کو اپنے کہنے میں کیا

ناہید۔ جی ہاں پھر بھی اہل باہیات وقتو بھٹیک کتاب ہے۔
 ثاقب۔ پھر بھی اہل۔ مجھے تو آپ کی اجازت ہے کہ آج بچوں
 آجاول میں کوئی تیر کی طرح کا قیدی محفوظ رہی ہوں۔
 بیگم۔ بیٹا جب چاہو آؤ۔ ہمارا اپنا گھر ہے۔
 اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں ادنیٰ نے آکر
 کہا کہ کھانا تیار ہے۔ سب کھانے کے کمرے کی طرف بڑھے۔
 بیگم کھانے کے کمرے میں سب کے ساتھ آئیں اور یہ کہہ کر
 کہ "بیٹا مجھے معاف کرو، تم بسم اللہ کرو، جلی گئیں۔ گھر کا چہ چہ
 کرنا کونا گویا کہہ رہا تھا کہ اس گھر میں ایسے لوگ رہتے ہیں جن
 کا دل بے چین نہیں۔ کھانے کے کمرے میں قیمتی چیزیں نہ تھیں
 مگر ہر چیز فریضے سے رکھی ہوئی اپنی جگہ پر گویا چمک رہی تھی۔
 دیواروں پر چند فارسی قطعات تھے، میرے پردہ میں خوبصورت
 گلہاں تھے۔ کہہ گویا زبان حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ گو گھر کا بڑ
 ہوں مگر دولت کی تلاش سے ہلاتا ہوں۔ مگر آقا نے کمرے کو
 نہ دیکھا۔ تیمو میں مورا۔

(۷)

ثاقب نے اپنے جس دوست سے اس تمام ماجرے کا ذکر
 کیا وہ دوست اب اس سچی سرگزشت کو جھوٹ کے لباس میں ڈھپ
 کر رہا ہے۔ جب ثاقب بات ختم کر چکا تو دوست نے تعجب
 ہو کر پوچھا کہ آخر اس تمام واردات میں انکمی بات کیا ہے؟
 ثاقب۔ تم انسانہ نویسوں کے اس مرض کا کوئی علاج نہیں کہ زندگی
 میں، جو ایک معمولی چیز ہے، غیر معمولی جذبہ کی تلاش میں سرگرداں
 رہتے ہو تھری لگا نہیں نہیں ہیں کہ بھولے بھولے سیدے سادے
 نظروں کے معمول کو دیکھ کر۔ یا پہلی سادہ کوشش کرنا اور پھر

کے بڑے چاہے یا موت کا ذکر نفی میں ہے۔ دیکھنا موت یہ ہوتا ہے کہ جب وہ کچھ کر سکتے ہوں تو انہوں نے کیا کیا؟ ثاقب - یہ تو بالکل ٹھیک ہے مگر تم تو بھی تو انسان ہو اور کچھ نہ کچھ کر سکتی ہو۔ بناؤ تم نے کیا کیا؟

نیمو - مجھے تو جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکی۔

ثاقب - کب اور کیسے؟

نیمو - کیا تمہید نے تمہیں نہیں بتایا؟

ثاقب - حاشا دکلا۔ اس نے مجھے ہرگز کچھ نہیں بتایا۔

نیمو - کیا جواب سستی ہے۔ اگر میں تمہیں بتا دیتی تو تمہید ہونے کی آرزو کرتی۔ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا کہ تمہارے اس کدو دوسرے میرے کدو سے کوئل کر دیا مگر کسی خیال سے میں نے اسے نہ ہٹایا۔ نورجہاں نے تو صرف کدو بڑاڑائے اور وہ سیکم کے پسند آگئی۔ ہم دو بھونڈے ہٹائیں تو بھی ہماری قدر نہیں۔

اس فقرے کے بعد میں نے پیٹ کر پار کرنے کی کوشش کی مگر اسے میرا فقرہ یاد تھا۔ کہنے لگی :-

”مگر دن حاضر ہے۔ مروڑ لیجئے“

کیوں کرتی کہ مجھے تمہارے خلاف ایک *Advantage* دیتی۔ یہ واقعہ ہے کہ میں خوش نصیب ہو کر بھی اپنی بیدار مٹی محبت سے بے خبر رہا۔ نیند میں بڑی ہمت جاگئی۔ مجھے جاگ کر بھی اس کا پتہ نہ چلا۔ مگر اب جو تم پر سمجھتے ہو تو جو واقعہ کل پیش آیا وہ تمہیں بتا دیتا ہوں۔ پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کیوں ہماری نسبت نہیں ہوگی۔ مگر شاید جلد ہو جائے گی۔

میں اور نیمو کچھ عرصے سے چند تاریخی واقعات کا مل کر مطالعہ کر رہے ہیں۔ مل کر کام کرنے میں جو روحانی چاگ لگی پیدا ہوتی ہے وہ بجائے خود ایک حین دنیا ہے۔ کل اتفاق سے ہم نورجہاں کے متعلق کچھ مطالعہ کر رہے تھے۔ نیمو کی اور میری یہ گفتگو ہوئی۔

نیمو - مؤرخ کس قدر احمق ہیں۔ نورجہاں کا ذکر ہمیشہ یوں ختم کرتے ہیں کہ مکہ کا مقبرہ دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ باغ ویران ہے، کتبہ گم ہے۔

ثاقب - اور پچاڑے کیا لکھیں؟ یہ واقعہ ہے۔

نیمو - اس واقعہ کو نورجہاں سے کیا تعلق؟ یہ تو ہماری دنیا کی کبھی کاشیت ہے، اور نہ نورجہاں کی مٹی نورجہاں نہیں۔ نورجہاں ایک طاقت تھی، ایک عروج تھا۔ وہ طاقت، وہ غور و زمانہ کے لئے ہمیشہ ایک روشن مثال ہے انسانوں

”فلک پیم“

رعنائیاں

(۱)

کس جلوہ پر کیف سے معمور ہے دنیا؟
ہر سمت نے حُسن سے معمور ہے دنیا!

بجلی کے ترپتے ہوئے کوندوں کی لپک ہیں
برسات کی بھیگی ہوئی راتوں کی جوانی
میتاب سے برسی ہوئی کرفوں کی چمک میں
مبتے ہوئے دریا کا جھلکتا ہوا پانی!
شبنم کے کھلائے ہوئے پتوں کی ہلک میں
بیتاب پیہوں کی جگر دوز کمانی!
چھٹکے ہوئے تاروں کی دل افروز جھلک میں
جنگل سے گزرتی ہوئی ندیوں کی رولنی!

اے بے خبر حُسن تجھے یہ بھی خبر ہے؟
ہر گام پہ اک منظر نو پیش نظر ہے!

(۲)

کس جلوہ پر کیف سے معمور ہے دنیا؟
ہر سمت نے حُسن سے معمور ہے دنیا!

سرسبز پہاڑوں میں چمکتے ہوئے جبر نے!
دادی میں چمکتے ہوئے چشموں کا ترنم!

شاما کی دل آویز غزل لُور کے ترانے!
 صحرا کی خموشی میں جمالِ مہ و انجم!
 کمرے میں اُبھرتے ہوئے سُبُوح کے کرشمے!
 مہتاب کے جلووں میں سمندر کا تلطم!
 رنگین دھندلوں میں ابا بیل کے نغمے!
 ٹھہری ہوئی جھیلوں میں ستاروں کا تبسم!

اے بے خبرِ حُسن تجھے یہ بھی خبر ہے؛
 ہر گام پہ اک منظرِ نو پیش نظر ہے؛

(۳)

کس جلوہ پر کیف سے محو رہے دُنیا!
 ہرست نئے حُسن سے معمور ہے دُنیا!

سادن کی مکتبی ہوئی گلبریز ہوا میں
 گلشن کی لچکتی ہوئی شاخوں کے ترانے!
 میدان کی سہمی ہوئی خاموش فضا میں
 فرت کی ستائی ہوئی کوئل کے فسانے!
 مہتاب کے پُر نور تبسم کی ضیا میں
 تالاب میں گھلے ہوئی چاندی کے خزانے!
 راتوں کو وہ بوجھار کی مجنور صدا میں
 بوندوں سے ٹپکتے ہوئے کچھ گیت سہانے!

اے بے خبرِ حُسن! تجھے یہ بھی خبر ہے؛
 ہر گام پہ اک منظرِ نو پیش نظر ہے!

ذوق

سب سے پیچھے کھڑے ہوئے

۱؎ میرا شہید پر شاد مژدہ کھنڈی
۲؎ مڑ ڈی ڈی کپور مڑا خرمین
۳؎ مڑا شہیدیاں مڑتین ملک

کھڑے ہوئے

۴؎ میر محمد بخشی علی مڑ قدیر احمد خان قدیر کھنڈی
۵؎ خان بہادر محمد ملکر
۶؎ میر محمد علی مڑ قدیر احمد خان قدیر کھنڈی
۷؎ مڑ کھنڈی لال چوہا
۸؎ میرزا احمد مڑتین کھنڈی
۹؎ سید نجم الحسن
۱۰؎ میاں بشیر احمد مڑتین داس تار
۱۱؎ سید احمد مڑتین داس تار
۱۲؎ سید ذب میاں خان بہادر مڑتین حسن خان
۱۳؎ سید احمد مڑتین ملک
۱۴؎ سید ذب میاں خان بہادر مڑتین حسن خان
۱۵؎ سید ذب میاں خان بہادر مڑتین حسن خان
۱۶؎ سید ذب میاں خان بہادر مڑتین حسن خان
۱۷؎ سید ذب میاں خان بہادر مڑتین حسن خان
۱۸؎ سید احمد مڑتین ملک
۱۹؎ سید احمد مڑتین ملک
۲۰؎ سید احمد مڑتین ملک

کر سبوں پر بیٹھے ہوئے

۲۱؎ جلیپہ سلطان دانش
۲۲؎ بہت بہادر ام جوش میانی
۲۳؎ میرزا ثاقب کھنڈی
۲۴؎ آریزلی بہر سید سلطان احمد
۲۵؎ ملک غلام محمد
۲۶؎ مولانا یحیٰ دہلوی
۲۷؎ بہادر کھنڈی
۲۸؎ سید احمد مڑتین ملک
۲۹؎ سید احمد مڑتین ملک
۳۰؎ سید احمد مڑتین ملک
۳۱؎ سید احمد مڑتین ملک
۳۲؎ سید احمد مڑتین ملک
۳۳؎ سید احمد مڑتین ملک
۳۴؎ سید احمد مڑتین ملک
۳۵؎ سید احمد مڑتین ملک
۳۶؎ سید احمد مڑتین ملک
۳۷؎ سید احمد مڑتین ملک
۳۸؎ سید احمد مڑتین ملک
۳۹؎ سید احمد مڑتین ملک
۴۰؎ سید احمد مڑتین ملک

فرش پر بیٹھے ہوئے

۴۱؎ بہت باکند مڑتین میانی
۴۲؎ مڑ عبد اسلام
۴۳؎ مڑ محمد بہد خان احمد مڑتین
۴۴؎ سید تنویر علی
۴۵؎ مڑ محمد کھنڈی مڑتین
۴۶؎ سید احمد مڑتین ملک
۴۷؎ سید احمد مڑتین ملک
۴۸؎ سید احمد مڑتین ملک
۴۹؎ سید احمد مڑتین ملک
۵۰؎ سید احمد مڑتین ملک
۵۱؎ سید احمد مڑتین ملک
۵۲؎ سید احمد مڑتین ملک
۵۳؎ سید احمد مڑتین ملک
۵۴؎ سید احمد مڑتین ملک
۵۵؎ سید احمد مڑتین ملک
۵۶؎ سید احمد مڑتین ملک
۵۷؎ سید احمد مڑتین ملک
۵۸؎ سید احمد مڑتین ملک
۵۹؎ سید احمد مڑتین ملک
۶۰؎ سید احمد مڑتین ملک

م۔ک۔ن۔ب

دنیا بھر کی دلچسپ باتیں بھی اُسی وقت یاد آتی ہیں جب ہم چار پانچ بے تکلف دوست کہیں پھر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ایک شام گوراکے مشہور شاعرات دھام دھام دین کے بلند پایہ اشعار سننے کے بعد جب قہقروں کی آوازیں بند ہو گئیں تو شمیم نے استاد کا دیوان ”بانگ دہل“ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”اکرم! ہاں! وہ گھنٹی والی بات تو تم نے ان لوگوں کو سنائی ہی نہیں! اکرم بولا۔ ”ہاں! ابھی سنو ایک اور دلچسپ بات جو میں کبھی نہیں بھولتا۔

جب سب نے اپنے اپنے سگٹ سلگائے تو اکرم نے جسے پرانی باتیں بیان کرنے میں خاص مہارت کے ایک لہجہ رکھتے ہوئے اپنی داستان یوں شروع کی۔

”فانکاجب تھڑا میں گیا تو کچھ عرصہ کے بعد پرنسپل نے عرفیاتی ڈنسی کی وجہ سے ہمارے ریاضی کے بھلے چلنے پڑھنے کو کالج میں علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہم لوگوں نے بہت شور مچایا مگر کچھ بنا اور چند ہی دن میں ہم پرایک ایسا پرفیسر نزل کر دیا گیا جو تھا تو میری ٹانگے ڈرا ہوا لڑکے ہی جیسا تھا کہ وہ کھانے سے بھی توڑے ٹوڑے کمرے کے کونوں میں بک جائیں۔ پاکٹ سائز پڑھنے پر ہر وقت نارعب جھانے ہم اتنا ہی نہیں کہ بچا کرنا کیا ہے۔ چند ہی دن میں سارے کالج میں مشہور ہو گیا کہ ”فرنیئر“ میں نے پرفیسر کو انگلیوں پر پٹچا یا جاتا ہے۔ ہمارے کمرے کالج کی بڑی عمارت کے ذرا بہت کمرے بنے تھے اور ہم اپنے ہالک کو اپنی آزادی اور بے باکی کی رعایت سے ”فرنیئر“ کما کرتے تھے۔

ایک دن آپ پڑھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ کسی لڑکے نے زور سے پیٹی بجائی۔ پرفیسر نے جھٹکا کر کہا ”کون ہے یہ پیٹی بھانے والا میں نے بیٹے بیٹے کہہ دیا۔“ پچھا ”رضل سے بھاڑ کر آپ کو ادھستے لگا دینا چاہتے تھے“ اتر کر کھٹے لگے ”مڑھ بھٹا کھڑے ہو جائیں“ مگر کوئی نہ اٹھا۔ آپ نے پٹیش میں کہا ”مڑھ بھٹا کیوں کھڑے نہیں جوتے“ لڑکے ہنس دینے آپ نے پھر کڑا کر کہا ”مڑھ بھٹا خود ہی کھڑے ہو جائیں نہیں تو میں ان کے خلاف سخت کارروائی کروں گا“ کھاتے میں ایک لڑکے نے ہنستے ہوئے اٹھ کر کہا ”جناب گنتی غی معاف! پچھا تو جماعت میں کسی لڑکے کا نام ہی نہیں پچھا تو ہوش کاحمام ہے“ لڑکوں نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور پرفیسر زمین پر پاؤں مالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل کر یہ جادو جا۔

دوسرے دن پرنسپل کی طرف سے ساری کلاس کو تین تین سو پچھترہ جہان ہوا اور ساتھ ہی یہ نوبی بھی ملا کہ اگر آئندہ کسی لڑکے نے خلاف کسی بھی شرارت کی تو اسے پانچ پونے تک جرمانہ کیا جائے گا۔ لڑکے جڑانے سے ڈر گئے اور شرارتیں بہت کم ہو گئیں۔ ایک دن پرفیسر جھٹکا پھٹکا کہ پڑھا رہا تھا میں نے خاموشی عمارت کی نفاذاتی پاکٹ بلی سرور ہوئی تو رخت آہ بھرنے پر ہی مجھے ایک بلی پر جہان ملنا دیا گیا۔

چند دن بعد کہہ کر کہہ کر پرفیسر روڑ پڑ پڑ کھنکھنے کے لئے لگا تو جماعت بے گنتی بچنے کی آواز اٹائی لیکن جب اس نے ڈرا کر دیکھا تو آواز فوراً بند ہو

گئی۔ چند منٹ کے بعد جب پھر وہ کچھ کھڑا ہوا تو گھنٹی بجی اور وہ ابھی مڑ کر دیکھنے بھی دیا تھا کہ آواز بند ہو گئی۔ پروفیسر کچھ حیران سا ہوا مگر اس نے پھر لکھنا شروع کر دیا۔ آہستہ سے ٹن... ٹن... ٹن کی آواز پھر آئی تو پروفیسر نے پیش سے چاک لکھ کر ملازمین پر پھینکتے ہوئے کہا: "یہ کیا ہے؟" اس کے غموش تھے اس وقت کی نشست پر پروفیسر سے بیٹے کو لایا اور وہ چلا گیا۔ دوسرے دن پروفیسر نے آکر پڑھنا شروع کیا اور ابھی اس نے بورڈ کی طرف متوجہ ہی تھا کہ گھنٹی بجی اور آواز آئی ٹن ٹن ٹن ٹن... لیکن اس نے پلٹ کر دیکھا تو اجتماع بالکل خاموش تھی پروفیسر نے جھانک کر کہا یہ کس سے ٹن ٹن کی آواز آ رہی ہے۔ کون گھنٹی بجاتا ہے؟ ایک لڑکے نے جواب دیا "وہ بابا لڑکیوں کی چوڑی ہے اس کے گھٹائیں شاید گھنٹی ہو" پروفیسر نے لڑکوں کو کھڑا کر کے ساری کلاس کے لڑکوں کی تلاشی اپنی شروع دی اور غصہ میں کہا "یہ بکری اس وقت چرتی ہے جب میں بورڈ کی طرف لکھنے جاتا ہوں" نیچے اندر تلاش کرنے کے بعد جب پروفیسر کو گھنٹی بجی تو وہ سر ہٹھکراتا ہوا اپنی کرسی پر جا بیٹھا اور کچھ کے لیے پھر پڑھنا شروع کر دیا۔ چند منٹ کے بعد وہ بورڈ کی طرف گیا تو گھنٹی پھر بجی ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن... پروفیسر نے ڈر لڑکوں کو لڑکوں سے ہارنے کا حکم دیا اور کھڑا کر کے ان کی جانے تلاشی کی۔ لڑکوں کو دوبارہ دیکھا مگر اسے کہنے دیکھے۔ لڑکوں کے نیچے دیکھا۔ مگر کچھ نہ ملا بلکہ بالکل خاموش تھے۔ پروفیسر حیران تھا۔ غصہ سے اس کا منہ لال تھا مگر ضبط کرتے ہوئے وہ ہمیں بیٹھ جائے گا۔ اس کو کچھ نہ کہہ سکا اس نے دوبارہ کچھ شروع کیا اور جب پلٹ کر دیکھنے کے لیے گیا تو اس قدر ڈر لڑکیوں کے گھنٹی بجے کی آواز آئی ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن... اس نے پروفیسر کی حالت اکیلے ہی مجھے کس شے کے اندر متوجہ جو پھر جس کی ملائی تو دوبارہ لڑکوں کو کچھ پھر دینا چاہتا ہو۔ مگر وہ بابا ساری طرف متوجہ نظر آئے دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں کالج کی گھنٹی بج گئی اور وہ اپنی کتاب لے کر چلا گیا۔

تیسرے دن ہم جہاں کہہ دوسرے کمرے سے آکر اپنے کمرے میں داخل ہوئے تھے تو پروفیسر پہلے ہی دروازے میں کھڑا تھا۔ باری باری اس نے تقریباً تین منٹیں لڑکی کی چھٹی طرح سے تلاشی کر انہیں اندر جانے کی اجازت ہی جب سب لڑکے اندر آ گئے اور پروفیسر کو کچھ نہ ملا تو وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارے کمرے کے باہر کچھ کے تین باجر چڑی چڑک رہے ہیں۔ پروفیسر پھلنے کے لیے گیا تو پھر گھنٹی کی آواز آئی اس نے پچھلے کمرے کو بلا کر پچھلے کمرے کے کمرے کے کمرے کو بلا کر لڑکیوں کو کہہ نہیں۔ چوڑی چلے گئے تو پروفیسر کو کچھ لڑکی پڑھ گیا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ چند منٹ کے بعد اس نے جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرے عزیزو! یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے... مجھے یقین ہے کہ گھنٹی تم ہی میں سے کوئی بجانا ہے یا اس میں ہے گھنٹی کس طرح جیتی ہے۔ اگر تم لوگ یہ نہیں جانتے کہ یہ کس میں پڑھاؤں اور میں میری صورت ہی سے غصہ سے نہیں مل سکتا لیکن حق جاننا چاہتا ہوں کہ یہ شہرت کون کرتا ہے میں خدا کی قسم کہ میں اسے نہیں لکھتا شہرت کرنے والے کو کسی قسم کی سزا نہیں دوں گا اور میرے دل میں اس کے خلاف کبھی بغض نہ ہو گا۔ بڑے میں سے سوس روپے کا نوٹ لال کر میرے ہاتھ سے ہونے اسی نے کہا "مگر میں نے اسے غم دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے تمہیں ایک پروفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست کی حیثیت سے کہا ہے۔ کلاس میں چند منٹ کا خاموشی رہی۔ لڑکے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں ہنسنا ہوا "کچھ پروفیسر کے پاس گیا اور اپنی گڑھی اٹھا کر اس کی میرے ہاتھ سے جس کے لیے سے شہری کا وہاں میں چھوٹی سی گھنٹی دنگے ہی تھی۔ پروفیسر نے لڑکے کو میرے ہاتھ سے لے لی۔ اور اپنے سر کو دھرا لے رہے کہا "اچھا بیٹوں! جانتے ہیں اسے ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن... کلاس ایک دفعہ پھر غم میں سے گونج اٹھی۔

فادق علی خاں

کلامِ شاد

مرسلہ آنریبل شیخ سر عبد القادر سابق مدیر ”محرران“

میرے ایک دستِ ترمیمی سرانِ صاحبِ شادی۔ اے ایل سایل بنی ہیں جو آج کل ہمدیاں میں سب ج ہیں۔ وہ اردو کے قدردان ہیں اور اردو غزلِ خوب کتے ہیں مجھے اُن کا کلام سننے کا اتفاق ہوا تھا میں نے یہ دو جزیں اُن سے آپ کے رسالہ ہاؤس کے لئے مانگ لی تھیں۔ ارسال خدمت ہیں روہام آپ کا مقصود عبد القادر ہاؤس۔ ہم آنریبل سر عبد القادر کے مضمون ہیں کہ انہوں نے شاد صاحب کی یہ رشتہ غریب ہاؤس کے لئے حاصل کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

(۱)

آسمان بھی تو آسمان نہ رہا	برق چمکی جب آشیاں نہ رہا
دل کا جلنا کبھی نہاں نہ رہا	شعلے نکلے اگر دھواں نہ رہا
کوئی عنوان دستاں نہ رہا	ضبط بھی داخل فغاں نہ رہا
بوستاں ہے وہی مگر صیاد	بوستاں اب وہ بوستاں نہ رہا
دل مرا یا ترمی نظرِ ظالم	کون نشترِ قریب جاں نہ رہا
کیا قفس بھی قفس نہیں اپنا	آشیاں خیر آشیاں نہ رہا
دل کو اچھا کب امٹا ڈالا	اب کوئی رازِ دیریاں نہ رہا

سَمے کی پکار!

بھوک کے مارے ہند کے پیارے تو بھی ہے اس دُنیا کے اندر
 تو بھی خدا کی زمیں پہ بسا ہے تجھ کو بھی چاہئے خود اپنا گھر!
 سامنے اپنے حقوق کے اڑ جا دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!
 رزق پہ تیرے یہ پہرہ کیا کیوں نہیں راحت تجھ کو میسر
 ہے یہ سے کا تقاضا تجھ سے کیوں نہیں سب کی طرح تو خود سر
 دُور ہے کیوں تو اپنی خودی سے دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!
 اپنے وفار کے بل پہ کھڑا ہو سب کو دکھا دے ضبط کے جوہر
 کھول رہا ہے خون بدن میں جی کو سنحال لے دل کو قوی کر
 سامنے عزم کے سُن نہ کسی کی اپنی کے جا موت سے مت ڈر!
 دیکھ قدم تھرائیں نہ تیرے عزم ہے تیرا جان سے بڑھ کر
 اب تو سَمے کی پکار یہی ہے خود ہی خدا بن خود ہی سمیہ
 سُن نہ کسی کی اپنی کے جا دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!

خوف کے بادل گھور رہے ہیں جیسے بھیاں تک بھوت ڈرائیں
 ضبط کی آنکھ سے دیکھ لے تو گر ہو کے غبار ہوا ہو جاؤں
 دیکھ جھبک نہ ذرا بھی کسی سے ————— دل کو قوی کر موت سے مت ڈر
 توپ کے گولے بم کے دھماکے اپنی ہی موت کے آپ نشان ہیں
 جسم تو جسم سے ٹوٹ سکے گا رُوح کے آگے سب فیضواں ہیں
 جی کے مرے اور مر کے جئے تو ————— ضبط سے کام لے موت سے مت ڈر
 پھونک دے صورِ بگل کو بجائے جیتے ہوئے مردوں کو جلا دے
 نام گھنڈ کا جاگ سے مٹا دے خاک میں دھن کے ٹھٹھے ملا دے
 توڑ دے ظلم کی بنجیلِ دل کو ————— دل کو قوی کر موت سے مت ڈر
 آنکھ نہ پھیر حقوق سے اپنے چھوٹنا حق سے ہرجی سے گزنا
 بل پر اسی کے ہے قوم بھی قائم خود کشی خود ہی نہ چاہئے کرنا
 بھوک کے مارے ہند کے پیارے ————— دل کو قوی کر موت سے مت ڈر
 تجھ کو قسم سنت تنو کی ہنرِ دوا جوش میں لا پھر شکتی ساگر
 تجھ کو قسم توحید کی مسلم! قوم میں وحدت پھر سے بپا کر
 ضبط سے کام لے اصدقِ اپہ اڑ جا ————— دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!

سید مقبول حسین احمد پورسی

لے دے دے سنی فقیر۔ سنی کی رنگیں۔ نگ دیاں دھیر۔
 لے ست تواسنی ہر حقیقت۔ جوہر صدق۔ ذاتِ مطلق۔ اکھڑیں۔

غالب اور بیدل

غالب کے بہت اچلی افشار عام طور پر لکھتائی سے نگران ذکر دیے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان کا شعرا و پارہ پادہ نہیں ہے اس لئے غالب کے تمام نفا و دوس میں سے کسی نے بھی شاعر کے کلام کے ان جتنے کو تنقید کے ساتھ عرض بحث میں لانا ضروری نہیں سمجھا۔ اور اس نالوجہ ذہنی افتادہ کا مطالعہ کرنے والے کے لئے عریضی کا کلام اس اہمیت رکھتا ہے۔ جس پر حقیقت مختصر طور پر بیان کو نیا کہ ”شرع شرع میں مرزا غالب نے بیدل کے انداز کی تقلید کی“ غالب کی اولیں اور چوتھی شعرا و عقیدت کی شجہ کا حق ادا نہیں کرتا۔ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے اس موضوع پر ذیل میں بہ وضاحت بحث کی ہے۔ انہوں نے بتلایا ہے کہ غالب نے دس سال کی عمر میں مجاہد کے بجائے بیدل کو اپنا روحانی اُستاد کیوں اور کبھی طرح بنایا۔ بیدل کے انداز کی خصوصیات کیا ہیں اور یہ خصوصیات کس حد تک غالب کے ابتدائی کلام میں منعکس ہوئی ہیں۔ نیز مندرجہ طور پر غالب اور بیدل میں کیا اشتراک و امتیاز ہے۔ یہ بحث دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے حصے میں اجمالاً جیسے شائع کیا جا رہا ہے، غالب کے عریضی کے اشتراک و بیدل کے عام انداز کلام کے عمومی عناصر کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں فردوسی کے ہاویں میں شائع ہوگا، غالب اور بیدل کے مندرجہ اشتراک و امتیازات کی تشریح کرے گا۔ تاہم اس بات کا خاص طور پر یاد رکھیں کہ متبادل ذیل میں غالب کے کلام کا وہ نہایت ابتدائی حصہ زیر بحث ہے (ماں طور پر) ملامت ”کا نام دیا جا تا ہے۔ سن ۱۸۵۷ء تک پہنچنے پہنچنے غالب نے بیدل کی تقلید ترک کر دی تھی اس لئے غالب کا پچھلے کلام اس مقالہ میں۔

حامد علی خاں

ایک مرتبہ صابجہ از بحث ہے ۹

اور رنگ زیب عالمگیر کا سال وفات جس طرح ہندوستان میں اسلام کی سیاسی طاقت کے زوال کا نقطہ آغاز ثابت ہوا اسی طرح فارسی زبان میں مسلمانوں کی مسند اہلی زبان کی حیثیت سے دراصل عالمگیر کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ عوام نے تو غالب شاہ جہاں کے عہد ہی سے روزمرہ کی بات چیت میں اردو لیا اس زمانے کی مہم لکھنے کے سلطان ”ہندی“ کا استعمال شروع کر دیا تھا لیکن کم از کم سلاطین تک بادشاہ اور شاہی دربار میں گھٹکڑ کرتے تھے۔ اور رنگ زیب کی وفات سے کچھ عرصہ بعد بادشاہ و اُمراء نے بالاجت اور وہیں گفتگو کرنے کی طبع ڈال دی۔ جس سے پہلے شاید محمد شاہ رنگیہ نے اس ”طیر سرکاری“ طریقے پر اردو کی سرپرستی شروع کی یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے پانچ تخت اور اس کے فوج میں اردو کی کافاز محمد شاہ کے عہد سے بڑا چنانچہ دکن نے دکن سے آکر چند ہی سال میں اپنے ”مہینے“ ہندی ”غزل گائی“ سے دلی کو مرکز کر لیا۔

دل دلی کا لے لیا دلی نے چھین جا کے کوئی محمد شاہ سول

جب دربار میں اس نئی شاعری کی تدرافزائی ہوئی تو دلی کے گلی کوچوں نے اس سے نہیں بڑھ چو کہ اس کا غیر مہتمم کیا۔ اس لئے جب حکومت کے چار سال بادشاہ کے بعد وفتش کی وجہ سے غزل گوئی اور سخن نبی کے لئے خاص طور پر سازگار بنے۔ بعض ملاحین

سے ظاہر ہوتا ہے کہ سخت نشین ہونے سے قبل عالمگیر اچھے شعر سے لطف اندوز ہونا اپنے لئے باعثِ عارضہ سمجھتا تھا تاہم اس وقت بھی شعرو شاعری سے اُس کے ذوقِ عمل اور جوشِ تعوی کی بیزاری اس حد تک معروف ہو چکی تھی کہ اُس کے ہفتہ بہ ہفتہ بارگاہِ اس کے سامنے اپنے شاگرد کمال کا انہار اپنے لئے ذریعہٴ عزت نہیں سمجھتے تھے۔ اُس کے آیامِ شعر ادبی کا واقعہ ہے کہ ایک فدا خانے شکار میں جب تو اب مائل خاں نے اپنا شعر اُس کے سامنے پڑھا :-

عشق چہ آساں نمود، آہ چہ دشوار بود ہجر چہ دشوار بود، یا رچہ آساں گرفت !

اور عالمگیر نے اس شعر پر دیک و دیک و دیک کرنے کے بعد پوچھا کہ کس کا شعر ہے؟ تو مائل خاں نے جواب دیا: "ایک ایسے شخص کا جو بنگالِ حضور کے سامنے شاعر کے نام سے موسوم نہیں ہونا چاہتا۔" تقریباً نصف صدی بعد جب صاحبِ "مرآۃ البیہار" نے عالمگیر کے عہدِ سلطنت میں اپنا تذکرہٴ شعرا مرتب کرنا شروع کیا تو دورِ عالمگیری کے آغاز کی تصویر ان دلچسپ الفاظ میں کھینچی :-

"اُس کے دورِ عدل کی ہیبت سے حسینوں کا خال کا فزائش محرابِ ابرو میں مصروف نماز ہو گیا اور اس کے

مکملہ قضا کے دبدبے سے خوش حالوں کے غمزہ خوں ریز کو مجھ پر چشمِ چل نہیں ہونا پڑا۔"

یہ حد کثی پوری نصف صدی تک جاری رہی۔ آخر ۱۸۷۷ء میں اس پنجاہ سالہ سکوت و دھجور کا عمل شروع ہوا۔ رنگیلے پاپا اورنگ زیب کی وفات کے بارہ سال بعد میر تقی میر کی سلطنت ہوئی اور انہوں نے گزشتہ نصف صدی کی قاعدہ شناسی، ادوارِ نوازیوں کا ظلمِ غفل کھول کر توڑا۔ عوام نے قدرۃً بے حد جوش و خروش سے دلی کی شاعری کا خیر مقدم کیا۔ ساٹھ ستر سال کی پابندیِ نظم و ضبط کی وجہ سے ان کے جذبات اپنے اظہار کے لئے گھبرائے ہوئے تھے۔ دلی ایک نہایت مزدول نفسیاتی موقع پر دلی میں وارد ہوا اور اُس نے ان کے بے جا جذبات کے لئے ایک بے حد دلپذیر ذریعہٴ اظہار عیاں کیا۔ نئی زبان کی شاعری جس سرعتِ مقبول ہوئی اُس کی تہ میں یہی راز تھا اگرچہ اس عہد کی نئی شاعری کی روش بھی شاید ایک حد تک اس انقلاب کی ذمہ دار تھی۔ بہر حال بحیثیتِ گہنی کی مقبولیت کی رفتار نہایت حیرت انگیز ثابت ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹھارویں صدی کے وسط تک اردو کی حیثیت بجا ناطہ ایک دلی زبان کے قطعی طور پر قائم ہو گئی۔

دلی اور اُس کے متقدّمین لادلی حیثیت سے گویا اردو زبان کی تخلیق کر رہے تھے۔ اس لئے قاعدہ ان کی توجہ زبان کے مانجھے اور دُر میں فارسی کے متبادل کے اسالیب ظاہر فرما رہے تھے۔ بہت زیادہ مبذول تھی۔ زبان و بیان کو زیادہ ہیبت دینے کی یہ روایت تیسرے دور کے قحط سے انیسویں صدی تک قائم رہی اور اس کا منطقی نتیجہ ذوق کی شاعری کی صورت میں سرورِ نوازا جس کی غزل میں حسن و صفائے بیان اور تصنیف سے میں شکوہ الفاظ و قدرتِ کلام بجائے خود ایک قیمت رکھتے ہیں، خواہ ان کی تہ میں کتنا ہی کمزور خیال یا جذبہٴ کمبول نہ ہو۔ اس کے برعکس اٹھارویں صدی کے سچے بڑے شاعر عین کمال فن یہ ہے کہ اس کے کلام میں جذبے اور انہار کا نہایت لطیف توازن قائم ہے اور اس کے بہتر اشار میں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے ان دونوں میں سے کسی ایک کو غیر متناسب اہمیت دی ہے جب انیسویں صدی کا آغاز ہوا تو نثرینِ ریختہ کے کئی سال اُتار دیر کے شاعر اہم کمال کے صدقے میں سادگی اور سادگی کے متعلق دلی کی قیادت کی ہوئی روایت اردو

ادب کی دنیا میں کامل طور پر تسلیم کی جا چکی تھی۔

اُردو شاعری کی اس فزونیہ روحانییت کے ساتھ ساتھ ایک اور ادبی مسلک بھی موجود تھا جس کا اندازہ اُردو کی سلامت روی اور سلامت پسندی کے بوجہ تعین رکھتا تھا۔ یہ فارسی کے متاخرین شعراء کا مسلک تھا جس کے مطابق سخن آرائی میں تخلص، سہیزنا، گزلیاں اور عدت طرازی، میاں کمال بھی جاتی تھی۔ فارسی شاعری اب اپنے دورِ سادگی کو عرصہ بڑھا چھپے چھوڑ چکی تھی اور گزشتہ صدی سے درہل اپنے صنعتِ ذوال کی اُس منزل میں نل رہ چکی تھی جسے مغربی فن کی اصطلاح میں "rococo" کہا جاتا ہے۔ اُردو میں اس کیفیت کو مٹانے کے لیے لکیر کیا جائے تو شاید وہی مطلب ادا ہو سکے۔ وکی کے فارسی گویا حاضرین میں مرزا عبدالقادر دبیر اور ناصر علی سرہندی اس طرزِ شاعری کے سب سے بڑے استاد تھے

غالب کے تعلق سب سے پہلی بات جو یاد رکھنی چاہئے یہ ہے کہ اُس کا سلسلہ نسب براہِ راست فارسی گوشتا سے ملتا ہے۔ وکی اور تیر کی نسل سے، کم از کم اپنے پہلے دور میں، اُسے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُس کے ابتدائی اشعار دیکھے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُسے قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ تیر کے نام کا بھی کوئی شخص ہو گا۔ رہے محمد شاہ کے عہد میں فارسی اور ہندوستانی ادب کے درمیان جو طبعِ قائم کی گئی تھی اور جسے اسی نوسے سال کی شاعرانہ کاوشوں نے ناقابلِ مجبوریت تک پہنچا کر دیا تھا، غالب اپنے طور کے ساتھ ہی باخلافت اُسے اپنے کلموں میں صرف نظر کرتا اور رنگِ زیب کی وفات کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۸۵۸ء میں، وہ ایک صدی کی اُلٹی زندقہ لگا کر وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں علامہ غائب کے حقدار آخر کے شعرا کھڑے تھے۔ ریختہ گوشتا نے فارسی سے لے کر عربیہ الگ الگ زبانیں سیکھیں اُسے نہیں آتا۔ وہ اُردو میں شعر لکھتا ہے مگر اُردو اور فارسی میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ درہل محمد شاہی دور کے بعد پہلے مرتبہ اُردو کے ایک شاعر نے یہ کوشش کی کہ دیکھنے کی ایک صدی کو فراموش کر کے براہِ راست فارسی سے رشتہ جوڑنے کا ڈھنگ نکالے اور ریختہ گوشتا کی روایات سے قطع نظر کر کے فارسی شعرا کے دوشِ بدوش کھڑا ہونے کی کوشش کرے۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس کا بار برونہن ممکن نہ تھا اور اس کا اقدام کوئی ناخبر کار اور بے مدبر چوش نوجوان ہی کر سکتا تھا۔ وہ شاعرانہ روایت جو ایک سو سال کی سخن پردازوں کا حاصل تھی، ایک طفلِ نازِ نودہ کار کی مذہبیانہ لٹکا کو خاموشی سے نہیں سن سکتی تھی، چنانچہ غالب ۱۸۵۸ء میں پولیس کی طرح غالب نے بھی اپنے اس وائر لوسے معرکے میں فیصلہ کن شکست کھائی اور اُپشاور دوشِ بڑی حد تک بدل ڈالی، لیکن اس شکست کے باوجود نوجوان شاعر کا سرِ غرور اُردو کے سامنے بالکل ٹھیک نہیں گیا۔ ندی سے جو گری روٹھا تھا، نہایت اُس کو تھی وہ اپنے انداز کے لئے مضبوط ہی جس کے باعث وہ اور پانچ چھ برس تک مختلف اطرافِ جوانی میں اپنے پتے پھیلنے سے بے بسی بیکار رہا۔ اس مدت کے خاتمے پر یعنی ۱۸۶۱ء کے قریب، مسعود ذکی اس وقت تخلص سے تنگ آ کر اُس نے اپنی عینِ جنتیل ریختہ گوشتی کے میدان سے ایک حسرت آمیز انداز کے ساتھ بظاہر ہمیشہ کے لئے پھیر لی۔ یہ عہد آخر تک قائم رہا کہ تقریباً تیس سال بعد یعنی ۱۸۸۵ء میں دوبارہ بادشاہ کے ساتھ تعلق قائم ہو جانے پر غالب نے دوبارہ اُردو میں شعر کشا شروع کیا اور اگلے ہی میں ہی تبدیلِ شہر انداز جاری رکھا جو غالب کی شاعری کے پہلے اُردو دور کے دیگر کئی تخلص کے تعلق مجھے ڈاکٹر تیرتھو علیہ السلام اور شیخ محمد کمال سے شدید اختلاف ہے مگر اس کی شرح جو مسیحا

تفصیل کی محتاج ہے، یہیں کسی اور موقع مجھے لے آنا رکھنا ہو گا۔

گردوقی اصحاب نے اشعار میں فارسی اضافوں کے مسرفانہ استعمال کو غالب کی پیروی سمجھ رکھا ہے۔
 لو کہیں میں مرزا غالب کے تخیل اور وقت بیان کی ناکجنگی بہ ہر نوع مسلم ہے لیکن دور اقل میں تبدیل کے ساتھ ان کی مماثلت اتنی سطحی اور
 اتفاقی بھی نہیں ہے معنی عبارت مافوق کے حصہ آخر سے مترشح ہوتی ہے۔ میری رائے میں تخیل کے ایک بنیادی عنصر کا اشتراک اس امر کا باعث
 ہوا کہ شروع ہی میں (تیسرے کے بجائے) تبدیل کے کلام نے غالب کو اپنی طوف کھینچا تخیل و تجزیہ غالب کے تخیل کا ایک ایسا مستقل لازم ہے کہ
 تبدیل کے خاص اسلوب بیان کی تقلید ترک کر دینے کے بعد بھی اسے ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بالکل درست ہوگا
 کہ جس متنک شعر کی محض فنی کیفیتوں (مثلاً انتخاب نشست الفاظ اور شبیہ واستعارہ کی ساخت) کا تعلق ہے غالب کے ابتدائی اشعار اور تبدیل
 کے کلام کے ایک بہت بڑے حصے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس مشابہت کی شرح میں یہاں کسی تفصیل سے کرتا ہوں۔

دنیا میں شاید کسی قوم کا ایسا بیان نہیں جس کا آغاز نظم سے نہ ہوا ہو اور یہ نظم ابتداء سا کی خیال سے متنازع نہ رہی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ
 ابتدائی دور میں شاعر کو کسی جذبے یا خیال کے تجربے سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ اس کے واضح اور نمایاں پہلو کو حیثیت ایک غیر منظم کل کے
 دیکھتا ہے اور الفاظ میں اسی کی تعبیر کرتا ہے۔ اور بے ارتقا کے ساتھ تخیل کی یہ ترکیبی کیفیت گھٹنے لگنے لگتی ہے۔ چنانچہ نشوونما ہوتی
 ہے جو تخیل و تجزیہ کا مخصوص ذریعہ اظہار ہے اور خوشحال کی جگہ بھی اشیاء و واردات اور جذبات و خیالات کے عملی پہلوؤں پر زیادہ اطمینان
 ہے۔ الفاظ دیگر اس دور میں بدیہی حقائق کے بجائے نکات کے بیان پر زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ سعدی و حافظ اور عرفی و غالب کی غزلیات
 میں ترکیبی اسلوب بیان کا عروج و زوال بڑی خوبی سے نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ مولانا حالی نے مقتدر دیوان میں سعدی، حافظ اور غالب
 کا ایک ایک شعرو یا ہے۔ تینوں شاعروں نے مصیبت و ابتلا کی تصویر ایک بھری نشیب کے ذریعے کھینچی ہے لیکن تینوں تخیل و تجزیہ کے
 عنصر میں تدریج اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔

سعدی

آسودہ کہ برکنار و دیار است / از وسطہ ما خبر ندارد

حافظ

شب تار یک دیم مروج و گرد لپے چسپین حاصل / کجا داند حال با کساران ساحل

غالب

ہوا محال و شب تار و بحر طوفان خیر / گشت لنگر گشتی و نا خدا خفت است

فارسی شاعر کی کسادائی دور میں تخیل کی ترکیبی ہیئت نہایت وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً رودکی کا جو مشہور قصیدہ امیر
 غفر کی ہے جسے سب سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے، اس میں شاعر نے اپنے ہر شاعر کے امتحان پایا جاتا ہے اس کو کبھی شاعری سے منسوب کرنا بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جس طرز
 بیان کو ہم سامنے لایا ہے اس میں شاعر نے اپنی طرز ترکیب کو ملحق ہوتا ہے لیکن یہ عمل غالباً بعدائی ہے۔

دوبہ داند و بالید و آشیال گشتہ در انتظار بہا دام چید ہم سنگرا
 بیدل کی تشبیہات و خیالات میں یہ تخلیقی انداز بے حد نمایاں ہے۔ مثلاً حیرت میں استقامت کا جو پہلو پایا جاتا ہے، اس کا تجزیہ کرتے
 ہوئے وہ اپنے مخصوص طرز بیان میں آنکھ کو کان سے مشابہ قرار دیتا ہے
 حسرت کین مرثوہ اصدیت حیرتم چشم بہم نیامدہ گوشن فناء الیت
 ایک نسبت تشبیہ ہے

کشم سر ز پستی کہ آواز آب ترقی بہ قدر نازل کند
 اس تمام بحث سے حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ ترکیبی اور تخلیقی شاعری میں کس نوعیت کا فنی قلم ہے تخلیق کی یہ تخلیقی کیفیت
 اگرچہ تمدن کی ترقی اور مزید معاشرت کی تدریجی نفاس و اتفاق اور سایہ علم و حکمت کے اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے لیکن اس کے برعکس
 تہذیب و تمدن اور طرز زندگی تخلیق نفاسوں کے ساتھ ہی لازماً تخلیقی شاعری کا فروغ نہیں ہوتا۔ اس طرز بیان کا غور تمدن کے ارتقاء
 علاوہ ایک خاص شعور اور ادب کے ارتقاء کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں عہدِ غنیہ کا تمدن ایک طرف تو تیرھویں صدی کے
 شعراء سے اس قسم کے اشعار لکھو اچکا تھا

تاک را سیراب کن اسے ابر نیباں در بہار	قطرہ تائے می تواند شد چرا گوہر شود ؟	(دانش)
آہنا کہ بہ قتل از تو نشان می طلبیدند	پیراہن متاب نمودند کتا نما	(فرجی)
از بابل صدمت ز بند راہ احوال دروں	حل عقد موئے معنی شاد کے اندک حصیت	(سوزی)
دل غم دیدہ دارم پیرس از گرد گفتا	صدادر کوہ چوں رگ ماندہ از سنگینی آہش	(نامرعلی)
شب عید از خیال ابرویت گر بہ فلک بینم	بداعلم ہنرمین گروں غلہ چوں نیش عقربہا	(شافعی)
نشہ آئینہ کیفیت ماطس ابر آرائی	نہاں ماندیم چوں معنی بچمنیس لفظ سپدائی	
بہ نفلت ساخت دل تاوار ابد از غیرت امکاں	بہامی سوخت ایں آئینہ گرمی داشت بینائی	(بیدل)

اور دوسری طرف اسی تمدن نے ریختہ گوئی کے آغاز میں دل کی زبان سے کیفیت ذیل کے اشعار کہلائے، اسے

بتہ لب کی مصفت لعل بخشش سے کھل گ
 مادہ ہے ترسے نہیں غزالاں سے کھل گ
 زنجی کیا ہے مجھ تری پھول کی انی نے
 یہ زخم ترا خنجر و جالال سے کھل گ

یہ ایک لہجہ ہے جس سے کہ بیدل کے دوا و شعر و جذبیہ تیرہ تک پہنچے ہیں اپنی گلوں، شادمانہ انداز بیان کی معنائی کے لحاظ سے خود بیدل کے عہد کے تیرہ کے بہترین انداز کی یاد دلاتے ہیں۔
 معروضہ معنیاد ہے اور بیدل کے بعض غزلے بے غوی سے بے بہت فنی مشابہت ہے۔ پھر بھی بیدل کے وہی انداز کی بہا و پایاں بیان باطل نظر نہیں آتیں۔ محنتان شریفین
 یہ دونوں شاعرانہ تیرہوں ہند ہیں۔ ست پچھوں کی باتیں وہ دل کی کماں سے ہم ہیں + معنی غم فانی کا مائل کماں سے ہم ہیں
 جب دل کی آستین پر حلقی کئی کر پکا مارا + پرے سے یاد دلا بیدل کماں سے ہم ہیں

رہنے کا یہ ترکیبی انداز بیان انیسویں صدی کے آغاز تک قائم رہا جب نگاہ غالب نے اپنے بازوئے ناز و نوک کی پوری قوت سے اس کی سچ و بنیاد پر وار کیا اور فارسی کے دور آخر کی تخیلی روایت کو رستے کے دور اقل کے ساتھ جبر وادینا چاہا۔ عائد کی طرح تیر کے ترکیبی تخیل کے ساتھ بھی دور تخیل کی سرحد اٹھی ہے لیکن بڑی حد تک وہ کی کی قائم کردہ روایت کا پابند ہے تیر کی واقعہ نگاری کا نہایت معنائیہ یہ ہے کہ ابراہیم مٹھا کعبے سے اور محبوب بڑائے خانے پر! بادہ کشوں کا مجرث بیگاشیٹے اور چپا نے پر تشبیہ کا پاکیزہ ترس انداز یہ ہے

کہانیں نے گل کا ہے کتنا ثابت! کلی نے یہ سن کر تیرم کیا!

اس کے خلاف غالب شروع سے آخر تک اپنے اردو اشعار میں جا بجا اپنی تخیلی مناسبت طبع کا ثبوت دیتا ہے

از مزنا تیر ذوق دل و دل ہے آمنہ طوطی کو شش جہت سے متاہل ہے آمنہ

رہے اس رخ سے آرزو ہم چندے کھنکے تخلص بر طوطی تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

دیکھتا تیر بر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ میرے دل میں ہے

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تیر کھینچے کیا؟ ایسی تو تخیلی کام و دہن کی آزمائش ہے

ان چاروں شعروں میں غالب کی عمر کے چار مختلف منازل کے مطابق اس کے تخیلی تخیل کی تمام تبدیلیات نمایاں ہیں۔ لاکھن کی ناچکر آج بیاہی نظر، معنویان شباب کی رنگینی جذبات، انتہائے بلوغ کے زمانے کی پختگی خیال اور آخر میں بڑھاپے سے کچھ پہلے کی مشافہت و تیرت کلام کے ساتھ ساتھ تجربہ و تخیل کا انداز ہر جگہ قائم ہے لیکن جہاں تبدل کے تخیلی طرز خیال کا موضوع فلسفہ و اخلاق کے مسائل ہیں وہاں غالب فلسفہ و اخلاق کے علاوہ نفسیاتی نکات کو بھی اپنی تجربہ کے میدان میں آتا ہے بلکہ نفسیاتی تجربے سے آگے بڑھ کر کہیں کہیں تخیلی نفسی کی سرحد تک جا پہنچتا ہے چنانچہ مندرجہ بالا چار شعروں میں سے تیسرا شعر اس طرز خیال کی ایک مثال ہے۔

لیکن نفسیاتی تجربہ یا نفسی تخیل بہت بعد کی باتیں ہیں۔ دور ازل کے کلام میں جب تبدل کی تغذیہ غالب کے لئے سرکاری نوازش تھی نفسیاتی تجربے کا صوف ایک ڈھنڈلا سا آغاز نظر آتا ہے۔ لاکھن کے ان اشعار میں غالب کو زیادہ تر محض معنی (Concrete) واقعات کے تجربے سے سروکار ہے۔ تخیل جذبہ و خیال کی منزل تک پہنچنے کے لئے اسے ابھی اور چند برس لینے ہیں۔ ابتدائی دور کے تخیلی واقعات کا انداز یہ ہے کہ اسد جاں نذر الطاف نے کہ ہنگام ہم آغوشی نایاب ہر سر مرثو حال دل پر سیدنی جانے یہاں شاعر ہم آغوشی محبوب کو محبوب کی وہ بڑی سے بڑی نوازش قرار دیتا ہے جس کے ذریعے سے محبوب کے بدن کا نواں رُوحاں بر زبان حال اس کے دل کی کیفیت اس سے پوچھ رہا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے

اے غشا و حلقہ! کہ اتنی یک مٹاں واکرے تار و پود فرشتہ مثل نبیہ مینا کرے

مطلب یہ ہے کہ دور ساز کی ایسی فراوانی ہو کہ ایک سراجی نے کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کھلتی چلی جائے۔ فریت یہاں تک

آئے کہ بادہ کشوں کے فچے پنجہ دینا کا فرش بچھائے۔ ایک اور جگہ زمین میں دبے ہوئے بیج کا تعلق تختہ لالہ خزانہ آکے ساتھ پر ہی ٹوٹا گاؤں کے بعد ثبات کیا ہے۔ پاتال کا یہ پانی برس برس کر اوپر کی مٹی تک پہنچا ہوا ہے اور دوسری طرف بیج نے اپنے ننھے ننھے ریشے اس طرح نیچے کو پھیلا رکھے ہیں جس طرح کسی نے کنویں میں ڈول ڈال رکھا ہو۔

بلکہ زیر خاک با آب طراوت راہ ہے ریشے سے سرسبز کا ڈول اندرون چاہ ہے غالب کے تخیل کی یہی پہلی کیفیت ہے جس کی وجہ سے اُسے بیدل کے ساتھ ایک نسبت خدا داد حاصل ہے۔ اُس کی شاعرانہ فکر کے اسی عنصر نے تعمیر اور اُس کے مسکاتے شعرا سے قطع نظر کر کے ابتداء بیدل اور پھر دوسری نظری اور عرفی وغیرہ کی طرف رجحان کیا۔ دراصل کی جن عزلیات میں غالب نے بیدل کے ساتھ ایسا نا اظہار عقیدت کیا ہے ان میں سے ایک میں بصریت یہ بتایا ہے کہ مجھے بیدل کی محبت طرائیاں دیتی ہیں جتنی بخت آفرینیاں خصوصیت کے ساتھ خوب ہیں۔

اسد ہر جاسن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے مجھے رنگ بھرا ایجا دی بیدل پسند آیا لیکن اس قسم کی "بھرا ایجا دیوں" کے لئے بھی ذوق سلیم نے ایک حد نظر کر رکھی ہے جس سے باہر قدم رکھنا ناقابل معافی نہیں تو خطرناک ضرور ہے۔ اس حد کو عبور کر کے ہم "خیال بندی" کے میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں شاعر واقعات اور جذبات کی تشریح کے علاوہ خیالی اور شبی چیزوں کے تجربے سے بھی اپنے ذوق تخیل کی تسکین کا سامان بھرنے لگتا ہے۔ تجربہ جو مابعد الطبیعیات کے بازار کا خاص سکہ ہے یہاں ضمانت کثرت کے رائج ہے۔ بیدل کے یہ چند شعرا دیکھئے۔

تمناش رنگ لبں بے حجاب می بافند بر نے گل ز دریدن نقاب می بافند چشم و اکرم جویش اتا بہ آغوش شرار غوطہ خور دم در دل خواب فراخوش شرار نہ غبار است کرین دشت پر افشاں برفاست ننگ طاقت سوخت اتا دشت آغام ہنوز چشم برفا کتر بال است پر دازم ہنوز مشہم رم طبعیم، بیدل گرا فسر دم چہ باک می زند بر یک جہاں بے طاقتی نازم ہنوز خیال بندی کے یہ تمام مضامین غالب کے دراصل میں موجود ہیں مثلاً وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کی رنگیں یا اسے میری حسرت فراخ کی زینت ہے اور اس مضمون کو اوائل میں واقعی اور خیالی چیزوں کو بلا تکلف ملا دیتا ہے۔

کر کتابے بیا د بے رنگیں دل مالو بس رنگ ز نظر رفت ہٹائے کعب افسوس

لے "خیالی" اور "دہی" سے تشبیہ کی دو مختلف کیفیتیں متعقبات ہیں۔ خیالی "چیزیں وہ ہیں جنکے شے اگرچہ غامض دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن محسوسات کی وجہ سے ہم ان کے تصور تک پہنچ سکتے ہیں جیسے غزل کی بارش، ساکن آہٹ و دھند۔ دہی چیزیں بھی غارت میں موجود ہیں لیکن ہم کم بیش انسان کے قوائے فطریہ کے تحت ہیں جیسے ہرگز، عقائد و فہم۔ خیالی چیزیں محسوسات اور دہی چیزیں محسوسات ہیں۔

اس کے ساتھ بیدل کا یہ شعر یاد آتا ہے :

در یاد عمر رفتہ زلے شاد میکنم رنگ پریدہ بہ خیال آشیانہ است
در اصل اس زمانے میں غالب کا کلام مضامین خیالی سے بھر پڑا ہے اور تقریباً ہر شعر اسی طرزِ بیان کی ایک پیچیدہ گتھی ہے مگر چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

تماشا کردنی ہے انتظار آبا و حیرانی نہیں خیر از نگہ جوئی گستاخِ نریشِ مہلما
ذوقِ راحت اگر احراقِ پیش ہر جوشِ شمع پائے خواہید بہ دل جوئی شکیبہ آوے
پرورشِ نالہ ہے وحشتِ پرداز سے ہے تر بالِ پری مینہ ببلِ ہنوز
بہارِ حیرتِ نظارہ سخت جانی سے خائے پائے جلِ خونِ کشمکشِ ستم سے
خیالِ بندی کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی خیال کے بیان میں متعدد تشبیہات اس طرح سرِ لوٹ کر دی جاتی ہیں کہ لہجہ کا گوش کے مطلب مل نہ ہو یہ شعر دیکھئے :

بیدل : زہشِ آبدام درو طلب گوہر فروش شد صدب گوشِ نقش پا

اسی طرح غالب کہتا ہے :

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی ہرنگِ لالہ جامِ بادہ بر محلِ پسند آ یا

اس شعر کے معرکہ ثانی میں پہلے لالے سے تشبیہ فی سبہ اور پھر خرد لالے کو ایک سافر سے مشابہ قرار دے کر تشبیہ و تشبہ پیدا کی ہے جو خیالِ بندی کا لغزائے امتیاز ہے۔

خیالِ بند شعرا صرف یہی نہیں کرتے کہ اپنے عقلی اندازِ بیان کی بنیاد وہی خیالی چیزوں کے تجزیے پر رکھیں۔ بلکہ یہ تجزیہ معنی کی عقلی مناسبت پر مبنی ہوتا ہے۔ عبد اورنگ زب میں خیالِ بندی منتہائے عروج پر تھی۔ شیر علی خاں لودھی نے اس زمانے میں خیالِ بند شعرا کو چونکہ مرتب کیا اس میں خیالِ بندی کی تعریف یہ کی ہے۔ ”دو ایسے کلمات بلا اشتراک لانا جن میں سے ایک حقیقی ہو اور ایک مجازی۔ دووں میں سے رہ جائے حقیقت و مجاز“ دو مندرجہ متروک ہوں اگرچہ دراصل مراد مجازی سے ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس مجازی کلمے میں کوئی اصطلاح یا لطیفہ یا ضربِ اشل ہو۔ خیالِ بندی کی اس تعریف کے بعد یہ طورِ شرح بیدل کا یہ شعر دیکھئے۔

صافِ معنی کو مستثنیٰ ز در ز صور تم جوں بطائے بالین من عالمِ آبِ می است

یہاں شعرے پوری طرح اُلفت اندوز ہونے کے لئے لفظ ”آب“ کے دو معنی لیے مندرج ہیں، ”صفائی“ اور ”پانی“۔ غالب کا دورِ اقل کا ایک شعر ہے :

آئینِ پا ہوں گدا ز وحشتِ زندان : نہ پوچھ مرنے آتش دیدہ ہے ہر علقہ یاں نہ بخیر کا

یہاں شاعر قید خانے کی وحشتِ تنہائی سے مضطرب ہوا۔ مضطرب ہونے کے لئے دوسرا لفظ آتش زیر پا ہونا ہے۔ چنانچہ آتش زیر پا کی آتش کی مناسبت سے مصرعِ ثانی پیدا ہوا:-

بیدل کا ایک اور شعر ہے

بود سرش در پس بجزوی باریک بینہا زمو انگشتِ حیرانی برب دارند چینیہا
چینی کے بتن میں جو بال آگیا ہے اس سے باریک بینی مراد لی ہے لیکن چونکہ بال آنا دوسرے لفظوں میں بتن کے ٹٹنے کو کہتے ہیں اس لئے ٹٹنے سے درس بجزوی کی تعبیر کی ہے۔ اس بجزوی کا مزید ثبوت یہ ہے کہ بتن میں جو بال آگیا ہے وہ اس کے لبوں پر انگشتِ حیرت کی مثال بن گیا ہے۔

اسی انداز میں غالب کا ایک شعر ہے

ذو چہ سینہ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ کہ زخمِ روزن در سے ہوا نکلتی ہے
یہاں سینے کو بالکنایہ مکان سے اور دل کو دیاسوراخِ دہن کو (روزن در سے تشبیہ دی ہے جس میں سے ہوا (یعنی سانس) گزرتی ہے۔ پھر اسی روزن در کو زخم سے ماثل قرار دے کر زخم کو خطرناک ثابت کیا ہے اس لئے کہ امثلِ طب کے مطابق جو زخم ہوا دینے لگے وہ مملک ثابت ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تیغ نگاہ بے حد تیز ہے۔ ان خصوصیتوں کے علاوہ دولوں مصرعوں میں آب اور ہوا کا تقابل بھی ملحوظ رکھا ہے۔

جب ایک ایک شعریں خیالات کی اس قدر محاورہ تو سمل گئی کی منزل بہت قریب آ جاتی ہے۔ تخلیقی شاعری اور خیال بندی کا انتہائی کمال بلاغت ہے جس طرح ترکیبی شاعری کا انتہائی کمال فصاحت ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ بلاغتِ کلام کے ہی نمونے پسندِ طبع ہوتے ہیں جن میں فصاحتِ بیان کا پہلو بالکل چھوڑ دیا گیا ہو۔ تخلیق شاعری جب اپنے کمال بلاغت سے گرتی ہے تو سمل گئی ہو جاتی ہے اسی طرح ترکیبی شاعری انتہائی معراج فصاحت تک پہنچنے کے بعد اپنے دورِ زوال میں پھسکے اور بے مغز شعروں پر انحصار کر لیتی ہے۔ اور نگ زیب کے عہد میں فارسی کی تخلیقی شاعری خیال بندی کی شکل اختیار کر لینے کے بعد بلاغتِ کلام کی اس منطقی ترویج تک پہنچ گئی تھی جسے اصطلاح عام میں سمل گئی کہتے ہیں۔ چنانچہ صاحبِ مرآۃ الغیال لکھتا ہے:-

”زمانہ حال کے شعراء نے صنعتِ خیال بندی کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے جسے ہر شخص جانتا ہے۔ یہ مشہور نکتہ ہے کہ شاعر کے معنی نہیں ہوتے۔ خیال بند شعراء کے کلام میں صاف اور واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔“

جمل دہلی قدر کا تنقیدی طرز ہی ہو کہ شعرِ غیبی معنی ندارد، اس میں بلاغت کی اس منزل کو وہ شکل (سمل گئی) کا فروغ پانا باعثِ تعجب نہیں۔ شاعری میں پرورشِ منطق یا دستِ دلال خیال بند شعرا کا بڑا کام مرہ ہے۔ بیدل اس فن کا بہت بڑا استاد ہے۔

گر تاملِ نفسِ برینہ طاموس شود در شبتانِ عدمِ نیرِ چراغانِ مست

نہضِ جدمِ شرر کاغذِ آتشِ زدہ است یک شرورِ راہِ اجدِ چشمِ بریدنِ فرستم

نامِ رانفتشِ نگینِ بالِ پروازِ ساست مازِ غورِ فہمِ اگر پائے طلبِ درنگِ ماند

لیکن جب ناکافی توضیح بیان کے باعث ہمارا ذہن شاعر کی پڑیچ دیلِ آرائی کے تمام مدارج کا ساتھ نہیں لے سکتا تو شعرِ معلوم ہونے لگتا ہے، بیدل کے حسبِ ذیل دو شعر دل کو بے معنی تو لیتے ہیں مگر کتنا چاہئے لیکن عالمِ انسانی فہم کے لئے ان کے طلبِ تک پہنچنا بہت دشوار و نرسچ

دانہ مارا کے سچندیں خطِ ساغرِ لیشہ کرد در گردِ استبحمِ عالمے زنا و دشت

حیرتِ دیدہ ام گلِ داغِ بہانہ ایست طاموسِ جلوہ زارِ تو آئینہ خانہ ایست

یہی شانِ اہمالِ غالب کے ابتدائی کلام میں بہت زیادہ کثرت کے ساتھ موجود ہے

خطِ زخیر، اینلِ چشمِ صافی عارضِ لیا آئینے نے حذرِ پر طوطی بچنگِ آخر

آغوشِ گل ہے آئینہ زدہ ذرہ خاک عریضِ بہارِ جوہرِ پرواز ہے مجھے

ہر ذوقِ شوقی اعضا مختلفِ بازِ بستر ہے معافِ پیچ و تابِ کشمکشِ ہر تارِ بستر ہے

لیکن اس قسم کی کئی کئی کے ساتھ بلاغت کی سرحدیں اس طرح مل جاتی ہیں کہ بعض دفعہ دونوں میں تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیدل

میں تعلیمی تخیل کی جدید گیول کے تشبیہ سے ہی نہیں دکھاتا، وہ بلاغتِ کلام کا بھی بہت بڑا استاد ہے اور وسیع مضامین کو صفا عائد چاکہ جیسی

سے دوسرے میں ادا کر سکتا ہے

دیدہ انتظارِ را دمِ امید کردہ ام لے قدرتِ بحشمِ من غادرِ سفید کردہ ام

نغمِ زبندِ لباسِ تلخِ آزاد است بزرگیِ بہرِ مصلحتِ خدا داد است

سب عرفانِ را شرابِ دیگر سے درکار نیست جہرِ طوافِ خوشِ دورِ ساغر سے درکار نیست

غالب کے ابتدائی دور میں اس قسم کی ماہرانہ بلاغت کی جستجو کرنا فصول ہے لیکن اگر غالب کے ایامِ بچگی کے محض اُردو کلام کو

دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ غالب نے فنِ بلاغت کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا اور اس لحاظ سے وہ اُردو کے تمام قدیم و جدید

شعرا کا سرِ تاج ہے۔ مثلاً غالب کا یہ بظاہر سید سا صاحبِ شعر ملاحظہ ہو

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا!

ان چند الفاظ میں حسبِ ذیل نکات ملاحظہ ہوں:-

(۱) خدا کی عبادت کرنے سے بندوں کو بھلا ہوتا ہے۔

(۲) نمرود کی پرستش باعثِ عذاب ہے۔

(۳) میں نے تمام عمر خدا کی عبادت میں بسر کر دی۔

(۴) اور ہمیشہ اُمید یہ رکھی کہ اس میں میرے لئے فلاح کی کوئی صورت پیدا ہوگی۔

(۵) انجام کار مجھے مایوسی ہوئی۔

(۶) اور میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میں نے عمر بھر جس کی پستش کی شاید وہ خدا نہیں، غرور کی ذات تھی کیونکہ غرور کی پستش ہی اس قدر لاعاصل ہو سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی نکتہ طرازی کی توقع بارہ پندرہ برس کے کسی لڑکے سے نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی سنہ ۱۵۷۵ء کے بعض اشتہاروں کا دورِ اول کے لکھے ہوئے میں قیثاً اس پائے کے ہیں کہ انہیں ہل گئی کا نام دینا ظلم معلوم ہوتا ہے۔

خاک بازی اُمید کا رغانہ طغیانی

یاس کو دو عالم سے لب بخندہ واپایا

اسد کو بُت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے

نہاں ہیں نالانا قوس میں نرپردہ یارب

باوجود دل جمعی خواب گل پریشاں ہے

غنی تاشگفتہا برگ عافیت معلوم

اب خصوصیاتِ بیان میں صرف ایک چیز باقی ہے اور وہ خیالِ بندی کی مخصوص تشبیہ ہے۔ اسے انگریزی میں (Gonciat)

کہتے ہیں۔ اردو میں اس قسم کی تشبیہات کے لئے کوئی خاص اصطلاح وضع نہیں ہوئی لیکن اگر انہیں بدائع (واحدہ بدلیہ) کا نام دے دیا

جائے تو شاید کچھ زیادہ غلط نہ ہو۔ عجیب تعلق ہے انگریزی ادب میں بھی خیالِ بندی کی شاعری (جسے وہاں Metaphysical

Poetry کہتے ہیں) سترھویں ہی صدی کے قریب نمودار ہوئی۔ تقریباً نصف صدی کے فضلِ زمانی سے فارسی اور انگریزی ادبِ دونوں

میں جنیبل القدر خیالِ بند شاعر کا ظہور ہوا۔ انگریزی شاعری میں جان ڈن (John Donne) کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ہندوستان

کی فارسی شاعری میں بیدل کو۔ مگر اس اتفاق سے بھی زیادہ عجیب تعلق یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں خیالِ بندی کا ظہور اُس وقت ہوا جب تمام

ملک میں ایک شدید مذہبی احساس کا دورِ دورہ تھا۔ شاید مذہب کے پیدا کئے ہوئے عقلی شعور کو اس کیفیت سے کچھ تعلق ہو۔ بہر حال دونوں ملکوں

میں خیالِ بند شعرا کا یہ قاعدہ تھا کہ اپنے استعارات و تشبیہات کی تمام جزئیات کو سرشتِ تخلیل بناتے تھے۔ اسی طرز کی تشبیہ کو ہم نے یہاں

بدلیہ کا نام دیا ہے۔ جب شاعر پیشِ نظر چیز کو کسی بظاہر غیر متعلق چیز سے مبالغہ آمیز یا بعید از قیاس تشبیہ دیتا ہے اور پھر اُس اہلِ چیراہی تشبیہ

کو نظر انداز کر کے مبالغہ آمیز یا بعید از قیاس تشبیہ ہی کو اصل موضوعِ کلام قرار دے لیتا ہے یا اس تشبیہ کا تقبیہ یہ اس طریق پر کرتا ہے کہ

اُس کا خطابِ تخیل کے بجائے انسانی فہم سے ہو جاتا ہے، اُس وقت وہ بدلیہ نگاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ بیدل کے یہ دو شعر مثال کے طور

پر دیکھئے۔

اشک شمع بود یک عمر آب روان ام
سویقن خرمن کند از حاصل پرواد ام
نخبت سجدہ خاک در آو کرد مرا
آں قدر آب کہ سالان و منوگر دیدم

دور ازل میں غالب کی تشبیہ کا انداز دبیدل کی بدلیہ نگاری کا انداز ہے۔ یہ شعر دیکھئے

رکھا غفلت نے دور افتادہ ذوقِ فاہور
اشارتِ انہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا
ایک اور بڑے صاف شعر ہے

عزلت گزیریں بزم میں دامادگانِ دید
مینائے نئے ہے آبلہ پائے نگاہ کا
غالب کے ان فارسی اشعار میں بھی دبیدل کی بدلیہ نگاری کا اثر نمایاں ہے

دربھر طرب بیش کستابِ وقیم را
مہتاب کعب مارِ سبست شہم را
مختتم زادہ اطراف بساطِ مدیم
گوہر از سفینہٴ حقیقت بر گنجینہٴ ما

بدلیہ نگاری کے ساتھ علم و خیال کا بہت گہرا اور قریٰ تعلق ہے۔ علم و خیال سے علم طور پر یا تو یہ مراد ہوتی ہے کہ شاعر کے فکر کا موضوع زندگی کے بہت بڑے بڑے مسائل ہیں اور یا یہ کہ وہ اپنی تشبیہات سے دو ایسی چیزوں کو ہم ربط بناتا ہے جن میں بظاہر عظیم الشان فاصلہ عامل تھا مثلاً ناخنِ بریدہ کو اشارۃً ابرو سے تشبیہ دینا دو قطعا بے تعلق چیزوں کو باہم منطبق کر دیتا ہے۔ دراصل شعر کا ادعا لطفِ تشبیہ میں ہے جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ دو بظاہر بے تعلق چیزوں میں کسی گہرے اندرونی ربط کا اشعار شاعر اس اشعار کے ساتھ نور و فکر اور استعجاب کا احساس جس حد تک شامل کر سکے گا اسی حد تک تشبیہ عالی یا مضمون بلند ہوگا۔ لیکن ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد اس قسم کے تخیل سے تیز اشعار کی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ طبیعت یا تو بے مزہ ہو جاتی ہے یا شاعر کے تخیل کی آوارگی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے اسی وجہ سے علم و خیال اور بدلیہ نگاری میں بہت ہلکا سا پردہ عامل رہ جاتا ہے۔ چنانچہ بدائعِ طرازی کی انتہائی غیر متناسب صورتوں کے ساتھ انتہائی بلند ہی خیال کے نونے بادشاہ شریک ہو چکے ہیں دبیدل اور غالب کے بدائع میں مضحکہ خیزی کے بجائے طبیعت کی بزرگی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ تیر کے کلام میں بھی بدلیہ نگاری نے نہ نکلا ہے لیکن اس کی یہ بلند پروازیوں دوسرے کے بجائے ہمارے بلکے سے تہمت کا باعث ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس دبیدل کے بدائع بہت پیچ در پیچ اور عیسراظم ہوتے ہیں۔ شکلِ مثنوی کی طرح ان کو حل کرتے ہوئے بھی سر میں درد ہونے لگتا ہے لیکن ان میں جتنا غالب کے دور ازل کے اشعار کو سمجھنے میں کیونکہ ان میں دبیدل کے بدائع کے ساتھ بچوں اور نو عمر لڑکوں کا وہ روایتی شوق بھی منسلک ہو گیا ہے جس کی تشفی صرف پسندیدل اور دیگر بزرگوں سے ہوتی ہے۔

شاعرانہ تخیل کا آخری درجہ یہ ہے کہ حیرت کو اشیائے حقیقی کے برابر اہمیت دے دی جائے۔ یہی بدلیہ نگاری کی منزل ہے۔ جہاں کیفیاتِ اشیاء کو اشیاء سے منسلک کر کے باز پیچ و تخریب و تخیل بنالیا جاتا ہے۔ تیر کی یہی شاعر کا انتہائی تشرنقل مضمون محاورہ بندی اور تخیلِ شاعر کا انتہائی تشرنقل مضمون بدلیہ نگاری ہے۔

دعا

لگا آگ سینے میں سوزِ دروں سے
مری فطرتِ پاک و بیاک یا رب
عطا کر عذابوں کی پرواز مجھ کو
مجھے طاقتِ بالِ رُوحِ الٰہیں نے
جواں رکھ مری ہمتِ کوہ کن کو
سکوں مرگ ہے بہرِ زند آدم
سکھاتی ہے یہ رنگِ آدمی کو
جسے پڑھ کے بے زین و بز دل ہوا
مرے دل کو رکھ نورِ ایساں سے روشن
یہ مہتی ہے چہرِ حقیقت کا پردہ
خدا یا ہو بارغِ سخنِ بارغِ جنت
سخن سے مے نے انہیں سرفرازی
رُلائی ہے خوں مجھ کو ان کی تباہی
مٹے زندگی بھر دے جامِ سخن میں

کہ ان تیرہ بختوں کو نورِ شید کر دوں

چمن زارِ ایمان و امید کر دوں

محمد اکبر منیر

توبہ

اگر شراب کو چھوڑوں بھی آج سے نامح

چراغِ حسن کی لو پر مجھے جلا دینا
 کسی نگاہ سے کچھ بجلیاں گرا دینا
 مردِ تم آتشِ رخسارِ سُرخ میں جل کر
 کروں جو بادہ کشتیِ توبہ بددعا دینا
 کسی حسین کے جادو و فرسوس زانو پر
 سچک کے نیندِ فضا کی مجھے سلا دینا
 گریں جو ساقیِ مہوش کے نرم ہونٹوں سے
 انہیں حینِ نگوں میں مجھے دبا دینا
 مرے نصیب کی مشعل ہو گر کبھی روشن
 تو آبِ غمشہ انگور سے بجھا دینا

اگر شراب کو چھوڑوں بھی آج سے نامح
 الطافِ مشہدی

گلچیں اور شاعر

ایک ہی سُندر پھول ہے جس سے دُولِ اُلفت کرتے ہیں
 درشن کے بیٹھے امرِ سے نین کٹو رہے بھرتے ہیں

آہ پر اس پر بھی دُولوں کا رستہ نیا رانیا رہے
 گلچیں کو تن اُٹس کا اور شاعر کو درشن پیا رہے

گلچیں باری لال پوری

گلشنِ تصور

جسے عقل کہتے ہیں وہ سراسر بے عقلی ہے
اودھے جسے بے عقلی کہتے ہیں وہ عین دانشندی

کانے کے آنسو

میں نے اپنے لڑکر کو دیکھا
جہاں درج خانے میں چھپ کر
ایک لڑکانی کے لئے
اپنی ایک ہی آنکھ سے رو رہا تھا

چمگا دوڑوں کی جنگ

رات کو دو چمگا دوڑیں کیکر کے درخت کی
سب سے اونچی ٹہنی پر بیٹھ کر
اپنے شوہر کی راہ دیکھ رہی تھیں
کہ ان کی لڑائی ہو گئی
ایک نے دوسری سے کہا
تو کیوں 'اُن کا' راہ دیکھ رہی ہے
اپنا من تو دیکھ جو چاند کی طرح سیا ہے!
دوسری نے جواب دیا "چپ رہی چپ تیرا لنگ بک
کڑے کی طرح سفید ہے!"

مدھی علی خاں

جنت کا ایک منظر

جنت میں ایک پہاڑی ندی کے کنارے
طوبی کی ہری بھری شاخوں کے نیچے
ایک نازک مزاج حیدر
بیٹھی رو رہی تھی
نہ جانے کیوں؟

فریاد

بچائے کوئی مجھے بچائے
وہ جس سے میں شادی کرنا نہیں چاہتی
وہ میرا ان اپنے بے اندازہ احسانوں کا
جلال پسند کر مجھے اسیر کر رہا ہے

اُلوؤں کی محفل

نصف شب کے قریب
جب چاند آسمان سے ذرا نیچے اتر کر
چمک رہا تھا
کندڑوں میں اپنے اپنے درخت پر بیٹھ کر
چند منبر اُلوؤں کا محفل اُٹھ اُٹھ رہے تھے
وہ جھپٹے تھے کہ یہ سب تو وقت انسان

کھڑکھڑاتا پتہ

سرسراقتی ہوئی آئی چمنستان میں ہوا

آہ سُوکھے ہوئے پتے تری غمناک صدا

بین کرنے لگیں مسرور ہوائیں افسوس

دم بخود ہو گئیں پرکیف فضائیں افسوس

فاختہ کے دل اندر وہ میں اک ہوک اٹھی

پھول مرجھا گیا کم لا گئی معصوم کلی

تیسری روتی ہوئی صحن گلستان سے گئی

درد کا راگ سنانے لگی محزوں ندی

آہ سُوکھے ہوئے پتے تری غمناک صدا

غزل

رحمت کو اُن کی جوش میں لانے کی دیر ہے یعنی سیرِ نیاز مجھکانے کی دیر ہے
 پینے کی دیر ہے نہ پلانے کی دیر ہے ساتی کے بنگاہ اٹھانے کی دیر ہے
 پروانے آہی جائیں گے کھنچ کر بہ جبرِ عشق محفل میں صرف شمع جلانے کی دیر ہے
 آنکھوں میں دم ہے آخری ہچکی کا وقت ہے او بے نیاز! بس ترے آنے کی دیر ہے
 غم و مضطرب ہیں بادہ و ساغر کی جھلکیاں ساتی کی سمت ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے
 جامِ شرابِ مست گھٹا، مُطرب و بہار سب آچکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے
 وہ بھی توپ نہ جائیں، تو اس عاشقی پہ خاک مجھ سے فقط نگاہ ہلانے کی دیر ہے
 اُن کے غم و حُسن کو رحم آہی جائے گا لبِ تکتِ حدیثِ شوق کے آنے کی دیر ہے

چلمن کی بندشوں سے وہ شاید نہ رُک سکے

ماہر کے صرف شعرِ نمانے کی دیر ہے

ماہر القادری

سستی

یہ بھڑکتے ہوئے شعلے، یہ لپکتے ہوئے شعلے، یہ بھڑکتے ہوئے سینے
یہ لرزتے ہوئے سینے، یہ مچلتی ہوئی رُوحیں، یہ محبت کے دِ فیض
یہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو، یہ ڈھلکتے ہوئے آنسو
یہ دھکتے ہوئے آنسو، یہ کہ حوروں کی انگوٹھی میں ہیں پارے کے نگینے
یہ لپکتے ہوئے آنچل، یہ رکھسکتے ہوئے دہن، یہ سرکتے ہوئے فضل
کہ سمندر کے کنارے پہ ہواؤں سے ترپتے ہوئے خاموش سفینے
یہ پریشاں سی نگاہیں، یہ ہراساں سی نگاہیں، یہ غم افشاں سی نگاہیں
یہ تعجب سا لبوں پر، یہ شکایت سی نظریں، یہ جبینوں پہ پسینے
وہ چمکتی ہوئی نبضوں میں، قیامت سی درآئی، وہ چمک سی ہوئی پیدا
وہ دھکتے ہوئے فردوس میں، اک جست لگائی ہے غمخوشی سے کسی نے

وہ فرشتوں کی قطاریں بھی شعاعوں کے سہارے سے زمیں پر اتر آئیں
وہ تھرکتے ہیں ستاروں سے پرے نور بھرے بحر میں ردووں کے سفینے

احمد ندیم قاسمی بی۔ اے

کلام پاک

(تاج کمپنی کی حائل شریف کو دیکھ کر)

کلام پاک! انصاف کا تقاضا ہے اور جی بھی ہی چاہتا ہے کہ جیسی اس کلام کی روح خوبصورت ہے دلیا ہی اس کا جسم اور ویسی ہی اس جسم کی پوشاک بھی خوبصورت و خوش نما ہو!

لیکن جس آہی کا باطن خود خدا نے بنایا ہو انسان کے لب کی بات نہیں کہ اُس کے ظاہر کو اُسی قد حسین و پاکیزہ بنا سکے۔ پھر بھی ہم خاک کے پتے آرزو کے بندے ہیں اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ جس حسین نے ہمارا دل لیا ہے زندگی کی سب رعنائیاں اُس کے قدموں پر نثار کر دیں۔

یہ حائل جو میرے سامنے ہے اس کا ہر منور رنگوں کی ایک دنیا ہے اور ہر سلمان جو ہمتاقت رکھتا ہے اُس کا اپنے ہی دل کی خوشی کے لئے فرض ہے کہ اس کتاب زندگی کے تاج ایڈیشن کو اپنی غفلت کا سامان آرائش بنا کر رکھے۔

کوئی صفحہ کھولو حُسن کی فطرتی میں مگر کے موتی بکھرے ہوئے ہیں :

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ————— ہم کو سیدھے رستے چلا

اَنَّا مَرُّونَ النَّاسَ بِالْاَبْرَةِ وَتَنَسُّونَ اَنْفُسَكُمْ ————— (یہ) کیا مرض کی بات ہے کہ تم لوگوں کو ٹھکی کرنے کو

کہتے ہو اور اپنے تئیں فراوانی کئے دیتے ہو۔

وَلِلّٰهِ اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ————— اور خدا کے سب نام اچھے ہی اچھے ہیں تو اُس کو اُس کے

ناموں سے پکارا کرو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لِيَتَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ————— مومنو تم ایسی باتیں کہوں کہ کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔

مُحَمَّدٌ صَلَّاهُ مَنْزُور! قسم اول کے صفحے کا ایک نمونہ تاج کمپنی لاہور سے مفت طلب کیجئے اور دیکھئے!

بشیر احمد

ہماری زبان کے مسباری ماہور رسالے ہیں۔

اردو کا سب سے پہلا سماجی رسالہ اردو جو انجمن ترقی اردو اور گنگا گاندو کن کا آرگن ہے ۱۹۳۱ء میں نکلا جو خالص ادبی رسالہ اور اپنی ادبی تنقید و تحقیق کے لئے مشہور ہے، دوسرا سماجی اور نیشنل کالج میگزین لاہور ۱۹۳۲ء سے نکل رہا ہے، جو شرقی علوم و فنون و تاریخ پر محققانہ مضامین چھاپتا ہے، اور تیسرا سماجی رسالہ ہندوستانی انجمن کا ہندوستانی الہ آباد سے جو ۱۹۳۳ء سے جاری ہے اور ہندوستانی زبان اور ادب کا خدمت گذار ہے۔

ہندوستان کے دوسرے مکتوبوں سے بھی ماہور رسالے نکلتے رہے، اور ہندوستان سے مثلاً کلکتہ سے لسان الصدق (۱۹۰۳ء) ہولین ایلکام کی اڈیشی میں اور نوبل انشورق، اور ڈھاکہ سے مادو، جو ناگڑھ سے زبان اور شتاب، پونا سے رفیق الطلیحہ (انجیلو اردو بانی اسکول پونا)، مالگٹول منٹلے ناسک مہاراجا ندین سے بیہداری۔

مدراں میں ستینہ اور بٹھری شہر مدراس سے، کوڑبگلور سے، اور محقق عمر آباد سے دوبارہ نکلا ہے۔

سنتیہجن پٹار سے، میرزاں (انکار) زبان ہند اور اردو نکل کر اچھی سندھ سے، افغانستان ملتان سے، اور لالہ مسعودی ہماوہر سے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک نکلا۔

ہندوستان سے باہر بھی کچھ رسالے اور اخبار اس زمانہ میں نکلیے جن میں نوائے کیمبرج اور نوائے وطن امریکہ قابل ذکر ہیں۔

”معارف“

(سید سلیمان ندوی)

شہزادہ میرزا منگل

(یہ مضمون خواجہ حسن نظامی دہلی نے ۱۹۳۳ء کی شام کو دی ریڈیو میں سنایا)

دراچھی لگا کر نئے منگل شہنشاہ شاہ جہاں کی لہائی دل لی میں ایک لال قلعہ ہے جو شاہ جہاں کا بنایا ہوا ہے۔ اس قلعہ کے جنوب میں ایک عجیب خانہ بھی ہے جہاں شہزادہ میرزا منگل کی قلمی تصویروں پر لگی ہوئی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا منگل غیب ہوئے نمانے سے سیدہ چوڑا تھا، قلعہ جڑو شیر کا ساتھ، غریب گمان بھری ہوئی دایرہ میں منگنی ٹوٹی اوڑھتے تھے جس میں شہزادگی کے طرے لگے رہتے تھے۔ بڑی بڑی سنگین تھیں گردن مضبوط اور بڑی بھی غرض یہ کہ موت دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ میرزا منگل کسی بڑی فوج کے سپہ سالار میں یکسی کا کے بادشاہ ہیں۔

میرزا منگل ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ آخری بادشاہ خاندان تیمور کے فرزند تھے مگر ولی عہدی ان کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ اپنے بچپن میں بہت زیادہ لائق تھے جانتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں علیحدگی اس کو ملتی تھی جو ایٹ انڈیا کمپنی کی ریڈیو ٹیلی ویژن جول کھتا کہ کنڈا کمپنی مذکورہ بہادر شاہ کے دادا شاہ عالم بادشاہ نے کسی کے روائے کے بعد ہندوستان کی وزارت سے دی تھی اس لئے دیکھنے سے کہیں میں کمپنی کا بڑا اختیار تھا۔

غرض ۱۵۵۷ء سے چند مہینے پہلے ہمارا درشاہ کے تیسرے ولی عہد میرزا فخر الدین فتح الملک کا ہسینہ سے انتقال ہو گیا۔ تولی عہدی کے جھگڑے میں بھر جان پڑی۔ ایک طرف مرزا قویش کا کوشش کر رہے تھے، دوسری طرف بادشاہ اور ان کی محبوب ملکہ زینت محل اپنے چھوٹے اولاد لٹے بیٹے شہزادہ جلال تخت کے لئے سعی میں مصروف تھے شمس العلامہ مولانا ذکا عاٹھ صاحب کی تاریخ ہند سے معلوم ہوتا ہے کہ دیرینہ بیٹی دہلی نے مرزا قویش سے ایک غلیظ قرآن میں منوں کا لکھوایا تھا کہ اگر ایسا نڈیا کہنی مجھے بہا درشاہ بادشاہ کی ولی عہدی دے گی تو میں تخت نشین ہونے کے بعد اپنے آپ کا بادشاہ نہیں کہوں گا بلکہ شہزادہ کہوں گا اور لال قلعہ میں نہیں رہوں گا بلکہ درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب میں بہادر شاہ بادشاہ نے جو محل بنوایا اس میں اپنے خاندان سمیت ہماروں کا اور کہنی سے ایک لٹکے ہوئے ماہوار جزو ظیفہ بہادر شاہ کو ملتا ہے میں اس کے عوض صرف پچاس مزار پٹے ماہوار لیا کروں گا۔

اس حد صاف یا انفرانامہ کی خبر چھٹی نہ رہی اور بہادر شاہ اس سے بہت غرے اور انہوں نے ریزینڈنٹ کو لکھا بھیجا کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو میں اس کی شکایت بغیر لکھوں گا کیونکہ جو عہد نامہ میرے اوشاہ عالم سے ایسا نڈیا کہنی کا ہوا اس کی شرائط میں سی کی شرط نہیں تھی کہ بادشاہ کی اطلاع کے بغیر ولی عہد سے قرآن نامہ لکھوایا جائے کہا جاتا ہے کہ میرزا نعل کے دوستوں نے ان کو بھی ترغیب دی تھی کہ وہ بھی اپنے بھائی میرزا فخر الدین عہد کرنے کے بعد ولی عہدی کے لئے کوشش کریں مگر انہوں نے انکار کیا اور اپنے باپ بہادر شاہ سے کہا کہ کیا میرے بھائی میرزا قویش نے جس مضمون کا اقرار نامہ ریزینڈنٹ کو کیا ہے وہ ہم سب کا نیکو کی مرضی کے خلاف ہے اور میں ولی عہدی نہیں چاہتا میرے دشمنوں نے غلطی شہر کیا ہے کہ میں بھی اپنے لشکر کش کر رہا ہوں۔ بلکہ میں جو عیسائی میرزا جلال تخت کی ولی عہدی قبول کرنے کو آمادہ ہوں جس سے بہادر شاہ ہوش مشے تھے میرزا نعل کی خوراک بہت اچھی تھی لیکن وہ اچھے کھانوں کے شوقین تھے، ان کے دسترخوان پر چالیس قسم کے کھانے چنے جاتے تھے۔ وہ ناشتہ میں ایک کبے کی چینی پیٹے تھے اور دوسرے کھانے میں بھجے ہوئے پانچ مرغ کھاتے تھے۔ دوسرے بادام کا حیرہ پیتے تھے۔ ایک دُنبہ کا پلاؤ کیلئے غم کرتے تھے۔

میرزا نعل کو درش کا بہت شوق تھا۔ مگد کی جوڑی کے ایک ہزار ہاتھ ان کا روزمرہ کا معمول تھا وہ روزانہ ٹھنڈے پانی سے نہاتے تھے چڑی کے موسم میں بھی گرم پانی استعمال نہ کرتے تھے۔ ان کو پنج کشی کا بہت شوق تھا۔ میرزا کیش دہلوی کے شاگرد تھے۔ بدوق کاغذ بھی خوب لگاتے تھے۔ وہ ہر شے سے ہیرا سننے اور ناچ رنگ کا شوق بھی ان کو تھا اور ادشاعی کے بھی مخالف تھے۔ میرزا غالب کو برا کہتے تھے کہ وہ شراب پیتے ہیں۔

ان کی مجلس میں ہیشہ ایسے لوگ جمع ہوتے تھے جن کو دنیا فغان کے نوال کا مدد تھا۔ کوئی پولیسی مرشد آفرزادہ میں ان کا مصاحب بن گیا تھا جوں کو ایسا نڈیا کہنی کے خلاف جھوٹا کرتا تھا۔

میرزا نعل اپنے خاندان کی عیاشی اور آرام طلبی کے بہت مخالف تھے اس لئے ہمیشہ ایسا نڈیا کہنی کے انگریز افسر کے کلمات پوچھا کرتے تھے کہ ہاں کچھ زندگی بسر کرتے ہیں جتنا پھر میرزا نعل نے بھی اپنے رہنے سہنے کے طریقہ کو باقاعدہ بنالیا تھا۔ سناڑ کے پاندتہ جسے خدا کی نماز پڑھ کر بولی ہو جاتے تھے اور کچھ رات کو بیدار ہو جاتے تھے۔ پہلے غسل کرتے تھے، پھر نماز پڑھتے تھے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، اور صبح کی نماز کے بعد وضو کرتے تھے۔ پھر دوسرے بالائی کیمپ کے کئی کئی کاشانہ کے گھوڑے پھوسا کر بہاؤری کو جاتے تھے اور شہر کی بازی کی مشق کرتے تھے، پھر گھوڑوں کی ناز کی کاموں کو دیکھتے تھے۔ سبیل کے گھوڑوں کیلئے دروازوں کی چاندہ دانہ لپٹا سٹے لڑاتے تھے اور کھاری پھیل دیں دروازوں کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔ غرض وہ جہاں ایک منٹ بھی بن

کا ضرورت میں متعلق رہتا تھا۔ میرزا مثل کی جہانی قوت اور پاکیزہ زندگی کے سبب دلی کے کاپا باندہ و سلمان اور فوجی لوگ سب شہزادوں میں اپنی کو پسند کرتے تھے اور دیرینہ میز مثل کی نقل و حرکت کو اپنی نظروں میں رکھتی تھی۔

۱۱ مئی ۱۷۵۷ء کو صبح کو جب میرزا مثل سے انگریزی فوج باغی ہو کر ٹی میں لڑی اور جبراً لال تلخیص گس کر بادشاہ کو اپنا سرپرست بنالیا تو بادشاہ نے اس فوج کا سپہ سالار میرزا مثل کو بنا دیا اور میرزا مثل نے اس خدمت کو خوشی خوشی قبول کر لیا اور اپنے بھائیوں میرزا ابوبکر اور میرزا خضر سلطان وغیرہ کو فوجی خدمت سے سبک کر دیئے۔

باغی فوج بہت غور سے تھی اور بادشاہ کی علاقہ بندی میں کرتی تھی اور کبھی تھی کہ جس کے سر پریم چرتی رکھ دیں گے وہی بادشاہ بن جائیگا مگر میرزا مثل نے ایک ہی ہفتہ کے اندر باغیوں کو ایسا دیا کہ وہ سب میرزا مثل کے اشاروں پر کام کرنے لگے۔ اس معاملہ میں میرزا مثل کا مرید مصباح بھی ان کو بہت مدد دیتا تھا۔ وہ ریاست ناگلپور کے فاضلان سے تھا جس کی ریاست الہٹ اندیا کمپنی نے مضبوط کر لی تھی اس لئے وہ انگریزوں کا بہت دشمن تھا اور وہ حکومت کے انتظام کو بھی خوب جانتا تھا۔ جب دلی میں باغی فوج کا قبضہ ہو گیا تو باغیوں نے انگریزوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنا شروع کیا۔ وہ بڑی چرچی سے انگریزوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزی غیر فوجیوں کو ملتے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو بھی زندہ نہ چھوڑتے تھے۔ چنانچہ ایک سر کے تیرب انگریز عورت مرد اور بچے گرفتار ہو کر میرزا مثل کے پاس لائے گئے۔ مرید مصباح نے مشورہ دیا کہ ان کو قتل کر دیا جائے مگر میرزا مثل نے ان قیدیوں کو بادشاہ کے پاس لال تلخیص بھیج دیا اور بادشاہ نے ان کو ایک مکان میں نظر بند کرادیا اور حکم دیا کہ شاہی باورچی خانہ سے ان کو کھانا لاکرے۔ یہ قیدی بہت دن اس مکان میں نظر بند رہے، مگر باغیوں نے میرزا مثل اور بادشاہ کو مجبور کرنا شروع کیا کہ ان کو قتل کرنا ضروری ہے۔ بادشاہ کے شیر خاں حکیم حسن اسٹھا اور میرزا غفور و یسعد حرم کے خضر میرزا علی بخش اور ملک زینت محل نے بادشاہ کو اس حکم سے روکا اور کہا کہ انگریز پنجاب کے سکھوں اور مسلمانوں کی مدد سے لائے ہیں اور یہ باغی ان کا متعلقہ نہ رکھیں گے۔ آپ ان انگریزوں کی حفاظت کریں گے تو انگریز آپ کا احسان نہیں گے۔ اس لئے بادشاہ نے عرصہ تک ان انگریزوں کو قتل سے بچائے رکھا لیکن جب باغی فوج نے حکیم حسن اسٹھا کو گھوٹ لیا اور بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ ملک زینت محل کو ہار سدا لیا جائے کیونکہ وہ اپنے بیٹے جمال بخت کی ویدھی کی وجہ سے انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں تو بادشاہ مجبور ہو گئے اور انہوں نے کہو ایک قیدیوں کے معاملہ میں رقم عیا مناسب جا لارو گزنیہ طور سے میرزا مثل کو لکھا کہ انگریز قیدیوں کو قتل نہ کرنا۔ بادشاہ نے منسل سے یہ رقم لکھا تھا اور زینت نامی ایک شاہی مصاحب یہ خط لایا تھا لیکن بسنت نے وہ رقم میرزا مثل کو نہ دیا اور مرید مصباح کے اشارے پر بانی کرد یا کہ ضرور بادشاہ سلامت نے حکم دیا ہے کہ انگریز قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔ میرزا مثل نے دیکھ کر ناخوش ہو کر دلیاں خاص لال تلخیص کے سامنے ان قیدیوں کو لاکر رکھا اور بادشاہ سے سختی حکم مانگا یا گزنیہ قسمی سے اس وقت بھی وہی بسنت پرہیز تھا جو بعد میں ٹوٹ محل کے اندر گیا اور کہہ دیا کہ بعد اس آیا اور کہا کہ جہاں پناہ نہ ملے کہ سب قیدی قتل کر دیئے جائیں حالانکہ میرزا مثل اس خیال میں تھے کہ میں میرزا مثل کو تحریر کی حکم بھیج چکا ہوں کہ قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے چنانچہ بسنت نے اس وقت جو قدر کے بدلے لال تلخیص میں ہوا تھا بادشاہ نے غصہ دیا کہ کیا تھا کہ میں نے قیدیوں کو بچا کر بسنت نے غلط بیانی کر کے قتل کرادیا۔ اقتصد جب بسنت نے بادشاہ کا آخری حکم مانا تو میرزا مثل نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور باغی فوج نے انگریزوں کو قتل کر دیا۔ جن میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔

کیوں قتل کیا۔ تو میرا دماغ نے جواب دیا تھا کہ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ ان کو رہا کر دیں گے حالانکہ وہ بہت بڑے مجرم تھے اور عافیت کرنے کے قابل نہ تھے۔ زندہ رہتے تو بدلت کی آگ پر چھڑک اٹھتی۔ مغرض اس طرح یہ زہن کی زندگی ختم ہو گئی اور کوئی نہیں جانتا کہ ان کی لاش کہاں دفن ہوئی لیکن ہندوستان کی لگ بھگ فیروز آبادہ کو جہاں میرزا قتل ہوئے تھے اس طرح دیکھتے آتے ہیں جس طرح ان کی قبر کو دیکھا جاتا اگر وہ مکین موجود ہوتی۔

”منادی“

قومی ترانہ

بھارت پیارا دلش ہمارا سب دلشوں سے نیا رہے ہر رات ہر رات موسم اس کا کیسا پیارا سپاہ ہے
کیسا شہنا کیسا سوند پیارا دلش ہمارا ہے دکھ ہیں، تنگ ہیں، بہوات میں بھارت مل کا سہارا ہے
بھارت پیارا دلش ہمارا سب دلشوں سے نیا رہے

سارے جاگ کے پاؤں میں بے مثل پاؤں ہمارے پرست سب کے ادغا ہے یہ پرست سب سے نالا ہے
بھارت کی رکشا کرتا ہے بھارت کا رکشوالا ہے لاکھوں جتنے جتنے ہیں اس میں لاکھوں ندیوں والا ہے
بھارت پیارا دلش ہمارا سب دلشوں سے نیا رہے

گنگا جی کی پیاری لہریں گیت سنانی جاتی ہیں صدیوں کی تہذیب ہماری یاد دلاتی جاتی ہیں
بھارت کے گلزاروں کو سرسبز بناتی جاتی ہیں کھیتوں کا ہریالی دیتی پھول کھلاتی جاتی ہیں
بھارت پیارا دلش ہمارا سب دلشوں سے نیا رہے

ہرے بھرے ہیں کھیت ہمارے دنیا کو ان دیتے ہیں چاندی سونے کی کاغذ سے ہم جاگ کو دھن دیتے ہیں
پریم کے پیارے پھول کی خوشبو گلشن گلشن دیتے ہیں امن و امان کی نعت سب کو بھر بھر دامن دیتے ہیں
بھارت پیارا دلش ہمارا سب دلشوں سے نیا رہے

کرشن کی مٹی نے پھونکی ہے رُوح ہماری جلال میں گوتم کی آواز سب سے محلوں میں میداؤں میں
جستی نے جو دی مٹی کے وہاب تک ہے پہاڑوں میں ناک کی تعلیم ابھی تک گونج رہی ہے کاغذ میں
بھارت پیارا دلش ہمارا سب دلشوں سے نیا رہے

مذہب کچھ ہو ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں ہندو ہیں یا مسلم ہیں یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے پریم کے ہم شیدائی ہیں بھارت نام کے عاشق ہیں ہم ہم بھارت کے بھائی ہیں
بھارت پیارا دلش ہمارا سب دلشوں سے نیا رہے

”دین و دنیا“ (علی گڑھ آفسیر میٹھی)



فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ فروری ۱۹۳۸ء



تاریخ شاعرہ {۔۔۔} "مشاعرہ آل انڈیا پائش لائو"
 از ناول پرنسپل دہلی
 تصویر:- ارکان شاعرہ آل انڈیا پائش پنجاب لاہور

صفحہ	صاحب مضمون	مضمون	شمار
۱۲۳	بشیر احمد	ہم بزم "ہمایوں"	۱
۱۲۶	عادل خاں	اردو شعر کا ارتقائی مطالعہ	۲
۱۳۰	چودھری غلام حیدر خاں صاحب ناظم ادارہ زمیندار لاہور	لاہور میں ایک عظیم الشان مشاعرہ	۳
۱۳۲	"	مناظرہ و مشاعرہ	۴
۱۳۳	"	شرح بقدر	۵
		الغامی نظمیں	۶
۱۳۴	محترمہ زینب عثمانیہ بیگم اہل بہاء الدین	(۱) مقصد حیات	۷
۱۳۵	حاجی قنق	(۲) مقصد حیات (مزاحیہ)	
۱۳۷	بالمکند صاحب عرش ملیانی	(۳) الغامی غزل	
		موضوعی نظمیں	
۱۳۸	آغا آفتاب المہر قدس	(۱) مقصد حیات	۸
۱۳۹	حضرت الطاف شہیدی	(۲) مقصد حیات	
۱۴۰	خواجہ معین الدین صاحب عثمانیہ یونیورسٹی حیدرگاہ دکن	(۳) قانون ہند کا مقصد حیات	
۱۴۱	حضرت ساجد نظامی	(۴) ہمارا وطن	
۱۴۵	حضرت روشن صدیقی	(۵) اسکے کور ہندوستان	۹
۱۴۷	خان بہادر چودھری خواجہ محمد صاحب ناظر سابق گورکھ پور	(۶) ہندوستان کا قومی ترانہ	
۱۴۹	پنڈت بالمکند صاحب عرش ملیانی	(۷) ہمارا وطن	
۱۵۰	محترمہ سمن بیگم آغا ز صاحبہ	(۸) ہمارا وطن	
۱۵۱	سید رفیع صاحب جلالپوری	(۹) ہمارا وطن	۱۰
۱۵۲	سید عنایت علی صاحب آغا ز	(۱۰) ہمارا وطن	
۱۵۴	حضرت قدیر گھمنوی	(۱۱) دیہات کا ایک منظر	
۱۵۶	حضرت دقار اباوی	(۱۲) دیہات کا ایک منظر	
۱۵۷	جناب سید نظیر احمد صاحب نگر	(۱۳) دیہاتی لڑکی	۱۱
		طرحی غزلیں	

۱۵۹	طرح اول :- غزل درغ	پروفیر عبداللطیف صاحب پیش
۱۶۰	(۱) غزل	ارضا علی نقی
۱۶۱	(۲) غزل (مزدحمیہ)	
۱۶۲	طرح دوم :- غزل اقبال	جناب پنڈت برجمن صاحب کیتی ناتاریا دہلوی
۱۶۳	(۱) غزل	حضرت سراج گھنوی
۱۶۴	(۲) غزل	مولانا ماجریب آبادی
۱۶۵	(۳) غزل	سردار اودے سنگھ صاحب شائق
۱۶۶	(۴) غزل	ڈاکٹر محمد دین صاحب تاثیر
۱۶۷	(۵) غزل	پرنسپل رام پت د صاحب استاد
۱۶۸	(۶) غزل	جناب جوش ملیانی
۱۶۹	طرح سوم :- غزل جوش	خان اصغر حسین خاں نظیر
۱۷۰	(۱) غزل	جناب پنڈت ورتہ پرتا د صاحب قدا
۱۷۱	(۲) غزل	
۱۷۲	متفرق نظمیں :-	حضرت جوش ملیح آبادی
۱۷۳	(۱) خرابات	حضرت سائر نظامی
۱۷۴	(۲) چمن آزاد	خواجہ دل محمد صاحب
۱۷۵	(۳) دوسے	حضرت احسان دانش
۱۷۶	(۴) پردہ	حضرت روشن صدیقی
۱۷۷	(۵) زبور حریت	پروفیر عابد علی صاحب
۱۷۸	(۶) صبح بہار	حضرت حفیظ ہوشیار پوری
۱۷۹	(۷) سرمایہ دار	صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم
۱۸۰	(۸) پیمان وفا	عابد علی خاں
۱۸۱	(۹) ہمہ گیری عشق	پروفیر فیض احمد صاحب
۱۸۲	(۱۰) رقیب سے	بشیر احمد
۱۸۳	(۱۱) بیامعات	
۱۸۴	متفرق غیر طرخی غزلیں :-	
۱۸۵	(۱) غزل	خان بہادر جمعی ہوشی محمد صاحب ناز سائیک گورکھ پور
۱۸۶	(۲) غزل	خان بہادر ذوالحمدا خاں دولتانہ
۱۸۷	(۳) غزل	جناب دینا ناتھ صاحب ست کاشیہ صدیقی صاحب راجپور
۱۸۸	(۴) غزل	جناب جلال الدین صاحب اکبر
۱۸۹	(۵) غزل	محمد علی خاں صاحب آٹھ راجپوری
۱۹۰	(۶) غزل	جناب بدر غازی پوری

بزم ہمایوں

آل انڈیا نائٹس کا شاعر

لاہور کی نائٹس کا آل انڈیا شاعرہ جو زیر اہتمام انجمن اردو پنجاب ۳۰-۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء کو نائٹس گاہ میں منعقد ہوا ملک میں بدولتی برستی ہوئی سر ولعزیزی کا ایک کامیاب اور دل خوش کن مظاہرہ و شاعرے کے شروع ہونے کے وقت ہندو باندی ہوسہی تھی، اس پہنچانے کے بڑے دنوں کی سرودی اور ستم فضاہی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ساری نائٹس گاہ میں جہاں ہر فرد ایک ایک لکھ تماشائی ہوتے تھے ایک ایک سیکڑو آدمی بھی موجود نہ تھے، لیکن کارکنان انجمن کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب دو گھنٹے کے اندلندہ بارش کے بہتے ہوئے ایک ہزار سے زائد لوگ ہال میں جمع ہو گئے، شرح گھٹ تین روپے، ایک دہیہ اور آٹھ آنے تھی۔ ہال بھر گیا تو لوگ باہر پکارا مڈل میں سننے کی خاموشی کو شیش کتے رہے۔ اس کے مقابلے میں اس کے بجائے پنجابی اور ہندی کے دربار بلکہ کوئی دبا منعقد ہونے تو باوجود اس کے کہ موسم نہایت خوش گوار تھا، انگلٹ ایک روپیہ اور آٹھ آنے اور چار آنے تک تھے مگر مال کا دو تہائی حصہ تعالیٰ تھا اور جو ایک تہائی پڑھا، اس میں بھی زندگی کے ساتھ زندہ دلی اور گرمجوشی اور لطف اندوزی کے بہت کم آثار پائے جاتے تھے۔ انجمن کی محنت ٹھکانے لگی، قومی زبان کی جاؤاثری سے بلا امتیاز مذہب و ملت لوگوں کو سرسور و دیکھ کر شفقت کی یاد ادبی سرت سے بدل گئی۔ ہم دوسری زبانوں کو نیچا دکھانا نہیں چاہتے وہ بھی سب ہمارے ہی دیں کی پیاری بولیاں ہیں لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہندو مسلم کچھ عیسائی سب کے سب جس زبان کی مجلسوں اور شاعروں کی طرف خود بخود کھینچے چلے آتے ہیں وہ اردو اور صرف اردو ہے؛ یہ درست ہے کہ جس کا کما میں اس کا گائیں لیکن یہ اس سے بھی بڑھ کر درست ہے کہ جس کی سمجھیں اس کی سنیں۔ شہریتی کو کون پسند نہیں کرتا؛ اردو شاعری بھی وہ چشمہ شیشوں ہے کہ ہر خوب دولت کے لوگ اس کے گرد اگر خود بخود جمع ہو جاتے ہیں!

بعض لوگوں کو شاعرے کے دجور سے شکایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کل کے عملی زمانے میں ایسی خرافات کی گنجائش نہیں۔ آج کل کے عملی زمانے کے لئے سانس باعث افکار ہے لیکن بے کس عورتوں اور ننھے بچوں پر ہم گرانے والی جہی نہیں ہی ہے۔ ہر شے اگر اس کا استعمال صحیح ہو صحیح ہے اور اگر اس کا استعمال غلط ہو غلط ہے۔ یہی حالت شاعروں کی ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے اکثر شاعروں میں اصلاح کی گنجائش ہے مگر اس کے معنی نہیں کہ ہم بجائے ان میں اصلاح کرنے کے ان سے بکسر مزہ پھیر لیں، شاعرے صحیح انسانی اور فطری زندگی کی تصویر بن سکتے ہیں۔ جب وہ ایسے نہیں اور ایسے ہوں تو اردو شاعرے بلاشبہ زندگی اور زندہ دلی کے چیتے جل گئے نور نے ہمتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم انہیں بڑبھجیں۔

آل انڈیا نائنٹھ کے شاعرے کی تین ہشتین تھیں۔ ۲۰ دسمبر کو پہلی نشست ۲ بجے صبح سے ایک بجے تک تھی۔ اس کے صدر ویوان بہادر راجہ زندر ناتھ تھے۔ دوسری نشست ۲ بجے سے ۶ بجے شام تک جاری رہی۔ اور تیسری ۳۱ دسمبر کو ۲ بجے سے ۲ بجے شام تک۔ ان دونوں کی صمدت انجیل سر عبد القادر ممبر انڈیا کونسل نے فرمائی۔ راجہ صاحب نے ایک دلچسپ افتتاحی تقریر کی جس میں انہوں نے شاعروں کی تاریخ بیان کی اور کہ شاعرے خاص طور پر مدوزبان اور اردو شاعری کی پیداوار اور اس کا دلچسپ اور مفید نتیجہ ہیں سر عبد القادر نے شاعرے کے ورلڈ میں جا بجا نہایت پُرکلفت نکتے بیان کئے اور سخن کا زمانہ یاد دلایا۔

معتمد ذیل شاعرے کرام نے اپنے کلام سے حاضرین کو غلط فہم کیا۔ الطاف دشتی، عابد، تاجور رسامی، انشا، تاجور رئیس بادی، جوش مسیانی، عرش مسیانی، احسان بن دوش، اروش صدیقی، اکبر سراج (لکھنوی)، اودے گلشن شانی، بدر غازی پوری، غلیظہ عبد الحکیم، حیرت ہوارثی، حنیفہ ہوشیار پوری، نصر اللہ خاں عزیز، اثر رامپوری، حامد علی خاں، نواب احمد خاں دولتانہ، اشتر جانہ لدھی، خواجہ دل محمد، کبھی دلجو، خوشی محمد ناظر، ترستہ پرشاد فقار، تابش رفیع، تبسم، دینا ناتھ مست (صدر یزیم اردو جوبل کوشمیر، پٹیش، بشیر احمد (سکرٹری مشاعرہ کبھی)، قدیر لکھنوی، ساغر میرٹھی اور جوش ملیح آبادی۔

سابقہ اعلان کے مطابق جن سو سے زائد نظمیں اور غزلیں انجمنی مقام میں شریک ہونے والے حضرات کی طرف سے مرمول ہوئی تھیں ان میں سے تین منتخب کی گئیں اور شاعرے کی دوسری نشست میں پڑھی گئیں۔

۳۱ دسمبر کی سبج کا وقت شعرا اور انھیں بیرون پنجاب کے شاعر نے یہ موقع میں گزارا۔ آجی دودھ پر کورام نے اپنے مکان المنظر (۲۳-۲۴ لارنس روڈ) میں سب شعروں کو دعوت کیا تھا۔ متبادل حاضر کے بعد ایک پُرکلفت شاعری، معتمد ہونی اور پھر مکان کے بہر فرخو انارکلیا، عجم پوری کو تے امتیاز علی صاحب تاج نے شاعر کی اپنے ہاں چائے سے ضیافت کی۔ غرض شاعرے کی یہ پُلٹ صہبتیں تین روز جاری رہیں اور ان کی یاد دہوں باقی ہے گی۔

شاعرے کی کامیابی کو دیکھ کر کئی دوستوں اور دوسرے سلسلوں نے لاہور میں ہلال ایسٹ شاعرے منعقد کرنے کی تجویز پیش کی اور ان میں ہر طرح کی ادلائیں کا وعدہ فرمایا۔ اگر یہ دوست اپنے وعدے یا دیکھیں گے تو ان کی تجویز کو ضرور عملی جامہ پہنا جانا جائے گا۔ ہماری ناچیز خدمات کے اعتراف کے طور پر ہم نے دست جناب راجہ ہوشیار پوری نے تعریفی "تائیکس" کے پل باندھ دیئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں "واہ واہ ابراہیم ہائیل کا شاعرہ نمبر ساتھ ہی نائنٹھ پریمی نظر نہایت ڈلتے ہیں" نائنٹھ نمونہ مصنفات پنجاب خوب ہوئی اور چونکہ یہ نائنٹھ اعمال جاری ہے اس لئے بے امتیاز یہی فرماتے ہیں کہ "۱۱ نائنٹھ نمونہ مصنفات پنجاب خوب ہے"۔ اس ضمن میں بہترین تائیکس تعریف اور تعریفی تاریخ وہ ہے جو فرسٹ مضامین کے لوبر میں کی گئی ہے اور وہاں سے لے دی کہانی ہے یعنی شاعرہ آل انڈیا نائنٹھ لاہور۔

بشیر احمد

جو حضرات شاعرے کے اس گہپ کی خواہش نہ ہائیل میں شائے لگا گیا ہے کاپی فرمنا چاہیں وہ براہ راست ایم اے رشید صاحب فوٹو گرافر ٹیٹو ونگ روڈ نزد شالامار باغ ۱۱ ہمارے طلب فرمائیں قیمت فی کاپی ایک روپہ چار آنے (معاذ معصوم) ہے۔ منیجر ہائیل

لاہور میں ایک عظیم الشان شاعر

(انجناب چوہدری غلام حیدر خاں صاحب اہم ادارہ زمیندار لاہور)

چوہدری صاحب نے اپنا پندرہواں جنوری ۱۹۳۷ء کے زندہ دلی میں تلخ بڑا عشق سے اضافے کے ساتھ شاعر ہونے کے عہدیت فرمایا ہے۔ ایڈیٹر آل انڈیا نمائش لاہور کے آفیسر گنگا مال ہیں اردو کا خوش شاعر ۳۰ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء کو منقذ ہوا وہ پنجاب میں اس لحاظ سے بلاشبہ عظیم الشان قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس میں ہندوستان کے چرچے کے اردو شاعروں جو تھے جنہوں نے راجہ نریندر داس صاحب اور انوبل سرمد دلاور کی صدارت میں حاضرین کے سامنے اپنا ایسا کلام پیش کیا جس کی یاد کا نقش لوح دل پر عرصہ دراز تک قائم رہے گا۔

اس شاعر کی روح رواں میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہلالوں و کمری انجمن اردو پنجاب تھے جن کی انہماں نے شاعر کو ہلال میں زندہ دلی کا قطعی طور پر سنبھال کر دیا جس کا نتیجہ شش عام طور پر ان شاعروں کو بتایا جاتا ہے جن کا کلام اس سے خارج تحسین و وصول کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ میاں صاحب ایسی زندہ دلی کو ہر پہلو سے سیورب خیال کرتے ہیں یہی وجہ تھی کہ ”انہماں“ کی بدولت سامعین کو ہر قسم کے کلام سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل گیا۔

لیکن بلی اور ادبی پسو سے بیال صاحب کی زندہ دلی میں کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ طبقہ امر اسے تسلیں رکھنے اور بظاہر زندگی کی راحتوں اور مسرتوں کے سرمایہ دار ہونے کے باوجود وہ اردو کی تحریک کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ اس کے نصب العین کو پانچ تھیل تک پہنچانے کے لئے اپنا دماغ وقت اور روپیہ خرچ کر رہے ہیں۔ یہی وہ زندہ دلی ہے جس کے علی مظاہر کے بغیر کوئی قوم ترقی اور کامیابی کے اعلا مقام تک نہیں پہنچ سکتی سامعین میں ہندو سلطان اور کچھ سہی شامل تھے، مگر مسلمانوں کی قبیلہ نسبت زیادہ تھی۔ مسلم خواتین بھی موجود تھیں۔ اگرچہ اردو ادو ہندی کی بحث نے ایسی نگاہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ ہندوؤں کا قوم پرست تعلیم یافتہ طبقہ اردو کو جگہ نشہ چار پانچ صدیوں سے دونوں قوموں کے سانی ماسخری اور ہند کی تعلقات کی ایک نمدہ یادگار ہے صفحہ ہستی سے بنائے پڑا ہوا ہے۔ لیکن اردو کی جڑیں ہلک واپ کی زمین ہیں اس قدر گہری اور ڈور چلی گئی ہیں کہ ان کا کٹنا دشمنان اردو کے لئے کوئی آسان کام نہیں رکاش اردو کے دشمنوں کو اس امر کا احساس ہو کہ ان کی اردو دشمنی وطنی مفاد کے لئے کس قدر تباہ کن ثابت ہو رہی ہے۔ یہ سہ تھلا میں وطن کے لئے اپنا سنے وطن کی ہم آہنگی ایک لازمی امر ہے۔ لیکن جب زبان ایک نہ ہو تو ہم سب کیسے یکساں ہو سکتی ہے۔

جن شعر لے کر ہم نے اپنے کلام سے حاضرین پر وعدہ اور روڑ کی کیفیت طاری کر دی ان میں عرش ملیانی، احسان بن دانش، روش صدیقی، سانوہی، جوش ملیح آبادی، تاج محمد نجیب آبادی، حفیظ جوشیاد پوری، اثر لاہوری کے سامنے لگائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

محمد زبیر عثمانی صاحب رلدیاد کی نظم قابل انعام قرار دی گئی اور ماہین اردو پنجاب نے موصوفہ کو ٹہری تمغہ عطا کیا۔ ایک کلمہ خاں شاعر کی یہ کامیابی یقیناً قابل فخر ہے، اور میرا ایمان ہے کہ اگر عذرا کی بیٹیوں کو صحیح تعلیمی جاسے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو وہ اپنے علم و عمل سے ملک و ملت کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر سکتی ہیں، کیا یہ انقلاب نہیں کہ انیس خواتین میں ایک ایسی خاتون بھی موجود تھی جس نے اہر و ملین کیا ۱۹ سہ ماہی کی بلدی تک اپنی پرواز سے پانچ دیاؤں کی مرز میں یکساں قلم کے زینا کو دکھایا کہ شاعر کے طائر خیال کی طرح وہ بھی عالم بالا کی نیر کر سکتی ہے؟

دوسرا نمبر کمال شاپ لاہور کی طرف سے عرش ملیانی صاحب کو ادیبہ تمغہ خلیفہ شاعر کی طرف سے حاجی قلی قلی صاحب میوہ احسان عطا کیا گیا۔ حاجی قلی قلی کی کما حقہ نظم پرستین سے تین اصحاب نے بھی ستوروی دیر کے لئے اپنی ستائش کو تحریر کیا کہ وہی بھی حاضرین کے مسلسل تہنوں کی گونجنے کی بجائے یہ سہل پیدا کر دیا تھا۔

زمانہ کی رفتار کے ساتھ شاعری کو رنگ بھی بدل گیا ہے، اقوام و ملل کے عروج و زوال سے شاعری بھی لازمی طور پر اثر پذیر ہوتی ہے جب ہندوستان آزاد اور طاقتور ملک بن گیا تو شاعری کا رنگ کچھ اور بن گیا اور جب فرقہ واریت کی فتنی آگ بجی کا دور شروع ہوا تو رنگ بدل گیا۔ وقت و مکہ کے احساس نے اب ایسے شاعری پیدا کر دیے ہیں جو رفت و غفلت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے لئے لوگوں کے خیالات میں ایک نئے ست انقلاب پیدا کر چلتے ہیں مثلاً جو شاعر طبع آبادی اس قسم کا شاعر ہے جسے

مے شوق کے دی پتے ہیں کمر پستی، صراحی دار گردن

کے مضمون سے کوئی ڈپٹی نہیں ہوشیج ہو جسے اپنے زہر و اتفاقا ہرانا ہے ایسی شراب کا جام پیش کرنا ہے جس کی بدلت وہ خلافت ارضی کا مالک بن جائے۔ شاعری جو کلام بنایا گیا ہے اس کی نسبت یہ کہن ہے جاہد کہ انقلابی شاعری ایک علم پرور ہے جو ہائے مستقبل کی شاہد اور قوتی کار ہے۔ شاعری کا مقصد بھی یہی ہے کہ ایک نرہ قوم میں بیداری اور آزاد خیالی کا غیر فانی احساس پیدا کرے۔

پنجاب کے بین الاقوامی اتحاد کا مسئلہ حل کرنے کے لئے بھی اردو شاعری کا وجود نہایت ضروری ہے۔ اس سے یاد و بخش منظور کیا ہو سکتا تھا کہ شاعری کی بیٹی پرسلان ہندو اور سکھ سامعین کی نگاہیں شاعر پر جمی ہوئی تھیں جس کے کلام نے ان کو خود کر کے متاثر کیا اس وقت کلمہ و غیر کلمہ ایک ہی خانہ ان یا بلدی کے ارکان نظر آتے تھے جن کا مقصد حیات اردو شاعری کو ہر پہلو سے فروغ دینا ہے۔ شاعری ہی وہی ہے ایسی ہستی جس کے موع پرؤ نند کی جڑت سامعین جبے مل کی شمع کے پروٹے بن جاتے ہیں جو اب اوقات یک پر کے اس راگ پر مل مرتے ہیں۔ شاعر سجاد اوند کے ان جھگڑوں سے جنہوں نے ہندوستان کو غم نہا کر رکھا ہے بالاتر رہتا ہے، کیونکہ اسے اپنے محبوب کا جلوہ مندیں بھی نظر آتا ہے اور سب سے بھی۔

انہیں اردو پنجاب کے پرجوش دانشمندان کی طرح میاں امیر محمد صاحب مارکوا کے سختی ہیں جن کی توجہ اور سی سے اردو کی تحریک قابل اطمینان رفتار کے ساتھ منزل مقصود کی طرف جا رہی ہے اور یہی وطن کی سب سے بڑی خدمت ہے +

مناظرہ و مشاعرہ

اور

انعامی اعلان

ذیل میں مشاعروں کے لئے نظموں کے موضوع اور غزلوں کی طرحیں دیج کی جاتی ہیں

موضوعات نظم

ہمارا وطن ————— مقصد حیات ————— دیہات کا ایک نظر

مصرعہ طے طرح

۱۔ پریشاں ہو کے میری خاک آخر بدل نہ بن جائے

۲۔ مدد شکر کہ پھر زیست کا ساماں نظر آیا

۳۔ حال دل بھی سنا کے دیکھ لیا

ان کے متعلق انعامی مقابلہ بھی ہوا۔ مندرجہ بالا موضوعات میں سے کسی موضوع پر بہترین نظم کے لئے ”انجمن اردو پنجاب“ کی طرف سے ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا تھا اور مصرعہ طے طرح میں سے کسی ایک پر بہترین غزل کیلئے کرنل شاپ مار کی لاہور کی طرف سے بھی ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا تھا۔ کسی موضوع پر بہترین مزاحیہ نظم کے لئے بھی ایک طلائی تمغہ مقرر تھا۔ بہترین نظم یا غزل کے علاوہ انعامی نظموں یا غزلوں میں سے جو نظمیں یا غزلیں منتخب کی گئیں جو مقابلہ کے لئے مقررہ تاریخ کے بعد آئیں ان میں سے چند منتخب نظمیں اور غزلیں یہاں کے اس نمبر میں دیج کی جاتی ہیں۔ جو شعرائے کرام مقابلہ میں شریک نہ ہوئے ان کی نظمیں اور غزلیں بھی انہیں صفحات میں شائع کی گئی ہیں۔

”ہم آئیں“

پہنچے کھڑے ہوئے

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
تقریرانہ صی	سہن الہامہ	بلکہ عرش	بش درن راز	جلال الدین اکبر	حقیقہ ہر شایہ	فیض حسد

کھڑے ہوئے

۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶
مہولہ ام پش	آترابہودی	آسان دانش	ماد علی خاں	تاجہ غیب آبادی	بشیر احمد	حیرت دارانی	تائیر	غلام مصطفیٰ انجم

کریوں پر بیٹھے ہوئے

۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶
مہولہ اللطیف تپش	غلیظہ عبدالحکیم	اودے گلکشاہق	ردش صدیقی	تافغانی	سررب مقامہ	جوش ملیح آبادی	بدغازی احمد	سراج لکھنوی	قدیر لکھنوی

(سردار شاہ)

انعامی نظمیں

مقصدِ حیات

از محترمہ زینب عثمانیہ صاحبہ سیکم امین بہاء الدین صاحب قار

اس نظم پر شاعر کو انجمن اُردو پنجاب کا طلائی تمغہ پیش کیا گیا۔
”ہمایوں“

بھول کے بھی نہ درد کو دل سے کبھی جُبِ را سمجھ
شاہدِ دل نواز کی یہ بھی کوئی عطا سمجھ
امن کی آرزو نہ کر امن کی آرزو ہے موت
ہر نفسِ حیات کو درد میں مُبتلا سمجھ
منزلِ ہست و بود میں تیرا مقام ہے بلند
مہروبہ و نجوم کو اپنے نشانِ پا سمجھ
شاہرہ حیات میں رہبر و راہزن نہ بن
اپنے سفر کا مددگار اس سے کہیں ہوا سمجھ
تیرے حریمِ قلب کی خاک میں جب جمود ہو
فتنہ کوئی اٹھا سمجھ حشر کوئی بپا سمجھ
تیری صفائے قلب کا دہریں امتحان ہے
خود کو بشر سمجھ مگر قدسیوں سے ہوا سمجھ
پردہ چشم سے ترے اشک جھلک رہے ہیں زیب
دنِ امن کا ثنات کو موتیوں سے بھرا سمجھ!

مقصدِ حیات

ما جی فن فن کی مزاحیہ نظم ہے پر کمال اندیا نمائش کے آل انڈیا شامو غلامی نمائش کی گیار۔

زندگی کیا چیز ہے کس دس کی سوغات ہے ؟ آؤ ہم بتلائیں کیوں جیتے ہیں ہم کیا بات ہے

زندگی اپنی نمائش گا دِ مصنوعات ہے چاروں بجلی کے لمپ اور پھر اندھیری رات ہے

آئے ہیں دُنیا میں ہم کچھ کام کرنے کے لئے

کچھ خدائے اور کچھ ہیوی سے ڈرنے کے لئے

ہے جوانوں کے لئے سنہا میں جانا زندگی حبیب میں پانی نہ ہو مٹائی لگانا زندگی

مہ و شول سے باغ میں آنکھیں لڑانا زندگی غلخانے میں اکھیلے گنگنا نا زندگی

عشق بازی اور موسیقی نہیں تو کچھ نہیں

اور کچھ کچھ مے سے دلچسپی نہیں تو کچھ نہیں

شعر کہنا بھی بنا جاتا ہے جزو زندگی نام چھپ جانا رالے میں ہے حدِ شاعری

نثر میں اشعار کہہ لینا ہے اک صنعت نئی اور اگر یہ بھی نہیں خالی تخلص ہی سہی

نام کے ساتھ ایک دو الفاظ کی دم چاہئے

شعر بے معنی سہی لیکن ترنم چاہئے

عہد آزادی عروسی قید کا قائل نہیں اور اگر ہو بھی تو ایسے شعر کچھ مشکل نہیں

مُرّتش جذباتِ قلبِ مَرّتم حل نہیں نکمّتِ عارضِ شمیمِ فطرتِ حاصل نہیں

سبزہ شوریدہ سارا وارڈ الزام ہے

محملِ لیلیٰ سرورِ درِ اغنوں ورجام ہے

زندگی کا ایک مقصد لیڈری کرنا بھی ہے چندہ کھا کر قوم کی اُلفت کا دم بھرنا بھی ہے

ٹمک پر جاں دینا لفظی طور پر مرنا بھی ہے اس پہ مُردہ باد کے نعروں سے کچھ ڈرنا بھی ہے
گرم مجلسوں میں رہے ہنگامہ کوں و فساد
کان میں آتے رہیں بس نعرہ ہائے زندہ باد

سامنے مسجد کے گانے پر بھی جھگڑا چاہئے اور کبھی قومی ترانے پر بھی جھگڑا چاہئے
ہوسکے تو ذبح خانے پر بھی جھگڑا چاہئے اور کبھی کونسل میں جانے پر بھی جھگڑا چاہئے
بن کے لیڈر سو رہے تو زندگی کس کام کی

امن قائم ہوگیب تو لیڈری کس کام کی

مقصدِ حجام ہے عورت بنانا مرد سے مقصدِ عاشق ڈرانا بہت کو آوارہ سرد سے
کام ہے پولیس کو آوارہ کوچہ گرد سے ڈاکٹر کو اکیس سے سے اور دل پر درد سے

ہے یہ ایڈیٹر کا مقصد جنگ چھڑ جانے کیس

یہ نہیں تو مسلم وہن دہی بھڑ جانے کیس

کام بیکاروں کا ہے شام و صبح غم دیکھنا اہل دفتر کی طوف با چشم پر نیم دیکھنا
جلسہ میں قومی رضا کاروں کا اودھم دیکھنا صبح دم اخبار میں "وائٹنڈ" کا کالم دیکھنا

ان غزبوں کا کوئی مقصد بھی برآتا نہیں

اب کہیں لکھا "ضرورت ہے" نظر آتا نہیں

زندگی کے اور مقصد بھی ہیں انسان کے لئے کوئی ایساں کے لئے ہے کوئی زنداں کے لئے
منتظر ہے کوئی جنگ بوس وں جاہاں کے لئے زندگی حق لق کی ہے اخبار "احساں" کے لئے

میرا خامہ رات اور دن مقب لقلقیات ہے

چاروں کی چاندنی ہے پھر اندھیری ات ہے

انعامی غزل

(پینڈت بالکند صاحب عرش لیانی)

اس طرح غزل پرنکرنال شاپ اتار گئی لاہور کی طرف سے طوائف تھو پھیر کیا گیا۔ ”ہمایوں“

زخمِ دل بھی دکھا کے دیکھ لیا	بس تمہیں آ زما کے دیکھ لیا
دارغِ دل سے بھی روشنی نہ ملی	یہ دیا بھی جلا کے دیکھ لیا
شکوے رٹتے ہیں کیونکر آپ آپ	سامنے اُنکے جا کے دیکھ لیا
مژدہ آئے حسرتِ دل پر شوق	اُس نے پھر مسکرا کے دیکھ لیا
نہ گئی ان کی تمکنت نہ گئی	بارہا سر جھکا کے دیکھ لیا
جو نہ دیکھا تھا آج تک ہم نے	دل کی باتوں میں آ کے دیکھ لیا
آبرو اور بھی ہوئی پانی	اشکِ حسرت بہا کے دیکھ لیا
لطفِ جو بہ خودی میں تھا وہ کہاں	ہوش میں ہم نے آ کے دیکھ لیا
ترکِ لُفت کے سُن لئے الزام	رازِ دل کو چھپا کے دیکھ لیا

کوئی اپنا نہیں یہاں آئے عرش

سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

”موضوعی نظمیں“

”مقصدِ حیات“

مقصدِ حیات کے موضوع پر ذیل کی چند نظمیں خاص طور پر قابلِ تعریف ہیں :-

۱۔ مقصدِ حیات

(آغا آفتاب اطر قریبا شش)

پوچھتا کیا ہے مری ہستی کا مقصد ہم نشین !
ظاہری عالم ہی تک تیری نظر محدود ہے
ماذی اشیاء پر ہے تیرے تخیل کی اساس
سطح پر حیوانیت کی میں اُتر سکت نہیں
میرا مقصد تو ملائکے بھی ہے اعلیٰ کہیں
میری ہمت لامکاں میں کرتی ہے جولانیاں
میری منزل۔ منزل شمس و قمر سے دور ہے
میرے مقصد کی بستی کا بھلا کیا پوچھنا
ہوں ازل کے دن سے میں اِزیت کا امین
جس امانت سے زمین و آسمان کو تھا حذر
میری فطرت کی بستی کو تو پا سکت نہیں
تو بھتا ہے سرت ازیت کا مقصد وہ ہے ؛
کس طرح سمجھاؤں تجھ کو ا حقیقت ناشناس
میں غلامی نفس کی برداشت کر سکت نہیں
پوچھ لے روزِ ازل سجدہ کیا تھا یا نہیں
ہیں تارے آسمان کے میری گردِ کارواں
آسمانوں سے پرے ا حدِ نظر سے دور ہے
خود مری ہستی ہے موجبِ دہر کی تخلیق کا
تُو عرفاں سے ہے تابندہ مری لوحِ جبین
وہ امانت بڑھ کے لے لی میں نے اپنے دوش پر

مختصر یہ ہے نہیں تخلیق میں ثانی مرا

جلو ڈال ہوں مقصدِ ہستی ہے لانانی مرا

۲۔ مقصدِ حیات

(جنابِ الطافِ مشہدی)

مرے خامہ میں ایسی قوتیں ہوں مضطرب یا رب

جو ماؤں کو کریں مجبور یہ آواز دیتے پر
مرے نورِ نظر! جامِ شہادت جلد خالی کر
عروسِ نو کے دل میں جو کریں یہ آرزو پیدا
مرے شوم کا غل کر دے خزاں میں نگہ بُو پیدا
جو ہمشیر و کوکر دیں یہ دُعا دینے پر آمادہ
مرا بھائی ہو دل پر بچیاں لینے پر آمادہ
جو انوں کو کریں مجبور جو سب دال میں آنے پر
جگر کی قاش کے خنجر سے ہلک کو چھکانے پر
جو ہونٹوں کو ابھاریں اس طرح تقریر کرنے پر
کہ نثر جائیں جواں عسریاں لبِ شمشیر کرنے پر
جو آنکھوں کو کریں غنیمتِ مناظر کے لئے نیکل
جو چھاتی کو کریں نوکِ سناں کے اسطے پاگل
جو سینے کو عطا کر دیں وطن کی چاہ کی سوزش
جو شاعر کے تخیل میں بھریں اُس آہ کی سوزش
کہ جس سے قصہ استبداد میں پہل ہی پر جائے
مرے اُجڑے موٹے ہندوستان میں پھر بہا آئے

مرے خامہ میں ایسی قوتیں ہوں مضطرب یا رب

۳۔ خاتون ہند کا مقصد حیات

(خواجہ معین الدین عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

فخر مشرق، نازنین ہند، اے جان وطن!
زندگانی تیری عالم کے لئے درس حیا
زینتِ بزمِ فلک ہے انجمِ رخشاں اگر
مرد پر لگتے ہیں جب تیرے جھائے آسمان
ہاں ستم سستا ہے جب گردوں گرواں کے غریب
اک ادا ئے دلکشا سے محو ہو جاتے ہیں غم
شوقِ آرائش تجھے زیبا نہیں اے نازنین
عفت و عصمت سے ہے توقیرِ عالم میں تری
قوم کی کایا پلٹ سکتی ہے تو اک آن میں
آج وہ اگلی اولوالعزمی تری نایاب ہے
خلق کی خدمت ہمیشہ چاہئے تیرا شعار

پیکرِ ناموس و عزت، منظرِ شانِ وطن
ہر عمل تیرا سراپا شرحِ ابوابِ وفا
محلِ مشرق ہے تیرے حسن سے تابندہ تر
دل کے کاشانے پہ جب گرتی ہیں غم کی بجلیاں
ٹھوکریں کھاتا ہے جب سنگِ حوادثِ غریب
تیرے باعث سے ہیں گھرِ رشکِ گلستانِ ارم
غانہ رنگِ تکلفِ تجھ پہ کچھ صحبتِ انیس
پاکبازی سے ہے تو دیوی 'مریمِ قدس' کی
کاش! پیچھے رہ نہ جاتی علم کے میدان میں
پھر زمانہ "چاندنی بی" کے لئے بیتاب ہے
گتھیوں کو قوم کی سلجھا کے پھر گیسو سنوار

دیکھ! بھٹکا کر نہ لے جائے ہو اے روزگار

.. بان! سنبھل کر پاؤں رکھ ہے یہ روٹھل گزار

ہمارا وطن

اس موضوع پر ذیل کی نظموں نے شاعرہ میں خراج تحسین حاصل کیا :-

اترائے وطن

(حضرت ساغر نظامی)

اے وطن ، اے وطن ، اے وطن !

جان من ، جان من ، جان من !

(۱)

ڈرتے ڈرتے میں محفل بجا دینگے ہم تیرے دیوار و درجگا دینگے ہم
تجھ کو ہستی کا گلشن بنا دینگے ہم آسمانوں پہ تجھ کو بٹھا دینگے ہم

بن کے دشمن ترا جو اُسٹے گا یہاں

اُس کو تخت الشرطے میں گرا دینگے ہم

اور تخت الشرطے کو فنا کے سمندر میں غرقاب کر کے بہا دینگے ہم

اے وطن ————— اے وطن !!

سُن لیں یہ اُنسُ جانِ وزمین وزمن

اے وطن ، اے وطن ، اے وطن

جان من ، جان من ، جان من !

(۲)

سُسنے والوں کو اک دُجگا دینگے ہم رسم و راو غلامی بٹھا دینگے ہم

بربریت کے محوٹے اُڑا دینگے ہم آسمان وزمین کو ہٹا دینگے ہم

کون کتنا ہے کمزور اُنزل ہے تو

ہر طرف نوح کے دریا بہا دیئے ہم
جس طرف سے پکارے گا ہندوستان اُس طرف ہی دنیا کی صدا دیئے ہم

اے وطن ————— اے وطن
سرے باندھے ہوئے ہیں ترنگا کنن
اے وطن ، اے وطن ، اے وطن !
جان من ، جان من ، جان من !

(۳)

تیری ہستی ہمالہ کی چوٹی بنی ماہ و خورشید کی اس پر بندی لگی
روشنی شرق سے غرب تک ہو گئی سجدہ میں جھک گئی عظمتِ زندگی
عظمتِ زندگی کی قسم ہے یہیں
تیری عزت پہ سر تک کٹا دیئے ہم
وقت آنے دے اے ماں ! ترے نام پر اپنی ہستی و مستی مٹا دیئے ہم

اے وطن ————— اے وطن !
خون سے اپنے بھر دیئے لنگ و جمن
اے وطن ، اے وطن ، اے وطن !
جان من ، جان من ، جان من !

(۴)

مست و غشبو ہواؤں شیتل ہے تُو مادھری ہے منوہر ہے ، کول ہے تُو
پریم مدر کی لہر و زچھا گل ہے تُو سر پہ عالم کے جھٹکا ہادل ہے تُو
آکھ اُٹھ کے جو دیکھا کسی نے تجھے
چھاؤنی اپنی لاشوں سے چھا دیئے ہم
تیرے پاکیزہ پنکھ کو روحوں کی باریک چادر کے نیچے چھپا دیئے ہم

اے وطن ————— اے وطن!
 تجھے پہ قرباں زرو مال اور جان و تن
 اے وطن، اے وطن، اے وطن!
 جان من، جان من، جان من!

(۵)

تیری نمایاں ریلی، مہر، نغمہ خواں
 تیرے گل بھی بہتے ہوئے گلستاں
 تیرے گلشن بھی رشک بہارِ جاناں
 زندہ باد اے غریبوں کے ہندوستان!
 تیرا سکہ دلوں پر بٹکا دینگے ہم
 جو بھی پوچھے گا جنت کا ہم سے پتہ راہ کشمیر اُس کو بتا دینگے ہم

اے وطن ————— اے وطن!
 تو چمن درجمن ہے عدن در عدن
 اے وطن، اے وطن، اے وطن!
 جان من، جان من، جان من!

(۶)

گلشنِ عیش و آرامِ راحت ہے تو بے کسی میں کناراِ مہبت ہے تو
 بے بسوں اور غلاموں کی دوا ہے تو زندگی کے جہنم میں جنت ہے تو
 پہنچ کر خونِ دل سے تری کیا ریاں
 اور بھی تجھ کو جنت بنا دیں گے ہم
 ہو وہ گلچس کہ صیادا، دونوں کے سر تیرے قدموں پر اکٹاؤں بھگاؤں گے ہم

اے وطن ————— اے وطن
 فہم تو بے پھول ہیں تو ہمارا چمن

اے وطن، اے وطن، اے وطن!

جان من، جان من، جان من!

(۷)

جس کا پانی ہے ارٹ و مخزن ہے تو جس کے دانے ہیں کبلی و خزن ہے تو

جس کے لنگڑیں ہیں مہل و مہل ہے تو جس سے جنت ہے دنیا و گشت ہے تو

دیویوں، دیوتاؤں کا مسکن ہے تو

تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دیں گے ہم

تیری الفت نہیں اسے سنار میں تیری عظمت کا ڈھکا بجا دیں گے ہم

اے وطن — اے وطن

یہ یمن، یہ وقار اور یہ بانگین

اے وطن، اے وطن، اے وطن!

جان من، جان من، جان من!

(۸)

یہ ستارے، یہ نکھرا ہوا آسمان آسمان سے ہمالہ کی سرگوشیاں

ہے تری عظمتوں کا اٹل راز داں مستقل معتبر، محتشم، جاوداں

اس کی چوٹی سے دنیا مئے خود بخوار کو

پھر پیامِ حیات و وفا دیں گے ہم

پھر محبت کا نغمہ سنا دیں گے ہم پھر زمانے کو جیسا کہما دیں گے ہم

اے وطن — اے وطن

زندگی پھر بھی لے گی ہماری شرن

اے وطن! اے وطن!! اے وطن!!!

جان من، جان من، جان من!

۲۔ اے کشورِ ہندوستان

(حضرت روتش صدیقی)

اُونچا رہے تیرا نشان

اے کشورِ ہندوستان

اُونچا رہے تیرا نشان

پھر شعلہ افشاں نغمے آتشِ زنِ مضر اب ہیں
پھر ولولوں کی تیرہ موجیں عالمِ سیلاب ہیں
پھر نوجوان ہست کی ہر سانس میں بیتاب ہیں
بیداریوں کے قافلے آزادیوں کے کارواں

اے کشورِ ہندوستان

اُونچا رہے تیرا نشان

ہے زریں دامنِ شفقِ خونِ شہیدانِ وطن
گہوارۂ خورشید ہے چاکِ گریبانِ وطن
پیغمبرِ صبحِ وطن! ہیں نوجوانانِ وطن

اے خلد سے لائی ہوئی رنگیں بہاؤں کے وطن
کوڑھے جن میں موجزن اُن آبشاروں کے وطن
نازناں ہے جن پر ایشیا اُن کوہساروں کے وطن
بے کیف تیرے سامنے افسانۂ باغِ جنال
اے کشورِ ہندوستان
اُونچا رہے تیرا نشان

تھا زندگی کے نور سے معمور کاشانہ ترا
اے شمعِ تہذیبِ کمنِ عالم تھاپروانہ ترا
خورشیدِ انجم کو ابھی ہے یادِ افسانہ ترا
وہ عمد زریں آج تک مجھوا نہیں ہے آسمان
اے کشورِ ہندوستان

اُونچا رہے تیرا نشان

باطل کبھی تنویرِ حق کی تابِ لاسکت نہیں
شمعِ جلالِ حریت کوئی بجھا سکتا نہیں
کوئی بھی اب تجھ کو غلامتِ بنا سکتا نہیں
ہے ذرے ذرے کی رگوں میں خونِ آزادی رواں
اے کشورِ ہندوستان

اُونچا رہے تیرا نشان

جنت کو پھر تیری فضاؤں میں بسایا جائے گا
آزادیِ افکار کا مرثدہ سُنایا جائے گا
انسانیت کا تجھ کو گوارہ بنایا جائے گا
وہ دن بہت نزدیک ہے از فضلِ تُو جہاں
اے کشورِ ہندوستان

اُونچا رہے تیرا نشان

اُفتان و خیزاں بھاگتی جاتی ہیں سب تاریکیاں

اے کشورِ ہندوستان

اُونچا رہے تیرا نشان

ہمدوشِ شیخ و برہمن اُٹھے ہیں تیری گود سے
پردانہ شمعِ وطن اُٹھے ہیں تیری گود سے
خضرِ لیرانِ زن اُٹھے ہیں تیری گود سے
جن کا غبارِ کارواں ہے آج خضرِ کارواں
اے کشورِ ہندوستان

اُونچا رہے تیرا نشان

حبِ وطن کی لہر ہے بیگاؤ و زنجیر پھر
ہلنے لگی ہے ظلم و استبداد کی تعمیر پھر
آزادیوں کے خواب ہیں دامنِ کشمیر پھر
پھر انقلابِ دہرنے بدلا ہے اندازِ جہاں
اے کشورِ ہندوستان

۳۔ ہندوستان کا قومی ترانہ

(جناب خاں بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر سابق گورنر کشمیر)

(۱)

ہائے میرا جان سے پیارا وطن
یہ مرا ہندوستان جنت نشان
وہ ہمارے پرچمِ آفتاب
کوٹلوں اور قمریوں کا نغمہ زار
مشرقی تہذیب کا چشم و چراغ
اولیاء اور اوتاروں کا گھر
کیسے کیسے اس سے اٹھے شورِ بے
اپنوں بیگانوں کا ٹھکرایا ہوا
تنگدستی فاقہ دستی کا شکار
چارہ گر جس کے غلاموں کے غلام
ہائے میری آنکھ کا تارا وطن
یہ مرا فردوسِ نظرِ نفاہ وطن
صبح دم جلوں کا فوارہ وطن
سروسنبل کا چمن پیارا وطن
ایشیا کا دل جگر پارہ وطن
عشق اور عرفاں کا گوارہ وطن
کتنے میدانِ جیت کر ہارا وطن
پھوٹ کا اور لوٹ کا مارا وطن
یہ مرا مفلس زمیندارہ وطن
وائے بیچاروں کا بے چارا وطن

(۲)

مسجد اور مندریں جو پیکار کیوں
ہم نوا ہمدم تھے ناقوسِ واذال
ان بتوں کی بھی خدائی تھی کبھی
اب جو کعبہ ہے کبھی بُت خانہ تھا
اُسے گوردوارے کے لال! اسے گیسودراز
تو بھی دُور اندیشِ وحدتِ کیش ہے
یہ نزاعِ سجدہ و زنا کیوں
ان میں اب چلنے لگی تلوار کیوں
بندگی سے یہ نہیں بیزار کیوں
شیخِ جی! عشقِ بتاں سے عار کیوں
ہو یہ برہم گیسوئے خدائے کیوں
تیری مُسلم ہے رہے تکرار کیوں

لیڈروں کا ہر طرف طوفان ہے
یہ جلو سوں کے جنازے کس لئے
ابھوں پر چھا گئے عمیاریوں
یہ تماشا بر سر بازار کیوں
ملک پر یہ پھوٹ کی پھٹکار کیوں
قوم میں ان بن کی لعنت تاجکے
کیوں غنی محتاج سے کھچتا رہے

(۳)

اب مہوں سے لو لگانا چاہئے
عید پنڈت کو منانا چاہئے
اُن کی اُلفت آزمانا چاہئے
شیخ کو ہولی کھلانا چاہئے
اور یہ دونوں بچڑ بیٹھیں اگر
جن کی لو سے بزم میں لگ جائے آگ
مذتوں مسلم یہاں مہاں رہا
گائے تو مالک ہے سب گھربار کی
اب تو بھارت دیس کے زیرِ علم
گو بہت ہوں رہتوں کے ہیر پھیر
خود زباں سے بھی زباں مل جائیگی
شعلہ زن ہے ہر طرف میشین گن،
ہیں وطن کے سورما یہ نوجواں
گلشن اُلفت میں یہ پھولیں پھلیں
ایک دن پھڑپھڑے ہوئے مل جائیں گے

ہم کو ناظرِ بزمِ قومی کے لئے

یہ ترانہ چاہئے

۴۔ ہمارا وطن

(پہنٹ بالکن صاحب عرش ملیانی)

۱۔ پھلوں سے لدے جس کے اشجار ہیں مکتے ہوئے جس کے ٹکڑا رہیں
نرالی ہے جس کے گلوں کی پھین

۲۔ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن — ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
ٹھکاب اور بوجی کی جس میں ہمارا سمن ہے جہاں ہر چمن کا سنگار
کھلے ہیں جہاں زگس و نستر

۳۔ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن — ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
ہے پورب سے پچھم ترالا جہاں ہے اثر کا دوسرا ہمالہ جہاں
مکاری جہاں ہے غزس و گن

۴۔ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن — ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
کہیں گوشتی، بیاس، گوداوری کہیں سندھ اور شیدا، تاپتی
کہیں جس میں بستے ہیں لگت جمن

۵۔ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن — ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
ہراک پھل ہراک پھول ہر رت جہاں ہواؤں میں جس کی ہے غمبر نماں
فضائیں ہیں جس کی چمن درچمن

۶۔ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن — ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
پہیلا پھارے جہاں پانی کمال عنادل سنائیں ترانے جہاں
ہے آموں پر کوئل جہاں فتمہ زن

۷۔ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن — ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
اناج اور میووں کی کثرت جہاں ہے پانی میں بھی رک ملاوت جہاں
بناتا ہے جو ہم کو شیریں سخن

۸۔ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن — ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
کیا جس کی مٹی نے پیدا نہیں نہ کیوں خسرے اس کا ہم نام لیں
تکبیل کے سب شیخ اور برہمن

۹۔ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن — ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

۵۔ ہمارا وطن

(مختصر ترین مضمون بانو نگیم آغا نصابہ)

ان آنکھوں کا تارا ہمارا وطن ہے	جو آیا یہیں اُس نے آسن جمایا
دل و جاں سے پیارا ہمارا وطن ہے	جو آیا وطن اس کو اپنا بنایا
جہاں کا سہارا ہمارا وطن ہے	کسی کو بھی در سے نہ جس نے پھرایا
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ہے	ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ہے

زراعت کے جس کی جہاں پیٹ پالے	یہیں سواٹھے لے کے سب اپنا ساک
تجارت کے ہر ملک دولت کمالے	کرشن اور گوتم کبیر اور نانک
محبت جہاں رنگ اپنا جمالے	سنا تا ہے جو داستانگی اب تک
ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ہے	ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ہے

جو ہر دورِ ماضی کو چمکا چکا ہے
 زمانے کو جو نفع پہنچا چکا ہے
 غلامی سے جو تنگ اب چمکا ہے
 ہمارا وطن ہے ہمارا وطن ہے

۶۔ ہمارا وطن

(سید فیضی صاحب جالندھری)

ہر ذرہ ہے زمین وطن کا مہ تمام ہر ذرہ ہے زمین وطن کا خاک مقام
ہر ذرہ اس زمین کا ہے جنت کے ہم کلام اللہ رے وطن کی یہ صبح اور وطن کی شام

ہر سال اس زمین پر بقاء کے دوام ہے

اس کے بہشت ہونے میں کس کو کلام ہے

کشمیر اس زمین پہ ہے دنیا میں انتخاب پنجاب اور دکن کا نہیں دہریں جواب
بنگال اور آودھ کا ہر اک ذرہ آفتاب گنگا و جمن ہیں بہتا ہے شہد اور شیر ناب

اس کا ہمالہ میرے لئے رشک طور ہے

ہر رنگ اس کا غیرت صد کوہ نور ہے

اس سرزمین نے زورِ قلم دیا مجھے اس سرزمین نے معجزہ قلم دیا مجھے

اس سرزمین نے سوزِ قلم دیا مجھے سینہ میں ولولوں کا تلاطم دیا مجھے

اس خاک نے کیا مجھے عالم میں سرفراز

دہن پہ اس کے کیوں نہ پڑھوں آج نہیں نماز

گو قلم نے جس کی گود میں آکر جنم لیا ناک نے جس زمین پہ پیغام حق دیا

ایک نے جس کی خاک پہ جامِ فنا پیا بابر نے فیل فتح کو جس پر رواں کیا

ہر ذرہ جس کا میرے بزرگوں کی جان ہے

دوسرے زمین پاک یہ ہندوستان ہے

وابستہ اس کی آب و ہوا سے ہے اپنا دم ہونے نذیر کے اب اسے ہم موردِ اہم

ہندو ہو سکھ ہو یا ہو مسلمان مل کے ہم کھاتے ہیں اے وطن تری عزت کی اب قسم

اس تیری خاک پاک پہ سب نواں بھائیگی

جو منہ سے کہہ رہے ہیں تجھے کہو کھائیگی

۷۔ ہمارا وطن

(سید عنایت علی صاحب آغا)

وہ نظر افروز فطرت آئینہ دارِ کمال
حُسن رنگارنگ میں وہ شہکارِ ایشیا
چاندنی راتوں کو شرماتے ہیں جیسے بامِ در
فروزِ فردا اپنی جگہ مجموعہٴ عہدِ شباب
خود ہمالہ جس کی عظمت کا علمبردار ہو
پہلوں میں جس کے کساروں کی نگینیں ادا ہیں
سبزہ زاروں کی وہ شامِ اس پر شبنمِ زاروں کا رنگ
جس کے بحرِ ویر پست تان گھٹا چھائی ہوئی
ہر طرف دشت و چمن کی اک زالی شان تھی۔۔۔ جو بھی رنگینی تھی خود رنگینوں کی جان تھی
جل رہے تھے غفلوں میں جس کی ندیوں کے چراغ
وہ کرشن اور اُس کی مٹی کی صدائیں چاروں
خاکدانِ ہند سے گوتم اٹھانا نکلتا اٹھا
ہند کی اس خاک سے کیا کیا رشی پیدا ہوئے
کیا کہیں اُس عہدِ زریں کی حقیقت کیا کہیں
ہند کی راہوں میں اُردوں کے قدم آئے نہ تھے
تک یہی تھیں فورے اختیار کی نظریں اسے
اک گھٹا وسط ایشیا سے جو اٹھی اور آگئی
وہ ہوا بدلی تغیر کا رُخ ماہو گیا
کوروؤں سے پانڈوؤں کی جنگ کے وہ سلسلے
بھائی اپنے دوسرے بھائی کا دشمن ہو گیا

چشمِ مہر و ماہ میں وہ پیکرِ حسن و جمال
تازہ تر تابندہ تر نقشِ ہمارا ایشیا
جس کے ذرے سُکرائیں انجمِ شب تاب پر
حُسن کا نادر صحیفہٴ عشق کی نادر کتب
کاروانِ اوج کا جوقِ فنا سالار ہو
وہ جس شہروں کا عالم وہ حسیں آبادیاں
جس کے گھراؤں میں فطرت کے گھراؤں کا رنگ
جس کے دشتِ در کی فطرت جوش پر آئی ہوئی
ہوں اُجاگر جن سے ہمارے پتوں کے دماغ
گیان کی گیتا کہ ہو ہر آفت کو آرزو
صاحبِ عرفاں تھا اک اک فرد اپنے وقت کا
کیسے کیسے مجسمِ واجن سے جرمی پیدا ہوئے
دہریں مانی ہوئی تھی اپنی عظمت کیا کہیں
ہاں ابھی اہل عرب اہل عجم آئے نہ تھے
چاہتے تھے سب یہی تخیلِ مکر لیں اسے
چھا گئی ہر سست اس سبز میں پر چھا گئی
اور ہی رنگِ اس بہشتِ رنگ و بو کا ہو گیا
خود غرض آپس میں ہی ہست و گریباں ہو گئے
باپ کے رستے میں بیٹا خود ہی بھرن ہو گیا

انفرادی صورتیں گھر بار کھو کر رہ گئیں
 عام خانہ جنگیوں نے حشر برپا کر دیا
 ہند کے اس روز بد کو تک رہی تھی شام ہند
 رنج کیا اس کی طوفان ایک ایک کٹور گیر نے
 رنگ لائے جنگ مجرمی صاحب تسخیر بھی
 بڑھ گئیں کچھ اس قدر غیروں کی چیرہ دستیال
 کام اپنا ایسے عالم میں سیاست کر گئی
 پہلے قانونی شخصوں میں کیا بے دست و پا
 اس طرح آزادی ہند وستان رخصت ہوئی
 ہند نے پستی سے پھر اپنے لئے دھونڈا عروج
 آکے اسلامی سلاطین نے اسے چمکا دیا
 یادگار عہد میں ان کے نقوش پائدار
 رفتہ رفتہ صافان حق کے آئے کچھ گروہ
 دکھ میں جب ہر اتنا تسکین کی طالب ہوئی
 ہر نظر پر غراجہ واقعات کے جوہر کھلے
 اللہ اللہ ہند روحانی تصرف کا مقام
 اس طرح گوتم کی تعلیمات زندہ ہو گئیں
 بل گئی تہذیب ہند اسلام کی تہذیب سے
 پھر کئی تہذیبیں آئیں اور اسے پرچالیا
 ہندو مسلم وطن ہے گر غلامی کا شکار
 دونوں قوموں کے لئے یکساں ہر تحریک وطن
 جو سوال آزادی کا مل کا ہوا اس وقت پیش
 ہم مسلمانوں کو بھی سوجاں سے پیارا ہے وطن
 ہند والو ہندو ہندو لہو سے ہمارا ہے وطن
 اجتماعی قوتیں تقسیم ہو کر رہ گئیں
 ابتری ہند کا ساماں ہت ہٹا کر دیا
 آخر اپنا رنگ لائی قسمت ناکام ہند
 لے لیا زخم میں اپنے یک قلم تسخیر نے
 بھیس میں سودا گروں کے آئے مانی گیر بھی
 ہو گیا تاراج یہ جنت نشان ہند وستان
 رنج استبداد رنگ میں سراسیمہ کر گئی
 پھر حکومت کو بہانہ تھا قیام امن کا
 یوں غلام آزاد ہو کر اور ہی صورت ہوئی
 عہد حق آئیں نے پھر اس کو دیا اپنا عروج
 اس کا تعمیری نشان افلاک تک پہنچا دیا
 ہند کی تاریخ جن سے ہے ابھی تک زندگار
 کی ریاضت پر ریاضت و دیباچہ نشنت کوہ
 مادیت پر یہاں روحانیت غالب ہوئی
 ہند میں اسلام کی تعلیم کے دفتر کھلے
 خدا جو دار الحرب پہلے اب بنا دار السلام
 یوں کرشن اور اس کی گیت کی صد میں گونج نہیں
 کی ترقی دونوں تہذیبوں نے اس قریب سے
 اپنے اپنے طور پر ہر ایک نے اپنا لیا
 ملک کی ہم دو بڑی قومیں ہیں اس کی ذمہ دار
 ہیں دو قالب ایک جان دونوں ہی نزدیک وطن
 آؤ ہم تم ہند کی خاطر نہیں اخلاص کیش
 ہند والو ہندو ہندو لہو سے ہمارا ہے وطن

۸۔ وطن

(حضرت قدیر لکھنوی)

وہ وقت اب کہاں کہ گل و سبزہ زار دیکھ مویں نسیم و دامنِ ابر بہار دیکھ
چشمِ سیہ میں منظرِ کیف و خمِ رخسار دیکھ کھو جا کسی کی یاد میں اور انتظار دیکھ

اے بے نیازِ سخنِ چین ہوشیار ہو

رمٹنے کو ہے بہارِ وطن ہوشیار ہو

تیری فضا اُداس، ترا بوستاں اُداس تیری زمیں اُداس، ترا آسمان اُداس
تیری شفق اُداس، تیری کمکشال اُداس نغمہ ترا اُداس ہے، تیری فضاں اُداس

حسرت برس رہی ہے وطن کی بہار پر

کیا اوس پر گئی چین روزگار پر

گلشن میں تیرے آگ لگی ہے، ہوا کو دیکھ مڑجھا کے پھول رہ گئے رنگ و فا کو دیکھ
رگ رگ سے روح کھینچ گئی، زو قفس کو دیکھ بیڑا قریب غرق ہے۔ اب نا خدا کو دیکھ

ڈوبی ہوئی ہیں نہر میں گھڑیاں شباب کی

آتی ہے ہر طرف سے صدا انقلاب کی

اے مستِ شوق و سرخوش کیفِ شرابِ چونک تاجِ ندامت ہے گایونہیِ مخو خوابِ چونک
بے کیف سا ہے اب ترا عہدِ شبابِ چونک گھیرے ہوئے ہے دیکھ تجھے انقلابِ چونک

ماہلِ وطن کے دیکھ کلیجے فگار ہیں

مدہوش! گل نہیں ترے دہن میں خار ہیں

اس دورِ ارتعاب میں جبکہ تُو نہ پاسکا اُڑے ہوئے وطن کا نہ نقشہ بنا سکا

گردشِ نصیب میں تھی ، نہ مرکز پہ آ سکا افسوس تُو نہ اپنا تمدن بڑھا سکا

خالی ہوا دماغ نہ سودائے خام سے

فرقہ پرست دیکھ ہے بدتر غلام سے

صنعت سے تجھ کو کام نہ حرفت سے واسطہ حُسنِ سلوک سے نہ محبت سے واسطہ

کچھ مقصدِ حیات ، نہ فطرت سے واسطہ ہے بھی اگر ۔ تو شومیِ قیمت سے واسطہ

قیمت سے لو لگائے ہوئے سو رہا ہے تُو

ہنستی ہے کائنات ۔ مگر رو رہا ہے تُو

اپنی نظر میں اپنے وطن کو نہ خار کر اپنے چین کی سیر نہ بیگانہ وار کر

کچھ تو علاجِ دردِ دل بے قرار کر دُورِ خزاں ہے ۔ ماتمِ فصلِ بہار کر

وہ ساز و برگِ عیش و ہلاں نہیں رہا

اب کیا کرے گا چاک ۔ گریباں نہیں رہا

آئینہ لے کے دیکھ تو کیا تیرا حال ہے حالتِ بیانِ درد ہے ۔ صورتِ سوال ہے

برہا دیوں کا اپنی ۔ تجھے بھی ملال ہے ! کچھ مادرِ وطن کا بھی ۔ تجھ کو خیال ہے

کمزوریوں پہ اپنی نہ تیری نظر گئی

کیوں ۔ آج تیری غیرتِ قومی کدھر گئی ؟

دیہات کا ایک منظر

اس موضوع پر ذیل کی نظمیں تال ذکر ہیں:-
تھاپوں

۱۔ دیہات کا ایک منظر

(حضرت وقار انہالوی)

ڈھاک کے پھول آم کے پھل چھاؤں ٹھنڈی نیم کی
روح کا سامان عشرت کیا رسید گیت میں
نہند سے معمور دلکش چاندنی راتوں کا رنگ
لے کے چوپایوں کے گلے خانہ دہقان سے
کھیت میں خود دار مزدور اور جفائش مخنتی
جن کے ویرانوں کی زرخیزی سے ولت شمسار
پاسدار عصمت مہم بلبل کنواری لڑکیاں
ناچتے ہیں گیت جن کے مخنتوں کے ساز پر
اک طرف ساون میں ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار
ریشم کھائے بادشاہت جن پہ ہفت اقلیم کی
گاؤں کی رتی کے ہاں ہر کسی کے ہریت ہیں
پنی کہاں کے سوزے پر سوز برساتوں کا رنگ
پھرتے ہیں چرواہے کس پیغمبر اند نشان سے
جن کا مسکا ہے عمل اور جن کا مشرب سادگی
جن کے غم خانوں کی خاموشی پہ ہنگامے نثار
ناشائیں رنگ بیش و کم ہیں کنواری لڑکیاں
چکیوں کی منضبط اور دل رُبا آواز پر
اک طرف اُن کے سریلے مست گیتوں کی بہار

گرمیوں کی دوپہر میں باہمی دل جوئیاں

سروپوں کی لمبی راتوں میں فسانہ گوئیاں

۲۔ دیہاتی لڑکی

(جناب نذیر احمد صاحب ظفر)

اے نورِ حسنِ فطرت، اے سادگی کی دیوی اے پھول کی جوانی اے چاندنی کی دیوی

آبادِ تجھ سے صحرا

تو شمعِ آرزو ہے ————— قصیرِ رنگ و بو ہے

ترشی ہوئی ادا ہے فطرت کے بانگین کی

یا ہے ہمارے خداں دیہات کے چمن کی

بجلی کا آئینہ ہے تیرا شبابِ کافر کلیموں کی نکستوں سے آباد تیرا پیکر

پُر نورِ تجھ سے جنگل

تو جلوہ حقیقت ————— تو نغمہ مسرت

— کٹیا تری قیامتِ جنت سے کم نہیں ہے

یہ وہ جگہ ہے جس میں آبادِ غم نہیں ہے

نغمے ترے نشاط اور سکین کی نشانی ہر کے سے تیری پیدا پیغامِ شادمانی

ذرتے بھی جھومتے ہیں

تو ہے فیضانِ نغمہ ————— یا ہے خدائے نغمہ

جس وقت تیری تانیں صحرائیں گونجتی ہیں

فرورس کی ہوائیں مُتیرا چومتی ہیں

گیتوں میں تیرے پنہاں گیتوں کی زندگی ہے آوازِ تیرسی گویا فطرت کی ہانسی ہے

طاثر ہیں تیرے ہمد

مونس تری چنبنی ————— نڈی تری سہیلی

صحرا کی دایاں بھی تجھ سے ہوئی ہیں روشن

ہے تیرے ہر ادا سے پیدا ہمارے گلشن

گاگر اٹھائے جب تو گھٹ سے آ رہی ہو ہلکے سروں میں کوئی گانا بھی گارہی ہو
اُس وقت کوئی دیکھے

بیرا شہاب رنگیں ————— یا ماہتاب رنگیں

جیسے ابھی چمن میں تازہ کھلی کھلی ہے

جیسے ابھی کنول کو دوشیزگی ملنی ہے

جب تو نہا رہی ہو تالاب کے کنارے گیسو کھلے ہوئے ہول جھڑتے ہولان سے نائے
اُس وقت کا نظارہ

اک کیفِ سہری ہے ————— مستی بھی مجھوتی ہے

وہ بعدِ غفلتِ سیرِ اسری سے کپکپانا

بھجولوں کا تیری وہ پھر تجھے ستانا

معنِ چمن میں جب تو کچھ پھول چن رہی ہو رنگین دستاویز کیوں کی سن رہی ہو
اور گنگنات رہی ہو

ہے دیدنی نظر ————— رنگین و کیف پرور

جیسے بہارِ تجھ میں تبیل ہو رہی ہے

رنگین مستیوں میں تجھ کو ڈبو رہی ہے

اے ذبہارِ محرابِ لالہ زارِ محراب ہے جنبشِ نظر میں تیری قرارِ محراب
اے کاش میرے بل کو

تو سرفراز کرتی ————— پامالِ ناز کرتی

لاریب تو ہی تنہا دیہات کی ہے رانی

اے کاش مجھ کو حاصل ہو تیری پاسبانی

طرحی غزلیں

طرح اول

حال دل بھی سنا کے دیکھ لیا

یہ مصرع طرح قلع دہلی کی مندر فیضی غزل سے لیا گیا ہے۔

جذب دل آزما کے دیکھ لیا	اُس نے کچھ مکر کے دیکھ لیا
اُن کے گھر داغ جا کے دیکھ لیا	دل کے کہنے میں آ کے دیکھ لیا
لوگ کہتے تھے چپ لگی ہے تجھے	حال دل بھی سنا کے دیکھ لیا
جاؤ بھی کیا کرو گے مہروں	بارہا آزما کے دیکھ لیا
حُسنِ کیا ب نغمہ ہے نایاب	شہر در شہر جا کے دیکھ لیا
جنس دل ہے یہ وہ نہیں سودا	ہر جگہ سے منگ کے دیکھ لیا
وہ اثر جن کو دل ترستا تھا	آگے آگے دُعا کے دیکھ لیا
ادھر آئینہ ہے ادھر دل ہے	جس کو چاہا اُٹھا کے دیکھ لیا
نہ لیا اُس نے خط شراست سے	نامہ بر کو بُلا کے دیکھ لیا
اب خریدار ہی نہیں کوئی	مول اپن بڑھا کے دیکھ لیا
قابلِ آشیاں کوئی نہ ملا	تینکا تینکا اُٹھا کے دیکھ لیا

دارغ نے خوب عاشقی کا مزا

جل کے دیکھا جلا کے دیکھ لیا

لے اس سلسلے میں جذبِ عرش کی انعامی غزل منہ بول میں ہے۔ ”ہاویوں“

ا۔ غزل

(پروفیسر عبداللطیف صاحب تپش)

وہ چلے مُکرا کے دیکھ لیا	قصہ غم سنا کے دیکھ لیا
ہم نے یہ بھی اٹھا کے دیکھ لیا	ایک دھوکا تھا پردہ غفلت
تم کو دل سے بھلا کے دیکھ لیا	ہو گئی زندگی وبال مجھے
اُن سے آنکھیں لڑا کے دیکھ لیا	جو تماشا کبھی نہ دیکھا تھا
نقشِ ہستی مٹا کے دیکھ لیا	کچھ نہ تھا جزِ فریبِ ناکِ نمود
شمع سے لو لگا کے دیکھ لیا	داغِ تھی انتہائے دلسوزی
موت کو بھی بھلا کے دیکھ لیا	یہ بھی تو وقت پر نہیں آتی
خواب میں تم نے آ کے دیکھ لیا	حشرِ بزمِ خیال کا میری
اگ گھریں لگا کے دیکھ لیا	جو تماشا تھا طور پر ہم نے
بارہا زہر کھا کے دیکھ لیا	تلخیِ غم نہ ایک دن بدلی
ہاتھ پاؤں ہلا کے دیکھ لیا	نہیں کھلتا نصیب کا عقدہ

ان حسینوں کا اعتبار تپش

آزما آزما کے دیکھ لیا

۲۔ غزل

(مزا حیدر)

(راز حاجی قلی)

پارٹی میں بُلا کے دیکھ لیا	یار کو آ زما کے دیکھ لیا
کوئی سُنتا نہیں فغانِ غریب	ریڈیو پر بھی گا کے دیکھ لیا
ہے نہ فائزِ پروف جذبہٴ عشق	آپ نے دلِ جلا کے دیکھ لیا
نہیں ملتا ہے دل کا سُراغ	ایکسے بھی کرا کے دیکھ لیا
موت بھی ہم سے بھاگتی ہے دُور	کار کے نیچے آ کے دیکھ لیا
اُن کا فوٹو ہے زینتِ دیوار	چاہا جب سر اٹھا کے دیکھ لیا
میرے دل کی لگی نہیں بچھتی	برف میں دل لگا کے دیکھ لیا
یہ جراثیمِ عشق مرنہ سکے	ہم نے ٹیکا کرا کے دیکھ لیا
بُجھھی صورتِ نظر نہیں آتی	سینما میں بھی جا کے دیکھ لیا

اس جہاں میں وفِ کہاں قلی قلی

خوب ٹھونک اور بجا کے دیکھ لیا

طرح دوم

پریشاں ہو کے میری خاک آخرو دل نہ بن جائے

یہ مصرع طرح اقبال کی مندرجہ ذیل غزل سے لیا گیا ہے۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخرو دل نہ بن جائے

جو شکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

نہ کر دیں مجھ کو مجبور نوافر دوس میں خوریں

مرا سوز دروں پھر گرمی مغل نہ بن جائے

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

کھٹک سی ہے جو سینے میں غم منزل نہ بن جائے

بنایا عشق نے دریائے ناپید اکراں مجھ کو

یہ میری خود نگہ داری مرا ساحل نہ بن جائے

کہیں اُس عالم بے رنگ و بو میں بھی طلب میری

وہی افسانہ ونبالہ محفل نہ بن جائے

عروج آدمِ خاکی سے انجم سمے جاتے ہیں

کہ یہ ہلونا ہوا تارِ امیر کا دل نہ بن جائے

۱۔ غزل

(جنابِ پندت برجنہن صاحبِ کیفی صدرِ انجمنِ اردو پنجاب)

فراہم ہو کے غلن آرزو پھر دل نہ بن جائے یہ اُجڑی پر سکول بستی بھری مغل نہ بن جائے
وہ جلوہ ہو عیاں دیر و حرم کیا ڈرے ڈرے میں جو تیری ذات ہی اک پدہ حائل نہ بن جائے
جماعت کی مستم قابلیت ہو تو کیونکر ہو ہر اک فرد اس کا جب تک ہر قابل نہ بن جائے
وطن کی ساکھ ہو تم نوجوانو! کب یہ ممکن ہے کہ فخرِ حال و ماضی شائستہ قبل نہ بن جائے
ہجومِ یاس و ناکامی میں گر تہمت رہے قائم تو پھر کوششِ تہاری سعیِ لاحاصل نہ بن جائے
کبھی بحرِ محبت سے نہ بیڑا پار ہو اُس کا فرازِ موجِ طوفان ہی جسے ساحل نہ بن جائے
جوازِ خود رفتہ راہِ عشق میں ہیں ہو نہیں سکتا کہ منزل اُن کے حق میں دُوریِ منزل نہ بن جائے
پریشانی سے تنگ آیا ہوں کچھ بھی مغمود ہوں ہیں کہ ہم آہنگ سوزِ دل کا سازِ ول نہ بن جائے
مریضِ غم کے جینے کی دُعا احباب کے تہیں جسے آسان سمجھا ہوں وہی مشکل نہ بن جائے
قیامت ہو کچھ یزین آ کے حالِ دل اگر پوچھیں کہیں شہرِ خموشاں تاہی مغل نہ بن جائے

تمہیں ہو رازِ دواِ عشق بس اب چُپ ہو کیفی

۔ فسانہ اک جہاں کا وارِ دِل نہ بن جائے

۲۔ غزل

(حضرت سراج لکھنوی)

یہ مشکل اور بھی اے ضبطِ غم، مشکل نہ بن جائے
 ہمارا خاک میں چھنتے ہو کیوں اب منتشر فرے
 سمٹ کر دل کی آہوں کا دھواں بھر دل نہ بن جائے
 جسے قاتل کہیں ہم اور وہ قاتل نہ بن جائے
 ہمارا ہاتھ لگنے سے کہیں بھر دل نہ بن جائے
 یہاں کا ذرہ ذرہ تو سہی جو دل نہ بن جائے
 نفس کا سلسلہ جب تک پیامِ دل نہ بن جائے
 یہ حسرت پرورش پا کر کسی قابل نہ بن جائے
 تجھے راحت کہاں یہ درِ وجہ تکِ دل نہ بن جائے
 ترے کوچے کا ہر ذرہ تڑپ کر دل نہ بن جائے
 یہی ذرہ کہیں کروٹ بدل کر دل نہ بن جائے
 یہ مشکل اور بھی اے ضبطِ غم، مشکل نہ بن جائے
 ہمارا خاک میں چھنتے ہو کیوں اب منتشر فرے
 ہمارا اعتبارِ عشق بھی کچھ وزن رکھتا ہے
 مرے ذوقِ لطف کا جائزہ لے اپنے کوچے میں
 تصورِ وہم سے بدتر حدیثِ عشق بے معنی
 ابھی ہے خیرِ مجھ سے بھین لو ذوقِ نظر میرا
 جو پیکر میں نہ ہو تبدیل وہ احساسِ غم کیا ہے
 فضاؤں میں یہاں کی زندگی سی برستی ہے
 جسے تم کم حقیقت جان کر پامال کرتے ہو

سراج اکثر میں بڑھ جاتا ہوں آگے پھر پلٹتا ہوں

کوئی ایسا بھی محو حسرت منزل نہ بن جائے

۳۔ غزل

(مولانا تاجور نجیب آبادی)

جہاز زندگی کا موت ہی ساحلِ نہن جائے کہیں یہ پہلی منزل آخری منزل نہن جائے
 محبت میں زیاں کاری مُرادِ دل نہن جائے یہ لا حاصل ہی عمرِ عشق کا حاصل نہن جائے
 مرے دل کی تڑپ پر ہنسنے والے تو نہیں ڈرتا ترے پہلو میں یہ فولاد پارہ دل نہن جائے
 وہ رازِ عشق جس کو میں نے دل سے بھی چھپایا تھا خدا را اے جنوں افسانہ محفل نہن جائے
 مجھی پر پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظر اُن کی یہ دلداری حسابِ ستار درِ دل نہن جائے
 دل ایذا طلب بھی ہونہ جائے ہمزایاں اُن کا کہیں میری شکایت شکوہِ باطل نہن جائے
 نہ دیکھو میری مشیتِ خاک کو ننگین نگاہوں سے کہیں یہ زندہ ہو کر جلوہ زارِ دل نہن جائے
 کہیں رُسوانہ ہو یہ نشانِ استغنا محبت کی، مری حالت تمہارے رحم کے قابل نہن جائے
 یہ متوالی نظرِ یہ بادۂ بے جام، اے توبہ کسی پر بے بنی اے ساتی محفل نہن جائے
 ترے انوار سے ہے غشِ ہستی میں تڑپ پیدا کہیں سارا نظامِ کائنات اک ل نہن جائے

کردوں گا عمر بھر طے راہ بے منزل محبت کی

اگر وہ آستان اس راہ کی منزل نہن جائے

۴۔ غزل

(مترار اُدے سنگھ صاحب شائق)

یہ میری ضبط کوشی سعی لا حاصل نہ بن جائے
 نظر اس انجمن میں داستانِ دل نہ بن جائے
 نہ ہوا خبام بھی آغازِ محرومی کا محرومی
 کہیں فریاد ہی فریاد کا حاصل نہ بن جائے
 یہ تشکیل جنوں تاحِ تکمیلِ جنوں پہنچے
 کہیں اس راہ میں ہر نقش پا منزل نہ بن جائے
 ابھی اس سے محبت میں بہت کچھ کام لینے ہیں
 یہ بے تابی کہیں بڑھ کر سکونِ دل نہ بن جائے
 مری آنکھوں پہ چھائی ہے ترے جلوں کی تابانی
 کہیں میری نظر میرے لئے قاتل نہ بن جائے
 نشین چھونک دے لیکن نشیمن چھوٹنے والے
 جنوں سچتہ نہ ہو جائے جنوںِ کامل نہ بن جائے
 سنا تے رہتے ہو تم دوست کو شائقِ کلام اپنا
 مذاقی دوستِ اک دن ہم مذاقِ دل نہ بن جائے

۵۔ غزل

(پرنسپل محمد دین تاثیر)

غمِ عالم مٹ کر یا الہی دل نہ بن جائے
یہ مشکل جو پُرانی ہے نئی مشکل نہ بن جائے
یہ تارے گردِ راہِ کارواں معلوم ہوتے ہیں
یہ منزل تھی مگر اب رہبرِ منزل نہ بن جائے
اٹھا کر چھینک دیں جائے کہاں طوفان کی لہریں
کہیں گرداب ہی میرے لئے ساحل نہ بن جائے
وہی بیتابیاں اس کی، وہی بیباکیاں اس کی
یہ اب تک جو مراد لیتا یہ تیرا دل نہ بن جائے
سمجھ جائے اگر تو بن کہے میں چپ رہوں لیکن
مجھے ڈر ہے مری مشکل تری مشکل نہ بن جائے

۶۔ غزل

(پرنسپل رام پرشاد ناتھ)

حجابِ جلوہ لیلیٰ جسٹونِ دل نہ بن جائے
نگاہِ شوقِ یارب پر وہ محفل نہ بن جائے
نہ وا ہوا سے مری چشمِ تہنا دید کی مجلس
کہیں شوقِ نظارہ سنگِ لہو دل نہ بن جائے
نہ جل جائے کہیں آہِ تپاں سے غمِ زینِ ہستی
شہراہِ برق کا دودھ چراغِ دل نہ بن جائے
جو بن مانگے ملے تو پی نہ ہوشتِ کیش ساقی
یہ تیرا ساغرِ گل کا سہ سائل نہ بن جائے
نہاں غم کو تو آشکوں سے اپنے سینے کیوں ہے
یہی کشتِ دلِ ناکام کا حاصل نہ بن جائے
سنبھل کر وادیِ الفت میں اسے آتشِ ادم چلنا
کہیں پہلا قدم ہی آخری منزل نہ بن جائے

۷۔ غزل

(مخاب ہوش ملیح)

جفا سہ سہ کے میرا دل تمہارا دل نہ بن جائے
 مجھے ڈر ہے یہ مشکل اک نئی مشکل نہ بن جائے
 سکونِ یاس میں راحت تو حاصل ہو گئی مجھ کو
 مگر ڈر ہے کہ یہ بڑھ کر جو درد نہ بن جائے
 وہ آنکھیں بھی تو حاصل کر جو اُس کو دیکھ سکتی ہوں
 یہ مشکل سہل ہو کر دوسری مشکل نہ بن جائے
 وہ حسرت کیا جو آنکھوں سے نہ ٹپکے اشک بن کر
 وہ ارماں کیا جو آخر اضطراب نہ بن جائے
 بہت مشتاق ہے تو امتحانِ سخت جانی کا
 ترے دم پر کہیں اے خنجرِ قاتل نہ بن جائے
 ہوائے ترکِ رنگ و بو میں یہ بھی سوچ اے واعظ
 چمن زارِ جہاں اُبھڑی ہوئی محفل نہ بن جائے
 معاف اے شوقِ دل کبتک کروں یہ برقِ فتاری
 مجھے ڈر ہے یہ منزلِ آخری منزل نہ بن جائے

طرحِ سوم

صد شکر کہ پھر زلیت کا سماں نظر آیا

یہ مصرعِ جوش کی منہ بجزیل غزل سے لیا گیا ہے۔

صد شکر کہ پھر زلیت کا سماں نظر آیا
 پھر در پہ کوئی فتنہ دوراں نظر آیا
 پھر طلِ گراں مست ہوا نکلتے سے
 پھر ذوقِ طرب سلسلہ جنبان نظر آیا
 پھر کاکلِ ثولیبہ سے جھلکا رخِ رنگین
 پھر ابر کے سامنے میں گلستاں نظر آیا
 اشکوں کی جھڑی بند نہ ہوتی تھی کسی طرح
 صد شکر نزا گوشہء واماں نظر آیا
 لو کا کل شب رنگ کھلی، کھل گئیں آنکھیں
 اڑتا ہوا رنگِ شب ہجران نظر آیا
 بشاش ہو جمیعتِ خاطر کی تمتا !
 لے، سلسلہ زلعت پریشاں نظر آیا
 اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی
 تم آئے تو گھر بے سرو سماں نظر آیا
 انگوٹیاں لیتا کوئی لے جوشِ دمِ صبح
 خورشید سے پھر دست و گریبان نظر آیا

۱۔ غزل

(غان، صغیر حسین غاں نظیہ)

ظاہر نظر آیا کبھی نہاں نظر آیا وہ جلوہ بہر حال درخشاں نظر آیا
 رگ گہ میں محبت کی پیش دوڑ گئی جب ہر ذرہ مرے جسم کا تاباں نظر آیا
 دریائے محبت سے مجھے پار اُترنا مشکل نظر آیا کبھی آسناں نظر آیا
 اک شہر غم و یاس ہر اک گام پہ دیکھا ہر ذرے کے پہلو میں بیاہاں نظر آیا
 ہر قطرہ شبنم تھا چمکتا ہوا ساغر ہر پھول کے دامن میں گلستاں نظر آیا
 دل شاد ہوا پیرِ خرابا سے مل کر اس شہر میں بھی شکر ہے آسناں نظر آیا
 چاہا تھا کہ دکھ لایئے نیزنگ طبیعت پر تنگ ہمیں عالمِ امکاں نظر آیا
 سوار گئے دیکھنے ہم دیرِ حرم کو کافر کوئی دیکھا نہ مسماں نظر آیا
 اٹھا کبھی پردہ جو مرے داغِ جگر کا خوشید چراغِ تہِ داماں نظر آیا
 پھر شمعِ سکن ہے نظیرِ انجمنِ آرا

پنجاب میں پھر جلوہ یوناں نظر آیا

۲۔ غزل

(جناب پنڈت دستہ پرشا و صاحب قدا)

رونق میں وہ جتنا بھی نمایاں نظر آیا
 اتنا ہی جنوں مجھ میں فراوان نظر آیا
 دوڑائی نظر دیدہ عبرت نے جدھر بھی
 ہر خندہ گل خار بد اماں نظر آیا
 پروانے نے سمجھا تھا جسے نورِ حقیقت
 اے وائے وہی موت کا سماں نظر آیا
 زلفوں کے تصور میں وہ اُبھکا تو مرادل
 زلفوں کی طرح خود بھی پریشان نظر آیا
 دیکھی جو بہمن نے مے خواب کی تعبیر
 گردش میں اُسے گنبد گرداں نظر آیا
 بھٹکایا سراپوں نے قدا راہِ وفا میں
 نزدیک جو آئے تو بیاباں نظر آیا

متفرق نظریں

یہ وہ منتخب نظریں ہیں جو طرعی غزلوں اور موضوعی نظموں کے علاوہ آل انڈیا شاعروں میں پوس گئیں - تھاپوں

خرابات

(حضرت جوش ملیح آبادی)

عین طاعت ہے تماشا ئے لب بام یہاں	یہ خرابات ہے، تقوے کا نہیں نام یہاں
وجد کرتا ہے فلک، صبح کے ہنگام یہاں	رقص کرتی ہے زین، رات کی رنگینی میں
کہ ازل سے نہیں گنجائش اوہام یہاں	میکدے میں نہ ہوا سے شیخ حرم نکتہ فروش
خارج از سبب ہے اندیشہ آلام یہاں	اثر تربیت پر مغال کے قسداں
حکم ایزد ہے کہ گردش میں رہے جام یہاں	شکر باری کہ علی الرغم فقیہ خود ہیں
جام در دست ہیں خود شرع کے احکام یہاں	میکدے کا ہے مشیت کے اشاروں پہ مدار
طائرِ بدرہ ہے اک مرغ تہ دام یہاں	طوطیِ قدس ہے اک رشتہ با صید زبوں
ظلمتِ کفر سے ہے رونقِ اسلام یہاں	سایہ زلف سے ہے زینتِ ہوشِ ندال

اثر بے بصری ہے طلبِ جاہ و نمود
 گوشِ رندانِ قدحِ خوار ہے اور لعلِ نگار
 کسی سورت میں بھی باقی نہیں جاتے تاویل
 شعلہٴ عشق ہے اس آہیں چڑھتی ہوئی دھوپ
 منزلیں، راہ میں تبدیل ہوا کرتی ہیں
 قیمتِ بادہ میں جو غرقہ کہ ہوتا ہے گرو
 خوفِ عقبی کی اُداسی کے عوض، چھوٹل پر
 اک تو ہم ہے ارہ و رسمِ شمارِ مہ و سال
 ذرے ذرے پیہے اتنا بدیت کا جلال
 گردِ رندانِ سیہ مست، بصدِ عشوہ و ناز
 خوابِ صمدانہ کے مانند ہے اے محرمِ از
 لب ہلاتے ہی جو دنیا کو ہلا دیتے ہیں
 ہدفِ مسخرگی ہے ہوس نام یہاں
 لبِ جبریل نہیں درخورِ پیغام یہاں
 کسی آیت میں بھی ممکن نہیں ابہام یہاں
 مشعلِ عقل ہے نورِ شید لبِ بام یہاں
 رُوبہ آغاز ہی رہتا ہے ہر انجام یہاں
 اُس پہ قربان ہیں سو جامہٴ احرام یہاں
 کھیتا ہے اثرِ بادہٴ گلِ فام یہاں
 اک متحر ہے نظامِ سحر و شام یہاں
 وقت رہتا ہے سدا لرزہ بر اندام یہاں
 حلقہٴ باندھے ہوئے رہتے ہیں گلِ اندام یہاں
 وقفہٴ یک نفس و لغزشِ یک کام یہاں
 چند ایسے بھی نکل آئیں گے خدام یہاں

شکر ہے جوشِ کے اور ادو وظائف کے عوض

لب پہ ہے زمزمہٴ حافظ و خیام یہاں

جہان آزاد

(حضرت سگنظامی)

مرے خیال میں ہے وہ دیارِ آزادی ہے ذرہ ذرہ جہاں اک نگارِ آزادی
چمن جہاں کے نوید بہارِ آزادی قفسِ جہاں کے ہیں سرمایہ دارِ آزادی
نہ پردہ ہے نہ کہیں پردہ دارِ آزادی حقیقتیں ہیں جہاں جلوہ بارِ آزادی
وہ شہر انس و وفا، وہ دیارِ آزادی جہاں فقیر بھی ہے شہرِ بارِ آزادی
جہاں کا بندہ ادنیٰ ہے شکِ صمدِ عبود جہاں غلام ہیں پروردگارِ آزادی
نفسِ نفس ہو جہاں موجِ لالہ و نسیریں روشِ روش ہو جہاں لالہ زارِ آزادی
جہاں ہے موجِ خونِ شہید کوثرِ شوق، ہے موجِ موج جہاں آبِشارِ آزادی
نگاہِ مستی و ہتھال میں ٹھل کے گرتی ہے وہ برقِ انام ہے جس کا شرارِ آزادی
دلِ غریب میں کھنچتی ہو کھنچ کے ڈھلتی ہے وہ مےِ سرور ہے جس کا بہارِ آزادی

جہاں مقدرِ مزدور رہے تنہا بے گم گل
 شعاعِ ماہ کی زنجیر ٹوٹتی ہے جہاں
 جہاں ہر بانیِ طفلانِ جہاد کا جہ
 جہاں کے طوق و سلاسل میں شکنجہ بے گم گل
 لوہے کی آبی و ہزار جس کے آدم کا
 ہمالہ جس کی بندی کی اولیں چوٹی
 جہاں کی یہ ہے طفلانِ سراپے سیلاب
 جہاں نگاہِ ہوشاں ہے جہاں خیالِ عقاب
 جہاں خیال ہے آزاد، فکر بے پروا
 جہاں ہیں کفر پہ بند اور نہ ایمان پر
 جہاں ہر قیمتِ ہتھال بہارِ آزادی
 جہاں کی خاک ہے آئینہ دارِ آزادی
 جہاں ہر کھیلِ تمنّا ہے کارِ آزادی
 جہاں کی قید ہے حُسنِ بہارِ آزادی
 شہید جس کے ہیں نقش و نگارِ آزادی
 نشیب جس کا سب کو بہارِ آزادی
 جہاں کی خاک ہے برق و شرارِ آزادی
 جہاں ہر طائرِ فطرت شکارِ آزادی
 جہاں ہے دینِ مرفح شعارِ آزادی
 وہ کارگاہِ وفا، وہ دیارِ آزادی

تجلیاتِ حقیقت خطاب ہو جائیں
 الہی ذرے مرے آفتاب ہو جائیں

دوہے

(جناب خواجہ دل محمد صاحب)

- ۱- آنکھیں موند جہان سے پنی سے پریم لگا
رات ہے کھڑکی بند کر گھر میں دیا جلا
- ۲- اب کی اب کے ساتھ ہے جب کی جب کے ساتھ
جس کی رے کے ساتھ ہے اُس کی رے کے ساتھ
- ۳- میرا میرا سب کہیں تیرا کہے نہ کوئے
میرا سب کچھ ہو گیا تو گر میرا ہوئے
- ۴- اٹا پڑا ہے راستہ گرے پات اور پھول
جھلکے تارا دُور سے - راہ نہ جاؤں بھول
- ۵- تنکا سا اک نہر پر لہر بہاتی جائے
تَن کا دھوکا ہو مجھ من سے نکلے ہائے
- ۶- جھل جھل کر رہے تارے سبجی برات
کس دُولہا کے منتظر بیٹھے ساری رات
- ۷- سچ دیکھے عکس کو کھیلے اس کے ساتھ
پیار کرے مجھ بھلائے بھی آئے نہ لیکن ہاتھ
- ۸- اٹھ اٹھ پلکیں دیکھتیں نینول سیج بچھا
جلوے تیرے آگے آپ بھی پیتم آ
- ۹- پنڈت پتری کھول کر بین میکہ مت دیکھ
جو پیتم کے ہاتھ نے لکھے وہی شبہ لیکھ

پیر ۵

(حضرت احسان دانش)

یاد ہے دہلی کی وہ اک غم فشاں ضویرِ شام
تیرگی کے رو برو تنویر تھی محوِ نیاز
تھا فضاؤں میں مسرتی کا رخاؤں کا دھواں
ہو چکا تھا سُرخ و مغرب ہشتق تھی لالہ کار
رہروں کے غل سے تھا قلب فضا زبر و زبر
نورِ ظلمت کر رہے تھے بل کے شب کا اہتمام
راستوں میں تار کے کھبیوں کے سائے تھے دراز
جا رہے تھے گھر کو مز دوروں کے کھنڈ لکے رواں
چل رہی تھی نرم قدموں سے ہوائے برف بار
لاریوں سے خم ہوئی جاتی تھی سڑکوں کی کمر
سیر کرنے کے لئے میں اور مجید الدین خاں
بحث تھی آپس میں لیکن قلعے دونوں کے صاف
کہہ رہا تھا میں ”تغیر“ ہے فروغِ کائنات
بحر و بریں جنبشِ نبض ہوا سے انقلاب
راہبر بدلے نظامِ کارواں بدلا کئے
شہر کی جانب سے سوئے رائے سینا تھے رواں
وہ تو تھے پرے کے عالمی میں بھارپرے کے خلا
اس کی ہر کروٹ سے پاتا ہے نمودِ نگِ حیات
صحیح گلشن میں عناد کی نوا سے انقلاب
آئے دن ننگِ زمین و آسماں بدلا کئے

لیکن اب تک ہے مسلمانوں میں پردے کا رواج
ان کے فسودہ تمدن کا نہیں بدلا مزاج

لے نواب مجید الدین خاں صاحب میرے شخص اور بے تحفہ دوست ہیں۔ میں دہلی کے سفیرِ آپ ہی کے پاس مقیم تھا۔ اور یہ نظم ہمیں کے ایک
قرعے کی رہین بنتی ہے۔ احسان دانش

یہ پڑانی رسم روپوشی نہیں بدلی گئی بچہ دلوں سے خود فراموشی نہیں بدلی گئی

ہموطن اقوام کی جو عورتیں ہیں بے نقاب کیا گن میں آگیا عظمت کا ان کی آفتاب
ان کا کیا ایمان نہیں عزت نہیں عصمت نہیں؟ شرم آنکھوں میں نہیں یا قلب میں غیرت نہیں؟
کیا انہیں اللہ نے بخشا نہیں رنگ و جمال؟ کیا اثر رکھتا نہیں ان کا فنونِ خد و خال؟
کیا کوئی فطرت میں ان کی دل نشیں پہلو نہیں؟ لوحِ اعضا میں نہیں؛ گفتار میں جادو نہیں؟
کیا نہیں ان کے دلوں میں عظمتِ آفت کے راز؟ کیا نہیں ان کے تنفس میں شمیمِ دلنواز؟

فرق کچھ اس کے سوا ان میں نہیں ہے زینہار ہم تمدن کے پیالے، وہ تمدن کے سوار

چیمپے پیچھے ایک عورت مضحلِ رفتار سے آ رہی تھی غالب آسودا لئے بازار سے
وہ عقیقہ سن کے میری گفت گو کیا ہوئی بحیثیتِ ایتیری مردانہ حیثیت کیا ہوئی؟

آہ شاید اے حریمِ راز سے نا آشنا
تو ہے آوازِ شکستِ ساز سے نا آشنا

شان و شوکت کو برحانے کنے لئے پردہ نہیں رنگ و روغن کو چھپانے کے لئے پردہ نہیں

اس کا پردہ ہے کہ ہم گردِ اُبناداری میں ہیں
 اس کا پردہ ہے کہ چہرے میں اُلم کے اشتہا
 اس کا پردہ ہے کہ جینا موت کے دشوار ہے
 اس کا پردہ ہے کہ سینے دروے سے معمور ہیں
 اس کا پردہ ہے کہ ہم اپنی نظر پر بار ہیں
 اس کا پردہ ہے کہ دل کا حال پیشانی پہ ہے
 اس کا پردہ ہے کہ سر پر چادریں ہیں تارتار
 اس کا پردہ ہے سرِ سرِ غم کی تصویریں ہیں ہم
 گفتگو سے پیشتر کچھ غور ہونا چاہئے
 یہ نقابیں اُٹھ نہیں سکتیں زمانے کے لئے
 تیری کج بکشتی ہماری بے بسی پر چوٹ ہے

سُن کے اُس کی گفتگو احسان میں تھرا گیا
 آئکھ بھرتی نہ دست سے پسینہ آگیا
 دِل کے پردے جل اُٹھے رازِ آشنا دل ہو گیا
 دِلتِ سَلَم کی بد حالی کا قائل ہو گیا
 رسمِ پردہ سلمہ کی بے بسی کا ہے حجاب
 پردہ داری ہے یہ ناداری کے چہرے پر نقاب

زبور صریت

(جناب روش صدیقی)

ظلم و بیداد کی بنیاد کو ڈھانے کے لئے!
 بجلیاں قصرِ غلامی پہ گرانے کے لئے!
 نقشِ تزویر تمدن کو مٹانے کے لئے!
 کشورِ ہند کو آزاد بنانے کے لئے!
 شمعِ بیداریِ مشرق کو فزول کر دیں
 ایک ذرہ بھی نہیں مہرِ درخشاں کا غلام!
 ایک تنہا بھی نہیں رنگِ گلستاں کا غلام!
 ایک لمحہ بھی نہیں گردشِ دُراں کا غلام!
 کوئی انسان ہو پھر کسویں کسی انسان کا غلام!
 دہر کو جنتِ آزاد می انسان کر دیں

خاکِ خود ہیں ہو تو ہو جو ہر قابلِ پیدا
 دل ہو آزاد، تو ہو مرگِ سلاسلِ پیدا
 صفِ شکن چاہیے جہاں ہو وہیں منزلِ پیدا
 جوشِ طوفاں ہی سے ہو جاتے ہیں ساحلِ پیدا
 دلِ ہر قطرہ کو آمادہ طوفاں کر دیں
 جس غلامی کو رہا خنجر و سپکاں پہ غرور،
 جس غلامی کو رہا ہیبتِ سلطان پہ غرور،
 جس غلامی کو رہا حیلہٴ شیطان پہ غرور،
 جس غلامی کو رہا دونخِ زنداں پہ غرور،
 اُس غلامی ہی کو نابِ خلّ ملّاں کر دیں

جس تہن میں مساوات کے انوار نہیں
جس تہن میں کہیں جلوۂ ایثار نہیں
جس تہن کا نگہباں دل بیدار نہیں
جس تہن میں غریبوں کے لئے پیار نہیں
اُس تہن کے ہر لوائے کو پیراں نہیں

عزمِ بیباک ہے جن کا، وہی فرزانہ ہے!
جو ہے ذی ہوش، وہی مرشدِ میخانہ ہے!
جس کے دل میں ہر حرارت، وہی پروانہ ہے!
انتیازِ شہ و مزدور اک افسانہ ہے!
اس فنانے کو بھی اب خواہِ پیشانی نہیں

شکمِ اسودہ ہوں غالت گرو رہن افسوس!
رہیں محروم مگر صاحبِ خرمن، افسوس!
اہل گلشن تو ہوں دُور از درِ گلشن افسوس!
اور گلچیں ہو سزاوارِ نشیمن افسوس!
آؤ گلچیں ہی کو پیرِ گلستاں کریں

علمِ جزعِ عالمِ احساس وفا کچھ بھی نہیں،
عشق، جگرِ خدمتِ مخلوق خدا کچھ بھی نہیں،
جبرِ انصاف، کسی قلت کی بنا، کچھ بھی نہیں،
حریت، اُلٹ بیڑاں کے سوا، کچھ بھی نہیں،
دہر کو ناکر شِ اُلٹ بیڑاں کریں

صبح بہار

(خطاب پروفیسر عابد علی صاحب)

صد شکر کہ پیدا ہوا دامنِ اُفق سے
 مشرق کی طرف صبح کا ہنستا ہوا تارا
 فطرت نے لیا ہاتھ میں انوار کا نیزہ
 اہرِ بینِ ظلمات کے سینے میں اُتارا
 افلاک کے ہودج سے عرویںِ قمرِ اُتری
 غورِ شیدِ جہاں تاب ہوا انجمنِ آرا
 وہ رنگِ تماث کہ تماشاِ تجتہ
 وہ روجِ تجلی کہ دلِ برقِ دوپارا
 بہمتِ درو بام سے چھٹے ہوئے بادل
 بہمتِ درو بام پر چڑھتا ہوا پارا
 اے مطربِ خوش لہجہ ہی آگِ ہی لے
 اس وقت نہ بربط سے اٹھا ہاتھ خدا را
 اے ساقیِ نونہیزِ بی جامِ ہی مے
 اس وقت نہیں اور کوئی بات گوارا

سرمایہ دار

(حضرت عقیلہ ہرنیاری پوری)

بادۂ گل رنگ سے لبسریز میں جن کے سبُو
 جن کے پیمانوں میں رقصاں ہے غیبوں کا ہُو
 جن کے فانوسوں میں ہیں مزدور کے سینے کے داغ
 اندھیوں میں جل رہے ہیں جن کی نخوت کے چراغ
 جن کے باعث مفلسوں پر عرصہ ہستی ہے تنگ
 جن کے چہروں پر ہے مظلوموں کے غل سے آب درنگ
 نہ دعائے زندگی جن کا ہے سودائے نمود
 بے نواؤں کو پیام مرگ ہے جن کا دُجو
 جو ہر اک مفلس سے ملتے ہیں بصد کبر و غرور
 نقشہ دولت سے ہے جن کے دماغوں میں فتور
 جن کی رگ رگ زرد کی نہنجیوں میں ہے جکڑی ہوئی
 زعمِ باطل سے ہیں جن کی گردنیں اکڑی ہوئی
 تیرو ہے جن کے گناہوں نے ضمیمہ کائنات
 ڈھونڈتے ہیں ظلمتِ عصیاں میں جو آبِ حیات
 جن کی توندیں ہیں محبت اور شرافت کے مزار
 جن کو پیادہ کر کے شرمندہ ہے خود پروردگار
 بچھ کو اور مرغوب کر دے ان درندوں کا شکوہ؟
 اٹھ بغاوت کے لئے اے فاتحِ ستوں کے گروہ!

پیمان وفا

(ایک شعر کے نام جو سفر پر جا رہا ہے)

(ترجمہ زسوفی غلام مصطفیٰ صاحب تسم)

کیا فقط اک بوئے لب ہی وفا کا نام ہے کیا ہمارے وعدہ الفت کا یہی انجام ہے
 یاد کر اپنے دل مضطر کے پیمان وفا میں تجھے جانے نہ دلوں گی اے مری جان وفا
 دیکھ ہے چاروں طرف کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے زمیں کے ذرے ذرے پر بہا ر آئی ہوئی
 اور فضاؤں میں اُسند آیا ہے طوفانِ سرور میں تجھے جانے نہ دلوں گی اے مری جان سرور
 ماہِ عالم تاب نے مدہوش دیکھا ہے ہمیں چاندنی راتوں نے ہم آغوش دیکھا ہے ہمیں
 چشمِ انجم میں ابھی رقصاں ہیں وہ سامانِ عیش میں تجھے جانے نہ دلوں گی اے مرے بُتائِ عیش
 باغ میں ہوگا ہمارا سخن بُتائِ منتظر طائرانِ خوشنوا، گھمائے خندانِ منتظر
 رہ ہمارے دیکھتے ہوں گے جوانانِ بہار میں تجھے جانے نہ دلوں گی اے مری جانِ بہار
 موسمِ گل ہے، ہوا ہوتی ہے گلِ یزِ طرب مغلیں ہوں گی جہاں والوں کی لبرِ یزِ طرب
 راگ سے منور ہو جائے گا ہر سازِ حیات میں تجھے جانے نہ دلوں گی اے مرے اِز حیات
 عزمِ خصم سے ترے بیتاب جاتی ہوں میں شعلہ بن جاتی ہوں میں، سیما بن ہو جاتی ہوں میں
 دیکھ پہلوئیں اچھلتا ہے دلِ مضطر مرا میں تجھے جانے نہ دلوں گی، اے مرے صبرِ آنا
 دیکھ خلوت کو اور انِ عشرت کے سامانوں کو دیکھ میری آنکھوں میں مرے افسردہ ارمانوں کو دیکھ
 رحمِ کراہی محبتِ حسرتِ ناکام پر میں تجھے جانے نہ دلوں گی اے مرے فوقِ نظرا
 جا رہا ہے تو چھڑا کر اٹھ، آنکھیں میسر کر ڈالتا جا اس دلِ بیتاب پر بھی اک نظر
 جس کی خلوت سے کل سخت نہیں تو زینہار میں تجھے جانے نہ دلوں گی اے مرے صبرِ وقار

ہمہ گیری عشق

(حاصل علی خاں)

تم مجھ سے کہاں بھاگ کے جاؤ گے بتاؤ
چھایا ہوں میں بہرت جدھر آنکھ اٹھاؤ
میں چشم ازل، چشم ابد، چشم لقب اہوں
بیچ نگہ کا کشتاں بن کے اٹھا ہوں
ہے بوسہ متا بے تاباں سُرخ ہستی
آفاق کے چہرے پہ ہے چھائی ہوئی مستی
میں دیدہ انجم سے تمہیں جھانک رہا ہوں
وہ نور کا طوفاں ہوں جدھر جاؤ بپا ہوں
نکمت ہے مرے سانس کی ہر موج صبا میں
اک کیف سا پیدا ہے دلِ ارض و سما میں
میتابِ رنجِ حُسن ہوں میں رُوح و وفا ہوں
میں عارضِ گلِ نعمتِ بلبل میں بسا ہوں
ہے برقِ مرے خندہ وحشی کی نشانی
ہے رعدِ مرے نالہ غمگین کی کہانی
میں سازِ فلک سازِ زمیں سازِ زماں ہوں
میں محرمِ جاں پرودہ درِ رازِ جہاں ہوں
ہر ذرہ مرئی آنکھ ہے کیا مجھ سے چھپو گے
چھپتے ہو عبث مجھ سے کہاں چھپ کے ہو گے

میں ربطِ عناصر ہوں میں شیرازہ جاں ہوں

میں عشق ہوں میں غورِ گ کون و کماں ہوں

رقیب سے

(پروفیسر فیض احمد صاحب)

آ کہ وابستہ ہیں اُس حُن کی یادیں تجھ سے جس نے اِس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی اُلفت میں بھلا کھی تھی دُنیا ہم نے دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا
آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر اُس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اُسی رُسنائی کے جس کی ان آنکھوں نے بے سُود عبادت کی ہے
تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوئیں جن میں اُس کے طُبوس کی افسردہ ہمک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مناب کا فُور جس میں بستی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے
تُو نے دیکھی ہے وہ پشانی، وہ رُخسار، وہ ہونٹ زندگی جن کے تصور میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُنھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے
مشترک ہم پہ ہیں احسان غم اُلفت کے اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے جُز ترے اور کو بھلاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکسی، غریبوں کی حمایت سیکسی حسرت دیاس کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھا سیکھا سرد آہوں کے رُخ زرد کے معنی سیکھے
جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بکس جن کے اشک آنکھوں میں بکھتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناقوانوں کے نواہوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب بازو قلعے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکھتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت شاہراہوں پہ غریبوں کا لٹو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے فاقہ مستوں کو ڈبوئے کے لئے لٹکتا ہے

آگ سی سینے میں رہ کے اُلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

بُعایات

(بشیر احمد)

ہم جس کے ہمیشہ میں ہمارا ہے ہند
 قی یہ ہے ہمیں جان کے پیالے ہے ہند
 چھائی میں بارکی آغلیتیں گواس پر
 اس پہ بھی ہمیں کھانا کھانا ہے ہند

ساز اپنا جو یوں جبار ہے میں تارے
 لئے حق کی کوئی سنا ہے میں تارے
 کچھ آدھ سارے گا پادھانی سے
 کیا راگ ہے یہ جو گار ہے میں تارے

تراک حرت خزانہ ہے بنیالوں کے لئے
 تراک سانچہ کافی ہے خنانوں کے لئے
 تری ہر بات پیدا ہیں ہزاروں باتیں
 بس ہر اک تیرا تراکھ خنانوں کے لئے

کچھ کام میں ایسے کہ شپیاں ہوں میں
 کچھ کام میں ایسے کہ نمازاں ہوں میں
 اب ناز کروں اپنی شپیاں پر
 یا ناز پہ پھر اپنے شپیاں ہوں میں

متفرق غیر طرہی غزلیں

جو آل انڈیا شاعرے میں پڑھی گئیں

غزل

(بیادگار آرتھیل جیٹس میاں محمد شاد پٹن مرحوم)
انسان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب نظر سابق گورنر کشمیر

جو ہم نوا مرے ہم دستار ہے۔ نہ ہے
حادثِ عشق کے جو قصہ خواں ہے۔ نہ ہے
وہ عہدِ گل کے جو مُرغانِ نعمتِ خواں نہ ہے
اب اس چمن میں مرا آشتیاں ہے۔ نہ ہے
کبھی یہ کہتے تھے ہم بھی کہ ساقیا مے لا!
یہ بزمِ یار۔ یہ دل۔ یہ سماں ہے۔ نہ ہے
نہ جان کا ہے بھروسہ نہ اعتبارِ جہاں
یہ جہاں ہے نہ ہے۔ یہ جہاں ہے۔ نہ ہے
جہاں سے رُوحِ ہمایوں جو کر گئی پرواز
ہما کی دہریں اب دستار ہے۔ نہ ہے
قیامِ عیش کا ناظر کچھ اعتبارِ ہمیں
سرے میں کوئی دن میماں ہے۔ نہ ہے

غزل

(خان بہادر فواب احمدیاد خان ولدانہ)

عقل اسے نہ پاسکی منزل مہروماہ میں
 روئے شہود سے ذرا پردہ غیب دے اٹھا
 طائرِ سدرہ آشیاں قیدِ قفس سے کیا بچے
 کس کو مرا پتہ چلے گر خطِ کمکتاں نہ ہو
 مجھ سے نہال ہو کچھ تو میں اس کی تلاش بھی کروں
 تیرے لحاظ سے نہیں چارہ دردِ ناگوار
 فرقِ بلند و پست سے چشم کو آتش نہا کر
 بحر میں قطرہ جس طرح بے خبر کمال ہو
 گر تجھے اشتیاق ہے اپنے سوا دل میں دیکھ
 رحمتِ حق کا متحق ہے وہی سادہ دل جسے
 عشق نے جا کے رکھ دیا آئینہ جلوہ گاہ میں
 روزِ ازل سے آج تک خلق ہے استباہ میں
 انجمِ چرخِ دانہ ہوں جب مری دم گاہ میں
 راہ نمائے کارواں گرد و غبارِ راہ میں
 یہ بھی جہاں نگاہ میں وہ بھی جہاں نگاہ میں
 ورنہ یہ جو صلہ کہاں اس دلِ درخواہ میں
 تانہ پڑے خلل ترے زاویہ نگاہ میں
 میں ہوں اسی طرح تے جلوہ بے پناہ میں
 شمعِ ازل کی روشنی مہر میں ہے نہ ماہ میں
 پریشاں و زحشر کا خوف نہ ہو گناہ میں

سنگِ درِ حرم بنے احمدِ تیز گام کیوں
 کعبہ بھی اک مقام ہے بیتِ صنم کی راہ میں

غزل

(جنابِ نانا نانا صاحبِ دستِ کاشمیری صدرِ بزمِ اردو جہولِ کثیر)

مجھ کو کر لگی اُن سے کیا گردِ شمسِ سماں الگ
حُسن کا ہے بیاں لگ عشق کا ہے بیاں الگ
کتنی جنوں عشق میں کی ہیں تَبُولِ ذلتِ
گرد و غبارِ راہ بھی دُورِ فغاں میں کھو گیا
حُسن کا رازِ عشق ہے عشق کا رازِ حُسن ہے
مشرِ جوشِ عشق میں باتِ دل کی کہہ سکا
آہیں اُن کا نقشِ ہوا شک میں اُن کا عکس ہے
بُنجھ کو سمجھ سمجھ کے بھی کچھ نہ سمجھ سکا کوئی
دہر کا رنگ دیکھ کر دہر سے دل اُداس ہے
کوئی سما سکے گا کیا دیر و حرم کی قیاس میں

دُورِ نظر سے ہوں تو دل ہوں ہے ہی وہ کہاں الگ
جو ر کی داستاں الگ درد کی داستاں الگ
منتِ پاسبانِ الگ سجدۂ آستاں الگ
دیکھ کے میرا کارواں ہو گیا کارواں الگ
پھر بھی ہے از داں سے کہوں اُن سے لڑ داں الگ
میں ہاگم سکوت میں وہ ہے بدگماں الگ
اُن کے ہوا بھی ہے بندِ حُسن کا اک سماں الگ
دو دنِ چل میں تو عیاں پھر بھی نرا جہاں الگ
کیجئے اس جہاں کو کیا ڈھونڈیئے اُن جہاں الگ
ٹھہرے جو لامکاں کوئی کس لئے ہو مکاں الگ

مست جھکائے سر کو کیا دیر و حرم کے سامنے

بندۂ لامکاں ہے وہ رکھتا ہے آستاں الگ

غزل

(جناب جلال الدین صاحب کبر)

خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ سہم بہتے ہیں
ہم سامنے اُن کے بیٹھے ہیں اور قصہٴ فرقت کہتے ہیں
اب حُسن و عشق میں فرق نہیں ابُنوں کی اک حالت ہے
میں اُن کو دیکھتا رہتا ہوں وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں
اُن کی وہ جیا وہ خاموشی اپنی وہ محبت کی نظریں
وہ سُنے کو سب کچھ سُنتے ہیں ہم کہنے کو سب کچھ کہتے ہیں
اس شوق فراواں کی یارب آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کریں وہ یا وعدہ ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں
ہم دروہیں ہمراز نہیں، کس سے کیئے، کیونکر کیئے
جو دل پہ گزرتی رہتی ہے جو جان پہ صدمے ستے ہیں
آدیکھ کہ ظالم فرقت میں کیا حال مرا بے حال ہوا
آہوں سے شرارے جھڑتے ہیں آنکھوں سے دریا بہتے ہیں
اکہ شاید دل کھو بیٹھے وہ جلسہٴ وہ احباب نہیں
تہا خاموش سے پھرتے ہیں ہرقت اُداس سے تھے ہیں

غزل

(جناب محمد علی خاں صاحب آڈرامہ پوری)

ہائے دل یا خدا بھول گیا قبلہ کو قبلہ نما بھول گیا
 بن کے سائل بھی نہ کلا کچھم در پہ پہنچا تو صدا بھول گیا
 لذت کاوشِ نازک کو نہ پوچھ درد اٹھا تو دوا بھول گیا
 جب تری موت ہی صورت دیکھی سائے نکو سے بخدا بھول گیا
 میٹھی میٹھی تری باتیں سن کر تلخی جو روحنا بھول گیا
 ایک دیوانہ کی باتوں پہ نہ جا کیا خبر کیا کہا کیا بھول گیا
 ہائے اک بات ہی جاتی ہے کچھ ابھی کہنے کو تھا بھول گیا
 ہو گئی سینکڑوں عذوں کی وفا اُس نے جب تنہا کہا بھول گیا
 سو سے ہو گیا سب مہقول در پہ جب سر کو رکھا بھول گیا

یاد رکھنے کی ہے یاد اُس کی اثر

اور جو بھول گیا۔ بھول گیا

غزل

(جناب بددغازی پوری)

راہِ تسلیم و رضا کی دُور ہے منزل ابھی
آپ کو دنیا کسے گی مدتوں قاتل ابھی
آہ چھیرٹوں یا نہ چھیرٹوں داستانِ دل ابھی
میں مرتب کر رہا ہوں داستانِ دل ابھی
ایک عالم لے کے جانا ہے کئی منزل ابھی
ایک کشتی آ کے ڈوبی ہے لبِ ساحل ابھی
برسرِ منزل ہوں پھر بھی دُور ہے منزل ابھی
اُٹھتے اُٹھتے گر گیب پھر پردہِ محمل ابھی
اس غضب کی بھیر میں گم ہو گیا ساحل ابھی
داستانِ طُور دُہرائیں گے داغِ دل ابھی
نامرادی کہہ رہی ہے دُور ہے منزل ابھی
ایک ایک انسو کو جانا ہے کئی منزل ابھی

صبر کے آداب و آفت نہیں ہنر ابھی
ختم تھوڑی ہو گی میری داستانِ دل ابھی
بے نیازی میں تری بھرا ہے رنگِ التفات
اس گلی میں فترے چننے سے مجھے فرصت کہاں
میں ہوں و میرا جو دم شوق میرے ساتھ ساتھ
جب بھی آ جائے بُری سُلعت نہیں لگتی ہے دیر
کھینچ لائی وقت سے پہلے ہی بیتابی شوق
کوئی گستاخی ہوئی سرزد نگاہِ شوق سے
جزر و مد طوفانِ برق و باد، گرداب و حباب
آج ہر آئینہ پیدا ہے قیامت کی چمک
آس دکھلاتی ہے اپنا جلوہ رنگیں مجھے
چشمِ تر، نوکِ مژدہ، راہِ وفا، دامانِ دوست

ہمتِ دل چاہئے اے بددغ راہِ عشق میں
دیکھئے دو گام چل کر آتی ہے منزل ابھی



فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ مارچ ۱۹۳۸ء
تصاویر:- ٹیکلا کے تین منظر



شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	خیالات	بشیر احمد	۱۹۵
۲	جہاں نما		۱۹۶
۳	رباعیات	حضرت آذر جالندھری	۱۹۸
۴	جل ترنگ	جناب جلال بیچ آبادی	۱۹۹
۵	اقبال	بشیر احمد	۲۰۱
۶	بہشت و نظم	حضرت جوش ملیانی	۲۱۴
۷	شیریں کا سبق	"نکاح پیا"	۲۱۵
۸	اعجاز بہار و نظم	جناب تاجور ساری	۲۱۸
۹	ہونے سے بدنام و نظم	جناب منظور احمد صاحب بی۔ اے	۲۱۹
۱۰	آج کل کا لاہور	پروفیسر حمید احمد خاں ایم۔ اے	۲۲۰
۱۱	غزل	حضرت عینی گوگاری	۲۲۶
۱۲	اُردو حروف تہجی کی ایک نئی ترتیب	سٹر ادم پرکاش ایم۔ اے	۲۲۷
۱۳	کیلاش کنول (ترجمہ از پادشہ شرقی)	حضرت جمیل احمد پوری	۲۳۳
۱۴	ٹیکلا	جناب منشا زمان خاں صاحب جالندھری	۲۳۵
۱۵	قطع تعلق و نظم	جناب مرزا یاد علی صاحب	۲۴۱
۱۶	غالب اور بیدل	پروفیسر حمید احمد خاں ایم۔ اے	۲۴۲
۱۷	اُردو و نظم	جناب منور لال صاحب ہڈی	۲۵۲
۱۸	"محبت گر گر مر آنو محبت منور سو آہیں!"	"ابن مریم"	۲۵۳
۱۹	تمنا (ادبیت)	جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔ اے	۲۵۴
۲۰	ڈانے شاعر و نظم	جناب ابراہیم صاحب تہوش گلگتوی	۲۵۵
۲۱	جب کبل بٹا :-	"ہما"	۲۵۶
۲۲	التحا و نظم	حضرت امین عروسی سیالکوٹی	۲۶۲
۲۳	مصلوب و نظم		۲۶۳
۲۴	مطبوعات		۲۶۶

خیالات

برسوں میں خیالات لکھتا رہا !

پھر میں نے خیال کیا کہ خیالوں کو خیر باد کہوں کہ شاید اسی طرح غلوں کی طوط رجوع ہوا
اب پھدوت کے بعد آج میں اپنے خیال کے گھوڑے کو تازیانہ لگایا ہے۔ نہیں معلوم محض خیال ہے یا کوئی عمل؛

خدا سے !

”تُو نے کیوں مجھے اس ملک میں پیدا کیا؛ اے میرے خدا! جہاں گائے اور باجے اور تعزیریں پر لڑائی ہوتی ہے۔
جہاں مرد و عورت پر تسلط کرتا ہے۔ جہاں بچے بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ جہاں مزدور بھوکوں مرتے ہیں

جہاں تو بہت کا نام مذہب ہے۔“

خدا کا جواب

”اچھا! اور تُو نے مجھے اس ملک میں پیدا کیا؛

مجھے تو اس سے وہ ملک اچھے جہاں وہ مجھے مانتے نہیں لیکن جانتے ہیں!

دلیری ————— خوبصورتی ————— مصروفیت

میں پیرس میں کسی خوش منظر چوراہے پر کھڑا ہوتا ہوں کہ لاہور کی کسی تنگ گلی میں ایک ادبائش کی بیوہ پرآواز دے رہی ہے۔

”ڈر کر مجھے بچا رہی ہے، میں وہاں سے بھاگا آتا ہوں۔“

”اُٹ! تُو نے کیوں مجھے اس ملک میں؟“

”دُنیا وہی ہے لیکن میں وہ نہیں!

”دُنیا ابھی تک حسین ہے لیکن میں اس عشق سے خالی ہوں!

نہیں دُنیا وہی نہیں کچھ اور ہے اور تُو عشق کے سوا اُس میں اور بھی بہت کچھ ہے۔“

پھر تُو وہ دہسی اور عشق سے بھی خالی ہو لیکن دل و رُوح میں پھر اپنا آپ ڈال دے اور کچھ اور بن جاو تُو پہلے کسی نہ تھا!

بشیر احمد

جہاں نما

پُرانی روایات سے نئی دنیا کی تخلیق

”دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو!“

مغرب کی نسبت ہندوستان میں نئی تہذیب کی خودکشی کی تیر رفتار کروڑ کئے کا زیادہ امکان ہے۔ ہندوستان میں ابھی تک غیر ملکی قلم کے احترام کا گہرا جذبہ موجود ہے۔ ایف جی بیرس نے اپنے ایک مضمون میں جو بیسویں صدی میں شائع ہوا ہے ”لوگ“ کی اہمیت پر بحث کی ہے۔ ”لوگ“ سے اُس کی مراد وہ اٹھل یا طریقہ ہے جس سے انسان اپنے من کی دنیا پر اضیاد حاصل کر سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ ”اگر ہم اس بحید کو پالیں کہ اصل حیات واحد اور غیر منقسم ہے اور انسانیت ہم سے اپنے معدود ذہن کی تخلیق ہے تو کیا اس کے بعد ہم زندگی کے اُس نظام کو جائز قرار دے سکتے ہیں اور برداشت کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے بنی فروع انسان کا تین چوتھائی حصہ باقی ایک چوتھائی کے بوجھ کے نیچے کراہ رہا ہے؛ کیا اس کے بعد ہم کسی قسم کی غلامی اور ظلم کو گوارا کر سکتے ہیں؛ یہ ٹھیک ہے کہ ظلم کرنے والوں اور غلام بنانے والوں سے نجات حاصل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں لیکن ہم ان انسانیت سوز کاموں سے روکنے کی کوشش کر سکتے ہیں کیا یہ کام آرام گزی پر بیٹھے بھائے ہو سکتا ہے؛

میں اس بات کا احساس نہیں کہ دنیا کو روا راست پر لانے کی کوشش کرنا، سیاسی اور مادی انقلابات پیدا کرنا یا تعلیم دینا ہم سب کا فرض ہے۔ وہ لوگ بھی جن کا کام صرف دیکھ بھال ہے ایک قسم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ناگن نہیں کہ بیچ کر سوچنے والے بھی اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔ ایک آرٹ جسے مغرب نے فراوانی کر کے بہت نقصان اٹھایا ہے اور جس کی اہمیت مغرب کی پیروی کی وجہ سے مشرق میں بھی خطرے میں ہے سوچ بچار کی علامت ہے اور اگر یہ عادت متعقود بالذات نہ ہو بلکہ کسی اور مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہو اور وہ مقصد انا کے دھوکے سے نجات حاصل کرنا ہو تو یہ بیک وقت ایک اعلیٰ وجہ کا آرٹ اور سائنس بن جاتی ہے۔

”وہ شاعر جس نے لکھا تھا کہ مشرق لشکروں اور فوجوں کی گرج کے درمیان اپنے خیالات کی دنیا میں گم تھا اگر اس وقت زندہ ہوتا اور سطرہ کی کتاب پڑھتا تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ انہی لشکروں کی گرج اور اُن کے سائنٹفک تباہی لانے والے ہتھیاروں کے شاہد سے جدید سائنس کا ایک مغربی مصنف کس طرح تہذیبِ مغرب کے انجام کی پیش گوئی کرتا ہے۔ اور اگر وہ سننا کہ اس مصنف اور

اس کے اکثر معاصرین کو یقین ہے کہ تہذیب کو بچانے کا واحد ذریعہ انہی باتوں کی تلاش ہے جن کی تحریز مشرق ایسے نازک وقت میں اپنے خیالات کی دنیا میں گم تھا جب مغرب فاتحانہ انداز میں آگے بڑھ رہا تھا تو اس کی حیرت کی انتہا درستی۔
مضمون کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

”ہندوستان کو ان باتوں کی تلاش میں خاص سہولتیں حاصل ہیں سائنس اصول کی روایات جس نے ہندوستانی تہذیب کو اپنی پھر سامری اور مصری تہذیبوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی عرصہ دراز تک زندہ رکھا آج بھی اس ملک میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ اسی قسم کے کم از کم تین اہم اصولوں کی روایات یہاں موجود ہیں اور وہ یہ ہیں:- (۱) مبدہ مت کا نفسیاتی نظام، (۲) یوگ (۳) ہتھورت، چونکہ ان کا تعلق عام طور پر مذہب اور مذہبی نظاموں سے ہے اس لئے زیادہ تر یہ ان لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جو مادی حقائق کی دنیا سے پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ جو لوگ ان مادی حقائق کا مقابلہ کر کے دنیا میں انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ انہیں اپنے لئے بے گنجنگ سمجھتے ہیں۔ لیکن میاں کہ میں نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے یہ اصول دوسرے قسم کے لوگوں کے لئے سفید تریں ہے کیونکہ اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو اس کا اثر ان باتوں کے بالکل منافی ہے جو انسان کو موجودہ طرز زندگی کے عملی مسائل سے روگردان کو ہی ہیں۔ یہ اس قدامت پسند مذہبی نظام کا بالکل الٹ ہے جسے مارکس ایک نشہ آور چیز سے مشابہ کرتا ہے۔ یہ رُوح اولیٰ اور جسم کو از سر نو زندگی اور صحت دیتا ہے۔ بنی نوع انسان میں اپنے مستقبل کے تعلق خود اعتمادی کے جذبات پیدا کرتا ہے اور اخوت اور آزادی کا پیغام لاتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ ”قوتِ حیات“ جس وقت چلے اور جس طرح چاہے اپنی قدرتش کے کس اظہار کے لئے اپنے آپ کو نئی سے نئی شکلوں میں اور بڑے سے بڑے پیمانوں پر ظاہر کر سکتی ہے۔ یہ حقیقت کہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے اس بات کی کافی دلیل ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہوتا ہے گا اور ناکامیوں اور غامبیوں کے باوجود زندگی کی یہ رُو بُنُو قوت کے ساتھ جاری رہے گی۔“

لُہامیات

(۱) چنپی کے منہ پر شیش اندر تھامتا ہوا
 چنپی کے نہیں عقل سے بیگانہ ہوا
 چنپی کے منہ سے نہ مانے آذر
 جاسم ہے کوئی مانے نہ مانے آذر
 فرزاؤں کو میں دیکھ کے دیوانہ ہوا

(۲) وہ کیفیت نہ مٹے میں ہے نہ بیجانے میں
 وہ کیفیت نہ ساغر میں نہ پیمانے میں
 وہ کیفیت نہ پیکر تجھے حاصل ہوگا
 جو کیفیت ہے سہاگی کے محل جانے میں

(۳) غم جو یہ زنا تے میں بیجانے کی
 سہاگی کے چھلکتے ہوئے پیمانے کی
 یہ غم جو نہ میں تو اور کیا ہے ہاج
 تو کرتا ہے کوشش نہیں سمجھنے کی

(۴) کہ گیت گیت سے بڑبڑاتے ہیں نے
 کہ گیت گیت میں تھانی میں گائے ہیں نے
 کہ گیت گیت سے ایسے جی میں ہے آذر
 کاغذ پر جو کچھ کہہ کے ٹٹاٹے ہیں نے

محمد علی آذر جالندھری

جل ترنگ

جل ترنگ

بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی نگینوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
گومتی پرکشتیوں میں ہیں تباہ شمع و شنگ
بے دریغ و بے درنگ

جل ترنگ

بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی نگینوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ

بج رہا ہے جل ترنگ

ساحلوں پر پھول سے برسا رہی ہے چاندنی
نقرئی لہروں میں غوطے کھا رہی ہے چاندنی
آج ہے ہر شے پر رنگ

جل ترنگ

بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی نگینوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ

بج رہا ہے جل ترنگ

ساز و نغمہ، ساغر و نئے اکیت و نوماں و بہار
الحند و جوش جوانی، الاماں آغوش یار

دل ہوا جاتا ہے تنگ
جل ترنگ
بچ رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینوں میں بچ رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ

بچ رہا ہے جل ترنگ
جا رہی ہیں کشتیاں پانی پہ لہراتی ہوئی
ڈنگاتی، جھومتی، مڑتی ہوئی گاتی ہوئی
دل میں ہے تازہ انگ
جل ترنگ

بچ رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینوں میں بچ رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ

بچ رہا ہے جل ترنگ
بچ رہا ہے نیگوں موجوں میں یوں تاؤں کج
بر رہے ہیں کمکشاں پر ہم یہ ہوتا ہے خیال
ہو رہی ہے عقل دنگ
جل ترنگ

بچ رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینوں میں بچ رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بچ رہا ہے جل ترنگ

اقبال

اس مضمون کا ابتدائی حصہ "ایوم اقبال" کی تقریب پر ۹ جنوری ۱۹۳۷ء کو کراچی انڈیا ریڈیو کے لاہور سٹیشن سے براڈ کاسٹ کیا گیا۔

یہ لاہور ہے، لاہور جہاں اردو کا شہر و آفاق شاعر اقبال رہتا ہے۔ جہاں میں بول رہا ہوں وہاں سے مشکل ایک میل کے فاصلے پر وہ شخص اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے جس پر آج ایک دنیا کی نظریں جمی ہیں۔ وہ پلنگ پر لیٹا یا بیٹھا ہوا ہے وہ عام طور پر اپنے گھر کے اندر ہی رہتا ہے صحت کی کمزوری نے اُسے اس خانہ نشینی پر مجبور کر دیا ہے لیکن یہ نہ سمجھئے کہ وہاں وہ تنہا ہے۔ لوگ جب موقع پاتے ہیں وقتاً فوقتاً اُس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اسے ان کی ملاقات کے غائبیوں کیونکہ وہ حقیقت میں ایک بڑا انسان ہے جو عموماً اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے ہم جنس سے بھی ملنے سے انکار نہیں کرتا، وہ ایک آزاد خیال شخص ہے جس پر حکومت کے زور یا دولت کی شیخی کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ اس کے لئے بڑے چھوٹے سب برابر ہیں کیونکہ وہ ایک بڑا اور سچا انسان ہے!

اقبال کی صحت اور جسم کمزور لیکن اُس کے دل و دماغ ابھی خوب مضبوط ہیں اور جب وہ باتیں کر رہا ہو، زندگی کے مسائل پر اپنا نقطہ نظر بیان کر رہا ہو، موجودہ حالات پر تبصرہ کر رہا ہو یا مغربی حکمت یا سیاست کی بعض تازہ ترین کتابوں پر تنقید کر رہا ہو تو اُس کی وسیع نظری اور جوش اور انہماک اور معلومات کو دیکھ کر اس بات کا گمان بھی نہیں گذرتا کہ اُس پر زور شخصیت کی جہاں کی صحت کسی طرح کمزور ہو۔ اس عظیم الشان انسان کی صحبت یا اُس سے ملاقات ایک ایسی نعمت جس سے صرف بڑے اور سمجھدار آدمی ہی نہیں بلکہ معمولی آدمی بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اٹھاتے ہیں۔ کئی دفعہ شہر کے بعض آدمی حاضر ہوتے ہیں اور صرف یہ سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے قومی شاعر کی چند منٹ کے لئے مٹھی چا پی کریں۔ خوش قسمتی سے قومی شاعر باوجودیکہ وہ ایک جنگلی میں رہتا ہے سرمایہ داروں یا امیروں کا سامراج نہیں رکھتا کہ صرف صاحب حیثیت آدمیوں سے ملنا گوارا کرے۔ اس لحاظ سے موجودہ زمانے کا یہ شاعر موجودہ اور گزرے ہوئے وقتوں کے علم و اخلاق کا آئینہ ہے۔

اقبال کی عمر اس وقت ۶۱ سال ہے۔ وہ ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ وہاں الین۔ اے کا امتحان پاس کر کے انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے پاس کیا اور وہیں فلسفے کے اسٹنٹ پروفیسر مقرر کئے گئے۔ اسی زمانے میں ان کی شاعری بھی چمکنے لگی۔ اسی زمانے کا وہ شہر مشعر ہے جسے سن کر مرزا ارشد نے اس فوجان کے متعلق شاعر ہونے کا اعلان کیا تھا اسے موتی سمجھ کے شان کیچی نے چُن لئے قطرے جیسے مے عرق انفعال کے

اردو کے نقطہ نظر سے اقبال کی شاعری کیا پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا جسے مخزن کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۱۹ء

سے ۱۹۰۵ء تک تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے ادھر شیخ عبدالقادر صاحب کے مشورے سے مخزن میں لکھنا شروع کیا اور ادھر انہیں حمایت اسلام لاہور میں اپنی دردناک نظیں سنائی شروع کیں حب الوطنی کی نظیں بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ دوسرا انگلستان کا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک محتاج وہ یورپ تعلیم کی غرض سے مقیم ہے۔ اس دور میں مغربی تہذیب کے ان کی مٹھ بھیڑ ہوئی جس سے ان کے کلام پر خاصا اثر ہوا اور وہ مغربی تمدن کے ایک زبردست نقاد بن گئے۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۳ء تک محتاج وہ اپنی قومی و باہمی نظموں سے قوم کے ایک سرگرم رہنما بن گئے۔ شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر، خضر راہ، طلوع اسلام، یسب اسی عہد کی نظیں ہیں۔ لیکن اسی دور میں اقبال فارسی کی طرف کھینچے چلے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے "اسرار خودی" شائع کی۔ اس کے بعد پورے "صمدی" اور "پایم شرقی" شائع ہوئیں۔ چوتھا دور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک محتاج ایک طویل عرصے کے لئے انہوں نے اردو سے منہ پھیر لیا۔ "زبورِ عجم"، "جاوید نامہ"، "مساخر" اور اسلام پر انگریزی میں کچھ لکچر اس زمانہ میں لکھے گئے۔ ۱۹۳۵ء سے پھر اردو کی باری آئی اور پہلے "بالِ جبریل" اور پھر "ضربِ کلیم" شائع ہوئی۔

اقبال محض ایک شاعر نہیں وہ ایک زبردست قومی رہنما ہے، وہ ایک مخلص قومی پیغامبر ہے وہ ایک فلسفی شاعر ہے وہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے لئے اور ساری نوب انسان کے لئے ایک پیغام کے کراہے۔ ایک دفعہ نہیں کبھی باریں نے ۱۹۳۵ء سے پہلے ان سے شکایت کے طور پر عرض کی کہ آپ نے اردو کو چھوڑ دیا ہے اور اردو کا آپ پر خاص حق تھا اور ہے۔ فارسی والے فارسی ہیں لکھیں، اردو کو اردو والوں کی ضرورت ہے اور بہت سخت ضرورت۔ وہ یہ سن کر مسکرا دیتے تھے۔ بہت اصرار پر انہوں نے کہا تو یہ کہا کہ اول تو میری اردو بھی فارسی نما ہوتی ہے، دوسرے شاعر مسلمانوں کو مد نظر نہیں رکھتا، اُسے تو ایک پیغام دینا ہے جس زمان میں بھی موزوں ہو جائے اور جہاں تک بھی پہنچ سکے!

اقبال کا فلسفہ جدید و ہمہ کا فلسفہ ہے۔ زندگی انفرادی چیز ہے، اخلاص بے عظیم اشران فرو ہے، کائنات ایک عجیب و غریب کائنات ہے، وہ مکمل نہیں اس کا کام برابر جاری رہتا ہے اور مرفرد اس میں اپنے اٹکے ہن کے ساتھ حصہ لیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کا فیصلہ العین یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو فروغ دے، اُسے چمکائے، اُسے بھلائے اور اُسے جماعت اور نوب انسان کی خدمت میں صرف کرے۔ زندگی کا محرک ہے اپنے میں سب کچھ جذب کرنے والی اور عشق اس محرک کا سب سے زبردست جذبہ ہے۔ زندگی ہمیشہ آگے کو بڑھتی ہے:۔۔۔

چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ڈبا کچل گئے ہیں

زندگی آزادی کے لئے ایک مسلسل کوشش ہے اور صحیح زندگی صرف وہی ہے جو بے جھجک ہو کر خطروں میں سے ہو کر گزرنے اور اور زیادہ زندہ و تابندہ ہو جائے۔۔۔

اگر غراہی حیات اندھ نظری

اقبال کے کلام پر ایک سرسری سی نظر ڈالو تو جا بجا مناظر قدرت، حب وطن، امن و فطرت، موجودہ تہذیب اور قومی عروج و زوال کی بلیاتی تصویریں نظر آئیں گی جس و غریبی کے نظائے، جدوجہد کے نعرے، عشق و ایمان کے شعلے جا بجا یہ جلوے ہیں!

سب سے پہلے مجھ سے بانگ درا کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

اے ہمالہ اے فعیل کشور ہندوستان جو مٹتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسمان

تجربہ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ دوزی کے نشان تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے دریاں

ایک جلوہ متاکلیم طور سینا کے لئے

تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

گویا اپنے ملک کی محبت کو معرفت کا درجہ دے دیا ہے!

پرنس سے کی فریاد بچوں کے لئے ہے، ہم میں سے اکثر نے اسے سکول میں پڑھا ہے:۔

آتا ہے یاد مجھ کو گورا ہوا زمانہ

لیکن جیسی بچوں کے لئے ہے ویسی ہی بڑوں کے لئے بھی ہے، صرف ان کے لئے اس کے نئے کچھ ہیں اور ان کے لئے کچھ اور یہی ایک

بڑے شاعر کی غریبی ہے کہ ایسی بات کہ جس کے لئے موزوں اور بے دل پسند ہو۔ ایسی ہی نظم ایک آرزو ہے:۔

دُنیا کی مغللوں سے اُٹا گیا ہوں یارب! کیا لطف انجمن کا جب لہی بچھو گیا ہو

مزا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جمبو پٹا ہو

لذتِ سرود کی ہو چڑیلوں کے چھپوں میں چشمتے کی شورشل میں باجاس بچ رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کسا کا نفا رہ پانی بھی توج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

یہ اود اور اشار جو میاں و برج کھتے تھے ہیں اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ ان کا دھڑلا حاصل معلوم ہوگا لیکن یہی ہمارے شاعر کی عظمت

ہے کہ باوجودیکہ وہ ایک فلسفی شاعر ہے۔ اس کے ہزاروں شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ چکے ہیں اور لبیبوں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں۔

وطن کے درد سے شاعر کا دل معمور ہے:۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

اور وہ بے اختیار کہتا ہے:۔

لڑاتا ہے ترانہ اے ہندوستان مجھ کو کہ عبرتِ غیر ہے تیرا فائدہ سب فائز میں

نہ مجھ کے تو بٹ جاؤ گے لئے ہندستان والو ہمارے داستانِ تنگ بھی دھمگی داستان میں

قوم وطن کی بیماری کے لئے شاعر کے پاس علاج بھی ہے :

محبت ہی سے پانی ہے شفا بیمار قوموں نے کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے
ترانہ ہندی کو کون نہیں جانتا ؛ اُسے کون نہیں سمجھتا ؛ اُسے کون نہیں لگتا تا اور گاتا ؛ :
سائے جہل سے اچھا ہنڈ تل ہارا

بلاشبہ یہی اس وقت ہندوستان کا قومی ترانہ ہے !

عشق و معرفت اور عقل و دل پر کیے کیے موتی بھیرے ہیں :

جنس میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں مینوں میں وہ بچے میرے غلٹ غاڈ دل کے کینڈل میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا یہ وہ ہے جسے رکھتے ہیں نازک آنگینوں میں

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے نظائے کی مہر ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے
سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے ادبے خیر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
- اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال مسلسل کوشش اور مسلسل زندگی اور مسلسل تغیر کا قائل ہے :

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ نہام سے

سکونِ محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
میرے والدِ محترم جسٹس شاہدین ہمایوں (مرحوم) سے جن سے اقبال کو فاضل تعلق تھا خطاب کرتے ہوئے اُن کی وفات کے بعد
لکھتے ہیں : اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی تیری چنگاری چراغِ انجمنِ انسوز تھی
اس نظم کا آخری شعر ہے کہ :

موت کو سمجھ میں غافلِ اقتسامِ زندگی ہے یہ شامِ زندگی مسیحِ دوامِ زندگی

مغرب کی تہذیب پر کیا کھری کھری باتیں کہی ہیں :
دیا وِ مغرب کے رہنے والا خدا کی بستی و کائنات میں ہے
ہمارے تہذیب اپنے منہ پر کپڑے ہی غوشی کرے گی
اس کے مقابل میں شاعر کا نصب العین ترکِ دنیا نہیں بلکہ :

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں جن میں مجھ تے میں مانے لے
میں اُس کا بندہ بنو لگ جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
وطنیت اور مغرب پرستی کی علامت نہ روش سے بیزار ہو کر اقبال ایک زیادہ ہمہ گیر معاشرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے جن میں صحیح آزادی
اور رسالت اور محبت اور عدل و ہمدردی کے عناصر ہوں اور یہ محض ایسے افراد کے ایثار اور کوششوں سے وجود میں آسکتی ہے جو اپنی خودی
سے بھڑکی آگاہ ہوں:۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تقدیریں نہ تدبیریں
جو ہر ذوق یقین پیدا تو کٹھانی ہیں رنج میں
یقین محکم، عمل بہیم، محبت فاتح عالم
جہاں زندگی گانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں
اشتراکیت کی جھبکیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں: "ہوس نے کر دیا ہے کھڑے کھڑے فرح انسان کو" اور "قیامت ہے کڈنا
فرح انسان کا شکاری ہے۔"

بال جابریل میں شاعر مصر و حجاز اور پارس و شام یعنی ہر قسم کی قیامت پر مقام سے بہت بلند پرواز کرنے لگتا ہے۔ اس زمین پر
رہنے والے کی آواز سے آسمان بھی گونج اٹھتے ہیں:۔
میری نوا لے شوق سے شور حریم ذات میں
فعلیہ: اے الزماں بت کدہ صفات میں
اسلامی نعت العین ماننے سے۔

خودی کا سر نہاں لا اِلٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغِ فناں لا اِلٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
ہمارا ہو کہ خزاں لا اِلٰہ الا اللہ
لیکن اس میں بھی آزادگی کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
خرد ہوئی ہے زمان و مکان کی کنہی
اگرچہ بُت میں جماعت کی آئینہ میں
منعم کدہ ہے جہاں لا اِلٰہ الا اللہ
نہ ہے نہاں نہ مکان لا اِلٰہ الا اللہ
مجھے ہے حکم اذان لا اِلٰہ الا اللہ

اسلامی نعت العین ضرور ماننے ہے لیکن اقبال کے لئے مسلمان وہ نہیں جیسا کہ آج کل مسلمان ہے بلکہ وہ جیسا کہ مسلمان کو ہونا چاہئے
کیا اس تعریف کے تحت میں بعض غیر مسلم بھی شامل نہ ہونا چاہیں گے:۔

بناؤں تجھ کو مسلمان کی زندگی کیا ہے؟
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ حسنوں
طلوع ہے صفتِ آفتاب اُس کا غروب
یگانہ اور مشاغلِ زمانہ گونا گوں

کہا جاتا ہے کہ ضربِ کلیم میں شاعری نہیں محض دہی فلسفہ سا ہے دُہرا ہوا۔ اوپر کے ساتوں شعرا سی دیوان سے ہیں۔ ان سے

زیادہ زندگی بخش شعر اور کون سے ہوں گے ؟

غرض اسلامی نصب العین ضرور سامنے ہے لیکن یہ امر غور کرنے کے قابل ہے کہ اس نصب العین کی تلاش میں اقبال اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ وہ مسلم و غیر مسلم سب کے لئے زندگی کا ایک فلسفی رہنما بن چکا ہے۔ مثال کے طور پر بال جبریل اور ضرب کلیم کے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

خدا سے گلہ ہوتا ہے :-

اگر کج کرد ہیں آجسم آسمان تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا :-
اسی کتب کی تابانی سے ہے تیر جہاں روشن
زدال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا :-

فلک کی گردش اور زمانے کا انداز اب نرالا ہے اور ہونا چاہئے :-

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیر ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی
پڑانے میں یہ رستا سے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہوا بھی فوضیہ
حدیث بے خبراں ہے "تو بازمانہ بار"
زمانہ باتو ساز تو بازمانہ ستیز

یعنی زمانہ اگر ررات نہیں تو اُسے رست بنانا انسان کا کام ہے۔ انسان کی حیرت انگیز قوت و سمیت کا جا بجا غور و بلند کیا ہے

چیتے کا جگر چاہئے شاہین کا شبنم

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
آزادی و یک رنگی اسے بہت مروانہ
دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تُو بے باک نہیں ہے
کب تک رہے نکوئی آجسم میں مری خاک
یا میں نہیں یا اگر دشمن افلاک نہیں ہے
خود کے پاس خبر کے ہوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں
سب سے بڑھ کر یہ کہ

خود می کو کر لبت داتا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود دلچپے بتا تیری خاک کیا ہے ۔

کیا یہ آج کل کے ایک عام مسلمان کی سی محدود فکر و مسلمانیت ہے؟ نہیں یہ وہ زندگی پیدا کرنے والا رنگوں میں خون دوڑانے والا ہمہ گیر بلند نظر مذہب ہے جس کے آگے شاہدائے انتہا پسند اشتراکی بھی فخر کے ساتھ اپنا سر جھکا دیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقبال کو محض ایک فرقتے کا شاعر کہنا پڑے وہ درجے کی غلطی ہے۔ وہ نوع انسان کا پیغام بر اور نوع انسان کا بے بدل شاعر ہے۔

پنجاب کے دہقان سے یوں خطاب کرتا ہے کہ

بتا کیس تری زندگی کا سہے راز؟ ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز !

اسی خاک میں دب گئی تیر سی آگ سھر کی اذال ہو گئی اب تو جاگ !

یعنی خدا کے حضور جاتا ہے اور شکایت کرتا ہے تو فرشتے بھی نے انداز میں گیت گاتے ہیں اور اس شکایت کی حمایت کرتے ہیں۔ ادھر خدا کہ اسی جن طلب کا منتظر تھا فرشتوں کے نام اب اپنا انقلابی فرمان جاری کرتا ہے کہ :

اُمّو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخ اُمرا کے در و دیوار بلا دو

مرا و عسلا موں کا لہو سوز بے نیس سے کج فک فساد کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقش کمن تم کو نظر آئے مٹا دو

۔ جس کمیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی اُس کمیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

۔ میں ناخوش و مبہزار ہوں مری کی سلوں سے میرے لئے بنی کا حرم اود بنا دو

یہ سب اس لئے کہ اقبال جمہور و سکون و سکوت کا قائل نہیں مسلسل تیزی کا علمبردار ہے :

جو متناہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محمدانہ !

ضربِ کلیم کا سزا مر ہے

نہیں مفت ام کی تو کج طبیعت آزاد ہوائے سیہِ مثالِ نسیم پیدا کر

لہرِ آتشِ تیرے سناٹا سے پھوٹے غدی میں ٹپکے ضربِ کلیم پیدا کر

یعنی اب ہر انسان کو کلیم بننا اور کلیم بن کر دکھ دینا ہے :

دلِ مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دو بارہ

یہ مُردنی کیوں چھائی ہوئی ہے اس لئے کہ

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

اس زنداں سے نکلنا ہے لیکن اپنے آپ کو مجبور نہیں جانا کہ خود آگاہی ہی انسانیت کی ضامن ہے۔ اپنے چہیتے بیٹے جاوید سے

خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

شاخِ گل پہ چسک و لیکن کہ اپنی غدی میں آشیانہ

رہی مسلمان درکار نہیں :- دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں !

اقبال کے نزدیک صرف جرات اور طلب اور ہمت ہی صحیح زندگی کی رہنما ہے۔

جرات ہو مرنے کی تو فتنہ تنگ نہیں ہے اسے مرو خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے

ہے آپ حیات اسی جہاں میں شرط اس کے لئے ہے تشنگانی

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے جو ہر نفس سے کرے عمر جادواں پیدا

اقبال کا فلسفہ ہے کہ انسان اپنے سیاہ و سفید کا مالک ہے، وہ فنا کو بخت میں تبدیل کر سکتا ہے، وہ زمانے کی زد کو جدھر چاہے موڑ سکتا ہے اور اس سے زیادہ کسی انسان نے کیا کیا ہو گا کہ

در دشت جنوں من جب ریل زبل صیدے یزداں بہ کند آور اسے ہمت مروانا!

اگر وہ نہ تھا کہ اقبال کے فارسی کلام پر کچھ لکھا جائے۔ راقم نے مدتوں کوشش بھی کی کہ اُس سے رُوگردانی کی جائے لیکن سر ذوالفقار علی خاں کے مختصر انگریزی تبصرے "شرق سے ایک آواز" کے سرورق پر مرقوم بالا شعر پڑھ کر نہ رہا گیا اور اسرارِ خودی کو پہلے فارسی اور پھر انگریزی میں بھی پڑھا اور بعد میں دوسری فارسی شہنلوں سے بھی فیض یاب ہوا۔ "من صدائے شاعرِ فردا ہستم" کی کہانی اور پھر فارسی کی زبانی! سچ ہے کہ زمان کے جھگڑے کو بالکل بھول گیا اور زندگی سے دوچار ہوا۔

بیکر ہستی ز آثارِ خودی ست ہرچہ می بینی ز اسرارِ خودی ست

خویشتر را چوں خودی سیدار کرد آشکارا عالم پسندار کرد

سوز بہیم قسمت پروانہ ہا شمعِ مذبذبست پروانہ ہا

خانہ افکشِ مدلمر و زبست تابیا ر و صبحِ فردائے بدست

شمعہ ہائے اوصدا براہیم سوخت تا چراغِ یک محمد بر فروخت

خیودانگیزد پرد تا بد رمد سوزد افروزد کشد میرد دمد

نقطہ نور سے کہ نامِ او خودی ست زیرِ خاکِ با شرارِ زندگی ست

از محبت می شود پائندہ تر زندہ تر سوزندہ تر تا بندہ تر

در جہاں ہم صلح و ہم پیکارِ عشق آپ جہاں تیغِ جوہرِ دارِ عشق

از نگاہِ عشقِ خارا شقِ شود عشقِ حق آن خورسرا پا حقِ شود

خاک گشتن بے پروائی ست خاک را اب شو کہ این مرداکی ست
 از گل خود آدمے تمبیر کن آدمے را علمے تمبیر کن
 در عمل پوشیدہ مضمون حیات لذت تخلیق قانون حیات
 مرد خود داریے کہ باشد سنجہ کار بامزاج اوبازد روزگار
 گر نہ از بامزاج اوجہاں می شود جنگ آزما با آسماں
 بر کند بنیاد موجودات را می دہد ترکیب نو ذرات را
 گردش اقام را بر ہم زند چرخ نیلی فام را بر ہم زند
 آرمید صاحب قلب سلیم زور خود را از ہمت غنیم
 لیکن زندگی افساد کا مرکز ہے "خودی" کا زور دکھا کر شاعر بے خودی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ "شیعہ و شاعر" ہیں وہ برسوں پہلے کہ
 چکا ہے کہ سہ

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں مجھ ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
 اب "روز بخودی" میں ربط فرد و ملت کے معنی بیان کرتا ہے :
 فرد را ربط جماعت حجت است جوہر اور اکمال از ملت است
 "انوارانی با جماعت یار باش رونق بہکا منہ احرار باش
 فرد می گیرد ز ملت احترام ملت از انفرادی یا بدلتام
 فرد تا اندر جماعت گم شود قطر و وسعت طلب فلام شود
 ان اسباب کا ذکر کتاب ہے جن سے افراد اور قومیں تیار ہوئیں :
 مرگ را سماں ز قطع آرزوست زندگی محکم از لا تقطعواست
 اسے کہ در زندان غم باشی اسیر از بنی تسلیم لاشخون بگیر
 گر خدا داری ز غم آزاد شو از حیل بیش و کم آزاد شو
 نظام ملت کے لئے آئین کی ضرورت ہے :
 ملتے را رفت چو آئیں ز دست مثل خاک اجزائے او از ہم شکست
 برگ گل شد چوں نہیں بستہ شد گل نہ آئیں بستہ شد گلہ شد

نہمہ از ضبط صد اپید استے ضبط چل رفت از صد اغوغاستے
 اور ہمیت حقیقی صرف کسی نصب العین سے ممکن ہے
 مدعا گرد اگر ہمیں زما ہجو مصری رود شبیدیز ما
 اور وہ مدعا یہ ہے کہ

تاہم خیمہ زباں گنجی از عالمے گر مسلمان نیاسائی دے
 لیکن اس مسلمان کے صحیح معنی یہ ہیں کہ

ہوس نے کر دیا ہے مکڑے مکڑے نوح انسان کو اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
 مشرق کے لئے اُس کا "پیام" تجدیدیات ہے لیکن عشق و محبت کے ساتھ

بیا اے عشق اے بے ز دل ما بیا اے کشت ما اے حاصل ما
 کس گشتند این خاکی نہادال و گر آدم بنا کُن از دل ما

جو نقاد اس بات کے شاکي ہیں کہ اقبال کے کلام میں نغمے کی کمی ہے وہ "پیام مشرق" پر ایک نظر ڈالیں :-
 چرخش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن دل کوہ و دشت و محراب دے گماز کردن
 ز نفس درے کثادن بہ فضائے گلستانے رو آسمان نور دن بہ ستارہ راز کردن

(۱)

فصل بہار کی آمد دیکھو

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زدا بر بہار

مست ترغم ہزار

طلوی و دواج و سار

جرطرب جوئبار

کشت گل و لالہ زار

چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زدا بر بہار

(۲)

خیز کہ در باغ و راغ قافلہ گل صید

باوہساراں وزید
مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید
حسن گل تازہ چید
عشق غم نو خرید
خیر کہ در باغ و راغ قافلہ گل رسید

کشمیر جنت نظیر کی تصویر یوں کھینچی ہے:

رخت بہ کاشمیر کشا کوہ و تل و دمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
سبزہ جہاں جہاں بسیں لالہ چین چین نگر
مصلصل دسار زوج زوج بر سر یاروں نگر

ستاروں کا گیت کس قدر دلکش ہے

ہستی ما نظام ما مستی ما خدام ما گردش بے مقام ما زندگی دوام ما
دور فلک بکام ما می نگریم و می رویم
گرمی کا رزار ہا خامی بختہ کار ہا تاج و سریر و دار ہا خوار می شہر یار ہا
باز می روزگار ہا می نگریم و می رویم
خواجہ ز سرور می گذشت بندہ ز پکاری گذشت زاری و قیصری گذشت دور بکھن در می گذشت
شیدہ بہت گرمی گذشت می نگریم و می رویم
بیش تو نزد ما کے سارل تو زود ما دے اے بکنار تو یے ساختہ بہ شبنم
ما بہ تلاش عالمی می نگریم و می رویم

”زبور عجم“ میں شاعر بیداری کا پیام دیتا ہے

اے غنچہ خواہیدہ چو ز گرسنگراں خمیند
از نالہ مرغ چین از بانگ ازل خمیند
کاشا از مارفت بہ تاراج غماں خمیند
از گرمی ہنگامش آتش نفساں خمیند

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خمیند
از خواب گراں خمیند .

فریاد زافرنگ ددل آویزی افرنگ فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ دیر اند ز چنگیزی افرنگ معاصر مرم! باز بتیمی مرم خیند
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیند
از خواب گراں خیند

اور پھر انقلاب کا نعرہ بلند کرتا ہے :۔

خواجہ از خون رنگ مزدور سازد لعل ناب انجھائے وہ خدایاں کشت دہقان خراب
انقلاب!

انقلاب اے انقلاب!

من درون شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام آں چنان زہرے کہ ازوے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب!

انقلاب اے انقلاب!

جاوید نامہ میں ہمارا شاعر عالم فکری کی سیر کرتا ہے اور رُوحوں سے قمر اور عطارد اور زہرہ اور مریخ اور مشتری اور زحل
میں اور آئسوئے افلاک میں ملاقات کرتا ہے۔

کتاب کا دیباچہ یہ ہے :۔

خیال من بہ تماشا ئے آسمان بُود است بدوشن ماہ و بہ آغوش ککشاں بُود است
گماں مبر کہ ہیں خاکدل شین است کہ بہر ستارہ جہان است یا جہاں بُود است
زحل کی منحوس فضا میں شاعر رُوح ہندوستان کو کالہ و فریاد کرتے سنتا ہے :۔

شیخ ہال افسرد در فائوس ہند ہندیاں بیگاہ از ناموس ہند
مردک نامحرم از اسلام خویش زغمہ خود کم زند بر تار خویش
بر زمان رستمی بند و نظر ز آتش افسرد می سوزد جگر

اور اُس کے کتاب ہے کہ :۔

بگذر از فقرے کہ عربانی و دہد اے خنک فقرے کہ سلطانی دہد

الحمدرا ز جبر و ہم از غمے مبر
جابر و مجبور را زہر است جبر
ایں بر مسبر پیچے خوگر شود
اں جب بر پیچے خوگر شود

ہر دورا ذوقِ ستم گرد فزول
وردِ سنِ کالیتِ قوئی یلکون

آخری فارسی نظم "مسافر" (مطبوعہ ۱۹۳۷ء) سیاحتِ چند روزہ افغانستان کا شعر ہے۔ اقوامِ سہرے خطاب کرتے ہوئے شاعر پھر اپنے سازِ خودی کو چھیرتا ہے:-

چیت دیں؛ دریا فتنِ سرا و خولیش
زندگی مرگ است بے دیدارِ خولیش

آخری دیوانِ ضربِ کلیم کی آخری غزل کا مطلع ہے:-
فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ بھرائی یا مردِ کمستانی
اور آخری شعر یعنی اقبال کا تازہ ترین کلام یہ ہے:-
صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے جلیقہ اس کا
تو اے تیزی میں سبائے مسلمان!

بشیر احمد

ہیں کہے کر دیا ہے بڑے نفعِ انسان کو
... محبت کی نیاں بوجا وقت کا بیاں بوج
اقبال

سنت

پھر نسیم جا بجائے گن بچا گئی
پھر نوید زندگی سب کو گدگدا گئی
پھر ہمارے بچوں کو تخت پر بٹھا گئی
پھر ادائے دلبری معجزہ دکھا گئی
پھر سنت کی ہوا ہر چین میں آ گئی

پھر ہوا ہے خیمہ زن کا روان رنگ بو
پھر زین باغ ہے آسمان رنگ بو
پھر کلی کے لب پہ ہے دستان رنگ بو
پھر ہے نخل طور پر آستان رنگ بو
پھر سنت کی ہوا ہر چین میں آ گئی

پھر مرے کریم نے گنج زلٹا دیا
پھر ہماں آرزو دل ربا بن دیا
پھر چین کے فرش کو عرش پر بٹھا دیا
پھر کریم ناز کو آئینہ دکھا دیا
پھر سنت کی ہوا ہر چین میں آ گئی

پھر سرور کی گھٹا چھا گئی ہے چارو
پھر صدائے واشر بوا کو سختی ہے چارو
پھر فضائے دہریں دلکشی ہے چارو
پھر طرب ہے جا بجا پھر خوشی ہے چارو
پھر سنت کی ہوا ہر چین میں آ گئی

پھر خمار زندگی کیف میں بدل گیا
پھر فنونِ فصل گل میکشوں پہ چل گیا
پھر روبرو ہر جودی جھومتا نکل گیا
پھر عقیق دیکھئے بوتلوں میں مل گیا
پھر سنت کی ہوا ہر چین میں آ گئی
جوش ملیانی

شیریں کا سبق

شیریں - ماسٹر صاحب! میرے ایک نوجوان دوست کا یہ خط آیا ہے۔ پڑھئے اور مجھے مشورہ دیجئے۔

(ماسٹر خط پڑھتا ہے)

شیریں! تمنا سے لے کر کبھی کچھ نہ کر سکا۔ میرے پاس دن نہیں ہیں صرف نیند سے خالی چند راتیں ہیں وہ تمہاری نذر میں۔۔۔

(ماسٹر خط پڑھنا چھوڑ دیتا ہے)

ماسٹر - تمہارا نام شیریں تو نہیں اس نے تمہیں یہ نام کیسے دیا؟

شیریں - ایک دن یونہی کسی چار پارٹی میں یہ نوجوان بھیڑ میں سے کھسکتا ہوا میرے پاس آنکلا، تعارف ہوا نہ تھا میں کچھ ہچکچا سی رہی تھی کہ یہ نوجوان بالکل بے تکلفی سے پوچھنے لگا "آپ کا نام شیریں ہے نا؟" مجھ سے کچھ جواب بن نہ پڑا اور یہ حضرت بغیر جواب کا انتظار کئے کئے گئے "شیریں! یہاں بھیڑ میں دیکے سنے سے باغ میں پھرنے لگے" میں پھر بھی چپ تھی کہ اتنے میں کسی لڑی نے تعارف کی رسم ادا کر دی۔ اس دن سے وہ مجھے شیریں ہی کہتا ہے شیریں ہی لکھتا ہے مگر آپ باقی خط تو پڑھئے۔

ماسٹر - میں اس قسم کے لغو خط نہیں پڑھتا۔ سبق شروع کرو۔

شیریں - جی بہت اچھا۔ یہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے کہ اپنے آپ کو مانو۔ اپنے آپ کے انجان کون ہے؟

ماسٹر - کتاب کا مطلب یہ ہے کہ دل کی نقاب ہٹاؤ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ زبان کھولنے سے دل کا گھوگٹ بھی کھل جاتا ہے، یہ غلط ہے۔ عام طور پر پتلی زبان کھلتی ہے دل اتنا ہی زیادہ اور چھپتا ہے۔

شیریں - وہ پرانے زمانے کے دل ہوں گے۔ آج کل تو ہم لوگ دل میں کوئی بات رکھتے نہیں۔

ماسٹر - افسوس ہے کہ تم میں سوچنے کا مادہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

شیریں - مگر سوچنے سے کیا فائدہ؟ حمایت ہوئی وہ صاف صاف کہہ دی۔ جو سمجھ میں نہ آئے اس کے لئے انسان کہوں مضمرداری کرے۔ خواہ مخواہ کہوں زندگی کو مدامی کا کھیل بنایا جائے کہ ایک کس کے اندر دوسرا اور دوسرے کے اندر تیسرا۔ دل میں پیار آیا پیار کر لیا، نفرت ہوئی نفرت کا اظہار کر دیا۔

ماسٹر - میں تمہارے آبا سے کہہ دوں گا کہ مجھ سے یہ لڑکی کچھ نہیں سیکھتی۔

شیریں - شوق سے کہہ دیجئے۔ آخر آپ کھاتے کیا ہیں؟ یہی ناکہ اگلے لوگ یہ کرتے تھے اور یوں رہتے تھے! کرتے

ہونگے مگر مجھے اس جھنجھٹ سے کوئی ڈیپٹی نہیں۔ جوان کے جی میں آیا وہ کر گئے جو ہمارے جی میں آئے گا ہم کریں گے۔ نہ ہوں نے ہم سے پوچھا نہ ہم ان سے پوچھیں۔

ماسٹر۔ گویا تمہارے خیال میں علم ایک فضول چیز ہے۔ جب تمہارا یہ خیال ہے تو میں تمہارا اخلاقیات کا معلم کیا کماؤں؛ شیریں۔ جس طرح کا علم آپ علم بیان فرماتے ہیں وہ تو فضول ہی نظر آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے اس خط کا اخلاقی جواب لکھنا آجائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ دل کو بے نقاب کرو۔ ماسٹر۔ تمہارا دل کیا جواب لکھنے کو کہتا ہے؛

شیریں۔ اگر آپ سے نہ پوچھا ہوتا تو میں صاف لکھ دیتی کہ مجھے ایسی فضول باتیں نہیں آتیں۔ پوری نیند سوتی ہوں۔ تم ورزش کرو یا علاج کراؤ۔ ہاں اور یہ بھی لکھ دیتی کہ سنا کم جایا کرو۔

ماسٹر۔ تم میرے لئے بالکل ممتاز ہو۔ میں تمہیں کوئی مشورہ نہ دوں گا۔ پڑھنا ہے تو پڑھو نہیں تو بہرہ و وقت مت ضائع کرو۔ شیریں۔ پڑھنا تو میں چاہتی ہوں مگر ایسا پڑھنا جو میرے جاگنے کے خوابوں کی آرزوؤں میں کامیاب ہونے میں مدد دے۔ نہ ایسا پڑھنا کہ مجھے ابھی سے بڑھایا بنا دے۔

ماسٹر۔ تمہیں زندگی کا کچھ بھی علم نہیں۔

شیریں۔ اچھا نہ سہی مگر آپ ہی زندگی کی تعریف فرما دیجئے۔

ماسٹر۔ زندگی کی تعریف تو بہت مشکل ہے بلوں سمجھ لو کہ تم زندہ ہو اور یہ پتیل کی میز زندہ نہیں۔

شیریں۔ اس سے اچھی تعریف تو میں کر دوں۔

ماسٹر۔ کرو تو جانوں۔

شیریں۔ سنئے۔ زندگی شوخی کا وہ نقشہ ہے جو پتلی سبز شیشے سے سُرخ گلاب کا پھول نکالتا ہے۔

ماسٹر۔ اچھی تعریف ہے کہاں سے سیکھی۔

شیریں۔ سیکھنے سے تو فاک نہیں آتا۔ خود بخود دل سے ابھی پیدا ہو گئی۔

ماسٹر۔ کیا ان حضرات کے علاوہ اور بھی تمہارے نوجوان دوست ہیں۔

شیریں۔ کئی ہیں مگر اس نوجوان میں یہ خصوصیت ہے کہ بڑے مزہ سے جھڑک دیتا ہے۔

ماسٹر۔ مثلاً

شیریں۔ مثلاً وہی سوال جو آپ نے کیا تھا ان بے بسی کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو جانو؛ چھوٹے ہی بولنا کہ اپنے

آپ کو جانو کہ تم اُن کو ہوا اور اُن تو ہی رہو گی۔

ماسٹر۔ اس جواب سے نہیں غصہ نہ آیا؟

شبیریں۔ غصہ کی کیا بات تھی! (کچھ تال کے بعد) ادھر۔ اب میں سمجھی جن لوگوں کی اخلاقی تعلیم آپ مجھے سکھا رہے ہیں انہیں غصہ بہت آتا تھا۔ کوئی ذرا کچھ کہہ دے تو پشتوں تک قبائل میں عداوتیں قیامت ڈھاتی تھیں۔

ہاں اور اب میں سمجھی کہ شبی آپ کی اخلاقی تعلیم میں سوچ کربات کرنے پر اس قدر زور ہے۔ ہم آجکل کے نوجوان اس قدر صاف دل ہیں کہ کوئی سوچ کربات کرے تب بھی ہمیں غصہ نہیں آتا۔ یہ سمجھ کر کہ بات کرنے کا شعور نہیں درگزر کر دیتے ہیں۔ نااطل میں البتہ دغا خارا لوگ بہت سچ سمجھ کر بات کرتے ہیں اور جس انسان کو مجرم کرنا ہوا سے واقعی سچ کر ہی قدم دھڑنا چاہئے مگر ہم جیسوں کو جن کو غصہ نہ ہو کہینہ نہ ہو سوچنے سے کیا غرض، ہم تو خوش رہنے خوش رکھنے کے لئے ہیں۔

ماسٹر۔ کیا واقعی آج کل کی نوخیز بہیتوں میں غصہ کم ہے۔

شبیریں۔ جی ہاں، کم کیا، ہے ہی نہیں۔ ہم لوگ تو جیتنے مسکراتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کو غصہ ہوتے دیکھا ہی نہیں۔

ماسٹر۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو واقعی کمال کی ترقی ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر تھائے اُبا کو پتہ چل جائے کہ تمہیں اس قسم کے خطرات ہیں تو پھر۔

شبیریں۔ (ہنسنے) ماسٹر صاحب آپ عجیب نقطہ خیال کے مالک ہیں۔

ماسٹر۔ کیوں؟

شبیریں۔ کیا اُبا نے شباب میں اس قسم کے خطرات دیکھے ہوں گے؟ اچھے غامضے فین ایل ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ اب بھی لکھتے ہیں۔ خدا خواستہ بوڑھے نہیں ہو گئے۔

ماسٹر۔ (طیش میں آکر) لاجول ولاتو۔ تم بہت سخت زبانِ راز ہو۔

شبیریں۔ ماسٹر صاحب۔ ترشروئی کی کیا بات ہے۔ مہربانی کر کے مجھے آرام سے سمجھائیے۔ آپ تو اخلاقیات کے معلم ہیں۔

ماسٹر۔ آرام سے تمہیں کیا سمجھاؤں کہ تمہیں اتنا بھی علم نہیں کہ آج سے پچاس برس پہلے تو یہ خیال بھی ناممکن تھا کہ کسی شریف زادی کو محبت کا خط لکھا جائے۔

شبیریں۔ تو کیا اس زمانے کے لوگ صرف بد ذاتوں سے ہی محبت کرتے تھے۔ بڑے مزہ میں تھے اس زمانے کے بد ذات اور بڑے بد معاشرے اس زمانے کے شریف۔

ماسٹر۔ تم ہر بات کو غلط طور پر پلٹ لیتی ہو۔

شیریں - میری غلطی ہو تو معاف کر دیجئے مگر کیا یہ واقعی صحیح ہے کہ میرے ابا کو کبھی پیار کا خط لکھنے کا موقع نہ ملتا۔

ماسٹر - بیس سال تو ان کی شادی کو ہو چکے۔ چالیس سال کی ان کی عمر ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ انہوں نے اس قسم کی کج اخلاقی کی ہو۔

Poor dear! I must love him more than ever.

شیریں - (زیر لب انگریزی میں)

ماسٹر - (نہ سمجھ کر) کیا کہا،

شیریں - کچھ نہیں۔ ہم لوگوں کی دھری ذمہ داری ہے۔ وہ مسرتیں جو ہمارے بزرگ کھو چکے زندہ کریں اور وہ غصہ اور بھڑک کی عادتیں

جو زندہ ہیں انہیں دفن کریں۔ ✓

”فلک پیم“

اعجاز بہار

بہشتوں سے چلی اک ساحرہ مسخوڑ کرنے کو
اد و ناز سے مستانی دُھن میں جھومتی گاتی
عجب انداز سے دکھلاتی اعجازِ سیجائی
حیاتِ نو عطر کی خشک و پتہ زدہ زمینوں کو
گلتاں جہاں کو ریشکِ جنت کر دیا بیکر
اتارے تاجِ برغانی سروں سے کوہِ سروں نے
طلسمِ یاس کو بزمِ جہاں سے دُور کرنے کو
سہانی مسکراہٹ سے خوشی کے پھولِ برساتی
زمین پر آسمانوں سے وہ سب ناز اُتر آئی
سجایا سبزہ و گل سے پہاڑوں کی جبینوں کو
فضا کو اور ہوا کو بوٹے گل سے بھر دیا بیکر
ترانے چھیڑے ہیں مہرِ مہرلوں سے و دباؤں نے

عبیاں ہر چار سُو سے فیضِ اعجازِ بہاری ہے

کہ گلستاںِ عفتِ دل نغمہ سازِ بہاری ہے

تکجور سامی

ہونے دے بدنام

شیش محل میں قصاں ہے وہ دیکھو راک گلغام
 وہ جس کے ہر نرم بسم سے خنداں ہے جام
 مینا کی قفسل میں سنت ہوں اُس کا پنہام
 اب کیا فکرو فردا مجھ کو اور غم انجام
 ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام
 بجلی بن کر کعیت کی دیوی۔ بھٹاؤں میں رقصاں
 ستانی۔ اُلو دو شیزہ بستانوں میں رقصاں
 چلتی پھرتی آگ کے شعلے۔ پیانوں میں رقصاں
 ساقی بھی ہے۔ اور سادوں کی بھیگی بھیگی شام
 ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام
 میخانے کی چوکھٹ ہی پر ہوا ک خون پسینا
 دُرد ملے۔ یا باقی ساقی! جو مل جائے پینا
 میخانے میں مرنا ساقی۔ میخانے میں جینا
 میخاروں کے زمرہ میں تو لکھ لے میرا نام
 ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام
 تو ساقی۔ تو جام مصراحی۔ تو نے اور میں نہ
 تیرا سپیکر کعیت کی دُنیا اور آنکھیں مستانہ
 جس میں مدھر اپریک کی تجھو مے وہ ہنستا پیانہ
 میں پیاسا ہوں۔ اس بدرا سے بھر دے میرا جام
 ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام

آج کل کالاہور

ذیل میں پروفیسر حیدر صاحب کی وہ تقریر درج ہے جو انہوں نے ۲۴ جنوری کی شام کولامورٹیڈیویشن سے نشر کی۔

الٹ لیبل میں جو سونے جائے گا قلعہ ہے وہ اکثر لوگوں نے سنا ہوگا۔ اگر لاهور کو کوئی باشندہ آج سے اپنی نوے برس پہلے سکھوں کے عہد حکومت میں گہری فینر سو جاتا اور اس کی آنکھ اس ۱۹۳۲ء میں آکر کھلتی تو اُسے بار بار آنکھیں ملنے پر بھی اپنی بیداری کا یقین نہ ہوتا۔ چھ سو چالیس ایکڑ زمین کی جس بستی میں وہ سویا تھا وہ اس کے آنکھ کھولنے کو ملنے پڑائی کمانیوں کے بھوتوں کی طرح اس قدر پھیل چکی ہے کہ دس میں نہیں۔ چالیس پچاس مربع میل پر چلائی گئی ہے۔ شہر کے ارد گرد جو میدان اور کھیت تھے وہ غائب ہیں اور ان کے بجائے صاف ستھری سڑکوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ مزنگ کا پڑانا نصب کیس دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اب شہر کا ایک محلہ ہے۔ نواب محمد قاسم خاں کا مقبرہ جہاں کبھی اکھاڑے جتے تھے اور جہاں شہر کے من چلے دو تین میل باہر کرکسرت کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے، اب لاهور کے حاکم کا محل ہے اور لوگ اسے "لاٹ صاحب کی کوٹھی" کہتے ہیں۔ غرض کہ ہمارے سونے والے کو آنکھ کھولنے ہی ایک نئی زمین اور اسی آسمان نظر آتا کہیں کہہ سکیں اب اس کے اپنے ہی بھائی بند کوئوں اور جلیوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں۔ البتہ شہر کے اندر کوئی جتنے میں جا کر اس کی کچھ دھارس بندھتی۔ جو بیچ دار اور تنگ گلیاں وہ چھوڑ گیا تھا۔ وہ اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ان میں سے بعض کی تنگی کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ انسان کے گزرنے کے لئے نہیں، اس کے بچنے جانے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ان گلیوں میں پھیری یا غارچے والا آتا ہے تو عورتیں اور بچے سودا خریدنے کے لئے مکاؤں کی اوپر کی کھڑکیوں میں سے چھینکے لٹکتے ہیں۔ پیارے اور پوری چٹا اور ریڑھی، سرچرہ ای دریلے سے اور پوچھتی ہے۔

ہمارا ہی فینڈو نے والا ایک ادب چرچہ کو بھی دیکھ کر خوش ہوگا وہ یہ کہ مغلوں کی شاندار اور خوبصورت عمارتیں اور مسجدیں بڑی حد تک اُسی طرح کھڑی ہیں جس طرح سونے سے پہلے اس نے انہیں دیکھا تھا۔ شہر کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں قریب ہی کہیں مغلیہ عہد کی کوئی مسجد یا باغ یا مقبرہ یا کوئی ادیا دار نہ ہو۔ سچ پوچھئے تو لاهور کی روٹنی اور خوبصورتی کو پہلے چل مغلوں ہی نے چار چاند لگائے، دہلی اکبر کے زمانے سے پہلے لاهور کی حیثیت چند بکھرے ہوئے دہات سے زیادہ تھی۔ مثلاً پندرہویں صدی کے وسط میں جب شہر راج ابن بطوطہ ہندوستان آیا تو اس نے لاهور کو اس قابل بھی نہ دیکھا کہ سیر کے لئے دھرے گردتا جائے۔ اسی طرح ڈیڑھ سو سال بعد شہنشاہِ اکبر نے اپنی تزک، لکھی تو اس نے لاهور کا ذکر کرتے نہیں کیا۔ حالانکہ سرفراز کابل اور دی کی تعریف کرتے اس کا غلم نہیں بھٹکتا۔ اکبر

کی سخت نشینی کے بعد جب ایک صدی گزری اُس میں لاہور کی شہریت مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل گئی۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک تو وہ دن تھے جب ابن بطوطہ نے تمام ہندوستان کی بیرونی وساحت کے باوجود لاہور کو اپنی آمد کا شرف نہ بخشا، اور ایک وہ دن بھی آیا کہ انگلستان کے مشہور شاعر ٹنٹن نے لاہور تک زیب کے زلے میں جب اپنی مشہور نظم (موجودہ ہندوستان) لکھی تو اُس میں ایک قلم جہاں پچھلے لاہور کا ذکر ہوا وہاں کی ایک بنگالی سڑک سے زمین کے پھیلتے ہوئے میدانوں پر نظر ڈالتے ہیں، وہاں شاعر کی نگاہ لاہور کو اگر سے کہ پہلو بہ پہلو غلیہ شان و شوکت کا نمونہ قرار دیتی ہے۔ یہ اکبر اور اُس کے تین جانشینوں ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے کہ زمانہ حال کا لاہور قدرتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ مغلیہ لاہور اور انگریزی لاہور۔ مغلیہ لاہور وہ ہے جو سرگردوٹ کے اندر آباد ہے اگرچہ اُس کے آثار عمارتوں، مقبول اور باغات کی شکل میں شہر کے گرد و کئی کی میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اکبر نے اس کے چاروں طرف اینٹوں کی ایک پختہ دیوار تعمیر کرائی تھی۔ جو تقریباً پندرہ فٹ بلند اور تین میل کے قریب لمبی تھی۔ اس دیوار کے شکستہ آثار شہر کے شمالی حصے میں اب بھی نظر آتے ہیں۔ شہرِ ناناہ سے باہر شہر کے گرد ایک خندق تھی جو بعد میں بھرا دی گئی ہے۔ اس خندق کی جگہ پر شہر کے تقریباً چاروں طرف خوشنما اور شاداب باغ لگا دیئے گئے ہیں شہر کا صرف وہ گوشہ جگہ کی جانب ہے۔ سبزے کے تختوں اور سایہ دار درختوں کے حاشیے سے غالی ہے۔

سکھوں کے زمانے کے بعد گزشتہ صدی کے وسط میں جب لاہور پر انگریزی عکداری قائم ہوئی تو لاہور کے بازاروں کی بحیثیت ترقی کوئی جگہ صفائی و ترقی نہ تھا۔ کوچوں اور بازاروں میں کوڑیاں اور میسے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ محلوں میں جا بجا مردہ کتوں اور بلیوں کی لاشیں پڑی سر پڑی تھیں۔ اور برسات میں باہر ان حیرت کے ریلوں کا ہواؤ ہی غلاط کے اس انبار کی صفائی کرتا تھا۔ بازاروں کی نمایاں فوج میں تھیں جن کی وجہ سے بہت کچھ درست تھی۔ اُمرا و جب اپنے گھوڑوں یا بھٹیوں پر سوار ہو کر نکلتے اور ان جانوروں کے گم بازار کی مودوں میں پڑتے تو اتنی جھینٹیں اڑتی تھیں کہ بار بار اکبیروں کے کہڑے سے لٹ پٹ بوجھتے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے شہر کی اصلاح پر توجہ شروع کی۔ بازاروں کی درسیاں موقوف ہوئیں اور ماہی پشت فروش باندھے گئے۔ تقریباً تیس برس بعد جب وارڈوں کا انتظام ہوا تو بازاروں سے اینٹوں کے فرش اکھڑا دینے لگے اور کنکر کوٹ کرنی سڑکیں تیار ہوئیں۔

انگریزی قبضے کے بعد شہر لاہور نے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلی توسیع فوجی ضروریات کے لئے ہوئی۔ انارکلی کے مقام پر انگریزی فوج کی چھاؤنی تیار ہونے لگی۔ یہ میاں میر کا نقشِ اول تھا۔ بارکیں اور کوٹھیاں تعمیر ہوئیں اور ایک پختہ بازار تیار ہوا۔ جسے صد بازار کہتے تھے۔ یہ ہمارا موجودہ انارکلی بازار ہے۔ جلد ہی انگریزوں نے دیکھا کہ انارکلی کا میدان فوج کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ چھاؤنی میاں میر میں منتقل ہوئی اور فوجی بارکیں سرکاری دفاتروں اور محکموں کے کام آئے لگیں۔ انہیں میں سے ایک چھوٹی سی بارک ۱۸۵۳ء میں لاہور کے پاگل خانے کے طور پر استعمال ہونے لگی۔ اب ٹھیک اسی پاگل خانے کے موقع پر پنجاب کا یونیورسٹی ہال اور یونیورسٹی کا کیمیا کی تجربہ خانہ ہے۔ گورنمنٹ کالج کا افتتاح آج سے تقریباً ۷۵ برس قبل ہیرامنڈی میں ہوا۔ جب اچھ

دھبیان سنگھ کی حویلی سے کالج کی عمارت کا کام لیا گیا۔ چودہ پندرہ برس بعد یہ کالج اپنی موجودہ خوبصورت عمارت میں منتقل ہو گیا۔ انگریزی ٹیچر کے آغا ز کے بعد انارکلی کے علاقے میں وزیر خاں کی بارہ دری جس کے ساتھ ایک باغ بھی شامل تھا۔ مختلف طریقوں پر استعمال ہوتی رہی۔ آخر میں اس نے کچھ عرصے تک انارکلی کے یورپین باشندوں کے لئے بک کلب کا کام دیا۔ آج کل ہم اسے بچاے جابک لائبریری کہتے ہیں۔ اب لاہور کی ٹھنڈی سڑک کی داستان بھی سن لیجئے۔ ۱۸۵۸ء میں یہ تجویز ہوئی کہ انارکلی سے سینئیر تک ایک سیدھی سڑک تیار کی جائے۔ شروع شروع میں اس سڑک کے دونوں طرف وہ شاندار اور خوبصورت عمارتیں نہ تھیں جن پر نیا لاہور آج کل فخر کرتا ہے۔ اس سڑک کے اُس پاس اُس وقت زیادہ تر بھرمیدان تھے۔ جس میدان میں اب ہائی گوٹ کی عمارت اور اُس کے دکھائی دینے سے نظر آتے ہیں اُس کے قریب صرف ایک عمارت یعنی شاہ پور لنگ کی مسجد تھی اس سے آگے سڑک کے دونوں طرف اچھے خاصے فاصلے تک کھیت ہی کھیت نظر آتے تھے۔ یہی سڑک بعد میں مال روڈ کے نام سے مشہور ہوئی۔ لیکن اُس وقت یہ لائنز روڈ کہلاتی تھی۔ اُس زمانے میں اُسی مال روڈ موجودہ لوہا مال تھی۔ اسی کے قریب جوار میں لاہور کی یورپین سوسائٹی اپنے ہنگامے گرم کھیتی اُدر گولہ بلغمیں اسی طرح دیکھتی تھیں جتنی اُس طرح اب لائنز گاؤں میں بچتا ہے۔

غرض اس طریقے پر آہستہ آہستہ مغلیہ لاہور کے ساتھ انگریزی لاہور کا پونڈ لگتا گیا۔ شہر کے مشرق میں ریلوے سٹیشن قائم ہوا اور ریلوے کی بستی کی میل میں پھیل گئی۔ جنوب میں ریل سٹیشن کی رونق اور وسعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یورپین آبادی لائنز گاؤں کو عبور کر کے نہر کے کنارے تک پہنچ گئی جہاں انگریزوں اور خوش حال ہندوستانیوں کے رہنے کی کوششیاں اپنی دلچسپی اور فائست کے لئے اپنی نظیر آپ ہیں۔ فن تعمیر کے لحاظ سے انگریزی عمارتوں میں بہت سی عمارتیں قابل دید ہیں۔ میکلوڈ روڈ اور بالخصوص ٹیٹن سڑک پر ان عمارتوں کی کثرت ہے اور ان میں سال بسال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اچھی مثالوں کے طور پر ڈاکٹھولک گر جابا اوٹیل بلاڈنگ دیکھئے۔ اسی طرح کلکتی مینشنز کا ماتھا یا چینیٹنگ کلاس کے متعلق کی محراب لاہور میں اپنی قسم کی نئی چیزیں ہیں۔

یہ تو یورپین لاہور کے پھیلاؤ کی کیفیت تھی۔ لیکن لاہور کا ہندوستانی حصہ بھی اس سلسلے میں پیچھے نہیں رہا بلکہ بہت زیادہ گرم ثابت ہوا ہے۔ پچاس برس پہلے لاہور کی آبادی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اب ساڑھے چار لاکھ کو پہنچ گئی ہے اور ابھی اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اضافہ محض شہرچہ پیدائش کی زیادتی کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ باہر کے لوگ اس کثرت سے آکر لاہور میں آباد ہوئے ہیں کہ ان کی آبادی کا تناسب تقریباً ساڑھے چار سو فی مربع میل تک پہنچ گیا ہے۔ اندرون شہر کی آبادی اس قدر گنجان ہے کہ ہاں ایک ایک زمین تقریباً سواد و سوا اشخاص کے حصے میں آ رہی ہے۔ ان حالات میں شہر کا اپنی قدیم حدود سے باہر پھیلنے لگنا بالکل قدرتی تھا۔ پچاس ساڑھے برس پہلے اکبری دروازے کے باہر کوئی آبادی نہ تھی۔ اب بہت سے آباد محلات اور گلیاں شہر تک پھیل گئی ہیں۔ ریلوے سٹیشن سے لہادی دروازے کو اسلامیہ کالج کے پاس سے جو سڑک جاتی ہے اور جسے اب عالم پلو

پر بریڈر تھروڈ کہا جاتا ہے۔ اس کی یہ حالت بھی کہ راستے کے وقت کوئی اکاؤ کا اس پر سنگین رہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت نہ کالج تھا نہ سرک کے دوڑوں طرہ عمارتیں۔ کیلے کے گھنے درختوں کی قطاریں دوڑوں طرہ کھڑی تھیں۔ اور یہ سرک کیوں والی سرک کہ کافی تھی۔ رفتہ رفتہ شہر کے مضائقہ گنجان محل میں تبدیل ہونے لگے۔ جہاں غالی میڈلن تھے وہاں کرشن نگر اور محمد نگر، رام گلی اور اسلام گلی میں جاتی پھرتی زندگی کے جلوے نظر آنے لگے۔ اب لاہور کی آبادی شمال میں فاروقی گنج مصری شاہ اور فیض باغ سے بہت آگے نکل گئی ہے مغرب اور جنوب میں اس کا قدم قصور پورے اور کرشن نگر سے آگے بڑھنا نظر آتا ہے جو لوگ لاہور کی نئی فضا کی تاب نہ لاسکے۔ انہوں نے لاہور سے سات میل جنوب کی طرف ایک چھوٹے سے صاف شہر کے شہر کی بنیاد ڈال دی جسے ماڈل ٹاؤن کہتے ہیں۔ ماڈل ٹاؤن کے خوبصورت گھر تھے ہونے لگے۔ انہوں نے اس لاہور کے قابل دید مقامات میں شامل کر دیا ہے۔ بعد میں لاہور اور ماڈل ٹاؤن کے درمیان مسلم ٹاؤن اور گارڈن ٹاؤن کی تعمیر ہوئی ہے جس کی وجہ سے لاہور کی آبادی کا سلسلہ برابر ماڈل ٹاؤن تک چلا جاتا ہے۔

اب کیونکہ یہ ہے کہ ان تمام تبدیلیوں کا لاہور کی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ لاہور کی زندگی کے سب سے نمایاں پہلو اس کی سیاسی و تعلیمی اور علمی و ادبی سرگرمیاں ہیں۔ لاہور سے کم از کم اردو کے اتنے اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں جتنے ہندوستان کے اور کسی شہر سے نہیں ہوتے۔ ایڈیٹروں کی وہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ابنِ عامر خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ شہر کے بے شمار مدرسوں سے قطع نظر کالجوں کی تعداد بھی جیسے ہے۔ جو کالج شامی سکھاتے، دین و دھرم کا پرچار کرتے یا موسیقی کے سہارا لیتے ہیں وہ ان جیسے کالجوں کے علاوہ ہیں۔ اسی سلسلہ میں چند اور اعداد و شمار سنئے۔

ہسپتال ————— پندرہ

بنک ————— اکہین

بریکینین ————— تینیس

چھاپ خانے ————— اڑتیس

مختلف سوسائٹیاں اور جماعتیں وغیرہ واسطے کے قریب (مگر کالجوں کی بے شمار سوسائٹیاں اس گنتی میں شامل نہیں ہیں)۔ چودہ ہوٹل رہے صوف بڑے بڑے ہوٹلوں کا ذکر ہے ورنہ چھوٹے ہوٹل، قہوہ خانے اور بالخصوص خورد و لاہور کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کا پیشہ بھر تھے ہیں ان کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے لاہور میں ایک ہی مستقل سنیہاؤس نہیں تھا۔ اب سولہ سنیہاؤس جو بڑی حد تک لاہور کے کالجوں کے سرپرست رہے ہیں۔ تفریح کی آمد بھی کوئی نہ کوئی شکل لاہور میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔ بشمول گزشتہ دنوں میں منٹو پاک میں آل انڈیا نمائش جاری رہی۔ نمائش ذہنی، ہنر بھی منٹو پاک طرح طرح کے ہنگاموں سے بنائی نہیں رہتا۔ یہاں یا پریس کے میدان میں کبھی توینچلو

کے جوڑ ہوتے ہیں، کبھی دیکھتے تو فرخ اور تیسرے اور بیسویں چلی آتی ہیں تاکہ اپنی جوانمردی کے جہر دکھائیں۔ نکلنے بازی کے جھگڑے الگ لگتے ہیں اور زندہ دلاؤ لاہور میں ثابت کیسے ہیں کہ ان کے گھرے اور جیکے محض سیاسی لیڈروں کے اعتراض تک محدود نہیں ہوتے یا ہور کے اس حصے کی پیل پیل کے دور کو اور بھی ہیں، حمام اور کھاڑے۔ یہاں ہر معر زادی غلیظہ، استناد یا پہلو ان کھاتا ہے۔ صبح سب کچھ عام میں چلے جائے یا شام کو کسی کھاڑے میں۔ لاہور کے اندرونی محلوں اور دشوار گزار کوچوں کی مقامی سیاست پر بڑے بڑے بگاری غلیظہ اور تو نڈل پہلو ان استناد تبصرہ کرتے نظر آئیں گے۔

یہ اس لاہور کی تصویر کا ایک پہلو ہے جو شہر کے تیرہ دروازوں کے اندر واقع ہے۔ ان دروازوں میں سے دو کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ شاہ عالمی دروازہ جو اورنگ زیب کے بیٹے شاہ عالم کے نام سے منسوب ہے ہندوؤں کی معاشرت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ مروجی دروازہ جو دراصل نو دروازہ ہے اور نہ کسی مروجی سے نسبت رکھتا ہے شہر کے مسلمانوں کی زندگی کے سرشتے دکھاتا ہے۔ شاہ عالمی دروازے میں داخل ہوتے ہی ہم ہلدی اور مٹھ اور مندی، قہم قہم کی بوؤں اور خوش بوؤں سے دوچار ہوتے ہیں۔ گولوں میں ایک خاص کاروباری سلیقہ اور ضابطہ نظر آتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی بھارے کے باوجود دستان کی غضا طاری ہے۔ مروجی دروازے کی پائیں اور خوشبوئیں اتنی چٹپٹی نہیں ہیں جتنی شاہ عالمی دروازے کی۔ تاہم جلد ہی انسان کو کھٹکتے ہوئے گرمی اور بھاس کی آہیرش کا خوشگوار احساس ہو جاتا ہے، متانت کے بجائے زندہ دلی اور قہقہے اور چہچہے زیادہ نظر آتے ہیں۔ لوگ محض گفتگو کے لطف کے لئے تھوڑے اور کٹاؤں کے پاس کھڑے زندگی کی لغت کی تہہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

کشمیری بازار یا لوہاری دروازے کے اندر کی سیر کیجئے تو بہت سے کتب فروشوں کی دکانیں نظر آئیں گی۔ ان میں سے بعض بہت مشہور ہیں اور بعض کم مشہور مگر سب خاموشی سے اپنا اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ علمی اور منید کتابیں، ادبی اور دلچسپ کتابیں، فنی اور کارآمد کتابیں کتر سے شائع ہوتی ہیں۔ کبھی بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی کتاب کئی کئی روپ بدل کر لوگوں کے سامنے آتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے مصابون سازی، یا شادی نامہ، شائع کیا تو ایک دوسرے شخص نے اسی مضمون میں ہیر پھیر کر کے ایک نئی تالیف مکمل شادی نامے کے نام سے پیش کر دی۔ تیسرے شخص نے اسی چیز میں کچھ اور اداں کیا اور عبید مکمل شادی نامے سے دنیا کی آنکھوں کو کچھ چوند کر دیا۔ مضمون کا تو لاہور میں کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ اگر ہر شخص کے ماتھے پر اُس کا پیشہ لکھا ہوا ہو تو ہر گلی کے بوڑھے آپ کو ایک ادھ بھولا بھٹکا مصنف ضرور نظر آجائے۔ لاہور میں بے شمار ادبی انجمنیں ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہی بزرگوں کے سہائے چل رہی ہیں۔ انہیں پر کیا موقوف ہے۔ لاہور میں ہر پیشہ اور وضع و قماش کے لوگ بس رہے ہیں۔ جو میری اور دیگر فلسفی اور دیوانے، انجینیر اور نقب زن، شاعر اور ماعز و اعظا اور شرابی، لیڈر اور چور، پروفیسر اور طالب علم بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔

آج کل کالاہور جو کچھ کرتا ہے دل لگا کر کرتا ہے۔ میلان ٹیلیوین بطبعیت آجاتی ہے تو بہت اور چرخاں، دوسرے اور دیوانی سے

فضا کو اس قدر جگہ گادیتا ہے جیسے دنیا کی تمام نگینی اور خوش طبعی اسی کے جھٹے میں آئی ہے۔ لیڈروں کے جلدوس اور جیسے اس دھوم دھام سے برپا کرتا ہے کہ سیاسی سرگرمیوں کے سوا اسے کوئی اور کام معلوم ہی نہیں ہوتا۔ شعر و ادب اور فلسفہ و حکمت کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو بے فائدہ دیوان کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یہ تمام انقلاب گذشتہ تیس چالیس برس کی پیداوار ہے۔ اس عرصہ میں زندگی کا کوئی شعبہ اس انقلاب کے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ ایک سرکوں کی آمدورفت ہی کو دیکھئے۔ اس صدی کے آغاز میں بیس تیس نہ سوڑکاروں کی یہ کثرت نہ ملے گی البتہ چلتے تھے مگر ان سے کہیں زیادہ بسوکارٹ یا ٹم کارواج تھا۔ لاہور میں پچھترے عمر کے لوگوں کو وہ زمانہ بھی یاد ہے جب بائیکل کارواج بنایا ہوا تھا۔ لوگ بائیکل کو بڑے شوق اور تعجب سے دیکھا کرتے اور بائیکل کے سوار کو بہت معزز سمجھتے تھے۔ اب وہ زمانے لہ گئے ہیں اور بائیکل سوار کی وہ پرانی عظمت لوگوں کے دلوں میں نہیں رہی۔ ہر ٹانگے والا اور پولیس کا سپاہی اگر چاہے تو بائیکل والے کو "کوسیکل" کہہ کر بھڑکاتا ہے جس کا نہایت ناقص اور بے رنگ اُردو ترجمہ "اے اوسا بیکل" ہے جو گا۔ تیس چالیس برس میں زمانہ اس قدر بدلا ہے کہ اب بھینگی اور سٹے اور گھوڑی کبھی کبھی جھاڑو یا مشک بخل میں دباے یا گھاس کی گٹھڑی سرور کے سرک پر دو چرخي گھماتے اور ہوا میں فرٹے بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غرض اونٹوں سے لے کر اعلیٰ تک تمام طبقے لاہور کی زندگی کی رونق اور چل پھل کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ اہل پنجاب کو بجا طور پر "زندہ دلاں پنجاب" کا نام دیا گیا ہے مگر پنجاب کا دل لاہور ہے اور جو صدر اس دل نے چلتی ہے اُس کو سارا ہندوستان سنتا ہے۔

حمید احمد خاں

داغ - اقبال - جوش

تمہی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
یعنی یہ لیلیٰ وہاں ہے پڑھیاں محل میں ہے
(اقبال)

اپنی کوشش سے نہیں ہے جو ملک سیر اقبال
اُس کو اوپر لئے جاتا ہے زمیں سے کوئی
(سجاد حیدر)

جو بیاں کرتا ہے حالِ دل مرا
اس زمانے میں فقط ایک جوش ہے
(دلگیر لکھنوی)

(ح-۵)

غزل

خشک ہوئے جب آنکھ سے آنسو آہوں نے دل تھام لیا
 جیفے اس جینے پر اپنے ہم نے بھی کیا کام لیا
 قسمت کتنی سیدھی ہے کیوں رشک نہ آئے محبینوں پر
 گاہک بن کر بکھے لیکن جس کو لیا بے دام لیا
 چلتے چلتے چونک پڑے ہم شوق تمنا کیا کئے
 کل جو کسی نے جاتے جاتے راہ میں تیرا نام لیا
 اور کوئی دل ڈھونڈا ہوتا اس دل میں کیا رکھا ہے
 کیسی تلکی چیز پر تم نے چوری کا الزام لیا
 صبر نہیں آرام نہیں پھر پہلی سی بے چینی ہے
 دل نے شاید آج کسی حسرت کا دامن تھام لیا
 آج تمہارے تیرے نظر پر جان ہی دے دی تہل نے
 ناز کرو اس بخت پہ اپنے قتل کیا انعام لیا
 در در دیکھا گھر گھر جہانکا با و صبا کے ساتھ پھرے
 جب تک تیرا بھید نہ پایا ہم نے کب آرام لیا
 ہم کو اس کے لطف و کرم سے قاصد کی حاجت نہ ہوئی
 آنکھوں نے پیغام سنایا آنکھوں نے پیغام لیا
 اس میں گرفت ہی کیا ہے سیفی اپنی اپنی مرضی سے
 تم نے خوشی پر ہاتھ بڑھایا ہم نے غم اتا م لیا
 سیفی ذکاؤنی

اردو حروف تہجی کی ایک نئی ترتیب

{ یہ مقالہ انجمن اردو پنجاب کے جلسے میں پڑھا گیا جو ۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء کو زیر صدارت میں {
(آئینہ اذلتاج طائی ایلم سی۔ اسے لاہور کے بورڈ روم میں منعقد ہوا۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کو اردو پڑھانے اور لکھانے کے شوق کی وجہ سے مجھے حکمران تعلیم پنجاب اور دیگر مقامات کے منظور شدہ قاعدوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ میں سبق کو غور سے دیکھتا۔ اس میں سے غیر ضروری الفاظ کو کاٹ چھانٹ کر نئے الفاظ بھر دیتا۔ اس کے علاوہ حروف کا ربط سکھانے کے لئے مجھے ایجوکیشن میں بانٹنا پڑا۔ جہاں اسباق کی ترتیب ہی غلط ہوتی وہاں ہر وقت پیش آتی جو قاعدے ”ڈاؤنٹ میٹھ“ پر چلتے ہیں ان میں تو کسی نظام کو سوچنے کی تکلیف ہی نہیں کی گئی۔ حروف کے ربط کا کوئی طریقہ ہی نہیں سکھایا گیا۔ اس کے بجائے بچوں کے حافظے پر ناگوار بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ چونکہ اردو میں ایک حرف مثلاً ”ب“ باقی حروف سے ملتے وقت بہت سی مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے آسانی اسی میں ہو سکتی ہے کہ ”ب“ کو ”تب“ کی طرح جڑنے والے دیگر الفاظ کی تختی کا دوسرے حروف کے ساتھ ربط علیحدہ علیحدہ مسمول میں سکھایا جائے۔ بالخصوص اردو سیکھنے کے لئے صرف یہی طریقہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ پس تین باتیں قابل غور ہیں:-

۱۔ ابجد کی ترتیب ایسی ہو کہ حروف کا جوڑ یا ربط سمجھنے میں آسانی ہو۔

۲۔ اسباق اس ترکیب کے لکھے جائیں کہ ربط سمجھنے میں آسانی ہے۔

اس لئے مندرجہ ذیل ترتیب ٹھیک ثابت ہوگی:-

(ا) زبر زیر پیش کو پوری طرح ذہن نشین کرایا جائے۔

(ب) بعد میں ایسے الفاظ جن میں جوڑ نہ ہو مثلاً دم۔ دل۔ رک وغیرہ اس کے بعد مطاق کے جوڑ۔ کیونکہ یہ حروف پورے پورے

استعمال میں آتے ہیں ان کے سرے نہیں مثلاً طب۔

(د) ش س ض وغیرہ جن کے سرے ذرا آسان ہیں۔

(د) پھر ب پ ت ث ن کے سرے جن کی مختلف شکلیں بنتی ہیں مختلف مسمول میں سکھائی جائیں۔

(گ) ایسے الفاظ جن کی جوڑ تے ہوئے شکل بدل جاتی ہے۔ مثلاً د، ر، ع۔

(پ) پھر لمبی آوازیں۔ اور پھر ساکن اور تشدید اور نون غنہ وغیرہ۔

۳۔ لفظوں کا چناؤ ایسا ہو جس میں جوڑا آسان ہوں۔ محل الفاظ استعمال کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ سادہ جوڑوں والے فارسی الفاظ کا کوئی حرج نہیں۔ نیچے لفظ سنگ کو بآسانی بول اور پڑھ سکتے ہیں "ت ت ت ٹ ٹ ٹ ٹ" کو نہیں۔ دوسرے پرندوں اور جانوروں کے نام، بچوں کے نام، گھر کی چیزیں وغیرہ مطلب یہ کہ ذخیرہ بہت ہو تاکہ لڑکا یاد نہ کر سکے اور نہ یاد کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اس اصول کو سمجھے جس اصول سے وہ حروف آپس میں ملے ہیں۔ ساتھ ہی اسناد کے لئے بھی الفاظ کا ایک ذخیرہ میا کرنا چاہئے جو ہدایات میں دیا ہوا ہو۔ ہدایات کافی ہونی چاہئیں کیونکہ ہمارے پرائمری کے استاد اکثر ناشوق نہیں رکھتے کہ وہ خود نئے نئے طریقے سوچیں۔ مشقوں میں خوب نظمیں وغیرہ ہونی چاہئیں کیونکہ بچوں کی زندگی ایک تہم راگ ہوتی ہے اور وہ لاگ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں منظر الذکر دو لڑکوں باتوں کو محدود کر صرف اُردو الف، بے، تے کی ترتیب اور ربط کے متعلق کچھ کہوں گا۔ ہم مختلف زبانوں کے حروف تہجی کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ جلتا ہے کہ جدا جدا حروف کو پڑھانے کے لئے خاص خاص طریقے آسانی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حروف بالکل بے ترتیب نہیں بلکہ کچھ نوہم اور بعض حالات میں نہایت خوراک ختم ہوتے ہیں۔ آسانی کے لئے میں انگریزی زبان کو لیتا ہوں۔ اگر آپ ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کو بولتے ہوئے ہم ایک آہنگ پر چلتے ہیں، اے، بی، سی، ڈی، ای، الٹ، جی، ایچ وغیرہ وغیرہ۔ اگر ہم تین تین یا پانچ پانچ الفاظ کو اکٹھے پڑھیں تو وہ Rhy/nm گم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ تین تین کا جوڑا نہ کر ہی Rhy/nm پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جیسے اے بی سی۔ ڈی ای بی۔ یا اے بی سی۔ کے ڈی ای وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ دود و حروف کے جوڑ میں آسانی رہتی ہے اور ساتھ ہی چار چار کے جوڑ بھی خواہ مخواہ بن جاتے ہیں اس لئے دود و حروف کے جوڑوں کو ہی موزاں نہایت دی جاتی ہے۔ اُردو کی ابجد کو لیجئے۔ اس میں بھی اسی Rhy/nm کو بغیر اُردو کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کا اثر ہم سب پر ظاہر ہے۔ نیچے آسانی سے ابجد کو حفظ کر سکتے ہیں۔

دوسری بات جو میں اسے بی سی پغور کرنے سے نظر کرتی ہے وہ ہے حروف کی بناوٹ۔ اے اور ڈی، سی اور ای آئی او، جے، ایم اور این، پی اور کیو، وی اور ڈبلیو، والی اور زیڈ کا نزدیک ہونا ان کی بناوٹ کو صدی کی سمجھ میں مدد دیتا ہے۔ اسی طرح پ ت ٹ ٹ، ج چ ج خ، ڈ ڈ وغیرہ کا نزدیک ہونا اُردو کی ابجد کو بآسانی یاد کرنے میں بہت ہی مدد دیتا ہے۔ اب سنسکرت یا ہندی زبان پر غور فرمائیے۔ وہاں بھی کوئی نظام سوچنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ نظام اپنے نقطہ نگاہ سے مکمل ہے۔ پہلے عربی علت، پھر گھمیں بولے جانے والے الفاظ پھر (۱) گھمیں (۲) تاگوں (۳) تاڑے گے (۴) دانیوں سے (۵) جوڑوں سے آخر میں *Ami Vowel*۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اُردو زبان میں جس طریق پر ابجد کو قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں کون کون سی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے جس سے اس طریق میں تبدیلی واقع نہ ہو، یا کوئی ایسا طریقہ سوچا جائے جو کہ ایک نظام کے مکمل طور پر ماتحت ہو۔ اُردو ابجد کی موجودہ

اس کے ذریعے حروف تہجی کس طرح ظہور میں آئے کیونکہ اس سے ثابت ہوگا کہ حروف فرضی علامات ہج نہیں ہم جب چاہیں بدل سکتے ہیں:

الف عبرانی (א) ، عربی لا ۲ سننی ییل عبرانی

ب بیت سننی گھر۔

ج جمل (دُوت)

ح ۳ عربی قبیلہ

د 4 یونانی Δ، عربی د، مصری تصویر ہاتھ، عبرانی دالت دروازہ

ر ۵ مصری ۳ رومن منہ 9 گلمانی نے 7

س مصری ۴ عبرانی ۳ سن سننی نیلو مصری

ک عبرانی ۵ سننی عربی ۶

ل یونانی زبانوں میں ۷ عبرانی ۸ عربی مل عبرانی لمذ سننی آکس۔

م عبرانی ۹ مسر بم بانی۔

ن عبرانی ۱۰ نون پھلی نئی شکل ۱۱ ن ن

و ۱۲ د پھلی پکڑنے کا آکھوہ

ہ ۱۳ ہ ہٹ جگل۔

ی عبرانی ۱۴ ی یسنی ہاتھ

ان حرفت کی بناوٹوں سے ظاہر ہے کہ ایک چیر کی شکل سے ہم اس کے سادہ نشان کی طرف دوڑتے چلے آئے ہیں اور موجودہ شکل میں بھی ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کرنے کا حق حاصل ہے۔

اگر آپ صرف نون کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ صرف ب پ ت ث کے بالکل مشابہ ہے۔ اگر یہ 'مٹ' اس شکل سے 'ن' کی شکل اختیار کر لیتا تو لکھنے اور سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ نون کی موجودہ شکل اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ دائرہ کا ایک مرکز ہوتا ہے اور مرکز کے بغیر دائرہ خوبصورت نہیں لگتا۔ جس طرح ایک قوم یا جماعت ایک باہمی نصب العین کے بغیر اچھی نہیں لگتی۔ لیکن ن کی شکل ت صحیح طور پر نونوں کی قرار دی جاسکتی ہے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ نون اس بستی کا رہنے والا ہے جس میں ب پ نیو رہتے ہیں اور ہماری فعلی سے ہی اس کو اتنی دیر تک بدر رکھا گیا ہے۔ اور ہمارے راج میں اسے وطن کو ٹ آنے کی اجازت مل

لیکن اس میں ایک سیم چھپا ہوا ہے اس لئے سیم کے پاس رہتا ہوا یہ سہانا لگے گا اور اسے بولنے میں آسانی ہوگی۔ باقی رہا "ع"۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ عو ادعا الف ہے جس طرح آتین الف کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ بذاتِ خود حرف نہیں بلکہ ایک علامت ہے۔ اس بنا پر اب اب پ سے نکالا بھی جاسکتا ہے یا نہ کہ اب پ میں داخل بھی کیا جاسکتا ہے اور وزن قائم کیا جاسکتا ہے۔

چند اور تبدیلیاں بھی میرے دماغ میں ہیں مثلاً اب پ، ت کی جگہ اب ت پ ٹ ن ی سے ہر حال جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔ ایک نوچا جھگڑا اچل جائے گا اور اسے یہ تک سختی علیحدہ ہو جائے گی دوسرے نقاط کی ترتیب کچھ بہتر ہو جائے گی۔ و د ڈ پڑھنا بھی د ڈ د سے بہتر ہے کیونکہ و علیحدہ رہ جاتا ہے اور شکل بدلنے والے حروف کی سختی علیحدہ ہو جاتی ہے۔ ع غ کو م ل کے بعد رکھا جائے تو وزن اچھا ہو جاتا ہے۔ پھر نوچا جھگڑا درمیان میں آ جاتا ہے۔ اس لئے ساری ترتیب کو ہی اور جگہ دینی چاہئے پس اب پ کا آخری سا پچھری نظروں میں اور پر بیان کئے گئے اصولوں کے مطابق یہ ہونا چاہئے۔

نئی ترتیب

موجودہ ترتیب

ا
ب ت پ ٹ ن ی سے
ط ظ
و د ڈ
ر ز ژ
ع غ ل م
ج چ ح خ
س ش ص ض
ن ق ک گ

ا
ب پ ت ٹ ٹ
ج چ ح خ
د ڈ ذ
ر ز ژ
س ش
ص ض
ط ظ
ع غ
ن ق
ک گ

اوم پرکاش ایم۔ اے

ل م ن
و ہ
ی سے

کیلاش کنول

ترجمہ از پیام شرق
حب اجازت علامہ اقبال
(حقوق محفوظ)

(ترجمہ)

تارے کے جسم سے راہ نکالی
اپنے سروپ پہ آنکھ نہ ڈالی
بھونکی سے بیج نے پیڑ لگایا
کیوں نہ وہ بیج سی آنکھ کھلا لی

(۲۴)

رہے در سینہ انجم کثانی
ملے از غیبتن ناآشنائی
یکے بر خود کثاچوں دانہ چشے
کہ از زیرِ زمیں سخیلے بر آئی

(ترجمہ)

صبح کو بیڑ پہ ایک چمن میں
ٹھوک بھرے تھی یہ کویل تن میں
بہر دے میں جو کچھ ہولا باہر
راگ کہ بین ہو تیرے من میں

(۲۵)

سحر در شاخارے بوستانے
چہ خوش می گفت مرغ نغمہ خوانے
بر آ و در چہ اندر سینہ داری
سرودے انا لہ، آہے فغانے

(ترجمہ)

سنا کے تھلا بنگ غم میں
دم بھر کو جیون کی تپن دے
چاہے اڑا دے لکھ سوئے
زین تو آگ سے بھرتن دے

(۲۱)

شدید دم در غم پروانہ می گفت
دے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سخن خاکِ ترم را
ولیکن سوزد سا از یک تبم بخش

ٹیکسلا

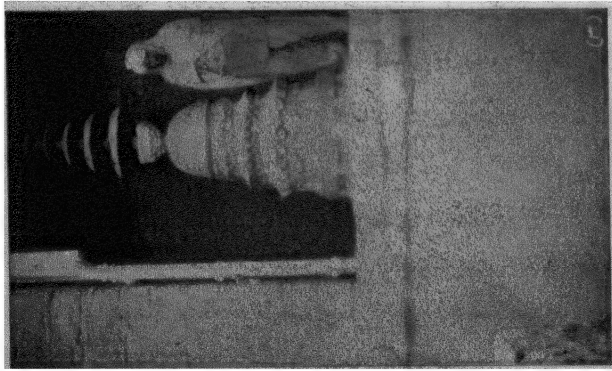
”گذشتہ برس ہمارے مجھے سرحد کے آزاد قبائل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے ہمراہ افضل صاحب جالندھری، محمد نضر اللہ خاں صاحب اور محمد سبطین شاہ صاحب تھے۔ راستہ میں ہم ٹیکسلا دیکھنے کے لئے ٹھہرے۔ ذیل میں ٹیکسلا کے تاریخی حالات درج کئے جاتے ہیں۔ اگر قارئین کو کام لے لیں گے تو آزاد قبائل کے حالات بھی جو نہایت دلچسپ ہیں، پیش کر دوں گا۔

میں محمد سبطین شاہ صاحب قبلہ کا نہایت ممنون ہوں جن کی وجہ سے میں اُس جگہ پہنچا جہاں شاید بہت کم ہندوستانی مہائوں کو جانے کا اتفاق ہوا ہوگا۔“

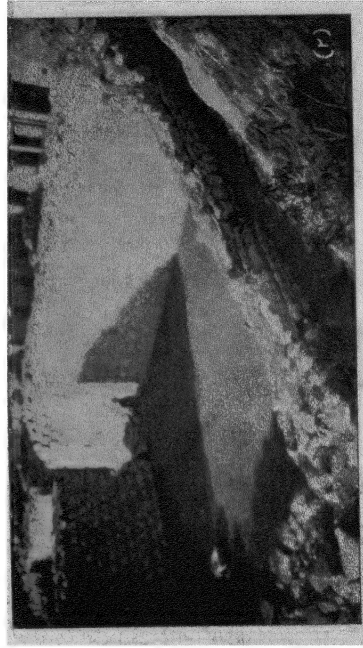
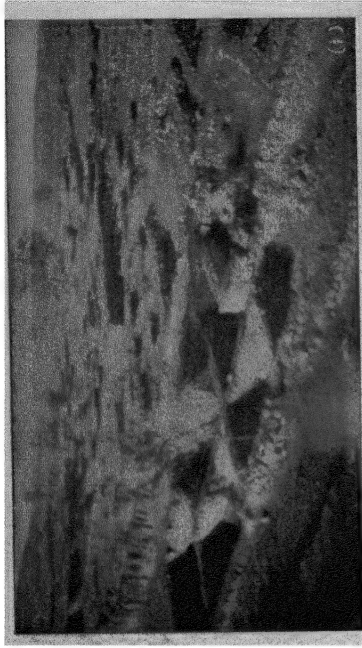
وضع جالندھری

ہندوستان میں محکمہ آثار و قدیر کے سب سے بڑا کام ٹیکسلا کے محل وقوع کا پتہ چلانا ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں یہ شاید اپنی قسم کا پہلا اور لازمی واقعہ ہے کہ ٹیکسلا کا مشہور اور عظیم شہر مسعودی سے تقریباً تیرہ سو سال کے لئے اس طرح نامید ہو جائے کہ اُس کا ذکر بھی لوگوں کی زبانوں پر رہے۔ سچے اگر مقامی حکایات اور اساطیر تک اُس کے ذکر سے قطعی اجنبیت کا اظہار کریں۔ تعجب ہے کہ ایسا عظیم شہر اور اس قدر جلد فراموش کر دیا جائے لیکن یہ ایک امر واقعی ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء سے جب ٹیکسلا کو بھٹن قوم نے نذرِ آتش کر کے تباہ کر دیا، گذشتہ ستر سالوں تک اس شہر کا نام میں مذہبِ انسانی سے محروم رہا تھا۔ ٹیکسلا کی عظمت اور اس کی شہرت کے مندرجہ بالا طور کا اذعان مشکل ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ کئی سو سال تک ٹیکسلا کا نام تاریخی کتب یا سفر ناموں کے علاوہ کمین نظر نہ آتا تھا۔ زمانہ نے اس کا نشان اس طرح مٹا دیا کہ ان چند سکالوں کے دوران میں اس کے نعوش تک کا پتہ چلنا بھی ناممکن تھا۔ زمانہ نے شاید ٹیکسلا کو تنہا یہ انسانی پر ایک بدنما دھتیا خیال کیا جو اسے اس طرح روئے زمین سے مٹا دیا۔ لیکن حقیقت یہ ٹیکسلا انسانیت پر کوئی بدنما دھتیا نہ تھا۔ برعکس اس کے اس شہر کی تمدنی، سیاسی اور معاشرتی ترقی ترقی دُنیا تک مثال بنی رہے گی۔ اس کی مذہبیت پر آج بھی ہندوستان نازاں ہے اور ہندوستانی اس پر جس قدر بھی فخر و مباحات کا اظہار کریں زیبا ہے۔

۱۸۶۳ء میں جنرل لنگھم نے قطعی طور پر ٹیکسلا کی جائے وقوع کو شناخت کر لیا۔ قدیم اربابِ برہمن کی کتب اور سفر نامہ محبت سے اُسے ٹیکسلا کی موجودہ جگہ دریافت کرنے میں بے حد مدد ملی۔ پانچویں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیکسلا حسن ابدال کے مقام پر شاہ ڈھیری سے آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے لیکن اُس کا یہ خیال غلط ہے۔ فاجیان اپنے سفر نامہ میں اسے ٹو۔ چا۔ ٹی۔ لومبخی ٹیکٹ سیلا کتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ شہر گندھارا سے سات روز کی مسافت پر واقع ہے۔ چینی زبان میں اس کے معنی ”سربزیدہ“ کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مہاتما بدھ جب بدھستوا تھے تو وہ بھی ماصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنا سر کسی شخص کو دے دیا تھا۔ اس لئے



ٹیپسلا کے آثار
(۱) سرکپ کا ایک مفلط (۲) جولیاں می خالقاہ ۴
ایک حصہ (۳) مرادو کے حوزے کا بارہ فہق بلند سترہا



اس جگہ کا نام ٹیکسلا سیلا پڑ گیا۔ لیکن جمیر لیمپی (James Legg) کے خیال میں ٹیکسلا سیلا جس کا ذکر فانیان کے سفر نامہ میں آتا ہے فیکسلا سندھ کی مغربی جانب واقع تھا اور غلطی سے ٹیکسلا شمار کیا جانے لگا۔ اسے ٹیکسلا شر لکھنا چاہئے۔ اور چینی تلفظ بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ علاوہ ان کے میون ساگ اور سنگ کی کتبے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ سر جان مارشل لکھتا ہے۔

ٹیکسلا سیلا یا ٹیکسلا سکر کے لفظ ٹکس سیلا سے ماخوذ ہے جس کے معنی سنگ تراشیدہ کا شہر ہے۔ فیکسلا کا ذکر سنسکرت لفظ پوج میں بھی پایا جاتا ہے۔ پانی (Pani) بھی ٹیکسلا سیلا کا ذکر کرتا ہے۔ یہ لفظ رمان اور مہا بھارت میں بھی کئی دفعہ آتا ہے۔ بدھوں اور جینیوں کی کتب میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ اس شہر کے محل وقوع کا اندازہ زمپیشتری ایسے ذرائع سے لگایا جا چکا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد ایک پڑانے اور مندر ستوپا کے کتبے سے جنرل کننگھم کا خیال پائیکسلا کو پہنچ گیا۔ اس کتبے سے یہ بات مکمل طور پر ثابت ہوئی کہ محولہ بالا ستوپا ٹیکسلا میں پائیکسلا کو پہنچاتا تھا لہذا اس میں کھدائی شروع کر دی گئی۔

کھدائی کا کام گذشتہ صدی کے اواخر میں ہی شروع کر دیا گیا تھا لیکن فی الحقیقت کھدائی ۱۹۱۳ء میں شروع ہوئی۔ اس سال سر جان مارشل نے ستوپاؤں، خانقاہوں اور محل شہروں کو ان کے مدفن سے نکالا اور بیس سال کی مسلسل محنت و مشقت کے بعد ٹیکسلا کی ریرینہ عظمت کے نشانات ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر کر دیئے۔ آج سیاحوں کے لئے ٹیکسلا پوری سے زیادہ کشش رکھتا ہے یہاں کا موجود عجائب گھر مندرستان کی گذشتہ عظمت اور زمانہ قدیم کی معاشرت و مذہب کا جامع ہے، یہاں سنگ تراشی کے نمونے قدیمی سکھات، زیورات اور دیگر ایسی ہی چیزیں نہایت قابل دید ہیں۔

ٹیکسلا کے وجود و زوال کی داستان کا اندازہ انہی اشیاء سے لگایا جاتا ہے بلکہ کسی حد تک تو یہی کنارت معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ کی بنا (۵۰۰ ق م سے سنہ ۱۸۰ تک) انہی برآمد شدہ اشیاء پر قائم ہے۔ پڑانے یونانی اور چینی سیاحوں کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰۰ ق م میں ٹیکسلا اپنی ایک شاندار یونیورسٹی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا۔ ٹیکسلا ایک نہایت سرسبز و آباد وادی میں واقع ہے جہاں پانی کی بہتا ہے۔ اور یہ بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کے لئے نہایت مناسب جگہ ہے۔ ٹیکسلا اس شاہراہ پر واقع ہے جو زمانہ قدیم میں وسط ایشیاء سے اندرون ہند کو جاتی تھی اس لئے یہ تجارتی شہر تھا۔ اب اس پڑانی شاہراہ کی جگہ گر انڈ ٹرانک روڈ اور ناٹھ ویسٹرن ریلوے نے لی ہے۔

۵۰۰ ق م سے سنہ ۱۸۰ تک یعنی ایک ہزار سال کے دوران میں ٹیکسلا کچھ بعد دیگرے تقریباً سات اقوام کے زیر نگیں رہا۔ سب سے پہلے ایرانیوں نے اپنی حکومت یہاں قائم کی جن میں سے دلاؤ فرہ مشہور بادشاہ ہوئے۔ اسی دوران میں ۵۱۳-۴۸۳ ق م ہمتا بدھ پیدا ہوئے اور وفات پائی۔ بعد ازاں یونانی آئے۔ سکھ در علم کے زمانہ میں پنجاب کسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور ٹیکسلا صرف اس محفوظے سے حصے کا دارالحکومت تھا، جو دریا نے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع ہے۔ اس لئے اس

نہ میں فوجی نقطہ نظر سے اس کی رویت تھی نہ ہی جو آج کل راولپنڈی یا دیگر چھانڈیل کی ہے۔ لہذا سکندریہ عظیم نے خون کا ایک قطرہ بہانے بغیر راجہ ایتھی سے ٹیکسلا حاصل کر لیا۔ اس کے بعد پورس سے لڑائی ہوئی لیکن چند سال کے عرصے میں ہی چند رگپٹے یونانیوں کو نکال باہر کیا اور موریہ خاندان کی بنیادی۔ اسی خاندان میں اشوک عظیم یا پیادھی (حبیب خدا) پیدا ہوا۔ اس کے بعد شال سے باخترین آئے جنہوں نے تقریباً ایک صدی تک حکومت کی اور شمالی ہند کے فنون پر اپنے گہرے اثرات چھوڑ گئے۔ ان کے بعد پارتھین اور کشان قوم کا دور دورہ ہوا۔ انہوں نے ٹیکسلا کے علاوہ پنجاب و سندھ کے وہ علاقے بھی فتح کر لئے جو باخترین کے ماتحت تھے۔ ۱۲۵ء میں کشان خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ کنشک سترتشتین ہوا جس کی سلطنت وسط ایشیا سے بنگال تک پھیلی ہوئی تھی آخر کار یہ سوچ سلطنت بھی زوال پذیر ہوئی اور ہن قوم نے ہندوستان کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا۔ اس قبیلہ کے لوگ ابتداً وسط ایشیا کے پہاڑوں میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے اور بہت خوشنوا اور خوشی تھے۔ اس حملہ کے بعد ٹیکسلا اپنی گذشتہ عظمت پھوہوار کبھی حاصل نہ کر سکا۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب ہینن سانگ ہندوستان میں آیا تو اس نے تمام ستوپاؤں اور خانقاہوں کو برباد شدہ حالت میں پایا۔ وہ لکھتا ہے ”جو کد شاہی خاندان معدوم ہو چکا ہے اس لئے امرا طاقت سے برسرِ اقتدار آگئے ہیں۔ کچھ عرصے سے یہ علاقہ کشمیر کا بگنڈا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ تمام خانقاہیں غیر آباد چڑی ہیں اور چوڑی بہت کم نظر آتے ہیں“ اس سے آگے ٹیکسلا کی بابت تاریخ بالکل خاموش ہے۔ آہستہ آہستہ خاک نے اس سرزمین کو پیشہ انسان سے بالکل پوشیدہ کر دیا۔ اور کوئی ایک عمارت بھی ایسی نہ چھوڑی جس سے شہر کا کچھ نشان مل سکتا۔ حتیٰ کہ ٹیکسلا کا نام بھی حضرت انسان نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا گوارا نہ کیا۔

ٹیکسلا کے کھنڈر راولپنڈی سے تقریباً بیس میل شمالاً واقع ہیں۔ اس وادی کو دریا نے ہو اور اس کے معاون سیراب کرتے ہیں اور گرد و نواح کی پہاڑیاں اس حوالہ گذشتہ اور عظمت دینہ کی حفاظت میں سینہ سپر ہیں۔ زمانہ قدیم میں جب وسط ایشیا اور ہندوستان کے درمیان تجارت عروج پر تھی تو تمام قافلے اسی وادی سے گزرتے تھے۔ اس بیان سے اس شہر کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس وادی میں تین مختلف شہروں کے کھنڈر تیر کر لئے جاسکتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے سے تقریباً سارے تین میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ ان شہروں کے علاوہ بے شمار توپے اور خانقاہیں زمین سے کھود کر نکالی گئی ہیں۔ تذکرہ بالا شہروں میں سب سے قدیم شہر میرو نیم اور سرانے کا لاریہ تیشٹین سے قریب ہی واقع ہے۔ یہ شہر یونانیوں سے بھی کئی صدی قبل آباد تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح میں یونانیوں نے اس سے چند میل کے فاصلے پر سرکپ کو دار الخلافہ بنایا۔ کھدائی سے اس شہر کے تمام معابد، سرکاریں بازار اور گاہیں اور مکانات صاف نظر آنے لگے ہیں۔ سرکپ کی بیرونی تفصیل بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں کے سنگتراشی کے نمونے نہایت اعلیٰ اور دلکش ہیں۔ اس شہر کی ایک ایک دیوار کھدوی جا چکی ہے۔ دیواریں چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنائی گئی ہیں۔ کہیں کہیں ان میں بڑی

سلیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ دیواریں ماہرینِ فنِ تعمیرات کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہیں۔ قیاس ہے کہ جب یہ شہر آباد ہوں گے تو ان دیواروں پر چڑھنا اور پلٹر کر لیا ہوا ہوگا۔

ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے مطابق ان عمارتوں کی بالائی تہیں کشان خاندان کے عہد کی یادگار ہیں۔ ان سے زیریں تہاڑھ قریب سے متعلق ہے اور اسل زمین تک پہنچنے سے پیشتر دو اور تہیں نظر آتی ہیں جو یونانی حملوں کی یاد دلاتی ہیں۔ سر کے مکانات سے جو یکا کہ خیال کیا جاسکتا ہے سنگ جات، ظروف، جو اہرات، بھلنے، گڑسیاں اور ہزار ہا دیگر شہا، برآمد ہوئی ہیں۔ یونانی طرز کا چاندی کا ایک چھو بھی دیا منت ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی ٹوٹے کے چمچے پومی سے بھی ملے ہیں۔ زمانہ قدیم کے جو بہتر فن زمین کے اندر سے یہاں دستیاب ہوئے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اس قدر طویل امتداد زمانہ کے ان کے رنگ و روغن کی آپ وقاب وہی باقی ہے سر کے دریاں سے ایک بڑی شاہراہ گزرتی ہے جو شہر کو دو حصوں میں منقسم کر دیتی ہے۔

اس سلسلے کا تیسرا شہر سرنگھ ہے جو سر کے پکے تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر کشک کے زمانہ میں (۱۲۵ء) آباد کیا گیا تھا۔ چونکہ یہاں کی زرخیز زمین ابھی تک مقامی زمینداروں کی مقبوضہ خیال کی جاتی ہے اس لئے یہاں کھدائی کا کام اعلیٰ پایاد پر شروع نہیں کیا جاسکا۔

اس ایک ہزار سال کے دوران میں یہاں مذہب مت ہی رائج تھا اس لئے اسی مذہب کی یادگاریں اس ولوی میں مدفون ہیں تمام خانقاہیں، ستوپے اور گھوڑے اسی مذہب کی یاد دلاتے ہیں۔

جنڈیال کے کھنڈروں سے ایک بڑا مندر کھودا گیا ہے۔ بدل پورا اور لال چک کے مقامات پر خانقاہیں مدفون تھیں جو اب نکالی گئی ہیں۔ علاوہ ان میں چلیاں اور مرادو کے موڑے کی کھدائی سے نہایت زبردست انکشافات ہوئے ہیں اور یہاں سے نہایت منفید اور لاثانی بلوگاریں برآمد ہوئی ہیں۔ یہ خانقاہیں قدرے بہتر حالت میں ہیں اس لئے ان کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے حافظے یا تصور سے زیادہ کام نہیں لیں پڑتا۔ ان کا تقدس اور ظاہری شان و شوکت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی اُس زمانہ میں تھی۔ دیواروں پر بھی کاری کی گئی ہے۔ یہاں کوڑی کا منقش کلام اور مذہب کے ہزار ہا مجسمے قابلِ دید ہیں۔ اس جگہ سے سنگتراشی کے نہایت اعلیٰ نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان سب کے یونانی اثرات نمایاں ہیں۔ مرادو کے موڑے میں ایک بارہ فیٹ بلند ستوپہ ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ یہ ستوپا نقش و نگار سے مزین ہے اور اس پر ہاتھ بڑھ مختلف حالتوں میں دکھائے گئے ہیں۔

اس وادی کے تمام ستوپا فل میں سے دھرم راجیکا ستوپا نہایت مشہور ہے۔ یہ حضرت کج کے زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا جس بڑے ستوپا کے ارد گرد کئی چھوٹے ستوپے ہیں جن میں بے شمار قدیم آثار مدفون ہیں۔ عموماً ستوپے میں سے ایک چھوٹی سی ڈوبا برآمد ہوتی ہے جس میں سے چند ہڈیاں اور ہیرا قیمتی جو اہرات نکلتے ہیں۔ دھرم راجیکا سے ایک طرف دستیاب ہوا تھا جس میں سے

ایک کتبہ اور چھوٹی سی طلائی ڈبیر برآمد ہوئی۔ اس ڈبیر میں چند ہڈیاں تھیں اور کہتے ہیں جو زرخستی رسم الخط میں تحریر تھا۔ اس راز کا انکشاف جزا کردہ ہڈیاں ماسٹاگوٹرم ہڈی کی یادگار تھیں۔ یہ ہڈیاں برما کے بھول کو متعلقہ پیش کردہ گئیں۔ اب یہ مانڈے کے ایک پہاڑی کی چوٹی پر پگڈوے کے اندر محفوظ ہیں۔ اسی جگہ شیشے کی مانند ثقافت اینٹیں بھی مدون تھیں۔ یہ سیاہ، سفید اور زرد رنگ کی تھیں۔

میر انصون تشہ نگیل سبے گا اگر یہاں ٹیکسلا کی رسوم اور مذہب و مذہبیت کا اجمالاً کچھ ذکر نہ کیا گیا۔ یونانی ستیا ج جب پہلے پہل یہاں وارد ہوئے تو انہیں یہاں کی کئی رسمیں عجیب معلوم نہیں جنہیں انہوں نے نہایت دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔ پہلی چیز جو انہیں عجیب معلوم ہوئی سستی کی رسم تھی۔ سترجو (ہمہ دھامہ) لکھتا ہے ”میں نے بعض ایسی کہانیاں سنی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ کی عورتیں اپنے خاندانوں کی موت پر زندہ جتنا میں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے میں ذرا بھی تاثر نہیں کرتیں اور نہ رنج و ملال کا اظہار ہی کرتی ہیں ڈسٹریکٹ کے علاوہ ارسطو پوس (Aristophanes) اور دیگر یونانی تیار بھی ایسا ہی کچھ بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکسلا کے لوگ مردوں کو باہر پھینک دیتے تھے تاکہ انہیں گہر یا دیگر شکاری جانور کھا جائیں۔ اگر ان رسوم کو نظر ثانی کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیکسلا کی تہذیب و مذہبیت مجموعہ تھی مختلف ممالک کی رسوم کا۔ اس میں باہلی، ایرانی اور تبتی رسوم کا عنصر قریب غائب نظر آتا ہے۔ اگر اگر ایک طرف مردوں کو گڑھوں کے آگے پھینکنے کی رسم پارسیوں یا تبتیوں سے لی گئی تھی تو رسمی قسم کا مذہبیتیں قوم معلوم ہوتی ہے۔ یکنہ غلطی کے زمانہ میں پنجاب کو کئی اقوام نے اپنا وطن بنا رکھا تھا۔ اگرچہ اس وقت برہمنی مت یہاں اپنے قدم چاٹ چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی آتش پرست بھی آباد تھے۔ چنانچہ ان کا ایک بڑا معبد سرکپ کے شمالی دروازہ سے چند سو گز کے فاصلہ پر دریافت کیا گیا ہے۔ آتش پرستوں کے علاوہ دوسرے مذاہب بھی ترقی پر تھے۔ اس سے یہ نتیجہ سامانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ٹیکسلا کی تہذیب و مذہبیت اس وقت اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس جگہ ایک اعلیٰ اور متول قوم کے تمام فنون و رسوم رائج تھے۔

مندرجہ بالا سطروں سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستان کی معاشرت اور تہذیب و تمدن کس قدر دیرینہ روایات کے حامل تھے۔

”جاٹھاؤں“ کی شہادت سے یہ بات پانچواں کو پہنچ چکی ہے کہ ٹیکسلا ہندوؤں کا علی مخزن تھا۔ یہاں ملک کے گوشہ گوشہ سے لوگ دیدوں اور پوراؤں کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ دستور زمانہ کے مطابق شاہزادے اور متول برہمنوں کے لڑکے سولہ سال کی عمر میں تکمیل تعلیم کے خیال سے ٹیکسلا بھیجے جاتے تھے۔ یہ یونیورسٹی خصوصاً طب کی تعلیم کے لئے مشہور تھی۔ اور یہاں بڑے بڑے سلاطین اور مقبرہ کار استاد تھے۔

لہذا نہایت جامع پیدائش سے متعلق ہیں جاٹھاؤں کی باتیں۔ (دفعہ)

آج کل حکمہ آنا بر تقدیر کے ادب است و کشادگی تو بہ سے ان تمام چیزوں کے چند نقوش نظر آسکتے ہیں جن سے فیکسلا کی عظمت گذشتہ کا قدرے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ شہر ایک نہایت قدیمی تہذیب کا مدفن ہے۔

وہ بھی کیا دن ہو گئے جب یہ دادی اپنے مکینوں سے آباد ہوگی اور یہاں کی ہر چیز تجارت، تمدن اور سیاست اپنے پورے عروج پر ہوگی۔ جو چیزیں دست برد زمانہ سے اب تک محفوظ ہیں ان سے اس زمانہ کے فن تعمیر کی ترقی اور یہاں کی تہذیب کا پورا پورا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رفیع الزمان خاں جالندھری

اس معنوں کی طیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے:-

1. *Fa Hien* ~~~~~ *A Record of Buddhist Kingdoms*
Translated by James Legge.
2. *Hsien Tshang* ~~~~~ *Budhist Records of the Western World.*
Translated by Samuel Beal.
3. *Rapson, E. J.* ~~~~~ *Ancient India.*
4. *Oxford History of India*, by Smith, V. S.
5. *A Guide to Taxila*, by Sir John Marshall.
6. *Archaeological Survey of India*, Report (1914-15)
by Sir John Marshall.

جہاں کوئی دن کی بات گھر سے باغ و شاہ

دور

گر وہ دن جس نے سب سے کشتیوں کے گنگ

قطع تعلق

اچھا تجھے منظور یہی ہے تو چلی جا

اور جب تجھے جانا ہے بالآخر تو ابھی جا

لیکن مجھے واپس مرا آرام دیئے جا اور جیب و گریباں کا مے چاک یئے جا

تجھ بن یہ نبجھا رہتا ہے اس رجبہ کہ توبہ جا دل کو مگر غوغا کرتی نہانی کئے جا

ایسا نہ ہو رہ جائے تیری یاد مے پاس جاتی ہے تو جا پر اسے ہمراہ لئے جا

گو خود تو پڑا کشمکش ہجر کے پالے

جا کرتا ہوں تجھ کو مگر اللہ کے حوالے

مرزا یاور علی

غالب اور بیدل

(سلسلہ اشاعت جنوری)

غالب نے محض اپنی نظم کا انداز بیان ہی بیدل سے مستعار نہیں لیا بلکہ معنوی طور پر بھی وہ ایک نمایاں حد تک بیدل سے متاثر ہوا ہے۔ اس معنوی مناسبت کی ایک دلیل وہ بہت سے مخصوص الفاظ اور ترکیبیں ہیں جو بیدل اور دورِ اول کے غالب میں مشترک ہیں۔ بیدل کے ان الفاظ و اصطلاحات کو غالب کسی کو ردوق اور ذروما یہ نقال کی طرح بے سمجھے بوجھے استعمال نہیں کرتا بلکہ جن فلسفیانہ تصورات پر یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں، ان کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے اور انہیں اپنی شخصیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً جوہر اور عرض کے باہمی تعلق کی بہت سی ممکن صورتیں اس کے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں اور ان صورتوں کو وہ اس طرح بار بار قید شعر میں لانا چاہتا ہے جس طرح کوئی سچے عینی مٹی کو رہ رہ کر ایک نئی شکل دیتا ہے۔ ان مخصوص ترکیبوں میں سے بعض کو تو خود بیدل ہی نے وضع کیا ہے اور بعض اگرچہ نئی نہیں ہیں مگر بیدل نے ثلث استعمال سے انہیں ایک خاص معنوم دے دیا ہے۔ غالب کو ابتدائی دور میں یہ الفاظ دتر اکیب بہت مرغوب ہیں اور ان کے استعمال کے ساتھ ساتھ بیدل کے خیالات کا اثر تقریباً ہر جگہ شامل ہے۔ ان میں سے صرف چند کا ذکر یہاں کافی ہو گا۔

جوہر۔ عرض۔ تامل (یعنی مطالعہ باطن)۔ پرافشاں، ہرینہ طائوس، بال طعیدن، کاغذ آتش زدہ، دامِ خیال، غبارِ شیشہ، یک الف کم اور یک الف بیش وغیرہ۔ اسی طرح خوں شدہ دل اور غنچے کی تشبیہ غالب نے ہجرتِ ہمت کی ہے مثلاً ۵

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھ، اُم کیا ہوا پایا

اس کا ماخذ بیدل کے اس نظم کے اشعار ہیں ۵

غنچہ گردیدیم گلشن در گریبانِ زکیم
عشرتِ مرستہ از دل ہائے غمیں بودہ است

(ہم نے غنچہ کی دباغ کی ہمارا خود اپنے گریبان میں دیکھی،
عشرتِ پنہاں کا مہر کچھ خوں شدہ دل ہی میں آتا ہے)

غالب کا وہ شعر جس میں اس نے دل کو ایک ٹپکتے ہوئے قطرۂ خوں سے مشابہ قرار دیا ہے بہت مشہور ہے۔ اس کا سرائی بھی بیدل کے ایک مقطع تک پہنچتا ہے۔

ز احوالِ دلِ غم دیدہ بیدل چہ می پرسی
کہ بہت ایں قطرۂ خونِ غنچہ محروم از چمکِ رہا

بیدل کے غم زدہ دل کا حال کیا پوچھتے ہم۔
یہ ایک ایسا قعر ہے جہنم کی طرح بجٹے سے محروم ہے)

اگرچہ تشبیہ کا تعلق دراصل نظم کے مصوری مندرجہ بالا تشبیہات کے ہتھمال میں معنوی اشتراک کی جھلک صاف لفظی ہے اس سے قطع نظر میں کئی ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں دونوں شعروں نے ایک ہی مضمون ادا کیا ہے مثلاً تبدل کے لائق شعروں پر غور کیجئے

دلِ آسودہ ما شعورِ امکان در نفس دارد
گہر و زویدہ است این جاعلانِ موجِ دریا را
ہمارے پُر سکون دل میں ہم کا نائے بنگلے بند ہیں
یہاں مورتی نے موجِ دریا کی ہاگ اپنی طرف پھیر لی ہے
اضطرابِ موجِ آخرِ موجِ گومر می شود
در کین ما دلِ بے مدعا اُفتادہ است
دریا کا اضطراب آخر کار گوہر میں موج بہ جاتا ہے۔
اسی طرح ہماری جنگِ مغیروں کی تاک میں پہل بے تما چاہئے

ان دونوں شعروں کے ساتھ غالب کے حسب ذیل شعر کا تعلق بالکل واضح ہے۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
گہر میں موجِ آب دریا کا
اسی طرح تبدل ایک اور جگہ کہتا ہے۔

تنگنائے ہفتہ تبدل گوشہ آرام بود
شد پریشان مرغِ با تالابِ و پر آوردہ است
غالب نے اسی مضمون میں پرکشائی کی زیادہ وسعت یہ کہ ہے۔
از سر نو زندگی جو گر رہا ہو جائیے
ہفتہ آسائشِ بال و پر ہے یہ کینِ نفس
یہاں صرف چند اور مثالوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

بمبدل :- چوں غلبِ ایشیہ ساعتِ تنی دشمنم
از مزاجِ غالب ما ہم بردہ اند آرام را
(مجھے ایلیناں دیکھو کہ اتنا ہی ہیرے جتنا بلوچتر کی ریت کو
میری ٹہنی کے خمیر ہی میں سے آرام نکال لیا گیا ہے)
غالب :- نہ بھولا اضطرابِ مِشادِ می منتظر اپنا
کہ آخر شیشہ ساعت کے کام آیا غبار اپنا
بمبدل :- صدائے کچھ پییدہ برسانِ ہستی
چہ دار و حجبِ زنا لہ زنجیرِ خانہ!

(تو ایک صدا ہے جو زندگی کے سارے سپہا ہوئی
زنجیرِ خانے میں نالے کے سوا اور بھی کیا سکتا ہے!)
غالب :- بہ نالہ حاصلِ دل بسگی فرام کر
متاعِ خانہ زنجیرِ جوا صد معلوم!

بمبدل :- رمزِ فرصت یکف من بہ توجیبِ راں بودم
از نقدِ دستِ نادر ام کہ تو اں شود بہم
غالب :- فرصتِ آئینہ صدرِ رنگِ خود آرائی ہے
روز و شب یک کفِ انوسِ تماشا فی ہے

بمبدل :- بہ چند دستگاہِ بود پیشِ حرصِ بیش
از موجِ بحرِ نشہ لبی می کشد زباں
(جب نامِ سببِ میریوں تو حرصِ اور دہ جاتی ہے)
سندِ رکِ موج سے دراصل تشبہ لبی دہن پھیلاتی ہے)

غالب:- ہوا وصال سے شوقی دلِ مرصع زیادہ لبِ قدر چہ کھٹ بادہ جو شیشِ تشنہ لبی ہے جس حد تک غالب کے اپنے ارادے کو قلع قمع تھا، اُس نے سن بلوغ کو پہنچنے سے کچھ پہلے بیدل کی تقلید ترک کر دی۔ اگرچہ انگریزین برسوں کی ہش محنت اور طبیعت کے تکلیفِ میلان کی وجہ سے جس روش پر بڑھ چکا تھا، اس سے علیحدہ ہونا ابھی اور چند سال تک عملاً غالب کے لئے ناممکن تھا۔ لیکن جب وہ زمانہ آیا کہ مرزا بیدل اور خیال بند شعرا کی روایت سے قطع نظر کر کے غالب نے اپنے ذاتی اجتہاد کی بنا پر اردو میں ایک نیا (گر کسی قدر ملتاجلتا) اسلوب بیان پیدا کر لیا، اُس وقت بھی اس نے اپنی اولین شاعرانہ عقیدت کو بالکل خواہ فراموش نہیں بنایا اب فارسی میں غالب خود پائے استاد کی کو پہنچ چکا تھا اور بیدل کی فارسی گوئی کے شائق گاہہ گاہہ کوئی حقارتِ امیرِ اشارہ کرنے میں اسے باک نہیں تھا۔ تاہم اس کے عہدِ طفلی کے شاعر کی روح کبھی کبھی اس کے خیال کی دُنیا میں پھرداخل ہوتی تھی۔ بڑھا پیسے میں مرزا گوپال تفتہ کو ایک خط لکھا ہے جس میں یہ عبارت نظر آتی ہے، ایک چرخ ہے جو چلا جاتا ہے۔ جو ہوتا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے ... مرزا عبدالقادر بیدلِ خوب کتا ہے سے رغبتِ جاہ چہ ولغرتِ اسبابِ کلام۔ زیں ہوسا بگڑیا بگڑیائی گزرد“ پہلے دور سے آگے بڑھ کر کبھی غالب کے کلام میں بار بار یہ شہادت ملتی ہے کہ ابھی بیدل کی آواز اُس کے دل و دماغ میں گونج رہی ہے۔ مثال کے طور پر بیدل کا یہ شعر دیکھئے

جادو خود را ساز می نمود منزل چہ را؟

کیوں نہیں اپنے راستے کو منزل میں محو کر دیتا

تاہم کے بے مدعا چوں شمع باید رفت

(تو تک شمع کی کس طرح بے مدعا رہا پیٹا ہے گا؟)

ظاہر ہے کہ یہ غالب کے اس شعر کا نقشِ اول ہے

اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو دم منزل میں ہے

رہنچ رہ کیوں کھینچنے؟ واما نگلی کا عشق ہے!

بیدل کا شعر ہے

تاخوشی پر وہ از رخِ برگشتہ آواز بود

حبِ خاموشی چہرے سے نقابِ لٹتی ہے تو آواز ہر طاق ہے

نیتِ بیدلِ غیر از اظہارِ دم اندر جہاں

(بیدل! دُنیا میں دم کے طور کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے)

غالب کتا ہے

خاموشی ہی سے نکلتے ہے جو بات چاہئے

نثر و نثر ہے اصل سے غالبِ فروع کو

بیدل کا ایک اور شعر ہے

تا کجا رنگِ تو راں باختِ بہا صفتِ اینجا

نفیِ خودِ میسکتم اثباتِ بر ولی آید

اس کے مقابل میں غالب کا شعر اتنا بلند نہیں ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ کسی ہیج وریج طریقے پر بیدل کا اثر اس کے دماغ میں کام کر رہا تھا

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا دی ہے جائے ذہن اُس کو دم ایجا نہیں
غالب کے دورِ جنگی کا ایک اور بہت مشہور شعر ہے جو صاف طور پر بیدل کے ایک شعر کا ترجمہ ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ
بہستی تو اُمیدِ ستِ نیستی مارا کہ گفتہ اند اگر بیچ نیست اندراست
(ترجمہ ہونے سے ہیں نیستی پر بھی اُمید ہے۔ کیونکہ کہتے ہیں کہ اگر کچھ نہ ہو تب بھی خدا ضرور ہو)

غالب کے ترجمے میں منطقیانہ سنواری کی شان زیادہ نمایاں ہے۔ بیدل کی نظر آئندہ امکانات کی دُنیا پر بھی ہے۔ اس کے بکس
غالب نے بالکل قدرتی طور پر آغاز کا کارخانہ لیا ہے۔ یہاں خیال بند شاعر کا لبریز جذبات استدرال اپنی پوری شاعرانہ کیفیتوں
کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

۱۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈلو یا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کب تھا!
در اہل لو کہن میں جو چیز غالب کو سب سے زیادہ باعثِ کشش معلوم ہوئی، وہ بیدل کے فلسفیانہ مضامین تھے۔ تجلی اندازِ طبیعت
کے منطقی نتیجہ فلسفہ دانہ ہے۔ بیدل اور غالب دونوں کی طبیعت میں تجلی و تجریر کا مادہ اس شدت سے موجود ہے کہ بیدل کا کلام تو
تمام فلسفیانہ خیالات سے بھرا ہوا ہے اور غالب کی شاعری میں بھی فلسفہ کو ایک امتیازی مرتبہ حاصل ہے۔ بیدل کی ماہرِ الطبعی
دلچسپی نے غالب کو شریع ہی میں بتا دیا کہ یہاں ایک ہم آہنگ روح موجود ہے چنانچہ دُورِ ازل میں جو اخلاق اور چھپ گئی نظر آتی ہے
اُس کی ایک وجہ وہ فلسفیانہ باریک بینیوں میں جو بیدل کے مضامین کی تسلید میں ناگزیر ثابت ہوئیں۔ ارسطو کہتا ہے کہ فلسفہ کا آغاز
استعجاب و تجسس سے ہوتا ہے۔ غالب کے فطری فلسفیانہ میلان کا ثبوت اس سے زیادہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ لاکھین میں بھی فلسفیانہ تجسس کا
عنصر اُس کے کلام میں بڑی وضاحت کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا۔ وہ کائناتی سوال جنہوں نے اُس کے ذہن کو ہمیشہ بے چین رکھا اور جن
کے لئے شعرائے اُردو کی صفت میں اُسے ایک متاثرِ رتبہ حاصل ہے تقلید بیدل کے دور میں بھی اس کے لئے خاص اہمیت حاصل
کر چکے تھے۔ اگر بیدل یہ پوچھتا کہ

کوئی مقام کہ تو ازل مرکزِ بہستی ہمید
از زمین تا فلک آغوشِ کشیدِ عدم
(وہ مقام کون سا ہے جسے مرکزِ بہستی قرار دیا جاسکے؟
زمین سے آسمان تک تو عدم کا آغوشِ پھیلا ہوا ہے؟)

تو غالب بھی پکار اُٹھتا تھا کہ

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدمِ یارب؟ ہم نے دشتِ امکان کو ایک نقشِ پاپا

بہت سے فلسفیانہ مقننات ایسے ہیں جنہیں غالب وضع طور پر بیدل سے اخذ کرتا ہے مثلاً زندگی کے لئے پابندیِ نظام

کی ضرورت کا تصور۔ بیدل کہتا ہے

قطرہ در ضبط موج آئینہ دار گوہر اند
تاشود روشن کہ سخی خاموشی ہیودہ نیست
(قطرہ سے دہانت ہو کر موتی بن جاتے ہیں۔
یہ اس کا ثبوت ہے کہ خاموشی محض ایک سخی نامشکو نہیں ہے)

غالب نے اسی خیال کو بہتر پر لائے ہیں ادا کیا ہے :-

بہ رہن ضبط ہے آئینہ بندی گوہر
وگرنہ بھرتیں ہر قطرہ چشم پر نرم ہے
بیدل اور غالب کے دودو اور شعر جن میں فلسفیانہ مضموں کی مناسبت موجود ہے یہاں درج کئے جاتے ہیں :-
بیدل :- در تکلم از اندامت ہیچ کس آسودہ نیست
جنش لب یک قلم جز دست برہم سودہ نیست
(بات کرنے میں کوئی شخص ندامت سے محفوظ نہیں رہتا
جنش لب کو بھی مجھ کو کہ (حرکت) ایک ہاتھ کا دوسرے پر مل رہے ہو)

غالب :- زبکہ مشق تا شا جنوں علامت ہے
کشاوہ بست مرثہ سیلی ندامت ہے
بیدل :- قطرہ ماتا کج سامان خود داری کسند
بھرم از موج این جامی شمار دادم
(ہمارا قطرہ کب تک اپنے نفس کو بچاتا رہے
یہاں تو سمندر اپنی موج میں بھی دام چھپانے ہوئے ہے)
غالب :- دامن موج میں ہے حلقہ صد کام نینگ
دکھیں کیا گزرتے ہے قطرے پہ گھر مجھے تک

ایک بڑی حد تک اسی فلسفیانہ رمز نشانی کی بدولت غالب اور بیدل دونوں اپنے آپ کو عوام سے برتر سمجھتے تھے۔ غالب کی روش عام سے علیحدگی بہت مشہور ہے مگر بیدل کو بھی اس معاملے میں اپنی ذات پر کچھ کم اعتماد نہ تھا۔ ایک مرتبہ لاپنگراٹھنل کی مجلس میں مرزا بیدل اور شیخ ناصر علی دونوں جمع تھے۔ بیدل کے اس مطلع کا ذکر آگیا :-

نش آئینہ کیفیت ماطہ ہر آرائی
نہاں ماندیم چوں سخی بچندیں لفظ سپدائی
(آرائش ظاہری نے ہماری اندرونی کیفیت کو کبھی آشکار نہ کیا
لٹنے لفظوں کے بجائے مجھے بھی ہم سخی کی طرح پناہ ہے)

ناصر علی نے کہا کہ دوسرا مصرع غلاب دستور معلوم ہوتا ہے کیونکہ معنی لفظ کے تابع ہے؛ لفظ جب بھی ظاہر ہوتا ہے معنی خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔ بیدل نے ایک حقارت آمیز مزمع کے ساتھ جو جواب اپنے نامور معاصر کو دیا وہ کسی ایسے ہی داغ سے نکل سکتا تھا جو فلسفیانہ خیالات سے سمجھا ہوا ہوا درجہ اپنی فوقیت کا پورا احساس ہو۔ اس نے ناصر علی سے مخاطب ہو کر کہا : وہی جسے آپ تابع لفظ قرار دیتے ہیں اس کی اصلیت بھی ایک لفظ سے زیادہ نہیں جو حیرت حقیقت میں معنی کھاتی ہے وہ کسی لفظ میں نہیں سما سکتی مثلاً انسان کی ماہیت ان شعروں کو تفصیل کے باوجود جو کتا بول میں درج ہیں، بالکل نہیں کھل سکتی۔ بچا شے سے ناصر علی جو جواب سُن کر خاموش ہو گئے۔

بیدل عوام کا شعر نہیں ہے۔ عجب نہیں کہ عوام کی روش سے علیحدگی کی خواہش نے بیدل کی طرف غالب کے میلان کو رمز بقوت

پہنچائی ہو۔ بہر حال اس خاص معاملے میں غالب اور بیدل کی طبیعت کا اشتراک بالکل روشن ہے۔ دونوں کے دل میں کسی نہ کسی وجہ سے عوام کے متعلق عقارت کا شدید احساس موجود ہے۔ بیدل اکتاہٹ سے

زباں نے جہاں بیہودہ درجہ سرکش بیدل اگر باہرے نداری التفات صیت باخبر؛
(بیدل! ہم دنیا والوں کے ساتھ کیوں بے گار سرکھاتے ہو؟ تنہا سے پاس کوئی بھرتو نہیں، پھر گھول سے یہ کام؟)

اسی طرح غالب ایک فارسی رباعی میں تمام دنیا کے عاملوں کو گدے قرار دیتا ہے اور ان کے مختلف طبقات کے درمیان صرف اتنا فرق کرتا ہے جتنا ضرر عیب اور ضرر و فساد میں ہے۔

بیدل اور غالب کے متعلق ایک اور دنیاوی حقیقت ایسی ہے جس کو پیش نظر رکھ کر دونوں کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دونوں کی فطرت میں وہ خاص روحانی کیفیت بدرجہ اتم موجود ہے جسے غالب کیسے وارستگی اور کیسے خود بینی، آزادی یا آزاد رویہ کہتا ہے۔ یہ کیفیت دوسرے لفظوں میں اپنی رنج کے عزم و جہت اور شخصی غرور و طاقت کا وہ احساس ہے جو مصائب حیات کو خاطر میں نہیں لاتا، جو اسباب ظاہری سے محروم یا مغلوب ہو جانے میں اپنی توہین سمجھتا ہے اور نا کامیوں کو ایک ”رُئیسانہ“ شان سے نظر انداز کرنے یا حقارت سے ٹھکرانے کی کوشش کرتا ہے۔ مرزا غالب کے لئے (پکس مرزا بیدل کے) خاندان و نسب کا غرور بھی اس احساس کی پشت پر موجود تھا۔ بیدل کی صورت میں اس احساس کو اس کے فلسفہ غوری اور جذبہ حرکت و عمل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ بیدل کی شاعری میں (دوسرے معنوں میں) ناپید ہونے کی وجہ سے (میں) منوں اس قدر نمایاں ہے کہ میں اس کے کلام میں سے ضرر دو تین مثالیں دینے پر اکتفا کر دوں گا۔

بر شوخی آمد از بے دست گاہی احتیاج من درازی کرد دست آخر ز کوفت آستینی با
(بے وسیلہ ہونے کی وجہ سے آخر میری غربت ہی شوخی میں آگئی، گویا میں نے اپنی کوفتہ آستینی کی وجہ سے دراز دوستی کی)

مقام وصل نایابست، راہ سعی ناپیدا چرمی گردیم یا رب گرنہ بودے نارسیدنا
(میں منزل محبوب میں بھی اور سی جہت کا راستہ گم ہے، خدا یا اگر تیری نعمت نہ ہوتی تو ہم غریبوں کا کیا حشر ہوتا)

اس پر غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے جسے بعض حضرات اس کی ”فقطیت“ کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن جس میں دراصل یہی احساس وارستگی غالب کے دماغی پس منظر کے طور پر صاف نظر آتا ہے۔

مارا دیا غریب میں مجھ کو وطن سے دور رکھ لی مرے خدا نے مری ہیکسی کی شرم!
بیدل کا ایک شعر ہے: دامانگی ز عافیت بے نیاز کرد
بال آں قد ننگست کہ آذائیاں گزشت
(محبوبوں نے مجھے معش و کام سے بے پروا کر دیا۔ میرے پاس قدموں کے آذائیاں تو باہر چلنے)

غالب کے ایک مشہور شعر میں کچھ اسی قسم کا خیال ظاہر کیا گیا ہے:-

— رنج سے خورگڑھا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
شکلیں اتنی پردیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ شعر غالب کے آخری دور شاعری سے ماخوذ ہے۔ لیکن پہلے اور دوسرے دور میں بھی اس طرز احساس کی کچھ کمی نہیں۔ مثلاً پہلے دور کا یہ شعر دیکھئے

— غم نہیں ہوتا ہے ازلادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع مائتہ نام

— ان اکابل سے پاؤں کے گہرا گیا تمنا میں
جی خوش خوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

اگر ایک طویل نظم میں یہ دیکھنا ہو کہ انتہائی درد و کرب کے احساس کے ساتھ ساتھ غالب کی یہ وارستگی و آزاوگی کیا کیا مختلف اور متعدد شکلیں اختیار کرتی ہے تو غالب کا وہ فارسی ترکیب بند پڑھنا چاہئے جو اس نے دہلی کی انگریزی عدالت سے سزائے قید پانے کے دو ڈھائی مہینہ بعد غالباً ستمبر ۱۸۴۸ء میں جیل خانے کی دیواروں کے اندر بیٹھ کر لکھا۔ یہاں عربیت و وارستگی کا احساس بھی ہے اور ظرافت کی وہ شان بھی جس کی کوئی جھلک بیدل کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے رئیس شہر اور شریف النساب ہونے کا احساس غالب کے لئے بیک وقت سرمایہ قوت اور سرمایہ عذاب ہے۔ مگر یہ نظم اپنے متنوع نفسیاتی پہلوؤں کے لحاظ سے بہت پیچیدہ ہے جن کے تفصیلی تجزیے کا یہ موقع نہیں۔

جن کیفیات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ان کے علاوہ ایک اور شخصی جوہر ایسا ہے جو بیدل اور غالب دونوں کی فطرت کے خمیر میں داخل ہے۔ یہ استغنا کا جوہر ہے جو غالب کے اس قسم کے اشعار میں کارفرما ہے

نہ تائش کی تمّت، نہ وصلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہی

درد و نت کش دوانہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، نہ بُرا نہ ہوا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب کو بیدل کی طرف کوشش ہوئی اُس میں طبیعت کے اس رنگ کو خاص دخل تھا۔ بیدل اپنے استغنا کے لئے بہت زیادہ مشہور ہے کیونکہ اس کی زندگی شروع سے محض تک عملاً اسی استغنا کا مرکز تھی۔ وہ خود بڑی دھوم دھام سے کہتا ہے

آخر ذوق بر سر دنیا زویم پا
خلق بہ جاہ و تمجید ز دو ما زویم پا

آخر دنیا کو ہم نے اپنے پائے فخر سے مٹا کر دیا۔
لوگوں نے جاہ و شمت کا سہارا دھونڈا اور ہم نے اسے ہاتھوں سے مٹو کر دیا۔

بعض لوگ جو غالب کی آخر عمر کی تصنیف خواہوں کو غیر متناسب اہمیت دینے کے خواہ گریں، یہ سمجھنے میں وقت محسوس کرتے ہیں کہ

بیدل جیسے قناعت شمار اور استغنی المزاج انسان کے ساتھ اسے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ اس طرح خیال کے لوگوں کو حقیقت فراغت نہیں کرنی چاہئے کہ بیدل عبدالوہاب کا شاعر ہے، جب ہندوستان بھی 'گولڈن انڈیا' کہلاتا تھا۔ بہادر شاہ کا ہندوستان بڑی حد تک منسلک ہندوستان تھا۔ حال ہی میں 'مکاتیب غالب' کا جوشہ رام پور سے شائع ہوا ہے اس کے مندرجہ خطوط میں سے بعض غالب کے بڑھاپے کی مالی پریشانیوں پر دردناک انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ غالب کا افلاس اور بڑھاپا انتہائی تکلیف تک پہنچ گیا ہے اور اسے پچاس روپے کی حقیر رقموں کے لئے نواب صاحب رام پور کو جس عجز و ابرام کے ساتھ خط لکھتے پڑتے ہیں وہ بے حد عبرت انگیز ہے۔ اس کے مقابلے میں بیدل کا ماحول دولت و ثروت کا مال تھا، تمام بڑے بڑے اُمراء اس کے دروازے پر آنا اور اس کی خدمت میں تحائف پیش کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ مجموعہ رام پور کے بعض مکاتیب پر غور کیجئے اور اس کے ساتھ محمد حسین آزاد کی زبان سے بیدل کی زندگی کا یہ واقعہ سنئے:-

ایک کابلی سوداگر انار ہندوستان میں بیچنے کو لایا۔ اتفاقاً سب انار اس کے گل گئے حیران ہو کر چند انار جو باقی تھے بطریق نذر مرزا (بیدل) کے پاس لایا اور عرض حال کیا۔ مرزا نے ایک شعر اسے لکھ دیا اور نواب لطف اللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔ وہ شعر یہ ہے:-

بجز یہ کفنم اگر دماں نہ شاد عیب نیست
خندہ دار و چرخ ہم برہرہ گردی ہائے سن
نواب اسے جس طلب سمجھ کہ شاید مرزا کی جوتی ٹوٹ گئی ہے اور نہایت قیمت سمجھ۔ اسی وقت ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا۔ مرزا نے کل روپیہ اسی کابلی کو دے دیا۔

جن شخص کے حالات یہ ہوں اُس کی زندگی کی بنیاد اگر استغنا پر قائم رہی تو کیا تعجب ہے!
یہ سچ ہے کہ عجز و جاہ کی جوشلہ غالب میں نظر آتی ہے وہ بیدل میں معقود ہے اور اس بنا پر دونوں کی سیرت میں یقیناً ایک لائق قائم ہے۔ اس فرق کی بنیاد یہ ہے کہ غالب کو دنیا کی لذتیں لذیذ معلوم ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کی نعمتوں اور سرورِ قیل کا محض ہے اور بڑی سے بڑی حد تک ان سے ملتے اٹھتا ہوا چاہتا ہے، اُس کے پاس استغنا تو ہے مگر قناعت نہیں ہے۔ اس کے برعکس بیدل کے لئے لذائذ دنیوی سرے سے کوئی کشش ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ خود کہتا ہے:-

کافر مگر فاضل و سنجاب می باید مرا
سایہ بیدے کفیل خواب می باید مرا
(مخل در خواب کی حرص کیں کا فہم کرے۔)
میرے اکام کے لئے تو بیدے کے رخت کا سایہ کافی ہے)

ایک اور شعر میں اس سے بھی زیادہ غنی کے ساتھ ہی مضمون ادا کیا ہے:-

دنیا اگر دہمنہ منہ منہ جاے خویش
من لب تہ ام جانے قناعت پر پائے خویش
(مجھے اگر دولت دنیا میں دی تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہل جاے خویش
میں نے پاؤں میں قناعت کی مہندی لگا رکھا ہے)

غالب کچھ اپنے حالات کو کچھ اپنی فضا طبعیت کی وجہ سے قناعت کی اس بلندی تک بھی نہ پہنچا۔ لیکن ساتھ ہی بیدل کا جنون استغنا اتنا سنجیدہ بھی نہیں ہے جتنا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ اُس کے رفاقت کو دیکھنے تو اندازہ ہوگا کہ دوستوں کے تخالف و ہدایا کے معاملے میں وہ کچھ ایسا بے نیاز نہیں تھا۔ اس کے علاوہ نظام الملک آصف آبادی کی استادی قبول کرنا بھی استغنا کی خاص دلیل نہیں ہے۔ باقاعدہ گوئی اس نے اگرچہ نہیں کی لیکن اُسے امرار کی خوشنودی حاصل کرنے سے عائنیں تھا۔ امیر الامرا سید حسین علی خاں کی تعریف میں اُس کے دو شعر میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرہ شعرا میں موجود ہیں۔ بیدل ایک نعل دور کا شاعر ہے اس لئے اپنے مہر وچ کے لئے نشہ پیما نہ قدرت کی بلوغت و تربیت استعمال کرتا ہے۔ وہ دو شعر یہ ہیں۔

اے نشہ پیما نہ قدرت! بچہ کاری
ہستی اتری یا اپنے تاراج غماری

مے در قمری گل بھری، جام بدستی
رنگب چینی، مویج ملی جوش جاری

غالب کو اُس قسم کے قدروان نذل سے کیسے غریبی قسمت سے بیدل کو نیز آئے۔ بیدل دایاں ہاتھ سے لے کر بائیں ہاتھ سے دے سکتا تھا۔ غالب کو اس قسم کی فیاضانہ داد و دہش کی ضرورت ہی رہی ہے

نہ بخشندہ شاہ ہے کہ بزم دہد
بہر بار زر سپیل بازم دہد

کہ چون سپیل ز اسخار انگیز مے
زر کش بر گدلیاں فروز مے

لیکن قسمت کی ان تمام کوتاہیوں اور ایک جگہ سے فزونی سیرت کے باوجود یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بیدل اور غالب استغنا کے معاملے میں بحیثیت مجرعی متحد تھے۔ اگر بیدل نے شاہزادہ محمد ظلم کی ملازمت کو ایک اصول کی خاطر ٹھکرا دیا تو غالب نے بھی حکومت ہند کے چیف سکرٹری مٹر ماسن کی پیشکش کو اپنی آن پھر مان کر دیا اور جب کمپنہ حکومت کا درواں اُس کے لئے واندہ ہوا تو وہ اُسے لٹے پاؤں واپس چلا آیا۔ جو لوگ مکاریب رام پور سے غالب کی طبیعت کا اندازہ کرنا چاہیں وہ اُس واسطے کو بھی نظر انداز نہ کریں۔ جو ٹکلتے جلتے ہر مے اُسے نکھڑتے نائب السلطنت ادوہ کی ملاقات کے سلسلے میں پیش آیا۔ نائب السلطنت اکاڈہ لطف وکرم تھا مگر ادب ملاقات کے سلسلے میں جو شرطیں اس نے لگائیں انہیں غالب کی خودداری قبول نہ کر سکی چنانچہ مٹر ماسن کی طرح اُسے بھی غالب کی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔

غالب میں استغنا کا یہ جو قلب بیدل کے دوری میں واضح ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس جملہ کا ایک شعر ہے

وہ بے دماغ منت اقبال ہوں کہ میں
وحشت بہ وادغ سایہ بالی ہما کروں

اسی زمانے کے قریب کا ایک اور شعر ہے

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم
اے خانناں خراب نہ اصل اٹھائے

تشریحات بالا سے شاید یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ دورِ اوّل میں غالب معضِ بیدل کی صدائے بازگشت ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ غالب نے بیدل کے اندازِ بیان کی کامل تقلید تو ضرور کی ہے لیکن اپنی جامع الصفاتِ شخصیت کو بیدل کی زیادہ طوفانی و تکلفِ شخصیت میں بالکل ضم نہیں کر دیا۔ اس زمانے میں وہ ایسے مضامین بھی لکھ جاتا ہے جو بیدل کی زبان سے کہیں اور انہیں ہو سکتے تھے مثلاً دورِ اوّل کی ایک غزل ہے جس میں بیدل سے صاف طور پر اظہارِ عقیدت کیا ہے :

آہنگِ اسد میں نہیں جو غنمِ بیدل عالمِ ہما فناء ما دارد و ما، مسیح
لیکن اسی غزل کے ایک شعر میں بڑے زور سے ایک ایسی آزاد خیالی کی بات بھی کہہ دی ہے جس کا تحملِ بیدل کا اسلامی فلسفہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا وہ شعر یہ ہے :-

کس بات پر منور رہے اے مجرتما! سامانِ دُعا و حُشت و تائبِ دعا مسیح!

یہ اختلافاتِ تعبیر بیدل ترک کر دینے کے بعد اور نمایاں ہو گئے ہیں۔ مثلاً بہشت پر اگرچہ غالب اور بیدل دونوں کو اعتراض ہے مگر دونوں کی صورتوں میں وجوہِ اعتراض مختلف ہیں۔ بیدل کو اقبال کی طرح بہشت میں بھی ارزؤں کی گرمی اور انسانی زندگی کے ہنگاموں کی تلاش ہے۔ چنانچہ کہتا ہے

گوین بہشت است و ہمہ راحتِ بناوید جائے کہ بدائے نہ طبلِ دل چہ مقام است
(کہتے ہیں کہ بہشت میں راحتِ جاودانی کا سامن ہے مگر وہ بھی کیا جگہ ہوئی ہاں دلِ ہیرا داغِ اندک کی تپیل پیل ہے)
طالبِ صحبتِ معنی نظرِ راں باید بود خاکِ درِ معینِ بہشتی کہ نہ دارد آدم!
(اہلِ معرفت کی صحبتِ تلاش کرنی چاہئے ایسی بہشت پر خاک پڑے جس میں آدمی نہ ہو)

بہشت پر غالب کے اعتراض کے وجوہ بہت سے ہیں مگر سب بیدل سے مختلف۔ اس موضوع پر غالب کے اردو شعروں سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ میں اس موقع پر اس کے صرف ایک فاضی شعر کا حوالہ دوں گا۔ بیدل بہشت سے اس لئے گھبراتا ہے کہ وہاں ہی راحت ہے۔ غالب کو شکایت ہے کہ بہشت کی راحتیں اس معیار پر پوری نہیں اُترتیں جن کا تقاضا انسان کے آلامِ حیات کی تکلیفیں کرتی ہیں :-

بہشت کند چارہٴ افسردگیِ دل تعمیرِ بہ اندازہٴ ویرانیِ مانیست!

میں سے بیدل اور غالب کی نظرت کا ایک اہم فرق شروع ہو جاتا ہے۔ غالب میں ایک زہنی جذبات، ایک ذکاوت جس ایک ماطلت ایسی ہے جو بیدل میں قطعی طور پر مفقود ہے۔ زندگی بیدل کے لئے حرکت، عمل اور ہمہ تن مگ دوہے سکون و راحت کو اس کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ملتی :-

غالب راحت مزاج کر دیں کہ غلبہ خاک
ہر چہ آسودہ تر ضرورہ تر است

سر ہوائے اقامت دریں چمن ہنس لڑا
بر ہوش باش کہ تیغ گزشتنی تیز است

غالب اس لطیف غزل اور ذوق رفتار سے آشنا ہے مگر سکون و راحت کی لذتوں سے بھی محروم نہ رہا۔ یہی سبب ہے۔ راقم الحروف کو اس مسئلے پر کہیں نہ علامہ اقبال کے گفت گو کرنے کا موقع ملا۔ علامہ مدوح نے فرمایا کہ غالب اور بیدل کی صوفیانہ شاعری میں بہت فرق ہے۔ بیدل کے تصوف میں حرکت ہے مگر غالب کا تصوف مائل بہ سکون ہے۔ بیدل میں یہ جرحی عنصر اس قدر نمایاں ہے کہ اس کا معشوق بھی صاحب خرام ہے۔

یہ ذوق سکون خصوصیت کے ساتھ اس وقت واضح ہوا جب غالب نے بیدل کی تقلید بالکل ترک کر دی، ورنہ غالب کے دورِ اوّل میں اس قسم کے اشعار کی کچھ کمی نہیں۔

نہ ہو گایک بیاباں مانگی سے ذوق کم میرا
حبیب موجبِ رفتار ہے نقش قدم میرا
بیدل کے انداز سے روگردان ہو کر غالب کی ذہنیت میں جو تبدیلیاں آئیں وہ ایک الگ بحث کا موضوع ہیں جن کے لئے کسی اور محبت میں گفتگو کی جانی چاہئے گی۔

حمید احمد خاں

اردو

اے زبانِ مادرِ ہندوستان! اردو زبان
تو ہی ہندی، ہندوی، ہندوستانی بھی تو ہی
اتحاد و ربط کی تصویر ہیں تیرے ہر حرف
راشتر اک و جذبہ قومی سے تیرا وجود
مجھ میں ہی قومی ترانے کا گانے جانے پائیں
تجھ سے فدا رہی ہے ہندوستانی وطن اور قوم سے
تیرا جادہ اس قدر کامل برائے ارتقا
تیری خدمت، فرض ہر ہندی کا ہونا چاہئے

یا خدا تو نسیق دے ہادی کو اپنے لطف سے

خدا سب اردو میں ہو بیگانہ نمود و زیاں

منوہر لال ہادی

(نثر بیدل کی مٹی سے بنی)

محبت گرم گرم آنسو، محبت سرد سرد آہیں!

انہی کی موت کا کتنا غم ہے۔ اس محبت پر تو کئی سال گزر گئے تھے۔ ان خوشیوں کو کیا کولوں جو بس اپنی جھلک دکھلا کے محروم کر گئیں! زندگی کی اندھیرن اور کٹھن وادی میں روشنی کی ایک شعاع نظر آئی۔ وہ شعاع غیر محدود تاریکیوں میں جذب ہوئی جاتی ہے جیسے سورج حیرے و حیرے شرق سے ابھر کر دمشق میں ڈوب جائے!

بچپن زندگی کی ساری دلاویزیوں کی آمیزش سے اپنی جوانی کے خواب کی تعبیر کرتا ہے محبت اپنی ایک اداسے جوانی ہی نہیں زندگی کی طویل، پراسرار اور شاید کبھی ختم نہ ہونے والی راہ کو غم کی سیاہ گھٹاؤں سے بسا دیتی ہے!

میں نے اپنی سنگیت کو بادلوں میں چھپ کے بچتے والے چاند کی طرح دیکھا ہے۔ اُس کا دلاؤ قد، اُس کے چہرے کی سُرخی، اُس کے لالچے اور کاہلے بال! سپید پہل میں نے عورت میں کس شش محسوس کی، تو ایک مومہومی تصویر یا پٹے خیال میں بنائی۔ اور دل کے لئے ہر عورت عورت تھی میرے لئے! اُس تصویر میں کچھ ایسا جا دو بھرا تھا کہ دن رات اُسی کا تصور رہتا۔ رُوح پر دام پھینکے گئے اُس کو سناہٹ لے آیا۔ ہوس پرستی کی دعوت تھی۔ خیال کی عظمت اور گمنامی میں نے قربان نہ ہونے دی۔ زہیدہ میرے خواب کی تعبیر تھی۔ اب میں نے جانا زندگی کے کتے ہیں جیسے پھندوں بننے سے پہلے مٹی مڑھائی جو اور اُس کی پتی پتی کمرے کو ہوا میری زہیدہ، نو ہوا میں موت کے منہ میں پکی ہوئی جا رہی ہے! میری زندگی کی شش گل ہونے کو ہے۔ یہ تازہ، ہری بھری شات کوئی دن میں ٹوٹ کر رہ جائے گی۔ کائنات آخری سانس لے رہی ہے۔

نہ خدا ہے، نہ میں ہوں، نہ یہ کائنات!

ہمارے دل ایک دوسرے سے دہستہ ہیں، تو کون مجھے اُس کے پاس جانے نہیں دیا جاتا! اُسے یقین تو ہوا، اور تسکین بھی کہ اُس کا ہنگیر، اُس کے جسم کی تازگی پر نہیں، اُس پر نڈا ہے۔ روتی کے سروانے پر سر رکھ کر نہیں، وہ میری آغوش میں جان دے! ہماری محبوب چیزیں جو ہم سے ہمیں ملتی ہوں ان کے غم سے اُن کی یاد آئے، تو غم کے کس طرح محبت نہ کر دے! اُس کے لئے میری زندگی ایک غم ہوگی۔ اُس کی ایک نگاہ، شاید آخری نگاہ، جو میری محبت سے متاثر ہو کر میری طرف اُٹھے!

وہ کہتے ہیں کسی اور سے بیاہ کر لوں۔ گو با عورت ایک مادی مخلوق ہے۔ جیسے دل کی دنیا میں رانی بنے بغیر وہ رکنتی ہے!

اور زہیدہ — بیڑن کروہ جیتے جیتے قبر میں نہ پہنچ جائے گی!

جیسے برسات کی تاریکیوں میں نہر کے سطح سے مٹی کی مٹی ہر دکتی ہو، زہیدہ کا سراپا میری زندگی کی کلاہات میں ایک نورانی تار ہے جس کی دیمی دیمی خشک روشنی سکون دیتی ہے کہ ہر اجسام لئے میری رُوح بن جائے!

ابن موم

تماشا

(ایک گیت)
دُنیا ایک تماشا

بس
دُنیا ایک تماشا
پھول کھلے کھل کر مٹ گئے اُدھا گاتا بھوڑا آئے
نازک کلیوں میں سو جائے
پائے مَن کی آشا

بس
دُنیا ایک تماشا
گرم ہوا کے جھونکے آئیں پھول گریں۔ گر کر مَرجائیں
بھوڑے کے بھی پر بل جائیں
بھلے اُس کا لاش

بس
دُنیا ایک تماشا
کیوں کرتے ہو نیش پرستی رنگ بدلتی ہے یہ بستی
آج بے بندی اُدھر کل بستی
تولا پل میں ماشا

بس
دُنیا ایک تماشا

نوائے شاعر

نفس کے ساز کا ہر تار گونگستا ہے
وہ نعمہ جس سے زمانے میں حشر برپا ہے
وہ نعمہ جس میں ہے مضمر حیات نو کا پیام
وہ نعمہ جس میں ہے صہبائے تند کی تیزی
وہ نعمہ جس سے تموج ہے قلبِ ساحل میں
وہ نعمہ جس سے قدم تیر تیز اُٹھتے ہیں
وہ نعمہ ہوتی ہے تخلیقِ آرزو جس سے
وہ نعمہ جس کو جو آشنائے ناز کرے
سنا رہا ہے پیامِ اپنا شاعرِ دانا
چمن میں تم کو ضرورت ہے چار تنکوں کی
نہاں ہے جو ہر مقصدِ عمل کے معدن میں

ہنوز نعمہ دلدور اس سے پی رہا ہے
وہ نعمہ جس پہ عنادِ دل کو رشک آتا ہے
وہ نعمہ مردہ دلوں کے لئے جو عیسے ہے
جو شل برق ہر اک گہ میں دوڑ جاتا ہے
وہ نعمہ جوشِ درآغوش جس سے دیا ہے
وہ نعمہ جس کی ہر اک تان تہت افزا ہے
جو نعمہ روح کو اور دل کو گدگداتا ہے
وہ نعمہ عشق میں جس سے نیاز پیدا ہے
سنو کہ تم کو بھی اس گلستاں میں جینا ہے
تمہیں بھی اپنا یہاں شیاں بنانا ہے
عمل کرو جو گہر کی تمہیں تمنا ہے

تمہیں بھی ہوش کبھی ہوش آئے گا نہیں
خبر بھی ہے کہ زمانے کی اب ہوش کیا ہے

انتجا

(۱)

چیز ایسی ہی کوئی رندوں کے پیالے میں ہوا
عشق کی ہنگامہ آرائی ہے حُسنِ شوق سے
جس سے سرشارِ یقیں ہو جو بھی میخانے میں ہوا
یا دلیلی کا فرما اپنے دلوانے میں ہوا

(۲)

بے نیازِ یکسی بیگانہ حُرمِ ماں بنیں!
دیکھتے ہی بھانپ لیں تقدیر کی افتاد کو
ہم سراپا اک تمنائے جنوں ساں بنیں!
روشناس جو ہر آئینہ امکاں بنیں!

(۳)

بخودی ایسی کہ جو ہو مطلعِ مہرِ شعور!
سر نہ تسخیر وہ ہو چشمِ بدینا کے لئے!
توڑ ڈالے اک نظر میں جو طلسماتِ ظہور!
جو حقیقت میں ہو نفیِ غیبِ اثباتِ حضور!

(۴)

تشنہ کاموں کو مے پندارِ پینے کو ملے!
خلعتِ نو کے الہی ہم بھی ہیں اُمیدوار!
ہم تہی جاموں کو آفرِ کچھ تو جینے کو ملے!
آج تک تو چاک ہی کجخت سینے کو ملے!
امینِ حوزینِ بیا کوٹی

مختل ادب

ایک شہزادہ کی شہنشاہیت سے نفرت

(مشہور مہذبہ قہقرو کے خیالات)

موجودہ دور میں نہ صرف عوام بلکہ بادشاہ اور شہزادے بھی شہنشاہیت کو ایک لعنت سمجھتے ہیں۔ شہنشاہیت کے خلاف یورپ کی رائے عام ہے۔ کس قدر سیدار ہو چکی ہے اس کا اندازہ مشرق وسطیٰ کے مندرجہ ذیل خیالات سے ہو سکتا ہے جو آپ نے شہنشاہ اٹلیورڈ کی تخت سے دستبرداری کے سلسلہ میں شائع کئے ہیں۔ جس میں آپ نے صامت الفاظ میں بظاہر کہا ہے کہ شہزادہ اٹلیورڈ کی دست برداری کا دامن سب یہ تھا کہ وہ ہیرس جیتا رکھتے تھے۔ مشرق وسطیٰ کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

۱۹۱۹ء میں جب برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت کے ولیعہد میدان جنگ سے واپس آئے تو وہ قدیم نظم زندگی کے خلاف باغی بن چکے تھے۔ اُس وقت کسی کو بغیر محسوس نہیں ہوا اس لئے کہ قدیم کے خلاف نوجوانوں کی اس قسم کی بغاوت اس زمانہ میں ایک بالکل عام بات تھی۔ ہزار ہا نوجوان میدان جنگ سے ایک ہی ذہنیت لے کر واپس آئے تھے۔ انہوں نے زندگی کے واقعات کی انتہا درجہ تیز رفتار اور موت کی سرعت کو دیکھا تھا۔ وہ اس کے لئے تیار نہ تھے کہ کسی دفتر یا کارخانہ میں خاموشی کے ساتھ کام کریں۔

جنگ کے بعد لوگوں کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ ہزار ہا گھروں کے اندر یہ بغاوت جاری ہے مگر اس کی کسی کو خبر نہ تھی کہ خود ولیعہد سلطنت بھی ان باغیوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ مگر ایسا کیوں نہ ہوتا آخر وہ بھی اور نوجوانوں کی طرح ایک نوجوان تھے۔ اپنے گھر پر وہ اپنے والدین کی محنت بخراں میں رہے۔ کالجوں اور مدارس میں ان کی سیرت کے ہر پہلو کی نگرانی کی جاتی تھی اور اس طرح نوجوان شہزادہ قدیم خیالات کی زنجیروں میں بندھا ہوا پرورش پاتا رہا۔ لیکن جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس نے ان زنجیروں کو توڑ ڈالا۔ رفرانس میں شہزادہ کے اندر ایک نئی زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور ان کے خیالات میں ایک عجیب گھمبیر زادی نے جنم لیا۔ مشرق وسطیٰ کے لکھتے ہیں کہ جنگ نے قدیم اور جدید انسانوں کے درمیان ایک وسیع علیحدگی پیدا کر دی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بادشاہ اور ان کے ولیعہد کے درمیان بھی خیالات اور سیرت کی ایک علیحدگی پیدا ہو گئی۔ جنگ کے واپس آکر شہزادہ نے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ جو دربارت ہی کی قدیم روایات سے بہت بعید تھا۔ شاہی دیباچوں کے قدیم طریقوں سے شہزادہ نے بجاگن شروع کیا اور قدیم رسم و رواج اور قدیم محبتوں سے وہ اکتانے لگے۔ اپنے دادا کی طرح شہزادہ نے اپنی محبت کو عام فلاح و منتوں تک محدود کر لیا اور باہمی میں ان کو تعزیر اور خوشی حاصل ہونے لگی۔

رفتہ رفتہ قدیم ہوسانہی نے شاہزادہ کی اس حیثیت کو ناپسند کرنا شروع کیا۔ ولیمد بڑے بڑے رؤساکے گھروں میں مہمان ہو کر قدامت پسند جماعتوں کے متنازعہ افراد سے ملنا پسند نہ کرتے تھے اور ان کے مزاج میں جس قدر آزادی ہوتی تھی وہ اپنی عادت میں بھی سخت ہوتے گئے۔ چنانچہ وہ اکثر کسی صحبتوں سے روگردان ہونے لگے۔

حقیقت یہ تھی کہ جنگ نے شاہزادہ کی زندگی کے معیار کو بدل دیا تھا اور انہوں نے اپنی زندگی کا معیار ایسا قائم کر لیا تھا جس سے قدیم اور رسم و رواج کے پابند افراد قوم کو تکلیف ہوتی تھی مگر یہ معیار زندگی وہی تھا جو اس زمانہ کے تمام نوجوانوں کا تھا۔ جس طرح شاہزادہ کے جنگ سے شکے ہوئے بہت سے ہم عصر محسوس کرتے تھے اسی طرح شاہزادہ کے اندر بھی ایک ایسا احساس پیدا ہو گیا کہ وہ قدیم رسم و رواج سے گھبرانے لگے۔ درباریوں کے مشورہوں کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اور ان کو یقین ہو گیا کہ یہ پڑنے دہانے کے لوگ ہی دنیا کے مصائب کا باعث ہوتے ہیں۔

شاہزادہ کھلے میں محبت اور دوستی کے جذبات جن لوگوں کے لئے پیدا ہوئے وہ یا تو جنگ سے واپس آئے ہوئے بے روزگار سپاہی تھے یا فلاکت زدہ غریب۔ یا تو آبادیوں کے بے فکر بے جن سے شاہزادہ کو اپنی سیاحتوں میں بار بار ملنے کا موقع ملتا تھا۔

رفتہ رفتہ شاہزادہ کے جمہوری رجحانات ساری دنیا کو معلوم ہونے لگے۔ دراز راسی باتوں پر نظریں سپینے لگیں۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس فرق کو سمجھ لیا کہ ایڈمز ہمیشہ اپنی رعایا کو رعایا کے نام سے یاد کرتے تھے اور شاہ و جاج نے اپنی رعایا کو (میری قوم) کے نام سے یاد کیا۔ اور شاہ ایڈمز نے تخت نشین ہو کر ان کو ہم جنس انسانوں کے نام سے موسوم کیا اور شاہی زاویہ نظر کا یہ تدبیر بھی فرق ساری دنیا نے محسوس کیا۔

شاہزادہ کی طبیعت میں سے بڑا انقلاب ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوا جب وہ ایک دفعہ خیراتی باورچی خانوں کا مائنٹر کرنے گئے اور وہاں انہوں نے ہزار ہا بھوکوں کو کھاتے دیکھا۔ انہوں نے اپنی عمر میں پہلی دفعہ انسانوں کی اس مصیبت کا اندازہ کیا جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی۔ وہ بغیر ان بھوکوں کی حالت کو دیکھتے رہے اور اس کے بعد انہوں نے بے روزگاروں کی حالت کو سمجھانے کے لئے اپنے اوقات وقت کر دیے۔ تقریریں کرتے تھے۔ خیراتی کاموں میں حصہ لیتے تھے اور ان وزراء سے الزامی جمع کرتے تھے جن کو وہ قدامت پسند سمجھ کر ناپسند کیا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اب وہ شاہی درباروں کے رسم و رواج اور قدیم طرز سے گھبرانے لگے۔ بلکہ کماتو یہ جانتا ہے کہ جب وہ جنوبی افریقہ سے واپس آئے تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر ان کو ذاتی طور پر آزادی دینی جائے گی تو وہ ولیمد ہی سے دست بردار ہو جائیں گے اور کسی لڑاؤ یا بی بی جاکر سکونت اختیار کر لیں گے۔

مگر قدامت کی قوی طاقتیں ان کو ہماروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں حتیٰ کہ گھوڑے پر سوار ہونے اور شکار کھینے کی نعمت کر دی گئی۔ ہوائی جہازوں میں تنہا سفر کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ایک دفعہ تو انہوں نے صوف اس ممانعت کے خلاف احتجاج کرنے

کے لئے تنہا سر کیا۔ مگر اب وہ سلطنت کے وزیر اور خصوصاً آج بٹپ کو اپنی آزادی کا دشمن سمجھنے لگے اور یہ سمجھنے لگے کہ یہ ایک سازش ہے تاکہ ان کی آزادی کو محدود کیا جائے۔ ان کی فطرت میں منہ پید ہو گئی اور وہ یہ کوشش کرنے لگے کہ ان (روڈسوں) کو ہر معاملہ میں شکست دی جائے۔ ان کی تقریروں میں تعجبی پید ہو گئی۔ کان کنوں کی بد حالی کے متعلق حکومت کی بے پروائی پر انہوں نے صاف صاف تنقید شروع کر دی۔ وہ ایک دفعہ برطانیہ کے سب سے بڑے جہاز کوئن میری، کا معائنہ کرنے گئے اور حکومت کے اراکین کو یہ کہہ کر سخت صدمہ پہنچایا کہ اس عظیم الشان جہاز کی تیار کرنے والی دنیا کا توازن ان غریبائی گندہ آبادیوں سے کیونکر قائم رکھا جائے جو ابھی ہم دیکھ کر گئے ہیں۔

ان حالات میں وہ تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اور جب انہوں نے تخت سلطنت پر قدم رکھا تو وہ بہت بے یار و مددگار تھے۔ مسٹر بلیٹو لکھتے ہیں کہ ان کو ایسے وقت تاج و تخت حاصل ہوا جبکہ ملک سر یا ہوا تھا۔ اگر وہ کسی جنگ یا کسی نازک سیاسی زمانہ میں تخت نشین ہوتے تو وہ ان تو ہما تے اپنے کو آزاد کر لیتے جو ان کو گھیرے ہوئے تھے مگر وہ ایسے زمانہ میں برسرِ اقتدار آئے جبکہ وہ پانے اور ذریعہ تھے ہوئے لوگوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ان کا وزیرِ ظہم ایسا شخص تھا جو صرف احتیاط اور بے عملی چاہتا تھا۔ اور آج بٹپ ان کے مخالف سمجھے جاتے تھے۔

اس زمانے کو پچھلے مسز ہنسن سے شاہزادہ کی دوستی شروع ہوئی تھی پس جس وقت وہ تخت نشین ہوئے اسی وقت کے قدامت پسند حلقوں میں سر ملے جانے لگے اور تنہا بنانے جانے لگے جب انہوں نے اپنے کل کے قیام ملازمین کو الگ کر کے نئے ملازم رکھنے شروع کئے تو لوگوں نے اور بھی زیادہ اعتراض کیا۔ غرض یہ کہ ان کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔ ہر طرف سے وہ ایسی نفس میں گھرے ہوئے تھے جو ان کی باغی فضا کے خلاف تھی۔ جب ان کی شادی کا سوال پیدا ہوا تو پھر انہوں نے سمجھا کہ ان کی شخصی آزادی چمکے کیا جا رہا ہے چنانچہ انہوں نے ضد شروع کی اور اس ضد میں غلطیاں کرتے چلے گئے اور اب جو دیکھ یہ معاملہ بہت ہی خفیف اور ذاتی تھا اور ضد بہت سخت تھی مگر کوئی شخص ان کے ارادوں کی دیانت کو شک نہ نہیں سمجھتا حقیقت تخت و تاج سے ان کی دست کشی جاننے والوں کے لئے کوئی عجیب بات نہ تھی مسز ہنسن کا نام آئے سے پہلے ہی لوگ سمجھتے تھے کہ ایک دن ان کو دست بردار ہونا پڑے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنے منصب کی پابندیوں کو گوارا نہ کریں گے۔

آئندہ کیا ہو گا ذرا ہی معلوم ہے۔ مگر مسٹر بلیٹو کا خیال یہ ہے کہ ڈیوک آف وندسٹر ایک ایسے ویران میں چلے گئے ہیں جہاں وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ تنہائی کے سوا بھی کوئی اور صورت زندگی بسر کرنے کی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ان کی مصروفِ طبیعت اور زندگی کے معاملات کے ان کی دلچسپیاں اور بحیثیت ایک شاہزادہ کے ان کی تربیت شادی اور محبت کے محدود دائرے کے لئے کبھی موزوں ثابت نہ ہوگی۔

مطبوعات

پریم ترنگ (ترانہ اُفت) "پریم ترنگ" جس کے مصنف لالہ کانشی رام صاحب جاؤلہ پسر ٹنڈنٹ و فٹروڈی کشر ہوٹیار پور میں مختلف مذاہب کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا پتہ چڑھے۔ ہندوستان میں آئے دن کی خارجہ جنگوں کو ختم کرنے کے لئے اس کی اشاعت بہت مفید ثابت ہوئی کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو محبت، یکجہت اور رواداری کا سبق سکھایا جائے، اُردو اور فارسی کے پاکیزہ اشعار اور رہنما بیان عام کے قیمتی اقوال سے مصنف نے کتاب کے ادبی مسیار کو بھی فائدہ رکھا ہے قیمت مقررہ پندرہ روپے صرف بلکہ ارباب طلب کی ہر قسم کی تسکین۔ یہ حضرت حنیفہ جالندھری کی تازہ نظم ہے جس میں انہوں نے کشمیر کے غنی وصال پر ایک نگاہ ڈالی ہے۔ جاہا سیتی و ڈنڈنٹ کی بہت اچھے نمونے پیش کئے ہیں نظم پڑھنے کے قابل ہے، نمونے کے لئے ذیل کے شعرا ملاحظہ فرمائیے:-

ٹوٹے دیکھا اے شعور کیا ہے بچہ لوکاں ترنگ آبشاروں کا نینم نہر کا یہ جل ترنگ
ڈل کے اندر نقرئی لہروں کی پریاں جو جنگ چاندنا رسل کو زمین پر لوٹ جانے کی اُنگ

بے خودی طاری ہے عالم ہے عجیب تاثیر کا

ایک سپو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تغریب سر اس مسعود عزم و شعور نے نہایت محنت سے لکھی ہے۔ آخر میں فرنگ بھی شامل ہے قیمت ۸۰ روپے۔ اُردو اکیڈمی بیرون لاہوری دروازہ لاہور۔

ایڈورڈ زکالچ میگزین (حقہ اردو) :- ایڈورڈ زکالچ پشاور کے میگزین بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء کا حقہ اردو ہمارے پیش نظر ہے۔ نظم و نثر کے مضامین بتائے ہیں کہ ان کے لکھنے والے طلبہ ہونہار ادیب اور شاعر ثابت ہوں گے۔

مطالعات :- مولانا پر از حسن حسرت کو دکا ہی مضامین لکھنے کا عظیم الشان طریقہ حاصل ہے۔ ان کی زبان نہایت صاف سلیس اور سہل ہوتی ہے۔ یہ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو اُردو اکیڈمی بیرون لاہوری دروازہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ مضامین بہت دلچسپ ہیں۔ قیمت ۱۰ روپے۔

صحیفہ چین :- کیونین شس کی کتاب شوگلنگ کا اُردو ترجمہ ہے جو سید اسد علی انوری فرید آبادی نے نہایت قابلیت سے کیا ہے۔ کتاب کے ساتھ مختصر تاریخ چین اور حالات کنفیوشس شامل ہیں۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے یہ کتاب نہایت حسن اہتمام کے ساتھ جلد شائع کی ہے۔ قیمت ۱۰ روپے۔



فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ اپریل ۱۹۳۸ء

تصویر: بزم آہنگ نغمے



صفحہ	صاحبِ مضمون	مضمون	شمار
۲۶۸	لبشیر احمد	بزمِ ہمایوں	۱
۲۷۰	حامد علی خاں	جاں نسا	۲
۲۷۴	جناب مولانا سید احمد حسین صاحب اتحاد حیدر آبادی	توحید وجودی (نظم)	۳
۲۷۵	پروفیسر الطرعی صاحب فاروقی	خشکی پریم چند کی کامیابی میں کردار نگاری	۴
۲۸۴	حضرت الطاف مشدی	انگلیش (نظم)	۵
۲۸۵	"میراجی"	ہم	۶
۲۸۶	"رحمن عزیز"	چوٹ رام (ڈراما)	۷
۲۹۴	جناب سید احمد صاحب آغا	جھوٹ (نظم)	۸
۲۹۵	حضرت عدم	انقلاب	۹
۲۹۶	جناب مرزا محبوب بیگ صاحب	فلسفہ ادراک کے نقاد	۱۰
۳۰۶	حضرت فانی بدایونی	غزل	۱۱
۳۰۷	جناب سید علی منظور صاحب حیدر آبادی	"	۱۲
۳۰۸	جناب بکرہ عتیق انشراح صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی	خدا کی آمد (افسانہ)	۱۳
۳۱۶	جناب راجہ محمد علی خاں صاحب	گھنٹن تصور	۱۴
۳۱۸	جناب پروفیسر سید فیاض محمود صاحب گیلانی ایم۔ اے	کبھی کی کہانی (افسانہ)	۱۵
۳۲۷	جناب مختار عزیز بیگ صاحب	مزدور خدا کے حضور میں (نظم)	۱۶
۳۲۸	حضرت حنیف پور شیوا پوری ایم۔ اے	اقبال (نظم)	۱۷
۳۲۹	جناب غلام حسین صاحب لدھیانوی	خباہات پریشاں	۱۸
۳۳۰	حضرت قبول احمد پوری	جو گنگا گیت	۱۹
۳۳۱	حامد علی خاں	پیر گنگا	۲۰
۳۳۷		محفل ادب	۲۱
۳۳۹		مطبوعات	۲۲

”بزمِ ہمایلوں“

”ہمایلوں“ کے ایک خریدار — نہیں یہ ادب و فیشن کے خلاف ہے — لکھو ”معاون“ بلکہ ”سرپرست“ اکتی شکل ہے؟ ہے تو یہ ایک سودا ہی، ادبی سودا سہی، لیکن نہیں ہمارے غایت درجہ حس ادب کا تقاضا ہے کہ ادب میں بازاری زبان استعمال نہ ہونی چاہئے، خریدار بازار میں ہوتا ہے اس لئے ”خریدار“ بازاری لفظ ٹھہرا — اس سے بہتر ہے ”معاون“، کیا معاون؛ دریائے سندھ کے معاوؤں کی طرح کا معاون جو دوسرے بصد ناز اگر جذب ہو جائے، نہیں بلکہ وہ جو پانچ روپے دے کر دوسری سے صاحب سلام کے ادب و سوسائٹیز میں زبان پر لائے۔ لیکن اردو ہندی جھگڑے کے اس عہد میں ہمیں مصلحتاً اس جنس کی اتنی خوشامد منظور ہے کہ کم ”معاون“ چھوڑا اسے ”سرپرست“ کہنے پر بھی مجبور ہیں —

غرض کہ قندہ کوتاہ آدم پر مطلب ہمایلوں کے یہ ایک ”سرپرست“ جو میر کے دوست بھی ہیں — ادب کے سلسلے میں دوستی کا ذکر آتا ہے تو ایسے کیسے واقعات یاد آتے ہیں — کبھی کوئی غیر ادب پسند دوست ملتا ہے اور ہمیں دیکھ کر ہمایلوں کا لفظ اُس کے ذہن میں گنگائی کرتا ہے تو محض ہمیں خوش کرنے کے لئے بلکہ ہم پر احسان کرنے کے لئے کہتا ہے کہ کبھی وہ تمہارا ہمایلوں تو دلوں سے دیکھا ہی نہیں، اب ادھر ہم ہمایلوں تو ایک ایسے بے ادب کے منہ سے ہمایلوں کا ذکر سن کر خوش ہو جاتے ہیں کہ شکریہ یہ بھی اردو سے تعلق پیدا کیا چاہتے ہیں لیکن اُدھر جب یہ خیال آتا ہے کہ محض ایک بے پیسے والے سرپرست ہیں تو ہمایلوں کے بحث کا تصور کر کے طبیعت میں اتنا سنا پیدا ہو جاتا ہے سنا چار ایک بے معنی سی سکراہٹ حضرت کی نذر کر دیتے ہیں اور پھر دونوں خوش خوش کسی اُردبات کا ذکر چھری دیتے ہیں — اس کے برعکس بعض ادیب دوست ادبی زیادہ و جعل ثابت ہوتے ہیں — ادیب تو خیر وہ جیسے ہوتے ہیں ہوتے ہی ہیں لیکن نیم دوستی کے بھر دے پر وہ ہمایلوں میں مضمون شائع کرانا ہمارا خوش گوار فرض اور اپنا الٹی حق سمجھتے ہیں — ہم اُن سے خندہ پیشانی سے ملنے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مضمون کا مطالعہ ہے اس کے بعد یہ کچھ بعد دیگے اُن کے خط پر خط آنے شروع ہو جاتے ہیں، ایک میں مضمون کا وعدہ، دوسرے میں مضمون، تیسرے میں نظم جو تھے میں ترجمہ ہوتا ہے اور پانچویں میں جواب نہ آنے کا گلہ، انٹائیڈ کی شکایت اور یہ اطلاع ہوتی ہے کہ جس پرچے میں اُن کے ارشادات شائع ہوں وہ ٹھیک اس پتے پر روانہ کر دیئے جائیں — سو خط کے بعد ایک ایلولی تھوڑی سی ہوتی ہے کہ انھوں نے کہنے لگے اُن مضمون لکھنے کی بالکل فرصت نہیں — یہ تو محض ایک بزم کے ادیب دوست ہیں دوسری نہیں گنوانے کی یہاں گنجائش نہیں — اور بے دوست ادیبوں کا کبھی ہمزہ کر گیا ہلے گا، جہن میں ایک

ہے۔ غرض عورتوں کے لئے مناسب ماحول کی کمی ان کی گزشتہ ترقی کو پیش نظر رکھ کر مطمئن ہو سکتے ہیں اور مخالفین اپنے دل کی تسلی یوں کر سکتے ہیں کہ عورتوں کی صرف ایک نہایت قلیل تعداد ہی عہدے قبول کرنے کی آزادی سے فائدہ اٹھائے گی اور اکثریت فطرۃً خانہ داری کے کاموں کو ترجیح دے گی۔

باتونیوں کے لئے خوش خبری

نائیس کے ایک قابل ڈاکٹر نے جو پچھلے برس کے امراض کا ماہر ہے، یہ بتایا ہے کہ باتیں کرنا بہترین تفسیح ہے بہت سی انسانی بیماریاں پچھلے برسوں کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں اور زیادہ باتیں کرنے سے پچھلے برسوں کو بہت تفریق پہنچتا ہے۔ عورتیں چونکہ عموماً زیادہ باتونی ہوتی ہیں، اس لئے مردوں کے مقابل میں ان کی صحت بہتر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں تندرست مردوں کے مقابل میں بیوہ عورتیں بہت زیادہ ہیں۔

ہندوستان کے گیت

مشرقی ہندوستان کے گیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ملک کی شاعری میں دماغی نہیں بلکہ روحانی بالیدگی کے جوہر ہیں۔ یہاں کے گیت عموماً خدا سے مل جانے کی غرض سے لکھے جاتے ہیں اور ان کا مقصد حیات میں ایک عارضی سماجیان پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ ہندوستانی شاعر اس دنیا کی چیزوں کی طرف سے عجیب غریب طور پر انکسین بند کر لیتا ہے اور اپنی پوری توجہ روحانی دنیا کی طرف منتقل کر لیتا ہے۔

ہندوستان کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ طریب ہے کہ گیت کا ہیرو ایتھو ڈو خواہ کتنے مصائب میں گرفتار ہو یا آخر اس کا انجام چھا ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان شاعر کو خدا کے وجود کا پورا یقین ہوتا ہے، ان کا اعتقاد یہ کہ خدا راست کردار آدمی کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا۔ اس لئے ہمیشہ صداقت کی فتح ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ایلیٹس تقریباً معدوم ہیں۔ ہندوستانی شاعری کی ایک خصوصیت تشبیہ و تمثیل کے فیلڈ سے اخلاقی اصلاح کا کام ہے، ہمارے شاعر مزاحیہ گیتوں میں بھی عموماً کوئی مذکورہ اخلاقی سبق چھپتے ہیں۔ ہندوستانی گیتوں کی ایک خصوصیت ہتھیاری ہے۔ ہندوستانی شاعری زیادہ تر خدا کی تعریف کے نمونے پر مشتمل ہے اور سرکارِ ہندوستان کا درجہ اس کے بعد ہے۔ عاشق کا دل کو محبت کا ٹھکانہ لیا جاتا ہے بھی ہر دلیا معلوم ہوتا ہے۔ خود غرض میں بعض غیر اخلاقی شاعری گیت محض اپنی ہتھیاری کی وجہ سے شہیرا معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے لئے کوئی بات جن قدر عجیب ہو اسی قدر ہم اسے بار بار سننا چاہتے ہیں اور اس سے اکتانے نہیں پاتے۔

توحیدِ ہودی

کہیں ہر ہوں میں اور کسی جا قدم ہوں
کہیں چشمِ قتال کی تصویر ہوں میں
کہیں جلوتہ ماہِ رُخسار ہوں میں
کہیں صورتِ لب کسی جا ذقن ہوں
کہیں شکلِ دل ہوں، کسی جا زبان ہوں
کہیں نشان ہوں میں کہیں آن ہوں میں
کہیں جسم ہوں، اور کہیں جان ہوں میں
کسی جا عیاں ہوں کسی جا نشان ہوں

و جود ایک ہے، اور تعین ہزاروں
مری ایک تہی کے ہیں گن ہزاروں
ہے مرقۂ طلق کا جو پھر تعین
ہویت کا ہے خاص منظر تعین
ہے توحیدِ اصلی، ادوئی اعتباری
بنے نورِ وحید سے نوری و ناری
بہن منکشف گشتِ ایں نکتہ ناگاہ
زا محمد رشید ————— محمد رشید

ملے چکر تمام تعینات ایک ہی ذلت طلق
کے چہوں ہیں اس لئے ہر نوعیت کی تسخیر
وہی ایک ذاتِ طلق ہے۔ (محمد رشید)

منشی پریم چند کی کہانیوں میں کم رنگاری

کہانیوں کے لئے پلاٹ، اس کی ترتیب اور تحریک کو جتنی اہمیت دی گئی ہے، اس سے کہیں زیادہ ضروری اور اہم خود افادگی کر داریں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کہانی کا پلاٹ اس لئے دلکش اور مغرب بن جاتا ہے کہ اس کو ہم انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے حاصل کرتے ہیں اور اس کو حقیقت کا ماہر پہنانے کے لئے ہمیں کر داریوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ افسانہ نگار کے کمال کا مظاہرہ جہاں اور میوں جگہ کیا جاسکتا ہے وہاں کر داری نگاری سے خصوصاً کہیں زیادہ زور کے ساتھ اس کے کمال کی جھلک رونما ہوتی ہے اور فنی حیثیت سے افسانہ نگار کے لئے یہ کام اگر سب سے زیادہ دشوار نہیں تو کم از کم ایک بیدار کام ضرور ہے۔ کہانیوں میں کر داری نگاری کی اہمیت کا اندازہ جیمز جین کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے افسانہ کی فنی تعریف کرتے وقت ایک جگہ پیش کیا ہے۔

”افسانہ کسی ایک کر داری کی زندگی کے سب سے اہم موقع کو ڈرامائی صورت میں مختصر طور پر پیش کرنے کا نام ہے۔“

افسانہ کی اس تعریف سے کر داریوں کی اہمیت صاف ظاہر ہے اور فنی افسانہ نگاری میں کر داری نگاری کا جو مرتبہ ناپاٹنے لگی حیاں ہے کر داری نگاری کے معنی یہ ہیں کہ کہانی کے لوگوں میں کچھ ایسی خاص عادتیں اور صفتیں پیدا کر دی جائیں کہ ان کی بہتی دوسرے لوگوں سے پہچانی جاسکے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کہانی یا ناول کے کر دار اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب افسانہ نگار کے ذہن نظر کوئی خاص مقصد اور وہ اس مقصد کو واقعات کے ذریعہ سے پیش کرنے کے لئے افراد افسانہ میں خاص خصائل اس طرح پیدا کر دیتا ہے کہ اس مقصد بحسن و خوبی پورا ہو جائے چنانچہ جب وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ حرمیں اور لالچی پنڈتوں کو کھانے سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہے اور یہ جذبہ شوق ان پر اس درجہ غائب ہے کہ انہیں اپنی عورت اور اکبر کو بھی پروا نہیں رہتی تو کہانی لکھنے والا بعض خاص واقعات کو ایک شخص کے سوانح حیات سے وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح ان کو زندہ اور ہم عمرت میں پیش کرتا ہے۔ پنڈت ہونے کے رشتہ شاعری کا کیریکچر ملاحظہ فرمائیے جس سے اس بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

غرض کہ کر داری نگاری کا مقصد یہ ہے کہ اشخاص قصہ کی طبیعت، عادات اور ان کے خصائل میں ایسی امتیازی خصوصیات پیدا کر دی جائیں، جن سے وہ چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے انسان معلوم ہوں اور ان کی سیرت پر اسطیحت کا دھوکا ہو جائے۔

منشی پریم چند نے اپنی کہانیوں میں صد ہا کیہ کرپٹیشن کئے ہیں اور سچ پونچھے تو ہی نفع انسان کے افراد ہیں بے کون سا ایسا فرد ہے جس کا کیہ کرٹران کی کمائوں میں وجہ نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف دو ایک مثالیں بیان بالا کی تائید میں انہیں کے انسانوں سے پیش کرتے ہیں۔ کیہ کرٹرا حلقہ دریائے اور انصاف کیلئے کر پڑھنے والا ان کو پڑھ کر کس قدر ضابطے میں پڑ جائے گا اور ان کے کیہ کرٹرا صرف اصلیت کا اھوکا ہوگا بلکہ من و عن سچے معلوم ہوں گے۔ ہندو گھرانے کی ایک بوڑھی ساس کا کیہ کرٹرا حلقہ ہو۔ وقت وہ ہے جب کہ ایک شاہکار صاحب گزین ہشتان کی طیاری کر رہے ہیں اور ٹھکانے بھی ان کے ہمراہ جانے والی ہیں۔ ہونیس زاد سفر کی طیاری میں مشغول ہیں۔ ساس پڑنے خیال کی سیدی سادی بگلتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بہوں پر نئی روشنی کا اثر غالب رہا ہے یا وہ جوان ہیں اور جانی دیوانی ہے۔ شاید وہ گزین کے موقع پر مذہبی فرائض ادا نہ کر سکیں یا ان کے ادا کرنے میں تاہل کریں ساس اپنا فرض اس طرح ادا کرتی ہے۔

”بوڑھی ٹھکانے کی بچوں کو کھلاتی تھیں اور بیچ بیچ بہوں کو کھاتی ماتی تھیں۔ دیکھو خبردار! جب تک اگر وہ ہوجائے گھر سے باہر نہ گھنٹا، ہنسنا، چمڑی، کھلاڑی انہیں ہاتھ مت چھونا۔ بچھائے دیتی ہوں ماننا چاہے زمانا۔ نتیں میری بات کی کیا پروا ہے زمین پانی کی بلند نہ پڑے۔ نارائن گھر بہت پڑی ہے، جو سادھو بھکاری دروازے پر آجائے اسے پھیرنا مت“

ایک اہتیار کا کیہ کرٹرا حلقہ فرمائیے۔

گوپال ذات کا اہتیار تھا۔ نہ پڑھا نہ لکھا۔ بالکل اکھڑ۔ دماغ روشن ہی نہیں ہوا تھا تو شمع جسم کیوں گھلتی۔ پورے چھو فیٹ کا قدر گھٹا ہوا بدن۔

خیر یہ باتیں تو ایسی ہیں جن کو مہر کس دن کس وقت جانتا ہے اور ہر کہانی لکھنے والا کر سکتا ہے۔ مگر منشی جی کی کردار نگاری کے کمال کا نمونہ ان چند الفاظ سے ہوگا جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور جو بغیر اسطلاح بدہ کے نامکن ہے۔ آگے چل کر وہ اس گوپال کیہ کرٹرا کی تکمیل اس طرح کرتے ہیں۔

”لدا کر گاتو سننے والے میل بھر بر بیٹھے ہوئے اس کی تاہل کا مڑہ لیتے۔ گانے بجانے کا عاشق۔ ہولی کے دنوں میں ہمیں بھرناک گاتا۔ ساون میں ملارا دھنیں تو روزمرہ کا مشغل تھا۔ نذر الیا کہ محبت اور پشائی کے وجود پر اسے حال نہ ٹھوکتے تھے لیکن جس طرح شیر اور لینگ بھی سرخ شعلوں سے ڈرتے ہیں اسی طرح سرخ صافے سے اس کی نوع لڑاں ہوا تھی“

پیماگ ایک کچھڑی بھگودی کا کیہ کرٹرا جو غریب سے منشی جی نے مزار آتشیں میں پیش کیا ہے کیا اس کو پڑھ کر کہانی پر سچائی کی حقیقت کا گمان نہیں ہوتا۔ ہم طوالت کے خیال سے پورا کیہ کرٹرا لکھنا نہیں چاہتے مگر صرف وہ حصہ نقل کر دیتے ہیں جو عام انسان نگاری

ملے۔ صرف ایک آواز۔ پریم چند ہی حصہ دوم۔ سٹو گزین کا ختم ہونا۔ سٹو اندر پریم چند۔ سٹو (پاپت) سٹو خاک پروانا۔

”جگت سنگھ کو کتاؤں سے نفرت تھی، وہ سیانی آوارہ گرد، گھنگڑا نوجوان تھا۔ کبھی امرود کے باغوں کی طرف نکل جاتا اور باغبان کے ساتھ شوق سے گالیاں کھاتا، کبھی دریا کی سیر کرتا اور ملاحوں کی کشتیوں میں بیٹھ کر اس پانچ نکل جاتا۔ گالیوں میں مزا آتا تھا۔ اسے بیٹڈ باجہا بہت پسند تھا۔ بیٹڈ کو کوئی دن ناخند نہ کرتا، آوارگی اور سفری دونوں ہزاروں میں دوسری کا سفر تھا۔ گارڈ جا رہا تھا۔ جگت سنگھ کو جب موقع ملے گا تو اس سے روپیہ ڈالے جاتا، نقد نہ ملے تو برتن نکال لے جانے میں اسے دریغ نہ تھا۔ گھر میں جتنی شیشیاں اور بوتلیں تھیں سب اس نے صاف کر دیں۔ پڑانے وقتوں کی کتنی ہی چیزیں اس کے یہاں بڑی بچسب جگت سنگھ نے ایک ایک کر کے ان کا خاتمہ کر دیا۔ اس فن میں ایسا طر اور ہوشیار تھا کہ اس کی جدت اور شکل پسندی پر حیرت ہوتی تھی۔ ایک بار وہ ماہری باہر اپنے دوستوں کے مکان کی چھت پر چڑھ گیا اور اوپر ہی سے ایک پتیل کی مثالی لے کر اڑا آیا۔ گھروالوں کو خبر نہ ہوئی۔ اس کے باپ ٹکا کر جگت سنگھ اپنے محلے کے ڈاک خانے کے منشی تھے۔ جگت سنگھ قومی لیجنڈ ہونے پر کبھی چپکے سے مار کھایا کرتا تھا، لیکن مار پیٹ، تنبیہ، فہمائش کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بچی گھر میں قدم رکھتا چاروں طرف سے کون کاؤں مچ جاتی۔ ماں دُور دُور کر کے دوڑتی، دوہنیں گالیاں دیتے گنتیں۔ بیچارہ اُلٹے پاؤں بھاگتا۔ کبھی کبھی وہ دو دو تین تین دن بھوکا رہ جاتا۔ گھر والے اس کی ٹھوڑے جلتے تھے۔ آوارہ گردی نے اسے تکلیفوں کا خورگ بنا دیا تھا۔ جہاں منید آ جاتی وہیں پڑا رہتا۔ جو کچھ مل جاتا وہی کھا لیتا۔“

اسی تفصیل کے بعد کہانی شروع ہوتی ہے۔ مگر یہ بیانی تفصیل غیر ضروری نہیں، بلکہ نہایت اہم، کیونکہ کہانی لکھنے والے نے جو کچھ کہا ہے اس سے آنے والے واقعات پر کہانی روشنی پڑتی ہے اور پڑنے والوں کے دلوں میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ کیسے ایسے لوگ کے کیا انجام ہوگا۔ اس قسم کے تفصیلی بیانات میں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ جو کچھ کہا جائے اس کا تعلق براہ راست کہانی کے پلاٹ اور اس کے نتیجے سے ہو۔

ان باتوں کو مد نظر رکھ کر اگر ہم کہناں، کا جائزہ لیں تو اس کا تعلق پلاٹ سے صاف ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کا حشر کیا ہوگا؛ اور ایک مذابک دن وطن کو خیر باد کہنا اس کا لازمی نتیجہ ہو گا۔ چنانچہ جگت سنگھ اپنے باپ کی حبیب سے ایک انٹیور ڈاؤن لیتا ہے اور بیٹی کی راہ پر داتا ہے۔ ڈاک خانہ کے منشی پر جو واقعات پیش آئے ہوں گے وہ بھی اس تفصیل سے آسانی سے اندازہ کیے جاسکتے ہیں یعنی حکمرانی کی طرف سے غبن کا چاچ لگنا، چنانچہ چاچ لگتا ہے اور سزا ہو جاتی ہے۔ اب وہ نتیجہ اور انجام کا سوال اور اس کا اس تفصیل سے تعلق۔ اس کے لئے یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ منشی پر چند ریڑھیوں کی کوزیا وہ ہولناک نہیں بنانا چاہتے اور اس لئے اپنے اضافی کردار کسی نہ کسی طریقہ سے اس سخت معاملے سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا؛ جگت سنگھ فوج میں ملازم ہو گیا اور سات سال کے عرصہ میں وہ کپتان ہو گیا۔ باپ کی سزا کا خاتمہ ہو گیا اور اس کو رہائی کا حکم ملا۔ وہ ایک شش و پنج میں تھا کہ جانے تو کہاں جائے کہ بیٹا یعنی کپتان جگت سنگھ جس کی شہریت اور شرائط اب خمیدگی سے بدل چکی تھی، باپ کو لینے آتا ہے اور کہانی کا خاتمہ طریقہ پر ہوتا ہے۔

منشی پریم چند نے عجلت سنگھ کا کیرٹر پیش کرنے کے بعد اس کو فوج کا پستان بنایا، جو بالکل نظری ہے اس کو کسی کالج پروفیسر یا ڈاک خانہ کا بائیس بنایا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے لئے ایسے ہی محکمے موزوں ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح بڑے گھر کی بیٹی، عالم بے عمل، آہ نکس، صرف ایک آواز، کرمول کا پھل، بانکا زمیندار، مناؤن، مرہم وغیرہ میں منشی پریم چند نے تفصیلی بیانات کی مدد سے کیرٹر پیش کئے ہیں اور نہایت خوبی کے ساتھ۔

(۲) مکالمہ (Dialogue) اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ بعض اوقات کسی شخص کے طرز گفتگو، اس کے حرکات و سکنات اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے بھی ہمیں کیرٹر کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ کمائی لکھنے والے بھی اپنے کرداروں کے کیرٹر پیش کرنے میں مکالمہ اور حرکات و سکنات سے بہت زیادہ مدد لیتے ہیں۔ مکالمہ کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ حقیقی اور اصلی معلوم ہو یعنی کمائی لکھنے والے نے اپنے کرداروں سے جو کچھ سکھایا ہے وہ ہر بہو وہی ہو جو ان موقعوں پر اصلی زندگی میں لوگ کہا کرتے ہیں۔ انسانی گفتگو اپنے کردار کی فطرت کے بالکل مطابق ہونی چاہئے تاکہ اس کی زبان سے ادا کردہ الفاظ جہنی نہ معلوم ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں ایک انفرادی شان باقی جائے۔ اب درمنشی پریم چند کی کہانیوں میں ان کے مکالموں کو دیکھئے اور ان کے کمال کی داد دیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو بات جس انسانی کردار کے منہ سے نکلتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود گھڑا بول رہا ہے خصوصاً وہ افروجن کا تعلق دیہات سے ہے۔ مہنڈ آتشیں میں پیاک اور اس کی بیوی کا ایک مکالمہ ملاحظہ فرمائیے اور ان کے کردار اخذ کیجئے۔

پیاک۔ لا کچھ میسے مجھے دے دے دم لگاؤں۔

کمنی نے نہ پھیر کر کہا۔ دم لگانے کا شوق ہے تو کام کیوں نہیں کرتے۔ کیا آج کل کوئی بابائیں ہیں؟

پیاک۔ بھلا چاہتی ہے تو پیسے دے دے۔ نہیں اس طرح تنگ کرے گی تو ایک دن میں کل جاؤں گا تب روئے گی۔

تو کمنی۔ روئے میری بلا۔ تم کل جاؤ گے تو میں بھوکوں نہ جاؤں گی۔ اب بھی چھاتی پھاؤ کر کمائی ہوں تب بھی چھاتی پھاؤ کر کمائی ہوں گی۔

پیاک۔ تو یہی پٹہ ہے۔

پنڈت موٹے رام شاستری کا کیرٹر مکالمہ کے ذریعہ اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

موٹے رام۔ ابگر کرے نہ چاکرئی بچھی کرے نہ کام۔ وہیں ملو کا کہہ گئے کہ سب کے دانا رام۔

سونانے منکر کر کہا۔ کیا کوئی بیٹی تازی خیر ہے کیا؟

موٹے رام نے مہینتر ابدل کر کہا۔ ایسا تاک کر کہ چاروں شلے نہ چت۔ سائے گھر کا نیو تہے سائے گھر کا! ڈوہ بڑھ کے

ہاتھ ماروں گا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔

سونانے لگا۔ کہیں پہلے کی طرت اب بھی دکھا کر ہو۔ پتلا بوڑھا کر لیا ہے نا؟
موسے رام نے تو بچوں پر تازہ دے کر کہا۔ "ایسا لگن منہ سے نہ نکالو۔ بڑے چپ تپ کے بعد پیشہ دین آیا ہے۔ جو
طیاریاں کرنی ہیں کرو!"

بچوں کے مکالموں میں بڑے بڑے ماسٹرفن بہک جاتے ہیں، ماسٹرفن جی نے جو نمونہ بچوں کی گفتگو کا پیش کیا ہے وہ خود
اپنی نظیر ہے:-

شیاما نے پوچھا: "کے بچے ہیں بھتیجا؟"
کیشو۔ تین انڈے ہیں، ابھی بچے نہیں نکلے۔
شیاما۔ ذرا ابھیں دکھا دو بھتیجا کتنے بڑے ہیں؟
کیشو۔ "دکھا دوں گا۔ پہلے ذرا جیتھڑے لے آ۔ بچے بچھا دوں۔ بچاے انڈے تنکوں پر پڑے ہیں۔
شیاما دوڑ کر کپڑے لے آتی ہے۔

شیاما۔ ہم کو بھی دکھا دو بھتیجا!
کیشو۔ پہلے ذرا ڈگری ٹوڑے دے اور سایہ کر دوں۔

شیاما نے ڈگری لاکر دے دی اور بولی۔ "اب تم اُتر آؤ میں بھی دکھاؤں۔"
کیشو نے کہا۔ "جاؤ نا اور پانی کی پیالی لے آؤ۔"

بڑے بھائی کا چھوٹی بہن سے اس طرح بار بار کام لینا اور اس غریب کا اس لالچ میں دوڑ دوڑ کر کام کرنا کہ بھتیجا ہیں بچے دکھا
کس قدر نظری اور حقیقی ہے۔ پھر ان کی بات چیت۔ اگر اکیٹ کی جائے تو بڑے حقیقت نظر آتی ہے۔
ان مکالموں سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں ہات اور مکالموں کے علاوہ کہانیوں کے افراد کی خصوصیات اور ان کے کیرکٹر نمایاں کرنے
کے لئے ایک کہانی کہنے والا اعلیٰ یا اچھٹن سے بھی مدد لیتا ہے۔

اسی طرح بعض اوقات تحریکات اور کشش کے ذریعہ سے بھی کیرکٹر پیش کئے جاتے ہیں۔ ماسٹرفن جی نے اپنی ایک کہانی غنڈہ
رج میں رانی منورما اور مانجھی کے کیرکٹر اسی طور پر پیش کئے ہیں۔

کبھی کبھی انسانہ نگار کو شخصی کیے کر لڑکی کے بجائے کسی جماعت، قوم یا ذرہ وغیرہ کا یہ لڑپش کرنا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں فساد نگار کی نظر افراد کی بجائے جماعت پر ہوتی ہے اور وہ اس کو ذرہ واحد تصور کر کے اس کا یہ لڑپش کرتا ہے۔ اس قسم کی کردار نگاری کا نمونہ منشی پریم چند کی ایک کہانی تاملت میں ملتا ہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کی تبلیغی انجمنوں اور ہندو سبھاؤں کے امتیازی خصوصیات اجتماعی حیثیت سے پیش کئے ہیں۔ مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس میں زیادہ غور اور مشاہدہ کو دخل نہیں دیا ورنہ وہ اس سے زیادہ مکمل ہو جاتے۔

کردار نگاری کے ترکیبی عناصر میں حسب ذیل باتیں شامل ہیں :-

(۱) مکالمہ جس کے متعلق ابھی لکھا جا چکا ہے۔ (۲) اشخاص نقشہ کے نام۔ اعلیٰ درجہ کے فساد نگار اپنے افسانوں میں کوئی چیز ایسی نہیں رکھتے جس سے کوئی نہ کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ چنانچہ نام بھی کرداروں کی مخصوص انفرادی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، اور بعض اوقات یہی نام افراد نقشہ کے کیڑے نکالتے ہیں۔ قدیم فساد نگاروں کے افسانوں میں یہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہے چنانچہ الزاویسیل میں زرخ فال، غمبے مانے وغیرہ اسی قسم کے اسم باغی نام ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے اکثر افراد نقشہ اسی نوعیت کے ہیں۔ نصوح ظاہر اور ایک حمیدہ، صالحہ، سلیم، کلیم، مبتلا وغیرہ۔ منشی پریم چند نے بھی اس خصوصیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور ان کی کہانیوں میں اسی قسم کے نام پائے جاتے ہیں جن سے ان کے اطلاق و کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ رچوٹن سنگھ، ہری داس، ارجن سنگھ، سائیں دیال، دیکش سنگھ، گرجا، شان سنگھ، دوجی کیلاش وغیرہ اسی نوعیت کے نام ہیں جو بالکل اہم ہونے کے علاوہ اپنی اپنی جگہ نہایت موزوں اور مناسب ہیں۔

(۳) کرداروں کی ظاہری شکل و صورت کا بیان وضع طہ پر پیش کرنا بھی کردار نگاری کا ایک بہت بڑا عجز ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تفصیلات کی بھرمار کر دی جائے۔ اپنے کردار کی اس مادی یا جسمانی خوبی کا ذکر کرنا چاہئے جس سے کہانی کی تحریک کو خاص تعلق ہو۔ حسن کا تفصیلی ذکر بھی زیادہ اچھا نہیں۔ منشی پریم چند نے اس اصول کو مد نظر رکھ کر کس خوبی سے منشی کی شکل و شبہات پیش کی ہے۔ لڑکی کی صورت بہت پیاری تھی جو اسے دیکھتا توہ جاتا ؟

صرف ایک لفظ سے منشی کے حسن کا جو نقشہ پڑھنے والے کی آنکھوں میں پھر جائے گا وہ شاید کسی طویل جملے سے نامکن ہے یا مثلاً دانی سارنہ عا میں اندرہ سنگھ کی شکل و صورت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :-

”اس نے میں دروازہ کھلا اور ایک لمبے قد کا سبھلا جوان اندر داخل ہوا“

یہاں لمبے قد کا سبھلا جوان، مسیا فقرہ وہ کام دیتا ہے جس کی اضافے کے لئے ضرورت تھی یا اسی طرح انہوں نے اپنی ایک کہانی

لے ناک پر باد - سے دشمن کو کھڑے دلا۔ از بابا کھنڈار (منشی پریم چند)۔ لے کمرل کاجل سے مٹاؤں لے مہم۔ لے خودی از غائب پروادہ

مرہم میں شان سنگھ اور گمان سنگھ کا علیہ اس طرح بیان کیا ہے :-

”دو لڑائی بھائی قومی میل اور غضب کے چاکش تھے“

اور ان کی بہن دوجی کی شکل و شبابت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف اتنا ہے :-

”نہایت نازک اندام، سر پر گھڑا رکھ کر چلتی تو کمر بل کھاتی“

اس میں سرسبز بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل یہاں دکھانا یہ مقصود ہے کہ باوجود نزاکت مفکری کے باعث اس کو یہ کام کرنا پڑتا تھا اور اس کا اثر یہ ہوتا تھا۔

۱۴) لباس اور اس کی اہمیت - آدمی کے لباس سے بھی اس کی اخلاقی حالت کا پتہ لگتا ہے۔ صاف ستھرے لباس سے پہننے والے کی نفاست مزاج ظاہر ہوتی ہے۔ مرد کے لئے رنگیں اور گونے پٹنے کا استعمال اس کی دوسری حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ عورتوں میں سبک اور نفیس زیورات کا استعمال ان کے مہذب ہونے اور جدید روشنی کی دلدادگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کردار نگاری میں لباس سے بہت مدد ملتی ہے۔ یہاں آنحضرت صاحب دہلوی کے ایک مضمون کا اقتباس دینا بے جا نہ ہوگا جس سے کردار نگاری میں لباس اور ظاہری شکل و صورت کی اہمیت کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا۔

”اس جلسہ کی روح رواں سروجنی کی بابت سنو۔ ٹھک ٹھکا ہوا سا قد۔ گول گول گد ریا ہوا ذلیل کھلی چھٹی رنگت خوب گمری گمری کالی کالی جٹی بھولیں، جٹ کے اور چھوٹا سا کسم کا نیر کا۔ بڑی بڑی زرگیں آنکھیں کچھ جھکی جھکی سی۔ بالوں میں کالی گنگھیاں لگا ئی گئی تھیں، جن میں سیرے کی طرح چمکتے ہوئے سفید رنگ جڑے تھے جو ہمیں بناری ساڑھی کے اندر سے پٹ بینڈیوں کی طرح جھم جھم کر رہے تھے سانچے میں ڈھلی باہیں اور اچھی گول گول نازک کلنیاں جن میں بھنپی بھنپی چمکتے ہوئے زبردستی رنگ کی جاپانی ریشمی چوڑیاں۔ بیچ میں نیم کے پھول کے مہنی کی جلا دار اشرفی کے سونے والی چوڑیاں گلے میں ست لٹے کی وضع کی گنڈی تھی جس میں گبنو کی جگہ باقوت کی عروا کی کا چاند۔ اور کپھراج کی عروا کی کا تارا سا لگا ہوا تھا۔ کانوں میں ہیر کے چھوٹے چھوٹے بندے تھے، جو بجلی کی روشنی میں حرکت کے ساتھ پڑے جبر جبر کرتے تھے“

جناب آنحضرت صاحب موصوف کا ایک دوسرا رنگ ملاحظہ ہو :-

”چھلانے والی ایک لڑکی کی تیس تیس برس کی، پھنسا ہوا سفید آڑا پاجامہ نیچا نیچا مہینیں آپ رواں کا سفید کرتا پہنے جس میں کلاؤ کا کام اور گشن کی کیل لگی ہوئی، دو پڑ کچھ کندھے پر پڑا کچھ نزش پر جھاڑو دوسے رات تیار بازی رنگ کا تانین چار دن کے بدلے مہنے کے پڑے تھے۔ ہاتھوں میں کالی کرپالی انگلیں اور گنڈی کے کندھے کے کٹے۔ گلے میں بادامی دلتے کی چھپا لکی، کانوں میں ایک ایک ہیرا کٹ کی بالی“

کیا پڑھنے والے ان بیانات میں لباس اور وضع قطع کی مدد سے وزن کے کیرکٹر کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہماری رائے ناقص میں تو ایک ادنیٰ تاہل سے ان کا کیرکٹر معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ افرادِ قفقہ کو سمجھنے میں لباس کو کہاں تک مصل ہے۔ منشی پریم چند نے جہاں اس سے کام لیا ہے کسی دوسرے سے پیچھے نہیں ہے اور جو کچھ دکھلایا ہے نہایت موزوں اور سبباً طور پر۔ انہوں نے جو لباس افرادِ قفقہ کے لئے پیش کیا ہے اس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:-

”گاڈلے کے ڈھیلی مرزئی، گھٹنوں تک چڑھی ہوئی دھوتی۔ سر پر ایک گرانبار اٹھا ہوا صافہ۔ کندھے پر چنٹی اور تباکو کا دزنی بڑا۔“

امرت میں عائشہ کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے:-

”سالار رنگ مختار، چرواہا کی متین ملاح سے متور تھا۔ بڑی بڑی رنگسی آنکھوں سے اخلاقی تہذیب کی روشنی جھلکتی تھی۔ قد میانہ سے کچھ کم۔ اعضا سبک“

یہی وہ چیزیں ہیں جن سے کہانی لکھنے والا اپنے افرادِ قفقہ کے لئے مواد فراہم کرتا ہے۔ اور ان میں مشاہدہ کی بہت سخت ضرورت ہے اچھے افسانہ نگار ہمیشہ اپنے گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہو کر اپنے لئے مواد فراہم کر لیتے ہیں۔ وہ جن لوگوں سے ملتے جلتے ہیں یا جو لوگ ان کے گرد و پیش نظر آتے ہیں، ان کی ہر حرکت کا مطالعہ بغور کرتے ہیں، ان کی باتوں کو قوجہ سے سنتے ہیں اگر کوئی چیز ایسی مل جاتی ہے جسے وہ دلچسپ سمجھتے ہیں تو فوراً اسے اپنے افسانے کے لئے رکھ لیتے ہیں۔

اس کے علاوہ افسانہ نگار کا یہی فرض ہے کہ وہ اشخاصِ قفقہ کے غیر اختیاری افعال اور حرکات کو بھی بہ نظر رکھے مثلاً رونے، ہنسنے، ہیوس ہونے، غصہ کرنے وغیرہ۔ یہی افرادِ قفقہ کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ حرکات کس موقع پر کیسی ہونی چاہئیں اس کا جائزہ لینا افسانہ نگار کا فرض ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ قلبی کیفیتوں کے اظہار کے بہ ذرائع گفتگو سے زیادہ واضح اور مؤثر ہونے کے علاوہ مین فطری ہوتے ہیں۔

منشی پریم چند نے اپنی کہانیوں میں بجا بجا اس قسم کے غیر اختیاری افعال سے کیرکٹر نگاری میں مدد لی ہے اور نہایت خوش اسلوبی سے نباہا ہے، اگر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے جو علت پیدا کیا ہے وہ منشی جی کے وہاں نہیں۔

انظر علی فاروقی

اظہارِ عشق

میں آج کل اپنے گاہنِ نعل سرگدھائی میں ہوں۔ گاؤں کے سادہ تہذیب نے میرے دل و دماغ پر چارٹ جھڑے میں اُن کنارتین کیوں
کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔
الطاف

اس طرح جرات کروں گا عشق کے اظہار کی

کمیت کو جب جائے گی تو چھاپھ لیکر دھوپ میں
بانسری کی لے میں تو ہو جائیگی گم جس گھڑی
رات کو چھیر پٹی جب چھنے کا ٹونگیں ستار
صبحی دم جب گائیگی چکنی پہ نو میکے کا راگ
تو نہائے گی جو چھپ کر کبکروں کی باڑ میں
رات کے ہنگام سو جائے گی جب تو کھاٹ پر
جب کبھی تو جائے گی گرمی میں گیہوں کوٹنے
دن ڈھلے جب لے کے چارہ آئیگی تو گاؤں میں
دودھ دہنے کی صدا پر جب لگے گی جھبونے
جب برستی رات میں گائے گی تو میٹھے ملار

مُسکراؤں گا جوانی بن کے تیرے رُوپ میں
میں تری آنکھوں میں بن جاؤں گا ساون کی جھڑی
میں ترے نغموں میں بن جاؤں گا ہلکا سا خمار
میں تے سینے میں بن جاؤں گا امیڈوں کی آگ
بلبلے کی شکل بن کر میں رہوں گا تاڑ میں
خواب میں بن کر کوئی چھیر پٹو کا تجھ کو گھاٹ پر
بجلیاں بن بن کے گالوں سے لگوں گا ٹوٹنے
بن کے سبزہ لپیٹ جاؤں گا میں تیرے پاؤں میں
بن کے گیسو مسخ گالوں کو بڑھوں گا چومنے
میں تری آنکھوں میں بن جاؤں گا ہلکی سی بھوٹا

اس طرح جرات کروں گا عشق کے اظہار کی

الطافِ مشدی

برہما

سیاہی اور غتابی پھیلتے ہیں اندھیری راتوں کے
جیسے منتر ہوں جنگل کے جادوگر کی باتوں کے
یاساؤن کی کالی گھٹاؤں کی تکھی برساتوں کے

دل پر چھانے والے نغمے، بیہوشی لانے والے!

ایسی راتیں: چند اکھونٹ کاٹھے چپکے سوئے ہیں،

اور گنتی کے چند ستارے نیند میں کھوئے کھوئے ہیں،

پیر اور پتے، ٹھنی ٹھنی تاریکی میں دھوئے ہیں،

دل کو ڈرانے والے سائے، دل کو دہلانے والے!

سائے — کالے کالے سائے رنگ رنگ کر چلتے ہیں،

اور ان کالے سالیوں سے بھوتوں کے جھنڈا اُبلتے ہیں،

دل میں اندھے، بے بس، بے پایاں جذبات مچلتے ہیں،

گیت بنانے والے، نغمے چاہت کے گانے والے!

چوہٹ راجہ ہندوستان کا ایک قدیم وایتی قصہ ڈرامے کی شکل میں افرا تمشیل

گرو	بھگوان کے بھگت
چیلہ	گرو جی کا ناخلف اور پیٹو پیرکار
حلوائی	اندھی نگری کا دکاندار
بڑھیا	جن کا بچہ دب کر مر گیا
معمار	جن نے دیوار بنائی
بچے والا	جن نے مالہ دیا
چوہٹ راجہ	اندھی نگری کا حکمران
منتری	چوہٹ راجہ کا مشیرکار
فالتو لوگ	گاگ، بھکاری، رعیت، چوہدار، اخدام وغیرہ

پہلا منظر

گرو اور ان کا چیلہ اس بستی سے چل کر اندھی نگری میں داخل ہوتے ہیں جہاں دتھ کیا کرتے تھے۔

چیلہ۔ کیوں گرو جی! چوہٹ راجہ کی اندھی نگری یہی ہے؟
گرو۔ ہاں بیٹا۔ چوہٹ راجہ کی اندھی نگری یہی ہے۔ یہاں

ہمیشہ سے اندھیر ہوتا چلا آ رہا ہے اور اسی لئے اس گناہ
اندھی نگری پڑ گیا ہے۔ اجنبی اور نئے آدمی کے لئے
معاملہ بڑا کٹھن ہوتا ہے بعض دفعہ تو ہوتا کے چکر میں لایا
پھنس جاتا ہے کہ شوالی تک نہیں ہوتی۔

چیلہ۔ واہ گرو جی! یہ آپ نے کیا کہا؟ آپ کے ہوتے
کسی کی مجال ہے کہ میرا بال بیکار کر کے؟ آپ کے کرم سے

یہ نگری تھے راس نہیں آئے گی اور ترے ساتھ وہ معاملہ ہوگا کہ دوسری کی گردیا، مگاسر منڈائی۔

چیلہ۔ واہ گردی! آپ نے تو غضب دھادیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ دھرم بھاری ٹھہرے اور میں پیٹ بھاری۔ دیکھئے دونوں میں کتنا فرق ہے زمین آسمان سے بھی زیادہ۔ گرو۔ تیری اچھیا۔ تو تو پتھا ہٹ دھرم ہے۔ ہمیشہ اپنی بات کی حق کیا کرتا ہے۔ جو جی میں آئے کر! ہم تجھے روکتے ٹوٹے نہیں۔ پھر بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنا اور خوب چوکس ہو کر رہنا۔

چیلہ۔ ہاں ہمارا ج! یہ تو مجھے کرنا ہی پڑے گا۔ ایسا نہ کیا تو جگہ جگہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔

گرو۔ بس ٹھیک ہے۔ دھوکہ درد کا وقت آپڑے تو مہنگوان کا نام لے کر ہماری طوط دھیان لگا لیسنا اور بند بننا بار ہمارے نام کی بالا چل لینا پھر سب کشتہ دھوکہ دینا اب تو بیشک جدھر جی چاہے چل پھر کیونکہ ہم نے تجھے جہاں کہا تھا وہاں پہنچا دیا ہے اب ہم وہاں جاتے ہیں۔ چیلہ۔ ابھی سے کیا؟ نہیں ہمارا ج۔ دوچار دن تو تھوڑے ہیں۔ یہاں کا حالو ابراہیم یاد رہتا ہے اور پھر نئے سیر کرتا ہے۔ آپ دوچار سیر رکھ جائیے۔ یاد تو رہے گا۔

گرو۔ بس بننا! مہنگوان بھی کر دیں۔ ہمیں اس کا بوجھ نہیں۔ پھر بوتیر اکلیمان کریں۔ ہمیں وہاں اپنی بستی میں جا کر چلے کاٹنا ہے۔ لے ہم چلتے ہیں۔

(آٹا ٹاٹا گردی غائب ہو جاتے ہیں)

سب تیری دل سے عزت کریں گے اور غور سے دلوں کے اندر اندر میرے نام کا دھول لیں پٹنے لگے گا کہ دُور دُور تک چرچا ہوگا۔ سب لوگ میرے پاؤں دھو دھو کر پیئیں گے۔ گرو۔ مجھے تو ایسی آس نہیں بلکہ کمٹکا ہے کہ کہیں تو ایچ پیچ میں نہ آجائے اور پھر جان پر بن جانے کی نوبت نہ پڑے۔

چیلہ۔ اچی واہ گردی! کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے۔ آپ تو بات بات پر جی جھوڑ دینے کے عادی ہو گئے ہیں اور ساتھ ہی مجھے بھی پھسڈی بنا رہے ہیں۔ بھلا یونہی بیٹھے بھٹے بلاوجہ میں ایچ پیچ میں آ سکتا ہوں؛ اگر کوئی مجھے اس میں لانے کی کوشش کرے تو وہیں کچھ نہ کمال دوں۔

گرو۔ تو تو زرا کٹ کا آتو ہے۔ نہ سمجھتا ہے دسو چتا ہے۔ ذرا خیال تو کر کہ اتنی دُور سے چل کر آنے کی کوئی بے لاری پڑی تھی؟

چیلہ۔ واہ گردی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بھلا بے لاری ہی کوئی نہیں تھی، دھیان دے بیٹے کہ ایک تو اس ٹگری کے باسی دھرم کو قبول بھال جھٹکتے پھر رہے ہیں اور دوسرے پڑتا کے کرم سے ٹپکے پیر بھاجی، اور نئے سیر کیا جا سکتا ہے کھانے پینے والے آدمی کے لئے مرے میں اور غضب گھرے ہیں۔

گرو۔ بس رہنے دے۔ اتنی سی بات پر اتنا دُن۔ چیلہ۔ واہ گردی! کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ اتنی بڑی بات اور آپ اسے اتنی سی بنا رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کے لئے اتنی سی ہو لیکن میرے لئے تو بہت بڑی ہے۔ گرو۔ پھر وہی دھاک کے تین پات۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ

حلوائی۔ واہرا کیسے جڑا؛

چھیلا۔ اچھا تو لاؤ دھیلا واپس کر دو۔ میں اگلی دکان جاتا ہوں۔

حلوائی۔ اچھا آدھ چھٹا تک اور لے لو۔

چھیلا۔ پورا ایک پاؤ دینا ہے تو دو۔ ورنہ سادھو کو خراب

نہ کرو۔

حلوائی۔ اچھا مہاراج پورا پاؤ بھر لیجئے! تاؤ میں نہ آئے۔

چھیلا۔ واہ تاؤ میں کیسے نہ آؤں تم نے بات جیسی ہی کی۔

(حلوائی ترازو میں ہات چڑھا کر صاف کرتا ہے)

چھیلا۔ ڈنڈی کیوں مارتے ہو؟ کیا کم دو گے،

حلوائی۔ نہیں ہمارا ج! نہ میں ڈنڈی مارتا ہوں، نہ کم دیتا ہوں

آپ تو ناحق بے حارے ہو رہے ہیں۔

چھیلا۔ اچھا تو پھر بیچ بیچ میں سے گرم گرم تو دو دیگی بجائی نہ دو۔

حلوائی۔ گھبراہٹ میں نہیں سب کچھ آجاتا ہے۔ یہ لیجئے۔

(قرنے کے بعد ساڑھ کے اندھ میں دونا پکڑا دیتا ہے)

چھیلا۔ ارے ارے رے! یہ اس میں کبھی کیسی؟

حلوائی۔ یونہی آگئی ہوگی، نکال پھینکئے اسے باہر!

چھیلا۔ پھر اس کا بھی حصہ دو۔ یہ بھی تول میں آئی ہے۔

حلوائی۔ یہ لیجئے اس کا بھی حصہ۔

(حلوائی تھوڑا سا حلوا ڈال دیتا ہے)

چھیلا۔ بس بس۔

(حلوائی نے کراڑھ کر ایک ٹونٹ چلا جاتا ہے۔ چھوٹا سا پتھر پکڑے)

کراس پر بیٹھ جاتا ہے اور حلوائی نے لگ جاتا ہے۔ حلوائی

گرم ہونے کے باعث زبان بل جاتی ہے۔)

چھیلا۔ اوہ! گروہی غائب بھی ہو گئے چلو بیٹھ جینا۔ انجب

آرام اور عیش کے دن بسر کروں گا۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی دکھ۔ رات

دن منے ہی منے ہوں گے۔ مکھ میں زندگی کٹے گی۔ اتنا

حلوا کھاؤں گا کہ تھوڑے ہی دن میں یہ بٹیاں چپ جاتی۔

اور ان پر اتنا ماس چڑھے گا کہ پورا بھینسا بن جائوں گا۔

دوسرا منظر

(سامنے حلوائی کی بہت بڑی دکان ہے جس پر کھول

کی خوب بھیر لگتی ہے چھیلا بھی ادھر ہی کاٹھ کھڑا ہے)

حلوائی۔ اسے لوندے! یہ پکڑاؤ دھ پاؤ حلوا اور لوجی، ستم اپنا تین

پاؤ کا دونا۔

بھکاری۔ بابا کچھ نہیں بھی بھگوان کے نام پر دو۔

حلوائی۔ چلو حلوا آگے بڑھو۔ اپنا راستہ لو۔ ہاں! دھو جی

آپ کو کیا دول۔

چھیلا۔ دینا کیسے جو بیچتے ہو وہی دو۔ اور ہاتھی یا بیل تھوڑی

دے سکتے ہو۔ یہ لو ایک دھیلا۔ کھرا کھوٹا بھی سے دیکھ

لو پھر نہ کہنا۔

حلوائی۔ اس کا حلوا ہوں پاؤ لے گا۔

چھیلا۔ وہ کس حساب ہے؟ پاؤ بھر دو۔

حلوائی۔ دیکھئے نا آپ کے دھید میں چھید ہے۔

چھیلا۔ چھید سے کیا ہوتا ہے؟ کوئی بھس تھوڑی بل جاتا ہے۔

مال سے تو کھرا ہے۔

مرد۔ تمہیں بچاؤ نہ جو کھڑے منہ نہ رک رہے ہوا اور دوسروں

کو بے رحم اور نہ جانے کیا کیا بنا رہے ہو۔

چیلہ۔ اے واہ! ہاتھوں پر پٹی باندھ کر کھڑے ہو۔ دیکھ

بھی نہیں سکتے کہ میرے ہاتھ کسے ہوئے ہیں۔ ایک

ہاتھ میں ملوٹا ہے اور دوسرے سے ملوٹا کھا رہا ہوں۔

اگر کہیں تمہاری طرح میرے ہاتھ خالی ہوتے تو بچے

کو دیوار کے نیچے ہی نہ آئے دیتا۔

لوگ آتے ہیں اور بچے کو کھاتے ہیں ساتھ ہی دہا آجاتا ہے)

چیلہ۔ افو، بچاؤ مرکز ہی رہا۔

مرد۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ تم اگر تھوڑی دیر کے

لئے زندہ نہ کر لیتے تو کچھ بھی نہ مرنے۔

چیلہ۔ اے واہ۔ آنے میں تم لوگوں نے دیر کی اور اٹا کھ

اُٹھ رہے ہیں۔ اگر میں آوازیں نہ دیتا اور چلا کر نہ

پکارتا تو تم کیسے آتے اور بچے کو بچاتے۔ میں پڑا پڑا

گل سڑ جاتا۔

(اتنے میں بچے کی ماں آجاتی ہے)

ماں۔ ہائے رے میرا بچہ، میرے دل کا ٹکڑا، میرا پیارا

میرا تارا مجھ سے چھین گیا۔

چیلہ۔ بڑھئیوں بین نہ کرنا اس سے کچھ نہیں بنے گا۔ کال

کی چکی اسی طرح گھوما کرتی ہے۔ اس کی جتنی ہمارے ہاتھ

میں نہیں ہے۔

ماں۔ مگر ساتھ ہی میری تو زندگی کا یہی ایک سہارا تھا جس

سے میں اس لگنے سے بچتی تھی۔ اب میرے لئے بچنا کیا رہا

چیلہ۔ او او او! جب بیل گئی۔ جب بیل گئی۔ لیکن مرنا گیا۔

واہ گرجی! غب جگہ پہنچا گئے۔ دن رات آندے سے حلوا

کھایا کر دیں گا اور آپ کے گن گایا کروں گا لیکن کتنے ڈکھ

کی بات ہے کہ میں تو اس وقت چٹھارے لے لے کر حلوا

کھا رہا ہوں اور آپ کسی برگد کی کھوہ میں بیٹھے تپ کر

رہے ہوں گے (آدمے کے قریب ملوانہ پر بیٹھا ہے) اب

اسی طرح کھاتے کھاتے ابھی کو جی بھر کر دیکھنے نکل چلیں تو

ٹھیک ہے۔ ذرا یہاں کے باسیوں کے طور طریقے اور

چوٹ راجہ کے رنگ ڈھنگ دیکھیں۔ آخریتہ تو چلے کہ

یہ سچی اندھی نگری کے نام سے کیوں مشہور ہے۔

(ساتھ وہاں سے اُٹھ کر چلا جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

اندھی نگری کے قبا کا وہ حصہ جہاں کے مکان نہایت

خشہ ہیں، اتفاق سے ایک مکان کی دیوار گرنے کہے کہی

کا بچہ اسی دیوار کے نیچے کھینچنے لگا جانے سے ملوٹا

کھانا کھانا ادھر آکھتا ہے۔)

چیلہ۔ (دیوار گرنی دیکھ کر) ارے ارے دیوار گر گئی۔ واہ واہ

کسی کچھ دبا۔ ہائے ہائے۔ بھاگو رے لوگو! نہیں تو بچہ

اگلی دنیا میں جا کر دم لے گا۔ جلدی آؤ، رے کوئی ہو تو

کتنے بیرحم ہو تم۔ مرنے ہوئی جان کو نہیں بچا سکتے۔

(کوئی مرد ادھر آکھتا ہے)

سپاہی اور محافظ دست بستہ سرخوں کمرے ہیں۔ میدان کے بچوں بیچ پھانی گاڑی گئی ہے۔

لوگ ہر چار حصے کے جرم کر رہے ہیں۔ جیلا بھی تازہ مولے کا دونوں کپڑے آجاتا ہے۔

چیلہ۔ کیوں بھئی یہ ٹٹ کیوں لگ رہا ہے۔ کوئی میلہ ہے یا کسی ٹٹ کا تماشا جو تمام لوگ ٹٹ سے ہیں۔ آدمی۔ میلہ یا تماشا ایسا ہوتا ہے۔

چیلہ۔ اور کیا اس کے سر سینگ ہوتے ہیں۔ آدمی۔ سادھو مہاراج! یہ دربار لگا ہے۔ کل جو ہمارے سامنے بڑھیا کچھ دیوار تلے دب کر مر گیا ہے، اس کا فیصلہ ہوگا۔

چیلہ۔ اسے واہ! ایک دو دن کا 'پیکا' مرا ہے اور اس کے بعد اتنا دن مچ رہا ہے کہ جیسے آفت ہی تو آگئی ہو۔

آدمی۔ آفت، آفت نہیں تو اور کیا، دیکھنا، ہمارے سامنے سامنے ہی کتنے لوگوں کو سسٹنے لگی ہوئی پھانی پڑ چڑھا دیا جاتا ہے۔

چیلہ۔ واہ، یہ کیوں، بچہ مرا اپنی موت، بھلا پھانسی کس بات کی، نہ کسی نے اسے جان بوجھ کر ہلاک کیا اور نہ کسی نے اسے مارنے کی کوشش کی۔

آدمی۔ بس دیکھتے ہی رہے کیا ہوتا ہے۔

چیلہ۔ پھر تو خوب موقع ہاتھ آیا۔ آج تو مرنے لے کر ہی تاشے کو دیکھتے ہیں کہ کس طرح فیصلہ کیا جاتا ہے اور کس کس آدمی کو پھانسی چڑھا یا جاتا ہے لیکن بھئی یہ تو ہٹاؤ، یہ

مرد۔ نہیں بڑھیا یوں دل تو زور بلکہ جھلک کر! شاید بھگوان اس کا بدلہ تجھے کسی اور طرح دے دیں۔ یا اس کے جنم میں تجھے عوض دیں۔ دیکھ منتری جی! دھڑ رہے ہیں، ان سے فریاد کرو! (منتری جی آسپختے ہیں)

ماں۔ منتری جی میں بڑھیا عورت اس نامرد بڑھاپے میں آکر ٹٹ گئی۔ میرا ایک ہی بچہ تھا وہ دیوار تلے آکر دب گیا منتری۔ تو پھر بھگوان سے کہ جس نے یوں کیا، ہم نے تھوڑی دیوار گرائی ہے کہ تیرا بچہ دب گیا ہو۔

ماں۔ مہاراج اب تو آپ ہی میرے لئے بھگوان ہیں۔ کرنا چاہیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔

منتری۔ اچھا تو کل آجاتا۔ اس سامنے کے پنڈال میں مہاراج کا دربار لگوا دیں گے۔ تو اپنی فریاد ان سے کہہ دینا۔ ماں۔ اچھا مہاراج۔

(منتری جی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بڑھیا بچے کی منٹ کر

اٹھا کر دوقی پٹنچ مچھل دیتی ہے۔ سادھو مولا کا تھماتا

لہنی کی سیر کرنے لگ جاتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں

مغروٹ ہو جاتے ہیں۔)

چوتھا منظر

(آج صبح ہونے ہی ایک وسیع میدان میں چوٹ راجہ کا دربار لگ

گیا ہے۔ زمین تخت بچہ لگیا ہے۔ مہاراج اس پر ٹھکان ہیں۔ خادم چنکر کر رہا

ہے۔ دائیں جانب منتری اور بائیں جانب دیگر امراء، ایستادہ ہیں۔ اور لی

سانے نگہبان پر کن بیٹھا ہے ؟

آدمی ۔ یہ اس گری کے بیہان راجہ ہیں۔

چیلار ۔ بیہان ادا یہ بھی خوب کہی ۔ ان کی تو آؤٹ کی طرح

کوئی کل سیدی ہی نہیں ، یہ بیہان کدھر سے ہیں ؟

آدمی ۔ بس جی ، چھوڑو اس بات کو ۔ نسیب ڈھول پینے لگا ہے ۔ رخاوش ہو کر سب کچھ دیکھتے جاؤ۔

(ڈھول بٹاتا ہے ۔ بڑھیا دست بہرے سے حاضر ہوتی ہے)

راجہ ۔ بڑھیا ! تیرا بچہ کیوں مرے ؟

بڑھیا ۔ ہمارا ج دیوار سے آکر۔

راجہ ۔ پھر قصور کس کا ہوا ؟

بڑھیا ۔ ہمارا ج دیوار بنانے والے کا جس نے بے پروائی سے

کچی دیوار کھڑی کر دی۔

راجہ ۔ ٹھیک ہے ۔ کہاں ہے دیوار بنانے والا ۔ دکھیو پٹال گیا

چوہدری ۔ ہمارا ج وہ کھڑا ہے گھنے بڑکی جڑ میں۔

راجہ ۔ وہ جس کے ہاتھ میں تیشہ اور کرنی ہے۔

چوہدری ۔ جی ہمارا ج۔

راجہ ۔ جلاؤ اسے ، فوراً سٹنٹ آئے۔

(دیوار بنانے والے کو حاضر کر دیا جاتا ہے۔)

چوہدری ۔ حاضر ہے ہمارا ج !

راجہ ۔ کیوں بے ٹوٹے دیوار کچی کیوں بنائی ؟ تجھے پھانسی لگنے

سے کون فائدہ پہنچا سکتا ہے ؟ جلدی بول !

معمار ۔ ہمارا ج میرا اس میں قصور ہی کوئی نہیں ۔ سارا قصور

تو مجھے دالے کا ہے جس نے مجھے کچا اور زخمی ہمالہ دیا۔

راجہ ۔ اچھا تو پھر بیٹے والے کا ہتہ دے یا اسے لاکر سانے حاضر

کر نہیں تو اس کے عوض تجھ کو پھانسی لٹکا دیں گے !

اسے تب پھانسی دیں گے جب وہ مل جائے گا۔

معمار ۔ ہمارا ج ، بھٹے والا تو وہ سانے ہے ۔ دیکھئے اوپر

سے نیلے پر ایک پتھر کے ڈھیر پر بیٹھا ہے۔

راجہ ۔ اچھا تو چار بار تم اسے حاضر کرو تا کہ ہم اسے پھانسی

پر لٹکائیں ! بغیر کسی کو پھانسی دینے خالی پھانسی کو نہیں

اٹکائیں گے۔

(چوہدری ہی دیر میں بھٹے والے کو حاضر کرتا ہے)

چوہدری ۔ بھٹے والا حاضر ہے ہمارا ج !

راجہ ۔ کیوں بے تجھے ہم نے اس لئے بھٹا بنانا دیا تھا

کہ تو لوگوں کو کچا سا دے جس سے کچی دیواریں بنیں !

بھٹان کے تھے دب کر مر جائیں۔

بھٹے والا ۔ نہیں ہمارا ج ! یہ بات نہیں ہے۔

راجہ ۔ پھر کیا بات ہے ؟

بھٹے والا ۔ قصور سارا اس بڑھیا کا ہے۔

راجہ ۔ بڑھیا کا ؟

بھٹے والا ۔ جی ہمارا ج۔

راجہ ۔ وہ کیسے ؟

بھٹے والا ۔ وہ ایسے کہ اگر وہ بچے کی حفاظت کرتی تو نہ بچہ

مرتا نہ ہمارا ج کو دربار لگانے کی ہتھالی پڑتی اور

نہ ہمارا ج کے آرام میں خلل پڑتا۔

راجہ ۔ شاہشاہ ، شاہشاہ ! غرا پئی ۔ اس بھٹے والے کو گلے سے

چیلہ۔ لیکن مجھے اپنا قصہ رُخِ عالم نہ پڑنا چاہئے!
 راجہ۔ ہمارا تو اب دماغ کام کرتا ہے اور نہ اب ہم مقصور ہو رہے
 بناتے ہیں۔ ہم یہ سمجھ لو کہ موت ہمارے لئے یقینی ہے
 اور کوئی طاقت ہمیں اس کے پنجے سے چھڑانہیں سکتی
 شوہر مچانے کی بجائے جھگڑان کی طرف دھیان دو اور
 اپنے کئے ہوئے پاپ بخشتو۔

چیلہ۔ یوہی ہے تو بھری دو آرزوئیں ہیں۔
 راجہ۔ وہ کیا؟

چیلہ۔ وہ یہ کہ اول تو علواً لکھا لینے دیجئے اور دوسرے اپنے
 گرو کو یاد کر لینے دیجئے۔

راجہ۔ ہاں تمہاری دو دلائل باتیں ہم منظور کرتے ہیں۔
 (چیلہ جلدی جلدی علواً لکھا لیتا ہے)

چیلہ۔ چلو علواً تو کھالیا اب گرو جی سے منٹ لوں۔
 (انہیں بند کر کے گرو کی طرف دھیان دیتا ہے)

اے گرو جی! میں نے بڑا کیا جو آپ کی بات نہیں مانی،
 میری نادانی اور پیڑ میں نے مجھے موت کے منہ میں ڈال دیا
 اب اس بھری دنیا میں آپ کے سوا اور کون ہے جو
 مجھے پڑی ہوئی بھیتا کے ہاتھوں سے چھڑائے۔ آپ
 جب سے کہیں اور مجھے صید سے نکالے۔

(گرو جی کا نذر)

گرو۔ کیا ہوا ہے بیٹا؟
 چیلہ۔ گرو جی ہوا کچھ نہیں، یہ لوگ بلاوجہ مجھے پھانسی دے
 رہے ہیں۔

تنخواہ دینا شروع کر دو اور یہ آج سے ہمارے منتر لیں
 شمار ہوگا۔ اس نے ہمیں بڑے پتے کی بات بتائی۔ اہلی
 شکار تو اب پکڑا ہے۔ ہم ناشی دماغ کو پریشان کر رہے
 تھے۔ بس اب بڑھیا! تجھے پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔

بڑھیا۔ ہمارا ج!

راجہ۔ ہمارا ج دہراج کچھ نہیں، جلا داس بڑھیا کو پھانسی
 پر لٹکا دو۔

(ایک آدمی سامنے آتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر گڑبڑ بولتا ہے)

آدمی۔ ہمارا ج اگرچہ پوچھیں تو قصور اس بڑھیا کا نہیں ہے
 راجہ۔ بڑھیا کا نہیں ہے تو پھر اور کس کا ہے!

آدمی۔ قصور اس علواً لکھانے والے سادھو کا ہے جس نے
 بچے کو نیچے آنا دیکھ کر جھٹکے لئے بھانہ لیا۔

راجہ۔ یہ بھی ٹھیک بات ہے۔ لیکن سادھو کہاں ہے اس
 کا پتہ دو نہیں تو اس کے عوض ہمیں پھانسی چڑھنا ہوگا۔
 آدمی۔ ہمارا ج! سادھو وہ... اس طرف بائیں کھنٹ
 پر کھڑا ہے۔

راجہ۔ چوہدار! اس پھر اسی کو پکڑ لاؤ!

(چوہدار سادھو کو لے آتا ہے)

چیلہ۔ اے واہ ہمارا ج، مجھے آپ کیوں پھانسی پر لٹکایا
 چاہتے ہیں؟

راجہ۔ چپ رہو جی! ہم اگت چکے ہیں اور اب کسی کا غدر
 سننے کو تیار نہیں۔ دن ڈوبنے کو آیا اور اب تک پھانسی
 پر ایک ہی نہیں چڑھا۔

(راجہ تختے اتر کر پھانسی کا پھندا اٹھائے بیٹا گیا)
 آواز میں۔ مہاراج ! مہاراج ! مہاراج !!
 (ایک ہی جھٹکے میں راجہ کا دم نکل جاتا ہے)

پانچواں منظر

(نغمی کے ایک درخت)

چیلہ۔ بس گرو جی، آپ کی کرپا سے سارا پاپ کٹ گیا۔
 گرو۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔
 چیلہ۔ اچھا گرو جی ! (گرو جی غائب ہو جاتے ہیں) گئے۔ ارر۔
 یہ بھی اوجھ ہلکا ہوا۔ ذرا دھوٹی میں سے ملو تو کھول
 لوں، کہیں ٹھنڈا نہ ہو گیا ہو۔ نہیں نہیں گرم ہے،
 آہ مزا آ گیا۔

(ایک بڑے درخت کی چھان میں بیٹھا ہے اور)

گائے لگ جاتا ہے)

جھوٹا سب سندر

پیارے

رین بسیرایہ دنیا ہے دم بھر میں دم پار
 کھانا ہے تو کچھ کھانی لے باقی دن دو چار

پیارے

جھوٹا سب سندر

(دوبارہ گرتا ہے)

گرو۔ تجھے تو ہم نے کتنا کھانا کھایا، اب یہی کچھ ہوتا ہے۔

چیلہ۔ یہ تو ٹھیک ہے گرو جی، اپراس دقت کچھ متین کیجئے۔

گرو۔ اچھا تو لا پھانسی کا پھندا ہمارے حوالے کر !

چیلہ۔ نہیں مہاراج ! اگر یہی بات ہے تو پھر میں ہی ٹھیک ہوں۔

گرو۔ ہٹ ذکر۔ پھندا میرے حوالے کر۔

چیلہ۔ اول ہوں، آپ پھانسی چڑھ گئے تو میں آپ کے بغیر

کیسے جی سکوں گا۔ مہاراج پھانسی میں ہی چڑھوں گا۔

راجہ۔ یہ جھگڑا کیسا ہے ؟

چوہدار۔ مہاراج ٹھنڈا یہ ہے کہ ایک کتا ہے کہ میں پھانسی

چڑھوں گا اور دوسرا کتا ہے میں چڑھوں گا۔

راجہ۔ کیوں سادھو کیا بات ہے ؟

چیلہ۔ مہاراج بات صرف سو رگ کی ہے۔

راجہ۔ سو رگ کی، وہ کیسے ؟

چیلہ۔ وہ ایسے کہ آج کے دن جو کوئی بھی پھانسی لگے گا، وہ

سیدھا سو رگ میں پہنچے گا اور جگوان اسے درخت دیں گے۔

راجہ۔ اچھا یہ بات ہے ؟

چیلہ۔ ہاں مہاراج یہ بات ہے۔

راجہ۔ اچھا تو لاؤ پھانسی مجھے چڑھنے دو۔

منترجی۔ مہاراج یہ آپ کیا کرنے لگے۔

راجہ۔ منترجی، تم دنیا کے لوگ اس میں دخل مت دو۔

چوہدار۔ مہاراج یہ کیا ؟

راجہ۔ چپ رہو !

جھوٹ

موت کے بعد سہانگی
 اور بھی اک زندگی
 جاودانی زندگی!
 غیر فانی زندگی!
 اک بہار بے خزاں
 اک نشاط بے کراں
 لذتیں، کیفیتیں!
 رختیں ہی رختیں!
 کتنا دلکش ہے یہ جھوٹ!

انقلاب

تو مائل جفا نہیں، کیا انقلاب ہے
 میں التفات خواہ نہیں، کتنا ظلم ہے
 تسلیم کر رہا ہوں کہ ننگِ وفا ہوں میں
 ہوں دست کش میں تیری محبت سے بیدار رہ
 میں ہوں مُصر کہ ظلم کی تجدید چاہئے
 تو کر رہا ہے میری محبت کا احترام
 وہ بدگمانیاں، وہ تغافل، وہ بے رُخی
 اب کیوں نہیں تسلسلِ وعدہ کا اہتمام
 میں قائلِ وفا نہیں، کیا انقلاب ہے
 تو صبرِ آرزو نہیں، کیا انقلاب ہے
 تو میرا امنوا نہیں، کیا انقلاب ہے
 اور تجھ کو کچھ گلا نہیں، کیا انقلاب ہے
 تجھ کو مگر رو نہیں، کیا انقلاب ہے
 اور مجھ کو اتنا نہیں، کیا انقلاب ہے
 وہ شیوہ جفا نہیں، کیا انقلاب ہے
 کیوں شوقِ التوا نہیں، کیا انقلاب ہے

غم اتنا بڑھ گیا ہے کہ مٹتا نہیں عدم

اب مے بھی غم رُبا نہیں، کیا انقلاب ہے

عدم

فلسفہ اور اس کے نقاد

سماج کی ترقی کا راز یہ ہے کہ بعض افراد انسانی اوسط سے ہمیشہ مختلف و ممتاز ہوتے ہیں۔ اب ان کا یہ اختلاف یا امتیاز چونکہ بیشتر نہایت جا ذیب توصیف یا معنی ہوتا ہے اس لئے ان کے قبائل انہیں اپنا قائد بنالیتے ہیں اور وہ یوں نئے نئے نصب العین قائم کرنے لگتے اور معصود یا محبوب خلافت بن جاتے ہیں۔

ایسے ہی لوگوں میں ان محدود افراد کا بھی شمار ہے جو نظریوں کے غیر معمولی دلدادہ ہوتے ہیں اور جن سے کوئی انسانی نسل خالی نہیں ہوتی، یہ لوگ ایسے معاملات میں حیران اور پریشان ہوتے ہیں جن میں دوسروں کو کوئی حیرانی اور پریشانی محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی عقل توجہات ایکاد کرتا، اور انہیں باہم ملانا دیتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے جہلہ علوم پر کافی عبور رکھتے ہیں، آئندہ کی باتیں بتلاتے ہیں، تمبیہیں کرتے ہیں اور عقائد کھلاتے ہیں، انہی کی کارگرداری کا نتیجہ فلسفہ ہے جو اشتقاق اور مادہ کے لحاظ سے "دانائی کی محبت" کا معنوم ادا کرتا ہے۔ ان سے وہ اشتیاق بھی دلی رغبت اور عقیدت رکھتے ہیں، ان کی باتوں کو سمجھتے ہیں اور ان کے عقائد پر یقین لاتے ہیں۔ اس طرح فلسفہ ایک نئی درجہ اور علوم کا ایک نہایت زبردست مجموعہ ہے۔ ایسی صورت میں اس سے کیا اور فلکیات میں مخصوص حکمتوں کو دیکھ کر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا مگر عام طور پر چونکہ مخصوص حکمتوں کو فلسفہ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اس لئے میں یہاں یہی تبادلوں کا کیا گیا کیا گیا مخصوص حکمتوں کو فلسفہ سے کال فیہ کے بعد باقی جو چیز بچ رہی ہے اس کو فلسفہ ہی شخص تعبیر کر سکتا ہے جبکہ اغراض نہایت وسیع ہوں۔ مخصوص حکمتوں کو جب فلسفہ سے خارج کر دیا گیا تو اس کی دست میں خاصہ فرق پیدا ہو گیا۔ اب وہ عبارت ہو کر رہ گیا صرف "فلسفہ"۔ کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی، اس کا منشاء کیا ہے، انسانی علم کی شرطیں کیا ہیں، عمل کے عام سے عام قواعد کون سے ہیں، دیوتاؤں، انسانوں، حیوانوں اور پتھروں میں کون عناصر مشترک ہیں، اور توجیہ کے ذرا اصول کون سے ہیں جو جملہ چیزوں کی تہ میں مستور ہیں، یہ وہ مسائل ہیں جو عام طور پر اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ مسائل خیال کئے جاتے ہیں۔ اور فلسفی وہ ہے جو ان کے تعلق بہت کچھ کتا اور کہہ سکتا ہے۔ متداول درسی کتابوں میں فلسفہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ "مشاہدہ کا ہشیار کی انتہائی عقلتوں کے ذریعے ایک ممکن الحصول علم ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ فلسفہ کا مقصد کائنات کی توجیہ ہے، اس کی جہر نہایت کا بیان نہیں۔ ایسی صورت میں کسی خیال کے فلسفیانہ ہونے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں:-

(۲) دوسری یہ کہ وہ ادراخالات سے زیادہ ربط رکھے۔ اور

(۳) تیسری یہ کہ اپنی صفائی میں وہ ایسے اصول پیش کر سکے جو قریبی یا وسطانی نہیں بلکہ انتہائی اور ہم گیر ہوں۔

اس اعتبار سے دنیا کا ہر ایک ہمدرد نظریہ فلسفہ ہے خواہ وہ مبہم ہی کیوں نہ ہو۔ یوں فلسفہ تصور کا ناسا ہے یعنی زندگی کی ایک عقلی حیثیت۔ پروفیسر ڈیوے لکھا ہے کہ فلسفہ عقل اور ارادہ کی مجموعی تربیت کا اظہار نہیں ہوتا کیونکہ اس تربیت کے حدود بہ عقلی نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ ان دونوں کے ایک خاص انداز، ایک خاص مقصد اور ایک خاص مزاج کی پختی کھاتا ہے۔ پروفیسر مونسٹن نے اس قول میں حیدر حقیقی فلسفوں کی ترکیب کو جس مبلغ پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اظہار کا شمس ہے۔

کوئی تعلیم اس وقت تک اعلیٰ کمانے کی سعی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں دو امر کا خاص اہتمام نہ ہو۔ ایک تو انسانی فکرمند کے جملہ مختلف مگر اہم شغلوں کے پورے علم کا اور دوسرے ان شغلوں کی موافق دلیلوں کے کامل وقوف کا۔ تعلیم لوں تو خشک ادعائی طریقوں پر بھی ہو سکتی ہے اور فلسفیانہ طریقہ پر بھی۔ لیکن ان میں جو فرق ہے وہ کمی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس شخص نے کسی فنی مسئلہ میں تعلیم پائی ہو وہ اس میں شک نہیں کہ بعض امور کو شبہی انداز میں انجام دینے کی بہترین صلاحیت اپنے میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن فطرتی محدود و صرف اعلیٰ تربیت و تہذیب ہی کا لازمہ ہے کہ کسی اس میں پایا نہ جائے گا۔ سو وہ زبردست ہے گا شائستہ کمی نہیں ہوگا۔ پھر عقلی اعتبار سے بھی اپنے مفہوم موضوع کی بکیر کو فیر ہوگا۔ معانی سے سروکار نہ رکھے گا، الفاظ پر جان چھڑکے گا۔ جو کچھ ایک مرتبہ دیکھ لیا اس سے اختلاف کے امکان کا قائل نہ ہوگا شغیل سے معذور، اخلاقی ماحول سے عاری، اور ذہنی تجربے سے عاجز اور قاصر رہے گا۔

فلاطون اور ارسطو کے قول کے بموجب فلسفہ جو کچھ جبر سے شروع ہوتا ہے اس لئے وہ ہر چیز کو اس کی حقیقت سے مختلف خیال کر سکتا ہے، وہ مانوس کو نامانوس اور نامانوس کو مانوس سمجھ سکتا ہے، وہ بہت سی باتیں اختیار کر سکتا اور پھر انہیں جچ سکتا ہے۔ اس کے سر میں ایک ایسا سودا سیا ہوا ہے جو اسے کمی بخلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ بلکہ ہر موضوع پر چھا جانے کے لئے یکساں آگستا رہتا ہے، وہ ہمیں اپنی پیدائشی ادعائی نمیند سے جگاتا اور ہمارے پختہ تصورات کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے وہ انسانی فکرمند کی اپنی چار مختلف قسموں کے باہمی تصادم کا نتیجہ ہے جنہیں ہم سائنس، شاعری، مذہب اور منطق کے ناموں سے منوم کرتے ہیں۔ اس نے سخت کوشش اور محنت طلب استدلال کے ذریعہ ایسے نتائج کی بے حد چھان بین کی ہے جو حیدر باقی لحاظ سے قابلِ قدر اور سودمند ہوں۔ انہی تمام باتوں کے پیش نظر اس سے کچھ نہ کچھ پس رکھنا اور اس کے اثر و نفوذ کو کھنچنا ادب اور حکمت دونوں کے متعلقین کے لئے کافی مفید ہے، اپنی شاعری کے ذریعہ وہ ادبی ذوق رکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن اس کی منطق انہیں بخیر کار باقی اور ان کی نزاکت اور سادگی دود کر دیتی ہے۔ اپنی منطق کے ذریعہ وہ ماہرین حکمت کی توجہ کو جذب کرتا ہے لیکن اپنے دھڑلے سے پہلو سے

لے فلسفہ اداسیت کی نسبت مرتبہ بالادوں میں فلسفہ کا تلامذہ فرمائیے۔ مصنف

ان میں ملائت پیدا کرتا اور انہیں اصطلاحات کی خشکی اور گراںبازی سے بچا لیتا ہے۔ لہذا ادب اور سائنس دونوں کے طلبہ کو چاہئے کہ وہ فلسفہ سے ایک زندہ جوش، ایک نئی قوت، اور ایک خوش ناپس منظر حاصل کریں۔ سچ اسٹون نے ایک دفعہ ایک گڈریسے سے پوچھا تھا: "ماں بچہ میں کچھ فلسفہ بھی ہے؟" اور یہ سوال ایسا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو دوسرے سے ہمیشہ پوچھتے رہنا چاہئے جس انسان میں کچھ فلسفہ نہیں وہ سخت منحوس اور بڑا بے فہم شخص ہے۔

باوجود ان تمام فائدوں کے جن کو میں نے سطور بالا میں گنایا ہے فلسفہ کے باقاعدہ دشمن بھی بہت سے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد کسی زمانہ میں اتنی زیادہ نہ تھی جتنی کہ آج کل ہے۔ اس کی کچھ ذمہ داری تو سائنس کی معین فتوحات اور فلسفیانہ نتائج کی صریح غیور و پختہ پرعایدہ ہوتی ہے اور ترقیہ انسان کے ذہن کی اس پیدائشی تاہماری پر جو اصطلاحات اور تجربات کا مضحکہ اڑانے میں ایک شیطانی لطف محسوس کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ بہت سوں کے نزدیک صرف مدرستی کی اصطلاحی برلی اور تصورات کے مترادف ہے۔ اشیاء کی ماہیت اور عقول کے عقلی فلسفی کے خیالات چونکہ ہمیشہ مبہم اور غمگین بنی ہوئے کرتے ہیں اس لئے اُسے ایک ایسے اندسے آدمی سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایک تاریک کمرہ میں اس سیاہ دہلی کی تلاش کر رہا ہے جو وہاں موجود نہیں اور اس کے پیش کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ مسلسل بجھنے اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچنے کا فن ہے۔

اس قسم کی دشمنی صرف ایک حد تک درست ہو سکتی ہے چنانچہ میں ذیل میں ان چند اعتراضوں کے جواب دینے کی کوشش کروں گا جو فی زمانہ رائج اور عام ہیں۔ ان کو میں سلسلہ سے یکے بعد دیگرے پیش اور رد کروں گا کیونکہ ان کے رفع کرنے میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہماری رسائی اپنے موضوع کے قلب کی گہرائیوں تک بآسانی ہو سکتی ہے۔

پہلا اعتراض:-

حکایتیں مشتمل اور سبب ترقی کرتی ہیں اور ان کے استعمال سے بے نظیر فائدے حاصل ہوتے ہیں لیکن فلسفہ نہ تو کوئی ترقی کرتا ہے اور نہ اس کے استعمال سے عملی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

اس کا جواب:-

یہ اعتراض ناانصفانی پر مبنی ہے کیونکہ مخصوص حکمتیں فلسفہ ہی کے درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔ جب سوالوں کے جواب معنوت کے ساتھ یعنی بالکل نئے نئے انداز میں ادا ہوتے لگے تو ان جوابوں کو ملکی کہا گیا اس طرح جس کو ہمارے زمانہ میں لوگ فلسفہ کہتے ہیں وہ ان سوالوں کا چھٹ اور مجموعہ ہے جو ابھی قطعی جواب کے شرمندہ نہیں ہوئے۔ نئیات اور حقیقتات کی محنتوں نے ابھی ابھی مادہ فلسفہ کی آغوش سے علیحدگی اختیار کی ہے اور اپنے استقلال کا جشن منایا ہے۔ ایک جانب اور مانع فلسفہ میں ہمیشہ مخصوص محنتوں کی تفصیلی جزئیات پر تمام کمال موجود نہیں ہو سکتیں کیونکہ وہ ان پر اپنا اتنا وقت صرف نہیں کر سکتا جتنا کہ کوئی مخصوص حکمت کر سکتی ہے۔

اس جگہ اگر ہم فلسفہ کے ارتقاء پر ایک سرسری نظر ڈال لیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ پہلے خطہ زمین کے ابتدائی فلاسفہ جہاں اعلیٰ عقل تھے وہ عام طور پر عقائد پر مبنی تھے۔ ان میں سے بعض پر مذہبی یا اخلاقی رنگ ہے جیسا کہ غالب تھا اور بعض اس سے باہر تھے۔ وہ نہایت حد پر دور تھے۔ ان میں تجسس اور کھوج کا مادہ حاضر عملی ضروریات کی حد سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کے سامنے مخصوص مسائل نہ تھے بلکہ وہ خود مسائل پیدا اور پیش کر رہے تھے۔ اس قسم کی بزرگ محترم اور دانشمند ہستیاں یوں تو چین، ایران، مصر و ہندوستان میں بکثرت ہو کر رہی ہیں لیکن جن عقائد نے مغربی قوت فکر کو حال تک اپنا بندہ بنے دام نہار کیا وہ سب یونان کی پاک اور موم خیز سرزمین کے سپور تھے، ابتدائی یونانی فلسفہ کی عمر تقریباً ڈھائی ہزار سال سے یعنی یہ دور ۶۰۰ ق۔ م سے ۴۰۰ ق۔ م تک قائم رہا۔ اٹالیا ہرقلیطوس، فیثاغورث، براہینڈس، انیکساگورث، اناکسگورث اور دیگر اہل اسی حد کی پیداوار ہیں۔ یہ سب کے سب برائیاں تھیں، سیاسیات، فلکیات، اور طبیعیات کے ماہر تھے گویا ان کے زمانہ کا پورا علم ان کا فائدہ زاد غلام تھا۔ فطرت اور اسطوٹ نے انہی کی روایات کو زندہ اور برقرار رکھا۔ اور قرون وسطیٰ کے فلسفیوں نے توان روایات کے اظہار کے واسطے کے سوا اور کچھ کام ہی نہیں کیا۔ اگر ہم ان کو اس کی اہلیات عامہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں ہر چیز کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ خدا ہے یا نہیں ہے۔ کرمہ ایک کوئی چیز ایسی چھوٹے نہیں پائی جس پر اٹھا خیال نہ کیا گیا ہو۔ فرشتے، انسان اور شیطان سب کچھ اس گھسٹ میں آگئے۔ علاوہ اس کے ہر چیز کے ساتھ دوسری چیز کے تعلقات پر معلوم کے ساتھ عالم کے تعلقات پر مختلفات کے ساتھ خالق کے تعلقات پر ضرور کے ساتھ جہاں کے تعلقات پر جسم کے ساتھ ذہن کے تعلقات پر اور خفا کے ساتھ گنہ کے تعلقات پر بھی کافی مضمون کی گئی ہے۔ اگر ہم اس کتاب میں فرائض اور اخلاق کے نظام کی اہلیات کی اور نفسیات کی جملہ جزئیات بہ تمام و کمال بیان کر دیں گے تو طبیعیات اور منطق سے البتہ زیادہ اہم نہیں کیا گیا۔ بلکہ صرف ان کے کئی اصول قائم کر دیئے گئے ہیں، اس کتاب کے مطالعہ کا قاری پرہیز کرتا ہے کہ وہ اس کے صنف کو مافوق الانسانی عقل کا ایک سمجھنے لگتا ہے لیکن ان کو اناس نے واقعات یا مفروضہ واقعات سے بحث کرنے کا ہر سبب اختیار کیا ہے وہ آج کل کے رائج اسلوب کے بے حد مختلف ہے۔ اس نے ہر چیز کو یا تو مفروضہ عقلی اصولوں سے ثابت اور منطقی کیا ہے یا پھر کتب مقدس سے مثال کے طور پر اجسام کے خواص اور تزیینات کو لے کر جہاں کی توضیح اس نے اسطوٹ کی تعلیم میں مادہ اور صورت کے ذریعہ کی ہے۔ مادہ ذی کثرت، تعین پذیر اور انفعالی عنصر تھا اور صورت ذی کمیت، تعین بخش، اور نفی۔ یہ نوعیت کی ایک غایت تھی اور اشیاء ایک دوسرے پر اسی وقت عمل کر سکتی تھیں جب کہ وہ ایک دوسرے سے متصل ہوتی تھیں۔ اشیاء کی انواع کی تعداد مبینہ تھی اور ان کے اختلافات مستقل تھے وغیرہ وغیرہ۔

لے جے۔ ریگول کی تصنیف، اہلہ طبیعیات، علامہ طوریکہ، ایک سیرگاہ ایڈیٹر، میں مدرس ہانس کوپلر کے فلسفہ فطرت کی ماہرین کا پیش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کتاب "مدینہ کی مبادی طبیعیات" (علامہ کپلر) میں بہت زیادہ تفصیلات مذکور ہیں۔ (مصدقہ)

مترجمین صدی کی ابتدا کے ساتھ ہی لوگوں میں مدریت کی مخالفت کا رجحان عام ہو گیا۔ وہ اس کے دقیق حضورِ اسلامیؐ کے اکتا گئے مولویز کے رسالے بھی مخالفت کی اس آگ کو بجھانیں سکے۔ ڈی کارٹ کے فلسفہ نے اگرچہ مدرسی تعلیمات کو یخِ ذہن سے اکھاڑ پھینکا اور ریورسپ کے علمی مطلع پر حیرت انگیز سرعت رفتار کے ساتھ چھا گیا۔ لیکن اس میں پھر بھی ہمہ گیری کی وہی پچھلی روح کا کم کر رہی ہے، ڈی کارٹ کو ہم اس زمانہ میں ایک ایسا ماہرِ ابدالِ طبیعیات جانتے ہیں جس نے سن انڈیٹیم پس منہم کہہ کر ذہن اور مادہ کے تضاد کو اہر میں فرق کیا اور خدا کی ہستی کا ایک نیا ثبوت ہم پہنچا یا لیکن اس کے ہم عصر اس کی نسبت وہی رائے رکھتے تھے جو آج کل ہم ہر برٹ اسپنسر کی نسبت رکھتے ہیں یعنی وہ ایک ایسا شخص سمجھا جاتا تھا جو کائنات کی ارتقار کا قائل تھا اور جس نے مادہ کو پھر سے مادہ و قدرت میں تقسیم کر کے اور انصدام کے قوانین سے کام لے کر انلاک کی گردش کی، خون کے دوران کی جسم اور ذہن کے ارتباط کی طرح کے غفلت کی اور نور کے اخراج کی توجہ با حسن الوجہ کر دی۔

ڈی کارٹ نے ۱۶۵۰ء میں وفات پائی اور لاک کی کتاب فہمِ انسانی ۱۶۹۰ء میں شائع ہوئی اس کی اشاعت سے فلسفہ کی تاریخ کا ایک پھل بنایا اب کھلاویہ بابِ علمیات کا متناجس پر غور کرنے سے فلسفہ تنقیدی بنتا گیا۔ ہر چند کہ لائبِ زو جیبے آفاقی مائل کا دبستان ہمہ گیری کی روایت کا پورا پورا حامل تھا اور دولتِ طبیعی اور اخلاقی مباحث پر متعدد رسالے تصنیف اور شائع کئے تھے لیکن یہ منوعی رجحان پھر بھی ترقی پانامہ لاک نے اپنا ستارہ ہیروم کے حوالہ کیا جس نے اپنی تخلیق سے کائنات کو اذعانیٰ فیئد سے جگایا۔ کائنات کے زمانہ سے فلسفہ کا لفظ طبیعی نظریوں سے زیادہ عقلی اور اخلاقی قیاس آرائیوں پر دلالت کرنے لگا چنانچہ حال حال تک فلسفہ کو ”ذہنی یا اخلاقی فلسفہ“ یا صرف ”انسانی ذہن کا فلسفہ“ کہا جاتا تھا تا کہ اس میں اور فلسفہ فطرت یا طبیعیات میں امتیاز قائم رہے۔

لیکن قدیم روایت بہتر بھی ہے اور مکمل بھی جس دنیا میں ہم رہتے سنتے ہیں اس کی خصوصیات کا جاننا اتنا ہی اہم ہے جتنا یہ جاننا اہم ہے کہ وہ ممکن کیسے ہے؟ اس کے باوجود کائنات کے بیشتر متاخرین کا خیال تھا کہ مقرر الذکر علمی صحیح منسل میں فلسفیانہ علم ہے۔ عام انسان اس سوال کو کہ فطرت کیسی ہے؟ اتنا ہی دلچسپ سمجھتے ہیں جتنا کائنات کے اس سوال کو کہ فطرت ممکن کیسے ہے؟ لہذا فلسفہ اگر انسانی انتفا سے محروم نہیں ہونا چاہتا تو یہ ضروری ہے کہ وہ موضوعیت کی بیرونیوں کو اتار پھینکے اور عاقلی دنیا کی طرف متوجہ ہو۔ کیونکہ موضوعیت کی طرف لوگوں کا میلان بڑھ رہا ہے۔

فلسفہ کے حقیقی معنی انسانی سوچ کے ہیں، یہ سوچ علمی کلیات سے تعلق رکھتا ہے جو دنیا سے نہیں۔ لیکن اس کا تعلق خواہ کلیات سے ہو یا جزئیات سے انسان کے سوچنے کے اسالیب ہمیشہ یکساں رہے ہیں، وہ ہمیشہ مشابہہ کرتا ہے، امتیاز کو بروئے کار لاتا ہے، تنہم سے کام لیتا ہے، تہیب کا عمل انجام دیتا ہے، اصل کا متلاشی رہتا ہے، مائلتوں کا پتہ لگاتا ہے اور امتزافات ترتیب

دیتا ہے لیکن فلسفہ کو اگر سائنس سے مختلف خیال کیا جائے تو پھر اس کا کوئی خاص اسلوب نہیں رہتا۔ ہمارا کتابت مائے معجزہ و منعمت میں نہیں ہے اس نے تائید دم کئی پٹے کھائے ہیں جن میں سے دو نہایت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے یقیناتی کے انہار میں وہ پرنیش کرنے لگا اور دوسرا یہ کہ ان کی تصدیق اور توثیق کے کھوج کا عادی ہو گیا۔

اس جگہ اگر ایک سرسری نظر کر کے ارتقاء پر ڈال لی جائے تو مناسب ہوگا کہ چونکہ اس سے نہیں یہ پتہ بہ آسانی مل جائے گا کہ ہمارا فکر کن جھولن سے بہتا ہوا موجودہ حالت کو پہنچا ہے۔

آگست کومت ایک فرانسیسی فلسفی ہے، اس نے ایک فلسفہ ایجابی فلسفہ کے نام سے مرتب اندیش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسانی فکر کے بعد دیگے تین مرحلوں سے گزرا ہے گزرتا ہے۔ پہلا مرحلہ الہیات کا ہے دوسرا بالبعاد الطبیعیات کا اور تیسرا علمیات کا۔ الہیات مرحلہ میں وہ مظاہر کی توجہ محض پریت کے ذریعہ کرتا ہے کیونکہ وہی اس کے نزدیک ان مظاہر کے منب ہیں۔ بالبعاد الطبیعیات مرحلہ میں وہ مظاہر کے ذاتی خواص کو محض و تقصیرات کی صورت میں تبدیل کرتا اور یہ ماننا ہے کہ وہ مظاہر کی توجہ کئے دیتے ہیں اور حکمیاتی یا ایجابی مرحلہ میں وہ مظاہر کو سائنٹفک طور پر یعنی سیدھے سادے انداز میں بیان کرتا ہے، یوں گردش سیارگان کا الہیاتی نظریہ یہ ہوگا کہ سیارے ارواح عالم ہیں اور انسانی قسمت کا دروست ان کے اختیار میں ہے بالبعاد الطبیعیاتی نظریہ یہ ہوگا کہ ان میں کشش ہے اور ایجابی نظریہ یہ کہ وہ کلیہ مرئیات کے تابع ہیں۔

کومت کا بیان نہایت پاتلا ہے۔ چنانچہ انسانیات کا مطالعہ شہادت دیتا ہے کہ انسان نے ابتدا میں الہیات اور بالبعاد الطبیعیات کو بطرح لکڑیا کر دیا ہے۔ معمولی چیزوں کے لئے اس کے نزدیک کسی توجہ کی ضرورت نہ تھی، انوکھی چیزیں مثلاً موت، مرض اور مصیبت البتہ ایسی تھیں جنہیں توجہ طلب سمجھا جاتا تھا۔ اشیاء کی پراسرار قوت ان کے اثر کی ذمہ دار تھی جو چیز مضمینی زیادہ خوفناک تھی مضمی، اتنی ہی یہ پراسرار قوت اس میں زیادہ پائی جاتی تھی۔ ہر بڑی چیز میں یہ ”مستن“ و ”لادنا“ موجود ہوتا تھا۔ لہذا انسان نے قدیم زمانہ میں جو ہر فلسفہ مضمی وہاں ”ہم احساسی سحر“ کہلاتی ہے یعنی اگر آپ کسی چیز پر اثر ڈالنا چاہتے تو یہ لازمی تھا کہ آپ کو فی ایسی چیز حاصل کرتے جو اس کے ساتھ رہ چکی ہے یا پھر اس کے مشابہ ہے۔ اس طرح اگر آپ اپنے دشمن کا پٹکا بناتے یا اس کے کھربال یا ناخن یا ایسی چیزیں مسلسل کر سکتے یا اس کا نام ہی کسی پرچہ کاغذ پر لکھتے اور اس کو جلاتے یا اور طرح کی تکلیف دیتے تو آپ اپنے دشمن کو نقصان پہنچا سکتے تھے گویا

لے جی۔ ایچ۔ لیس کی کتاب ”ارسطو“ کا باب چارم دیکھئے۔ مصنف

لے فلسفہ ایجابی۔ چھ جلدوں میں۔ مطبوعہ پیرس۔ ۱۸۲۰-۱۸۲۲۔ مصنف

لے کمونشیائی زبان کے گھرانے میں ایک زبان پالی نیشیائی ہے جس میں اسی پالی نیشیائی زبان کا ایک نقطہ ہے جو انڈونیشیا کے تھیا مشدوں کا عام مقبول فکر و نظر ہے جس میں اور ہر وقت میں ایک پراسرار قوت پائی جاتی ہے جس کا مجرم سے دو چار ہیں کر سکتے ہیں یا وقت کے بعد ان چیزوں کو انہار میں لے کر منسب کہلاتی تھی۔ مقدم

نام مقام کو نقصان پہنچانا اصل کو نقصان پہنچانا تھا۔ اسی طرح اگر آپ بائیں تو زمین پر چھوڑ کر لے کر ہوا چاہتے تو سبھی بھانے و طیف کھٹ کر آپ کی یہ خواہش ہوتی کہ آپ کے باغ میں اردیاں خاطر خواہ پیدا ہوں تو یہ مزدوری تھا کہ آپ ایک ایسا پتھر باغ میں نصب کرتے جو اردی کے مائل ہوتا۔ اگر آپ یہ قنار کا علاج کرنا چاہتے تو مریض کو ہلدی استعمال کرانی پڑتی جو اشیا کو پیلے رنگ میں رنگ دیتی ہے یا اگر درد و سر کا علاج مقصود ہوتا تو آپ کو شمشاد کا نسخہ تجویز کرنا پڑتا کیونکہ اس کے ڈوڑے سر کے شراب ہوتے ہیں بغیر شک و شکایت کا یہ نظریہ طب کی شروعات میں بے حد راجح تھا اور اسی پر وہ جملہ علوم و فنون متفرع ہیں جن میں سائنس اور تجربے طرح گھلے گئے۔ پہلے ہوتے ہیں، ہم احساسی کے نظریہ کا وجود ہمارے زمانہ میں بھی ہے۔ عملی فلسفہ کے ایک موجودہ مذہب کہ یہ دعویٰ ہے کہ انکار اشیا میں یعنی یہ کہ جو چیز آپ چاہتے ہیں اس کے خیال کو اگر آپ تقویت دیں اور ہر موقع و محل پر اس خیال کا اظہار کرتے رہیں تو اس سے ہوگا کہ اس کے مائل خیالات کہیں اور سے اس کی مدد کو آئیں گے اور آپ کی خواہش پوری ہو جائے گی، واضح رہے کہ یہ مذہب مجرعی حیثیت سے ایک نفیس مذہب ہے۔

اس کے بعد غور و فکر کے نسبتہ انجانی طریقے راجح پاتے گئے، مظاہر کے شریک عناصر کی چٹائی اور چھانٹ شروع ہوئی اور ان سے قیمتا مرتب کی گئیں لیکن پہلے پہل ان عناصر کو زیادہ ڈرامائی بننا پڑا۔ اشیا یا تو گرم ہوتی تھیں یا سرد یا خشک یا تر کھٹ و عطر کی قسم طبی اور فیزیکی۔ افکار و ازلوں میں گردش کرتے تھے کیونکہ دوسری حرکت اکل حرکت تھی۔ بیرم کی توجہ میں اس کے لئے بازو کی حرکت کو ہلنے سے مستلزل بنایا گیا۔ مؤدج سرماییں جنوب کی طرف اس لئے سرک جاتا تھا کہ سردی سے محفوظ رہے۔ قیمتی اور خوبصورت چیزوں میں خاص غور و دلوریت تھی۔ مور کا گوشت سردانہ قبول نہ کرتا تھا اگر مقناطیس کے قریب اعلیٰ درجہ کا الٹس لایا جاتا تو وہ اپنے سینہ سے چٹائے ہوئے لوہے کو فوراً ڈور کر دیتا تھا۔ ولس علی ہذا۔

یہ خیالات آج ہمیں بے سرو پا معلوم ہوتے ہیں لیکن سوچئے کہ اگر ہمارے علم دوست اجداد ہماری رہنمائی کے لئے کوئی فنش کوئی نقش پا کوئی لکچر نہ چھوڑ جاتے تو ہمارا کیا حال ہوتا؟ سترھویں صدی کے آغاز تک انسان نے آج کی نہ لی۔ پرانی لکیری کو پیٹا کیا۔ ہم میں سے چند ہی کو یہ معلوم ہوگا کہ سائنس کتنی کم عمر ہے۔ آج سے تقریباً چار سو سال پہلے کو پرنٹنگ کی سیراوی نظریہ کسی کے شان لہ کر کوئی صاحب اس موضوع پر تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہیں تو انہیں جانے کہ پرنٹنگ مینور و فینور سے رجوع کریں۔

قدیم ہر احساسی حیر کے باوجود ذیل کی کتابوں کا مطالعہ فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ (۱) فنیات کے داتھی ہوروات ذی اجرا۔ انسے جین و فنیات کے بائبل کی سفارش کی جاتی ہے۔ (۲) تاریخ مذہب کا مقدمہ مصنف الیٹ۔ جیز خاص کر باب جام و ان مطالعہ ہے۔ (۳) شاخ فنیات، مصنف ہے۔ جی۔ فریزر۔ (۴)

باب مذہب از آرکٹر میریٹ اور (۵) اے۔ ہاؤ۔ جوہر کے کائنات رسالہ The New Moon میں جلد ۱۶ ص ۷۵۴۔

گمان میں نہ تھا۔ خون کے دوران کا، ہوا کے وزنی کھارات کے ایصال کا اور حرکت کے قوانین کا کسی کو علم نہ تھا۔ معمولی پپ تجویہ کی دسترس سے باہر تھا گھڑوں کا کوئی وجود نہ تھا، تپش یہاں تھا، تھے، تجاذب عامرے کوئی واقعہ نہ تھا، ڈونکا کی عمر پانچ ہزار سال تھی مٹاروں پر اور لوح کا تصرف تھا اور موسیٰ، مادوگری اور نجوم ہر ایک کے اعتقادات میں داخل تھے۔ جدید سائنس کی ابتدا ۱۶۰۰ کے بعد ہوئی ہے اور کپلر، گیلیلی، او، ڈی کارٹ، نیوٹن، پل، ہاروے، نیوٹن، ہوتی گنس اور بوائل اس کے بانی مانی ہیں۔

استخلاص کے یہ داعی حقیقی سمنوں میں فلسفی تھے یعنی سنساری عقلا، چنانچہ گیلیلی اوگستا ہے کہ اس نے جتنے برس فلسفہ پر صرف کئے اتنے جیسے ریاضیات پر نہیں کئے، ڈی کارٹ فلسفہ سنساری فلسفی تھا۔ لیکن جدید خیالات نے حقیقت کے بعض خاص شعبوں کو اتنی ترقی دی کہ وہ تفصیلات سے بہت زیادہ گراں بار ہو گئے، اتنے زیادہ گراں بار ہو گئے کہ سنساری ذہن ان کا احاطہ نہ کر سکے۔ اس طرح میکانیات، فلکیات اور طبیعیات کی حکمتیں فلسفہ سے جدا ہوئیں۔ ان ہمہ گیر فلسفیدوں نے جن کے نام میں نے اوپر لکھے ہیں فلسفہ کے ریاضیاتی پہلوؤں پر بہت زیادہ زور دیا ہے کیونکہ یہ پہلو سودمند بہت تھے چنانچہ انہی کی بدولت گیلیلی او، پل، بوائل، نیوٹن، اور ڈی کارٹ نے وہ عظیم الشان انکشافات انجام دیئے جنہوں نے ان کا نام ہمیشہ کے لئے امر کر دیا، بارہا کی بندہ کی کے ساتھ ارتقاء کی مناسبت (پل،) فاصلہ کے ساتھ اسراع کی مناسبت (نیوٹن) دباؤ کے ساتھ ہوا کی دباؤ کی مناسبت (بوائل) اور صرف شعاع کے جیب التمام کے ساتھ اس کے جیب کی مناسبت (ڈی کارٹ) یہ سب فلسفہ کے ریاضیاتی پہلو کی پیداوار ہیں۔ فطرت کے بحث کرنے کے اس نئے طریقہ میں عوامل یا ہم احساسی کے خیالات کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ طریقہ متلازم تغیرات کا طریقہ تھا ادولس کے استعمال سے علم کی قسمیں دو ہوئیں (۱) سائنس (۲) عام فلسفہ۔ سائنس میں اپنے تھے اور معین قوانین رولج پانے لگے اور فلسفہ نے انہیں قبول نہیں کیا۔ اس واقعہ نے وہ ذہنیت پیدا کی جو آج اجمالی کمالی ہے اور جس کا لغو ہے فلسفہ مردہ پاؤں! اس ذہنیت کے لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں ضرورت صرف قابل چیلن واقعات یعنی مظاہر کی ہے، ذہن کی تعبیرات اور توجہات دو کا نہیں، اھ یہ اوسراض انہی کا ہے کہ فلسفہ نے کوئی ترقی نہیں کی!

مگر جب فلسفہ کا وہ دوا خاجن کالیک جواب متعین ہو جاتا ہے فلسفہ نہیں رہتا بلکہ سائنس یعنی کوئی ایک "یات" بن جاتا ہو تو فلاس ہے کہ صرف وہی مسئلہ فلسفہ کالیکس گے جن کا ابھی کوئی قطعی جواب تجویز نہیں کیا گیا اور وہی رہا ہے اس طرح فلسفہ کا اطلاق اب ایسے سوالوں کے مجموعہ پر ہونے لگا ہے جس کے معین جوابات معرض وجود میں نہیں آئے۔ اب اگر ان سوالوں میں سے بعض کی عمر دو ہزار سال کی ہے اور وہ اجمالی قطعی جوابوں کے منت کش نہیں ہوئے تو اس کے یہی نہیں کہ وہ کبھی قطعی جوابوں کے منت کش ہونگے ہی نہیں۔ دو ہزار سال کا عمر مہم ہادی فانی عمروں کے لحاظ سے معلوم بہت بڑا ہوتا ہے مگر یہ وہ اصل میں ایک لمحہ مختصر کیونکہ انسان کی عقل آرائی کی عمر اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ گذشتہ تین صدیوں کی غیر معمولی ترقی کما اور صرف ریاضیات کے استعمال میں

معنہ ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ فلسفہ بھی میکانی یا ریاضیاتی ہو جائے حقیقت مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے اور اسے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے رہنا چاہئے لیکن اگر ہم یہ چاہیں کہ ہر چیز کو ریاضیات کی مینٹک دیکھیں تو اس کا مطلب یا تو یہ ہوگا کہ ہم ریاضیاتی محنتوں کے سوا کسی اور چیز کو دیکھنا ہی پسند نہیں کرتے یا پھر یہ کہ حقیقت کی جائز آزادی پر بے باقیو دعا دکر رہے ہیں ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی فعل منصفانہ نہیں۔ روحانی سوالوں کو حل کرنے کے اچوک فلسفیانہ طریقے بھی رفتہ رفتہ دریافت ہو جائیں گے ہیں مستقبل سے ایس نہیں ہونا چاہئے۔

بعض بھانوسائنس نے فلسفہ کے مقابلہ میں بہت کم ترقی کی ہے، اگر ارسطو اور ڈی کارٹ کو پھر سے دنیا میں آنے کی اجازت کسی نہ کسی طرح مل جائے تو سائنس کے عام ترین تصورات ان کے لئے نئے اور حیرت انگیز نہیں ہونگے۔ وہ عناصر سے اشیاء کی ترکیب کے خیال سے موجودات کے ارتقاء کے تصور سے بقائے توانائی کے اصل الاصول سے اور نہ گہرے تجربت کے مسئلہ سے نا آشنا نہیں ہوں گے، البتہ فردینس، برقی روشنی، ٹیلیفون (دورگو)، ہوائی جہاز، لاسکی، زہر طی گیس، آہنی قلعے، ریڈیو، ٹیلی وژن (دور نظری)، اور محنتوں کی ذیلی چیزیں ان کے لئے ہیبت ناک چیزیں ہوں گی اس کے برعکس اگر وہ بالبطیبت کی عید نکالوں گا یا ہمارے فلسفیانہ کچھ روم کا معاینہ کریں تو ہر چیز ان کے لئے عجیب عجیب ہوگی۔ ہمارے زمانہ کا تصوری یا انتقادی انداز ان کے لئے بالکل ناگوار ہوگا۔ اور اس کا اعادہ کرنے کے لئے انہیں ایک زمانہ درکار ہوگا۔

دوسرا اعتراض :-

فلسفہ چمکی ہے۔ وہ صرف عقل کے ذریعہ مہات امور کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے، حالانکہ حقایق کے حصول کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ تجربہ کو حاضر راہ بنایا جائے، سائنس نے اسی طرح ترقی کی ہے، وہ واقعات کو اکٹھا کرتی ہے۔ انہیں الہام میں تقسیم کرتی ہے اور ان کی تعمیل انجام دیتی ہے فلسفہ اس طرح عمل نہیں کرتا اور گرد کارواں کی طرح سدا منزل مقصود سے دور رہتا ہے۔

اس کا جواب :-

یہ اعتراض تاریخی حیثیت سے وزنی ہے کیونکہ بیشتر فلسفہ نے فلسفہ کے ایسے ظلمات میں گم ہونے کی بجائے فلسفہ میں جنہیں بے خطا ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور جن کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قبول یا رد جو بھی کئے جائیں پورے کے پورے کئے جائیں۔ برعکس ان محنتوں کا حال یہ ہے کہ وہ اختراعات استعمال کرتی ہیں۔ مشاہدہ و اعتبار کے ذریعہ ہمیشہ ان کی تصدیق اور توثیق چاہتی ہیں، اور غیر محدود طور پر ان کی محنت اور ترقیم کے لئے تیار رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کے زمانہ میں حکیم پرستوں کی کوئی نہیں سنتا۔ ان کے لئے اپنے

لے جبر وادھے سال ماٹھر دج ۱۵، شمارہ ۵۵، میں ارتقاء فلسفہ کے عنوان سے جو نقیض مضمون جو اظہر کیا ہے وہ اس مضمون ہی پر توجہ لائق ملاحظہ کیوں کہ اس بارے میں

(مصنفت)

اس نے مجھے بہت کچھ یاد دلایا ہے اور حق یہ ہے کہ خوب کام ہے۔

نظموں کی قطعیت کا دعویٰ کرنا اور تعلیم یافتہ طبقہ میں قبول عام پانا سخت دشوار ہو گیا ہے افترض اور تصدیق سائنس کی خاص چیزیں ہیں۔ اور ان چیزوں نے علمی طبقوں کی نگاہوں میں ایک خاص اعتبار پیدا کر لیا ہے۔

مگر فلسفہ اور سائنس کے بنیادی ذوق کو نظر انداز کر دینا پھر بھی ایک بڑی جرأت ہوگی کیونکہ فلسفی معاملات دنیوی پر ایک وسیع انداز میں نظر کرتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اسے ہر سبب کے استعمال کی آزادی حاصل ہو۔ فلسفہ کو محنتوں کی حکمت اسی لئے کہا جاتا ہے۔ پھر بھی فلسفہ اگر بحکیمیت کو چھوڑ دینے پر مجبور نہ رہ سکتا ہے تو اسے لازم ہے کہ وہ افترضی بننے کی کوشش کرے۔

تیسرا اعتراض :-

فلسفہ کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ زندگی کی ضرورتوں سے نہیں بلکہ باہر تجربات سے سروکار رکھتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا ہر دم بدلتے رہنے والی، تکلیف دہ، اور پیچیدہ ہے لیکن بلا استثناء ہر فلسفی یہی کہتا ہے کہ وہ عمدہ، بسیط، اور کامل ہے۔ سو تیسرا اور شپن ہارٹ نے فلاسفہ کا جو مذاق اڑایا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک لاعلمی و رعایت کے مریض ہیں، شپن ہارٹ کی کامیابی اور ہر دلعزیزی کا راز صرف یہ ہے کہ اس نے اپنے نفس اور دوسروں کے نفوس کو دھوکا نہیں دیا۔ اور زندگی کی ہتھوڑوں اور ہڑبائوں کو چھپایا نہیں۔

اس کا جواب :-

یہ اعتراض بھی تاریخ حیثیت سے کافی وزنی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا یہ کیوں فرض کر لیا گیا کہ فلسفہ آئندہ بھی حقیقت یا زندگی سے ایسی ہی چھوٹ برتنے گا، وہ جیسے جیسے ترقی کرتا جائے گا ویسے ویسے اس کے طور طریق بدلتے جائیں گے۔ موجودہ مردہ تجربات کے بعد یقیناً زندگی تفسیرات کا دور آئے گا کیونکہ زمانہ بہترین مصلح ہے۔ وہ ایسے اسباب اور اسباب خود مینا کر دے گا جن کی زندگی تفسیرات کی تعمیر میں ضرورت ہوگی لہذا فلسفیوں کو آخر میں زندگی کی تکنیکوں سے ویسا ہی قرب حاصل ہو جائے گا جیسا قرب کہ واقعتاً پسند ناول نگاروں کو حاصل ہے۔

خاتمہ :-

ابتداء میں فلسفہ کا لفظ کائنات کے مکمل علم کا منہم ادا کرتا تھا اور وہ آج بھی اسپنسر کی زبان میں "وحدت یافتہ علم کا نظام" بن سکتا ہے۔ ضرورت صرف مختلف محنتوں کے نتائج میں مطابقت پیدا کرنے کی ہے اور یہ کچھ مشکل نہیں۔ لیکن آج کل فلسفہ سے مابعد الطبیعیات یعنی علم اور وجود کی حکمت مراد لی جاتی ہے، جو محنتوں سے جتن تناقض رکھتی ہے لہذا پہلا منہم ہی کچھ زیادہ عمدہ اور دل لگتا ہے کیونکہ وہ سائنس، مابعد الطبیعیات، اور مذہب تینوں کو ملا سکتا ہے اور ایک زیادہ شاندار تصویر دنیا کی پیش کر سکتا ہے۔

لیکن اس منہم کی طرف رجوع کرنے کا کوئی محال کوئی رجحان یا امکان نہیں۔

مرزا محبوب بیگ

(ترجمہ بہ قلم مرتب)

غزل

پھر ذوق تماشا کو مرہون اثر فرما
 فرصت ہو تو دل پر بھی پھر قصدِ نظر فرما
 جب جانِ فد اکروں تو عشق کو بھوکا کر
 جب میری خبر آئے تو شرحِ خبر فرما
 یہ تیری خموشی بھی گوین تکلم ہے
 مشتاقِ تکلم سے کچھ پھر بھی مگر فرما
 فرمانِ سحر تیرا ہر شام پہ جاری ہے
 یارب شبِ غم کو بھی تاکیدِ سحر فرما
 فانی نے تجھے چاہا تو بند و نوازی کر
 فانی نے خطا کی ہے تو قطعِ نظر فرما

فانی بدایونی

مرز دور خدا کے حضور میں

جب یہ بندہ اپنے رب کے پاس جا کر روئے گا
 حاملانِ عرشِ اعظم کو رُلا کر روئے گا
 جب یہ اہل خانہ کے فاقے جتنا کر روئے گا
 جب یہ اپنی داستانِ غم سنا کر روئے گا
 اپنا خالی پیٹ مولا کو دکھا کر روئے گا
 انتہائے درو و غم سے بلبلا کر روئے گا
 نوحِ انسانی کی پامالی سنا کر روئے گا
 ابنِ آدم کی ستم رانی بت کر روئے گا
 اُن کی دولت کی فراوانی جتنا کر روئے گا
 اپنی محرومی کے افسانے سنا کر روئے گا
 جب یہ اپنی نیمِ سریانی دکھا کر روئے گا
 جب اسے داورِ کلیجے سے لگا کر روئے گا

چیخ اُٹھے گا آسمان کا ذرہ ذرہ۔ انقلاب

انقلاب اے ساکنانِ بزمِ دنیا انقلاب

اقبال

ذیل کی نظم ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو یومِ اقبال کی تقریب پر پڑھی گئی۔

عقل کی برم میں ہے عشق کی روشن قندیل	ترے اعجاز سے اے واقف اسرار و رموز!
عشق سے وحدتِ اقوام و مل کی تشکیل!	عشق افراد کو پیغامِ حیات جاوید!
جس کی موجیں ہیں فراتِ جہن و جلدہ و نیل!	تری کشتی کو ہے وہ تسلیم زخارِ سپند!
کارواںِ دہر ہے انغمے ترے آوازِ جبریل!	نوعِ انساں ہے تری قوم، وطنِ تیرا جہاں!
راہِ گم کردہ کو شعلِ ترے افکارِ جمیل!	پاشکتہ کو تری صوتِ خودی بانگِ در!
چشمِ نمناک تری دولتِ عرفاں کی کنیل!	دلِ پُرسوز ترا جنسِ محبت کا میں!
صرفِ بیباک ترا ہمتِ عالی کی دلیل!	نگہِ پاک تری آئینہٴ حسنِ بقیں!
ترے قبضے میں خودی کی ہے وہ شمشیرِ صیل!	جس کی بُرش میں نہاں ہے اثرِ ضربِ کلیم!
جس سے ہوتی ہے عیاں فکرِ بشر کی تکمیل	کر دیا فاش زمانے پہ وہ رازِ ہستی

”ترا اندازِ سخن شائد زلفِ الہام“

(غالب)

تری رفتِ قلمِ جنبشِ بالِ جبریل!

حفیظ ہوشیار پوری

خیالات پریشاں

حکمت یہ نہیں کہ ہم زندگی کو دکھیں بلکہ یہ کہ ہم زندگی کو پرکھ لیں۔

اکثر لوگوں کی دوستی اتنی گہری نہیں ہوتی جتنی اُن کی نفرت سخت ہوتی ہے۔

اُو آؤ ہم دیکھ رہ گئے۔ کیا تم گھنٹہ بجنے کی آواز نہیں سننے؟

وقت چھپن لیتا ہے بہت سی ایسی چیزیں جو کبھی خوشیاں تھیں اور انہیں تبدیل کر دیتا ہے مصیبتوں میں۔

میں سمجھتا ہوں کہ صنعت کی لاکھوں ایکڑ کویتی کو جوت کر پامال کر دیا جاتا ہے جب کہیں جا کر ہمارے نقش و نگار کی ابتدا ہوتی ہے۔

کسی بڑے کام کو سر انجام دینے کے لئے انسان کو نہایت محنتی ہونے کے ساتھ ہی کبھی بھی بیکار بھی رہنا چاہئے۔

ازدواجی زندگی میں لے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ ہم آہنگی کی۔

دانا فی انسان کے پاس خود چلی آتی ہے خواہ وہ اس کی خواہش کرے یا نہ کرے۔

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ خوف نے میری صحیح رہنمائی کی ہو میں نے سینکڑوں بار اس کی مطابقت کی مگر انجام کار دشمن ہی ہونا پڑا۔

ہم انہیں تو صاف کر سکتے ہیں جن سے ہم گمان گئے ہوں، مگر ہم انہیں ہرگز صاف نہیں کر سکتے جو ہم سے گمان گئے۔

غلام حسین (لاہور)

(نثر و جملہ)

جو کیا گیت

چنتا من سے گئی، نیند نین سے سُدھ لورے شام منوہر پیاے

کوک کوئل کی بھالے مارے

لگن بیچ جس کال پکارے

آٹے برہا کے باد رکاے

گیدھ گرین جس پنکھ سپاے

لے چنتا منی سکون پین۔

لے لگن منی آسمان

لے کال منی موت

چنتا من سے گئی، نیند نین سے سُدھ لورے شام منوہر پیاے

برہ آگن کے بھاؤ ہیں نیارے

نین بہاؤے جل کے تھارے

جیون جل ہلکورے مارے

اب تو کال ہی پار اُتارے

چنتا من سے گئی، نیند نین سے سُدھ لورے شام منوہر پیاے

رات کٹی گن گن کے تارے

پنپے میں دیکھا چند رسکاٹے

بھگٹ یہ نوکھی بات بچارے

اب جاگیں گے بھاگ تمہارے

لے سکارے ہی تھکے وقت

لے بھگت منی پریرگار

چنتا من سے گئی، نیند نین سے سُدھ لورے شام منوہر پیاے

سید مقبول حسین احمد پوری

پیر گودا

ہندوستان میں عام لوگوں کی زبان پر چڑانے قہقہہ کمانیاں جاری ہیں ان میں گودا پیر کی داستان کو بڑی اہمیت حاصل ہے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے خاندان بدوش قبیلوں کے لوگ گودا کی کتھا جاننے والے شخص کو بہت قابل احترام سمجھتے ہیں غار گولوں کو بالخصوص گودا سے بہت وابستگی ہے اور ہندوستان بھر کے ہترا سے اپنا سبکے بڑا پیر اور دیوتا ماننے میں۔ بھادول کے لوگوں میں جب گودا کا عرس ہوتا ہے ہتر گروہ درگروہ ہو کر اس کی کتھا گاتے اور گودا چوران کے نام کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں۔ چرکیں نے ہتروں کی اسی عقیدت کو نظر رکھ کر کہا ہے ۱۔

چلیں گے دیکھتے ہیں وقت گودا پیر کا میللا بنے گا ہتروں کا نوکر تخت رواں اپنا
لیکن گودا کا حلقہ الاہت ہتروں اور سپیروں اور دیگر خاندان بدوش قابل ہی تک محدود نہیں بعض مسلمان اور ہندو بھی اس کے عقیدت مندوں میں شامل ہیں۔

جیسا کہ ہتروں کے نعرے سے معلوم ہوتا ہے گودا راجپوتوں کی چولان قوم سے تھا، یہاں لوگوں کے علم کا زبردست ماہر گودا ہے اور اسے سانپ کے کاٹنے کے عجیب و غریب علاج معلوم تھے۔ گودا محمود غزنوی کے زمانے سے بہت پہلے اور یورپہ تحصیل راج گودا کا بیکانیہ میں پیدا ہوا اور نوجوانی میں اپنے باپ کے لوکر نوہر کے پرگنے میں چلا آیا عمر نے کے بعد وہیں اس کا مزار بنایا اسے گودا پیر کے علاوہ راجہ گودا، گودا چوران، راجہ پیر اور گودا کرمانی بھی کہتے ہیں۔

عوام کا عقیدہ ہے کہ گودا سانپوں کا راجہ بنے روہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کوئی سانپ اس کے حکم کے بغیر کسی کو کاٹ نہیں سکتا۔ گودا کے مرید اس کے نام پر بچے کی قربانی دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کیوں آدمی سانپ کے اثر سے دائمی طور پر محفوظ ہو جائے اگر کسی شخص کو سانپ ڈس جائے تو سپیرے ایک دھاگے پر گودا کا نام پڑھ کر زخم کی جگہ باندھ دیتے ہیں۔ پنجاب میں دھاگے پر اس قسم کے منتر پڑھے جاتے ہیں۔

زمیں تے گلہ۔ سناں مٹوایاں گئے دی نہتہ

مطلب غالباً یہ ہے کہ سانپ اور بچھو گودا کے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہیں کر سکتے۔ اس کے سامنے ان کی حیثیت زمین پر گئے ہوئے نینکوں سے زیادہ نہیں۔

گوگا کے مریدوں کا خیال ہے کہ وہ اولاد اور مال و دولت میں بھی برکت دے سکتا ہے۔ اس غرض سے جمعرات یا جمعہ کے دن گوگا کے نام کی نیا زولوائی جاتی ہے۔ نیاز میں کھیر، ملیدہ، دودھ، ناریل، اپنا یا پنکھا بھی دیا جاسکتا ہے۔ بعض خیم جلتے ہوئے اولاد حاصل کرنے کے لئے گوگا کے مزار پر جا کر بھی چڑھاوا اور دعا پڑھتے ہیں۔ عوام کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص گوگا پیر کی نیاز مان کر نہ دواسے تو اس کی اطلاع بھی مر جاتی ہے اور کاروبار بھی تباہ ہو جاتا ہے۔

گوگا کی پیدائش کے متعلق دو مختلف اور عجیب و غریب روایتیں مشہور ہیں۔ پہلی روایت سنئے۔

کتنے میں یہ کہانی نہیں کوئی راہ جو رگڑا رہے۔ اس کی دوریاں نہیں۔ ایک کا نام باجھل تھا اور دوسری کا نام باجھل۔ اتفاق سے دونوں باجھل تھیں۔ باجھل نے بڑی عبادت کے بعد خدا سے اولاد کے لئے دعا مانگی۔ اس کی دعا سے گرو گرو کا تھہ وہاں آکر تو کسی باغ میں آئے۔ یہ باغ تھہ گرو پران ہو چکا تھا لیکن گرو کے تدسوں کی برکت سے دیکھتے دیکھتے ہر اہو گیا۔ باجھل بارہ برس تک گرو کی سید گئی رہی۔ چھوٹی بچی گرو گرو کا تھہ ہانے لگے تو باجھل کی سوت کا جھل کو کسی طرح خبر ہو گئی۔ باجھل بہ چل چلی کہ باجھلی سے اس کے بھوٹے کے گھر پر گرو گرو کی خدمت میں جا پہنچی اور ان کے چیلے کا نیپا کی زبانی کہہ لیا کہ مجھے آپ کی بیوی ہیں کھڑے کھڑے دیکھ لگائی۔ آپ آپ جا رہے ہیں۔ جیسے آپ نے اجڑا باغ ہر کر دیا اسی طرح میری گود بھی ہری کر دیجئے۔ گرو نے باجھل کو باجھل بھر کر چیلے کو حکم دیا کہ اسے کچھ دے دے۔ کا نیپا نے اسے بڑے کے دودھ دے دیتے ہوئے کہا جا تیرے دو بچے ہیں پیدا ہوں گے۔ باجھل اس فریب سے اپنا مطلب نکال کر باجھل کے پاس آئی اور کپڑے لے کر لہلی تو نے اسے عرصہ چھو گیل کی سیوا کی۔ وہ آج بچے بھی گئے۔ تجھے کیا ملا۔ باجھلی یہ سنتے ہی اپنے کپڑے پہن کر گرو کی تلاش میں نکلی، بارہو کس کے فاصد پر جا کر اس نے گرو کو حالیا اور کھانا راج مجھے کیا دے چلے۔ گرو نے بھوکہ کھانا دیا اور بھوکہ کھاتے ہی دے کر تو آئے ہیں۔ باجھل لہلی مہاراج مجھے تو کچھ نہیں ملا، میری سوت کا جھل دھوکے سے کچھ لے گئی ہوگی۔ کھانا میں عوام کے کوئی نے اس لائقہ کو یوں میلان کیا ہے کہ جس شخص نے مجھے دھکا اڑی ٹھیک لائی تو ہے۔ بارہ برس سید گاری گرو جی کیا ہے چلے موٹے

گرو نے ہاتھ پر لی ڈال کر کا نیپا سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ چیلے نے کہا زانی سچ کہتی ہے۔ زانی سن کر گرو نے باجھل کو گوگ کی ایک گولی دی اور کہا جا تیرے گوگ پیر کا ہوا کا جھل کے بچوں کو ہلاک کرے گا اور چاروں کھوٹ اُس کی پیری مانی جائے گی

اب گوگا کی پیدائش کے متعلق دوسری روایت بھی سنئے جو پنجاب میں زیادہ عام ہے۔ کتنے ہی سانپوں کا سب سے پہلا گرو تہتر وید تھا۔ اس کے سوا لاکھ چیلے تھے۔ اس کو یہ کرات حاصل تھی کہ گردن کے سوا اُس کے جسم پر کسی چھوڑ سانپ کے زہم کا اثر نہ ہو سکتا تھا۔ اس گرو نے سانپوں کو بڑی چن کر بار بار شمع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سانپوں کی صرف تین ذاتیں باقی رہ گئیں۔

(۱) کوہ مار۔

(۲) تلیر۔

(۳) بھسرا۔

اب ان تین ذاتوں کو فکر ہوئی کہ تنہر وید نے ہماری تمام سولوں کو فنا کر دیا ہے اس کا بھی کچھ علاج ہونا چاہئے۔ سب سے پہلے کوہ مار نے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور ایک دن جب تنہر اپنے چیلوں کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ وہ مار سونے کی چھڑی بن کر اس کے گاتے میں لیٹ گیا۔ جب تنہر کی نظر اس سنہری چھڑی پر پڑی تو اس نے چیلوں سے کہا اسے کوئی اتھ نہ لگائے، یہ ایک آفات ہے۔ ایک چیلے نے جو سب سے پیچھے تھا دل میں کہا اگر کوئی تو بادشاہ آدمی ہیں۔ یہ میرا چھوڑ دینے کی نہیں چنانچہ چیلہ سونے کی چھڑی اٹھا کر گرو کے پیچھے دوڑا اور اسی پھٹے ہوئے بولا ماراج اسے کیوں چھوڑے جا تے ہیں مگر تنہر کی اپشت کے قریب پہنچے ہی چھڑی دفعتاً آگ پھینکنا تے ہوئے سانپ میں تبدیل ہو گئی اور اس نے اچاک کر تنہر کی گردن پر ڈس لیا۔

جب تنہر وید کی موت کا وقت قریب ہوا تو اس نے اپنے چیلوں کو جمع کر کے کہا کہ مرنے کے بعد میرے بدن کی بوٹی بوٹی کرنا اور اسے کھا کر کھا لینا۔ اس کے کھانے سے میرے بجائے سوا لاکھ تنہر وید پیدا ہو جائیں گے۔ چیلوں نے تنہر کے مرنے کے بعد اس کے علم کی تعمیل کی اور اس کی لاش کی بوٹی بوٹی کر کے اسے ہنڈیوں میں پکا لاش فروغ کیا۔ سانپوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے ایک جگہ جمع ہو کر کہا، یہ تو بڑی غزالی ہوئی، صرف ایک تنہر ہی زمین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا اگر سوا لاکھ تنہر پیدا ہو گیا تو قیامت ہوگی۔ بچاؤ کا کوئی ڈھنگ نکالنا چاہئے۔ اس پر تلیر سانپ بولا یہ کام تم میرے پر کر دو۔ اب میری باری ہے۔ چنانچہ تلیر نے ایک سہارا لے کر پلڑے پر بٹہ کاروپے مارا۔ ایک ہاتھ میں پوتھی ایک میں عصا۔ ہانپتا کانپتا چیلوں کے ٹھنڈ میں جا گھسا اور مدد لگانی کر کے کوئی چنگاں کے کنارے پر کھڑے ہوئے چیلوں نے کہا آج ہم وہاں نہیں دیں گے۔ گرو کا مکمل ہے۔ اس پر بڑہت نے گھوم کر اپنی پوتھی کھولی اور کچھ پڑھنے لگا۔ چیلے یہ دیکھ کر عجب ہوس گئے اور کہنے لگے یہ بڑہت تو بڑا انتر جانی معلوم ہوتا ہے۔ ایک چیلے نے آگے بڑھ کر ادبے کہا، آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اگر سچ بتا دیجئے تو خیرات مل جائے گی۔ بڑہت نے بھری چوہا کر جواب دیا۔ اچھا سونو۔ پہلے تم مارے گرو کو سانپ نے سرنے کی چھڑی بن کر ڈسا اور وہ مر گیا۔ اب یہ جو کچھ تم بچارے ہو زہرے زہر لکھاتے ہی مر جاؤ گے۔ اپنی غیر جانچتے ہو تو ہنڈیاں اٹھا کر دیا میں الٹ دو۔ بس بابا میں بھٹک نہیں چاہئے۔ ہم مرنے ہیں۔

یہ کہہ کر بڑہت تو یہ جا دو جا آکھوں سے اوجھل ہو گیا اور تنہر کے چیلے بچے ہنڈیاں اٹھا اٹھا کر دیا میں ڈالنے۔ اتفاق سے ایک ہنڈیا تیرتی ہوئی راجہ جیو کے محل کے نیچے پہنچی اور ایک لہندی کے ہاتھ لگی۔ وہ اسے اٹھا کر راجہ جیو کی رانی واپلا رہینی باجھل کے پاس لے گئی۔ تنہر کا گوشت خدکی قدر تھکے اس وقت تک گرم تھا، باجھل لے اسے اٹھی سے چھوڑا تو محل کی مٹی اس پر پڑ گئی۔

اس نے اپنی نگلی منہ میں ڈال کر چوس لی، لانی باجھتی لیکن شور باگلی انگلی چوسنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو گرہہ دنتی ہو گئی اور گوگاس کی کوکھ میں بڑ گیا

یہ دونوں روایتیں تو گوگاس کے ماں کی کوکھ میں پڑنے کے متعلق ہیں۔ اب اس سے آگے کا حال سنئے۔

انہیں دونوں راجہ جیو رانی باجھل سے سخت ہدگمان ہو گیا۔ اس کی موتی کا چھل نے بھی موتی پا کر راجہ کے کان بھرنے شروع کئے انجام یہ ہوا کہ باجھل کو اسی حالت میں دیں نکالا دیا گیا۔

لانی دو بیوں کی ایک پہلی بی بیڈ کر اپنے بھائی باسک دیو کے ملک طرف روانہ ہوئی جو سانپوں کا بادشاہ تھا۔ اسی رات باسک نے خواب میں دیکھا کہ کسی نے اُسے سخت سے اٹھا کر بے مارا ہے، چنانچہ اُس نے اپنی راجدھانی کے بڑے بڑے سانپوں کو بلا کر یہ خواب سنایا اور تیسرے رات بھی۔ سانپوں نے باسک کو تہتر وید کی ساری داستان سنا کر کہا کہ اب یہ یافتہ بن کر ادھر آ جا ہے۔ اس پر باسک نے تمام سانپوں کو جمع کیا اور کہا جو گوگاس کا باپ ہے اُس کو آدھا راج دے دوں گا۔ یہ سن کر سانپوں کی تیسری ذات یعنی مصطفا گ نے بیڑا اٹھایا۔ یہ بانٹتی سانپ بن کر روانہ ہوا۔ باجھل ابھی راستے ہی میں تھی کہ بھسرا اس کی پہلی کے پاس جا پہنچا۔ پہلے اس نے دونوں بیوں کو تڑپتی اور بھتی کو دسا، پھر گودھ ولے کو کاٹا۔ اس کے بعد گوگاس کا خاتمہ کرنے کے لئے سوئی ہوئی باجھل کے منہ میں گھسنے کو تھا کہ گوگاس نے پیٹ سے ہاتھ نکالا اور بھسرا کا پھن داب کر سارا زہر سٹوڑ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھسرا کچا بن گیا پھر گوگاس نے خواب میں اُسے کہا تو کس نیند سوئی ہے۔ اٹھ دیکھ بیوں کو کیا ہوا اور گودھ والا کس حال میں ہے۔ باجھل چونک کر اٹھی تو دیکھا کہ بیل اور گودھ والا سب مرے پڑے ہیں۔ بے کسی کے عالم میں بے چاری گھبرا کر رونے لگی کہ اب بھائی کے پاس کوئی طرح نہ ہوگی۔ اتنے میں گوگاس نے اسے کوکھ میں سے آواز دی، گوگاس کے نام کی بھینٹ مان اور اپنے نوبات کا دھاگا بیلوں اور گودھ ولے کے پاؤں میں باندھ۔ بے بہ نہ ہو جائیں گے۔ باجھل نے ایسا ہی کیا اور وہ سب زندہ ہو کر باسک دیو کے ملک میں جا پہنچے۔ یہاں باسک نے پہلے ہی سے ایک تھخانے میں سانپ بچھو وغیرہ چھوڑ کر باجھل کے لئے کچے سٹت کا پلنگ بچھو دیا تھا تاکہ وہ مر جائے اور گوگاس پیدا نہ ہو، مگر وہ پلنگ خالیوں سے کابن گیا اور سانپ بچھو بھی مر گئے۔

بارہ برس تک باجھل بھائی کے ہاں رہی لیکن گوگاس پیدا نہ ہوا۔ آخر ایک دن گوگاس نے خواب میں ماں سے کہا تو کس خیال میں ہے میں یہاں پیدا ہو کر نواں لائیں، ناں کے گھمکا جانا ہوا انہیں کہلا نا چاہتا جس طرح ہو سکے میرے باپ کے دیں کو چھل۔

باجھل بولی، مہاراج مجھے وہاں گھسنے ہی کہتے ہیں گے۔ ایسی تدبیر کر کہ وہ خود یہاں آ کر مجھے لے جائیں۔

گوگاس نے جس طرح خواب میں باسک کو سخت سے اٹھا کر بے مارا تھا ویسا ہی سلوک جیو سے بھی کیا اور کہا کہ میری ماں کو لے کر آ۔ راجہ جیو اس واقعہ سے بہت ڈرا اور جا کر رانی باجھل کو لے آیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد گوگاس پیدا ہوا۔

جوان ہونے پر گوگا بڑا مہری اور بہادر نکلا اُسے سہو شکار اور جنگلوں میں بھرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کئی لڑائیاں بھی لڑا لیکن کاجھل کے جرمزوال میٹھوں ارجن اور سرجن سے اس کی لڑائی بڑی عمر کے کی ہوئی۔ اس کا قبضہ یوں ہے کہ گوگا اپنے نیلے گھوڑے پر سوار کئی دن سے شکار کے لئے دور دراز جنگلوں کی طرف نکل گیا تھا۔ اتفاق سے انہیں دلاں اس کا باپ مرگیا اور ارجن سرجن کاجھل کے پاس آکر راج پاٹ کا حصہ مانگنے لگے۔ گوگا کو غیب سے خبر ہو گئی کہ کوئی راج مانگ رہا ہے چنانچہ کھڑپٹنے والوں کے لفظ میں اس نے اپنے نیلے گھوڑے سے کہا۔

جھل رے ییلے اُلے علیں اُلئی موڈیں باگ

بُٹم کے بانٹے ہو رہے مانتا کس رہی گھر بار

گوگا گھر پہنچا تو کاجھل نے کہا۔ ارجن سرجن کو کچھ دے دو۔ لیکن گوگا نے کہا، یہ راج کے لاین نہیں، ہم ان کو کچھ نہیں دے سکتے۔ اس پر ارجن اور سرجن سخت برہم ہوئے اور سازشیں کرنے لگے۔ انہیں دلاں گوگا قریب کے ایک راجہ کی حسین بیٹی سرٹیل کے رشتے کا خوشگوار بھڑا۔ کاجھل کے جملہ والے بیٹے بھی اسی لڑکی کے غم ہند تھے۔ لیکن لڑکی کے باپ نے گوگا کو اپنا ندکیا اڈو سرٹیل کی شادی گوگا سے ہو گئی۔ اب ارجن اور سرجن اور بھی غضب ناک ہوئے اور پوری طرح جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ ان دلاں دئی کا راجہ بڑا طاقت ور تھا۔ ارجن سرجن نے اسے سیر دکایا کہ گوگا عنقریب تم سے دلی چھیننے والا ہے۔ راجہ یہ سن کر عجب لایا اور ساری دلی کو لے کر گوگا پر ٹوٹ پڑا۔ ارجن سرجن نے اپنے توڑ جوڑے گوگا کے باپ کی فوج کو بھی دھنڈلایا۔ چنانچہ ساری فوج اُس سے بھگ گئی اور گوگا کے صرف چار ساتھی رہ گئے۔

(۱) گھوڑے کا سانس بھجھ چار۔

(۲) زرسنگہ بہمن

(۳) گوگا کا بھابھا جالا

(۴) اور اُس کا چچیرا بھائی فتح سنگھ۔

اس لڑائی میں گوگا کی طاقت عجیب و غریب طریقے سے ظاہر ہوئی۔ دشمن کی آدمی فوج تو اکیلے بالادھی نے نثار دی لیکن کچھ دیر بعد پانسا پٹا اور گوگا کے چاروں ساتھی بچے لچرہ دیرے دوست کے گھاٹ اتر گئے۔ اب اکیلا گوگا بارہ دن تک دشمن کی بقیہ فوج کا مقابلہ کرتا رہا لیکن یہ صحیح دن لڑتے لڑتے جب اُس نے دم لینا چاہا تو اُس کو پناہ دینے کے لئے زمین اُس کے شاہ سے یکدم چھٹ گئی اور وہ پانچوں بھتیجاں دل سمیت اس میں غائب ہو گیا۔

دوسرے دن گوگا پھر بڑی طاقت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ اب پھر اس نے تنہا دشمن کی ایک جہاز فوج پر حملہ کیا اور مغلوں پر

منیں اٹھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میدان اسی کے ہاتھ رہا اور دشمن فنا ہو گئے۔

گوگا کو ظاہر یہ راسی لے سکتے ہیں کہ وہ غائب ہو کر دوبارہ ظاہر ہوا تھا۔ اُس کے بھگتوں کا عقیدہ ہے کہ غیر فانی گوگا جب چاہے دوبارہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ جس جگہ وہ زمین میں سما گیا تھا کتے ہیں وہاں محمود غزنوی کے زمانے میں بعض کراتیں ظاہر ہوئی تھیں۔ مثلاً گائیں ہاں اگر خود بخود دودھ کی دھاریں مار جاتی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس جگہ ایک مزار بنا دیا گیا جو اب بھی توہر میں موجود ہے۔ یہ چھوٹی سی عمارت گنبد کی صورت میں ہے۔ ہر سال بھادوں کی نزیں کو یہاں بڑا عظیم الشان میلہ ہوتا ہے اور لوگ اس میں شامل ہونے کے لئے دُور دُور سے آتے ہیں۔ اس موقع پر یہاں ایک منڈی بھی لگتی ہے جس میں ناگور، مارواڑ اور دیگر کھیر کے بیل اور اونٹ وغیرہ کثرت سے فروخت کے لئے آتے ہیں۔

مزار پر ہر عقیدت مند سوا پانچ روپے یا ایک بکرے کا چروہا اور چھوٹا سا ہے۔ قبر کے پجاری چاہل کہلاتے ہیں جو برائے نام مسلمان ہیں۔ چروہا دلوں کا نصف حصہ مسلمان چاہل اور نصف حصہ ہندو برہمن لیتے ہیں۔ گوگا کی میسوں کراتیں مشہور ہیں مثلاً اس کے مزار پر جو کثیر التعداد ساپ رہتے ہیں، اُن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کسی کو نہیں کاٹ سکتے۔ گوگا کے بھگت مالا کی طرح انہیں نگلے میں لٹکا لیتے ہیں۔

ایک اصرار مات یہ بیان کی جاتی ہے کہ انگریزوں نے گوگا کے مزار تک ریل پہنچانے کی کوشش کی لیکن لاکھ عتبن کے باوجود بھی گاڑی بال برابر اس طرف نہ سرک سکی کیونکہ گوگا کو یہ منظور نہیں کہ اُس کے بھگت گاڑی میں سوار ہو کر اُس کے پاس نہ آئیں۔

میں نے ایک مہتر سے گوگا کا حال پوچھتے ہوئے کہا، معلوم نہیں گوگا کی چپی ہوئی کتھا ہمیں کہیں سے مل سکتی ہے یا نہیں بہتر نے مجھ کو کراڈوں کو ہاتھ لگائے اور کہا ہرے رام! حضور گوگا کی کوئی بات تو چھلے میں آ ہی نہیں سکتی۔ آپ کہتے ہیں ہم اس کی کتھا ریڈ و باجے پر گائیں گے مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ اسے کتاب میں نہ چھاپ دیں۔ پھر وہ کھائس کر ہولا۔ اگر میری جانی ہوئی کوئی بات کتاب میں آگئی تو میرے سب بچے مر جائیں گے اور حضور پر بھی ہی آفت آئے گی۔

حامد علی خاں

محل ادب

سرشک تبسم

اُمحسا سفر کر انسان کشتہ آلام ہے ساقی
 نہمانے نوز انسان کیوں اجل سے خوف کھاتی ہو
 حقیقت کیا بھومیں آسکے اشیائے عالم کی
 ساقی ساز حکمت کے ترانے کس توقع پر
 صداقت آج بھی پوشیدہ ہے ولاد آدم سے
 ادھر یہ قول، ہم نے شرح کر دی ہے حقان کی
 ادھر تخیل دیں، کا ہو چکا ہے دعویٰ محکم
 نوھر شرف کے ساتھ اعلان ہو آتما نسبت کا
 کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعام تھرتے
 شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز زوہلا کو
 گل کار شدہ ہے جب سب تحول و وراثت میں
 جسے کہتے ہیں عورت عالم میں خلیق انسانی
 وہاں بٹشٹا گیا ہے میرے سولے کو ذوق آزادی
 تبسم اک بڑی دولت ہے کہیں ہی اس کا تیل ہوں
 جسے اس لیے شہب دادہ توحید کہتے ہیں
 خروشش گر یہ ہی عامل نہیں غنائے پنہاں
 راکھیں ہندیں، و تاسا، جلالی دل میری دنی ہے
 تنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی ساقی ہے

یہ بیلط ہے، یہ نئے آگے خدا کا نام ہے ساقی
 اجل کہتے ہیں جس کو زحمت یک گام ہے ساقی
 فقط اک شکل ہے ساقی فقط اک نام ہے ساقی
 کہ اب تک نوز انسان بنیہ اوہام ہے ساقی
 دروغ صاحت تے میرا وہ بھی عام ہے ساقی
 ادھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی
 ادھر ایمان تھا صیاف نام اب تک غام ہے ساقی
 ادھر ہر سانس اب تک ہے کواک عالم ہے ساقی
 سزا کیا ہوگی اس کی جس کا یل نام ہے ساقی
 خود اپنا دل ہی جھیل میں غول شام ہے ساقی
 تو پھر کیوں آدمیت مورد الزام ہے ساقی
 یہ کس آغاز کی سعی زبوں تجسم ہے ساقی
 جلال موج ہر اک مرغ زیر دام ہے ساقی
 مگر یہ آنسوئوں کا ایک شیریں نام ہے ساقی
 وہ آپ صاف بھی افشردہ انعام ہے ساقی
 یہاں تو ساز کے پردے میں ہی کلام ہے ساقی
 نہ جب آرام تھا ساقی نہ اب آرام ہے ساقی
 نہ اپنی شمع ہے ساقی، نہ اپنی شام ہے ساقی

برہمی دریا دلی کے ساتھ ہر غولِ برہم طاقت کو
مشت کی طرف سے اذنِ قبل عام ہے ساقی
یکس کی ٹہر بہت ثبت ہے گیتی کے سینے پر
کہ ہر فرقہ ازل سے لرزہ براند ام ہے ساقی
ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
جوشِ بیخِ آبادی
کہ وہ اپنی صدی کا حافظ و خیم ہے ساقی
”کلیم“

شفار الملک حکیم فقیر محمد مرحوم کی پھبتیاں

پھبتی تشبیہ کی ہی ایک قسم ہے تشبیہ میں یہ ضروری ہے کہ مشبہ الہی ہو اور شبہ بہ اعلیٰ لیکن پھبتی کا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی اعلیٰ کو الہی سے تشبیہ دی جاتی ہے، یوں تو شاید ہم اور آپ بھی غور کریں تو اچھی اچھی بہت سی پھبتیاں سچ ہیں۔ لیکن وقت پر اچھی پھبتی بروی شکل سے سوجھتی ہے اور حکیم صاحب کا تو یہ حال تھا کہ وقت پر ایسی جبست پھبتی دماغ سے اُٹار لیتے تھے کہ جو سنت تھا حیران رہ جاتا تھا۔

ایک دن آغا شہزاد حکیم صاحب آم کھا رہے تھے، آغا آم کھا تے جاتے تھے اور اپنی عادت کے مطابق کہتے جاتے تھے کہ بھئی حکیم بھئی کے انساں کو جواب نہیں۔ لیکن آغا سفید، اس کے آگے کیا مال ہے، حکیم صاحب نے کہا، جی ہاں لیکن تم ہمارے گنگوٹے پڑھو، آغا چونک گئے۔ بات یہ تھی کہ آغا مرحوم ہمارے کے رہنے والے تھے، اور ایک ٹانگ سے لنگوٹے، اس لئے ہمارے گنگوٹے کی پھبتی ان پر ایسی بیٹھی جیسے انگشتی میں گیند بیٹھتا ہے۔

حکیم صاحب ایک مرتبہ کسی رئیس کو دیکھنے گئے، ایک کلابھونگ مہتر آدمی جو صاحب خانہ کا توہی رشتہ دار تھا، بعض کی پٹی پہ لگا پنڈل لٹکھا رہا تھا، حکیم صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن کچھ کہ نہ سکے جب رئیس کو دیکھ کر چلنے لگے تو اس شخص کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ یہ صاحبزادے کس درجہ میں پڑھتے ہیں، صاحب خانہ نے کہا حکیم صاحب۔ انہیں آپ نے صاحبزادہ کیسے کہہ دیا، ان کی عمر تقریباً پچیس سال کے لگ بھگ ہو گئی حکیم صاحب نے کہا، اچھا۔ یہ سلیٹ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ اس لئے میں یہ سوال کر بیٹھا۔ میں جن دنوں تہذیبِ نسل میں نیا نیا گیا تھا، ایک مرتبہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگے کوئی نئی خبر سناؤ میں نے آج کا اخبار نہیں دیکھا میں نے کہا صاحب میں خود کوئی نئی دن اخبار نہیں دیکھتا۔ مہنس کہہ فرمایا۔ جی ہاں سہ

مشق کا حال مسیحا میں ہم ہویشیاں یہ کیا جانیں

’شہزادہ‘

چراغِ حقِ حیرت

مطبوعات

اسلامی طب۔ (از امین الدین صاحب ہر فاروقی)۔ سلاطین اسلامیہ نے طب کی خدمات انجام دیں اور ان کے زمانے میں اس فن نے جو ترقی کی یہ کتاب اس کی مختصر لیکن دلچسپ اور جامع تاریخ ہے۔ واقعات کی ترتیب بہت دلکاویز ہے اور بعض جگہ تاریخ میں اسے کاٹھن محسوس ہوتا ہے۔ قابل ملاحظہ مسلمان سلاطین و اطباء کے علمی و فنی کارناموں کے علاوہ اس کتاب میں یونانی، عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کی ناویطی کتابوں کے تعلق کردہ اہم ترین منہایت مفید معلومات جمع کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایسی ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعے اردو کی لسانی تحقیقات بھی ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب مطالعہ کے قابل ہے قیمت ۵ روپے جلد ۱۲ روپے (مؤلف سے حسب ذیل پتے سے طلب فرمائیے: سن برج اؤس۔ عابد پبلنگ۔ مصطفیٰ بازار حیدر آباد (دکن)۔)

۱۔ اچھے گیت { یہ دو نون کتابیں میاں عبدالحی بیٹی ایڈیٹر ہونڈلا ہور نے لکھی ہیں۔ ۱۔ اچھے گیت میں بچوں کے لئے انیس ۲۔ تب تم اچھی بچی ہو } نہایت سبق آموز گیت دیج ہیں۔ دوسری کتاب میں چھوٹی بچوں کے لئے ایک ایسی سبق آموز نظم شامل کی گئی ہے۔ گیتوں کے پڑھنے سے علوم ہوتا ہے کہ یہاں صاحب کو بچوں کے لئے گیت لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ اُنہوں میں بچوں کے لئے اس سے اچھے گیت ہماری نظر سے نہیں گزے۔ زبان سادہ، سلیس، دلکش اور موضوع کے لئے ہر طرح موزوں ہے کہیں کہیں تصانیع ہیں جن سے ان کتابوں کو پاک ہونا چاہئے مثلاً اچھے گیت کے صفحہ ۲۸ پر ایک مصرعوں میں سورج ہے اور خود غرض بنا دیتا ہے ہماری رائے میں یہ کتابیں تمام چھوٹے بچوں اور بچوں کے ہاتھ میں ہونی چاہئیں۔ یہ کتابیں اس قابل ہیں کہ محکمہ تعلیم ان کی سرپرستی کرے۔ قیمت علی الترتیب ۴ روپے ۲ روپے ۲ روپے حضرت مصنف سے طلب کیجئے۔

شہریت۔ یہ کتاب بریٹن میجر جے ولٹ۔ ایم سی ایم اے کی تالیف ہے۔ جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی نے شائع کیا ہے یہ کتاب وین حروف میں چھپی ہے اور جو لوگ اردو کو وین حروف میں لکھا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے ایک نعمت فیض ہے کہ کتاب ہندوستانی شہری کے حقوق و فرائض سے متعلق ہے۔ زبان بہت سستہ اور قابل تامل ہے۔ شہریت میں قابل ملاحظہ ہندوستانی شہریوں اور وائیوں کے لئے نہایت مفید اور کارآمد معلومات جمع کر دی ہیں قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی سے طلب کیجئے۔

Since Our Fall۔ یہ کتاب سٹر عبد اللہ انور بیگ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی نے انگریزی زبان میں لکھی ہے۔ فاضل لٹریچر اس میں اسلام کے عروج و زوال کے اسباب پر غور کرتے ہوئے اسلامی ہند کی گذشتہ دورہ تاریخ پر ایک فائر نظر ڈالتا ہے۔ اسی سلسلے میں

میں اس کی تحریک کے خلق ہی اہل ریاض کیا ہے اور طراویں کی کوتاہیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ کتاب پر معلومات اور قابل مطالعہ ہے قیمت مجلد ہے۔ اردو اکیڈمی بیرون لہاری روادہ لاہور سے طلب فرمائیے۔

جام لہور۔ یہ جناب خواجہ عبدالمسیح صاحب پال انرمسبائی کی رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے جسے تاج کپنی لاہور نے نہایت نفیس کتابت و طباعت اور خوبصورت جلد کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ابتدا میں حضرت انرمسبائی نے خود میں مغزل کا دیباچہ لکھا ہے، جو نہایت دلچسپ ہے اور ان کی شاعری کے مطالعہ کے لئے نہایت مفید معلوماتیں پڑے۔ ایسا دیباچہ شاعر کے علاوہ دوسرا کوئی شخص شاید ہی لکھ سکتا۔ انرمسبائی پنجاب کے موجودہ فوجی افسران اور ممتاز حشیہ نگار، کاتبین، وہ خاتم، حافظ، اقبال اور دیگر وغیرہ سے غزل طبع پڑا ہوا ہے، چنانچہ ان شعرا کی تنقیدات کے نہایت دلکش فقرے ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔ انرمسبائی فلسفہ اور شاعری کو نہایت خوش اسلوبی سے سمجھتے ہیں۔ ناظرین ہمالوں ان کے دل آویز طرز خیال سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے نوٹ کلام کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ امید ہے کہ اچھے کلام کے شائقین اس مجموعے کو بے اعتنا نہ رہیں گے۔ قیمت مجلد غیر۔ تاج کپنی لاہور سے طلب کیجئے۔

سراج سخن۔ مرثیہ عبدالقادر درویشی استاد اردو جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)۔ یہ کتاب سلسلہ انتخابات شرعائے دکن کی چوتھی جلد ہے۔ جس میں سید سراج الدین ۱۹۰۷ء تا ۱۹۲۸ء اور نگ آبادی کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔

شروع میں دکن کی اردو شاعری کے عنوان سے ڈاکٹر سید جمی الدین قادری نے دور کا مقدمہ جس میں دکن کی اردو شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تقسیم کی مدد سے سراج جو تحفے دور کا شاعر ہے۔

مرثیہ نے اپنے مقدمے میں سراج کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کی خصوصیات متعطر طور پر بیان کی ہیں اس کے بعد سراج کے نوٹ تحریر کا ذکر کیا گیا ہے۔ انتخاب کلام میں غزلیات، رباعیات، مستزاد، مثنوی سب کچھ شامل ہے

اہل دکن کی یہ کوشش قابل قدر و ستائش ہے کہ وہ موجودہ زمانے کو اپنے قدیم شعرا سے روشناس کر رہے ہیں۔ قیمت ۱۲ اسر مصنف سے طلب کیجئے۔

پریت افسانے۔ یہ سرور گورنمنٹ لکھ صاحب ایڈیٹر پریت لڑی لاہور کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ مجلد شائع ہوا ہے۔ حجم ۲۴ صفحات ہے۔ سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور صاحب کو سادہ اور سلیس زبان لکھنے پر پوری توجہ حاصل ہے۔ انہیں باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر ذریعہ کے ہندوستانی اردو زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا بہتر وسیلہ بنا سکتے ہیں۔ جناب نوٹ ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ نفیس مجلد کتاب کی قیمت ۴۰ روپے۔ مندرجہ بالا پتے سے منگوائیے۔



فہرست مضامین

”ہمایوں“ بابت ماہ مئی ۱۹۳۸ء
تصویر: علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ



شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	بزم ہمایوں	بشیر احمد	۳۴۲
۲	اقبال (نظم)	عادل علی خاں	۳۴۴
۳	علامہ اقبال کے ہاں ایک شام	پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ایم۔ اے	۳۴۶
۴	جہاں نما	عادل علی خاں	۳۵۳
۵	بالوچی (افسانہ)	جناب محمد صادق صاحب فنی بی۔ اے	۳۵۷
۶	انہارِ لغت (نظم)	جناب ساجد امین الرحمن خاں صاحب	۳۶۴
۷	انجام (نظم)	جناب فخر نسرتقوی احسانی	۳۶۵
۸	غزل	حضرت شاد عارفی	۳۶۶
۹	بدعورتی	جناب کرشن چندر صاحب ایم۔ اے	۳۶۷
۱۰	دسمبر کی ایک رات (نظم)	صاحبزادہ احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔ اے	۳۷۰
۱۱	احسن الکلام (غزل)	حضرت آسن مارہروی	۳۷۱
۱۲	نگار خانہ چین	جناب ممدی علی خاں صاحب	۳۷۲
۱۳	خونِ پاک (نظم)	پروفیسر محمد اکبر صاحب نیر ایم۔ اے	۳۷۵
۱۴	محبوب کی قبر پر	حضرت عروج بدایونی	۳۷۷
۱۵	محبت کی نینگیاں (انتخابِ اشعار)	حضرت حفیظ ہوشیار پوری ایم۔ اے	۳۷۸
۱۶	سرشمہ (رؤاں)	جناب محمد یحییٰ صاحب صدیقی	۳۷۹
۱۷	کیلاش کنول (ترجمہ از پیام شرق)	حضرت مقبول احمد پوری	۳۸۸
۱۸	ایک عید کے دن (افسانہ)	مولانا حسن عسکری صاحب جاوید	۳۹۰
۱۹	قرار و سکون (نظم)	جناب خواجہ عبدالصغیر صاحب پال اثر صہبائی ایم۔ اے، ایل ایل بی	۳۹۶
۲۰	چندول (نظم)	پرنسپل رام پرث صاحب ناٹھاد ایم۔ اے (دکن)	۳۹۸
۲۱	اقبال کی منظر نگاری	جناب یحییٰ ناٹھ صاحب آزاد بی۔ اے	۳۹۹
۲۲	مغزل ادب		۴۰۶
۲۳	طبوعات		۴۱۳

چند سالانہ چہرہ ششماہی ————— مجموعہ معمول ————— قیمت فی پرچہ ۸

لگا یہ محسوس کر کے کہ ہمارے عین درمیان ہم سے اس قدر قریب دُنیا کی ایک عظیم الشان جہتی موجود ہے اور ہم کم بہت اُس کی نادر محبت سے ذرا فیض نہیں اٹھاتے۔ مسلمانوں نے اپنے قومی شاعر کی بڑی قدر کی گو گزشتہ سطور میں میں نے بعض دفعہ اُن کے پاس جا کر اُن کی تنہائی اور بچی کو شذیت کے ساتھ محسوس کیا۔ اُن کی آواز میں باوجود بہت دستِ قبال کے اب اتنی محبت اور شفقت کے جذبات بھر جاتے تھے کہ اُنہیں یاد کر کے اُن کی طرف اپنی کوتاہیوں پر شرم ہی آئے لگتی ہے۔ سچ ہے انسان کی قدر کرنے کے بعد ہی آتی ہے!

کس قدر قانع اور صلہ مند طبیعت پائی تھی سے

نہ گم ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

ترسی بندہ پوری سے میرے دِل گز رہے ہیں

اور بے نیاز: سے

گھر میرا نہ دلی نہ صفا ہاں نہ سمرقند

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی

نے اہل مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں چپے حق

میں بندہ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش

اور بچہ وہی: سے

آزاد و گرفتار وہی کیسہ و خورسند

پرسوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار

ذرا اپنے ہی بعض اور لیڈروں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھئے کس طرح گُمنامی اور ترکِ دنیا کے ذریعے سے بھی اپنا پروگینڈا کرتے ہیں لیکن مروجہ کو بھی خوشی تھی کہ سے

دگر نہ شعر مر کیا ہے شاعری کیا ہے:

خوش آگئی ہے ہماں کو قلمِ درمی میری

اس کے ساتھ ہی انہیں اپنے حیاتِ بخش پیغام کی اہمیت کا احساس تھا، اپنے مزار کے لئے یہ کتبہ چھوڑ گئے ہیں: سے

ہمہ گفتند با ما آشنا بود

چو خستِ خویش بر بستم ازیں خاک

چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

ولیکن کس نہ انست این مسافر

اور اپنی ولادت کے چند روز پیشتر یہ شعر چھوڑ رہے تھے سے

نیسے از جاز آید کہ ناید

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید

دگر دانائے راز آید کہ ناید

سر آ در روزگارِ ایں فقیر سے

”ہینئر دینِ غدی“

”ڈاکٹر سر محمد اقبال برآمد“

جنابِ حنیف ہوشیار پوری نے اُن کی یہ تاریخیں کہی ہیں:-

بشیر اجل

۱۳۵۶ھ

۱۳۵۶ھ

شہیدِ ملت حضرت اقبالؒ

تاجدارِ قلمِ سخن کی بارگاہ میں ایک گدائے بے نوا کا علاج عقیدت

جنہیں فحش سے نکلیں بھی ملانے کا نہ تھا بار
 انہیں پھر لے اُڑی یہ کس کی تمغیل سپہ آرا؟
 گرے میراثِ باکھوکے یوں ہم خاکِ حسرت پر
 کہ تھا دنیا کی آنکھوں کیلئے عبرتِ نظر آرا

”کبھی اے نوجوانِ مسلم ہند بھی کیا تونے“
 ترے دل کو بنایا قلبِ مسلم کس نے دوبارہ؟
 گدلوں کو جہانِ بانی سکھانے کیلئے کس نے
 خزانہِ حکمتِ گم گشتہ کا پھر پالیا سارا؟

ہوئے افرادِ پھر حیا سے ملت کیلئے قریب
 دریا پھر فشنِ عشقِ یغما سے دلِ جہاں کو
 نقیبِ آفتابِ تازہ و تابندہ تر آیا
 حق آگاہی تجھے بخشی خود آگاہی نے دوبارہ
 ہو س کے قافلے کو لے کے بھاگا نفسِ تارا
 کہ ابھرا ہے اُفق سے پھر تر اُڈو باہو اتارا

فلکِ جاہلا پھر طاقِ قصرِ ملتِ بیضا ترا اقبال ہے اور سطوتِ کبریٰ کا نقارا
 بنایا اپنے دل کو گنجِ اسرارِ بقا جس نے اور اُس کو اُمتِ مرحوم کی تقدیر پر وارا
 سرورِ سینہِ ملتِ افروغِ دیدہٴ دنیا خدائے پاک کا پیارا، نبی کی آنکھ کا تارا

نوا سازِ خودی! تیری نوا کی گنجِ اٹھی ہی تھی کہ ٹھکرا نے لگھے پھر بے نوا تاجِ سرِ دارا
 ترے ذوقِ یقین نے کار فرمائے جہاں پائے وہی دل دیدہٴ نکتہ نے پایا جن کو ناکارا
 ریاضِ ہند کو تو نے اور ورو کے سینچا ہی ادا تو نے کیا ملت کی تقصیریں کا کفارا
 گیا ہر باغِ ملت میں شمیمِ جاں فرالے کر ترا جوشِ انوث اور صبا کا خیل آوارا

ترے سوزِ محبت کی فصولِ سازی نے پگھلائے

وہ بے حسِ دل کہ تھے قنوں سے ننگِ سینہٴ خارا

حامد علی خاں

۱۔ یہ نظم جنوری ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی تھی۔ یومِ اقبال کی گزشتہ تقریب پر مجلسِ علم میں پڑھی گئی۔

علامہ اقبال کے ہاں ایک شام

گذشتہ ماہ رمضان کی ایک شام کو جب ہوا کے جھونکے گلابی جازے کی تازگی اور کیفیت سے بس رہے تھے ہم علامہ اقبال سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے، میرے ساتھ میرے شعبہ انگریزی کے رفیق پروفیسر عبدالواحد اور صدر شعبہ فلسفہ ڈاکٹر سعید راشد تھے۔ خزاں کا آغاز تھا مگر موسم میں وہ جولاہی تھی جولاہور کا فرحت بخش آسمان، بن صرف کبھی کبھی زمین والوں کو عطا کرتا ہے، ساڑھے چار بج چکے تھے۔ سڑج کے مغرب ہونے میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا۔ فضا اُجلی اور نکھری ہوئی تھی۔ مگر مغرب کی طرف ابر کی چند تفری اور ناجی دھاریاں اُٹن پر ایک لہریاں بنا رہی تھیں۔ ہم امپرسس وڈسے ہوتے ہوئے اُس چھوٹی سی سڑک پر چل رہے تھے۔ جو ریلوے کے بڑے دفتر کے جنوبی رخ کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ وہ سڑاہہ آیا جہاں یہ سڑک میرو وڈسے ملتی ہے۔ اور ساتھ ہی ہم نے اُس مختصر سے سفید مکان پر نظر ڈالی جہاں دو بھائیوں حقیقت کا سب سے بڑا اثر جہاں اپنی خاموش مگر نگار خیز زندگی بسر کر رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ صحن کی چھوٹی سی دیوار اور اُس کے پیچھے پولکینس کے چار پودے جو ابھی اپنے پورے قد و قامت کو نہیں پہنچے، پھر سڑک کے ایک مختصر سا تختہ جس کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے ہم مکان کی ڈیوڑھی کے پاس جا کر رُک گئے۔ اس ڈیوڑھی کی تین محرابیں اپنے ہشت پہلو ستونوں پر سڑک سے صاف نظر آتی ہیں۔ ڈیوڑھی کے ساتھ ہی مکان کا برآمدہ ہے جس کے سفید پیل پائے طبیعت کو زرب وقار کے بجائے حن و لطافت کا اخز یادہ دیتے ہیں۔ ہمارا پُرانا دوست علی بخش ہمیں دیکھ کر محسن کے ایک لہجہ جھریں سے نکلا۔ اس نے جا کر علامہ اقبال کو ہماری آمد کی اطلاع دی اور پھر فوراً واپس آکر ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔

برآمدے سے گزرتے ہی ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ اس کمرے کا سامانِ آرائش بہت سادہ اور سلیف تصنع سے پاک تھا۔ روائی پرشاد مشرق کی ایک تصویر، دو تین فنٹ انچی فوراً نظر کے سامنے آگئی۔ اسی کمرے سے طبعی بانیں ہاتھ کو علامہ اقبال کی خواب گاہ ہے۔ اس خواب گاہ کی ایک کھڑکی برآمدے کی طرف کھلتی ہے۔ جس کے ساتھ لاٹوا علامہ مزمل کا لبتہ بچھا رہتا ہے۔ اب ایک عرصہ ہو گیا تھا کہ ہم جب آتے تھے۔ علامہ اقبال کو اسی بستر پر کبھی کبھی بیٹھے ہوئے مگر زیادہ تر بیٹھے ہوئے پاتے تھے۔ لیکن مجھے وہ دن بھی یاد ہیں کہ میکلوڈ روڈ کے قیام کے دنوں میں حضرت علامہ اپنے حرمِ فیض کے خوش بھینچوں کو کسی اور رنگ میں صلائے عام دیتے تھے۔ میں سڑک سے مڑتا تھا تو کونٹھی کے صحن میں داخل

ہوتے ہی، اور بعد کے دنوں میں اُس لمبی روشنی پر چند ہی قدم چل کر جو مکان تک پہنچا جاتی تھی۔ ہمیشہ برآمدے کے ایک غمگین گوشے میں ڈاکٹر صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے دُور سے نظر آ جاتے تھے۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے غلی غلی سانس سے جی ہوئی غمگین میں جب ضرورت تک یا دو کرسیوں کا اضافہ کر دیتا تھا۔

آج ڈاکٹر صاحب کے دم میں داخل ہوتے ہی ہم کسی قدر ٹھنکے۔ ایک یورپین خاتون ڈاکٹر صاحب کے بستر کے برابر کرسی پر بیٹھیں اور ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی بچی کو گود میں لئے ہوئے تھیں۔ ہم کو دیکھتے ہی وہ اٹھیں اور مقابل کا پردہ اٹھا کر مکان کے اندر چلی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے اُنہوں نے نیچے کے سہارے لیٹے لیٹے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ ہم تینوں بستر کے برابر کرسیوں پر بیٹھے ہی کو تھکے ڈاکٹر صاحب ہم سے مخاطب ہوئے:-

”کون صاحب ہیں؟“

یہ سوال سن کر میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گاہ بگاہ حاضر ہوتے اب سات آٹھ برس ہو گئے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب ہمیشہ شفقت و عنایت سے پیش آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا سوال میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس لئے اپنے استعجاب کو چھپاتے ہوئے میں نے جواب دیا ”جی میں ہوں حمید احمد خاں، سعید اشرا اور عبدالواحد“ اور یہ کہہ کر ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے ہم نے ڈاکٹر صاحب کے مزاج کی کیفیت پوچھی اس کے بعد تھوڑی دیر تک سکوت رہا۔ جس کو ڈاکٹر صاحب نے معمول کے مطابق اپنی اُس لمبی اُستادانہ ”ہوں“ سے ٹوڑا، جس میں بالعموم گفتگو کے لائقہ ادا مکانات منہم ہوتے ہیں۔ میں نے اُس تپائی پر نظر ڈالی جو بستر کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی پانچ سات کتابیں اس کے اوپر تھیں اور دو ایک نیچے فرش پر پڑی تھیں۔ میں نے ایک اعلیٰ ہونی نظر ان کتابوں کی ڈالی اور تھوڑے سے وقفے کے بعد پوچھا:-

”ڈاکٹر صاحب! آج کل پڑھنے پر زیادہ توجہ ہے یا کبھی کبھی آپ کچھ لکھتے بھی ہیں“

”پڑھنا کیسا! کچھ نظری نہیں آتا۔ اگر کچھ دیکھ سکوں تو پڑھوں“

”نظر نہیں آتا؟“ ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ میں نے بے حد حیرت و استعجاب کے لمحہ میں دُہرائے۔

”اُہ! جب آپ لوگ میرے کمرے میں داخل ہوئے ہیں تو میں آپ کو نہیں دیکھ سکا۔ اب تھوڑی دیر گزرنے

پر آپ کی عورتیں کسی قدر دُور مندی نظر آرہی ہیں۔ کتے ہیں کہ (Senile Cataract) (نوتیا مند) آتا ہے

سعید اللہ۔ ان گری کی چھٹیوں سے پہلے آپ نے ذکر کیا تھا کہ Senile Cataract آنز آنے کا خطرو ہے،

مگر یہ خیال نہیں تھا کہ اس قدر جلد اتر آئے گا۔

ڈاکٹر صاحب - جی ہاں۔ عام طور پر لوگوں کو دیر سے اُترتا ہے۔ مجھے ذرا پہلے اُتر آیا ہے۔ میرے والد مرحوم کو جو سو سال سے کچھ زیادہ زندہ رہے اسی برس کی عمر میں اُتر تھا۔

میں - اس کے علاج کی کوئی صورت تو آپ کر رہے ہوں گے؟

ڈاکٹر صاحب - اب اس کا آپریشن ہوگا۔ لیکن جب تک یہ پک دھائے آپریشن نہیں ہو سکتا۔ پچھنے میں اسے پانچ مہینے لگ جائیں، پانچ سال لگ جائیں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ بہر حال لکھنا پڑنا بالکل ہر طرف سے کیونکہ میری داہنی آنکھ تو شیش ہی سے بیکار تھی۔

”شروع ہی سے بیکار تھی؛ اب حیرت کے ساتھ اس فقرے میں ہمارا تانت و اضطراب بھی شامل تھا۔

”جی ہاں، دو سال کی عمر میں میری یہ آنکھ مائل ہو گئی تھی۔ مجھے اپنے جوش میں مطلق یاد نہیں کہ یہ آنکھ کبھی ٹھیک تھی بھی یا نہیں۔ ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ داہنی آنکھ سے خون لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے مینائی رائل ہو گئی۔ میری والدہ کا بیان ہے کہ دو سال کی عمر میں جو کہیں گولائی گئی تھیں۔ تاہم میں نے اس آنکھ کی کمی کبھی محسوس نہیں کی۔ ایک آنکھ سے دن کو تارے دیکھ لیا کرتا تھا (اس کے بعد ایک ایسے تبسم کے ساتھ جو گویا تاریکی کی قوتوں کے خلاف ظہیر امید کا لغو خاموش غنا) اب اگرچہ میں پڑھتا نہیں ہوں مگر پڑھنے کے بجائے سوچتا ہوں جس میں وہی لٹپٹے جو پڑھنے میں (پھر ذرا سرگرمی کے ساتھ تیجے سے سر اٹھا کر) عجیب بات یہ ہے کہ جب سے بصارت گئی ہے یہی اچانک بہتر ہو گیا ہے۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی کچھ اور باتیں ہوئیں۔ اُس یورپین خاتون کا ذکر ہوا جو تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں ہمیں نظر آئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے بچوں کی گورنس ہیں۔ اور علی گڑھ کے کسی پروفیسر کی مفاد پر ڈاکٹر صاحب نے انہیں ملازم رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ”بیجاری اپنے حالات کی وجہ سے سیدیت میں تھی اور ہے بڑی شریف عورت۔ بہت اچھی منتظم ہے۔ بچوں کی تعلیم کے علاوہ اس نے گھر کا بہت سا اہم کام کاج بھی سنبھال لیا ہے۔ ذرا فرسٹ کلاس لٹی ہے، تو مکان کے چھاننے پوچھنے میں لگ جاتی ہے، یا باورچی خانے میں جا کر اٹھ بٹاتی ہے۔ میرا باورچی خانے کا خرچ اب ایک تہائی کم ہو گیا ہے۔ کبھی مجھے انگریزی میں خط لکھنا ہوتا ہے تو اسی کو لکھوا دیتا ہوں۔ اُردو خط جاوید لکھ دیتا ہے۔“ ہاں اس سلسلہ میں ایک بڑا لطیفہ ہوا۔ میری لڑکی منیرہ اپنی گورنس کے ساتھ سیر کے لئے کسی طرح نہیں جانا پاتی تھی۔ بہت دفعہ کہا مگر اُسے گورنس کے ساتھ سڑک پر نکلتا بالکل منظور نہیں تھا۔ آخر لکھی دن بعد یہ راز کھلا جب منیرہ نے کہا ”لوگ مجھے کہیں گے میں کی بیٹی ہے۔“

انہیں باتوں میں سوا پانچ بیچ گئے۔ علی بخش نے مکر مہر صاحب اور سالک صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ دونوں صاحب تھوڑی دیر میں اندر داخل ہوئے۔ اور ہمارے قریب ہی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان دونوں تھوڑا ہی عرصہ پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اہم اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا اور پنجاب کی یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے باہمی میثاق کے چرچے تھے۔ مہبران انقلاب کے آنے ہی گفتگو کا رخ سیاسیات کی طرف پھر گیا۔

اس اثنا میں انظار کا وقت قریب آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے گفتنی بجا کر اپنے ملازم رحما کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ لفظ کے لئے سنگترے کجھوریں، کچھ نمکین اور میٹھی چیزیں جو کچھ ہو سکے سب لے آئے۔ سالک صاحب۔ اقویا سب کچھ نگو آنے کی کیا ضرورت ہے۔ کجھوریں کافی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ (ایک ایسی شوخی سے جس میں طنز اور معصومیت کا انداز جھلکتا تھا) سب کچھ کہہ کر ذرا رعب تو مجھ میں کچھ نہ کچھ تولائے گا۔

”رحما“ نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایات کی لفظ بہ لفظ پابندی ضروری نہ سمجھی اور قریب قریب سالک صاحب کی خواہش کی پاسداری پر قناعت کی۔

ان سیاسی مباحثے کے بعد خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے توڑا اور کہا ”ڈاکٹر صاحب گہمی کی چھٹیوں سے پہلے ہم حاضر ہوئے تھے تو آپ نے غالب اور بیدل کے تعلق فرمایا تھا کہ آپ کی رائے میں غالب نے بیدل کو سمجھا ہی نہیں۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ بیدل کا تصوف *Dynamic* (حرکی) ہے اور غالب کا *static* (سکونی)۔

ڈاکٹر صاحب *Inclined to static* (مائل بہ سکون)

میں۔ جی ہاں۔ اس سے آپ کا کیا مطلب تھا؛

ڈاکٹر صاحب۔ بیدل کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ حرکت پر زور ہے۔ یہاں تک کہ اس کا مشق بھی صاحب غلام ہے۔ اس کے برعکس غالب کو زیادہ تر اطمینان سکون سے اُفتاب ہے۔ بیدل نے ایک شعر لکھا ہے جس میں ”خوام می کاشت“ کی ترکیب استعمال کی ہے گو یہ سکون کبھی بہ شکل حرکت دیکھا ہے۔ مثالیں اس وقت یاد نہیں ہیں۔ لیکن اگر آپ بیدل کے کلام پڑھیں تو بہت سے اشعار ہاتھ آ جائیں گے۔ میں جن دونوں انارکلی میں رہتا تھا میں نے بیدل کے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اب میرے کف و غدو میں کہیں ادھر ادھر مل گیا ہے۔ نقشبندی سلسلے اور حضرت مجدد الف ثانی سے بیدل کی حقیقت کی

لہ ڈاکٹر صاحب نے جس شعر کی طرف اشارہ کیا وہ یہ ہے۔ مگر دو قدم غلامی کاشت بہ از انعمت عصابہ کف داشت

بنیاد ہی یہی ہے نقشبندی مسلک حرکت اور رجحانیت پر مبنی ہے۔ (Dynamic and Optimistic) گرجتی مسلک میں قنوطیت اور سکون کی جھلک نظر آتی ہے (Pessimistic and Static) اسی وجہ سے جنتیہ سلسلے کا حلقہ ارادت زیادہ تر ہندوستان تک محدود ہے مگر ہندوستان سے باہر افغانستان، ایران، ترک، وغیرہ میں نقشبندی مسلک کا زور ہے۔ دراصل زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہے۔ اس میں حرکت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ قنوطیت تقلید پر مبنی ہے۔ سیاسیات، فلسفہ، شاعری، یہ بھی تقلید پر مبنی ہیں۔ لیکن نقشبندی سلسلے کے شاعر مثلاً ناصر علی ہرندی کو دیکھیے، ناصر علی کی شاعری تقلیدی نہیں ہے۔ اسی لئے حرکت والی قوموں میں وہ زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ ہندوستان میں ناصر علی کی کچھ زیادہ قدر نہیں ہے۔ لیکن افغانستان اور بخارا کے اطراف میں لوگ اس کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں بتدیل کو بھی افغانستان کے لوگ بہت مانتے ہیں۔

میں۔ اس کے کام کے حرکی عنصر کی وجہ سے؛
ڈاکٹر صاحب۔ (مشکلات ہوئے) میرا خیال ہے کہ بتدیل کے کام کو سمجھنے میں انہیں مشکل پیش آتی ہے، اس لئے سعید الشہر۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو غالب نے شروع شروع میں بتدیل کی طرح شکل گونی کی، کیا یہ صوف اس دعوے کے لئے کہ میں بھی مشکل بلکہ سکتا ہوں؛

اس موقع پر ترجمہ صاحب نے سلک صاحب کی طرف دیکھا اور دونوں صاحبوں نے یہ اتفاق ڈاکٹر صاحب سے منخصت کی اجازت چاہی۔ چنانچہ قبل اس کے کہ ڈاکٹر صاحب سعید الشہر کے سوال کا جواب دیں کہ ہاں جوانی میں انسان طبعاً مشکل پسند ہوتا ہے؛ دونوں حضرات ڈاکٹر صاحب کی خواب گاہ سے نکل کر ڈرائنگ روم تک جا پہنچے تھے۔ ان کی رفت و برخواست کی وجہ سے گفتگو میں قدرۃً ایک اور وقفہ آیا۔ اس کے بعد سعید الشہر نے کہا "آج کل ہندوستان کے نیشنل انٹیم کے متعلق بڑی بحث ہو رہی ہے۔ آپ کی اس سلسلے کے متعلق کیا رائے ہے؟"

ڈاکٹر صاحب:- "نیشنل انٹیم" تو اس صورت میں ہو کہ کوئی "نیشن" ہو۔ جب سرے سے "نیشن" ہی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تو "نیشنل انٹیم" کہاں ہو سکتا ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ہندوستان کو کسی نیشنل انٹیم کی ضرورت ہی نہیں ہے؛

سعید الشہر:- "بندے ماترم" پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایک تو یہ بنگالی ہے۔ دوسرے اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب سدا گرمی سے، آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی دھونڈتے ہیں؛ ہندو شاعری کے تمام دفتر

دیکھ ڈالنے۔ کہیں گرمی نظر نہیں آئے گی۔ ہندو کو بہرِ عید شانتی کی تلاش ہے۔ ہندوؤں کی ادنیٰ پیداوار میں میرے نزدیک اس کی صرف ایک استثنا ہے۔ رامائن، اور وہ بھی بعض بعض حصوں میں۔

عبدالواحد: مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاصی ہیجان انگیز ہے۔ قوالی میں یہی موسیقی کافی گرمی پیدا کر لیتی ہے۔
ڈاکٹر صاحب: میں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں جس طرح کسی قسم کے نشے سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کر لے۔
عبدالواحد: کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وجد و حال کی کیفیت مصنوعی ہے؟ مثلاً ہمارے ہاں سیالکوٹ میں نوشا ہیوں کا مسید ہوتا ہے۔ وہاں قوالی سے بعض لوگ ایک دم حال میں آجاتے ہیں۔ کیا وہ آپ کے نزدیک محض دکھوا رہے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب: ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک عمل (دستور) بنا لیا ہے۔ یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے جوشِ مذہب کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں، تو پھر ان میں باقی کچھ نہیں رہتا اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ دراصل مسلمان جب عرب کے نکلے اور انہیں باہر کی قوموں سے سابقہ بڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی انسانیت کا لحاظ کرتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ انسانیت سے رواں فائذ جذبات ہیں۔ ایران اور ہندوستان میں فالو جذبات کی کثرت ہے۔ اور حال انہیں فالو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ صوفیوں کے سلسلوں میں قوالی کو جو دخل ہے وہ صرف اسی وجہ سے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک میں اپنا اپنا مقامی فن موسیقی رائج ہے مسلمان جہاں جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی انہوں نے قبول کر لی۔ اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فنِ تعمیر کے سوانحیوں لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی۔ اسلامی تعبیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی۔ البتہ کچھلی مرتبہ یورپ کے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا۔ اور وہاں قدیم فنون کے مقابروں دیکھنے کا موقع ملا۔ ان قبروں کے ساتھ دفن بادشاہوں کے بُت بھی تھے۔ جن میں قوت اور ہیبت کی ایک ایسی شان تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمر رضہ کی مسجد اور دلی کی مسجد قوۃ الاسلام بھی پیدا کرتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا جب میں نے مسجد قوۃ الاسلام کو پہلا مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر جراثیمی طبیعت پر اس وقت ہوا وہ مجھے اب تک یاد ہے، شام کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ اور مزب کا وقت قریب تھا۔ میرا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر بنا زادا کروں۔ لیکن مسجد کی قوت و جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فضل ایک جرات سے کم معلوم نہ ہوتا تھا۔ مسجد کا وقار مجھ پر اس طرح چھا گیا کہ میرے دل میں صرف یہ احساس تھا

کہیں اس مسجد میں گزار پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔

اُنڈس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن حملہ بول قمی زندگی کے قوسے شل ہوتے گئے، تعمیرات کے اسلامی انداز میں منہٹ آگیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فنی نظر آیا۔ قصرِ نرہادیوں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجدِ قطبہِ مذہب دیول کا مگر الحمراء محض مہذب انسانوں کا پھر ایک تبسم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا:-

”میں الحمراء کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا، مگر بعدِ نظر اٹھتی تھی دیوار پر ”هُوَ الْغَالِبُ“ لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا، یہاں تو سرِ طرختِ خدا ہی خدا غالب ہے۔ کہیں انسان غالب نظر کئے تو بات بھی ہو۔ اس کے بعد پھر تھوڑی دیر تک ہندوستان کی اسلامی عمارات کا ذکر ہوتا رہا۔ تاج محل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:-

”مسجدِ قزوۃ الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی۔ بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو منہٹ آگیا ہے، اور دراصل یہی قوت کا عنصر ہے جو حُسن کے لئے توازن قائم کرتا ہے۔“

سجید اللہ - دلی کی جامع مسجد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر صاحب - وہ تو ایک نیچر ہے!

ہم اس فقرے پر ہنسے اور ڈاکٹر صاحب بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس منزل پر پہلائی تعمیرات کے متعلق یہ دلکش بحث ختم ہوئی۔ اب شام کے ساڑھے سات بج چکے تھے، اور تین گھنٹے کی اس مسلسل نشست کو طول دینا کچھ ایسا مناسب بھی نہیں تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو ”ان مشورہ طلب“ لگا ہوں سے دیکھا جنہیں ہم نے معمولاً ڈاکٹر صاحب سے اجازت لینے کا پیشِ خیمہ قرار دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صبرِ معمول ہم سے کہا ”اچھا! چلتے ہیں آپ؟“ اور اس کے بعد ہم رخصت ہوئے۔

حمید احمد خاں

”تاریخِ علامہ“

۱۳۵۴ھ

آں امین سوزِ مشنِ ثانی مناد

آں قلعِ بکرت - آں ساقیِ فنا نڈ

مدرق و خلوص و مصفا باقی نماند

خستِ برکت از جاں اقبال ما

ما تہی پیاد و اما نہیم حیف!

در سفرِ گفت و خندِ اوقات

حفیظ ہرثیا دیوری

۱۳۵۴ھ

لے علامہ مرحوم کا ایک شعر مثنوی

جہاں نما

اُردو اور اتحاد ہندو و مسلم

اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی اُس ناپاکی کے اسباب پر غور کیا جائے جو اس ملک کی ذلت اور غلامی کا موجب بنی ہوئی ہے تو اس کا سب سے بڑا سبب یہی نظر آتا ہے کہ گزشتہ ایک ہزار سال کے قریب کے باوجود بھی یہ دونوں قومیں ایک دوسری کو سمجھ نہیں سکیں اور ایک قوم دوسری کے جذبات و محسوسات اور خیالات و عقاید سے اتنی ہی بیگانہ ہے جتنی مسند پار کی کوئی قوم۔

مغلوں کے دورِ حکومت میں یہ دونوں قومیں ایک دوسری سے کسی قدر قریب آ گئی تھیں اور نتیجہً ایک مشترک کچھ بھی پیدا ہوا تھا جس کا ذریعہ اظہار اُردو زبان بنی۔ خیال یہ تھا کہ آئندہ چل کر اُردو زبان اتحاد ہندو و مسلم کا سنگم قرار پائے گی لیکن عیار و شنول کی پرکاری اور نادان دوستوں کی سادگی آج کل اُسی زبان کو جو اس ملک میں بسنے والی ان دو عظیم الشان قوموں کو ایک دوسری سے قریب تر لارہی تھی مسخ کرتی ہے۔

حال ہی میں سر تیج بہادر سپرو نے جماعتی مساوات کا تذکرہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے کہ ہندوستانی اگر دل سے چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو جائیں تو انہیں چاہئے کہ وہ اُردو زبان کو ملکی زبان بنائیں، اس کی اصلاح و ترقی کی کوشش کریں اور بلا تمیز مذہب و ملت اسے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیں۔

سر تیج بہادر سپرو نے اسی سلسلے میں یہ حقیقت بھی بیان کی کہ ”اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان ہے۔ دونوں قوموں نے اس سے پیدا کیا اور اب دونوں کا فرض ہے کہ اسے ترقی دیں اور پھیلایں۔ آخر میں سر سپرو نے فرمایا کہ اُردو زبان محض اس لئے وجود میں آئی تھی کہ اس کے ذریعے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کیا جاسکے۔ اب یہ کس قدر رنج کا مقام ہے کہ خود یہی ذریعہ اتحاد پناہ لئے نفاق بنا ہوا ہے اور اتحاد و ترقی کی کوششوں کے بجائے اس ملک کے گوشے گوشے میں عداوت بکھڑی ہے۔

یاجت ہے اُردو ہندی کی یا قربانی یا جھنگل ہے

مغلوں کے عہد میں ہندوستان کی خوشحالی

فرانسیسی سیاح برنیر نے اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں ہندوستان کی سیاحت کی۔ اس نے ہندوستان میں جو خوشحالی

اور فارغ البالی کا شاہدہ کیا اس کا اندازہ ذیل کی چند سطروں سے ہو سکتا ہے جو اس نے سرزمینِ بنگالہ کی زرخیزی اور دولت مندی کا تذکرہ کرتے ہوئے سپردِ قلم کی ہیں۔

”تایج کے ہر دور میں یہ خیال عام رہا ہے کہ مصر دنیا کا سب سے زیادہ زرخیز خطہ ہے اور آج کل کے مستعین بھی یہی کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دوسرا خطہ درستی کے انعامات سے مصر کی طرح بالامال نہیں۔ لیکن بنگال کی سلطنت کی ماحول کے سلسلے میں دودھ جو معلومات مجھے موصول ہوئی ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں جراتاً کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں زرخیزی کے لحاظ سے جو سرزمین کو دیا گیا ہے اس کا اصلی حقد بنگال ہے۔ یہاں یا دل اس کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ اندو کی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد ان سے نہ صرف ہمایہ نظوں کی بلکہ دُور دور کے علاقوں کی طلب پوری کی جاتی ہے۔ شکر بھی یہاں اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے کہ اس سے نہ صرف گلوٹنس اور کرناٹک کی سلطنتوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں (کیونکہ ان کے ہاں خود بہت کم شکر پیدا ہوتا ہے) بلکہ بنگال کی مشرقی عرب عراق اور ہندوستانی کے راستے سے ایران کو بھی بھیجی جاتی ہے۔ بنگال مٹھائی کے لئے بھی خاص طور پر مشہور ہے۔ ٹکی ضروریات کے مطابق میوں کی کاشت بھی کی جاتی ہے اور اس سے ارزاں قیمت بھی بنا کر فروخت کیے جاتے ہیں۔ عوام کی عام غذا مختلف قسم کی سبزی چاول اور کمسن ہے اور ان چیزوں کی قیمت بالکل بے حقیقت ہے۔ ایک روپے میں بیس یا اس سے بھی زیادہ مٹر فیال مل جاتی ہیں۔ ہر قسم کی تازہ اور خشک میوے کی بھی اتنی ہی افراط ہے۔ مختصر یہ کہ بنگال میں ہر قسم کی ضروریات زندگی نہایت کثرت سے موجود ہیں۔ میں نے اور کسی ملک میں ہر چیز کی اتنی بہتات نہیں دیکھی جتنی پیداوار میں شکر کے علاوہ ریشم اور کپاس کی وہ کثرت ہے کہ بنگال کو ہم نہ صرف تمام ہندوستان یا سلطنتِ منیب کی ضروریات کا تکمیل قرار دے سکتے ہیں بلکہ یورپ کی ضروریات کا تکمیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ کس کثرت سے بنگال کا ریشمی یا مٹوئی، سنہ یا رنگین موٹایا باریک کپڑا لاہور اور کابل تک تمام سلطنتِ مغلیہ میں بھیجا جاتا ہے اور اس کے علاوہ کتنی بڑی مقدار میں اس کی برآمد غیر ممالک کے لئے بھی کی جاتی ہے۔ بنگال کی اسی زرخیزی کو مد نظر رکھ کر بنگالی، ولندیزی اور انگریز کم کرتے ہیں کہ بنگال میں داخل ہونے کے لئے سیکڑوں روپے میں تین ہزار روپے کے گاؤں کی راسخہ نہیں۔“

ابراہیم لیکن

۱۸۷۱ء کے دورِ زکی تقریب پر سپرنگ فیلڈ امریکا میں سزا ایڈورڈ کے گھر میں بہت گہما گہمی اور چل پھل نظر آتی تھی۔ شام سزا ایڈورڈ کی بہن میری ٹاؤ کی شادی ہونے والی تھی جس کی خوشی میں اب کی ضیافت اور اس کے بعد رقص کی مہفل کا اہتمام

بھی ہو رہا تھا۔

دوہین تیار ہو چکی اور مہانوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا لیکن اب تک دولہا کہیں نظر نہ آتا تھا۔ بھوڑی دیر کے بعد دولہا کی تلاش میں نکل گئے کیونکہ وہ غائب تھا۔

اپنی اس توہین اور ذات کے متاثر ہو کر میری ناؤ جا کر اپنی خواہگاہ کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئی۔ مہمان چینگو بیاں کرتے مجھے واپس چلے گئے۔ کھانے کو گئی نے ہاتھ بھی نہ لگا یا اور رقص کا کمرہ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ کیچے بعد دیگرے گھر کے کمروں کے پرزے بچھنے لگے اور گھروں نے اپنی اپنی خواہجہاںوں میں چلے گئے۔

دولہا کہاں تھا؟ وہ راستے کے وقت ایک جگہ میں پھر رہا تھا۔ اس کے دل میں دو مختلف جذبات کے درمیان ایک بردست جنگ ہو رہی تھی، زندہ سے پاس عمدا اور مردہ سے پاس دنا کے متضاد مزاجات اسے کسی طرح چین نہ لینے دیتے تھے۔

وہ ایک لڑکی کے غناک تصویر میں ڈوبا ہوا تھا۔ سیاہ چشم اور پچھل میری ناؤ نہیں بلکہ ایک خرب سر لے دار کی خیر شیریں حرکت لڑکی این رنچ۔ یہ نیلی آنکھوں اور سُرخ مائل مجھ سے ہالوں والی ایک ڈبلی پٹی خوش صورت لڑکی تھی، لوگ کہا کرتے تھے اس کا دل فرشتوں کی طرح معصوم اور پاکیزہ ہے۔

پریشان حال نوجوان دل میں کہہ رہا تھا، اسباب واقعی فرشتوں میں شامل ہو چکی ہے، مرنے کے وقت این نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مرنے سے چند ہی دن پہلے این نے اُس پر اپنی محبت کا راز افشا کیا تھا۔ نوجوان کا سر جھک گیا۔ تاریکی میں بیس سال کا یہ جوان ہستہ ہستہ اپنے چہرے پر پائل گھسیٹ رہا تھا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا "میں بھی کتنا احمق ہوں، اجاہ پرستی نے مجھے گمراہی کے حال میں پھنسا لیا ہے۔"

وہ ایک ذلیل اور حکومت کی مجلس وضع قوانین کا رکن تھا لیکن اس کے پاس نہ دولت تھی، نہ خاندانی اعزاز، وہ امریکا کے برساتانی طبقے سے اٹھا تھا اور سچا پے سے نہایت محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے والدین کا تعلق سوسائٹی کے اس طبقے سے تھا جہے امریکا کے جی غلام بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اسے اب تک اپنی ماں دوسی ہینکس یاد تھی، اگرچہ جب اس کا انتقال ہوا اس کی عمر کس سال سے زیادہ نہ تھی یہ حیرت جنینا کے ایک میندار کی غیر قانونی بیٹی تھی۔ اس کو مذہب کے بہت لگن تھا اور ہر وقت گھر سے خیالات میں ڈوبی رہتی تھی۔ بیٹے کو بھی ماں کی ہی طبیعت ورثہ میں ملی چنانچہ ایک زمانے میں اس نے یہ الفاظ کہے تھے "میری ماں پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں میں کچھ بنایا آئندہ ہوں گا اس کے لئے میں اپنی ماں کا نمونہ حاصل ہوں۔"

وہ اس قدر مغرب تھے کہ جس چوٹی جھونپڑی میں رہتے تھے اس میں دیبا بھی نہ جلا سکتے تھے۔ ان کے ہاں صرف ایک

کتاب تھی یعنی بنجیل مقدس۔ یہ لڑکا جسے اُندہ پل کر وکیل بننا تھا، چوہے کے سامنے لیٹ جاتا اور اس کی کوئیں ایک کلوی کے تختہ پر کوئلے سے لکھنا سیکھتا۔

جب یہ ذرا بڑا ہوا تو بہت طاقتور نکلا۔ ایک مدت تک درخت کاٹنا اور لکڑی کے جنگلے بنانا پناپیٹ پاتا رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ طرح طرح کی سختیاں جھیل کر اپنی تعلیم کا بھی انتظام کرنا رہا۔ آخر اس تمام محنت مشقت کا نتیجہ کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مگر آج یہ صورت تھی کہ وہ اس عورت کی رسوائی کا موجب بنا ہوا تھا جو اس کی شادی کی درخواست منظور کر چکی تھی۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا کہ اس میں شادی کی درخواست نہ کرتا یا کاش وہ اسے منظور نہ کرتی! اصل میں دونوں جاہ پرست تھے۔ محنت کش وکیل نے معاشرہ میں بلند حیثیت حاصل کرنے کے خیال سے اس عالی نژاد حسین کے ساتھ شادی کی تجویز پیش کی اور دودھ اندیش لڑکی یہ بھانپ چکی تھی کہ اس نوجوان کے سینے میں وہ چنگاری دہی ہے جسے ہوا دے کر میں اپنے نام کو شہرت و عظمت کے آسمان درخشاں تار جھانکتی ہوں۔ لیکن اس وقت جگل میں یہ نوجوان خود کشی کا ارادہ کر رہا تھا۔

دوسرے دن دوستوں نے اس کو ڈھونڈ پایا اور اسے ساتھ لے کر گھر پہنچے۔ اس کے بعد کئی دن تک اس کی گردن زنگاری کی گئی کہ یہ کیس خود کشی نہ کرے۔ آخر نوجوان دوبارہ اپنے کاروبار میں لگ گیا اور ایک غیر خواہ خاتون کی کوشش کے طینل میری ٹاڈ سے اس کی مصالحت ہو گئی۔ اور پھر یہ دونوں دولہا دولہن بھی بن گئے۔

دولہا کے دل میں سرست کی کوئی شق نہ تھی لیکن وہ احساسِ فرض کے خیال سے مجبور تھا۔ ایک چھوٹے لڑکے نے اسے شادی کا لباس پہنے ہوئے دیکھ کر سوال کیا "آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اس نے جواب دیا "شاید جہنم کو جا رہا ہوں" آخر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے شادی کے جہیز کو سخت کھٹکے — ایسا برا نام لیکن۔

میری ٹاڈ کو وہ مرتبہ حاصل ہوا جس کا اس کی جاہ پسندی نے بھی خواب تک نہ دیکھا تھا۔ وہ ملک کی سب سے بڑی خاتون کی حیثیت سے "وائٹ ہاؤس" میں رہی لیکن لیکن اس کی کوششوں سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی قابلیت سے صدر جمہوریہ امریکا "کے مرتبہ تک پہنچا۔

لیکن نے ایک نہایت نازک دور میں صدارت کا منصب حاصل کیا۔ امریکا کی خانہ جنگی کے دوران میں اس نے شمالی علاقے کی قیادت کی اور یونین کو بچایا۔ اس نے غلاموں کو آزاد کیا اور کاسیاب ہو جانے کے بعد وہ ایک قاتل کی گولی سے ہلاک ہو گیا۔ آج اپنے کارناموں کی وجہ سے اس کا شمار دنیا کی چند بڑی بڑی شخصیتوں میں کیا جاتا ہے۔

حامد علی خاں

انجام

لوئیں بیان کرتا ہوں تفصیل آرزو

جب میں جوان تھا مری دُنیا جوان تھی
 دل تھا پھنسا ہوا کسی دامن نگاہ میں
 جب حُسن و عشق پر تھا مرا انحصارِ زیست
 ارمان پل رہے تھے کسی جلوہ گاہ میں
 ایمان و کُفر سے مراد دل بے نیاز تھا
 اور تھا میں سر بسجودِ محبت کی راہ میں
 خاکِ درِ حبیب میں تھی اس قدر کشش
 ملتی نہی یہ بات کسی بارگاہ میں
 تھی مجھ کو آرزو کہ یہ دُنیا بنے بہشت
 بس جائے حُسنِ ساقی ہوش نگاہ میں

ہونے نہ دی زمانے نے تکمیل آرزو

فطرس نقوی احسانی

غزل

بیٹھے تھے اُن کی یاد میں کن خیر سے ہم
 کیسے چھپائیں دل کی لگی سائے گھر سے ہم
 وہ آئے اور کہا پلٹ آئے سفر سے ہم
 تذلیل شانِ ضبطِ سہی، یہ محال ہے
 اس "مبتدا" کو کیوں نہ سمجھ لیں "خبر" سے ہم
 کب تک چر نہیں آنکھ تمہاری نظر سے ہم
 کافر نگاہیوں کا سبب احسنِ دلفریب
 گزیریں صبح و شام، تری بگڑ سے ہم
 کعبہ کا طوفِ فرض، مگر اس کا کیا علاج
 اس "مبتدا" کو کیوں نہ سمجھ لیں "خبر" سے ہم
 انجامِ اُمتداد و وفا کچھ نہ پوچھئے
 کرتے ہیں مشورہ دلِ نامعتبر سے ہم
 چھائی ہے حسرتوں کی گھٹا اُس مقام پر
 پیتے تھے جامِ عشقِ جہاں اُس نظر سے ہم
 یارائے ضبطِ دردِ جدائی نہیں رہا
 اے حُسنِ ہوشیار، نکلتے ہیں گھر سے ہم

اوراقِ سادہ ہوتے ہیں لمحاتِ عمرِ شاد

رنجئے ہیں ان کو سُرخِ خونِ جگر سے ہم

شاد عارفی

بدصورتی

اسے میری بدذوقی سمجھئے یا عامیانه روش سے بچ کر مٹنے کی عادت، بہر صورت یہ ایک حقیقت ہے کہ میں بدصورتی کو ہمیشہ خوبصورتی پر ترجیح دیتا ہوں، خوبصورت چیز میں دیکھ کر میں ہمیشہ اپنے دل میں یہ سوچتا ہوں کہ خوبصورتی تو ایک عارضی شے ہے، شفق کی طرح جلد مرٹ جانے والی، تو بس قزح کی طرح گم ہو جانے والی لیکن وہ چیز جو ہمیشہ قائم رہتی ہے، وہ جس پر ہمارے حیات بھروسہ کر سکتے ہیں جس کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ وہ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے بدصورتی اور اس دنیا میں تو ہر شے چلے اس کی ابتدائی صورت کتنی ہی روشن اور دلپذیر کیوں نہ ہو اپنے انجام کو پہنچ کر بالضرور بدصورت بن جاتی ہے۔ پھول مڑ جاتا ہے، عورتیں بوڑھی ہو جاتی ہیں، شفق رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لیکن بدصورتی ہمیشہ قائم رہتی ہے، شروع سے لے کر آخر تک۔ تو پھر کیوں ان چیزوں کی طرف توجہ دی جائے، جو عارضی ہیں، وقتی اور ناپائدار، اور بشر اپنے دل کو ان چیزوں کی طرف کیوں نہ مائل کرے جس کی حقیقت ابدی و دوامی ہے، جو کبھی بدل نہیں سکتیں، جن کی بہت میں کبھی انقلاب نہیں آ سکتا، جو قدرت کے قانون کی طرح اٹل ہیں۔

بدصورتی کے متعلق میرے خیالات کسی مافیائے لغزش کا نتیجہ نہیں، ان کی اساس خالص فلسفیانہ ہے، اسے مذہب، آٹھ اور اس قسم کی دیگر باتوں سے کوئی تعلق نہیں، خوبصورتی کے متعلق آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک اعتباری اصطلاح ہے جس کے متعلق کبھی کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی، یہ کتنا تو بہت مشکل ہے کہ فلاں چیز حسین ہے، لیکن کسی بدصورت چیز کے متعلق ہر وقت اور ہر لمحہ نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بدصورت ہے۔ اور یہی بدصورتی کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ علاوہ ازیں بدصورتی زندگی اور کائنات کا جدو لا ینفک ہے، اس کے بغیر خوبصورتی ایک لمحہ نہیں جی سکتی۔ حسن کی بنیادیں بدصورتی پر استوار ہوتی ہیں، اور اس لحاظ سے بدصورتی بھی ایک طرح کا حسن ہی ہے۔ آئین شائین کے اضافی نظریہ سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے، اور شاید اسی نظریہ کے ماتحت ہمیشہ دنیا میں سکھ کے ساتھ دکھ، پھول کے ساتھ کانٹے اور خوبصورت عورتوں کے ساتھ بدصورت مرد رہتے ہیں۔

روحانی نقطہ نظر سے بھی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں آئین حسن صرف بدصورتی میں ہے۔ مثال کے طور پر آپ دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کی صورتوں کی طرف توجہ کیجئے، آپ دیکھیں گے کہ صرف بدصورت آدمی ہی دنیا کے ”بڑے آدمی“ بنتے ہیں۔ سچا ہے، ظہر بصورت آدمی تو عام طور پر فوج میں سپاہی بھرتی ہوتے ہیں اور بدصورت آدمی ان پر

حکومت کرتے ہیں، دُور کیوں جائے ہندوستان کے گیارہ صوبوں کی اسمبلیوں کے ممبروں کی صورت میں ملاحظہ کیجئے، ہوا ہے چند تہنیت کے لپٹی سب وہ ہیں جنہیں دیکھ کر بے اختیار خدا کی قدرت یاد آتی ہے، میں یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ بڑائی صرف بدعورت آدمیوں کی قیمت میں لکھی ہوتی ہے، چنانچہ اس بیسیویں صدی میں جب مردوں اور عورتوں کو حسین بنانے کے لئے سینکڑوں طریقے برتتے جا رہے ہیں، میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں کہ دُنیا کے بڑے بڑے رہنما، بڑے بڑے امیر، فوج کے جنرل، ادیب، فلسفی، سائنسدان بے حد بدعورت واقع ہوئے ہیں۔

در اصل مجھے بد صورتی سے ایک گورڈ عشق سا ہو گیا ہے، لوگ تو خوبصورت عورتوں پر مرتے ہیں، میں بد صورت عورتوں کو دیکھ دیکھ کر میتا ہوں، اور جب کبھی میرے گھر میں میرے بیاہ کے متعلق کچھ بات چیت شروع ہوتی ہے تو میں کچھ گھبرا سا جاتا ہوں اور اکثر نوجوان کی طرح جوان عورتوں پر لڑکی کیسی ہے، خوبصورت ہے نا، رنگ کیسا ہے، قد و قامت؟ اور اس سبب کے سوالوں کا تانا بانہہ دیا کرتے ہیں، میں بھی 'اول جلول' کہنے لگ جاتا ہوں، مثلاً

”لو کی بد صورت ہے نا؟“

”ہاں“
 ”لیکن محض“ ہاں“ سے میری تسلی نہیں ہوتی چنانچہ میں پھر سوال کرتا ہوں
 ”کیا اُس کی جلد بالکل سیاہ ہے، سیاہ جیسے اماؤس کی رات
 ”ہاں، ہاں، اطمینان رکھو“

اور وائٹ؟

”میں نے اور سُرُخ! شاید پان بہت کھاتی ہیں“

”بہت خوب . . . اچھا! . . . مگر یہ تو بتاؤ کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں؟“

”آنکھیں؟ آنکھیں تو ذرا بڑی بڑی سی ہیں، چہرے پر پہلی معلوم ہوتی ہیں اور بال بھی تو گنگرے لگے ہیں . . .“

”جج . . . جج . . . جج . . . میں ہاتھ ملتے ہوئے کتابوں کی تو بہت بڑی بات ہے۔“

اور اس طرح یہ ناظمہ ٹوٹ جاتا ہے۔

اسی طرح کئی ناطے آئے، مگر ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقض موجود تھا، کسی کا رنگ کھٹا ہوا تھا، تو کسی کی ناک تھوہا، کسی کی کمر تلی تھی، تو کوئی سرودھ، غنچہ، امید کھلا پر نہ کھلا۔ اور گلاب پیری عمرتیس سے کچھ اُدھر ہے، اگر پھر بھی پُر امید

ہوں اور ایک ایسی صورت کی تلاش میں ہوں جو قابل بدصورت ہو۔ . . . ایک بار! . . . منٹوپارک لاہور کی ٹائٹل میں ایک ایسی صورت دیکھی تھی جس کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ”وہ ہے میرے خوابوں کی محبوبہ“ لیکن افسوس کہ وہ بھی کسی کی بیابانگی!

بدصورتی کے خلاف اگر کوئی دلیل دی جاسکتی ہے تو وہ ہے شاعروں کی شاعری، شاعر لوگ شعر کہتے ہیں تو صورت میں چیزوں کی نظر میں حین عزتیں حسین پھول، حسین وادیاں، بس یہی ان کے موضوع ہیں۔ کیا کبھی کسی شاعر نے مگرچھ کی شان میں بھی طبع آزمائی کی؟ کبھی بدصورت عورت کو دیکھ کر کبھی کسی شاعر کے شعراں جذبات کو تھکب ہوئی؟ اگر نہیں تو بس میرے بدصورتی ایک بیکامٹے ہے۔ کچھ اس قسم کے دلائل بدصورتی کے خلاف شاعر مزاج لوگوں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں، لیکن ان دلائل پر زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ شاعر لوگوں سے قویہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی سچی اور جذباتی حرکتوں سے بے نیاز ہو کر اس ہم سوال کے سن قہج پر غور کر سکیں، اس کے علاوہ وہ تو محض خوبصورتی کے گن گانے کے سبب کاٹھانے ہیں، اگر آج لوگ بدصورتی کی اہمیت کو سمجھ جائیں تو یہی شاعر لوگ جو آج بلبلیوں اور گلاب کے پھولوں پر جان چھڑکتے ہیں اگلے اور بھنگ کی گونپوں پر طبع آزمائی کرنا شروع کر دیں، ضرورت یہ ہے کہ پہلے آپ لوگ کی ذہنیت میں بدصورتی ہی تبدیلی واقع ہو، لیکن میں اس پر بھی شاعر لوگ اعتبار نہیں کروں گا، کیونکہ شعر کہنا بذات خود ایک خوبصورتی ہے، اور خوبصورتی کا اعتبار کیا؟ خود شاعروں نے اپنے لکھول شعروں میں حین کی بیوفائی اور خوبصورتی کی بے ثباتی کا رد کیا ہے، پھر یہ لوگ کس طرح بدصورتی کے خلاف کچھ کہنے کی جرات کر سکتے ہیں۔

خوبصورتی فنا دکی جڑ ہے، پتھر اور دھات کے زلنے سے لے کر آج تک خوبصورتی دنیا کے امن کو تباہ و برباد کرتی چلی آئی ہے خوبصورت چیزوں کے حصول کے لئے لوگوں نے اپنی جانیں گواہیں تنہا میں سرگئیں، اور قومیں فنا ہو گئیں، لیکن ہم میں کلاسی جنوں خیر و ملائگی سے پُرنے راستے پر دھکے جا رہے ہیں، خوبصورتی، خوبصورتی، خوبصورتی، اس لڑائی کے جوش میں ہم نہیں سوچتے کہ امن کا عالم کیوں خراب ہے؟ وہ کیا چیز ہے جو اقوام عالم میں اتحاد نہیں ہونے دیتی؟ لوگ کیوں لڑتے ہیں؟ . . . اگر زاغہ و فکر سے کام لیا جائے تو صاف یہ چلتا ہے کہ دنیا میں بنائے نزل محض خوبصورتی ہے، لوگ لڑتے ہیں خوبصورت چیزوں کے لئے، خوبصورت خیالوں کے لئے، خوبصورت عورتوں کے لئے، خوبصورت خطوں کے لئے، خوبصورت ٹیکوں کے لئے، اگر لوگ آج بدصورتی کی اہمیت کو سمجھ جائیں، تو ان تمام ہوکمتا ہے، گذشتہ دس بارہ ہزار سال کی انسانی زندگی میں خوبصورتی نے ہم پر جو قیامتیں ڈھائی ہیں تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم لوگ خوبصورتی کے معنی غرض سے اکتا ہو جائیں، اور خوبصورت چیزوں کے لئے لڑنا بھگدڑنا چھوڑ دیں۔ یہ فیصلہ باتیں میں، آخر ہماری انسانی زندگی کی اساس خوبصورتی پر نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی بدصورتی پر قائم کی، اتوں ہی پر ہے۔

کرشن چندر

دسمبر کی ایک رات

کھوئے کھوئے دشت پر مخروں ہند کوں کا غلاف
جیسے لالٹھی کے سہاے ریگتے ہیں ناتواں
یا حلق ہیں فضاے تیرہ میں دیووں کے تخت
مانگتا ہے خواب میں جیسے کوئی مفلس دُعا
جیسے دن بھر کی کمائی کو گنیں سرمایہ دار
ہر جگہ مغموم - ہر نظر ارہ گھبرا یا ہوا
ڈھیلے ڈھالے جسم - انبارِ صریح و پرنیاں
رٹ رہے ہیں خواب میں الفاظ دُہرائے ہوئے
میکدوں کی چھاؤں میں لیٹے ہوئے ہیں میگسار
جن کے باطن سرو اور تار یک - ظاہر تابدار
بے تحاشا دُور قی مالا اچانک روک گئی

سوئی سوئی گھاس پر شبِ بنم کا افسردہ لحاف
پھیکے پھیکے آسمان پر کبھری کبھری بدلیاں
سر جھکاٹے وانگتے ہیں دُور برگد کے درخت
پست قد پودوں میں ہلکی سرسراہٹ کی صدا
اوڑھ کر کٹرے کی چادر سو رہے ہیں کوہسار
نیند کا جا دُواندھیرے گاؤں پر چھپا یا ہوا
سو رہے ہیں گرم ایوانوں میں شاہانِ جہاں
اپنے حجر میں ہیں واعظ پاؤں پھیلانے ہوئے
گرم و زغل کو لپیٹے سو گئے ہیں پہرہ دار
مست ہیں اپنے گھروں میں شاعرانِ ذی وقار
اپنے آسن پر ہی پنڈت جی کی گردن جھک گئی

ہاں مگر بستی میں اک بیوہ ابھی بیدار ہے درد کی شدت سے آنکھیں پھینچنا دشوار ہے

ذبح کرتا ہے اُسے دن رات بے غیرت سماں

غور کر - اے وہ کہ تیرے سرو پہ ہے مذہب کا تاج

احسن الکلام

دُنیا عیش و غم کا مساوی حساب ہے
 پوچھو نہ مجھ سے کیوں تری حالت خراب ہے
 لطفِ حیاتِ عیش ہے، جب تک شباب ہے
 برباد ہیں تباہ ہیں، آشفستہ حال ہیں
 دُنیا کے حق میں ایک تری گردِ شبنم گاہ
 دل توڑیے کہ عیدِ وفا کیجیے شکست
 کچھ غم نہیں مجھے تری چشمِ عتاب کا
 مایوس کر رہے ہیں وہ بے عرضِ دعا
 دُنیا ہے اک نمائشِ خوابِ آفریں مگر
 تلوار ہو چکی ہوئی جیسے، اسی طرح
 اللہ رحمتِ سادہ کی رنگینی مذاق
 غمازِ رازِ عشق کا ان کے سوا ہے کون
 تصویرِ خواب وہ ہے، تعبِ سیرِ خواب ہے
 سوچو! تمہارے پاس ہی اس کا جواب ہے
 پھر زندگی نہیں ہے وبال و غذا ہے
 تم پر مٹے ہوؤں کی یہ مٹی خراب ہے
 اے عشوہ گرِ محرکِ صدا انقلاب ہے
 ہر کام آپ کے لئے کارِ ثواب ہے
 تو سامنے ہے، ذوقِ نظر کامیاب ہے
 گویا وہاں سوال سے پہلے جواب ہے
 جو دیکھتے ہیں جاگتے ہیں وہ یہ خواب ہے
 وہ حسن بے پناہ ہے، جو بے حجاب ہے
 گلکاریوں سے تختِ گلشن، نقاب ہے
 یا چشمِ تر ہے یا دل پر اضطراب ہے
 احسن کے دل کو خوب چُنا اپنے واسطے
 یہ حُسنِ انتخابِ ترا لا جواب ہے

احسن مارہروی

نگار خانہ چین

موسم گرما کا آغاز

بانس کے درختوں کا سایہ گھٹنا ہو رہا ہے
پرنندوں نے سہ پہر کی فضا کو گیتوں سے بھر دیا ہے
ہمارے آلوچے کے درختوں سے بے وفائی کر رہی ہے
آدمی تھک چکا ہے، کیونکہ طویل دن ختم نہیں ہوتا

۹۰۰ء

(چ - شو - چین)

وہ کہاں ہے؟

میں ہندی کے کنارے
پہاڑ پر چڑھ رہا ہوں — بالکل تنہا
چاند کی شاعیوں لہروں پر قصاں ہیں
پچھلے سال بھی میں یہی نظارہ دیکھ رہا تھا
لیکن اس وقت میرے ساتھ
وہ بھی تھی

ہر چیز اُسی طرح موجود ہے
لیکن دل کو جس کی تلاش ہے
وہ یہاں موجود نہیں

۹۰۰ء

(چاؤ - چین)

نگارہ کرم

حسین لڑکیاں برآمدوں میں چلیں کرتی پھرتی ہیں
ان کے گیتوں کی آواز میں جنگ ورباب کے نغموں سے کھیلتی ہوئی یہاں آ رہی ہیں

ذرا ادھر تو آؤ اور بتاؤ کہ جس حسینہ پر آج کرسی کی نگاہ کرم پڑی ہے
اُس کی پلکیں کیا دوسری لڑکیوں سے زیادہ شوخ اور دراز ہیں ؟

(ہسیا فونگ)

سبکدوشی کے بعد

اس مفرد اور صاف دل سابق وزیرِ اعظم کو
کسی سے دشمنی نہیں
اب وہ مغربی جھیل کے کنارے
بالش کے دروازوں والے مکان میں رہتا ہے
اسے اپنی پیشانی سرد کرنے کے لئے
کسی پتھری کی ضرورت نہیں
کیونکہ جنوبی سرد ہوائیں
اسے چومتی رہتی ہیں
اور اس کی سرکاری ٹوپی
ساحل پر پڑی نہایت سستی سے
مراغیوں کی طرف دھبکتی رہتی ہے

(لی - چیا - یو)

ایک قسم

انہوں نے قسم کھانی کہ مہنوں کو تباہ کر دینا چاہئے
اگر ضرورت پیش آئی تو ہم سب اپنی جانیں قربان کر دیں گے
اور اب پانچ ہزار سال ان کے لاشوں کو سہڑپ کر چکے ہیں
ان کی ہڈیاں دریا کے کنارے ادھر ادھر
بکھری پڑی ہیں

لیکن یہاں سے بہت دُور بنے والے حسینوں کو
ان کی صورتیں اب تک صاف دکھائی دیتی ہیں

(۱۰۰۰-۹۰۰ء)

(چپین - تاؤ)

موقع

جامِ تہارے ہاتھ میں ہے
گریزِ پاؤقت کو بھاگنے سے روک لو
آخر تم ہی بتاؤ کہ زندگی میں
کتنی مرتبہ چاند سر پر آتا ہے

(نامعلوم)

ایک حقیقت

چاند کی شمع نے
دریا کے بستر کو متور کر رکھا ہے
پانی کی رو خواہ کس قدر تیز ہو
شمع کو اپنے ساتھ نہیں بہا لے جاسکتی
بادل بہا لے سر پر اڑے جا رہے ہیں
پہاڑ کی چوٹی ان سے کہیں زیادہ اونچی ہے
لیکن انہیں آگے جانے سے نہیں روک سکتی

۱۸۰۰ء

(لو - چو - چہ)

مدی علی خاں

خونِ پاک

ہے نورِ ایزدی کی جھلک خونِ گرم و پاک انسان کے دل کو رکھتا ہے جو پاک تو بنا کر
 بنتی ہے اس سے غیرِ نچرِ شیشِ خاک شیطان کی فوج ہوتی ہے اس تیغ سے ہلاک
 پیکارِ زندگی میں یہی تیغ تیز ہے
 ہر ضرب جس کی شعافِ شاہِ برقِ یز ہے
 ہے جوئے خونِ پاک کرنِ آفتاب کی مستی میں اس کی لہریں میں جو ہیں شراب کی
 اس میں تڑپ ہے نعمتِ تارِ باب کی نگینیاں اسی سے ہیں بزمِ شباب کی
 ظلماتِ غم میں خانہٴ دل کا چراغ ہے
 اس کی بہارِ حُسن سے جی باغِ باغ ہے
 خوں سے دلوں میں چہرِ تمنا ہے لعلِ گول خوں سے فصولِ ہر حُسن کا اور عشق کا جنوں
 امواجِ خوں سے جتا ہے ہمت کا ارغنون افواجِ خوں کے سامنے افلاک ہیں لبوں
 جس کی رگوں میں خوں ہے شرافتِ اُسی کی ہر

دولت اُسی کی اور حکومت اُسی کی ہو

یہ سُرخ سُرخ چیز جسے کہتے ہیں اُهو عشقِ غیور پاک کی ہو اس سے اُبرو
سینوں میں اس سو اُٹھتا ہو طوفانِ آرزو اس آب سے حمیت و غیرت ہیں با وضو

پلتی ہے حُبتِ دین و وطن اس کی گود میں

کھلتا ہے زندگی کا چمن اس کی گود میں

قوموں کی اُبرو ہیں جو انانِ پاکباز پُر نغمہ سوزِ حق سے ہیں جن کے دلوں کے کما
جہالت میں جو ہیں جُزرہ و شاہینِ شاہباز جن کی نگہ سے ہوتا ہے آہن کا دل گدا

جو خونِ شعلہ ریز سے مشعلِ بہار ہیں

پاکیزگی میں خنجرِ بُراں کی مہار ہیں

میری رگوں میں خونِ شجاعت ہے موجزن میرے لہو میں عشقِ صداقت ہے موجزن

میرے بدن میں شوقِ شہادت ہے موجزن میرے سخن میں نورِ محبت ہے موجزن

روشن مرا سخن ہے مرے خونِ پاک سے

نکلا ہے آفتابِ دلِ تابناک سے

محبت کی نینگیاں

(ایک قافیے میں)

غمِ حرمِ اُڑا لیا ہے مجھ کو اُس بے بند سی پر
جہاں سے حُسن کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!

(ذوقی)

منوہ جلوہ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!

(اصغر گوئدوی)

نہ تو بدلا نہ میں بدلا، مگر یہ کیا قیامت ہے،
کہ اب مجھ سے تری صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!

(عادل خاں)

محبت نے اثر کو اس قدر بے حال کڑا لیا
کہ بیچارے کی اب تو شکل پہچانی نہیں جاتی!

(رائٹسبائی)

ترے جلوے بسے ہیں اس قدر نیری نگاہوں میں
کہ اب صورت کسی کی مجھ سے پہچانی نہیں جاتی!

(حفیظ ہوشیار پوری)

حفیظ ہوشیار پوری

کشمہ

افراد و رانا

الطاف حسین ————— پلانی طرز کے ایک پنجاہ سالہ بزرگ
حمیدہ خاتون ————— ان کی بیوی عمر ۵۴ سال
لطیف احمد ————— ان کا لڑکا عمر ۲۵ سال
احمد حسین ————— ایک پشپن یا نئے فوجی سپاہی، عمر ۶۰ سال
رفیق احمد ————— لطیف کے کارخانہ کا ایک ملازم
ملازم —————

زمانہ حال

فوجی لباس پہنے داخل ہوتے ہیں۔ ان کا بایاں ہاتھ بوند
کے پاس سے کٹا ہوا ہے۔۔۔۔۔ ان کے بیٹھنے کے بعد
حمیدہ خاتون۔ اتنی گرمی میں، اور یہ لباس۔ تمہیں گرمی نہیں
لگتی۔

احمد حسین۔ یہ بھی کوئی گرمی ہے، جو شخص افریقہ میں رہ
چکا ہو، وہ اتنی معمولی گرمی کی پروا نہیں کرتا۔

حمیدہ خاتون۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔

احمد حسین (لطیف سے) تمہارا کام کیا چل رہا ہے۔ تم لوگ
بھی جادو گروں سے کم نہیں ہو۔ جہاں تم نے کہا تو شئی
ہو جائے، ساری دنیا مندر ہو گئی۔ بے جان مٹین سے
کہا نخل، اور وہ چلنے لگی۔۔۔۔۔ مجھے بھی جادو
کا تصور آسا عجیب ہے۔

پہلا منظر

راگنیری طرز کے مطابق سجا ہوا ایک کمرد حمیدہ خاتون
الطاف حسین اور لطیف بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں الطاف حسین
ملل کا ایک کرت، غراہ دار پانچواں پہنے ہوئے ہیں سر کے
بال کھڑے ہوئے ہیں۔ بینک پیشانی پر لگی ہوئی ہے لطیف
ریشمی قمیص اور سفید پتلون پہنے ہوئے ہے۔

الطاف حسین۔ (پہنہ پونچھتے ہوئے) اُن کس ہلاکی گرمی ہے
(کچھ وقفہ کے بعد) احمد حسین اب تک نہیں آئے۔
لطیف۔ آئے ہوں گے۔ راستہ میں کوئی بل گیا ہوگا۔ بزرگ
گئے ہوں گے۔ (باہر دھک کی آواز) لیجئے آگئے۔
(الطاف حسین، جا کر دروازہ کھولتے ہیں۔ احمد حسین

لطیف - کیا وہ اس وقت بھی آپ کے پاس ہے۔
 احمد حسین - ہاں ہے تو اگر تم دیکھ کر کیا کرو گے۔ اول تو
 تمہیں یقین نہ آئے گا۔ دوسرے وہ کوئی ایسی دیکھنے
 کی چیز بھی نہیں ہے۔ (جب میں منو لے ہوئے)
 ایک معمولی بتم کے سچوں کے کھلوے جیسا بت ہے۔
 (جب سے ایک بدو منع باہ رنگ کا چھوٹا سا بت
 نکال کر بتاتے ہوئے) یہ دیکھو۔

الطاف حسین - اس میں کیا خاص بات ہے۔
 احمد حسین - اس میں جادو کا اثر ہے۔

الطاف حسین - لا حول ولا قوۃ۔ (دب احمد حسین کو دینے لگا ہے)
 احمد حسین - (بُت کو تیل پر رکھ کر اسے گھورتے ہوئے اپنے
 آپ سے) ایک بُدھ فقیر، بڑا ہی مقدس آدمی، یہاں
 ایک ہی حالت میں بیٹھا رہنے والا۔ خدا سے لو لگائے
 ہوئے۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ لوگ قسمت کے غلام ہیں،
 تدبیر تقدیر کو بدل نہیں سکتی۔ اور اگر کوئی اس کی کوشش
 کرے تو تباہ ہو جائے۔ اس نے اس بُت کو بنا کر اس
 میں یہ اثر کیا کہ تین آدمی (تینوں کو باری باری دیکھتے
 ہوئے) تینوں میں سے ہر ایک تین چیزیں اس بُت
 سے مانگ سکتے ہیں۔

(سوائے حمیدہ خاتون کے باقی سب کھڑکی

ہنسی بہنے لگی)

حمیدہ خاتون - سش!

احمد حسین (اور زیادہ منجیدگی سے) جو کچھ وہ مانگیں گے ان

لطیف - وہی آپ کا بنگلی جادو۔ سب فریب۔ دھوکا۔
 احمد حسین - تم اسے فریب کہتے ہو۔ صاحبزادے میں اپنی
 آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔

لطیف - ٹوکری کا تماشا میں نے بھی دیکھا، اور یہ بھی جانتا
 ہوں کہ کیسے کیا جاتا ہے۔ کوئی زیادہ وقیع بات بیان کیجئے۔
 احمد حسین - اس کے تماشے کے مستمع تمہارا کیا خیال ہے؟
 لطیف - (منکراتار ہوتا ہے اور کوئی جواب نہیں دیتا)

احمد حسین - تم کو میری باتوں کا یقین نہیں آتا ہے۔ ہاں
 میاں زمانہ ہی ایسا آنگاہے کہ لوگ خود اپنے وجود سے
 انکار کرنے لگے ہیں۔

الطاف حسین - احمد حسین اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے؟
 تم آج کل کے نوجوانوں کی ذہنیت سے واقف ہوتے
 ہوئے بھی ایسی باتوں کا اثر لیتے ہو۔۔۔۔۔۔ خوب
 یاد آیا۔ تم ایک روز کسی بُت کا ذکر کر رہے تھے اوہ بت
 تو ادھوری ہی رہ گئی۔

احمد حسین - اب اس رقعہ کو جانے بھی دیجئے۔ (اپنے آپ
 سے) جب کبھی مجھے اس کا خیال آتا ہے میں سب کچھ
 بھول جاتا ہوں۔

الطاف حسین - تم نے کہا تھا کہ تم ہر وقت اسے ساتھ
 رکھتے ہو۔

احمد حسین (جو کچھ سوچ رہے ہیں۔ الطاف حسین کی طرف

توجہ کئے بغیر بے خیالی سے) ہاں

حمیدہ خاتون - اس بُت میں ایسی کیا خاص بات ہے۔

الطاف حسین۔ رُبْتُ کو زمین سے اُٹھاتے ہوئے یہ تم
کیا کر رہے ہو؟

احمد حسین۔ رُبْتُ الطاف حسین سے لینے کی کوشش کرتے
ہوئے) اسے توڑ دو، کھل دو، بھلا دو۔ اس بت کو
تباہ کر دو۔

الطاف حسین۔ جلانے یا توڑنے پھوڑنے کی کیا ضرورت
ہے۔ اسے میں اپنے پاس رکھوں گا۔

احمد حسین۔ ایسی غلطی نہ کرنا۔ تم اس کے اثرات سے
واقف نہیں ہو۔ دیکھو میرا کما مانو، ورنہ پھر اگر کوئی
بات ہوئی تو

الطاف حسین۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں بھی دیکھ لوں گا
کہ کیا ہوتا ہے۔ کیوں لطیف تھا را کیا خیال ہے؟

لطیف۔ (ہنسنے ہوئے) اگر آپ کی یہی خوشی ہے تو رکھ
لیجئے۔ یہ ایک لغوی چیز ہے۔

الطاف حسین۔ رُبْتُ کو دیکھتے ہوئے) لٹوسی چیز۔ ہاں،
حیرت ہے میں چاہتا ہوں کہ

احمد حسین۔ (الطاف حسین کے آخری الفاظ کا غلط فہم
سمجھتے ہوئے) ذرا سوچو تو کہ تم کیا کر رہے ہو۔
اس کا یہ طریقہ نہیں ہے۔

الطاف حسین۔ پھر کوئی طریقہ ہے؟

احمد حسین۔ دیکھو الطاف میں پھر ایک باتیں متنبہ کرتا
ہوں۔ یقین مانو کہ اس میں سراسر نقصان ہے۔

(الطاف حسین کے ہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ سمجھتا

کوئل جانے گا مگر بعد میں انہیں اپنے سوال پر انوس ہوگا۔
الطاف حسین۔ لیکن وہ چیزیں ان کو ملیں گی کیسے؟

احمد حسین۔ یہ اس نے نہیں بتایا۔

الطاف حسین۔ تم نے اس کو نہیں آزمایا؟

احمد حسین۔ (سنجیدگی سے) میں آزما چکا ہوں۔

لطیف۔ کیا تم نے جو کچھ مانگا وہ تم کو مل گیا۔

احمد حسین۔ ہاں۔

الطاف حسین۔ کیا کسی اور نے بھی اسے آزمایا ہے۔

احمد حسین۔ ہاں اس کے پہلے مالک نے بھی تین چیزیں

مانگیں (کچھ کھویا سا جاتا ہے) اور آخری چیز جو اس نے

مانگی وہ موت تھی۔ (سب کے جسم پر کپڑی کی ایک لہڑوڑ

جاتی ہے) اس کے بعد میرے ہاتھ لگا۔

لطیف۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسی تین چیزیں مانگی

جائیں جو بغیر مانگے بھی ملیں گی۔

احمد حسین۔ (سر ہلاتے ہوئے) آہ، نادان بچہ۔

الطاف حسین۔ خالص صاحب اب تو یہ بت ہمارے لئے

بیکار ہے، پھر اسے اپنے پاس کیوں رکھ چھوڑا ہے؟

احمد حسین۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے فروخت کر دوں مگر اب

میرا خیال بدل گیا ہے۔

حمید خاتون۔ اگر تم اوزر تین چیزیں مانگ سکتے تو

احمد حسین۔ (رُبْتُ کو بدستور تھیلی پر رکھے ہوئے) نہ جانے

کیا ہوتا، نہ جانے کیا ہوتا (بیکار ایک غصہ سے رُبْتُ کو

زمین پر پٹکتے ہوئے) نہیں، ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔

الطاف حسین۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مانگوں (بُت کو دیکھ کر شکر اترتے ہوئے) ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔

لطیف۔ ابا جان! آپ اپنے قرض کے بارے میں ہمیشہ فکر مند رہا کرتے ہیں۔ اتنا روپیہ مانگئے کہ قرض ادا ہو جائے۔

الطاف حسین۔ ہاں یہ ٹھیک ہے (بُت کو سیدھے ہاتھ میں لے کر) میں دس ہزار روپیہ چاہتا ہوں۔

(الطاف ادا ہونے نہیں پاتے کہ ان کے منہ سے

ایک سچ بھل جاتی ہے۔ اور بت ہاتھ سے گر پڑتا ہے)

لطیف۔
حمیدہ خاتون { کیا ہوا؟

الطاف حسین۔ (بہنی ہوئی آنکھوں سے بُت کو دیکھتے ہوئے) بُت نے حرکت کی۔ جو بہی الفاظ میری زبان سے نکلے مجھے ایسا معلوم ہوا گویا وہ نکل جانا چاہتا ہے۔

لطیف۔ (بُت کو اٹھاتے ہوئے) یہ کیسے ممکن ہے ابا جان (بہنتے ہوئے) یہ تو مٹی کی ایک بجان مورت ہے اسے را سے میز پر رکھ کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے) روپیہ ابھی آیا نہیں، اور میں بشرط باندہ سکتا ہوں کہ کبھی نہ آئے گا۔

الطاف حسین (ظن ہر کر) شک ہے کہ کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

لطیف۔ (منہ کر) اچھا اب میں بھی جاتا ہوں۔ ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے۔

ہے کہ انہیں کوئی پروا نہیں ہے) اس بُت کو اپنے سیدھے ہاتھ میں لو اور جو کچھ مانگنا ہو زور سے مانگو۔

حمیدہ خاتون۔ یہ الف لیلہ کے مضمون سے کم نہیں ہے..... اچھا میرے لئے چار ہاتھ مانگو۔

الطاف حسین۔ میں چاہتا ہوں کہ..... احمد حسین۔ مٹھرو۔ اگر تیرا مانگنا ہی ہے تو کوئی ایسی چیز مانگو جس سے تمہیں نفع بھی ہو۔ ان بیہودگیوں سے فائدہ..... اچھا، اجازت دو۔ میں اب

رخصت ہوتا ہوں۔

(الطاف حسین بُت کو میز پر رکھ دیتے ہیں)

لطیف۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ کارخانہ جاتا ہے ایک منٹ ٹھہر جائے۔

احمد حسین۔ نہیں میں نہیں ٹھہر سکتا۔ میرے حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے (جاتے ہوئے) مُرو کر! میں پھر ایک بار کہتا ہوں کہ اسے توڑ دو، یا کہیں دُور پھینک دو۔

(مذاطف کے بغیر چلے جاتے ہیں۔ ان کے

جانے کے بعد الطاف حسین بُت کو اٹھا کر لے

گھورتے ہوئے)

الطاف حسین۔ ہم اسے پھینک ہی نہ دیں۔

لطیف۔ (بہنتے ہوئے) کیوں؟ اس کے طفیل تو ہم تو ہند اور خوشحال ہو جائیں گے..... شہنشاہ ہونے کی خواہش کیجئے ابا جان۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

حمیدہ - صبح ذرا جلدی آتا۔

لطیف - آٹھ بجے تک آ جاؤں گا۔ لیکن میرا انتظار نہ کیجئے گا
 (الطاف حسین سے) اباجان فکرنہ کیجئے۔ شاید منج
 روپیہ آجائے۔

الطاف حسین - (لطیف کو گھورتے ہوئے) مگر لطیف اس میں
 حرکت ضرور ہوئی۔

(لطیف بہت بڑا چلا جاتا ہے۔ الطاف حسین بہت گھورتے
 رہتے ہیں۔ یکایک اُن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے
 ان کو کوئی خوفناک چیز دکھائی دیتی ہے۔ ان کے منہ سے
 جرجر نکل جاتی ہے۔)

حمیدہ خاتون (ان کی طرف متوجہ ہو کر) کیا بڑا؟

الطاف حسین (ڈر پر قابو پا کر) کچھ نہیں کچھ نہیں... میں...
 میں... میں... مجھے کمروں میں عجیب غریب شکلیں
 دکھائی دے رہی ہیں۔

حمیدہ خاتون - آؤ اندر چلیں۔

(چلے جاتے ہیں)

(پہرہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(وہی کمروں پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ حمیدہ خاتون اور

الطاف حسین بیٹھے ہیں۔ الطاف حسین اخبار پڑھ رہے ہیں۔

حمیدہ خاتون کچھ سی رہی ہیں۔)

الطاف حسین - کیا اچھی صبح ہے۔

حمیدہ خاتون - ہاں ہے صدفہانی

الطاف حسین - کیا بات ہے لطیف ابھی نہیں آیا۔

حمیدہ خاتون - (گھڑی دیکھتے ہوئے) کوئی کام ہوگا۔ اس
 لئے دیر ہو گئی ہوگی (بُت کو میز پر رکھ کر) رات احمد حسین
 بھی کیا جھوٹ سچ اڑا گئے۔

الطاف حسین - انہوں نے آج تک کوئی بات سچ بھی کہی ہے
 میں سمجھتا ہوں سب بڑے سچا ہی ایسے ہی کہتے ہیں۔
 حمیدہ خاتون - ایک بیان مٹی کی ثورت کسی کا سوال کیے
 پورا کر سکتی ہے۔

الطاف حسین - میں خود بھی تمام رات ہی سوچتا رہا۔ مگر کچھ
 سمجھ میں نہ آیا۔

حمیدہ خاتون - کہی مجھے خیال آتا ہے کہ ممکن ہے انہوں
 نے سچ کہا ہو۔

الطاف حسین - ہاں ہو سکتا ہے۔ دنیا میں آئے دن ایسی
 باتیں ہوتی رہتی ہیں جن کو باور نہیں کیا جا سکتا۔

(ملازم داخل ہوتا ہے۔ دونوں اچھل پڑتے ہیں۔)

ملازم - حضور ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

الطاف حسین - بلیم تم دلا اندر ہو جاؤ تو میں ان کو بیسیں بلا
 لوں (حمیدہ خاتون اندر چلی جاتی ہیں) ان کو بھیج دے

(ملازم ہوتا ہے۔ رفیق احمد داخل ہوتا ہے۔)

رفیق احمد - آداب عرض ہے۔

الطاف حسین - آئیے تشریف لائیے... یہاں

تشریف رکھیے۔

رفیق احمد - شکریہ کچھ دیکھتے ہوئے میں ایک خاص کام سے حاضر ہوا ہوں۔

الطاف حسین - فرمائیے - فرمائیے۔

رفیق احمد - رزک کوک کر / میں اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ کہ لطیف صاحب . . .

الطاف حسین - کیا آپ کو لطیف سے کچھ کام ہے۔ تشریف رکھیے وہ آتا ہی ہوگا۔

رفیق احمد جی نہیں میں دراصل مجھے ان سے کام نہیں ہے مجھے آپ سے میں انہی کے کارخانے سے آ رہا ہوں۔

الطاف حسین - وہ خود کیں نہیں آیا۔ کیا اس نے کوئی بینام بھیجا ہے؟

رفیق احمد - جی نہیں بلکہ بلکہ الطاف حسین - (یہ محسوس کر کے کہ کوئی خاص بات ضرور ہے) کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا ہے؟

رفیق احمد - مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں آپ کے بل کر الطاف حسین - آپ کوئی بڑی خبر تو نہیں لائے ہیں۔

رفیق احمد - مجھے افسوس ہے مجھے آپ کے بڑی ہمدردی ہے۔

الطاف حسین - کیا لطیف کو کچھ ضرر پہنچا ہے؟

رفیق احمد - بہت سخت

الطاف حسین - کیا اس کو کسی قسم کی تکلیف ہے؟

رفیق احمد - جی بالکل نہیں۔

الطاف حسین - کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ

رفیق احمد - وہ اپنے ساتھیوں کو ایک واقعہ سنا رہے تھے۔ جو شاید رات میں یہاں پیش آیا تھا۔ انہوں نے کوئی

خیال نہیں کیا۔ اور

الطاف حسین - کیا ہوا اس کے بعد کیا ہوا۔

رفیق احمد - وہ شین پر گر پڑے۔ (اندر سے ایک چیخ کی

آواز آتی ہے۔ الطاف حسین اپنا سر جھکا لیتے ہیں۔ ان

کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔) کہنی نے مجھ اس

لئے بھیجا ہے کہ اس کی جانب سے اس عظیم ترین سانحہ پر

آپ کے ساتھ انصار ہمدردی کروں۔

الطاف حسین - (جن کا چہرہ مرقم کے جذبات سے قطعاً غاری

ہے، غلامیں دیکھتے ہوئے) عظیم ترین سانحہ، ہاں عظیم ترین

سانحہ۔ میرا بچہ اکلوتا بچہ میری بیٹی

کا سہارا عظیم ترین سانحہ۔

رفیق احمد - (میز پر ایک لٹاؤ رکھتے ہوئے) مسٹر لطیف کی

خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہنی نے آپ کی خدمت

میں دس ہزار روپیہ کی حقیر رقم کا یہ چیک پیش کیا ہے۔

(رفیق احمد ہلچا جاتا ہے۔ الطاف حسین کے دونوں ہاتھ اسان

کی طرف اٹھ جاتے ہیں۔ پھر وہ ایک اندھے کی طرح ٹٹولتے ہوئے

اگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر بیہوش ہو کر گر پڑتے ہیں۔)

(پروہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

(دو مکروہ پہلے نظریں بتایا گیا ہے۔ الطاف حسین مونے پر بیٹھے اوگھ رہے ہیں۔ مکروہ میں ہر طرف بے ترتیبی ہے۔ کرسیوں پر گرد جمی ہوئی ہے۔ حمیدہ خاتون کھڑکی کے پاس کھڑی باہر دیکھ رہی ہیں۔)

الطاف حسین۔ (چونک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) بیگم۔ حمیدہ خاتون۔ کیا ہے؟

الطاف حسین۔ تم کہاں ہو؟
حمیدہ خاتون۔ کھڑکی کے پاس۔

الطاف حسین۔ کیا کر رہی ہو؟

حمیدہ خاتون۔ اس سانے والی سڑک سے آگے بڑھنے کے بعد وہ قبرستان ہے جہاں ہم نے اپنے لال کو سپرد خاک کیا۔

الطاف حسین۔ ہاں، مگر اب اس سے فائدہ بیگم۔ یہاں آ جاؤ۔ اس ہوا سے تمہیں نقصان پہنچ جائے گا
حمیدہ خاتون جس جگہ وہ آرام کر رہا ہے، وہاں اس سے زیادہ خندہ ہوا چل رہی ہے۔

الطاف حسین۔ وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ گیا۔

حمیدہ خاتون۔ ہماری ساری امیدیں اپنے ساتھ لیتا گیا۔
الطاف حسین۔ ہماری باری آرزوؤں کا خون کر گیا۔

حمیدہ خاتون۔ اور ہماری ساری... (ہنسنے لگی)
ادھر دیکھو (وہ بھاگ کر ان کے پاس آتی ہیں۔)

الطاف حسین۔ بیگم بیگم۔ کیا معاملہ ہے۔

حمیدہ خاتون۔ (انتہائی بے تابی سے) بُت۔ وہ بُت۔

الطاف حسین۔ حیران ہو کر کہاں۔ وہ کہاں ہے۔ کیا ہوا؟

حمیدہ خاتون۔ تم نے اسے پھینکا تو نہیں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔

الطاف حسین۔ اُس روز کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔
حمیدہ خاتون۔ اسے تلاش کرو۔

الطاف حسین۔ (اُٹھ کر ادھر ادھر تلاش کرتے ہیں۔ ایک صوفے کے پیچھے سے) یہاں ہے، یہاں ہے، مگر تم اسے کیا کرو گی۔

(بُت انہیں دے دیتے ہیں)

حمیدہ خاتون۔ مجھے پیلے سے اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔
الطاف حسین۔ کس کا؟

حمیدہ خاتون۔ باقی دو چیزوں کا۔

الطاف حسین۔ (غور فرما کر) کیا؟

حمیدہ خاتون۔ ہم نے ایک بک مرث ایک چیز مانگی ہے۔
الطاف حسین۔ کیا وہ کافی نہیں ہے۔

حمیدہ خاتون۔ نہیں۔ ہم ایک چیز اور مانگیں گے رت
ان کی طرف بڑھاتے ہوئے، اسے لو اور کو

الطاف حسین۔ (اس سے دُور بیٹھتے ہوئے) کیا کیوں؟

حمیدہ خاتون۔ کہو کہ ہمارا بچہ زندہ ہو جائے۔

الطاف حسین۔ یا اللہ۔ بیگم تم دیوانی ہو گئی ہو۔

ہوئی ہے دکھڑکی کے پاس سے لوٹ آتی ہیں اب ہماری زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم محض اس کی خاطر زندہ تھے ہمارے گھر کا چراغ گل ہو گیا (کڑی پرگریزتی ہیں ابھر کر جو گزرتا ہے ہزاروں سال کا معلوم ہوتا ہے۔

الطاف حسین۔ یہ تو عمر بھر کا رونسا بچہ۔ آؤ اندر چلیں کچھ دیر آرام کر لو۔

حمیدہ خاتون۔ میری قسمت میں اب آرام کہاں۔

(دروازہ پر کھٹ کی ایک ہلکی سی آواز ہوتی ہے)

حمیدہ خاتون۔ (اچھل کر) یہ کیا ہے؟

الطاف حسین۔ ہوا کی وجہ سے دروازہ بل رہا ہے۔

(دروازہ پر پھر کھٹ کی آواز ہوتی ہے۔ مگر پہلے کی نسبت

ذرا زور سے۔ حمیدہ خاتون دروازہ کی طرف بھاگتی ہیں)

الطاف حسین (حمیدہ خاتون کو پکڑ کر) مٹھو۔ تم کیا کرنے لگی ہو۔

حمیدہ خاتون۔ (چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) میرا

بچہ، میرا لال، میرا لطیف انگبہ۔ مجھے چھوڑ دو جانے

دو۔ میں بالکل بھول گئی تھی کہ قبرستان یہاں سے ایک

میل پر ہے۔ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں دروازہ کھول دوں۔

(کھٹ کھٹ کی آواز بدستور تھوڑے تھوڑے وقفے سے

جاری رہتی ہے۔ جو ہر بار پہلے سے زیادہ زور سے

ہوتی ہے۔)

الطاف حسین۔ (ان کو بستر پر کھینچتے ہوئے) خدا کے لئے

حمیدہ خاتون (چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) مجھے

جانے دو۔

حمیدہ خاتون۔ کہو۔ کہو۔ انتہائی افسردگی سے میرا بچہ میرا لال
الطاف حسین۔ تمیں اس کا بالکل احساس نہیں ہے کہ تم کیا
کہہ رہی ہو؟

حمیدہ خاتون۔ ہماری پہلی خواہش پوری ہوگئی، دوسری
کیوں نہ ہوگی۔

الطاف حسین۔ اسے مرے ہونے دس دن ہو گئے، بیگم،
تم اسے کیسے دیکھ سکو گی؟

حمیدہ خاتون۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ جس حالت
میں بھی ہو، وہ واپس آجائے۔ یہی کافی ہے۔

الطاف حسین۔ (بُت سے ڈر کر دور ہوتے ہوئے) میں اسے
چھوڑنا نہیں چاہتا۔

حمیدہ خاتون (بُت انہیں دیتے ہوئے) لو۔ اور کہو جو کچھ
میں نے کہا ہے۔

الطاف حسین۔ (کانپتے ہوئے) بیگم!

حمیدہ خاتون۔ (غصہ سے) کہو؟

الطاف حسین۔ (حمیدہ خاتون کے غصہ سے مجبور ہو کر مگر
کانپتے ہوئے) میں چاہتا ہوں کہ میرا بچہ زندہ ہو جائے۔

(ایک چمچ کے ساتھ بُت کو گرا دیتے ہیں۔ حمیدہ خاتون

کھڑکی کے پاس جاتی ہیں۔)

حمیدہ خاتون۔ (کچھ وقفہ کے بعد نا اُمیدی سے) کچھ بھی
نہیں ہے۔

الطاف حسین۔ نگر ہے خدا نے پاک تیرا سر ہے۔

حمیدہ خاتون۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ ساری سڑک سنان پڑی

الطاف حسین۔ دروازہ نہ کھلو۔ (انہیں کھینچ کر دوسری طرف لے جاتے ہیں)۔

حمیدہ خاتون۔ مجھے جانے دو۔
الطاف حسین۔ ذرا سوچو کہ تمہیں وہاں کیا دکھائی دیگا۔

حمیدہ خاتون۔ (چمڑا تے ہوئے) کیا تم یہ بچتے ہو کہ میں

اپنے بچے سے ڈر جاؤں گی (دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے) میں آ رہی ہوں میرے لال میں آ رہی ہوں۔

الطاف حسین۔ ایسا نہ کرو۔
حمیدہ خاتون ان کی باتوں کی پروا نہ کر کے دروازہ کے قریب جا کر اسے کھولنے کی کوشش کرتی ہیں۔)

الطاف حسین۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ رُبت بل جاتا ہے وہ ایک گہری سانس لیتے ہیں، اس کے بعد کھڑے ہو کر رُبت کو سیدھے ہاتھ میں لے ہوئے، میں جانتا ہوں کہ وہ مر جائے۔ مر جائے اور جنت کی لذتوں سے لطف اندوز ہو۔

(آواز بند ہو جاتی ہے۔ دروازہ کھل جاتا ہے۔ چاندنی دروازہ میں سے اندر آتی ہے۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں ہے۔ غور ڈی دیر سکوت۔ حمیدہ خاتون بہوش ہو کر گر پڑتی ہیں الطاف حسین دونوں گھٹنوں پر جھک کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیتے ہیں۔)

(پروہ گرتا ہے)

الطاف حسین۔ دروازہ نہ کھلو۔ (انہیں کھینچ کر دوسری

طرف لے جاتے ہیں)۔

حمیدہ خاتون۔ مجھے جانے دو۔

الطاف حسین۔ ذرا سوچو کہ تمہیں وہاں کیا دکھائی دیگا۔

حمیدہ خاتون۔ (چمڑا تے ہوئے) کیا تم یہ بچتے ہو کہ میں

اپنے بچے سے ڈر جاؤں گی (دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے) میں آ رہی ہوں میرے لال میں آ رہی ہوں۔

الطاف حسین۔ ایسا نہ کرو۔
حمیدہ خاتون ان کی باتوں کی پروا نہ کر کے

دروازہ کے قریب جا کر اسے کھولنے کی کوشش

کرتی ہیں۔)

الطاف حسین۔ (پچا پچ) رُبت۔ وہ رُبت کہاں گیا گھٹنوں

کے بل جھک کر ڈھونڈتے ہیں)

حمیدہ خاتون۔ زنجیر بہت سخت ہے۔ میں اسے نہیں

کھول سکتی۔ آؤ میری مدد کرو۔

(کھٹ کھٹ کی آواز بدستور آ رہی ہے

اور بہت زیادہ زور سے۔)

الطاف حسین۔ (ٹوٹتے ہوئے) رُبت۔ رُبت۔ ابھی ایک چیز

اور باقی ہے۔

حمیدہ خاتون۔ کیا تم سننے نہیں۔ تمہارا بچہ دروازہ

کھٹکھٹا رہا ہے۔

کیملاش کنول

ترجمہ از پیام مشرق ————— حسب اجازت علامہ اقبال
(حقوق محفوظ)

(۳۱) ————— ترجمہ

سنگ چمن والوں کے نہ جاؤں	زمرغانِ چمن نا آشنایم
کنج میں بیٹھ اکیل لگاؤں	بشاخ آشیان تنہا سرایم
من ہے ترا سکار تو ہٹ جا	اگر نازک لی از من کراں گیر
اپنا لہو بھی سُروں میں ملاؤں	کہ خونم می تراود از نوایم

(۳۲) ————— ترجمہ

خوب یہ فطرتِ آتا جاگ میں	جہاں یارب چہ خوش ہنگامہ لڑو
مست ہیں ایک ہی مخلوق سے سب	ہمہ رامست یک پیمانہ کردی
آنکھ تو آنکھ سے مل جاتی ہے	نگہ را بانگہ آمیز ز دادی
جان کو جان سے میل نہ مطلب	دل از دل جانِ جاں بیگانہ کردی

لے ہند ہی میں کنج و رفتوں بیان کی چیزوں کی پٹیاں کو کہتے ہیں۔ غار میں کنج کو لے کو کہتے ہیں۔
سہ عکدار۔ سنی نازک۔ سہ داتا سنی خدا

صدقے اپنی حیات اور گہر ہے حُسنِ عمل مصافحہ نیست میں تیغ و سپر ہے حُسنِ عمل
 یہی عمل ہے کلیدِ رُضِ ربینہ عرفاں اسی عمل سے وال ہے سفینہ عرفاں
 یہی ہے مردِ مجاہد کی منزلِ مقصود یہی مقام ہے جس کو کہا گیا محمود
 فضائے رُوح میں تیری ہو نورِ حق کا ظہور ظہورِ حق سے ہوں بطل کی ظلمتیں کا فور
 صفائے قلب میں ہے اُحت و سکون و قرار اس آئینہ میں ہیں حُسنِ ازل کے نقش و نگار
 وہ حُسنِ جس کا تماشا ہے جنتِ جاوید وہ حُسنِ جس کی تمنا ہے لذتِ جاوید
 وہ حُسنِ کیفیتِ جاوداں ہے جس کا وصال وہ حُسنِ میکدۂ رُوح و جاں ہے جس کا وصال
 تلاشِ حق میں اگر عمر ہو برب تیری جمالِ حق کی ہو جو یا اگر نظر تیری
 اگر نہ دامنِ حق تیرے ہاتھ سے چھوٹے اگر نہ پُورشِ باطل سے دل تراٹوٹے

تو مل ہی جائے گا تجھ کو سکوں کبھی نہ کبھی
 بدل ہی جائے گا حالِ نبوں کبھی نہ کبھی

چنڈول

طاثران دہر سے تیری نرالی شان ہے
 تُو نے پایا ہے جہاں میں مسکنِ بالا تریں
 دیکھتے ہی دیکھتے اس سے بھی آگے بڑھ گیا
 عقل کو حیران کرتی ہیں فلکِ پمیاں
 تیرے نکھول میں غضب کی طاقت پرواز ہے
 اوریں اہل جہاں حیراں تھے انداز سے
 دیکھنے والوں کی آنکھوں کا اشارا ہو گیا
 اُڑتے اُڑتے جاتے جاتے کمکشاں میں جا چھپا
 اہلِ دنیا سے ترا دل کس لئے گھبرا گیا
 دُور رہ کر تو وطن سے آہ گھبرا نہیں
 گم ہوا ہے کون وہ جس کا لگانا ہے پتا
 کیا ترے رہنے کے قابلِ آشاں تیرا نہیں

اے مرے چنڈول کیا نفی سی تیری جان ہے
 گرچہ مشت پر ہے لیکن محرمِ عرشِیں
 تُو زمین پر سے اُڑا باہمِ فلک پر چڑھ گیا
 ہیں تجبِ خیز تیری معرکہ آرائیاں
 آسمانِ الوں کو بھی اُڑنے پتیرے ناز ہے
 ہوش اُڑتے ہیں فرشتوں کے تری پرواز سے
 تُو اُڑا اور آسماں کا ایک تارا ہو گیا
 چاند تارا بن گیا اور آسماں میں جا چھپا
 تُو جہاں کی محفلوں سے کس لئے اُکتا گیا
 اپنی شاخِ آشاں تک کس لئے آتا نہیں
 ڈھونڈنے جاتا ہے کس کو عرشِ بالا پر بتا
 کیا زمیں والوں میں کوئی قدرواں تیرا نہیں

چنڈول

دیکھ اپنی ذات کو ناشاد کی ہستی کو دیکھ
 آسمانوں کی بلندی سے مری پستی کو دیکھ

اقبال کی منظر نگاری

زویل کا انتقال یوم اقبال کی تقریب پر اُس جلسہ میں ہوا گیا جو ۱۹ جنوری ۱۹۳۵ء کو ڈی۔ اے۔ وی کالج راولپنڈی کے اہل انجیل شیخ سر عبدالحق درمہراؤ نڈیا کونسل لندن کی صدارت میں منعقد ہوا۔

جگن ناتھ آزاد۔ بی۔ اے (میکروٹری انجمن راولپنڈی)

ہمارے ملک کی تاریخ ادب میں یہ پہلی مثال ہے کہ کسی شاعر کی یادگار اُس کی زندگی میں اس قدر اہتمام کے ساتھ ملک کے طول و عرض میں سنائی گئی ہو۔ ڈاکٹر محمد اقبال کو ان کی سالگرہ پر آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ڈاک، شعراء اور اصحاب ذوق ہدیہ مبارک باذیچ کر رہے ہیں۔ اور یہ اس شکرگزاری کا اظہار ہے جو ہم سب پر ان کی گراں قدر خدمت گزاری کے لئے لازم آتی ہے۔ دورِ حاضر میں ان کے سحرانگیز کلام نے اہل وطن کے جذبہ عمل کو بیدار کرنے میں جو حصہ لیا ہے، اس کے لئے علامہ اقبال کا جس قدر تکریر ادا کیا جائے کم ہے۔

اقبال کا کلام صوری اور معنوی خصوصیات کے لحاظ سے ایک بھرپور پایاں ہے۔ جس کی وسعت اور عمق کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے۔ میں اس شاعرِ عالم کے کلامِ بلاغت نظام کی صرف ایک خصوصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا یعنی مجھے "اقبال کی منظر نگاری" کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اگرچہ اس ایک خصوصیت کا مکمل بیان بھی میرے لئے چھوٹا ٹھنڈا اور بڑی بات ہے لیکن کاروبارِ بیان بزم کے ارشاد کی تعمیل میں وہ تاثرات جو مطالعہ کلام اقبال کے دوران میں میرے دل نے قبول کئے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اُردو کی موجودہ اصطلاح یا نثرِ شاعری جس کی داغ بیل غالب اور آزاد نے ڈالی تھی اقبال کے میدانِ عمل میں آنے سے پہلے مروج اور مقبول ہو چکی تھی اس شاعری کا بھرپور و اعظم منظر نگاری تھا، ان کے ہمعصرین اور تقلدوں نے منظر نگاری میں خوب ناکامیوں کو بردہ ہاں کیں بعض شعراء نے نثرِ شاعری کو اپنا خاص مضمون بنا لیا۔ بعض نے ٹکئی اور فنی مضامین میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے منظر نگاری کو ذریعہ امداد کے طور پر استعمال کیا۔ اقبال کا تعلق صریح طور پر دوسرے طبقے سے ہے، چنانچہ کلام اقبال میں جا بجا منظر نگاری کو وارداتِ قلب، جذباتِ ملت اور نکالنے وغیرہ کو دلکش اور ترش بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ان کی اولیں نظموں میں "مکوہ ہالیہ" کے دوسرے ہی بند سے اشتیاق کا ثبوت مل جاتا ہے کہ وہ ہالیہ پر ایک بیانیہ نظم نہیں لکھ رہے بلکہ ان کا اصل موضوع اس عنوان کے پردہ میں "حبِ وطن" ہے۔ باوجودیکہ منظر نگاری اقبال کے کلام کا خاص موضوع نہیں ہے لیکن جہاں جہاں کلام اقبال میں منظر نگاری موجود ہے وہاں

یہ ایک سحرانگہ منظر پیش کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی نظم میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ

یہاں شب کھولتی ہے آکے جب زلف رسا داہنِ دل کھینچتی ہے آبتِ ازل کی صدا
وہ خوشیِ شام کی جس پر تبسم ہو فدا وہ درختوں پر تفسر کا سماں چھایا ہو

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفیق کُساں پر

خوشنما لگتا ہے یہ غمازہ تھے رخسار پر

”ماہِ نو“ پر چند اشعار لکھے ہیں۔ میں شروع کے تین اشعار پیش کرتا ہوں، انہی سے کلام کی اس خصوصیت کے کمال کا اندازہ لگا لیجئے

منظر نگاری کے تمام لوازم مثلاً قدرتِ زبان، اندر سے تشبیہ، اعلیٰ تخیل ان چھ مصرعوں میں انسانی دلکشی کے ساتھ موجود ہیں کہ

لوٹ کر غور و تدبیر کی کشتی ہوئی عرقابِ نیل ایک محوِ ایتر تار پھرتا ہے رُئے آبِ نیل
طشتر گردوں میں نکیتا ہے غنیمت کا خونِ ناب نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصداً قناب

چرخ نے بالی چڑھائی ہے عروسِ شام کی

نیل کے پانی میں یا مہجسی ہے سیمِ خام کی

ایٹ آباد کے پہاڑوں پر گھٹاؤں کے منظر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :-

اُٹھی پھر آج وہ پورے کالی کالی گھٹا سیاہ پوشش ہوا پھر پہاڑ سرِ بن کا

نہاں ہوا جو رخِ ہسرِ زریں داہنِ ابر ہوئے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر

گرچ کا شور نہیں ہے۔ خموش ہے یہ گھٹا عجیب سیکڑے بے فروش ہے یہ گھٹا

ہوا کے زور سے اُبھرا۔ بڑھا اُڑا بادل

اُٹھی وہ کالی گھٹا، لوہرس پڑا بادل

برسات کے موسم کی کتنی سچی تصویر ہے۔ ایک ایک مصرع پر فصاحت اور بلاغتِ نثار ہو رہی ہے، لفظ لفظ نظر آئے کی

تصویر کھینچ رہا ہے خاص کر ساکنینِ راولپنڈی جس قدر ان اشعار کی صداقت کا احساس کر سکتے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور تمام دلوں کی قیمت نہیں۔

”ایک شام“ جن جذبات کی منظر ہے اس کا احساس فقط حساسِ دل ہی کر سکتے ہیں۔ دریا کے کنارے شام ہو رہی ہے،

سکوتِ ہر طرف اپنا تسلط جما رہا ہے۔ غیر ممکن ہے کہ اقبال اس خاموش کن اور غم انگیز منظر سے متاثر نہ ہو۔ کہتا ہے کہ

خاموش ہے چاندنی سحر کی شائیں ہیں خموش شہرِ سحر کی

وادی کے لڑا فرموش غاموش کنسار کے سب پرپوش غاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فصول ہے نیکر کا خسرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے یہ قافلہ بے درارواں ہے
غاموش ہیں کرہ و دشت و دریا قدر تے مرا تے میں گویا

لے دریا ئے نیکر دہائیڈل برگ) اے دل! تو بھی خموش ہو جا

آغوش میں غم کو لے کے سو جا

”گورستان شاہی“ میں تو اقبال نے منتظرگشی کے جاؤ کو اعجاز کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ شاندار اسلامی حکومتوں کے میلان کھنڈر شاعر کے سامنے ہیں۔ آنکھیں تباہ شدہ مناظر کو دیکھ رہی ہیں۔ حواسِ دلِ خون کے آئینہ رو رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ قطب شاہی اور عہد شاہی حکومتوں کے نام کا ڈیکانچر رہا تھا۔ لیکن آج ان کے عظیم الشان شہنشاہ سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں نے دور مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناممبور

عالمیناب شیخ صاحب نے جو ہماری خوش قسمتی سے آج کرسیِ صدارت پر جلوہ افروز ہیں، اس بلند پایہ نظم کی تہذیب میں جو ان میں چند طور زیب اور اراقِ محزن کی تھیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک تنقید کا ذکر کرنے کے بعد شیخ صاحب کہتے ہیں:-

”دوسری نظم جو گورستان شاہی کے عنوان سے شائع کی جاتی ہے ایسی لا جواب نظم ہے جو نے بحقیقت اقبال کے درجہ سکوت کی تلاقی کرتی ہے، اس کا ایک ایک مصرعہ ایسا درد بھرا اور مضمینی ضرر ہے کہ دل سے وا دھکتی ہے۔
سلاطینِ قطب شاہیہ کے مزار ان کے قریب گو کھنڈہ کا تاریخی حصہ رُخِ شبِ ماہ مگر ایسی شبِ ماہ جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نورِ ولادت میں لوائیِ وطن رہی تھی سپہ شاعر اور جذبات کے نشوونما کے لئے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان کیا ہوگا۔ ان عذابات کا کلن جس خوبی اور صفائی سے جنابِ اقبال نے اُتانا ہے۔ انہی کا جھٹ ہے“

خود علامہ اقبال نے اسی نظم کی تہذیب میں لکھا:-

”حیدر آباد دکن میں منتظرِ قیام کے دلوں میں میرے عنایت و مہمانب سوزندہ علی حیدری صاحب بی۔ اے سے مستحضر ذہنیات انس مجھے ایک شب اکن شاندار گھر سرتاک گنبدوں کی دیانت کے لئے لے گئے تھے میں سلاطینِ قطب شاہیہ سورہے ہیں۔ ملک کی غامی

ابراؤ آسمان اور بادل میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُرسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انہی بے شمار تاثرات کا ایک انہار ہے۔

شہنشاہوں کے قبرستان کا لٹاک منظر، شبِ مہتاب کا ابراؤ و نظارہ اور آقبال کا دلِ حساس، اس اتفاق کو اُردو شاعری کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے۔ نظم کا آغاز دیکھئے، کس درجہ بلند پایہ منظر نگاری ہے۔

آسمان بادل کا پہنے عرق نہ دیرینہ ہے کچھ مکدر صاحبِین ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھینکی ہے اس نظارہ خاموش میں صبح صادق رو رہی ہے رات کے آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فرا ہے غامشی بربطِ قدرت کی جھپی سی نو ا ہے غامشی

باطن ہر ذرہ عالم سرا پا درد ہے

اور خاموشی لبِ ہستی پہ آؤ سرد ہے

یہ ایک شاعر کی توجہ اس یاسِ انجیر منظر سے ہٹ کر سامنے گوگندہ کے قلعہ کی جانب مبذول ہوتی ہے اور کہتا ہے۔

آہ! جلا جلا و عالمگیر یعنی وہ حصار دوش پر اپنے اٹھائے سینکڑوں صدیل کا بار
زندگی سے تھا کبھی ممد و اب سنان ہے یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے ٹنگان کن کی خاک کا دلدادہ ہے

کوہ کے سرِ یشناںِ پاسبانِ ستادہ ہے

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ منظر نگاری آقبال کے کلام میں وارد است قلب، جذباتِ قلب، نکاتِ فلسفہ اور حبِ وطن وغیرہ

مضامین کو دلکش اور مؤثر بنانے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اس نظم میں بیحد صمیمیت مکمل طور پر رائج ہو جاتی ہے، ان اشاروں کو لیجئے، یہ

ابر کے روزن سے وہ بالائے بامِ آسمان ناظرِ عالم ہے خیمِ سبزِ فامِ آسمان
خاکِ بازی و صحرانے کا ہے منظرِ اے داستانِ ناکامیِ انسان کی ہے از براے
ہے ازل سے یہ مسافر سوسے منزل جا رہا آسمان سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا
گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لئے فاتحہ خزانہ کو یہ بھیرا ہے دم بھر کے لئے

یا

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مال جن کی تدبیرِ جہان بینی سے ڈرتا تھا زوال
بے عیب و نفور سی ہو دُنیا میں کدشانِ قیصری تل نہیں سکتی غنیمت کی پورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادو عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور
شورشِ بزمِ طرب کیا عود کی تفسیر کیا
دردِ منہاں جہاں کا نالہ شگبگیر کیا

اور

موت ہر شاہ و ملکہ کے خراب کی تعمیر ہے
اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے
یا

اس نشاط آباد میں گویش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غمِ قلت ہمیشہ تازہ ہے
صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ آغازے شاعر کا مطلب فقط منظر نگاری نہ تھا بلکہ کچھ اور بھی، اگرچہ بلی اور منظر نگاری کا کمال
دیکھنا ہو تو ”گورستانِ شاہی“ اقبال کے اردو کلام میں بے نظیر چیز ہے۔
”منوِ صبح“ کے زیر عنوان ایک نظم ہے، یہ دراصل ایک قصیدہء مہر کے ابتدائی اشار میں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ منظر
نگاری کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔
وقت کی تنگ دامانی کی وجہ سے بعض لاجواب نظموں مثلاً ”رات اور شاعر“ اور ”بزمِ انجم“ کو مجبوراً نظر انداز کیا جاتا ہے۔

چونکہ شاعر نے اردو سے زیادہ فارسی میں طبع آزمائی کی ہے، یہ مضمون تشنہ رہ جائے گا، اگر فارسی منظومات میں سے اقتباسات
آپ کے سامنے پیش نہ کئے جائیں۔ سدا اقبال کی فارسی تصنیفات میں ”پایہ شوق“ ایک ایسا چمن بے غراں ہے جس میں اقبال
کی منظر نگاری کے اچھوتے اور مکمل نمونے بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔

ہمارا کام ہم اپنی پورے شکوہ سے عبور ہو رہے۔ شاعر دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ

خیز کہ در کوہِ و درشت خیمہ زد ابر بہار

مست ترمم ہزار

طوطی و دراج و سار

بر طرفِ جوشبار

کشتِ گل و لالہ زار

چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

شاعر کی عینِ نظر فقط بہار تک ہی محدود نہیں رہ جاتی بلکہ بہار کے تاثرات کا بھی مشاہدہ کرتی ہے چنانچہ اشعار ملاحظہ ہوں :

خیز کہ در باغ و راغ خیز کہ در باغ و راغ

باغ بہاراں وزید

مرغِ نوا آفرید

لالہ گریمباں درید

حُسنِ گلِ تازہ چید

عشقِ غمِ نو خرید

خیز کہ در باغ و راغ خیز کہ در باغ و راغ

نیم صبح کی زبان سے کتنے لطیف اشعار کہلائے ہیں :

ز روئے بحر و سر کوہ ساری آیم ولیکے دشنام کہ از کجبا خیزم

بسبز و غلظم و بر شاخ لالہ می پیچم کہ رنگ و بو ز سامت اُور ابرائیچم

خمیدہ تانہ شود شاخ اوزگرش من برگ لالہ و گل زم زمک آویزم

ساربانِ حجاز اپنے نادر سوار جا رہا تھا۔ صبح ہو رہی ہے۔ اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :

مہ ز سحر پاکشید در پس تل آرمید

صبح ز مشرق دمید جانہ شب بردرید

باو سیباں وزید

تیر ترک گا مران منزل ما دور نیست

شاعر نشاطِ باغ کشمیر میں بیٹھا ہے۔ بہار پورے جوہن پر ہے، دل پر جو کیفیت طاری ہو رہی ہے، اس کا اندازہ ان

ان اشعار سے کیجئے :

زمیں از بہاراں چو بال تدرے ز فوارہ الماس بار آبارے

چہ شیریں نوائے چہ دیکش مدائے کہ می امید از غلظتِ ثلثائے

نوائے مرغِ بلسند آشیانے در آیمخت باغ و چو باغے

والدین - غالب کا نام تمام تذکروں میں عبدالرشید بگ خاں درج ہے امرا کے کلام سے اس معاملے پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن مرزا کے باپ کا کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اب سے کئی سو سال پہلے ہی ہندوستان میں بالوں کے نام ہڑا کرتے تھے، مثلاً جاگیر کے باپ کا نام حلال الدین اکبر اور بہاول کے باپ کا نام ظہیر الدین بابر تھا۔ اس تاریخی احث کے بعد اگر قاضی کی رعایت سے اسد اللہ کے باپ کا نام عبدالرشید تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں کچھ حرج نہیں۔

مرزا کی والدہ ماجدہ کا نام کسی کو معلوم نہیں ہو سکا لیکن انہوں نے اپنے ایک خط میں اس امر کی شکایت کی ہے کہ ایک شخص نے ان کو دھپا پیسے مال کی گلی دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا کی کم از کم ایک مال ضرور تھی۔

تعلیم - معلوم نہیں مرزا نے تعلیم کہاں پائی۔ مجنوں کے زمانے میں کوئی باقاعدہ سکول تو قائم نہیں۔ صرف ایک دبستان تھا جس کی دیواروں پر مجنوں لام اللہ لکھا کرتا تھا۔ پس مرزا غالب گھر پر ہی پڑے ہوں گے۔ بہر حال یہ بظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے۔ اگر ناخواند ہوتے تو شعر کیوں کر لکھ سکتے۔ اور اتنی تصانیف کہاں آجاتیں، انہوں نے اردو اور فارسی میں نظم و نثر لکھی ہے پس دو دو لفظ زبانیں جانتے تھے۔

پیشہ اور شغل :- مرزا کا سب سے بڑا پیشہ تو ظاہر ہے، دوسرا کام یہ تھا کہ شعر چن چن کر رسوا ہوتے تھے خود جانتے ہیں کہ

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس کے علاوہ بعض اور اشغال بھی تھے۔ مثلاً انہوں نے مصوری بھی سیکھی تھی۔ فرماتے ہیں کہ

سیکھے ہیں مہ زخوں کے لئے ہم مصوری

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

کچھ مدت پیشہ بھی رہا۔ کہ صبح سویرے کان پر قلم رکھ کر کھل پڑتے اور سارا دن لوگوں کے خط لکھتے پھرتے، اسی لئے کہتے ہیں :-

مگر لکھواٹے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھواٹے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر کھ کر تم بکھے

مختصر حالات :- اب مرزا کے مختلف سوانح حیات سنئے، وقت کی تنگی کے باعث میں صرف چند ہی واقعات کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

مرزا کی زندگی اگرچہ بیہ نظریت میں گذرتی تھی لیکن اس کے لئے اشیائے ذمہ دار نہ تھے، خود مرزا کو اقرار ہے کہ خدا نے انہیں لڑ

جہان دے رکھے تھے۔ سنئے

دونوں جہان دے کہ وہ سچے یہ خوش رہا

یاں آپڑی پیشہم کہ تکرار کیا کریں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ دونوں جہان کئے کہاں؛ جواب مرزا کے اس شعر میں موجود ہے کہ

لوہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ دنام ہے

یہ جانتا اگر لوٹ تا نہ گمہد کو میں

پس دونوں جہان بھی گھر کے ساتھ ہی ٹٹا دیئے ہونگے مرزا غالب کا گھر نہ صرف دیران تھا، بلکہ اس میں دیرانی سی ویرانی تھی چنانچہ

کوئی دیرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کہ گھر یاد آیا

لیکن ان کا گھر صبح تھا۔ اور مرزا کو ورزش کے لئے ہاشا پیر کرٹ کھیلنے کے لئے بہت دیرین جگہ کی ضرورت تھی۔ اس لئے بھگل میں جا کر

دشت میں ہے مجھے وہ پیش گھر یاد آئیے

تھے، افراتے ہیں، کہ نہیں وہ بھی خرابی میں پرہیز معلوم

عادات و خصائل :- مرزا نے سادہ لوح اور صاف دل انسان تھے اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے تھے جن کا نتیجہ نقصان یا تکلیف بنتا تھا چنانچہ ایک دن محبوب کی گلی میں بیٹھ بیٹھ ڈرائی فٹلی کے باعث دربان سے چند بانگچی کر لی سکتے ہیں یہ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاس کے لئے ایک دن خود محبوب سے بھی مار کھائی لیکن قصور اپنا تھا اس لئے نہایت ہمانداری سے اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے یعنی سے دعویٰ دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن اسی سادہ لوحی کی بدولت ایک دن محبوب کی حد سے زیادہ تعریف کر کے ایک غمخوار رازداں کو رقیب بنا لیا۔ ثبوت ملاحظہ ہو

ذکر اس پری وش کا اور پھر یہاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا لیکن دیوانہ بخارِ عشق شہ کیا کبھی رقیب کو صل بھی دے جاتے تھے

تاکہ نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا مرزا بخود اور بتش کے نہ صرف قابل تھے بلکہ محبت کے معاملے میں بھی جوشیدوں سے پوچھ کچھ کرتے ہوتے تھے اسی لئے کہا ہوا دیکھتے پاتے ہیں عشاق توں سے کیا فیض اک رہن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے مرزا کا دل غائب کا دل عام لوگوں کی طرح خون کا قوط یا گوشت کا لوتھڑا تھا بلکہ آفت کا ٹکڑا تھا اور مرزا اس کی آوارگی کے شاک تھے ارشاد ہوتا ہے میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا لیکن اندیشیاں نے فضل کیا، اور مرزا کو صلہ ہی اس سے رہائی مل گئی۔ اکیس دن بیٹھے بیٹھے سوزِ نہاں کا دورہ ہوا۔ اور اسے کا سارا دل بے مٹا جل گیا۔ مرزا نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محال جل گیا آتش خاموش کے بلند گویا جل گیا غالب کے ناخن بہت جلد جلد بڑھتے تھے۔ چنانچہ زخم ابھی بھر نے بھی نہ پاتا تھا کہ ناخنوں کے کھرپے پھر کھلنے کے لئے تیز ہوجاتے، فرماتے ہیں سے

دوست غمخواری میں میری سی فرمائیں گے کیا زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھائیں گے کیا غالب کا زمانہ غائب کے زمانے میں دلی میں غمِ آفت کا قوط پڑ گیا۔ اب خدا جانے کیا حال ہے، فرماتے ہیں :- ہے اب اس مسمومہ میں قوط غمِ آفت اسد ہم نے یہ مانا کہ دلی میں ہے کھائیں گے کیا اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی خوراک غمِ آفت تھی یا کم از کم غمِ آفت ان کی خوراک کا جزو غم تھا۔ لیکن اس قوطِ سال میں ایک دھیروں کی اور زانی بھی تھی مثلاً دل اور جان بازار میں بکا کرتے تھے۔ اور شخصِ جدید نہ تھا۔ مرزا کو اس کا اعتراف ہے کہ ہم شہر میں ہوتے ہیں کیا غمِ حب اٹھیں گے لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جان اور اس زمانہ میں پورے سات آسمان تھے، اور سب کے سب دن رات گردش میں رہتے تھے مرزا کہتے ہیں سے

رات دن گردش میں ہیں ہر سات آسمان ہو رہے گا کچھ نہ کچھ کھیرائیں کیا

مرزا کے زمانے کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ اگر کسی کو محبوب کا نام نہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی ہچکچاہٹ کھل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا کی ہچکچاہٹ کھل گئی جس کا اعتراف اس شعر میں موجود ہے۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہچکچاہٹ میری

سب سے بڑی قباحت اس عہد کی یہ تھی کہ مجرموں کو سخت دھتیا نہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ مرزا غالب ایسے شخص کو بھی ایک مرتبہ کسی مجرم کی پاداش میں پھرنے میں بند کر دیا گیا لیکن زمانہ اس قدر غراب تھا کہ مرزا اس حالت کو بھی عقیدت سمجھتے تھے۔

نئے پیر کمال میں ہے دھمپا دمیں میں
غالب کا محبوب مرزا کا محبوب بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا اس کا نام سارے جہان کو معلوم تھا لیکن کسی ملک کسی شہر کی گاڈن میں کوئی شخص بھی اس کا نام نہ سنے بغیر نہ لیتا تھا۔ مرزا کہتے ہیں سے

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا ہسان میں
یوں نہ کوئی نام نہ سنے کہے بغیر

اس محبوب کے عادات و خصائل بھی عجیب تھے مثلاً گالیاں بہت دیا کرتا تھا۔ مرزا پوچھتے ہیں سے
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دھتیاں صوبہ دریاں ہوئیں
اسی طرح اگر کسی مرزا کو شکایت کریں تو وہ فوراً اٹھ بھاگتا اور سارے رقبوں کو جمع کر لیتا۔ اسی لئے مرزا جھنجھلاتے ہیں سے

جنگ کتنے ہو کیوں رقبوں کو
اک تماشہ ہوا گلا نہ ہوا

حبیبہ رقیب کی نسل میں سوتا تو مرزا کے خواب میں آکر نہاں تبسم کیا کرتا تھا۔ اسی لئے مرزا کہتے ہیں سے
نسل میں غیر کی کج آپ سونے میں کس پر نہ
سبب کیا خواب میں کہ تبسم ہائے پنہاں کا
مستحق تھا تو شکر لیکن سفر میں بے طلب بوسے دینے لگا تھا۔ مرزا کی بدگمانی ملاحظہ ہو سے

صحت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہ میں یہ تو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر انتخاب کئے

اس کے مذہب کے متعلق صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم تھا۔ جی تو مرزا کو کتنا بڑا ہے

دل دیا جان کے کیوں اس کو فداوارہ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا

چند متفرق واقعات :- ایک دفعہ مرزا نے اڑنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز تو تھے نہیں کسی اور طریق سے اڑے ہوں گے لیکن حال میں چھنسن گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں سے

پنہاں تھا دام سخت قریب آتیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفت از ہم ہوتے

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے کچھ مدت گھونسنے میں بھی گزاری۔

مرزا کا ایک زمانہ بھی تھا جب مرزا کا گھر حیران ہو گیا تو اس کے لئے کوئی کام نہ رہا۔ مگر تھا وفادار۔ مرزا کا ساتھ نہ چھوڑا اور

گھر میں سے گھاس کھو کر گزارا وقت گزارا۔ مرزا فرماتے ہیں سے

اگاہے گھر میں ہر سوسرہ ویرانی تماشہ کر
ملا رہا کہو نے یہ گھاس کے ہے میرے نہاں کا

مرزا نے کئی مرتبہ بہشت کی سیر بھی کی۔ ایک مرتبہ بہشت سے واپس آکر محبوب سے فرماتے ہیں کہ میں نے
کم نہیں جلاؤ گری میں تم سے کہچے سے بہشت یہی نقشہ ہے ولے اس قدر باخبر نہیں

خواجہ خضر سے بھی مرزا کی اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ نصرت الملک کے قصیدہ میں فرماتے ہیں کہ
تو کس قدر رہے۔ مرا خضر ہے بلنا تیرا گوشہ خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

لیکن خضر کو رہنمائی کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیر وہی کریں مانا کہ اک بزرگ ہم میں ہم سفر ملے
مرزا بزدل بھی تھے ایک مرتبہ ان کو چوروں کا سامنا ہوا تو دیکھتے ہی بھاگ نکلے لیکن درودھوں کے ہرجو مچے گئے۔ ایک سے طلبین چور نے
ڈانٹ کر کہا کہ کم سخت ہمیں اس قدر دوڑایا ہے، اب میرے پاؤں داب۔ اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے کہ

بھاگے تھے ہم بہت سوا سوا کی سزا ہے یہ ہو کر اسید رہتے ہیں راہزن کے پاؤں
مرزا اپنے قریب کے دروازہ پر کم نہ زیادہ پوسٹ ایک ہزار مرتبہ گئے۔ شہر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی عمر بھر میں ہزار بار ہی قریب کے گھر گیا ہے
جانا پڑا قریب کے در پر ہزار بار لے کاش جاننا نہ تری رہم، کوئیں

مرزا نے مرنے کے بعد بھی بہت سے شعر کہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے شاگردوں تک پہنچا دیئے۔ انہوں نے دیوان میں شامل کر رکھے
ان میں سے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں کہ

اللہ سے ذوق و رشت تو رہی کہ بعد مرگ پہلے میں خود بخود مرے اندر رکھن کے پاؤں

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمع زیادہ مجھ سے مے گند کا حجاب لے کر اندام گنگ

مرزا کا محبوب کیں کہہ کے گرد و نواح میں سکونت پذیر تھا۔ چنانچہ جب کسی مرزا کو محبوب کے دروازے پر دھکے پڑنے تو وہ کسی جانب چل بیٹھے۔
فرماتے ہیں اپنا نہیں شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں اس در پر نہیں بل کر کو کعبہ ہی کو ہوا ہے

مجنوں عمر میں تو مرزا سے چھوٹا تھا ہی، اس کا انتقال بھی مرزا سے پہلے ہی ہوا۔ مرزا کہتے ہیں کہ

ہر اک مکان کو ہے کیں سے شرف اسد مجنوں جو مر گیا ہے تو بھگن اداں ہے

مرزا بچا ہے کی موت بھی غریب لاشی میں ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ

مارا دیا غریب میں مجھ کو وطن سے دور لکھ لی مرے خدانے مری بیکی کی شرم

موت یوں ہوئی کہ آخر عمر میں شہر کے دورے پڑنے لگے تھے، ایک دن اسی حالت میں سر پھوڑ کر مر گئے۔ مرتے مرتے کہا ہے

مر گیا چھوڑ کے سر غالب و جوشی ہے ہے بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

مشتاق کو یہ حال معلوم ہوا تو مروت سے خوش مارا اور دوڑا آیا۔ لیکن مرزا غریب میں ایک نظر دیکھ لینے کی طاقت بھی نہ رہی تھی چنانچہ شعر
پڑھتے پڑھتے جاں بحق ہوئے۔ مہنگیں کھولتے ہی کھولتے آٹھ گیس ہے۔ خوب آتے آتے اس عاشق بیمار کے پاس

لیجئے صاحب، یہ ہے ہمارے خدانے سخن کی وہ مورت جو تنقید عالیہ کے آئینے میں نظر آتی ہے +

مطبوعات

مکاتیب غالب۔ ملک کے ادبی مہتمم کو مولوی امتیاز علی صاحب عروسی ناظم کتب خانہ رامپور کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے رامپور کے شاہی کتب خانے میں سے غالب کے وہ خط و جمع کر کے شائع کر دیے جو نواب یوسف علی خاں اور نواب کب علی خاں کے مہم لکھے گئے تھے۔ نواب یوسف علی خاں غالب کے شاگرد تھے اور چونکہ ان کی شاعری غالب کی شاگردی کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی اس لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا پہلا دیوان سربراہ غالب کا کلام ہے۔ اسلوب بیان سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے، اس کے علاوہ جب نواب صاحب اسیر مرحوم کے شاگرد ہوئے تو ان کی شاعری کا رنگ قطعاً بدل گیا تھا۔ یہ کتاب ۱۱ خطوں کا مجموعہ ہے جن میں سے بیشتر میں مثنوی اور روپے کا تقاضا اس قسم کے غیر خود دارانہ الفاظ میں کیا گیا ہے جو غالب کے مداحوں کے لئے خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ لیکن چونکہ یہ غالب کے الفاظ ہیں اس لئے غالب کے حقیقی خلیفہ اداؤں کے لئے بہر حال نعت غیر تر قہر قبول ہے چاہیں ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ گو مرزا صاحب نواب صاحب کو ”ولی نعمت“ اور ”ایہ رحمت“ سمجھتے تھے لیکن ادبی معاملات میں ان کے سامنے بھی سرسخت خودی نہ چھوڑتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ فارسی فرہنگ نویسوں پر مرنے کی کچھ اعتراض کئے جس پر نواب صاحب کے اہل دربار نے اعتراض کیا اور نواب صاحب نے بھی ناراضی ظاہر کی، اس پر مرزا صاحب نے جواب دیا ”یا باتوں کو میں نے مانا لیکن فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بموجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افتادگی اور بے چارگی کی حالت میں بھی اقلیمِ ادب کے اس بادشاہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ کم از کم اس کی اپنی اقلیم میں کسی نااہل کا رنگہ پیلے۔

مکاتیب کی زبان وہی فصیح و سلیس اردوئے مثنی ہے جو غالب کا طرزِ امتیاز ہے، کتاب نیابت نفیس کا فخرِ خوبصورت نسخہ طائر میں چھپی ہے۔ حجم ۳۵ صفحات نفیس اور مضبوط جلد پر کتاب کے نام کی ڈائی گری ہے تصویریں بھی ہیں۔ قیمت بمقدار لکھ۔

سٹیٹ لائبریری رام پور سے طلب فرمائیے۔

مسلم گزٹ کلچر میگزین :- یہ علی گڑھ کے مسلم گزٹ کالج کا رسالہ ہے جو سرسزم الشدیناز احمد صاحبہ بی، اے بی ٹی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ علی گڑھ کے مشہور زائد رسالے ”فاتون“ کا قائم مقام ہے لیکن چونکہ یہ مسلم گزٹ کالج سے وابستہ ہے اس لئے اس میں زیادہ تر اس کا لچکی لطایف یا ادلہ گزٹ کے مضامین ہی چھپتے ہیں۔ حال یہ کہ رسالہ سالانہ ہے لیکن اگر خواتین اس کی سرپرستی کریں جس کا یہ متفق ہے تو ہمارا کردار یا جائے گا۔ کالج کی لڑکیوں کے مضامین قابلِ تعریف ہیں اور یہ رسالہ حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

طرحِ نو: یہ ماہوار اردو رسالہ اردو بک شمال لاہور نے جاری کیا ہے اور اس کی ادارت مشہور نوجوان شاعر سراج الدین صاحب ظفر کے سپرد ہے جن کی شاعری ناظرین ہمالیوں سے بھی خارجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس رسالہ میں سیاسی اور ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ روس کی طرح نو عورت کی معاشی غلامی، آئندہ جنگ کی تیاریاں، ملکی اتحاد کی ضرورت مفید مضامین ہیں۔ چند سالہ تین چلے مجلہ عثمانیہ۔ یہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کوئن کا رسای رسالہ ہے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ مجلہ عثمانیہ ہر طرح اس شاندار جامعہ کا رسالہ کہلانے کا مستحق ہے۔ مندرستان کے کبھی اور کالج کے رسالے میں اس قدر نیا اور محسوس مضامین شائع نہیں کئے طلبہ کے فاضلہ مضامین یونیورسٹی کے طریقہ تعلیم کی کامیابی کی روشنی میں دیں۔

(۱) **شہزادی گلنار** ۲۲ (بچوں کی کہانیاں ۳۱) لال مرغی (۴۴) ننھی مرغی (۵۵) نیت کا پھل (۶۱) چھوٹا چھوٹا (۶۲) مندرجہ بالا سات چھوٹی چھوٹی کتابیں مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور دلچسپی کی غرض سے شائع کی ہیں۔ یہ سب کہانیوں کی کتابیں ہیں اور بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر بہت سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں۔ بچوں کو دلچسپی کی اس سے بہتر کتابیں شکل سے مل سکتی ہیں۔ کتابت طباعت کا غور نہیں ہے اور تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت علی الترتیب ۲-۲-۲-۲-۲-۲-۲-۲۔ مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی سے طلب کیجئے۔

(۱۱) **اسلامی حکایات منظوم** قیمت درج نہیں ہے۔ (۲۲) سیرت حضرت جعفر طیار (۳۰) اسلامی روایات ۶ (۴۲) اسلام و غلامی (۴۴) اسلام اور غیر مسلم۔ یہ سب کتابیں محمد حفیظ اللہ صاحب پھولپوری نے مرتب کی ہیں اور کلمہ الہامی پھولپوری کے مشعل کے بل کی ہیں۔ اسلامی حکایات میں مشہور حوالہ کی نظائیں درج ہیں، اسلامی روایات میں اسلامی تاریخ کے سبق آموز واقعات ہیں، دوسری کتابوں کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے۔ اسلامی حوالہ کے لحاظ سے یہ کتابیں بچوں کے لئے مفید ہیں۔

یادگارِ افہم: مولوی سید ولد الرحمن آلہر کی طویل حیرت انگیز کتاب کے ساتھ مجلہ شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے خاص مشغول کو محفوظ رکھا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ مدرسہ فغانیہ دارالافتا حیدرآباد کوئن سے مل سکتی ہے۔

اسلامک برادر ہڈر: مولوی محمد حفیظ اللہ کی اسلامی مساوات کا انگریزی ترجمہ از مولوی عبدالغنی، مقدمہ از سر محمد فخر الدین وزیر تعلیم بہار و اٹلیہ۔ قیمت درج نہیں ہے۔ پتہ: مسلم بک ڈپو پھولپوری، پٹنہ۔

نغمہ سرور: فضل الدین صاحب قدرا کی رباعیات کا مجموعہ۔ مرتبہ کاظم ایڈیٹر دارالکتاب فی جہاد مغرب سے منگائیے۔ **عرفج زندگی:** (افسانہ) مصنفان حسن صاحب سلیم۔ اے بی بی ایل ایل بی سکریٹری کتب خانہ انجمن ترقی اردو کلکتہ قیمت ۸/- حضرت مفتوحہ صلاطی کے تحت ہیں۔ بنگال میں اردو زبان کے لئے کام کا نام طرح قابل قدر ہے۔ کتابت بیسٹ کے بل سکتی ہے۔

تبصرہ احکامِ رسالتِ طبیب جدیدہ: مصنفہ مکیم احمد الدین صاحب موجودہ طبیب جدیدہ ایڈیٹر تبصرہ الاطباء شاہدہ لاہور طب

کے متعلق کتاب میں مفید معلومات درج ہیں۔ مختلف طریقہ اے علاج پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ طب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو یہ کتاب مفید پڑھنی چاہئے۔ بہت مفید معلوم ہوتی ہے۔ قیمت مجلد سے۔ کتاب ضخیم ہے، پتہ: دارالکتب انجمن خادما حکمت شاہدرہ لاہور۔
رومی اور اسلامی ادارہ علمای: تفسیلی مازد اور تقابلی مطالعہ مرتبہ محمد حفیظ اللہ صاحب ایم اے عثمانیہ۔ قیمت ۴ روپے، پتہ: قلم خان عثمانیہ کالج حیدر آباد دکن۔

کشف الظلام ترجمہ شفاء السقام: علامہ تقی الدین عیسیٰ کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ زیارت قبور، استسقاء، توسل، تشفع، حیات انبیاء و شہداء، مقام محمود وغیرہ کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ روپے، پتہ: برقی پریس، سری باغ، بانگی پور عیش دوست۔ ایک عبارت آموز نایک مصنف پر و فیض خادم محی الدین صاحب، پتہ: قومی کتب خانہ لاہور۔ قیمت ۱۰ روپے۔ تعارف حضرت کیسکی دہلوی نے لکرایا ہے۔ پلاسٹ میں مصنف نے اس متعلق کو لکھا ہے کہ اولاد اور بالخصوص لڑکیوں کی شادی قرار دینے کے وقت اصولاً کن امور کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

راز۔ یہ چند افسانوں کا مجلد مجموعہ ہے، جو محبوبہ کا رخاں جلد ساری حیدر آباد دکن نے شائع کیا ہے۔ اس قسم کے مجموعے یہ کارخانہ آئندہ بھی بالیقین وقت شائع کرتا رہے گا اور جو حضرات اپنے نام درج کرادیں گے ان کو ہمیشہ ۵ روپے بچا جائے گا قیمت ہمیشہ ۵ روپے کی۔
پیام عمل۔ شائع کردہ صدیق بک ڈپارٹمنٹ آباد کھنڈ۔ قیمت ۴ روپے۔ یہ کتاب محمد امجد علی صاحب علی گڑھی نے مسلمانوں کی معاشری اور تمدنی اصلاح کی غرض سے لکھی ہے۔ اصلاح معاہدہ کے خیال سے یہ کتاب مفید معلوم ہوتی ہے عالم مسلمانوں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔
تذکرہ مصیعی۔ طاہر سید الدین صاحب کے ہندی و شملہ کے حالات سفر قیمت ۹ روپے، مطبع نادری جیل پور۔

زوال غازی: غازی امان اللہ صاحب نے نوال کے اسباب پر اس مفصل کتاب میں عزیز ہندی صاحب نے بحث کی ہے قیمت ۴ روپے، پتہ: ثنائی برقی پریس امرتسر۔

علامہ سیتا پوری: ڈاکٹر سید ناظم صاحب۔ ناشر: جامعہ ملیہ دہلی۔ قیمت ۴ روپے۔ اس کتاب میں فورٹ ولیم کالج کے رکن عظیم مولوی اکرام علی مترجم اخوان الصفاء کے حالات درج ہیں۔

انبساط روح: مصنف حاج محمد عبدالغفور صاحب شائق و شوق۔ یہ مذہبی اور صوفیانہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ کلام سہولتی ہے۔ قیمت ۴ روپے، پتہ: مولوی محمد منظور فاضل صاحب انارک۔ لاہور۔

ذکر نبی: سراج رسول قبول الضمیر الدین ہاشمی، اشی صاحب مشہور مصنف اور محقق ہیں۔ یہ کتاب جس کا حجم ۱۰۴ صفحات ہے قابل قدر ہے۔ قیمت ۱۲ روپے، پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ مصطفیٰ بازار حیدر آباد، دکن۔

ہاتھ کی عکسی تصویریں: اس کتاب میں دیواروں پر ہاتھ کا سایہ ڈال کر مختلف جالوزوں اور چوپایوں کی شکلیں بنانے کے

طریقے جمع ہیں۔ بچوں کے لئے دلچسپ تفریحی شغل ہے، کتابیں تصویریں دی گئی ہیں۔ قیمت ۵ روپے؛ ایڈیٹر صاحب انڈین میچین پابشر
دُنیا کے بچے، مختلف ممالک کے بچوں کی تصویریں اور حالات۔ بچوں کے لئے بہت دلچسپ اور پُر معلومات کتاب ہے۔ روپے ہفتہ
جامعہ تہیہ دہلی۔

فہرست کتب خانہ سٹی کالج: مرتبہ غلام رسول صاحب مددگار گورنمنٹ سٹی کالج حیدر آباد دکن۔ قیمت مجلد علی۔ دہرست جس
سلیقہ اور توجہ سے مرتب کی گئی ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔ فہرست کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سٹی کالج کا کتب خانہ بہت اچھا ہے
اور لائبریرین صاحب کو کتابوں کے جمع کرنے کا خاص خیال ہے۔ فہرست کی ترتیب میں جس حدت اور اجتہاد سے کام لیا گیا ہے
وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔

حمید کے شوخ سحر: از حمید صاحب لکھنؤی۔ کلام اچھا ہے۔ پتہ: منیجر نامی پریس لکھنؤ
باز کے شوخ سحر سہر۔ مرتبہ محمد واجد علی خاں صاحب باز۔ کلام اچھا ہے۔ کاشانہ باز، بازار گھانسی، حیدر آباد دکن۔
خوشہ یرویل۔ ۴۴۔ فضل الدین صاحب فردا دینا لکھی کے شوخ سحر بعض شعر خوب ہیں۔ پتہ: ابو الفضل الدین، فدا مال آباد دینا لکھنؤ گورنمنٹ
ہوش کے ناخن بند دلچسپ ڈراما از محمد رم محمدی الدین صاحب بی اے عثمانیہ۔ حیدر آباد کی سماجی زندگی کا مرقع قیمت ورج
نہیں۔ پتہ: احمدیہ پریس چارمینار حیدر آباد دکن۔

شب چراغ: محمد ذوق صاحب نیاں کے نوافول کا مجموعہ۔ قیمت ۸ روپے۔ پتہ: قمر الادب، دفتر شاعر، آگرہ۔
صہبائے راز: حضرت گویا جان آبادی کی قابلِ مطالعہ نظم قیمت ۱ روپے؛ الطرش پریس۔ بریلی۔
اصل حیات: از حضرت گویا جان آبادی۔ منکرین حیات بعد الموت کو مدلل جواب۔ قیمت ۴ روپے؛ رفاہ سوسائٹی بریلی۔
رباعیات جذب: از راگھندر راؤ صاحب جذب مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔ حجم ۱۰۰ صفحات۔ کلام یکسر اور عارفانہ قیمت ۸
متاع سخن۔ انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر از ڈاکٹر محمدی الدین زود قادر۔ قیمت ۱۲ روپے۔ استادان کلام ہے۔
پتہ: کتبستان، الہ آباد (یوپی)۔

مصطفیٰ کمال پاشا: از استاد شفاق حسین صاحب ایم اے ایڈیٹر مسٹر گودیانی منظر روچک قیمت مجلد طرہ
زندگی بہ پیشور جرنلٹ ٹما روزی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، حجم ۴۴ صفحات قیمت ۸ روپے؛ کتبہ ابراہیم محمد حیدر آباد دکن
قانون کی راجکارا، سنجوگن اور پرنی راج کا منظوم قصہ قیمت ۶ روپے؛ محمد سلیم خاں، صدر بازار کرنال۔
روزِ کلام غالب۔ از محمد خاں صاحب لکھنؤی۔ قیمت ۸ روپے؛ دفتر خالد ماہو، تمام، گلگتہ۔



فہرست مضامین

نہالیوں بابت ماہ جون ۱۹۳۸ء



تصویر: جنگ کے دنوں میں

صفحہ	صاحب مضمون	مضمون	شمار
۴۱۸	بشیر احمد	ہرم نہالیوں	۱
۴۲۰	حامد علی خاں	محمد اقبال (نظم)	۲
۴۲۲	"	جہاں نسا	۳
۴۲۵	جناب محمد افتخار الحق صاحب	مروم اقبال کی یاد میں	۴
۴۲۶	منشی تلوک چند صاحب محروم	زندہ جاوید اقبال (نظم)	۵
۴۲۸	حضرت راصل ہشتیار پوری	ہندوستان کی قومی زبان	۶
۴۳۰	حضرت مقبول احمد پوری، بی۔ اے	اقبال کے آخری لمحات (نظم)	۷
۴۳۲	جناب محمد صدیق صاحب تانوی بی۔ اے، ایل، ایل، بی	گورز کے اختیارات	۸
۴۳۳	حضرت حفیظ ہوشیار پوری ایم۔ اے	پیشہ ورانہ خودی (نظم)	۹
۴۳۴	جناب سردار واجند مسنگ صاحب بیدی	کوارنٹین (افسانہ)	۱۰
۴۳۵	جناب مولوی مظفر حسین صاحب شیم انجمن ترقی اُردو ہند	علامہ اقبال محروم (نظم)	۱۱
۴۳۷	جناب نعمان شاہ بل بھوپالی	ترہیت حبشی	۱۲
۴۳۸	جناب سید علی منظور صاحب حیدر آبادی	اٹھو والا فلسفی (نظم)	۱۳
۴۴۰	حضرت حفیظ ہوشیار پوری	امیدوں کی دنیا (افسانہ)	۱۴
۴۴۵	حضرت شاد عارفی رامپوری	اقبال رم (نظم)	۱۵
۴۴۶	جناب پروفیسر سید فیاض محروم صاحب ایم۔ اے	دعوت (افسانہ)	۱۶
۴۴۷	حضرت اطہر پال پوری	نایاب وفات ڈاکٹر سر اقبال محروم	۱۷
۴۴۹	جناب بابر بٹالوی بی۔ اے	برقع (ڈراما)	۱۸
۴۵۵	"	مضامین ادب	۱۹
۴۹۰	"	مطبوعات	۲۰

چند سالانہ سر ششماہی سے (مع مضمون) قیمت فی پیرچہ ۸

بزم ہمایوں

اُس ادیب یا ادب پسند کے لئے جسے سوائے ادب کے دنیا کی کسی اور چیز سے واسطہ نہ ہو، ادب ایک دل خوش کن حقیقت ہے، کم از کم ایک پُر امن جائے پناہ ہے لیکن اُس کے لئے جو زندگی کے کسی اور شعبے سے بھی تعلق رکھتا ہو یا رکھنے پر مجبور ہو زندگی میں اُن کے کھلاڑیوں کے درمیان ایک جنگ یا مقابلہ ہے بلکہ سیان میں بھی ایک غلطی ہے۔ پورا اٹھائے صرف اُس ادیب کو نصیب ہے جس کے لئے ادب داغی عیش و عشرت ہو ورنہ کہاں زندگی کا کوئی کام اور کہاں پورا امن؟

اُردو کے اہل ادب اپنی غفلت یا نیکوئیں میں مست تھے کہ زندگی کا ایک نیا فلسفہ اور سیاست کا ایک نازہ طوفان اُن پُر لوٹ پڑا ورنہ وہ خوب اپنے غم سے میں پڑے اپنے طرح معصوموں پر غروریں کھینچتے اور ایک نئے غم سے کہ باطنی دے مٹی کلام پر سر مڑھتے تھے نئے فلسفے نے انہیں جھنجھوڑا اور نئی سیاست نے اُن کی زبان اور رسم الخط کو بڑے نگہ پر چھینکا چاہا۔ اُن میں سے بعض پوچھتے تھے کہ کیا ایسی خوبصورت اور نفیس چیزیں کالیوں قلع قمع کیا جاسکتی ہیں؟ نامناسب ناگہن! انہیں کیا معلوم کہ ان سے پہلے کتنے مہر گلوں اور ہاکوؤں اور چنگیز خاؤں نے کتنی نفیس و خوبصورت چیزوں کو تہ تیغ کر ڈالا، پھر عرب کیا ہے کہ ان کی تمدنی پیداوار بھی کسی نئے قومی انقلاب کے پاؤں تلے روندی جانے والی ہو!

ڈاکٹر اقبال ج سے ان نئی شخصوں کا چند ہی ماہ ہوئے میں ذکر کر رہا تھا اور ایسا نہ لےجے میں اُن سے اس کے متعلق رائے طلب کر رہا تھا کہ میری ساری دلائل کے مقابل میں انہوں نے ایک سکرانہ سے پنجابی میں بے تکلفی سے جواب دیا تو یہ دیا کہ ایسے ہی مذہب آپ کی اُردو برابر قائم رہے گی!

کیا ہو گا یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے۔ آج کل ہر لڑائی بہت سے محاذوں پر لڑی جاتی ہے اُردو کی لڑائی کے بھی بہت سے محاذ ہیں۔ ایک وہ محاذ جہاں تین ادیب اور فاضل شاعر علم و ادب کے کوئی بھیرتے ہیں جہاں بڑے بڑے عالم فاضل ہزاروں کُنت کی اور آدھ گتائیوں کھولے اُردو کی نئی قافوں میں تیار کر رہے ہیں۔ ایک اور محاذ ہے جہاں اُردو اخبار اپنی مادہ و تیار کر رہے ہیں اور اپنی بندوبستیں کرتے ہیں۔ علی داؤدی ریلے ان دونوں محاذوں کے درمیان میں شش و پنج میں ہیں انہیں پتہ نہیں چلتا کہ امن سے ادبی کام کریں یا اپنی زبان کے لئے قتل چاہیں۔ ایک اور محاذ پر سیاست کی بولی کھلی جا رہی ہے ریڈیو لیون ٹرائٹ جاسے ہیں۔ ایک دوسرے کے نفس بیان کئے جاتے ہیں، کبھی تو توہمیں ہیں ہے اور کبھی صلیح کی گفتگو میں ہیں اس میں بڑے بڑے سیاست دان اور بڑے بڑے روحانی رہنما شامل ہیں۔ اسی طرح چند چھوٹے چھوٹے محاذ اور کچھ ہیں۔

سوال تو صرف یہ ہے کہ شخص اپنے لئے کونسا محاذ انتخاب کرنا ہے؟ محاذ کا انتخاب لازم ہے گو بارہا خود حالات ہی اس انتخاب کو عمل میں لاتے ہیں اور انتخاب کنندہ منہ نہ نکٹا رہ جاتا ہے۔ پھر بھی سرکاری طور پر انتخاب ہائے مانتور میں ہے اور ہم اس سے رُو گردانی نہیں کر سکتے۔

خوش قسمت ہیں وہ جنہیں صرف ایک ہی محاذ پر کام کرنا پڑتا ہے، وہ دوسروں کی حالت کے ناگاہک ہیں لیکن انہیں ایک گودا من تو نصیب ہے، ایک کوئی تو ہے، اپنا کام کر رہے ہیں بڑا ہوا بھلا۔ ایک ضبط ہی ہے، ایک اعتقاد ہی ہے، اپنے دائرے میں بند ہی ہوں، انہیں بے کچھ کر رہے ہیں اور حقوڑا بہت اطمینان رکھتے ہیں:۔۔۔
جو کرنا ہے تجھ کو کر، جو کرنا ہے ہونے دے

حضرت آہل ہوشیار پوری اپنے گرامی نامہ مؤرخہ، مڑی میں لکھتے ہیں:۔۔۔

”ہمایوں“ بابت ۱۹۳۱ء کی ترتیب خاص طور پر قابلِ تعریف ہے۔ رسالے کی ابتدا قبل مرحوم کے ذکر سے ہوتی ہے آخری مضمون بھی اقبال پر ہے۔ اس مضمون کے نیچے گرامی مرحوم کے متعلق اقتباسات۔ اس سے آگے گرامی کے آثار و نواب عظمہ جاہ کا کلام۔ غالب کی سوانح عمری، غالب کے کلام سے (منقول از شیرازہ) کے بعد مکاتیب غالب پر ریویو

بابو جی کے بعد منظومات ”الہام اُلفت“ اور ”محبوب کی قبر پر“ کے بعد ”مجت کی نیرنگیاں“، ”نیرنگیاں“ کے بعد ”کرشمہ“ کیا عمدہ ترتیب ہے۔ اقبال کے متعلق ادیب کی نثر اور جانٹ ایڈیٹر کی نظم۔ پھر جامدادی قہر اور اصل و حقیقت دو بھائیوں کی دو جوڑیل بزم بہاؤ میں نظر آتی ہیں۔ ”یا وگرا می“ میں گرامی کی رائے اقبال کے متعلق اور اقبال کی تصویر کے نیچے گرامی کا شعر واد، سبحان اللہ! گرامی صاحب کے شعر اور حنیف کا تاریخ ”بینہرین خودی“ میں جو مباحثے ظاہر ہے۔ میں اس ترتیب سے مجھ مخطوط ہوا۔“

بشیر احمد

محمد اقبال

فنا پر خندہ زن اقبال عالی گوہری تیری
کہ ہے صورتِ نسا اللہ کی صورت گری تیری

لرز جاتا ہے جذبِ عشقِ حق سے عرش کا پایہ

ہنساتی ہے پرے جبریل کو بھی بے پری تیری

پھر اب کر و بیانِ عرش کو اک سجدہ لازم ہے

عروجِ آدمِ خاکی کا زینہ رہبری تیری

انا الحق گو ہے عشقِ حق میں بندوں کی خود آگاہی

بناتی ہے خدا، انسان کو صنعت گری تیری

بسکھائے چیونٹی کو تو نے آدابِ سلیمانی

گدا ہو خسروی جس کی، وہ دولت بے زری تیری

رسول اللہ کے پیغام کی تفسیر کی تو نے

چلی ختمِ الرسل کے بعد بھی پیغمبری تیری

یہ فوق الخلق تخلیق اور یہ صمد جلوہ پیدائی

مسلم ہے جہانِ شاعری میں داوری تیری

حامد علی خاں

۱۸ مئی ۱۹۳۸ء

(۱)
نہ درو فرست باز آید کہ ناید
نیچے از عجب از آید کہ ناید
سر آمد روزگار این فقیہ
و گردانا سے راز آید کہ ناید
اقبال

(۲)
جباری نے نواز آئے نہ آئے
دول میں چر گرد آئے نہ آئے
سکندر تو ابھی آتیں گے لاکھوں
کوئی آئینہ ساز آئے نہ آئے
عادل علی خاں

(۳)
چو زخمت خوش بر بستم ازین خاک
ہمہ گفت بند بابا اشتنا بود
و یکین کس نہ انست این مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از عجب بود
اقبال

(۴)
خودی کا اور خد کا راز داں تو
پیام زبید کا ترجمان تو
چراغ افروز دین تیری بدلیات
یقیناً مہدی میں آخر نیاں تو
عادل علی خاں

جہاں نما

اتحاد ہندو مسلم اور آزادی ہندوستان

غلام قوموں کی بڑے بڑی بد بختی یہ ہوتی ہے کہ اپنے دور زوال میں ان کا سر بل شعوری یا غیر شعوری طور پر غیر ملکی قافلوں کے مصالح کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس سے زیادہ تکلیف دہ یہ بات ہوتی ہے کہ جو لوگ آزادی حاصل کرنے کے لئے بہتر انداز نظر آتے ہیں وہ خود بھی حکمرانوں کے پیدا کئے ہوئے فریبوں کا اس طرح شکار ہو جاتے ہیں کہ خود ان کے اعمال ہی اپنی غلامی کی بنیادوں کو اور زیادہ استوار کرنے لگتے ہیں۔ حاکم قوم دستور حکومت میں بعض ایسی خصوصیات رکھ دیتی ہے جن سے اہل ملک میں چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق اندرونی جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ فریب غلبہ وہ عوامل اور ان سے بڑھ کر ان کے رہنما موبہوم اور بے حقیقت مقاصد کے اس اہم فریب میں یوں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ آزادی کا اہم مقصد نظر انداز ہو جاتا ہے۔ جب کبھی غلاموں میں آرزوی کا دلولہ پیدا ہوتا ہے حکمران قوم ہمیشہ ایک نیا دام بھیلادیتی ہے اور قیامت یہ ہے کہ غلام اس دام کی حقیقت سے واقف نہ ہونے کے باوجود بھی اس میں گرفتار ہونے کے لئے کھینچے چلے آتے ہیں۔

غلاب سے بیدار ہونا ہے ذرا محکوم اگر بھڑلا دیتی ہے اس کو حکمران کی سامری

۱۹۱۹ء کے فسادات کے بعد جو بیداری اس ملک میں پیدا ہوئی تھی اس کا بھی یہی حشر ہوا یہ ایک نیا سازبات تھی کہ ہندو اور مسلمان کچھ دیر کے لئے آپس میں مل بیٹھے تھے لیکن مغربی سیاست کے جلد ہی اپنی زنجیل سے مائیکو سپر ڈا اصلاحات کی ہڑی نکال کر ان کے سامنے ڈال دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں شردار کی اس بے خبر خشک بلڈی کو جو چوڑنے کے لئے بیڑا بکرا ناض و چنگل سے ایک دوسرے چمدا د رہ گئے اور دونوں طرف کے بڑے بڑے لیڈر بھی اس جنگ میں شامل نظر آئے۔ دیکھتے دیکھتے وہ اتحاد خراب خیال ہو گیا جس کی برکت سے ملک اس قدر طاقت پریدار کی تھی کہ فراعندہ وقت بھی نئے فقیروں کے سامنے ٹھکنے لگے تھے اور آزادی کی منزل آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔

اس کے بعد جب غلامی کی پرانی شراب آئین حیدر کی نئی بول میں ڈال دی گئی تو ملک در زیادہ بدست ہو گیا۔ حقیقت سب نے فراموش کر دی کہ طاقت پیدا کئے بغیر کبھی کوئی داتا آزادی نہیں دیا کرتا اور طاقت اتحاد اور ایک متحدہ محاذ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی ملک کی مثال تریں جماعت کا یہ زوال بہت عبرت ناک ہے کہ وہ اپنے بلند مقاصد کو بھول کر جمہوری آزادی کے کھلونے سے بچوں کی طرح کھیلنے لگی ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ملک اگر کسی چوری طرح متحد ہو جائے تو ہمارے مطالبات کے تسلیم کرنے میں بہت زیادہ جیل نہ ہوگی۔ لیکن مغربی سیاست کے تحت نئے عقائد کے ملک کے ہر فرد کو اتحاد کی نصیحتیں دینے سے دور رہا ہے۔

اس سلسلے میں ہندو قوم کی حالت سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ سب سے زیادہ غافل ہے بلکہ اس لئے کہ وہ سب سے زیادہ بیدار ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُس عالی حوصلگی سے کام نہیں لیتی جس کی وہ اہل ہے۔ ہندوؤں کو اس ملک میں محض عظیم ترین اکثریت ہی حاصل نہیں بلکہ وہ ہر لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں، علم، تجارت، دولت، سیاسی تدبیر، سیاسی اقتدار، ہر میدان میں وہ آگے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اقلیتوں سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اقلیتوں کے مطالبات اپنے حدود سے تجاوز نہ کریں اور ہندو قوم اتحاد دیکھائی دے تو ان کے اہم مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک بڑے بھائی کی طرح عالی حوصلگی سے کام لے کر انہیں تسلیم بھی کر لے تو اس کی کسی طرح خطہ میں نہیں پرکتی۔ ہندوؤں کو ملک میں اتنی عظیم اکثریت حاصل ہے کہ اگر وہ باوجود بڑی زہنیوں، فکری اقلیت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی خواہ وہ اپنے تمام آبادی سے کچھ زیادہ حقوق ہی کیوں نہ حاصل کر لے۔

اقلیتوں کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جس ملک کی قومی تیز اور روشن خیالی ترین اکثریت اتنی بڑی اور رنگ جوصلہ ہو اس کی سپاندہ اقلیتوں کا جو حال ہو سکتا ہے ظاہر ہے صبح قیاس کن رنگستان بن بہار مرا

ملکی جمعیت کا موجودہ انتشار ہماری غلامی کی زنجیروں کو روز بروز زیادہ مضبوط کر رہا ہے اور اس انتشار کی سب سے بڑی ذمہ دار ملک کی بیدار ترین فعال جماعت ہے۔ ہمارا یہ طلب نہیں کہ جماعت علمانا اتفاق کی تلقین کرتی ہے بلکہ افسوس یہ ہے کہ اس جماعت نے اتحاد کے مقصد عظیم کو ایک سرے کے لئے پس پشت ڈال دیا اور اس سے قطعاً غافل ہو گئی۔ حالانکہ اس کا سیاسی تدبیر اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ایثار اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کر کے ملک کی تمام جماعتوں کو اپنا حلقہ جموں بنالیتی اور ایک متحدہ ہندوستان آزادی کی منزل کی طرف برابر جا رہا ہے۔

ہندوستان کا مستقبل

گذشتہ دنوں ہندوستان کے موجودہ حالات پر غور کرتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو نے حقیقت بیان کی کہ ”ہماری صوبائی حکومتوں کو جو قوت حاصل ہے، اس کا ہندو نظام حکومت نہیں بلکہ خود کا گورنر کی تنظیمی قوت ہے، جنگ اور انقلابات کے اس دور میں کوئی بات بعد از امکان نہیں۔ اس زمانے میں ہمارے بچاؤ کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ ہم اپنی رہ کر اپنی اندرونی قوت بڑھاتے رہیں۔ لیکن کوئی رستہ نظارت سے غالی نہیں ہوتا اس لئے ہمیں گوناگوں دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت متوجہ رہنا چاہیئے۔ ہمارے سامنے ہیں کچھ کم رکاوٹیں نہیں ہیں۔ غیروں کی مخالفت سے زیادہ ہم اپنی اندرونی کمزوریوں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں کسی دشمن کے

خلافت اٹھنے کے مقابلہ میں اپنی کوتاہیوں کے خلاف جہاد کا زیادہ دھواڑ ہوتا ہے یہیں دونوں طرح کا مقابلہ درپیش ہے۔ جماعتِ اندر بہت سہمی ساجی فرمایاں ہیں جنہیں قدیم رسم و رواج اور عقاید نے غیر معمولی تقویت بخشنی ہوئی ہے۔ یہ معاملات موجودہ یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ ہم میں اب ایک نئی میداری ضرور پیدا ہو رہی ہے۔ فضا میں انقلاب کے جراثیم رست کر چکے ہیں۔ مغربِ اہلِ اپنی ناتوازی اور مصیبت کا خاتمہ کر دینے پر تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دنیا بھر جنگ کے مصائب اور جنگ کے خطرات کے بلبل چھا رہے ہیں۔ ہندوستانی اب پہلے کی طرح دوسروں کے ہاتھ میں آلاکار بازی بنے رہنے پر تیار نہیں۔ یہ ملک اب خود اپنی قسمت کا مالک بننا چاہتا ہے، ہندوستان اگرچہ شینوں اور کارخانوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا مگر وہ انہیں اس زمانے میں ترقی کا ایک ناگزیر ذریعہ ضرور سمجھتا ہے اور وہ ان کے وجود کو کسی نہ کسی طرح اپنے منتقادات کے ہم آہنگ کرنے کا خواہشمند ضرور ہے۔ ہمارے ملک سب سے بڑا مسئلہ زراعتی مسئلہ ہے جیسے جیسے زمینداروں کا مابہ غریب کاشتکاروں کی ترقی کے راستے میں بری طرح حائل ہے ایک زبردست زراعتی انقلاب کے بغیر اس مصیبت کا علاج ممکن نہیں لیکن زراعتی انقلاب کے باوجود بھی شہری اور قصبائی بے روزگاروں کی ایک کثیر تعداد موجود رہے گی جن کے لئے کام کرنے کے لئے صنعتی کارخانوں کی تنظیم کی ضرورت ہوگی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر

۱۹۰۶ء	نواب وقار الملک	ڈھاکہ
۱۹۰۷ء	آدم جی پیر بھائی	کراچی
۱۹۰۸ء	مسٹر سید علی امام	امرتسر
۱۹۰۹ء	مہربانی نس آغا خاں	دہلی
۱۹۱۰ء	سید بی بی اللہ	ناگپور
۱۹۱۱ء	نواب سلیم اللہ	کلکتہ
۱۹۱۲ء	میاں مسٹر محمد رفیع	کلکتہ
۱۹۱۳ء	سر ابراہیم رحمت اللہ	آگرہ
۱۹۱۵ء	مسٹر مظہر الحق	بہلی
۱۹۱۶ء	مسٹر محمد علی جناح	کلکتہ
۱۹۱۷ء	مولانا محمد علی (نظر بند ہو گئے)	کلکتہ
	راجہ محمد علی محمد خاں	
۱۹۱۸ء	مسٹر اس کے فضل الحق	دہلی
۱۹۱۹ء	حکیم علی خاں	امرتسر
۱۹۲۰ء	مسٹر محمد علی جناح	کلکتہ (اصلاح خاص)
۱۹۲۱ء	مولانا حسرت موہانی	امرتسر
۱۹۲۳ء	مسٹر غلام محمد بھگت	کلکتہ
۱۹۲۴ء	سر سید رضا علی	بہلی
۱۹۲۵ء	سر عبدالرحیم	علی گڑھ
۱۹۲۶ء	شیخ سر عبدالقادر	دہلی
۱۹۲۷ء	مولوی سر محمد یعقوب	کلکتہ
۱۹۲۸ء	سر محمد علی محمد خاں	کلکتہ
۱۹۲۹ء	ڈاکٹر سر محمد اقبال	الہ آباد
۱۹۳۱ء	چودھری سر مظہر اللہ خاں	دہلی
۱۹۳۳ء	میاں عبدالعزیز	کلکتہ
۱۹۳۴ء	خان بہادر حافظ علی حسین	دہلی
۱۹۳۶ء	سر سید وزیر حسین	بہلی
۱۹۳۷ء	مسٹر محمد علی جناح	کلکتہ

مرحوم اقبال سچا محبت وطن تھا۔ وہ غلامی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کے رگ وریشہ میں آزادی کی محبت سرایت کر چکی تھی۔ اس نے شہنشاہی کا فلسفہ توڑ کر رکھ دیا ہے

آبتانوں تجھ کو رمز آئیہ اِنِ الْمُلُوكِ

سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

غواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر

پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمران کی ساحری

وہ مسلمان کے افلاس سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ اُس کی جہالت، پیر پرستی کو بھی اچھی طرح جاننا تھا۔ خوابیدہ

مردوں کی بیداری کا نقشہ کس جوش سے دکھایا ہے

ہم کو تو میٹر نہیں بنی کا دیا بھی گھر پر کا بجی کے چر لفظ سے ہر روشن

آہ! او دُنیا نے حاضر کے سبے بڑے انسان، اب ہم ہمیشہ کے لئے تیرے کلام سے محروم کر دیئے گئے۔ او محسنِ عظیم

تو قوم کا حقیقی مسنوں میں لیدر تھا۔

تیری زندگی قوم پر قربان ہوئی۔ تو نے سوتی ہوئی قوم کو جگایا۔ مُردہ روحوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

اقبال! تو میر و استقلال کا دیوتا تھا، تو نے آخری دم تک ملک و قوم کی خدمت سے جی نہ پڑایا۔ تجھ کو یقین تھا کہ اب میں کوئی

دیم کا مہمان ہوں لیکن پھر بھی تو نے اپنا کام جاری رکھا اور ملت پر جان نثار کی۔

اقبال! موت سے پہلے ہر الفاظ تیری زبان سے نکلے وہ ہمارے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہیں گے "میں مسلمان ہوں نہیں

نرت سے نہیں ڈرتا۔ جب موت آئے گی میں منتہرہ چہرے کے ساتھ اس کا خیر مقدم کروں گا۔"

مرنا سب کو ہے۔ دُنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ غیر فانی صفت خدائے واحد کی ذات ہے لیکن تیرے جانے سے جو

نقصانِ عظیم قوم کو پہنچا ہے اُس کی تلافی ناممکن نظر آتی ہے۔

اودلیہر حوصلہ رکھنے والے رہنا! قوم کے حقیقی بھی خواہ! الوداع! ہمیشہ کے لئے اور آخری الوداع! ۱؎

محمد اقصیٰ الحق

انوشاہ

یہ نواں مگر گئے مسجدوں میں جب وقت قیام آیا (اقبال)

یہ مصرع لکھ دیا کس شرح نے محرابِ مسجد پر

زندہ جاوید اقبال

قطعہ

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو گیب
 احساس میں سما گیا، دل میں اتر گیا!
 کُنج مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر
 قدسی نژادِ اوجِ سماوات پر گیا!
 کاشانہ بقا میں مسافر پہنچ گیا
 ویرانہ فنا سے سلامت گزر گیا!
 باغِ جہاں میں صورتِ گلہائے تر رہا
 باغِ جہاں میں مثلِ نسیم سحر گیا!
 خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں
 خورشیدِ جلوہ بار سے پوچھو کہ مر گیا!
 ہرگز نہیں رداں کہ دلش زندہ شد عشق
 روشن تر اس حقیقتِ روشن کو گر گیا!
 محروم! کیوں ترے دلِ حراں نصیب کو
 یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا!
 تنہا چند محروم

ہندوستان کی مشترکہ زبان

میں کسرائی، وطن طرآن، اسکن گوندوانے میں خدا مہسوم کیونکر آگئی اُردو زبان مجھ کو

زخمیں لڑ پڑیں بہت مرزا عاشق حسین بزم محرم

حقیقت یہ ہے کہ صرف اُردو ہی ہندوستان کی مشترک زبان (لنگوا فرییکا) بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور صلاحیت کا کیا ذکر ایک

بڑی حد تک وہ لنگوا فرییکا بن چکی ہے۔

البتہ انڈیا ایجوکیشن کے ایک جلسہ میں اس کے تقریباً دس برس پیشتر

زبان کا مرتبہ

تمام دنیا کے کاموں میں اپنی زبان کا مرتبہ سب کے برابر ہے۔ اور زبان کا مدار نازک بیانی و پاکیزہ خیالی پر ہے۔ میں اپنی زبان پر اپنا وقت اور وسیع فہم فریج کرنا تمام ملکی و قومی نیکیوں سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں اور کتنی ہی زیر باری اور دروسر ہواس منغلہ کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے بغیر نہ رہوں گا۔

اُردو کا قصور صرف یہی ہے کہ آپ کی زبان ہے۔ اور کسی کی جوتی تو خدا جانے کس قریب کو پہنچ جاتی۔

خان بہادر میرزا ناصر علی مرحوم

صدائے بازگشت

”جس طرح اُردو زبان ہندوستان و مسلمان دونوں قوموں کی زبانوں سے مرکب ہے، اسی طرح انجمن ترقی اُردو دونوں قوموں کیساں تعلق رکھتی ہے اور دونوں قوموں کا فرض ہے کہ زبان اُردو کو وسیع سمون میں قومی زبان یا ملکی زبان تصور کر کے اس کو ترقی دینے کی کوشش کریں اور یہ زبان جس اتحاد و اقوام کی یادگار ہے اس کو دونوں قومیں مل کر زندہ اور تازہ رکھنے میں ذرا کوتاہی نہ کریں۔ لیکن فرض کر دو دوسری قوم جس کے ساتھ ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے اور جو اُردو زبان پر دہی حق رکھتی ہے جو ہمارا حق ہے اس قریب وطن کی منزل میں کسی خاص وجہ سے ہمارا ساتھ نہ دے، اس کو میں بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا، تو پھر اے فرزندان اسلام! تم اپنے فرض سے کیوں غفلت کرو۔ تم اس محبوب زبان کو ترقی دینے اور اس کو بلند ترین درجہ تک پہنچانے میں کیوں کوتاہی کرو۔ یاد رکھو کہ اگر تم اپنا فرض ادا کرو گے اور اپنی عہد و جہد سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹو گے اور اپنے اس قومی یا ملکی منصوبہ کو پیش نظر رکھ کر برابر آگے بڑھتے اور منزل مقصود کے قریب پہنچتے جاؤ گے، تو وہ جو کسی غلطی سے ہمیشہ ہوا کہ چھوڑ کر کسی اور گنڈ باندھی پر چل پڑے ہیں اور وہ جو کوتاہ بینی یا غفلت سے ہمیشہ ٹھکرا رہے ہیں اور وہ جو کمزور ہیں اور وہ جو

لے ان کے غلط و غلط کیری اٹھنا اور ان سے ہٹنا ہے اور ان کی رائے اور وہ ہیں جنہیں۔

میں ہنساے نقش قدم کو پھر تلاش کریں گے، ہنساے قافلہ کے جس کی سدا پر پھر کان لگائیں گے، ہنساے گرد راہ کی پرواز کو پھر آنکھیں کھول کر اور دور بین لگا کر کہیں گے۔ اپنی پگ ڈنڈی کے انجام پر منزل مقصود کو نہ پا کر پھر اس اہلی شاہراہ پر قدم ہول گئے۔ اس وقت سمجھیں گے کہ نجات کا آب حیات جس کی تلاش میں وہ نکلے تھے، معتب و فائق کے رستے پر چلنے سے اس کے کنارے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس وقت وہ دوزخ دھوپ کریں گے تاکہ خضر اتحاد کا سراغ لگائیں اور اس کی دستگیری سے آب حیات کے چشمے تک پہنچیں۔

پس اے فرزندِ انِ اسلام! ہمارا فرض ہے کہ اس وقت کے آنے تک اپنے فرض کے انجام دینے میں سرگرم رہو اور پیچھے پھر کر اپنے بھائیوں کو دیکھتے جاؤ اور یہ خیال دل میں رکھو کہ آخر وہ بھائی ہیں، برادرانہ محبت کا جوش کب تک ان کے دلوں کو بے چین نہ کرے گا، غلط خیالوں کا غبار کب تک ان کی آنکھوں کو دھندلا کر تباہ نہ کرے گا، کب تک وہ یہ نہ جانیں گے کہ جس منزل پر ٹھم چل رہے ہو اس پر ہنساے اور ان کے آباؤ اجداد پہلے عرصہ دراز تک چلتے رہے ہیں کب تک وہ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہنساے اور ان کے اسلاف دونوں نے بل کر اس رستے کو خس و خاشاک سے پاک کیا تھا۔ اس کے نشیمن فرزا کو ہوا رکھا تھا۔ اس کے کناروں پر جا بجا سنگ نشان قائم کیے تھے، پھر وہ ذولِ طرف کوسوں تک پھولوں اور میوؤں کے درخت قطار در قطار لگائے تھے۔ اب یہ وہی منزل ہے جس میں تم آگے بڑھنا چاہتے ہو اور ہنساے بھائی اس منزل کے سرے سے دوسرا رستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اپنی نئی پگ ڈنڈی کی داغ بیل ڈال کر اس کو اس منزل کی طرح آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتے ہیں۔ آخر کب تک یہ تنگ مزاجی اور تنگ چشمی باقی رہے گی۔ کب تک سو مہری اور بے پروائی سے کام لیا جائے گا۔ بڑھو! آگے بڑھو! انہ اپنے فرض کو بھولوا اور اپنے بھائیوں کو بھولو۔ وہ وقت آج نہیں توکل منور آئے گا جبکہ ہمارے بھائی اسی منزل کو پھر محبت کی نگاہ سے دیکھیں گے جس پر ہمارے اور ان کے آباؤ کے کام مدت تک گامزن رہے ہیں۔

مولوی سید وحید الدین تسلیم مرحوم

(از تجلئے ممدارت انجمن ترقی اردو، سالانہ اجلاس بمقام سنوٹ، ستمبر ۱۹۵۱ء)

داخل ہوشیار پوری

اقبال کے آخری لمحات

دل بچھ رہا ہے آنسو آنکھوں سے بہ رہے ہیں
اقبال سب سے رخصت ہو کر یہ کہہ رہے ہیں
پھر نیند میں خودی کو اپنی سلا نہ دینا

میرا پیام دل سے اپنے بھلا نہ دینا
بجھتا ہے دل تو کیا غم، آنسو بہا لیں تو بہہ لیں
اک بات وقتِ آخر ہم تم سے اور کہہ لیں
میری نوائے دل پر تم دل سے غور کرنا

خود دار بن کے جینا خود دار بن کے مرنا
دل گھج چکا ہے آنکھیں بھی خوب رو چکی ہیں
سبیل ہر شکِ غم سے دامنِ بے گنجی ہیں

اک دلربا اندھیری بہمت چھا رہی ہے
 خواب فنا کی پیاری سی نیند رہی ہے
 ہم طوفِ شمع وحدت کا قصد کر رہے ہیں
 اپنی خودی سے بھی اب آگے گزر رہے ہیں
 خوش ہیں کہ سونے والو تم کو جگا کے چھوڑا
 تم کو خودی سے اپنی آگہ بنا کے چھوڑا
 کیا خوفِ مرگ ہم کو زندہ ہیں سب کے دل میں
 رہتے ہیں غمِ بن کر ہر قلبِ مضحیل میں
 دنیا میں تھے وطن تھا سارا جہاں ہمارا
 عقبی میں ہیں وطن ہے کون سا مکان ہمارا
 صد شکر پیشِ حق بھی ہم نیک نام پہنچے
 لمحاتِ آخری کا سب کو سلام پہنچے

مقبول

ہندوستان کے آئین نو میں گورنر کے اختیارات

آئین جدید و خصوصیتوں کا حامل ہے۔ اول فیڈریشن، دوم صوبائی خود مختاری۔ اول الذکر یعنی برطانوی اور ریاستی ہند کا وفاق اب تک عمل میں نہیں آیا، مگر صوبائی خود مختاری کا حکم اپریل ۱۹۳۷ء کو سرکاری طور پر نافذ کیا گیا۔ بطور ذیل میں صوبائی حکومت کے سب سے اہم جزو یعنی گورنر کے اختیارات اور اس کی آئینی حیثیت پر بحث کی گئی ہے۔ یہ سوال اس لئے اور بھی اہم ہو گیا کہ پچھلے دنوں کا محسوس ہے کہ گورنر نے بھی جو ہندوستان کی سب سے بڑی نظم سیاسی جماعت ہے، کچھ پس و پیش کے بعد نئے آئین کے ماتحت وزارتیں قبول کر لی ہیں۔ کا محسوس ہے کہ بڑا اعتراض گورنر کے اختیارات کے متعلق تھا، وہ چاہتی تھی کہ گورنر وزراء کی آئینی کاروائیوں میں مداخلت نہ کرے۔ گورنر کے اختیارات کی کیا نوعیت ہے؟ اور کیا واقعی گورنر کی مداخلت ہندوستان کے قومی و ملکی مفاد کے لئے مضر رسال ہے؟ ان د سوالوں پر ہمیں بحث کرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال آئینی جمعیہ گروں سے غالی نہیں اور ان پر کوئی قطعی حکم لگانا خطر سے غالی نہیں کیونکہ ان سوالوں کا تعلق آئین کے عملی پہلو سے ہے نہ نظری سے جب تک ہمیں نئے آئین کا عملی تجربہ نہ ہو ہم قطعی طور سے اس کے اثرات کو نہیں جانچ سکتے تاہم ان آئینی دفعات سے جو گورنر کے اختیارات اور ذمہ داریوں کی تشریح کرتے ہیں کچھ نہ کچھ نتائج قریب کیے جاسکتے ہیں جو ظاہر کریں گے کہ کہاں تک گورنر کی مداخلت ہمارے سیاسی ارتقاء اور قومی مصالح کے مفید یا مضرت ثابت ہو سکتی ہے۔ سب سے پہلے یہ بھلنا ضروری ہے کہ صوبائی خود مختاری سے کیا مراد ہے؟ برطانوی پارلیمنٹ کی ہمیشہ یہ نیت تھی کہ وہ کاروبار سلطنت میں ہندوستانیوں کو تعلیم دے گی تا آنکہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ ان کے ملک کی حکومت ان کو سونپ دی جاسے۔ اس پالیسی میں کی پہلی قسط ۱۹۱۹ء کا آئین تھا جس کے ماتحت صوبوں میں ”وعلیٰ حکومت کا نافذ کیا گیا۔ مشراٹھیکو اور مشریمسفرڈ کا خیال تھا کہ صوبوں میں اس قسم کی تعلیم بہتر اور زیادہ خوشگوار نتائج پیدا کرے گی، لہذا مرکزی حکومت کو چھوڑ کر پارلیمنٹ نے ہندوستانیوں کو صوبوں میں محدود سیاسی قوت دی۔ سائن کیشن نے بھی صوبائی تجربہ کی سفارش کی اور جب نئے آئین کی ترتیب و تدوین کا کام شروع ہوا تو سلیکٹ کمیٹی نے بھی یہی نصیحت کیا کہ مرکز کو چھوڑ کر صوبوں میں ہندوستانی وزراء کو صوبے کی حکومت دینی چاہئے۔ اس پالیسی کے زیر اثر موجودہ آئین پرانی وعلیٰ کو رد کر کے تمام سیاسی قوت ہندوستانی وزراء کے سپرد کرنا ہے، یہ ہندوستانی وزراء ان محسوس کی نگرانی اور اتھارم کئے لئے جو نئے آئین کے ماتحت انہیں سپرد

کئے گئے ہیں ایک ایسی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہیں جو عوام کی نمائندہ قوتور کی جاتی ہے۔

یہ حکومت خود اختیاری کی ابتدا ہے۔ رشتہ رفتہ جب ہندوستان میں حکمرانی کی استعداد، بظاہری تدریج ریاست کے صیانت کے مطابق پیدا ہو چلائی گئی تو حکومت اُن کو سپرد کر دی جائے گی۔ اور وہ پابندیاں جو کسی نہ کسی مصلحت کے زیر اثر کج کل مہنتی وزیر پر عائد کی گئی ہیں، ہٹائی جائیں گی۔ یہ منتہا ہوگا ہندوستان کے سیاسی ارتقا کا۔ آئین جدید صوبے کے نظم و نسق کا فہرہ اعلیٰ گورنر کو قصور کرتا ہے۔ گورنر شہنشاہ ہند کا نمائندہ ہے، گورنر کو مشورہ دینے کے لئے وزراء کا ایک کامیہ ہوگا جو ہر معاملہ میں گورنر کی راہنمائی کرے گا اسوا ان مخصوص حالات کے جن میں پارلیمنٹ کی طرف سے گورنر پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اپنے ذاتی فہم و مشا کے مطابق عمل کرے۔ بظاہر مٹو بیس میں پولیس، عدالت، مالیات، تعلیم وغیرہ سب کا انتظام ایسے وزیروں کو سپرد کیا گیا ہے جو عوام کی رائے کے مطابق چنے گئے ہیں اور جو عوام کی نمائندہ مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہیں یہاں تک کہ اگر عوام کی نمائندہ یہ جماعت وزراء کے کام سے مطمئن نہ ہو تو وہ ان کے اختیارات سلب کر سکتی ہے اور ان کے بجائے ایک زیادہ مستر جماعت کو حکومت دے سکتی ہے۔

آئین کی دفعات کے سرسری مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گورنر کے اختیارات ایک نگران کی حیثیت سے ہیں۔ نہیں مگر ایک عین نظر بنا سکتی ہے کہ حقیقت کچھ اور ہے اور باوجود اس کے کہ تمام وقت ہندوستانی وزیران کو تفویض کر دی گئی ہے گورنر کے اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ وہ سب کے ہر انتظامی شعبہ میں مداخلت کر سکتا ہے۔

گورنر کی قوت تین حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے: ۱۔ گورنر کی مخصوص ذمہ داریاں، ۲۔ خصوصی اختیارات، ۳۔ گورنر کی آئین سازی کی قوت۔

ذیل کے تصویب سے اس کے کہ ہر قوت پر ضابطہ بحث کی جائے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان سب قوتوں کا ایک ہی جگہ ذکر کر دیا جائے جن کی بدولت گورنر کسی معاملہ میں مداخلت کر سکتا ہے۔

گورنر کی سب سے پہلی ذمہ داری صوبہ میں ہر اُن سوز و تحریک یا قوت کا انسداد کرنا ہے، ظاہر ہے کہ ان کا تعلق صوبے کے انتظام سے ہے لہذا یہ ذمہ داری اُس وزیر پر عاید ہونی چاہئے جو صوبہ کی پولیس، عدالت اور اُس کے ضمنی اداروں کے انتظام کے لئے مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہے مگر ایسا نہیں کیا گیا، لہذا باوجود اس کے کہ ایک ہندوستانی وزیر صوبہ کا اعظم ہوگا، پھر بھی وہ اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس نہ کرے گا کیونکہ آٹری ذمہ داری گورنر پر عاید ہوتی ہے اور گورنر حکومت کے ہر شعبہ میں اس ذمہ داری کی بدولت مداخلت کر سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں وزیر کا کوئی حکم صوبہ کے افسان کے لئے خطرناک ہوگا اور منع ہے کہ اس بات کا فیصلہ کر کوئی چیز۔ گورنر کی مخصوص ذمہ داریوں کے تحت میں آتی ہے صرف گورنر پر منحصر

کی کہ وہ ان کے مفاد کا تحفظ انتہائی شکل میں کریں۔ لارڈسٹون نے ان کے اس مطالبہ کو منظور کیا اور آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان جلا کا نہ نیا بت اور انتخاب کے حقدار ہیں۔ قومی سیاست کو اس قسم کے تحفظات سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اس پر بحث کرنا موجودہ موضوع سے خارج ہے۔ مگر اس کا قدرتی نتیجہ جو صدر یا دیگر اہل ہونے والا تھا وہ یہ ہوا کہ اب دوسرے مذہبی گروہ بھی اپنے مخصوص مفاد کو اتنی ہی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان مطالبات کا نتیجہ ’کیمونل اور ڈس‘ ہے۔ یہی نہیں بلکہ نیا آئین نسلی اقلیت کو بھی تسلیم کرتا ہے اور انجیگلو انڈین جماعت کو ریلوے ملازمتوں پر خاص حقوق عطا کئے گئے ہیں۔

یہ تیس کرنا کہ اقلیتوں کے مفاد کو اکثریت کے تندہ و سیاست پر چھوڑ دینا چاہئے ایک سخت غلطی ہے، کوئی نظام حکومت مطمئن اقلیت کے بغیر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ ہر وہ ملک جہاں اقلیت غیر مطمئن ہے، جہاں کی اقلیت کو اکثریت پر بھروسہ نہیں، جہاں اقلیت اپنی زندگی کو دوسروں کے رحم و کرم پر مبنی تصور کرتی ہے ہمیشہ بدظنی اور سیاسی بے یقینیگیوں میں مبتلا رہیگا۔ یہ سب سچ ہے مگر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اقلیتوں کے تحفظ کا کیا طریقہ ہے۔ کیا ان کے ’جائز‘ مطالبات کو انہیں میں منضبط کر دینا چاہئے یا جائز مطالبات کا فیصلہ کسی شخص یا شخص کے لئے منحصر ہونا چاہئے۔ نیا آئین انہیں انہی صورت کو قبول کرتا ہے لہذا گورنر اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ کسی اقلیت کے کیا حقوق کس وقت، کہاں اور کیسے منسب کہئے گئے ہیں۔ گورنر کو ایسا شخص خیال کیا گیا ہے جو کسی بدظنی کے اندر، وہ ایسی شین ہے جو خارجی اثرات سے محفوظ ہے، اس کا فیصلہ ہر قسم کی محکمہ چینی لہذا نظر ثانی سے بالا تسلیم کیا گیا ہے مگر کیا یہ سب کچھ ہندوستان کی مکدر سیاسی فضا اور پارٹی گوشت میں ممکن ہے؟ اس کے جواب مستقبل دے گا۔

گورنر کی ذمہ داری اقلیتوں کے ’جائز‘ مفاد کا تحفظ ہے۔ آئین تو اس لفظ ’جائز‘ کی کہیں شیعہ نہیں کی گئی۔ قدرۃ لفظ ’جائز‘ کا اطلاق ہر اس چیز پر ہو سکتا ہے جسے گورنر کا دماغ قبول یا ایجاد کرے۔
خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ از کرے
بالشبہ اقلیت کو اکثریت پر بھروسہ اور یقین ہونا چاہئے مگر بھروسے اور یقین کی جگہ دل ہے نہ کسی کی چوکت !
اس کا نتیجہ ہو گا کہ اقلیتوں کے حقوق کا تصفیہ جائے مجلس قانون ساز کے گورنر کے ڈرائنگ روم میں ہوا کرے گا۔
ہر وہ ہندوستانی جو پچھلے بیس برس کی سیاسی تاریخ سے واقف ہے اس قسم کے آئینی تحفظات کے عملی نتائج کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں اقلیتوں کی خواہشات کا تحفظ اس طرح بھی کیا گیا ہے کہ انہیں جلا کا نہ نیا بت اور انتخاب عطا کیا گیا ہے

ملہ لارڈسٹون نے ان مطالبات کو انتہائی شکل دینے سے انکار کر دیا تھا۔
نئے آئین پر ایک نظر۔

اُن کے نمائندے مجلس قانون ساز میں اپنے مطالبات پیش کر سکتے ہیں اور اُن مطالبات کا منوانا اقلیت کی معنوی قوت پر جو اُس کی تنظیم اور سیاسی ارتقا سے وابستہ ہوگی، منحصر ہوگا۔

یہ سمجھنا کہ گورنر دفعہ اقلیت کا تحفظ کر سکتا ہے پارٹی گورنٹ کی علی سیاست سے ناواقف یا کاغذ ہے۔ اگر کوئی اکثریت کسی اقلیت کے حقوق غصب کرنے کا نتیجہ کرے تو گورنر کے سامنے صرف دو راستے کھلے ہیں، یا تو وہ اقلیت کے حقوق کا تحفظ نہ کرے یا اکثریت کو دبانے کی غرض سے تمام نظام حکومت کو پلٹ دے۔ نئے انتخابات ہوں، نئی وزارت بنے اور مجلس قانون سازی اقلیت کی سیاسی حیثیت بھی بدل جائے۔ کیا کوئی گورنر ہمیشہ بدفرماندہ کر سکتا ہے۔

اقلیتوں کو اور تقویت دینے کے لئے پڑھ ہدایات "Instrument of Instructions" گورنر کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ ختم الاسکان اُن کے نمائندہ کو کابینہ میں جگہ دے۔ مگر یہ مفروضی ہے کہ یہ اقدام کابینہ کی مجموعی ذمہ داری کو گورنر دینا چاہئے۔ گورنر کمال تک اس ہدایت پر عمل کر سکتا ہے وہ پچھلے چند دہائیوں کی مروجہ سیاسی سائنس سے واضح کر دیا ہے۔ اُسیہ کینٹ میں کسی مسلمان وزیر کو جگہ نہیں دی گئی مسلمانوں نے گورنر سے استدعا کی کہ وہ اپنی مخصوص ذمہ داری اور "پہچان" کی بدولت مداخلت کرے اور اقلیت کے مفاد کو خیال کرتے ہوئے ایک مسلمان وزیر کو کابینہ میں جگہ دے۔ گورنر نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کی رائے میں اقلیتوں کے حقوق ہر طرح سے محفوظ ہیں۔

ظاہر ہے بحالات موجودہ اقلیتوں کے جائز مفاد کو گورنر کے ہاتھ میں ہونا قومی اور ملکی مصالح کے بھی خلاف ہے اور اقلیتوں کو بھی نہیں کے حسب منشا فائدہ پہنچانے سے قاصر ہے۔ ان حالات میں دوسری صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ بنیادی حقوق جو کسی قوم کی مذہبی، ثقافتی، انسانی اور سیاسی زندگی کے حفظ و بقا کے لئے ضروری ہیں انہیں میں مضبوط کر دیے جائیں اور جب بھی مجلس قانون ساز میں ایسا قانون پیش کر رکھی کہ کوشش کی جائے جو کسی اقلیت کے حقوق پر ناروا حملہ ہو تو قانون کے جواز عدم جواز کا فیصلہ ذیل کورٹ جیسے ادارہ کے سپرد کر دیا جائے، جس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ آئین کی تشریح کرے۔ فیڈرل کورٹ کا یہ اہم ترین فرض ہے کہ وہ آئین کے متعلق تمام مسائل کا فیصلہ کرے اس لئے کوئی بد نظریہ جمیں آتی کہ کیں اقلیتوں کا مسئلہ بھی اسی طرح انبند ادارہ کے سپرد کر دیا جائے۔ گورنر کا فیصلہ چاہے کتنا ہی حق بجانب ہو مگر اس پر ہمیشہ شک کی نظریں پڑیں گی، ایسے فیصلہ میں روایتی تعصب، نسلی امتیاز اور عام کا مصلحت اندیشی کی جھلک نظر آئے گی۔ مگر عدالت کا فیصلہ ہر دماغ کے علاوہ نفسی رجحانات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، لہذا ایسا فیصلہ زیادہ قابل قبول ہوتا ہے اور آئین پسند دماغوں پر جو سیاسی جذبہ و جہد کے علمبردار ہوتے ہیں، عدالت کی انصاف پسندی نقش ہو جاتی ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مابعد الغرض مسائل میں استعفیائی سے نظر پاجاتے ہیں۔ دوسری صورت میں ہمیشہ گورنر کا فیصلہ خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے، جس کا حل

خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے، آزادی طلب قوم، بدلیج حکمرانوں کے عمل کو شک کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اقلیتوں کے رہنما ہر اُس فیصلہ کو جو کسی دوسری اقلیت کو تحقیر یا فائدہ پہنچائے، اپنے لئے مضرب اور آئندہ جنگ کے لئے ایک بہانہ بنا لیتے ہیں نتیجہ سے نیا آئین ان نتائج کا کوئی تسلی بخش حل پیش نہیں کرتا۔ گورنر کو اتنی قوت سے دی گئی ہے کہ وہ اُسے کسی پارٹی، کسی گروہ، کسی اقلیت کو سیاسی انعام دینے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

گورنر کی تیسری ذمہ داری ملازمتوں کے متعلق ہے، آئین کا حساب ہے کہ گورنر ملازموں اور ان کے منتقلین کے ان حقوق کی نگرانی کرے جو قانوناً ان کو بخش دیئے گئے ہیں۔ اس دفعہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ گورنر ملازمتوں کے جانور حقوق کا تحفظ کرے اور کسی فن کا اثر ہاری قومی سیاست کے لئے مضرب نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کا تعلق زیادہ تر پیشن یا ملازمتوں پر حقوق وغیرہ سے ہے، مگر پہلی شرط زیادہ واضح الفاظ میں بیان نہیں کی گئی، یہاں بھی لفظ جائز استعمال کیا گیا ہے اور اس کا جائز "کا فیصلہ کرنے والا صرف گورنر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کا انتظام بغیر ایک ایسی منظم جماعت کے جو اپنے آپ کو مشہور اور مدت ملازمت کے متعلق محفوظ خیال کرے، محال ہے۔ کیونکہ نایندہ حکومت (Representative Government) ایک ایسی جماعت کے سپرد ہوتی ہے جس کا قیام مجلس قانون ساز پر منحصر ہوتا ہے۔ کابینہ کی مدت حیات غیر مستقل ہوتی ہے، لہذا حکومت کی پالیسی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، مگر یہ پالیسی جاری کرنے والا محکمہ ایک منتقل حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محکمہ جانتا ہے کہ انتظامی مشکلات کیا ہوتی ہیں۔ نئی پالیسی کس طرح جاری کرنی چاہئے۔ قانون کیسے نافذ کیئے جاتے ہیں وغیرہ۔ الغرض اس محکمہ کا تجربہ ہر حکومت کے لئے ضروری اور لازم ہوتا ہے، ظاہر ہے یہ تجربہ حاصل کرنے کے لئے ملازموں کی ایک مجلس جماعت موجود ہونی چاہئے، ایسی جماعت تیار کرنے کے لئے آئین ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے، مگر ان حقوق کا محافظ گورنر کو بنا تو قوم پرستوں کے نزدیک قابل اعتراض ہے انڈین ہول سروس، انڈین میڈیکل سروس وغیرہ ملازمتوں کے قانون وزیر ہند کے مشا کے مطابق بنتے ہیں، ان کا تقرر و تنزل اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اس کے مطیع ہیں اور اسی کے سامنے ذمہ دار ہیں۔ . . . مگر حکومت کی مشین میں وہ قطاری اداروں کے افسر ہونے کی حیثیت سے ایسے وزیروں کے ماتحت ہیں جو مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہیں۔ وزیر اعلیٰ چاہے کہ اس کا ماتحت افسر کوئی آئی سی۔ ایس۔ ایسے قوانین پر عمل کرے جو خود وزیر نے اپنے محکمہ میں زیادہ تسلی بخش انتظام کے لئے وضع کئے ہوں اور اس کا ماتحت افسر ایسے قوانین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے یا ان کی خلاف ورزی کرے تو کیا وزیر اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر سکتا ہے یا اس کو ایسی سزا دے سکتا ہے جو اس نے ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے کے لئے تجویز کی ہو؟ جاں تک آئین کا تعلق ہے، آئین وزیر کو اس قسم کا کوئی اختیار نہیں دیتا۔ وزیر اپنے ایک ماتحت افسر کے خلاف چاہے وہ افسر وزیر کی کسی پالیسی، تجویز یا کسی حکم کے خلاف عمل کرے، خود کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ ایسے عمل کا حکومت اور ملک پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اس کا اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

کابینہ میں تقسیم کار اور طریقہ عمل کا فیصلہ گورنر اپنی مرضی کے مطابق کرے گا۔ آئین کی یہ دفعہ بہت اہم ہے، گورنر کے اس اختیار کے اثرات سے وہی لوگ زیادہ دقت میں جو حکومت کی نشین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس اختیار کی بدولت گورنر اگرچہ تو کسی ملک کی اصل قوت اپنے ہی ہاتھ میں رکھ سکتا ہے۔ طریقہ عمل کے ضمن میں گورنر کو قانوناً ایسا انتظام کرنا پڑے گا جس کی بدولت وزیر اور اُن کے سکرٹری مجبور رہوں گے کہ وہ خاص امور کے متعلق تمام اُملا میں گورنر کو پہنچاتے رہیں۔ گورنر اگرچہ تو وہ تمام خبریں اس طرح سے حاصل کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر ایک وزیر اور سکرٹری کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسی چیز جو گورنر کی مخصوص ذمہ داری سے متعلق ہو، فوراً گورنر کو پہنچا دے۔ اس دفعہ کی آئینی پیچیدگی یہ ہے کہ سکرٹری کو وزیر کا سادہ اتیار دیا گیا ہے۔ سکرٹری جو اکثر آئی۔سی۔ ایس انسر ہوئے گا اس کا جائز ہوگا کہ وہ گورنر سے براہ راست، وزیر کی مداخلت بلکہ حکم و مرضی کے بغیر کسی خاص محکمہ کے متعلق گفتگو کر سکے، وہ گورنر کو ایسے حالات بتا سکتا ہے، جن کا بتانا شاید وزیر مناسب نہ سمجھے، کیا گورنر ایسے موقعوں پر سکرٹری کو وزیر پر ترجیح دے گا، یا فیروز اپنے سکرٹری پر اعتماد کرے گا، یہ ایسے سوالات ہیں جو روزِ مملکت خوش غصواں داند "کے تحت آتے ہیں۔ گورنر کے اسی اختیار کے متعلق پارلیمنٹ میں ایک مخالف ممبر نے کہا تھا "کہ سکرٹری کو وزیر پر ایک محافظ لکھے کی طرح مسئلہ کر دیا گیا ہے۔"

یہ ایسے ہی ملازموں کے لئے ہے کہ اُن کے جائز حقوق کی نگہداشت گورنر کی مخصوص ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ مضبوط اور انصاف پسند حکومت کے لئے مطمئن ملازم ضروری ہیں تو یہ ادبھی زیادہ صحیح اور اہم ہے کہ ملازموں اور وزراء کے تعلقات خوشگوار ہونے چاہئیں، اُن میں آپس میں اعتماد، تعاون اور یکساں مفاد کے سامنے ذاتی اغراض کو بھول جانے کی ہمت ہونی چاہئے۔ بے شک آئین ایسا سازگار ماحول پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ادارہ پبلک سروس کمیشن ہے۔ مگر کیا آئین ہر اس کوشش کو دبانے کا انتظام کرتا ہے جس کا مقصد ملازمت اور وزارت میں یکساں پیدا کرنا ہو؟ کیا "جائز حقوق" میں سزا پانے کا حق "بھی شامل ہے؟ کیا گورنر کو اختیار ہے کہ وہ آئی۔سی۔ ایس انسوں کو سزا دے سکے؟ آئین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سزا دینے اور موقوف کرنے کا اختیار بھی صرف سکرٹری آف سٹیٹ (وزیر ہند) کو ہے، ظاہر ہے گورنر صرف اُن حالات میں مداخلت کرے گا جب کوئی وزیر کسی ملازم کے خلاف کوئی اقدام کرے، مطلقاً وسیع المعنی لفظ "جائز" جس کی آئین میں کچھ تشریح نہیں کی گئی، لامحدود وقت عطا کر سکتا ہے۔ یہاں بھی ضروری تھا کہ ملازمت کے حقوق کی حفاظت ایک ایسے ادارہ کے سپرد کی جاتی جو پبلک میں اعتماد پیدا کر سکے جس کا فیصلہ پارٹی گورنٹ کی ریشہ دوانیوں اور سیاسی جوڑوؤں سے بالاتر ہو، ایسا ادارہ پبلک سروس کمیشن ہو سکتا ہے۔ یہی ادارہ امیدواروں کی جانچ کرتا ہے، اسی کی سفارش اور جانچ پس سکرٹری آف سٹیٹ مختلف آسامیوں پر کرتا ہے۔ اگر ایسے ہی غیر جانبدار ادارہ کے ہاتھ میں تمام جھگڑے

چکانے کی قوت بھی دے دی جائے تو زیادہ خوشگوار نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ایسے حالات میں یہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ ایک محکمہ ملک جہاں ایسی قوم پرست قوتیں برس بھل رہی جو بدلیسی حاکموں کے اثر و اقتدار کو کمزور کرنے کی آزادی میں رکاوٹ سمجھتی ہوں ان کے پیش نظر یہ بات نہیں ہوتی کہ یہ اثر و قوت قوم و ملک کی مصلحت کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ وہ صرف یہی دیکھتی ہیں اور غالباً دیکھنا چاہتی ہیں کہ موجودہ حالات ان کی قومی صلاح کے منافی ہیں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ان کو ایک ملک میں اعتماد پیدا کیا جائے اس کی اعانت حاصل کرنے کے لئے دیانت دارانہ کوششیں کی جائیں اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک سیاسی قوت بجائے عوام کے کسی ایک شخص کے ہمنام و نشان پر منحصر ہے۔

گورنر کی چھٹی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسے قانون پاس نہ ہونے دے جو ایسے مقاصد کے منافی ہوں جن کے حاصل کرنے کے لئے امتیازی سلوک والی آئینی دفعات وضع کی گئی ہیں۔

اس سچیدہ ذمہ کے سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ۱۹۳۱ء میں ہندوستان کو مالی خود مختاری، عطا کی گئی تھی مرکزی مجلس قانون ساز کی حق حاصل تھا کہ وہ تجارتی معاہدوں پر بحث کر سکے اور اپنے حسبِ منشاء ان کو طے کرے اور اگر چاہے تو کسی ملک سے ترجیحی سلوک روادار کرے۔ اسلئے ان کا ان معاملات پر کہاں تک اختیار تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے برطانیہ کے ساتھ ترجیحی معاہدہ (اولڈ ہیکٹ) ختم کرنے کا ووٹ دیا اور حکومت ہند نے اس فیصلہ پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلئے کو تمام مالی امور پر اختیار تھا، بلکہ یہ ایک محدود قوت تھی جو ہندوستان کیوں کہ تجارتی معاہدے طے کرنے اور کچھ محصول لگانے کے لئے دی گئی تھی۔ تاہم اس کا اتنا اثر محدود تھا کہ تجارت درآمد پر محصول لگانے سے ملکی صنعت کو فروغ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اسلئے برطانوی سامان تجارت پر بھی محصول لگا سکتی تھی۔ مگر اب فیڈریشن کے قیام کے بعد یہ گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری ہو گئی کہ وہ ہر اس امتیازی قانون کو پاس نہ ہونے دے جس کا اثر برطانوی مال یا باشندوں پر پڑے چونکہ ہندوستان یا بالفاظ دیگر فیڈریشن کی مالی پالیسی بھی گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری ہے اور ضروروں کو مالیات "پر کوئی اختیار نہیں لہذا یہ گورنر جنرل ہی کا اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے ہندوستان کی مالیات کا انتظام کرے اور اس لئے کہ ضروروں میں کوئی ایسا قانون پاس کیا جائے جو اس مصلحت کے خلاف ہو، یہ گورنر کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ایسی کمیشنوں کی روک تھام کرے اور فیڈریشن کی اسلئے یا وائسرائے کے پاس کردہ قوانین کو اپنے صوبے میں نافذ کرے۔ فیڈریشن کی مالی پالیسی کو گورنر جنرل کی ذمہ داری قرار دینا، ۱۹۳۱ء میں عطا شدہ مالی خود مختاری پر ایک ایسی بندش ہے جو قوم پرستوں کی نظروں میں ہمیشہ کمزور رہے گی۔

علاوہ ازیں یہ دفعہ ملکی تجارت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، ہر اس ملک میں جو صنعت کے میدان میں نیا نیا آ رہا ہے، اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ بیرونی ممالک سے مقابلہ کر کے اپنی ملکی بندیوں کو اپنے تجارتی سامان کی کثرت سکھانے کے لئے محفوظ کرے حکومت ایسے

موقع پر قومی مفاد کے پیش نظر ملکی صنعت کو محمول درآمد اور دیگر ذرائع سے مدد پہنچاتی ہے، انالکھ ملکی صنعت بھی، اس قابل، ہو جائے کہ بغیر مدد کے بیرونی مسابقت کا مقابلہ کر سکے۔ ہندوستان ایک نیا صنعتی ملک ہے۔ ضرورت ہے کہ حکومت اس کی فزیر صنعت کی اعانت کرے تاکہ وہ سامان جو یہاں تکفایت تیار ہو سکتا ہے، ملکی منڈیوں میں متیا کیا جاسکے۔ اس میں شک نہیں کہ تاہم پالیسی کا اختیار کرنا خطر اسے خالی نہیں تاہم قومی مفاد کے لئے اختیار کی قیمت میں گرانی اور عوام کی قوت خرید میں کمی سمجھنے سے اس کے لئے برداشت کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ مالی خود مختاری کی بدولت آپلی اس تاہم پالیسی پر کاربند ممتی اور اسی کی برکت ممتی کہ ہندوستان کو ہے، مشکوک دیا سلائی وغیرہ اشیاء کے لئے بیرونی ممالک سے بے نیاز ہوتا جا رہا ہے۔ ... مگر کیا آئندہ بھی اسی پالیسی جس کا مقصد ملکی صنعت کا فروغ ہے عمل کیا جاسکے گا؟ اس کا جواب امید افزا نہیں تو ان بتائے ہیں کہ شاید یہ پالیسی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دی جائے گی۔

محصول درآمد کے علاوہ حکومت کبھی کبھی بعض صنعتوں کی پیداوار پر متدار کے لحاظ سے نقد روپیہ بھی دیا کرتی ہے، اس کا مقصد بھی ملکی صنعت کو صنعتی مدد سے ترقی دینا ہوتا ہے، اب فرض کیجئے کہ حکومت فیصلہ کرتی ہے کہ اونی مصنوعات کو ایسی مدد کی ضرورت ہے، لہذا ہندوستانی مفاد سے اس صنعت کو نقد روپیہ دیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اونی مصنوعات تیار کرنے کے کارخانے ہندوستانی اور برطانوی ہر قسم کے سرمایہ سے تیار کئے گئے ہیں۔ کیا آپلی اعتراض کر سکتی ہے کہ ہندوستان کا روپیہ کسی انگریزی گرانہ کو نہ دیا جائے، امتیازی سلوک والا آئین ایسے اعتراض کو جان تو فراموش کرے سکتا، کیونکہ ایسے قانون کا اثر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی (انگریزی) کارخانوں میں امتیاز پیدا کرنا ہوگا۔ اس طرح سے یہ قانون غیر ہندوستانی سرمایہ اور کمپنیوں کا تحفظ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا جاسکتا جو برطانوی باشندوں پر اس قسم کی پابندیاں عاید کر سکے جیسی آج کل جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر عائد کی جا رہی ہیں، برطانیہ کا ہر باشندہ تجارت اور کاروبار وغیرہ میں اُن تمام مراعات کا مستحق ہوگا جو کسی ہندوستانی کو حاصل ہوگی، اس کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کو یہ حقوق انکشتان میں حاصل ہوں گے۔

یہ قانون ہندوستان کی معاشی زندگی اور صنعتی ترقی پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے، گورنر جنرل کی اس ذمہ داری پر ہندوستان کی آئندہ خوشحالی منحصر ہے، مالی پالیسی پہلے ہی آپلی کی نگرانی اور غور و گہری سے محفوظ تھی، اب فیڈریشن کے بعد تمہاری معاشی بھی اس طرح طے کئے جائیں گے کہ ایک فزیر صنعتی ملک کے مفاد کو پیش نظر رکھا جائے، بلکہ دنیا کے معاشی حالات سے قطع نظر ایک عمدہ و فزیرانی اور سیاسی سلطنت کے قیام کو مقصد اول سمجھا جائے۔ یہ ایسے شہادت ہیں جو ہر قوم پرست کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں، تاہم یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان باقی دنیا کی طرح تاریخی قوتوں کے زیر اثر ہے۔ لیکن یہ قوم پرستوں کے شہادت کبھی عملی ضرورت اختیار نہ کریں۔

گورنر کی پانچویں ذمہ داری، ایسے علاقوں کی خوش انتظامی سے متعلق ہے جن کا انتظام باقی سربرے کے مانند کسی ترقی یافتہ نظام حکومت کا اہل نہیں۔ ۱۹۱۰ء کی اصلاحات کے ماتحت یہ علاقے گورنر اور اس کی کونسل (جماعت وزراء کے زیر نگرانی تھے ان کی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ نہ تو ان کے نمائندے مجلس قانون ساز کے ممبر ہو سکتے تھے اور نہ مجلس قانون ساز کو کسی قسم کی مداخلت کا اختیار تھا۔ دراصل یہ ایسے سعودی یا جنگلی علاقے ہیں جو تمدنی اور سیاسی اعتبار سے اس قدر نہیں کہ وہاں ترقی یافتہ سیاسی نظام، عوام یعنی وہاں کی آبادی کے لئے مفید ثابت ہو سکے اور کوشش یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ان کو باقی صوبے کی سیاسی سطح پر لایا جائے۔ نئے آئین کے مطابق ان علاقوں کی حکومت صرف گورنر کو تسلیم کی گئی، کسی وزیر کو یہ حق حاصل نہیں کہ دو گورنر کو ان معاملات پر کوئی رائے دے، مجلس قانون ساز کو سپنے کی طرح وہاں کے حالات پر کوئی اختیار نہیں۔ وہاں سے کوئی نمائندہ نہیں بلایا جائے گا، گورنر صوبے کے خزانہ سے روپیہ لے کر جس کی منظوری مجلس قانون ساز کے ہاتھ میں نہیں ایسے علاقوں کی حکومت لینے ختم و مرضی کے مطابق کرے گا۔ قوم پرستوں کا خیال ہے کہ مجلس قانون ساز کو کم از کم متحدہ چینی کا پورا اختیار ہونا چاہیے۔ دوسرے وہ چاہتے ہیں کہ ایسی حکومت کی مبادا کم از کم مدت تک محدود ہونی چاہیے تاکہ برطانوی ہندوستان اور ریاستی ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا ہندوستان نہ بن جائے۔

گورنر کی باقی دو ذمہ داریاں فیڈریشن سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں، لہذا ان پر تبصرہ کرنا جو دھڑکے خارج ہے۔ تاکہ گورنر ان دفعہ داریوں کو بوجہ احسن سرانجام دے سکے پارلیمنٹ نے اس کو آرڈیننس جاری کرنے کی قوت بھی دی ہے، گورنر کے آرڈیننس دو قسم کے ہوں گے (۱) وزیر کا آرڈیننس، (۲) گورنر کا آرڈیننس۔

وزیر کا آرڈیننس وزیر کے مشورے پر جاری کیا جائے گا مگر صرف اس وقت جب کہ مجلس قانون ساز کا سیشن (مجلس اجلاس) ختم ہو چکا ہو، ایسے آرڈیننس کے لئے ضروری ہے کہ گورنر کو یقین ہو جائے کہ حالات فوری احکام کے تحت ترقی ہیں، یا آرڈیننس مجلس قانون ساز کے اجلاس میں پیش کیا جائے گا اور اگر مجلس اس کی نام منظوری کا رد و لیوشن پاس کر دے تو آرڈیننس ختم ہو جائے گا دوسری صورت میں مجلس کے اجلاس کے چھ مہینہ بعد آرڈیننس از خود وغیرہ کی رد و لیوشن کے ختم ہو جائے گا، گورنر اور شاہنشاہ عظمیٰ آرڈیننس کو واپس لے سکتے ہیں۔

گورنر کا آرڈیننس اس وقت جاری ہوگا جب حالات ایسے ہوں جن میں اسے اپنے فہم و مرضی کے مطابق عمل کرنا ہے، یہ آرڈیننس چھ ماہ تک جاری رکھا جاسکتا ہے، لیکن اگر چھ ماہ سے زیادہ تو سب کچھ کرنے کی ضرورت ہو تو آرڈیننس وزیر ہند کے توکل سے پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔ ایسا آرڈیننس گورنر یا شاہنشاہ عظمیٰ واپس لے سکتے ہیں۔ یہاں یاد رکھنا ضروری ہے کہ آرڈیننس کس قوت کے زیر اثر ہیں، وزیر کا آرڈیننس مجلس قانون ساز کے ماتحت ہے، بصورت دیگر کونسل کے اجلاس کے

چھ مہنت کے بعد بخود ختم ہو جاتا ہے۔ مگر گورنر کا آرڈیننس کسی مجلس کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا اور اس صورت میں جبکہ اسے چھ ماہ سے زیادہ نافذ کرنے کی ضرورت ہو، اس وقت بھی پارلیمنٹ اسے رد نہیں کر سکتی، ایسا کرنا صرف ایک آئینی رسم کا پورا کرنا ہے۔ اس کا جاری کرنے اور واپس لینے والا صرف گورنر ہے۔ یہی نہیں اس کے علاوہ گورنر اگر چاہے تو قانون بھی بنا سکتا ہے، ایسا قانون گورنر کا ایکٹ کہلائے گا۔ ایسے حالات جن میں گورنر اپنے فہم یا مرضی کے مطابق عمل کر سکتا ہے اسے یہ حق دیتے ہیں کہ وہ فوراً گورنر کا ایکٹ پاس کرے یا مجلس قانون ساز میں ایک پیغام مجوزہ بل کے ساتھ بھیج دے۔ اگر مجلس قانون ساز پاس نہ کرے تو ایک ماہ کے بعد یہ بل از خود قانون بن جائے گا۔ ایسے موقع پر گورنر مجلس اور کونسل کی ترمیمیں قبول کرنے پر مجبور نہیں گو وہ ان پر طور کر سکتا ہے۔

یہ امر نہ تو نہیں، صوبے کی عوام سیاسی زندگی کو شکل کر سکتی ہیں، ذمہ داریوں کے علاوہ گورنر کو اتنی قوت دینا، وزیر کے معمولی اختیارات کی حقیقت ظاہر کر دیتا ہے، مالیات کو مرکزی حکومت یعنی فیڈریشن کے سپرد کر دینا اور فیڈریشن کی مالی پالیسی کو گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری قرار دینا، صوبوں کو منسلک کر دینا ہے، حکومت کے کاروبار سے وزراء، اتار و پیر نہیں بچا سکتے کہ وہ تعلیم، حفظان، صحت، بے روزگاری کے انسداد، وغیرہ فوجی کاموں پر صرف کریں۔ . . . ان تمام تحفظات کے باوجود یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ حکومت نظری فلسفہ نہیں بلکہ اس کا تعلق عملی سیاست سے ہے، بے شک نیا آئین قوم پرستوں کی آرزوؤں کی تکمیل نہیں۔ تاہم یہ اتنا بے جا نہیں کہ ہندوستان کے ان نغوں اور محکوکوں میں جو دور افتادہ علاقوں میں بستے ہیں سیاسی بیداری پیدا کر دے، نئے انتخابات اس بات کی کافی شہادت ہیں کہ لوگ آئینی شین سے دلچسپی لیتے ہیں بلکہ اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک سیاسی پارٹی کا احتجاج، ملک میں ہرجان پیدا کر سکتا ہے، مگر عوام کو ملکی مسائل سے آشنا کر کے سیاسی قوت نہیں دے دیتا زیادہ شکل اور اہم ہے۔ اور یہی ہمارا نچ نظر ہونا چاہئے۔ ذرائع حصول میں اختلاف ہو سکتا ہے، کوئی چاہتا ہے کہ غریب اقلیت کی ایک ہی کرٹ یہ سب کچھ حل کر دے اور کوئی سمجھتا ہے کہ بتدریج ارتقائی منازل طے کرنا ہمارے لئے زیادہ فوہا دانش ہے مگر کیا اس پر شور و شعل، بدلتی دنیائیں عوام کی قوت سے کوئی انکار کر سکتا ہے؟

محمد صدیق تاونوی

غلامی میں نہ کام آتی ہیں ششیر میں نہ تدبیریں

جو ہر ذوق یقین پیدا لوگ جاتی ہیں زنجیریں

علامہ اقبال مرحوم

موت کی تاریکیوں میں اور ہی تھی زندگی
 انتظارِ نعمتِ زن میں زندگی کا سار تھا
 ایک بیک اک طائرِ آتش نو اُپید لہوا
 جانبِ پستی اُڑا وہ خوش نوا گاتا ہوا
 زہر و ناہید کی محفل کو گراتا ہوا
 صبح کی قندیل روشن کی سوا دشام میں
 نعمتِ اقبال تھا یا صورِ اسرافیل تھا
 مرتبہ اقبال کا دُنیا نے پہچانا نہیں
 آہ محفل میں نہیں وہ ساتی محشر بدوش
 خلوتِ خاموشِ شب میں سو رہی تھی زندگی
 بر لبِ خاموشِ مہتی گوشِ براواز تھا
 آسمان کی سرزمین پر حشر سا برپا ہوا
 آتشیں نعموں سے اپنے آگ بساتا ہوا
 خونِ تازہ زندگی کی رگ میں دوڑاتا ہوا
 جان سی پھر ڈال دی خاکِ تریام میں
 دم بخود، ہیبتِ زدہ، ہسما ہوا جبیل تھا
 یہ مجاہد کون تھا خلقت نے یہ جانا نہیں
 جس کے ہنگاموں سو برپا تھا قیامت کا خروش

”جس کے آواز سے لذت گیرِ ابتک گوش ہے“

”وہ جس کی اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے“

منظر حسین شمیم

تربیت جنسی اور سماج

جب شباب کا آغاز ہو اور رگوں میں جوانی کا خون جوش مارتا ہو تو ہر جوان دل کی دھڑکنوں کے ساتھ زلیخاں، امیدیوں، دُش پانے لگتی ہیں۔ جذبات کی دنیا لہراتی ہے، زندگی کی سرمدان اور فضا نمود و تبسم سے بہرہ نظر آتی ہے، سنہری تخیلات کی مویں بول پر مشکلاہٹ بن کر تھرتھراتی ہیں، ہر سانس سانہ چمکتی اور ہر نفس صبا کے کیف لٹھاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان ہواؤں پر شیر ہوا اور لہروں پر سور ہوا ہے۔ عمر کا یہی وہ حصہ ہے جب بے اختیار گنگنا نے، بے وجہ مشکلاہٹ، اور کسی کی بارگاہِ ناز میں جوہاں کے نیاز پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اس جوشِ نوا اور سکروکینٹ کا اگر تجربہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ اس تمام ذوقِ عبودیت کی تہیں مستند ترین تقاضائے جنسی کی تڑپ ملتی ہے اور شوق و محبت اور حُسن و شباب کی تمام کامزاج برائیاں اسی عنوان سے شروع ہوتی ہیں۔ محبت کا کوئی بلند سے بلند اور پست سے پست تصور آپ کر لیجئے، اس کی بنیاد آپ اسی جنسی تڑپ پر پائیں گے جو ایک ویدیرتوں کے آئینوں میں مختلف جلووں کی نظر بنتی ہے، کیونکہ تقاضائے جنسی، یاد دہرے الفاظ میں ”محبت“ کا مقصدِ مادی ”حفظ نفس“ ہے، اور تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ نفس کی شکلیں کے پہلو مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ کسی نفس کا منتہائے نظرموت ”اتصالِ جنسی“ ہوتا ہے، کسی کا اتصالِ بدن، اور کسی کا اتصالِ روح و نظر۔ محورِ ان سب کا ایک ہی ہے اگرچہ گڑبگڑ میں مختلف ہیں۔ اس کا ایک آسان ثبوت یہ ہے کہ صورت کا حُسن، سبزہ کی لہک، پھولوں کی نمک، آئینہ کے ترنمِ اشق کی رنگینی، ہوا کی سنسناہٹ اور کلیوں کی چمک وغیرہ بچوں اور بزرگوں کے دلوں میں دلانہ کمیت اور گم شدگی کی وہ کیفیت نظر نہیں آتی جو نوجوانوں میں پائی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عہدِ طفولیت اور بچہ کھولت میں ”عذیر نفس“، ”تقاضائے جنسی“ بہت کمزور اور پُر مہرہ ہوتا ہے اور جوانی میں پورے در اور شباب پر۔

الغرض تقاضائے جنسی ایک فطری جذبہ ہے اور اس کی طاقت عظیم الشان طاقت ہے۔ اس کی اگر نفسیاتی اموولوں پر صحیح تربیت نہ کی جائے تو انتہائی وحشت و بربریت پر منتج ہوتا ہے جس سے نفس کی گندگی بہت گھناؤنے طریقہ پر اُبل پڑتی ہے، اور اسی دلدل سے تمام اخلاقی برائیاں کے پھڑاؤنے پھٹے ہیں۔ لیکن تربیتِ پابانے کے بعد یہی وہ طاقت ہے جو اخلاق کی پاکیزگی اور انسانیت کے مجدد و شرف کا معیار سی نو نہ پیش کرتی ہے اور بدل کا یہی گمراہ غلوں و ایشاک کی طرٹ رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ایک بھرکت

بڑا شعلہ ہے جو قابو میں آجانے کے بعد تعمیر تمدن میں بہت مفید رسالے کا کام دیتا ہے، اور قابو نہ ہونے پر ہر کوئی عمارت کو کھنڈر کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا اشارہ پاکیزہ مردہ و بے حق روجوں میں زندگی کی وہ غروب پیدا ہو جاتی ہے جو عناصر کو سمجھ کر کھنڈر کر سکتی اور مردہ و نابہر حکم چلا سکتی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ ہماری سماج کے نزدیک کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ دو انسانی ہستیوں کے درمیان میلان جنسی کی بنیادوں پر کوئی رابطہ پیدا ہو جائے، اس قدر حیرت کی بات ہے کہ فطرت کا ایک شدید ترین تقاضا جس کو کسی صورت سے ختم نہیں کیا جاسکتا اور اگر ایک طرف سے اُس پر دباؤ پڑے تو دوسری جانب زیادہ شدت کے ساتھ ابھر آتا ہے، سماج کے قانون میں سب سے بڑا جرم قرار پاتا ہے اور اس کے سنوارنے پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس کا تذکرہ بھی بہت معیوب اور انتہائی بے شرمی و بد اخلاقی سمجھا جاتا ہے۔

انسانے اور شرعی کی دنیا میں تو ریک کے ریک جذبات کا تذکرہ صرف ناگوار بلکہ محسن ہے لیکن علمی حیثیت سے ہم نے اس وقت تک، جیسا کہ چاہئے، اس طرف توجہ نہیں کی۔ دو ایک کتابیں اُردو میں اس موضوع پر ضرور لکھی گئیں یا ترجمہ کی گئیں، لیکن وہ یا تو اتنی ادق ہیں کہ شخص اُن سے استفادہ نہیں کر سکتا یا پھر بعض میں سرسری طور پر نمٹنا اس کا تذکرہ کر دیا گیا ہے اور افادی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری تربیت گاہوں میں اس کی اصلاح و تربیت پر کوئی مستقل درس نہیں دیا جاتا۔ درحالیکہ جذبہ جنسی اخلاق کی تعمیر کا وہ بنیادی پتھر ہے جس سے قطع نظر کر لینے کے بعد اخلاق کی عمارت حوالہ شکستہ پتھروں اور سیلاب کے مقابلہ کے لئے زیادہ استقلال و پایداری اپنے اندر نہیں رکھتی۔

اس ضمنوں کے ناظرین میں بعض بزرگ مجھ کو بے حیائی و بے شرمی کا قیوب ضرور قرار دے رہے ہوں گے، لیکن میں اپنا ادب عرض کروں گا کہ عرض حقائق کا پردہ پوش نہیں بلکہ حقیقت کے چہرے کا نقاب کشا ہوتا ہے، یہ بے حیائی کی عورت نہیں بلکہ حقیقت کی جستجو ہے، کیا ہم اپنے بچوں کو کھانے پینے کے طریقے نہیں سکھاتے، اُن کو گفت گو کے آداب کے واقف نہیں کرتے؟ کیا سونے جاگنے چلنے پھرنے کے متعلق گفتگو کرنا حرام ہے؟ یہ سب فطری احتیاج ہیں، اگر تمدن نے ان کے متعلق کچھ اور اہل طبیعت بنائے ہیں تو جنسی احتیاج کے متعلق بھی ہنلے ہوں گے جن سے واقفیت حاصل کرنا اور فوجواؤں کو اس کی تعلیم دینا ہمارا فرض ہے آپ خود غور کیجئے کہ ہماری بیخفت ہماری جوان نسلوں میں کن مناسبات کی وجہ سے؟ اور اس جذبہ کی تربیت زندگی کے کس شہ میں کام نہیں لیا جاسکتا؟ اب آئیے اُن اسباب کو تلاش کریں جو اس بے توجہی پر زندگی کے تمام شعبوں میں خرابیوں کی پرورش کر رہے ہیں!

اول اول جب آغا ریشہ بید میں دل میں طبیعت غلش پیدا ہوئی اور جذبات میں مہل مہتی ہے تو لڑکانہ لڑو دان، احساسات کو کچھ سمجھتا ہے اور نہ کوئی سمجھ والا ہی اس کو سمجھتا ہے۔ وہ خود بھی جہنمِ ملامت بننے کے لئے اپنے ان سنے عمو مات کو کسی کے

سامنے ظاہر نہیں کرتا۔ اس طرح اُس میں بے حتی جڑ پکڑ لیتی ہے اور اپنے اور دوسروں کی حیات کا بھڑکے کر کے اور اُن کو سمجھنے کی صلاحیت فنا ہوتی جاتی ہے۔

پھر جن کے سامنے یہ باتیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ اس کے ہم سن اور اسی کی طرح نابلد ہوتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ حسین معنویت کا نظارہ کیوں ان کے دل کی دھڑکن تیز کر دیتا ہے؛ وکھش لاگ کیوں ان کی طبیعت کو لٹھکتا ہے؛ اتفاقاً کسی جوان جسم کا لمس کیوں ان کے بدن میں بجلی کا سا ارتعاش پیدا کر دیتا ہے؛ اُن کے دل میں بیٹھا بیٹھا درد کیوں ہوتا ہے؛ کیا چیز ان کو گنگنا نے اور آپ ہی آپ منکرانے پر اُکاتی ہے؛ اور کبھی کبھی ان کو بلا وجہ تنہائی کس لئے مرعوب ہوتی ہے؛ علاوہ ازیں وہ نہیں جانتے کہ اُنہوں نے زندگی کی کس منزل میں قدم رکھا ہے اور اس راستہ پر ان کو کس طرح چلنا پڑا؛ لہذا ہوا کے موافق یا مخالف جھومنے کے مدھر چاہتے ہیں اُن کو موڑ دیتے ہیں اور اس طرح طبیعت میں جو بچکا چاٹا ہٹ اور گٹھاؤ یا بیہیاد آزادی اور غیر زبرداری جڑ پکڑ لیتی ہے وہ آخر غم تک نہیں جاتی۔

اس وقت اُن کے متعلین کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اُن کے پھرے کے اُتار چڑھاؤ اور اُن کے حرکات و سکنات سے اُن کے جذبات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر کے، نفسیاتِ شباب کے اُمٹولوں کے ماتحت اُن کو صحیح تربیت دیں اور تباہیں کہ وہ اب زندگی کی کس راہ پر گامزن ہیں اور یہاں اُن کو کس طرح قدم اُٹھانا چاہئے۔

چونکہ سماج کے نزدیک محبت جرم ہے لہذا جب دو انسانی ہستیوں میں اس قسم کی گچا گت پیدا ہوتی ہے تو وہ بہت اجتماعی کے زیر اثر یہ سمجھ کر کہ ہم کسی بہت ہی خطرناک اور ناپاک جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں اپنے خیالات و جذبات کو ناجائز حد تک چھپا کر مجرمانہ ذہنیت کے مسلک اور سرِ بلعِ انانہ جراثیم غیر شعوری طور پر اپنے اندر پالتے رہتے ہیں۔ افسوس کہ لاڈ کا خوف ہر وقت ان پر مسلط رہتا ہے، وہ چپ چاپ کمرِ ملاقات و گفتگو کے مواقع نکالتے ہیں۔ اور نتیجہ ان سب کا یہ ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی خست مستقل طور پر سازشی اور بُزدلانہ نوعیت اختیار کر لیتی ہے، صداقت و حقیقت کی طرف ان کے دل میں ہمیشہ کے لئے ڈر بیٹھ جاتا ہے، مکرو و روغ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے، ان کے ذہن میں پستی، کردار و عوام میں کمزوری، معزاز میں تلقین، لہجہ میں فسادگی، طبیعت میں بُزدلانہ شرم اور اخلاق میں ریاکاری آ جاتی ہے۔ وہ بے باک فطرت، اندر دل، بلند خی نظر معافی قلب اور اخلاقی جرات سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جنسی جذبات پر سماج بجز ملامت و سرزنش کے اور کسی حیثیت سے توجہ نہیں کرتی اس لئے محبت کی تباہ کاریاں ہی زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔ اگر کسی کا داغ غم مولیٰ صلاحیتوں کا حامل ہے تو وہ ان خود اپنے جذبہ جنسی کی تربیت کر کے اپنی انسانیت پر حاکم کر لیتا ہے، مدد عام طور پر اس کا تاریک پہلو ہی منظرِ عام پر آتا رہتا ہے جس کے باعث اس کا اندر زیادہ قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔

اگر یہ تحقیق کریں تو بہت تھوڑی جگہ کے ساتھ آپ کو ایسی متعدد مثالیں ملیں گی کہ ایک نئی فطرت کا لوہا جو بلند الطبع بھی ہے اور فکر و نظر اور کردار و عہدہ اہم کے اعتبار سے بھی بہت ہے جو اپنی زندگی کا معرفت نہیں جانتا اور اس کو ناقابل برداشت و جھجھکوتر کرتا ہے، محبت کا سہارا پا کر اٹھتا ہے، حیرت انگیز طریقہ پر اپنا پولاد بدل کر کشش حیات میں مردانہ جذبہ لیتا اور زندگی کا اعلیٰ نصب العین حاصل کر لیتے ہیں بغیر اعتدال کا نام نہ دینا کے سامنے پیش کرتا ہے، گویا اس کے ساز و زندگی کے بہترین نغمے سونے ہوئے تھے جو مناسب مضراب پر پڑتے ہی تانا تار سے نکلنے لگے، یا یہ کہ ایک اچھا خاصا ترقی کرنے والا اور جوان محبت میں ناکام ہو جانے اور سماج کئے بغیر غائب ہو جانے کے بعد یکایک ہندی و فرنگی کے مناسبات سے پستی و جہالت کے گہرے اند تانیک غافل و اندھے منہ جاکر رہا ہے، گویا وہ شبنم کا ایک قطرہ تھا جو تازہ آب آفتاب کی تاب نہ لا کر ہوا گیا۔ اور ان خوش قسمتوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہے جو جن اتفاق سے اپنی فطرت کے مطابق شریک زندگی حاصل کر کے شادی ہو جانے کے بعد محبت کی لذتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ علم و بصیرت کے اس دور میں محبت صرف روحانی لذتوں کے لئے ہی مخصوص نہیں رہی ہے، بلکہ وہ اس وقت علم انش کی ایک جد گادہ شاخ اور فلسفہ کا ایک اہم موضوع بحث ہے، جس کے ماتحت مذہب قومیں اپنے اپنے فرائض کے عینہ جنسی کی صحیح اصولوں پر تربیت کر کے ان کو قوم و وطن کے لئے زیادہ منیہ و کامدہ بنتی ہیں۔

اگرچہ میں نے اس مضمون میں صرف مردوں کے جذبات سے بحث کی ہے اور وہ بھی بہت ہی تشدد و نامکمل ہے لیکن تربیت جنسی صرف نازک کے لئے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ صنف قوی کے لئے بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ، کیونکہ مرد کے مقابلہ میں عورت زیادہ ذہین اور ذکی اکثر ہوتی ہے، وہ اضطراب درونی و غش باطنی کو مرد سے پہلے محسوس کرتی ہے۔

بہر حال ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سماجی حیثیت سے ان تمام امور کے پیش نظر تقاضائے جنسی و جذباتی کے متعلق اپنے روایتی فیصد فطرت و طوالت پر نظر ثانی کر کے اپنے قانون تربیت میں چند دفعات کا اضافہ کریں اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ تربیت جنسی کے لئے بھی اپنے معاشرے کی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ اصول وضع کریں۔ کیونکہ ذہنی و اخلاقی تربیت کا تاثر در و مدار اسی تربیت جنسی پر ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ ہمارے ملک کے ارباب فکر و بصیرت اس پر اپنی آزاد کا اظہار کرتے ہوئے کوئی صحیح راہ عمل متعین کریں گے +

نعمان شاغل بھوپالی

محبت دریا جسم عارضی ہے محبت زندگی کی زندگی ہے
محبت غایت الغایا بہت سی محبت حق نسا ہے حق ہی ہے

اللہ والہ فلسفی

کیوں گزشتہ ساعتیں پھر مجھ کو تڑپانے لگیں
بن گیا پھر کیوں پریشاں کُن یہ فالو بس خیال
زندگی کی حسرتیں پھر دل میں گھبرانے لگیں
وِشیتیں پھر کیوں مری تخیل پر چھانے لگیں
موت کی سی صورتیں کیوں کر نظر آنے لگیں
کیوں فنا کی بدلیاں دُنیا پہ منڈلانے لگیں
اُمٹ گیا دُنیا سے کوئی زندہ جاوید کیا

رو رہا ہے کون یہ لے لے کے نام اقبال کا

کچھ لحاظ اس کو نہیں مجھ سے پریشاں حال کا

کیوں نہ مضطرب ہوں نہیں لے دست بجا اضطراب
مجھ پر اپنا کر قیاس اُسے ہمنوا تو ہی بہتا
اور بڑھنا چاہئے اس وقت میرا اضطراب
آہ اطمینان حاصل ہے تجھے یا اضطراب
کیوں نہ ہوں پھر اس کی فرقت میں سراپا اضطراب
ہو گیا محتاج تدبیر آہ دل کا اضطراب
کیا خبر تھی یہ خبر اس وجہ ہوگی جاگسل

آلہ رُخلت اقبال میں کیونکر سُنوں؟

یہ خبر اُچپ ہے نفیب جاہِ پیغمبر سُنوں؟

ملک و ملت کا حقیقی رہنما جاتا رہا
قوم کی بیداریوں کو ناز تھا جس فرد پر
آدمیت کا دل درد آشنا جاتا رہا
آہ وہ فردیگانہ کیا ہوا؟ جاتا رہا
مُدعی جو رہنمائی کا نہ تھا، جاتا رہا
جاذبِ مخلص دلِ حُسن کا جاتا رہا
حائے بیدار اس نے کر دیا کل قوم کا

جوشش اس کی قیادت میں تھی اوروں میں کہاں

آب آتش ہے آتش آہ ہے آج
 چشمِ عبرت سے اے تماشائی
 دیکھ نیرنگِ چرخِ مینائی
 صبح ہوتے ہی ہو گئی نابود
 شب کے تاروں کی جلوہ آرائی
 سستی جو گلشن میں صبحِ فصل بہار
 وہ کہاں ہے خزاں میں عنائی
 اب کہاں ہے وہ بزمِ جمشیدی
 اب کہاں ہے وہ بادہِ ہمیائی
 ہو گئی خاکِ خاک میں بل کر
 شانِ اسکندری و دارائی

آج اقبال کا بھی ماتم ہے

یہ نیا حادثہ نیا غم ہے

نثارِ سحر کا رہتا اقبال
 آہِ معجز نگار تھا اقبال
 اس کے زیرِ نگین تھا ملکِ سخن
 خمِ وقار تھا اقبال
 چمنستانِ حُسنِ معنی میں
 اک گلِ نو بہار تھا اقبال
 دورِ حاضر میں ملکِ دولت کا
 بدبِ افتخار تھا اقبال
 سلطنت کیلئے بھی اک حد تک
 مایہِ اعتبار تھا اقبال

وادرلیف کہ آن سخن دان مُرد

فخرِ حسان در شکِ سبحان مُرد

کوئی بھی ایسا نکتہ داں نہ ہوا
 نغزِ گفتار و خوشِ بیاں نہ ہوا
 ایک عالم میں اس کی شہرت تھی
 اُس کا شمار کہاں کہاں نہ ہوا
 کچھ خدا دادِ مستِ قبولِ سخن
 کونسا شعرِ سردِ زِ جاں نہ ہوا

تھی جُدا سے اس کی طر زبیاں کوئی بھی اُس کا ہم زبان نہ ہوا
تھا وہ نازک خیال کچھ ایسا دل پر اُس کا سخن گراں نہ ہوا
خاص حصہ تھا اُس کا رنگینی
شاعری اس کی تھی کہ گل چینی

تھا وہ اک نقش بے مثال و نظیر مایہ نازِ خامہ تقدیر
صدر آرائے بزمِ حالی و دل آغ شہرت افزائے نامِ ذوق و نصیر
کلمہ افتخارِ ملت و ملک طرہ اعتبارِ تاج و سریر
فلسفہ اور پھر زبانِ غزل اور پھر یہ جزالتِ تحسیر
شہد سے بھی زیادہ شیریں تھی اُس کی ہر بات اُس کی تفسیر
شاعرِ دورِ انقلاب تھا وہ
نقطہ فروزِ انتخاب تھا وہ

جائے او در جوارِ رحمت باد مرقدش روضہ ز جنت باد
روزش مغفرت بود ز خدا بہرہ اش از نبی شفاعت باد
سایہ رحمت خدا ئے کریم بر سرش تا دمِ قیامت باد
حرزِ جانہا کلام او باد صیتِ فلش بہر ولایت باد
از پیاش فروغِ دین باد شمعِ ایساں چراغِ تربت باد

الہم این لوحہ و دعا گنتم

آنچہ گنتم بسد بکا گنتم

طہر اپڑی

برق

افرادِ دراما

ناصر علی احسان اور محسن کا باپ

مریم عمن کی بیوی

رحمت ملازم لڑکا

احسان ایک نوجوان طالب علم

امجد احسان کا دوست اور ہم جماعت

محسن احسان کا بڑا بھائی عمر ۳۵ سال

منظر۔ ایک آراستہ گرو۔ احسان ایک صوفے پر بڑے آرام سے لیٹا ہے۔ ٹانگیں اٹکے کھینچ لائیں ہیں۔ ہاتھ میں کوئی اردو رسالہ پڑھ رہا ہے۔ اشعار پڑھ رہا ہے کہی کے آنے کی آہٹ یا کرنا موش ہو جاتا ہے۔ دائیں دروازے سے اُس کا بڑا بھائی محسن داخل ہوتا ہے۔ احسان اپنی ٹانگیں میٹ کر صوفے پر سیدھا ہوتا بیٹھا ہے۔

محسن۔ احسان ایک کام لڑ کر دو؟

احسان۔ فرمائیے!

محسن۔ مریم کو اس کی چچی کے مکان پر پہنچاؤ۔

احسان (رسالہ تپائی پر کھٹکتے ہوئے) ابھی؟

محسن۔ ہاں

احسان۔ بھائی تیار ہیں؟

محسن۔ ہاں بالکل۔ (واپس جاتا ہے۔ احسان اٹھتا ہے اور تپائی

پر سے رسالہ اٹھا کر گھونٹا ہے۔ ایک دو لمحے پڑھتا رہتا ہے۔

پھر ترسے خیال کی مینیاں معاذ اللہ کہ ایک بار صلاؤں تولا

بار آنے لگتا ہوا سنگا میر کی طرف جاتا ہے۔ وہیں کے لنگھی اٹھا

کر اپنے گھنے بالوں کو درست کر رہا ہے کہ اتنے میں مریم اپنے بڑے

پر لڑیم کا رنگین برق ڈانے داخل ہوتی ہے۔)

مریم۔ چلو احسان۔ ابھی تیار نہیں ہوئے تم؟

احسان (کھوٹی پر سے کوٹ اُٹارتا ہے) میرے تیار ہونے

میں کیا دیر ہے۔ (کوٹ پہنتا ہے۔ مریم پہلے برق کا پتلا

پہنتی ہے پھر اوپر کا نقاب الاحمد۔ لڑیم کا نرم رنگیں برق

کبھی قدر تک تراشا جانے سے مریم کے فز بدن سے

چٹ جاتا ہے مزید برآں اُس کا یاد قد اُس کی ہڈیت کڑائی

کو عجیب سا بنادیتا ہے۔)

احسان۔ بھائی میں نے کئی بار کہا ہے میرے ساتھ چلتے

وقت برق نہ پنا کرو۔

مریم۔ (اپنے آپ پر ایک چمکتی نظر ڈالتے ہوئے) کیا ہے

اس برق میں؟

احسان۔ میں کیا بنائوں اس برق میں کیا ہے؟ ایک لڑیم

کا دوسرے رنگدار اور پھر پٹ بلا ہوا۔ اس کی تراش

تو دیکھو۔

مریم۔ ساری دنیا ایسے برق پہنتی ہے۔

احسان۔ اگر ساری دنیا پہنتی ہے تو میں بھی پہنتی ہے۔

لئے پھرتا ہو؟

محسن۔ کیا بڑا احسان۔ آدمیوں کی آنکھیں تو کھلوانی نہیں جا سکتیں۔ وہ کج فہم و شوہر و شہوت دیکھیں گے۔ جاؤ لے جاؤ۔ ہنکار نہیں کیا کرتے۔

احسان۔ نہیں بھائی جان میں اس بڑے کے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ دوسرا سفید بڑے ہیں میں۔

مریم۔ وہ تو دھو بی کو دے رکھا ہے۔

محسن۔ یہاں قریب ہی تو جانا ہے۔

احسان۔ چاہے قریب ہی جانا ہے، آخر بازار میں سے ہو کر جانا ہے۔ رست کو بھیج دیجئے۔ آپ چلے جائیے۔

محسن۔ احسان تمہیں ابھی تک بات کرنے کا سلیقہ نہیں آیا (مریم سے) جاؤ رست کو لے جاؤ۔

مریم۔ (راہت سے) دفعہ کی کو باہر لے کر گیا ہے۔

محسن۔ (لکڑے باہر نکلتے ہوئے غصہ سے) یہ ڈھیٹ تو

کرنا جانتا ہے۔ کام نہ کج کہیں کا بڑا دعوت دار (مریم

بھی اس کے پیچھے چلی جاتی ہے)

احسان۔ (بڑا ڈرتا ہے) بات کرنے کا سلیقہ۔۔۔!! اوتھو۔

ریشم کے رنگین بڑے کے ساتھ ساتھ بازار میں سے

سینکڑوں کی نگاہوں کا مرکز بن کر گزروں۔ ہر قدم کی جنبش

سے ریشمی بڑے پر لہریں اٹھیں لوگ ہری طرف گھومیں

کوئی منہ پھٹ کہنے لگے، ہیں انکھوں سے انھما کا

سے ہونے پر غیبت ہے حیا چلتا جاؤں کوئی دوست

ہے میں آنکھ بچاؤں۔ کوئی ہے مختلف پوچھے ہیں کہوں

تا مجھے میں پھرتی ہے، بازاروں میں یوں پیدل تو خاک

چھاتی نہیں پھرتی۔ اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو مہربانی

کر کے دوسرا بڑے ہیں آؤ۔ اس بڑے میں ساتھ لے جانے

کے لئے میں ہرگز تیار نہیں۔

مریم۔ تمہارے بھائی جان کو تو اس بڑے میں ساتھ لے جانے

ہوئے آج تک عار نہیں آئی۔ تم آئے ہو بڑے کہیں کے۔۔۔

احسان۔ بھائی جان کی کچھ پروتہ مدت سے پردے پر چپکے

ہیں، ان کا تو ذکر ہی چھوڑو۔ انہیں عار آنے یا نہ آنے

مجھے اس سے غرض نہیں۔ (مریم کمرے سے باہر جاتی ہے)

احسان صوفے پر بیٹھ کر سالہ پر حساب۔ ایک دو لمحے اسٹیج

پر خاموشی رہتی ہے۔ (مریم آگے دھڑکتی ہے)

محسن۔ احسان تمہارا کیا نہیں ان کے ساتھ؟

احسان۔ بھائی جان کم از کم اس بڑے کے ساتھ میں نہیں

جا سکتا۔ آپ خود ہی دیکھئے تو۔ مجھے بھائی کے ساتھ

جب لہنوں نے یہ نیلا بڑے پہن لکھا ہو بازار گئے تھے

شرم آتی ہے۔ میں ہرگز کا نہ لو اور ہر راہ گیر کی نگاہ کا مرکز

نہیں بن سکتا۔ کوئی دوست کوئی واقف کار مل جاتا ہے

اور کچھ نہیں تو ناگ لے دیجئے۔ کوئی سادہ سا بڑے ہو تو بت

بھی ہے۔ ایسا بڑے میں کہ بازار میں گزرا سراسر۔۔۔

محسن۔ کیا ہے اس بڑے میں۔ ساری دنیا پہنتی ہے۔

احسان۔ جی ہاں ساری دنیا تو پہنتی ہے بھائی نے جو کیا

کیا آپ نے کوئی ایسا شرب آدمی دیکھا ہے جو میری کو

اس قسم کا جانب نظر کشیم کا بڑے ہنکار سر عام پیدل

غلیل نے اُسے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ انہیں زنجیلی عورتوں میں سے ہے جو احسان کے ساتھ دلے مکان میں رہتی ہیں۔ میں نے بھی اُس کی چال ڈھال اور تیردنگ کے برقع سے ہی اندازہ لگایا۔ اتنے میں وہ عورت ہمارے قریب آگئی۔ جو نہی ہمارے پاس سے گزری غلیل کے دوست نے میدھڑک کہا۔ آجائیں برقع اور پیدل۔ کو تو موڑ پرے چلوں۔ ہم اُس کی اس دلیری پر بہت گھبرائے۔

احسان (اپنے چہرے پر سے گھبراہٹ کے آثار چھپاتے ہوئے) یہ سُن کر وہ عورت کچھ نہ بولی!

امجد۔ نہیں۔ اُس نے ایک نظر غلیل کے دوست کی طرف دیکھا اور بغیر بولے آگے چلی گئی۔ ہم نے اُس شخص سے کہا کہ اُسے یوں نہ کہنا چاہئے تھا۔ کیا پتہ کہی شرف گھرانے کی ہوتی، مگر وہ باست پر اڑا رہا کہ شریف گھرانے کی عورتیں ایسے جاذبِ نظر برقع پہن کر برابر عام عقوڑی پھیرا کرتی ہیں۔ ان عورتوں کا تو مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ شرفین مزاج لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے، غلیل نے بھی کبھی قدر میرا ساتھ دیا مگر وہ شخص چودگیا اور یکہ کر کہ اچھا آج مجھے آزمائش کر کے دکھانا ہوں، اُسے کہنے لگا کہ اسی وقت کے تعاقب میں چلا گیا۔

احسان۔ دکھوا جاتا ہے، چلا گیا ۱۹۹۹ پھر۔

امجد۔ پھر کیا۔ میں تو یہاں آ گیا ہوں مجھے کیا چاہیے۔

احسان (دکھ کر) بڑا ہی بدوہ تھا وہ۔

میری بھائی ہے۔ بھائی جان کی یکم صابہ!۔ مجھے بات کرنے کا سلیقہ نہیں، اُونہم۔۔۔ اِنچے سے آواز آتی ہے۔

— احسان —

احسان۔ (کھڑکی میں سے بچے دیکھ کر کون ہے؟ اچھا! آج آؤ پر (ایک کرسی کو راستہ میں سے ہٹاتا ہے) اچھا بایں بسٹانے سے منکوتا ہوا داخل ہوتا ہے۔)

امجد۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) خوب ہوا آج۔ غلیل کے دوست بھی عجیب ہیں؛

احسان۔ کیا ہوا؟

امجد۔ پہلے یہ بتاؤ وہ زنجیلی لڑکیاں ابھی تک ہیں یا نا، احسان۔ کونسی؟

امجد۔ وہی جو اُس رات سینما گئی ہوئی تھیں، ریشم کے نیلے اور سیاہ برقع یا ونڈیں۔ تم نے بتایا تھا نا کہ تمنا سے ڈنکا میں نہتی ہیں۔ بڑی رنگین مزاج ہیں۔

احسان۔ اُن اُن، شاید ابھی تک تو مکان نہیں بدلا، کہوں؟

امجد۔ میں اور غلیل تنہا سے ہاں آ رہے تھے۔ میل تنہا ہی گلی کے سرے پر غلیل کو کوئی دوست بل گیا بہت بے تحفہ معلوم ہوتا تھا۔ ہر چند کہا کہ تمنا سے ہاں جانا ہے مگر اُس نے ایک دہشتی اور غلیل کو کہنے لگا کہ اپنے ساتھ لے گیا۔ اس سلسلے میں ابھی تک رادہ رہی تھی کہ ایک دو ہرے بدل کی میانے سے قد کی عورت نیلے رنگ کا زنجیلی برقع پہنے گئی سے باہر آتی دکھائی دی۔

پنے جاتے ہیں۔

احسان۔ یہ باطل مجمع ہے کہ برقع کا پردہ بھی فیض سے محروم نہیں رہا اور یہی وجہ ہے کہ اس کا مجمع مفقود فوت ہو رہا ہے۔

امجد۔ وہ زمانہ اب ختم ہو چکا ہے جب برقع مجمع منسل میں برقع تھا۔ اب اگر کوئی عورت صاف سُتھرا برقع اور اور کوئی اچھا سا جوٹا پین کر بازار میں نیکے تو میسبل کیا سیکڑوں لوگ پہلے پاؤں سے سر تک پھر سر سے پاؤں تک جانتے ہیں اور اگر تنہا ہو تو خدا ہی حافظ۔

احسان۔ اور اگر برقع ہو رنگین یا ریشم کا تو لوگ بھڑالیں دیکھتے ہیں کہ کھا جائیں گے۔ ہمارے بڑے نہیں سمجھتے کہ اب زمانے کی روش اور ذہنیت ایک نظر کا منوریت اختیار کر چکی ہے۔۔۔۔۔

امجد۔ بالکل۔۔۔ وہی سمجھتے ہیں کہ موجود لوگ وہی لگ ہیں جو آج سے بیس برس پہلے تھے۔

(دائیں دروازے سے رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت۔ بڑے میاں جی آگئے۔

احسان۔ ابا جان !

رحمت۔ جی ہاں۔

احسان۔ انہیں تو آج شام کو آنا تھا۔ اچھا جاؤ۔ (رحمت جاتا ہے)

امجد۔ بھئی نہیں جی جلتا ہوں

احسان۔ وہ کیوں ؟

امجد۔ (دشکرا کر) یوں کہو بڑا ہی بدو تھا وہ برقع جس نے اس شخص کو یہ کئے کی جرأت دلائی ورنہ کسی کی مجال ہے کہ برقع پوش عورت کو کچھ کہہ سکے۔

احسان۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں یہ بھی ٹھیک ہے سارا قلمو برقع کا تھا مگر۔

امجد۔ تم گھبرا کیوں گئے ہو۔ تمہاری بلا سے۔ اپنی پرویزوں سے اتنی ہمدردی کا آخر مطلب کیا ؟ (خفیت سا کہتا ہے) خدا جانے لاہور میں ہر روز ایسے کتنے واقعات ہوتے ہیں۔ ہمیں کیا ؟

احسان۔ یہ تو ٹھیک ہے، مگر پردے کے متعلق تھرا کیا خیال ہے ؟

امجد۔ پردہ بجائے خود اچھی چیز ہے مگر یہ پردہ چھپ چھپ کر دیکھنا اور دیکھ دیکھ کر چھپنا جس سے ہم آگے دن دوچار ہوتے ہیں، فوراً ترک کر دینے کے قابل ہے۔

احسان۔ میرے خیال میں برقع بھانے والا ایک شوق ہے اور اب وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے جب لوگوں کی نگاہیں برقع کی قدر تھی اور وہ ایک برقع پوش عورت کی عظمت نگاہ اٹھانا میسر ہو سکتے تھے۔

امجد۔ اس میں کیا شک ہے۔ تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ ہماری قزاقی داروں میں چند عورتوں نے مختلف محفل کے چار پانچ برقع سلوارنگے ہیں اور وہ شادی بیاہ کے موقعوں پر انہیں اسی طرح بدل بدل کر پہنتی ہیں، جس طرح عام پہننے والے کپڑوں کے مختلف جوڑے

ناصر علی - (محسن کی طرف دیکھ کر) مریم کہاں ہے؟
محسن - اپنی چچی کے ہاں گئی ہے (رحمت سے) جاؤ بیلا
لاؤ۔ جلدی آنا۔ (رحمت جاتا ہے)

احسان - (والد سے) آپ کو تو آج شام نام تھا۔
ناصر علی - ہاں۔ رحمان اپنی کامیں آ رہا تھا۔ میں بھی اس
کے ساتھ ہی گیا۔

احسان - اُس کے کاروبار کا اب کیا حال ہے؟
ناصر علی - اچھا ہے۔ اب تو خوب کما رہا ہے۔ (زادیں
دروازہ سے مریم داخل ہوتی ہے۔ ناصر علی کو سلام
کرتی ہے)

محسن - تئیں تو ابھی رحمت لینے گیا تھا۔
مریم - مجھے ابھی نیند میں ملا ہے۔ میں نے میاں جی کو دیکھ
لیا تھا۔ ہم اوپر میٹیک میں تھے جب ان کی کار کو چوک
میں رکتا پڑا۔ میری نظر اتفاق سے ہی پڑ گئی۔

ناصر علی - ہاں بہت حیرت منی وہاں۔ تم اکیلی آئی ہو کیا؟
مریم - جی نہیں۔ رمضان بی بی کا گھبراہٹ ہے (احسان سے)
تم نہ گئے تو میں کیا بیچ نہ سکی؟

احسان - (اس نامگافی غیر متوقع حملہ سے گھبرا سا جاتا ہے،
اُس کے چہرہ پر غصہ کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور الفاظ
اُس کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلتے ہیں) اچھا بڑا
بیچ گئیں تو۔ پھر کسی کو ساتھ نہ جانے کی ضرورت ہی
کیا ہے۔ بس برقع اٹھایا اور چل دیں۔

ناصر علی - ہن بات کیلئے؟

امجد - تئیں والد صاحب سے ملنا ہو گا (اٹھتے ہوئے) پھر
میں گے۔ آج شام لارنس گارڈن آؤ گے؟
احسان - کچھ کہہ نہیں سکتا۔

(دوڑوں بائیں دروازہ سے نیچے اتر جاتے ہیں۔ اسٹیج
پر ایک لمحہ خاموشی۔ محسن اور ایک اُدھیر عمر کا شخص انہیں
دروازہ سے داخل ہوتے ہیں۔ پیچھے پیچھے رحمت آتا ہے)

ناصر علی - یہاں تو نہیں؟

محسن - یہیں تھا

رحمت - اُن کا کوئی دوست آیا تھا، اُن کے ساتھ چلے
گئے ہیں شاید۔

محسن - (ایک کرسی پر سے کتاب اٹھا کر) آپ بیٹھے
آ جاتا ہے ابھی۔

ناصر علی - کچھ پڑھتا پڑھتا بھی ہے یا دوستوں کے ساتھ
ہی پھرتا رہتا ہے؟

محسن - پڑھتا ہے۔ آرام طلب بہت ہے، گستاخ ہے جو
مُنہ میں آتا ہے کہہ دیتا ہے۔

ناصر علی - بہت لوگ ہو سٹلوں میں رہنے سے آرام طلب
ہو جاتے ہیں۔ (احسان بائیں دروازہ سے داخل ہوتا ہے)
اپنے باپ کو خود بادِ سلام کر کے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

بھئی کہاں تھے تم؟

احسان - اکیس دست کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا تھا۔

ناصر علی - ہم حامت ثنا کوئی؟

احسان - جی ہاں!

گستاخی کی شکایت ہوتی ہے۔ میں آرام طلب ہوں۔
میں گستاخ ہوں۔ اوندہ۔ اکیوں کماک میں نہیں
جاتا۔ برقع کا فساد۔ تم نہ گئے تو میں کیا پہنچ نہ سکی۔
رنگے لب کرداروں تلے دالیتا ہے، کچھ سوچتا ہے،
اوندہ — عورت — سگ باش بلاؤ خرد۔۔۔
(رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت۔ میاں جی بلاتے ہیں، چائے پی لیمبے۔
احسان۔ (دعوت میں) چلا جا میاں سے۔ چائے چلے کی
بکواس میں نہیں بیٹھا رنڈا ایک طرف کر کے آہستہ
سے چائے کا بچہ۔ نمیبٹ (رحمت چلا جاتا ہے۔)
اُن پور کو تو ال کو ڈانٹے۔ چائے پی لو۔ زہر پی لو۔
دباہر دُور سے ناصر علی کی آواز آتی ہے؟ احسان!
احسان (آہستہ سے) میں نہیں بیوں گا چائے۔۔۔
(ناصر علی کی پھر آواز آتی ہے) احسان!
احسان (آواز دیتا ہے) آیا جی۔
(پہرے پر غصہ ہے۔ جاتا ہے۔ دروازہ کا کواڑ
زور سے بند کرتا ہے)
(پدرہ گر جاتا ہے)

محسن۔ کچھ بھی نہیں۔ اپنی جھگڑتے ہیں۔ محسن احسان
سے کتنی تھی مجھے جچی کے مکان تک پہنچا آؤ۔ یہ نہ گیا۔
وہ اکیلی چلی گئی۔

ناصر علی۔ یہ بڑی بات ہے احسان۔ گھر کی عورتوں کو بازو
میں اکیلے نہیں جانا چاہئے۔ تم کیوں نہ گئے؟

احسان۔ (دیوچ و تاب کھاتا ہے۔ مانتے پر توری ہے)۔
میں کیا بتاؤں ابا جان، بھائی جان یا بھائی سے پوچھئے
میرے نہ جانے کی وجہ کیا تھی۔ وہ کیوں نہیں تباتے؟
ناصر علی۔ یہ بڑی بات ہے احسان۔ تمہاری آرام طلبی اور
گستاخی کی شکایت ہوتی ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا
چاہئے۔

(رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت۔ چائے تیار ہے جناب۔

محسن۔ اچھا چلو (سب اُٹھتے ہیں) احسان بیٹھا رہتا ہے
ناصر علی۔ (دروازہ کے قریب جا کر آؤ احسان
احسان۔ (اُٹھتے ہوئے) آپ چلے میں ابھی آیا بس
چلے جاتے ہیں۔ احسان رنڈا بٹورے کرسی پوچھا رہتا
ہے۔ اور آہستہ آہستہ کہتا ہے) میری آرام طلبی اور

آغا بابر بٹالوی

(بی۔ اے ڈاکٹر)

مختل ادب

اقبال کی تعلیم

(انضاب ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب ایم۔ اے ڈی فل (راکسن) مسدود شدہ فلسفہ علم یونیورسٹی علی گڑھ)

(ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے فرمایا کہ یہ کوئی مقالہ نہیں حراجِ عقیدہ ہے جو میں اقبال کی جناب میں اس موقع پر پیش کرتا ہوں) ستراسی برس ہوئے ہندوستان کی اسلامی فضا میں ایک واژگونی جس سے زمین اور آسمان بھر گئے۔ اس آواز کا منہج علی گڑھ تھا۔ سرسید نے اس زور شور کے ساتھ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا کہ درودیوار گونج اٹھے اور عالمِ اسلام میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔

مسلمانوں کے ماضی و حال کو دیکھ دیکھ کر سرسید کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے تھے اور ان کے استقبال پر نظر کے سرسید کے زبان اور قلم تندی اور تنبیہ، تہذیب اور تدبیر کا لاطم پیدا کر رہے تھے۔

پہلا شخص جس نے سرسید کا پیغام شعر کے سانچے میں ڈھالا وہ حالی تھا۔ حالی نے مسلمانوں کے ماضی و حال کا ایسا نقشہ کھینچا اور ایسے دردِ دل کے ساتھ اس داستان کو بیان کیا کہ شعر کی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ دوست دشمن سب نے گزرتی ڈال دی اور حالی اسلام کا سب سے بڑا قومی شاعر مان لیا گیا۔

لیکن سرسید کا پیغام ابھی اجمالی تھا۔ انہوں نے قوم کو اس قابل بنایا کہ اپنی حالت کو سمجھے اور حالات کو سمجھے اور پھر یہ بھی سمجھے کہ اس کا مستقبل کیا ہونا چاہیے۔ اس مستقبل کی تفصیل ابھی باقی تھی۔

وہ شخص جس نے اس اجمال کی تفصیل کی جس نے ماضی سے استقبال کی طرف نگاہ کو پھیرا وہ اقبال ہے۔ اقبال نے اس جوش و غروش اور اس ولولہ اور اُمت کے ساتھ زبانِ شعروادب میں اس مضمون کو ادا کیا کہ یہ اس کا حصہ ہو گیا۔ حالی ہمارے حال کا شاعر تھا اقبال ہمارے مستقبل کا شاعر ہے۔

ہندوؤں، بدھوں اور عیسائیوں کی تعلیم یعنی نفیِ خودی مسلمانوں میں پھیل گئی تھی۔ تصوف وائزوانے ان کے اچھے پیر فضل کر دیے تھے۔ نفیِ خودی کی بدولت وہ انفرادی خودی میں سکوا کر رہ گئے تھے۔ اقبال نے بتایا کہ سرِ مہیت نفیِ خودی میں

نہیں بلکہ خودی میں مضمر ہے۔ یہ کائنات خودی کا ظہر ہے۔ خودی پیدا کر۔ یہی خودی ہے جو تجھے ایک اعلیٰ فردی یعنی بے خودی میں لے جانے لگی اور تو انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں آجائے گا۔

یہ تمام مقامات اقبال نے خود طے کئے۔ وہ آغاز شعر میں نفی خودی اور وحدت وجود میں ہستلا تھا۔ پھر اُس پر خودی اور وحدت وجود کا بھید کھلتا ہے۔ اور آخر میں وہ بے خودی پر منتہی ہو جاتا ہے۔

اقبال کی عظمت کا یہ ثبوت ہے کہ وہ جس جس مقام سے گزرتا ہے ایک عالم کے عالم کا اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ جب وہ نفی خودی کا راگ گارہا تھا لوگ اُسے الپ رہے تھے، جب اُس نے خودی کا ڈنگا بجا یا ہر ساز سے یہی آواز آنے لگی۔ اب جب کہ اُس نے بے خودی یعنی اللہیت اور قوم پرستی کا آواز بلند کیا سب اُس میں آواز ملا رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کا قتل اُن کی سیاسیات بدرجہ غایت اقبال کے شہر مندہ احسان میں۔

مسلمان ایک گم کردہ راہ قافلہ کی طرح سیاسیات کے قیود و قیابان میں بھٹکتے پھر رہے تھے مگر اس فلسفہ حیات اور ولایت کے بمقرنے اُن کے لئے ایک مطلع پیدا کر دیا جس کے صائب ہونے کو لوگ نہایت سرعت کے ساتھ ملتے جا رہے ہیں۔ قوت آ رہا ہے اس کا جھنڈا غفریب بند ہو جائے گا۔

اقبال کتا ہے کہ مع من لوا سے شاعر فرد استم۔ لیکن یہ ایک مدائے بازگشت ہے۔ اے اقبال! تیری صدائے عالم اسلام کے دل و دماغ بھر گئے ہیں۔ وہ تیری ہی تعلیم کی طرف جلتے ہیں۔ تو شاعر فردا ہی نہیں، تو شاعر امروز بھی ہے۔ اور تیرا ارثا تبار ہے کہ شاید ہی کسی اور شاعر کا کبھی ہوا ہو۔ تو قومی شاعر ہی نہیں تو شاعرِ عہد ہے۔ یہ عہد تیرا عہد ہے۔ عہدِ اقبال ہے۔ کون شاعر تجھ سے پہلے یا تیرے زمانہ میں ہندوستان یا ایران و فراسان بلکہ لہریہ و فرنگستان میں ایسا ہوا ہے جس کا نتیجہ اس درجہ کیا گیا ہو، جس کی آواز میں اس طرح آواز ملائی گئی ہو۔ آج جو شخص بھی شعر کہتا ہے، وہ اقبال کے رنگ میں کہتا ہے، جو مضامین بھی وہ بیان کرتا ہے اقبال کے مضامین ہوتے ہیں۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بحر میں بھی اقبال ہی کی ہوتی ہیں اور شعر ننانے کا طریقہ بھی اقبال ہی کا طریقہ ترنم ہوتا ہے۔ ہاں یہ باوجود اس کے کہ ترنم کی کم فزائی شوکتِ مضمون کی تحمل نہیں!

زمانہ پرفرنگ چھانگیا تھا، اُس کا سیل بے پایاں ایسا چڑھا تھا کہ عالم اسلام بھی اُس میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔ اُسے اقبال اتو نے اپنی معنی خیز اور سوز انگیز آواز سے ایک سہ کنکری کھڑی کی اور اسے بناو یا کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن

قدم اٹھا، یہ مقام انتہائے راہ نہیں



فہرست مضامین

”ہمایوں“ بابت ماہ جولائی ۱۹۳۸ء
تصویر: پچپن



صفحہ	صاحب مضمون	مضمون	شمار
۴۹۶	بشیر احمد	ہجرت ہمایوں	۱
۴۹۴	حامد علی خاں	جہاں شا	۲
۴۹۸	"	نوا کے راز	۳
۴۹۹	حضرت ذوقی	چاکن کی رت (نظم)	۴
۵۰۱	سر محمد صدیقی تاؤفی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔	نیدریشن	۵
۵۱۰	حضرت ازہمائی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔	نوحی (نظم)	۶
۵۱۱	پیر زادہ احمد ندیم صاحب قاسمی۔ بی۔ اے۔	مسافر (افسانہ)	۷
۵۱۵	"	اسد کا صارا (نظم)	۸
۵۱۶	حضرت راصل ہریش یار پوری	گرابی و اقبال	۹
۵۱۸	سر پریم لال سنگھ رادھی	غائب (نظم)	۱۰
۵۱۹	سر ریا علی۔ اے۔ بیگمائی	جنگ کے بعد (افسانہ)	۱۱
۵۳۱	جناب محمد آؤب صاحب	لبکاری	۱۲
۵۳۲	پروفیسر سید محمد جیل صاحب واسطی۔ ایم۔ اے۔	غزل	۱۳
۵۳۳	جینیکیشن چندر صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔	گھانا	۱۴
۵۳۷	جناب سردار اختر سنگھ صاحب	رباعیات	۱۵
۵۳۸	حضرت شفیق منانی	غزل	۱۶
۵۳۹	کیم نڈت کرشن کونورت صاحب شرما	فخر حیات شکر کائنات شکر محمدی شکر علیہ السلام	۱۷
۵۴۰	جناب سرد جالی	نام	۱۸
۵۴۲	پروفیسر محمد علی سہائے فراق گوکھری۔ ایم۔ اے۔	غزل	۱۹
۵۴۳	سر حمید نظامی۔ بی۔ اے۔	بینک میں (افسانہ)	۲۰
۵۴۶	جناب غلام حسین صاحب لدھیانوی	خیالات پریشان	۲۱
۵۴۷	جناب عبد المجید صاحب حیرت۔ بی۔ اے۔ علیگ	آئینہ حیرت (غزل)	۲۲
۵۴۸	سر سعادت حسن منٹو	خوشی کا اقدام (افسانہ)	۲۳
۵۵۲	جناب غلام حسین صاحب لدھیانوی	مزبور	۲۴
۵۵۳	جناب اشفاق حسین صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ ایل۔ ایل۔ بی۔	تقدیر بخندہ (افسانہ)	۲۵
۵۶۷	"	مصلح ادب	۲۶

بزمِ ہمایوں

اک مدت سے یہ کوشش ہے کہ کسی طرح ادبیات کو سیاسی سے الگ کھا جائے لیکن کامیابی کی صورت نظر نہیں آتی۔
بقول مسٹر جناح اب ہندوستان کی ہر اینٹ اور روڑا اور پتھر سیاسی ہے۔ اب ہر شے پر اور کم از کم شہروں میں ہر شخص پر کسی نہ کسی طرح کا سیاسی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ جناح صاحب کا نام سن کر بعض حضرات ناک بھول چڑھائیں گے جیسے پرنٹ جواہر لال اور گاندھی جی کے ذکر پر بعض اور اصحاب چلراخ پا جوتے ہیں۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ یہ ادب بعض اور حضرات ہمارے ملک و قوم کے بہترین بنیادیں جنہوں نے اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ دوسروں کی خدمت کیلئے وقف کر دیا ہے۔

وقت یہ ہے کہ ہم ہر شخص کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں۔ اس میں بھی سرج نہیں لیکن جب ہم اُسے ہم خیال بنالینے میں کامیاب نہیں ہوتے تو ہم اپنے عمل یا قول یا کم از کم خیال میں جھنجھلا نے لگتے ہیں کہ یہ ناجار کیوں ہمارا ہم مشرب بن کر دنیا کو ایک جنت گاہ بنالینے میں ہمارا مددگار نہیں ہو جاتا؟

زندگی میں ہر آدمی درکار ہے اور یہ دنیا خواہ اگلی دنیا موجود ہو نہ ہو ضرور ایک امتحان گاہ ہے امتحان گاہ کو متحقی غائب بعض لوگوں کے نزدیک مفقود ہی کیوں نہ ہو! اخلاق مذہب علم و ادب سیاست سب میں اختلافات ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہوں۔۔۔
گھمائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن اسے ذوق اس جہاں کو ہے زیرِ اختلاف سے

عام سیاست کو چھوڑ کر اردو ہندی کی سیاست پر ایک نظر ڈالو۔ ہندی کا جھنڈا لوں تو ساٹھ ستر سال سے بلند کیا جا رہا ہے یعنی نئی ہندی کا سا لوی جی نے اس تھا شے میں بٹے بڑے کرتب دکھائے، کچھ ادھر سے بڑا کچھ ادھر سے بڑا، لیکن تعجب بلکہ افسوس اس پر کیا ہے کہ ادھر کانگریس ہندوستانی کو ملکی زبان قرار دیتی ہے اور اردو اور ناگری دونوں عروف کو تسلیم کرتی ہے اور ادھر کی کانگریس کے بعض نہایت ممتاز رہنما کشمیر سے لاس کمار کی تک ہندی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ خود گاندھی جی پر نفس نہیں جو کچھ کوشش اور کار میں فراتے ہے ہیں اُن سے ہندوستان کی دنیا کا کچھ بچہ واقف ہے۔ گاندھی جی ملک کے لئے لیڈر ہیں اور اس کے ساتھ نئی ہندی کا وہ فرقہ وارانہ کام کرتے ہیں کہ عقل حیران ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

آج ہی ایک قوم پرست ہے اس کے تعلق بات چیت ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے تازہ ترس بیان کا ذکر ہوا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ کانگریس نے اس مسئلے میں اپنی غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا عملی ثبوت دیا ہے۔ بہار میں کمیٹی مقرر کی ہے

جو ہندوستانی کا گفت تیار کرے گی، اس میں مولانا عبدالحق صاحب سے اردو لیڈر شامل ہیں۔ سدراس گورنٹ کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ہندوستانی لیڈر تیار کر چکے ہیں جو بہترین قومی زبان کا قابل دیدن نمونہ ہے۔ اس پر بھی نالائق لیڈر ضرور چارہ ہے میں یہ سب کچھ درست ہے، لیکن جو بات ان نالائقوں کی سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ اردو کی اتنی خاطر ہو رہی ہے پھر بھی "قدم ہندی" کا بڑا متا ہے لگتا جاتا ہے کہ ہندی کو ہندوؤں سے واسطہ نہیں وہ تو اپنی ایک زبان ہے کہ اپنا کام کر رہی ہے اپنا قدم بڑھا رہی ہے سب کچھ درست لیکن جسٹ آخراں قلوبازمی کی کیا وجہ ہے کہ بیس سال ہوئے، یوپی میں جہاں اسی فیصدی ہندو بھائی اردو اور صرف بیس فیصدی ہندی پڑھتے تھے وہاں اب معاملہ بالکل برعکس ہے اور ہندی ہندی ہو رہی ہے۔ آخراں قلب بیت کا کیا سبب ہے، پچھلے بیس بلکہ دس سالوں میں بلکہ پچھلے ہی سال میں کونسا انقلاب آگیا کہ اردو لٹریچر میں کیڑے پڑ گئے۔ اس کا رسم الخط یک لخت نامستول اور بھڑک رہا ہو گیا۔ وہ ہندوستان میں ایک ہزار سال رہ کر بھی اجنبی اور بیچہ قرار دیا گیا؛

ہیں اس سے انکار نہیں کہ ملک کے ایک محدود حصے میں کچھ حصے سے ہندی کا چرچا رہا۔ کئی ہندو عورتیں ہندی سیکھتی ہیں سب مسکرت زبان پڑھتی ہندی جانتے تھے لیکن وہ ہندی اتھوا ہندوستانی جن کا پرچاراب بڑے زور شور سے ہونے لگا ہے اس سے میٹر ہندوستانیوں کے کان بلکہ آنکھیں اور دماغ کھٹکنا نہ تھے۔ یہ لکنتو پر تو جو خشرات الارض بن کر ہم جگہ جگہ چلتے ہیں اور لیکن مگر چھوڑ بچا ہے پر تک کی جان کے پیچھے پڑے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی جی سے قوم پرستوں کو کیوں چند ہی دنوں میں ان سے اس قدر لگاؤ ہو گیا ہے؟

زبان کا مسئلہ پرانا کٹکٹہ ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کی آخری اور سب سے زبردست نشانی اردو زبان ہے، اردو صرف میں کمی جاتی والی زبان! جو اسے برباد کرتا ہے وہ ہندو مسلم فاضلت کو برباد کرتا ہے، جو اس سے منہ پھیرتا ہے وہ قومیت کے معجز تصور سے منہ پھیرتا ہے اگر چند سال اور یہی کیفیت رہی تو ہندوستان باطل کا بن جن بنائے گا جہاں ایک بھائی دوسرے کی بات نہ سمجھے گا اور جس پر زمانے کا طوفان ایک آفت بن کر ٹوٹے گا۔ ہم اپنے اردو پسند ہندو بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اردو سے منہ پھیرنے والے بھائیوں کو راہ پر لائیں۔ اور ہم یہ ہم اعتدال پسند مسلمانوں کا کام ہے کہ اپنے انتہا پسند بھائیوں کو ترغیب دیں کہ وہ اردو کو ہندوستانی جذبات و خیالات کا صحیح ترجمان بنائیں!

بشیر احمد

معذرت :- میں دلی فاضل ہے۔ کہ گذشتہ مہینے حضرت راسل کے مضمون میں مختصر قرطیس بنو یوں کے شعر کے نیچے ان کے والد ماجد: مرزا عاشق حسین صاحب، بزم کشمیری، مظاہر کے نام کے ساتھ مرحوم کا مخطوب چھپ گیا۔ حیدرآباد سے مرزا صاحب مدد فرما کر ان کی تصویر موصول ہونے پر میں اس خطی کا احساس ہوا۔ اس سوچ کے لئے حضرت دہل اور ہم مرزا صاحب اور دیگر اصحاب سے معافی چاہتے ہیں +

"ہمالیوں"

جہاں نما

ہندوستان اور انگلستان

انگلستان کے اخبار "پانچٹر گارڈین" نے ڈاکٹر ٹیگور سے ہندوستان کے مجوزہ وفاقی نظام حکومت کے متعلق اظہار خیال کرنے کی درخواست کی تھی۔ ڈاکٹر ٹیگور نے جواب میں اس اخبار کے ایڈیٹر کو لکھا ہے کہ اہل انگلستان مجوزہ وفاقی کے متعلق ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں کہ مجوزہ وفاقی قریب قریب حکومت خود اختیاری کا ہم پلہ ہے۔ اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لئے ڈاکٹر ٹیگور نے اہل انگلستان کو یوں مخاطب کیا ہے :-

"اُس ملک کو حکومت خود اختیاری کیونکر حاصل ہو سکتی ہے جس کی بے شمار آبادی مکمل غیر متعلم ہے، جسے اپنی آمدنی کے پچھلے حصے پر کسی قسم کا اختیار نہیں ہے اور جسے اپنے معاملات خارج میں قطعاً کسی قسم کا کوئی حاصل نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اہل انگلستان کو اپنے گھر میں کوئی اس قسم کی حکومت دی جائے جسے ہندوستان کی حکومت خود اختیاری سے دور کی نسبت بھی ہو تو وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگیں۔ انگلستان کی بنیاد پر ریادہ دلی نے ہمیں آزادی نہیں دی بلکہ آزادی کی منہسی اڑائی ہے ؟"

اہل انگلستان شلید یہ جواب دیں کہ وہ ہندوستان پر محض اس ملک کی ہوا خواہی کے لئے حکومت کر رہے ہیں اور اس ملک میں قیام اس دامن کے مقدس فرض نے اُن کے کندھوں پر ایک باطل عظیم ڈال رکھا ہے۔ آئیے اس دعوے پر بھی روشنی ڈالیں :-

"اگر کوئی بد لحاظ ہندوستانی آپ کو ہندوستان پر آپ کے طویل دور حکومت کا نقشہ دکھائے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کی حکومت ہندوستان کے لئے افلاس، جہالت اور بے مانی و روحانی تباہی کا ایک نامتناہی سلسلہ لے کر آئی ہے۔ آپ اس نقشے کو دیکھ کر بہت بگڑیں گے اور شاید ہندوستان کو مجرم گردائیں گے لیکن خداوند انصاف سے دیکھئے کہ آپ کی حکومت ہماری تعلیم، حفظان صحت اور اقتصادی اصلاح پر کتنا روپہ صرف کرتی ہے اور اس کے بعد دیکھئے کہ ماہان کی حکومت ان محکموں پر کیا خرچ کرتی ہے۔ یہ متاثر آبادی کے تناسب کو مد نظر رکھنے سے اور بھی زیادہ دلچسپ ثابت ہو گا کہ اہل انگلستان کو مصافحت و تبادلیا چاہتا ہوں کہ جب تک وہ ہمیں اپنے بچے میں گرفتار رکھیں گے انہیں ہمارا اعتماد یا دوستی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ اپنے گھریں اہل انگلستان بعض غیر معمولی خوبیوں کے



اس پر بچہ عہد شباب کے گھر کا لڑکا ہے
 کائنات کا لڑکا ہے

مالک ہیں ہم ان کے عدل و انصاف کے احساس کی بھی قدر کرتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ لوگ اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہی اگر یہ سچا اپنے گھر میں ان غویلوں کا مالک ہے مگر سب باہر جا کر اس طرح اپنے ملک کی بہترین روایات کی توہین کرنے لگتا ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ حکومت کا نقشہ ہمیشہ بدست بنا دیتا ہے اور اس نے آپ کو بھی بدست کر دیا ہے۔

لیکن انگلستان کے بعض ذی حس لوگوں کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ ہندوستان میں انگلستان کے شہنشاہانہ اقتدار کی انہیں بہت گراں قیمت دینی پڑی ہے +

ایک حد سے زیادہ وسیع سلطنت کے بوجھ نے آپ کو اٹنا کمزور اور بزدل بنا دیا ہے کہ آپ ان خیر خواہوں کی خود سرانہ کارروائیوں کی روک تھام کے قابل نہیں رہے جو بین الاقوامی سیاسی اخلاق کی حدود کو توڑ رہی ہیں اور یہی نہیں بلکہ آپ کے عجب وقار کی بنیاد کو بھی دھاوا رہی ہیں۔ آپ میں ایسے صاحب تدبیر اور بہادر لوگ ابھی بہت کم ہیں جو ایک طاقت اور خبر سے خائف نہ ہو سکیں کہ وہ حکومت کے عجب وقار کو بے حقیقت سمجھ کر ٹھکرا دیں۔ یہ فیصلہ گروہ ابھی اس قابل نہیں کہ حکومت کی اس اندھی طاقت کا مقابلہ کر سکے جو بدستی کے عالم میں اپنی تباہی کا راستہ خود تیار کر رہی ہے اگر آپ میری رائے کو چھتے ہیں تو میں صاف کہتا ہوں کہ اب اس تباہی کی روک تھام قریب قریب ناممکن ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں وہ ایک نئی کام میں یورپ کی تمام مختلف قومیں یک دل و یک جان ہو کر لگی ہیں باہمی تباہی کا راستہ صاف کرنے کا کام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرا یہ ایمان بھی ہے کہ اگر یہ تباہی آگئی اور کسی قسم کی روک تھام اس کے اٹسے نہ کی تو یہی یہ کائنات کی حدود کو نہ توڑے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی تہذیبیں بہت سی خوبیاں بھی ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتیں۔ مگر بعض اوقات تقدیر کا حملہ لڑھا بھی ہوتا ہے اور اگر انسان وقت پزیر نہ جائے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

لیکن اس تاریکی میں روشنی کی ایک کرن بھی ہے۔ یعنی ہندوستان اور انگلستان کی بعض بہترین خصوصیات تباہی کیلئے عناصر کے خلاف صف آرا ہیں۔

یہ درست نہیں کہ ہندوستان انگلستان کی دشمنی پر ادھار کھلے بیٹھا ہے۔ بیدار ہندوستان اور بیدار انگلستان دونوں ان اندھی اور غیر انسانی قوتوں کے خلاف ہیں جو دونوں سے غداری کر رہی ہیں۔ ہماری سلامتی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ جہاں کہیں ہیں ایسی انسانیت آشنا قوتیں ہیں جو فرود کو فرود کی لوٹ مار سے اور قوم کو قوم کی لوٹ مار سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہم ان سے متیق و متحد ہو جائیں +

مرتے ہیں۔ وہ عموماً حادثات کا شکار ہوتے ہیں۔ کسی بیماری کا حملہ ان کی موت کا موجب نہیں بنتا۔ اس زمانے میں شیر خوار اور صغیر سنی کی ابتدائی آفات کا دور گزر چکا ہے اور نوخیزی، جوانی اور بڑھاپے کے تدریجی ترقی کرتے ہوئے عوارض کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہونے پاتا۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے۔ گیارہ سال کی عمر میں موت عموماً حادثات سے واقع ہوتی ہے لیکن اس عمر میں انسانی زندگی کی قوت مدافعت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ حادثات سے بھی نسبتاً کم ہی موتیں واقع ہوتی ہیں۔

ہندوستانی سینما اور پریزیڈنٹ سبھاش چندر بوس

ہندوستان میں سینما نے جس قدر سرعت سے ترقی کی ہے۔ کسی اور تجارت نے نہیں کی۔ اہل ملک اب اسے اپنا سب سے بڑا ذریعہ تفریح سمجھنے لگے ہیں اور جاہل سے جاہل اور غریب سے غریب ہندوستانی بھی اس پر روپیہ صرف کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ عوام پر سینما کے اثر کو دیکھ کر حکومت بھی اس فن کی خاص نگرانی کرتی ہے۔ اور اکثر درجائے حکومت بھی سینما ہاؤسوں کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ اب تک سینما والوں کے پیش نظر صرف اہل ہند کی تفریح اور تعلیمی اخلاقی ترقی ہی تھی ہے۔ لیکن اب کانگریس کے صدر مٹھرا سبھاش چندر بوس نے یہ نا خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کے مخالف یورپی اور امریکی مصنفین نے اس ملک کے خلاف اپنے ہاں جن غلط خیالات کی اشاعت کر رکھی ہے ان کا توڑ بھی سینما کے ذریعے سے کیا جائے اور ایسی فلمیں بنائی جائیں جو ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور دیگر اوقات کی صحیح نمائندگی کریں۔ بہرینڈنٹ بوس کا خیال ہے کہ ہماری تعلیمی اور ثقافتی فلمیں اہل مغرب کے دلوں سے وہ غلط خیالات نکال دیں گی جو مخالفانہ پروپیگنڈا کی وجہ سے پیدا ہو چکے ہیں۔

یہ مقصد بلاشبہ بلند ہے اور طریق کار کی کامیابی میں بھی کوئی شبہ نہیں کیونکہ غور مغربی فلموں نے اہل ہند کی ذہنیت پر ایک ناقابل انکار اثر ڈالا ہے۔ لیکن یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ ہندوستان کی فلمیں اپنی موجودہ تاریخی یا تہذیبی صورت میں دوسرے ملکوں پر کوئی مفید اثر ڈالنے میں کامیاب ہو سکیں گی۔ ہماری فلمیں ابھی بہت ناکارہ ہیں۔

اس کے علاوہ یہ امر تو درست ہے کہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت بہت قدیم ہے۔ اور ہندوستان نے دنیا کو بہت کچھ سکھایا ہے۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ صدیوں کی غلامی نے اس تہذیب و تمدن کا کوئی نشان ہمیں باقی چھوڑا ہے جس کی گذشتہ تاریخ بڑھیں ناز ہے۔

حامد علی خاں

تصحیح:۔ گذشتہ مینجنگ ٹیم کی فلم کا یہ مصرعہ نہرو دھرم شید کی اصل گوگرماتا ہوا۔ غلط چھپ گیا ہے۔ اس کی تصحیح کر لی جائے۔

نواہائے راز

پھر ہوں میں وہی اور وہی غم خانہ ہی میرا
 کچھ اپنی تباہی کا مجھی کو نہیں ماتم
 یہ کیوں ترے یوانے پر عالم کی نظر ہے
 ہے شائبہ عقل یہاں دردِ تہجام
 اے فقر نہ دب حوصلہ شایانہ ہے میرا
 اک جذبہ وہ اے ہمتِ روانہ ہے میرا
 ہر حرف ہر اندازِ فقیہانہ ہے میرا
 خود عرش سے اک رشتہ حریفانہ ہے میرا
 پھر ہے وہی شب اور وہی فسانہ ہے میرا
 آفاق کا ہر گوشہ عزا خانہ ہے میرا
 جس شخص کو دیکھو وہی دیوانہ ہے میرا
 لبریزِ مئے عشق سے پیمانہ ہے میرا
 اے فقر نہ دب حوصلہ شایانہ ہے میرا
 اک جذبہ وہ اے ہمتِ روانہ ہے میرا
 ہر حرف ہر اندازِ فقیہانہ ہے میرا
 خود عرش سے اک رشتہ حریفانہ ہے میرا

ہے دل میں وہی آگ وہی سوز وہی نور

روشن ابھی جلست اٹھا دیوانہ ہے میرا
 حامد علی خاں

بھانگن رت

عشق کا موسم بہ طرزِ اماند آگیا
کوئل کا اور سپیہوں کا زمانہ آگیا

دل میں پھر نشتر چھوٹی ہے سپیہوں کی پکار
پھر ہاڑوں کو چلیں تازیں قطار اند قطار
پھر ہوائے صبح میں جاں بخش نرمی آچلی
پھر خمار انگیزِ خوابِ افروز گرمی آچلی
پھر ہوائیں چل رہی ہیں دنگے چھوٹی ہوائی
مستیوں میں تیرتی پھرتی ہے موجِ سرخوشی
پھر یہ دنیا بن گئی ہے اک طلسمی سرنیس
ہیں مناظرِ خواب کے مانند شیریں درحین
پھر لونی شام کی نیلی فضا میں دُک
اڑ رہی ہے آم کے پھولوں کی عنبی ہلک

دشتِ صحرا جاگ اٹھے ہیں آج گل میں جالی ہے
شعر اور رومان کی دنیا میں پھر ہرجاں ہے

(۲)

پھر بھرا ہے دہر نے افسانوی دنیا کا روپ
گرمیوں کے خوابے معمور ہجرانوں کی دھوپ

منکراتی ہیں ہساریں وادی کوکساریں
اودی اودی نرم کلیاں آگئیں کچنار ہیں
شاخِ گل پر رقص کرتی ہیں سنہری تتلیاں
مست بھونٹے گونجتے ہیں نیبوٹوں کے نمایاں
روح میں سوزِ محبت کا دیرِ چمپ پھر ہے باز
پھر ہواؤں میں ہے اک موہم خوشبو کا گداز
زل کی دھڑکن پھر سرودِ غم سے ہم آہنگ ہے
پھر ہوا میں مستیاں ہیں پھر فضا میں لہنگ ہے
یہ جنوں افروز راتیں! یہ قیامت خیز دن!
یہ فسانہ ساز راتیں! یہ فنوں انگیز دن!

ہر قدم پر سوز سا روح کا سامان ہے
عشق ہو جانے کا ہر سرگرم رپکان ہے!

ذوقی

امید کا دھارا

موجوں میں سکوں اتہ میں نہاں آگ کے طوفان
 امید کے دھارے پہ بہہ جاتے ہیں انسان
 فردوسِ نظر ہوتی ہے پانی کی روانی
 بھرے پہ تھرکتے ہوئے مانجھی کی جوانی
 لہروں سے نہکلنے ہوئے معصوم ترانے
 بنتے ہیں مسافر کی تسلی کے بہانے
 قطروں میں چمکتے ہوئے خورشید کی تصویر
 ساحل پہ بکھرتی ہوئی موجوں کا دم و زیر
 پیے تو انہیں دیکھ کے ہوتا ہے سکوں سا
 بن جاتا ہے لیکن یہ سکوں ایک جنوں سا

”منزل نہیں ملتی تو لگا مجھ کو کنارے
 مانجھی مجھے ڈستے ہیں یہ موہوم نظارے
 یہ راہ تو کالے نہیں کشتی نہیں کشتی
 اس درد سے مانجھی تری چھاتی نہیں بھٹی“

لگتا ہے کنارے جو امیدوں کا سفینہ
 پھر حسرت دیدار سے جل اٹھتا ہے سینہ
 مانجھی نے وہ بھر جھوم کے چٹو کو سنبھالا
 وہ دُور چمکتا ہے امیدوں کا شوالا

احمد ندیم قاسمی

گرامی و اقبال

(۱)

بچشم ما در احمد در پیہ احد است
 نہ جبرئیل نہ حتائیم و نہ جوہر فرد
 زبان ماعجمی و نگاہ ماعربی سرست
 مدح خواجہ بخوانم کمال بلے دینی سرست
 سحر سید گو شمع نڈاز حضرت قدس
 کہ صدر بزم نبوت یتیم مطلبی سرست
 دماغ حضرت اقبال نکتہ آورد
 چہ نکتہ ایست کہ دروس ہزار بولجی سرست
 متاع قافلہ ماجا زیاں بُردند
 دلے زبان بخشائی کہ یار ماعربی سرست

لسان الحسن گرامی ج

(۲)

سنخے راندہ کہ جبز قرشی
 سنگ حرب تو شیشہ معنی
 بسر سندرہ ہی نہ نشست
 در ادب گاہ امتیاز شکست
 درس گیر از گل می ہمہ درد
 رمز ترک و خلافت عربی
 کہ بُرد از خود و باد پیوست
 گفت آن میگسار بزم است

”ماہ را بر فلک دو نیم کند
 فقر را ترک کافی ہم هست“

ترجمان حقیقت اقبال ج

عقل و عشق

(۱)

عشق را دار و عقل را منبر
 عقل در رنگ و عشق خود پیونگ
 مسند عقل بر لب ساحل
 عشق را تنگدہ کام نہنگ
 عقل را دست پس مورد و بلخ
 عشق را سفتہ گوش شیر و پلنگ

عقل در پردہ گفت ہاں خاموش
عشق مستانہ برکشہ آہنگ
عقل در رنگ اختلاف آورد
عشق صد رنگ را کند یک رنگ
عقل با عشق نسبتے دارد
جام بلور و بادہ گل رنگ

بے ادب این سخن چہ می فہم

اہلہ شناخت ماہی از خرچنگ

گرامی رح

(۲)

عقل در پیکاک اسباب وصل
عشق صید از زور باد و انگشہ
عقل را سرمایہ از ہم و شکست
عشق را عزم و یقین لا ینکست
عقل چون باد است از دل درجاں
عشق کیاب و بہائے او گراں
عقل محکم از اساس چون چہند
عشق عریاں از لباس چہن چہند
عقل میگوید کہ خود را پیش کن
عشق گوید امتحان خویش کن
عقل گوید شاو شو آباد شو
عشق گوید بندہ شو آزاد شو
اں کست تعمیر تا دیراں کند
ایں کند دیراں کہ آباداں کند

اقبال رح

عشق و ہوس

بہتید و فاسخاں خالیت تہ پائے
امید ہوس کو شال گل بر سر دستارے

گرامی رح

در عشق و ہوس نالکی طائی کہ تفاوت چیست
اں تیشہ فرہادے ایں حیلہ پرویزے

اقبال رح

محمد عبدالرشید پیرتل

غالب

وطن کا افتخار اے شاعرِ جادویاں تو ہے
عطا فطرت نے کی ملکِ سخن کی قیصری تجھ کو
ترمی ہر سطرِ ملکِ نابدارِ گوہرِ معنی،
سزاوارِ قسمِ رفعتِ تری نازکِ خیالی کی
تھی جب بھی بیخودی چھائی ہوئی تیرے دلِ صانع
تائیلش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ ضوا کا
فنائے عشرت گیتی پہ تو اس درجہ گریاں ہے
ترمی "بیرنگ" اُردو سے بھی لاکھوں رنگ پیدا ہیں
ترمی شیریں کلامی اور قہر تلخیِ دوراں
مگر ہو مژدہ غالب تجھ کو تیرے ہاتھ کا پودا
ریاضِ ہند کی گویا بہارِ بے خزاں تو ہے
ادب کی سرزمین کی بل گئی اسکنہ ری تجھ کو
ترپتے ہیں تری ہر بات میں سودِ فترِ معنی
رسانی تا جبِ سرخِ ہفتیں افکارِ عالی کی
"کہ جنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ ہستیاں پر"
وہ ہے گلہ تہ "اللہ اللہ تیرے" طاقِ نیاں کا
کہ "صبحِ عید تجھ کو بدتر از چاک گریاں ہے"
ترمی سنگین زمینوں سے گلِ رنگیں ہویدا ہیں
ابھی تک رو رہا ہے اپنی بدبختی پہ ہندوستان
بڑھا بڑھتا رہا کچھ اس طرح سے پھولِ چل لایا

کہ اُس کے حُسن و خوبی کا چمن سارا ہے شیدائی
درِ اُردو پہ ہے جملہ زبانوں کی حبسِ سائی

پیشوتم لال ضیا لالہ اسوی

لے فارسی میں تابہ بینی نقشِ ہائے رنگِ تنگ + مجرورِ محمود اُردو کہ بے رنگِ بنِ مست +
غالب

گانا

گانا کئی قسم کا ہوتا ہے، اس کی ایک قسم تو وہ ہے جو متوسط درجے کے گھروں میں عام طور پر پائی جاتی ہے، دیکھی جاتی ہے، اور ہاں، اگر بھاگ بھگنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو سنی بھی جاتی ہے، عام طور پر ایک گھنٹیا سا رذیل ہارمونیم ہوتا ہے، یوں تو موسیقی کے اعتبار سے ہر ہارمونیم ہی فطرۃً رذیل ہوتا ہے، لیکن پھر اس رذالت کے بھی کئی درجے ہیں، اور متوسط گھروں میں اکثر ایسے درجہ سوم و چارم کے ہوتے ہیں۔ مگر خیر یہ تو ایک غیر متعلق بات تھی، اصلی چیز تو "گانا" ہے، گانے کے لئے متوسط درجے کے گھر میں ایک لڑکی ضرور ہوتی ہے، بہت سے گھروں میں شاید ایک سے زیادہ ہوتی ہوگی، لیکن اوسط کے اعتبار سے ایک ہی کافی ہے، آپ اس لڑکی کو جو چاہے کہہ کر پکار دیئے، بھلا، کلا، زمیدہ، پرکاشش کو، مطلب ایک ہی ہے یعنی اوسط گھرانے کی لڑکی جو گانا جانتی ہے اور جس پر سائے گھوڑوں، گونا نا رہے، اب اس لڑکی کو آپ ذہن میں رکھیے اور پھر اس ہارمونیم کی نظر بھی خیال کیجئے جو اس طاقچے میں لکڑی کے صندوق میں جس پر خاکی زین کا غلاف چڑھا ہے نہایت احتیاط سے رکھا ہوا ہے۔ متوسط درجے کے گھروں میں گانا عموماً کھانا کھانے کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس کا محرک بچا راہ غریب ملان ہوتا ہے جو بچہ بلا بھٹکا کبھی متوسط درجے کے گھر میں آ سکتا ہے، پیٹ پر دو تین بار ہاتھ پھیر کر اور چند لمبی لمبی کھٹی کھٹی کاریں لے کر میرٹوان مہمان سے پوچھتا ہے:-

"ناش واش کھیلو گے؟"

"نہیں"

"ایک آدھ بازی برج کی؟"

مہمان ایک جھاتی لے کر جواب دیتا ہے: "جب سے سکرٹریٹ میں ملازم بڑا ہوں، برج بھی بھلا بیٹھا ہوں۔"

"اچھا تو پھر — گراموفون اٹھا لا!"

جاپان کی ترقی کا لڑد ہاں کے لوگوں کی محنت و مشقت میں نہیں، نہ اس امر میں کہ انہوں نے مغربی تہذیب و سائنس کو اپنایا ہے، بلکہ محض اس امر میں ہے کہ وہ لوگ ہندوستان کے متوسط طبقے کو جاپانی گراموفون، جاپانی کریپ، جاپانی سائیکل جاپانی ٹھکڑیاں، جاپانی تصویریں اور اسی قسم کی ہزاروں سستی اور بے کار چیزیں بھیج کر اسے ہمیشہ فریب نفس میں مبتلا رکھتے

ہیں، سیاسی غلامی اور ذہنی غلامی دونوں کا چلی دہن کا ساتھ ہے،
 بشال کے طور پر اس گراموفون کو لیجیے، دیکھنے میں سبک خوشنما، بالکل ریڈیو معلوم ہوتا ہے، قیمت صرف پچیس روپے
 دسویں بارہویں دن اس کا فنر (Funer) ٹوٹ جاتا ہے، مگر یہ ایک بالکل فزوی بات ہے، اصل بات تو ہے گانا! یہ
 نالچ آپ نے سنا، سچی کمر تو رہی مل کھائے جائے۔ ”جی میں نے فلم دیکھا تھا۔“ ”اوہ — اچھا یہ ریکارڈ، اک
 میرے ماہی دی مُندی — بالو، یہ آپ نے نہیں سنا ہوگا۔“
 ”اچھا سنا دیجیے۔“

ریکارڈ پہن شروع ہوتا ہے، آدھا ریکارڈ ختم ہونے کے بعد فنر ٹوٹ جاتا ہے، بالو پہنی گھر، گھر، گھر کی آوازیں سنائی
 دینے لگ جاتی ہیں۔

میزبان بڑا سانسہ بنا کر کہتا ہے، ارے مُتے — گراموفون بند کر دو، اور پھر منکر کر، بھلا! (ایکلا! اسیدہ! پکاش کوٹا
 انیس گانا بسنا تو بیٹی!

بھلا آخر تو سہ سٹھ گھنے کی لڑکی ہے، اسیا سے کانوں تک سُرخ سُرخ ہو جاتی ہے، اور سر جھکا لیتی ہے، اس طرح لڑکچار
 مہمان کو پورا یقین ہو جائے کہ سچاری بھلا گانا تو کُتب بولن بھی نہیں جانتی،

میزبان، دوسری بار پھر یہ اسے مگر ذرا اونچی آواز میں کہتا ہے، بھلا، جا ہارنیم لے آنا، وہ اس طاقت میں دھر ہے۔
 اور مہمان جس کی پلکیں نیند سے جھکی جا رہی ہیں اسہتہ سے ہمت بڑھانے کو کہہ دیتا ہے، ہاں بہن بھلا! کچھ سنا دو، سنا
 ہے تم بہت اچھا گاتی ہو، (پھر جلدی سے یہ فقرہ جرد دیتا ہے) رام بھروسے کی ماں سے سنا تھا۔

اب یہ سب جھوٹ ہوتا ہے، دسچاری بھلا اچھی طرح گا ہی سکتی ہے اور نہ رام بھروسے کی ماں گانا سنی ہی سکتی ہے کیونکہ وہ
 سچاری تو بھری ہے، اور پھر بہن بھلا! ”لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہندوستان ہے جہاں عورتوں کی صرف دو قسمیں ہیں، ایک
 قسم ماں، دوسری بہن، اگر خوبصورت ہو جواں ہو، تو بہن اور اگر بد صورت، اُدھیڑ یا بوڑھی ہوتو ماں، پس اور تیسری قسم کوئی
 نہیں، کیونکہ جب عورت کی شادی ہو جائے تو پھر وہ عورت نہیں رہتی، بلکہ پاؤں کی جوتی بن جاتی ہے۔

اب بھلا گاتی ہے، باپ حقہ پی رہا ہے، اماں نونڈے پر بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں کو گود میں لئے لڑکی کی طرف دیکھ
 رہی ہے کہ کہیں بھلا گناہ اٹھا کر جہان کی طرف دیکھ تو نہیں رہی! مدھم باریک آوازیں بھلا گارہی ہے، ہارنیم الگ
 اپنے سُردوں کو بجا رہا ہے۔

گلا ہاں گلا کاٹ لو گلبدن دھیرے دھیرے

دھیرے دھیرے

مہمان گانا سنتے سنتے تصور کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ قصاب تیز چھڑی گردن پر رکھے بیٹھا ہے اور نیچے بکری میا میا کر کہتی ہے "گلا . . . ہاں گلا . . . کاٹ لو گلبند! دھیرے . . . دھیرے" ایک قصاب کیلئے "گلبند" کی تشبیہ کتنی نازک اور پیاری ہے، یہ شاعر لوگ بھی عجب دماغ رکھتے ہیں، مہمان ابھی یہاں تک ہی سوچ سکتا ہے کہ بلا دوسرا گانا شروع کر دیتی ہے، اب اک نئی لڑی ہے، مدھم اور غمگین

تم میرے تم میرے میں تیری

اُول اُول اُول

تم میرے تم میرے میں تیری

اُول اُول اُول

اور پکارا مہمان حیران ہو کر سوچتا ہے کہ اس اُول اُول کا کیا مطلب، مگر کچھ سمجھ نہیں سکتا، آخر جرات کر کے پوچھ لیتا ہے اور بہن بلا! اس دوسرے بند کا کیا مطلب؟

اور بہن بلا! جا کر کہتی ہے، جی، میں نے فلم میں ایسے ہی سنا تھا۔

* * *

متوسط طبقے سے اوپر گانا اپنی مثبت بیکس بدل لیتا ہے، اس کی تمام جزئیات تبدیل ہو جاتی ہیں، ہارمونیم کی جگہ گٹنڈ کی طرح گونجتا ہوا ارگن، یہ میں نے بارہ سو روپے میں خریدا تھا، کچھ اتنا برا بھی تو نہیں، شرابی ہلا کی جگہ ایک شوخ و شنگ تہلی، رنگین ہونٹ، بے باک ننگا ہیں، آپ کیا سننا پسند کریں گے، بوڈینیوب، یا گریس ٹوڈی کا نمبر، اچھا، آپ مغربی موسیقی کو پسند نہیں کرتے مگر سگل تو کب کا پڑانا ہو چکا ارگن پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اُس دن آپا کماری جو تھیکا رانے کا ایک ریکارڈ لے آئیں، یونی پسند آگیا، جیسے ریڈیو پر بھی کبھی کبھی کوئی اچھی چیز آ سکتی ہے، انگلیاں پھیرتے پھیرتے گانا شروع کر دیتی ہیں، اور گانے کے دوران میں بار بار دیکھتی جاتی ہیں، آپ کی طرف، آپ مسکرا مسکرا کر داد دیتے ہیں، اور گانا ختم ہونے پر تالی بجاتے ہیں، "! ہمنڈ" آپ کس سے گانا سیکھتی ہیں؟ "تے خاں کھنوی"، "وہ تو بڑے استاد ہیں اپنے فن کے"، ہاں اڑھاٹی سو سے کم نہیں لیتے، پاپا کہتے ہیں گانا سیکھنا ہو تو کسی کھنوی استاد سے سیکھ جائے کیونکہ ناچ بھی وہی سکھاتے ہیں!

در اصل متوسط طبقے سے اوپر گانا کم اور ناچنا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

* * *

اور پھر گانے کی ایک اور قسم بھی ہے۔ اس کا نام ہے "کلاسیکل میوزک"۔

عجیب شے ہوتی ہے یہ بھی، یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے ہر کس دن کس نہیں سمجھ سکتا۔ شاید اسی لئے سوسائٹی کے ہر طبقے میں اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، خاص کر وہ گروہ جو اپنے آپ کو ادب اور آرٹ کا محکمہ سمجھتا ہے۔ کلاسیکل میوزک کے سوا اور کسی شے کو پسند نہیں کرتا، کوئی "چیمبر" سنائے، یہ "چیمبر" دوسرا نام ہے کلاسیکل میوزک کا۔ "چیمبر" میں اگر گانا اپنی معراج کمال کو پہنچ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کوئی "چیمبر" سننے پر اس قدر متحرک رہتا ہے۔ ہر شخص یہی کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو کلاسیکل میوزک کا ماہر ثابت کرے، "اس دن ہم نے وائی، ایم، سی، اے میں جی، وٹو اور جاکوینی کا گانا سنا" کیا وحید لایا ہے، بھاگ اور سوڑھ جی، مالکوس اور ٹنگ، واہ، واہ، یا پھر اس دن ٹھٹھ آیا تھا، جو ہم نے پیا ٹو وال کو روپ صاحب کو دعوت دینے کے موقع پر اپنے ہاں دیکھا تھا، واہ، واہ، پچھے نے کی کیا تائیں؟ رانی تھیں، کیا کیا "کلیاں" بنائی تھیں۔

بھیم اور جوگ، بھیرویں اور درباری، اور مانڈ..... بس مانڈ تو پیا ٹو وال پر ختم ہے!

میرا اپنا چیمبر ہے کہ کلاسیکل میوزک کا ماہر بننے کے لئے کچھ زیادہ وقت پیش نہیں آتی۔ آٹھ دس راک راکٹیوں کے نام یاد ہوں، چیمبر کلاسیکل، انان، کھیرن، پٹلا اور اس قسم کے آٹھ دس فنی نام یاد کر لئے جائیں۔ طبیب کی کتاب پر کبھی کبھی سربلا دیا جائے، لوگ کہیں دیکھیں، بٹے صاحب بھیم کی گت کی خوب سجاتے ہیں، آپ کہیں، نہیں صاحب، ہم تو طبیلے والے کی کتاب پر مرے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مجلس میں لوگ آپ کو کلاسیکل میوزک کا استاد سمجھنے لگے جائیں گے، ہر ایک گویا آپ کی طرف ہی باز رہا بل کر گائے گا "تانی دھا، فی پاما گا دھا، تانی دھا، تانی دھا" اور آپ سر ہلا کر کہیں گے بھئی، واہ، واہ، واہ! چیمبر کس خوبی سے اٹھاتی ہے، بس اب "الٹ کلیاں" سنا دو تو روج خوش ہو جائے۔

سیانوں سے سنا تھا کہ گانا روج کی غذا ہے، لیکن ان تین قسموں میں کوئی قسم بھی ایسی نہیں جو روج کو بالیدگی بخش سکے، یہ سب نام نہادوں کے دھندے ہیں، ان تینوں طبقوں کے لوگ گانا سنتے ہیں تاکہ موجودہ تہذیب کے ظاہری لوازم کو پورا کر سکیں، اس کے پس پردہ ڈھرتی موجود رہتا ہے، مبادا کوئی انہیں جاہل، ادب اور آرٹ سے بیگانہ سمجھ لے، اسی لئے تو موٹی ٹوند والا ٹیس اور لمبی مونچھوں والا فوب اور باتیں بنانے والا پروفیسر اور سر ڈیٹ کی میز پر سر جھکا کر کھنے والا کلرک، ہر ایک اپنے آپ کو گانے کا شہیدانی جتاتا ہے، لیکن گانے کی ایک اور قسم بھی ہے، چوتھی، آخری اور سب سے سچی، یہاں نہ ہارنیم ہوتا ہے، نہ سٹرو وائیٹن نہ ارگن، یہاں نہ کلیاں سنانی جاتی ہیں، نہ پلٹے اٹھاتے جاتے ہیں،

ایک چھوٹی سی ڈھولک ہوتی ہے، اور پچاس ساٹھ مزدور اور اُن کی عورتیں اور لڑکے اور لڑکیاں، اور ننگ دھڑنگ بیٹھے، تالیاں بجاتے، پاؤں ہلاتے ”بحر یا توری بہ بہمار، بحر یا توری“ ملی جلی آوازیں، موٹی، پتلی، لمبی، کوئی گاتے گاتے کھانسنے لگ جاتا ہے، کوئی گاتے گاتے ہنسنے لگ جاتا ہے، درمیان میں ڈھولک بجتی ہے، کوئی پاؤں میں گھنگرو باندھ کر بھنبھنارہا ہے تو کوئی کانسی کے کٹورے پر پیہ رکھ کر بجا رہا ہے، گھلا سا گندہ صحن ہے، آسمان پر ستارے اُن گھنگرے ڈول کی طرح بکھرے ہوئے ہیں، جو کسی سمت رقاصہ کے ٹخنوں سے اُتر اُدھر اُدھر فرش پر پکھر گئے ہوں، اُن کے درمیان میں چاند ہے، جو کانسی کے کٹورے کی طرح چمک رہا ہے۔ گاتے ہوئے مزدور، چمکتا ہوا چاند، بے ہنگم لیکن پُرسرت نغمہ، دل کو خوش کرنے والا، دل بھر کی تنگن اُتار دینے والا، سیالوں نے سچ کہا تھا، گانا رُوح کی غذا ہے! — لیکن کئی لوگوں کے پاس رُوح نہیں ہوتی، وہ صرف ایک غول رکھتے ہیں +

کرشن چندر

رُباعیات

(۱۲)
یہ سہا ہوا چاند یہ سپین تارے
پہ چاک گشتاؤں کے حصین نظارے
پہ مچھ گشتاں یہ لبِ جو بہ سبوت
بولو جی تم ایسے میں کہاں ہو پیارے

(۱۱)
کیوں اپنے کبے میں عبث چھتاؤں
کیوں اب بھی مے و نغمہ میں جاؤں
کیا فائدہ تو بہ کا کہ فضلِ گل میں
مکن نہیں تو بہ کی جی تنگ جاؤں

تخت سنگ

غزل

دریاے عشق میں جو اُترنا پڑا مجھے
ہر موجِ آتشیں سے گزرتا پڑا مجھے

ہر چند کر رہا تھا میں تقدیر کے خلاف
تقدیر دیکھئے وہی کرتا پڑا مجھے

جنت کی آرزو کس دل میں بسی نہ ہو
کرتے ہوئے گناہ جو ڈرتا پڑا مجھے

آنے لگی تھی اُس کی جبیں پر زارِ شکن
اظہارِ عشق کر کے مگر ناتا پڑا مجھے

مے کے بغیر کیف سے خالی تھا نقشِ زلیت
یہ رنگِ جان بوجھ کے بھرتا پڑا مجھے

کھل جائے تاکہ زلیت کا اُلجھا ہو اطمینان
نقشِ وجودِ بن کے اُبھرتا پڑا مجھے

کشفی کٹھن تھی زلیت کی منزل بھی کس قدر
لڑلڑ کے حادثوں سے گزرتا پڑا مجھے

کشفی مکتانی

کارڈ پہنچنے جائیں اور بہادری کا تمغہ مل جائے۔

لیکن میری باتیں صد اہم و محترمانہ نہیں اور علیحدہ دوسرے روز کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

دوسرے دن پھر ایک مجلس شاد و بہت معتقد ہوئی جس میں ہر جماعت کے نمائندے موجود تھے۔ بچے کی خالو صاحبہ نے تجویز پیش کی

کی دوست بہت مناسب نام رہے گا، بچہ ماشاء اللہ خوبصورت بھی ہے اور عمر بڑی بھی۔

اس کے جواب میں انتہا پند پارٹی کے لیڈر نے جو خالصانہ تقریر کی وہ مختصر یہاں درج کی جاتی ہے:-

”عائز بن وعاقرات! میں ابتدا ہی میں یہ گوش گوار کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس نام سے کوئی پرغاش نہیں لیکن اس لئے کہیں لوگ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے مافی الضمیر کو صاف صاف بیان کروں، ان نول والدین کو اپنے بچوں کا نام رکھتے وقت اس امر کو ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ ان کے نام میں کوئی ایسا عنصر نہ ہو جو ان کے حالات و حالات پر اثر انداز ہو سکے جب ہم کسی بچے کا نام دوست رکھتے ہیں تو زلیخا کا تخیل دست بردار نہ ہوتا ہے۔ اب جن والدین کو اپنے لالہ عزیز بہوں وہ شوق سے ان کا نام دوست رکھیں۔ میں نے جو بات تھی عرض کر دی تاکہ یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ ”میں خیر نہ ہوں“

اس کے بعد کئی نام پیش کئے گئے جن میں عبدال، شہزادی، اجمو وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخر ایک نوجوان لڑکی نے جو بے حد شوق و شہرت تھی بچے کا نام سترٹیں ٹیں ٹیڑی کیو کیو کیو کیو کہہ رہی تھیں میں نے کیا کرنا تھا؟ مختصر یہ کہ کوئی نام بھی پس نہیں کیا گیا..... ایک مہنت بعد بچے کا حقیقہ ہونا قرار پایا۔ کسی نے منٹے کے آبا سے بچے کا نام دریافت کیا۔ جواب ملا رمضان۔ اے یہ رمضان کی کیا سے چک پڑا۔ مجھے بتایا گیا کہ چونکہ بچہ رمضان میں پیدا ہوا تھا اس لئے اس مناسب سے بچے کا نام رمضان قرار پایا۔

میں مسک کر رہ گیا۔ کچھ دن بعد رمضان کے والد صاحب سے میں نے پوچھا۔

”رمضان تو اچھا ہے نا؟“

جواب ملا ”بچہ بخیریت ہے“

”اے یہ کیا، بچہ کیوں، رمضان کیوں نہیں؟“

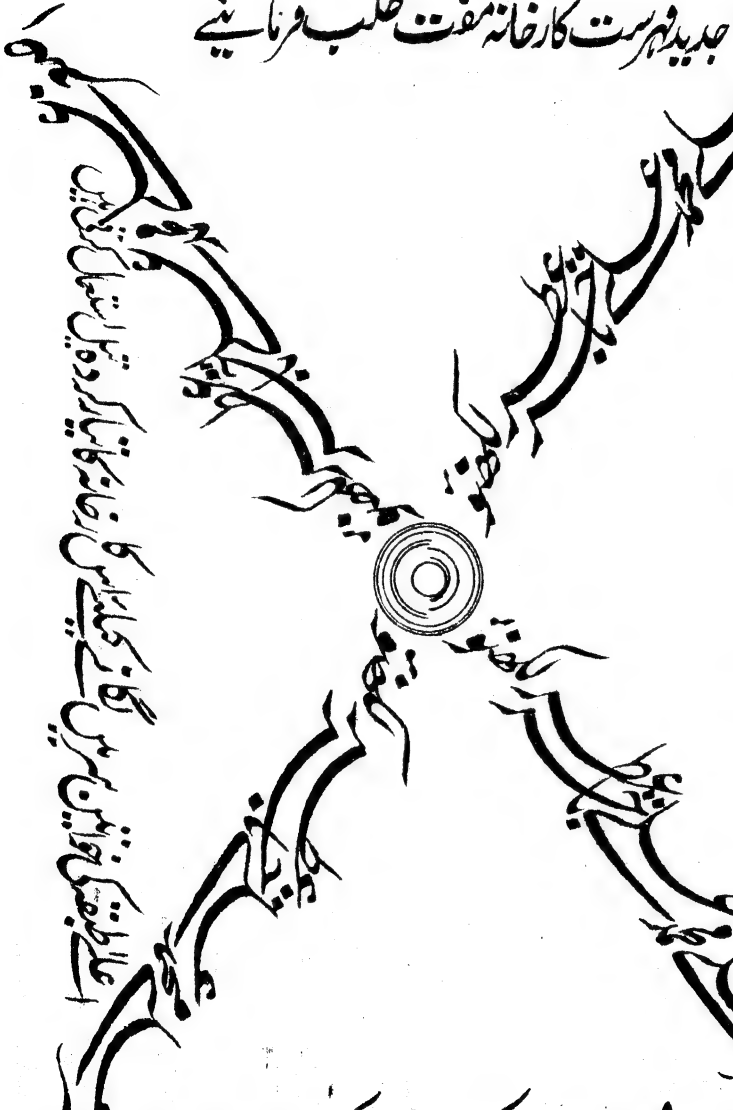
ہنس کر کہنے لگے ”بھائی صاحب آپ بھی عجیب آدمی ہیں ربات یوں ہے کہ یہ نام مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں صرف لوگوں سے بچھا پھرانے کے لئے میں نے یہ نام رکھ لیا تھا۔ مجھے تو شجاعت بچے کے لئے مناسب نام معلوم ہوتا ہے“

میں نے آہستہ سے کہا ”اور شیم کیوں نہیں؟“.....

مردہ جا چکے تھے۔

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

طبقہ سوال میں اس کارخانہ کا طرہ و رسم نہایت مقبول ہو رہا ہے :-



یہ کارخانہ ۱۳۳۹ھ سنہ ۱۹۲۰ء کے ساتھ جاری ہے

یہ عبد اللطیف پرنٹر و پبلشر نے مکشال پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔

فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ اگست ۱۹۳۸ء

(۲)
نمبر

(۳۴)
جلد

تصویر :- قبضہ مخالفانہ

شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	بزم ہمایوں	لبشیر احمد	۵۶۵
۲	جہاں ناز	عادل علی خاں	۵۷۰
۳	ایم جزد اور عمر و عیار	پروفیسر سید فیاض محمد صاحب ایم۔ اے	۵۷۳
۴	کاشفی (نظم)	حضرت ذوقی	۵۸۷
۵	سفینہ راصل	حضرت راصل ہوشیار پوری	۵۹۰
۶	اقبال اور گارڈز	جناب سید ظفر احمد صاحب کوکب	۵۹۱
۷	اے ندی (نظم)	جناب تاجور سامری	۵۹۳
۸	خبرے فست زگروں بشتان ازل (نظم)	جناب عطاء اللہ صاحب سجادی۔ اے	۵۹۴
۹	سات نہیں (افسانہ)	جناب محمد سراج صاحب ششی فاضل	۵۹۵
۱۰	کتب کے دن (افسانہ)	جناب عبدالکریم صاحب بی۔ اے مراد پوری	۵۹۶
۱۱	ریل کاراگ (نظم)	سید حمید صاحب کانٹی بی۔ اے علیگ	۶۰۴
۱۲	سراقبال سے نال میل	عادل علی خاں	۶۰۵
۱۳	کیوش کنول (تراجم از پیام شرق)	حضرت مقبول احمد پوری	۶۰۹
۱۴	ہار (افسانہ)	جناب ہمنو احمد رابادی	۶۱۰
۱۵	آہ وہ برساتیں	جناب پروفیسر صادق انجیری صاحب ایم۔ اے	۶۱۳
۱۶	مغزل	جناب سید ضحیر صاحب جعفری	۶۱۷
۱۷	اختلاج کے لمحے (نظم)	حضرت جمال بیچ آبادی	۶۱۸
۱۸	انقلاب ایران کا ایک شاعر	جناب ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم۔ اے	۶۱۹
۱۹	رفیقہ زمانہ (نظم)	حضرت وقار انبالوی	۶۲۴
۲۰	ایمان حکم (نظم)	جناب مختار زبیر عثمانی صاحبہ	۶۲۶
۲۱	مسافر (۱)	حضرت مجاز بی۔ اے علیگ	۶۲۶
۲۲	محفل ادب		۶۲۷
۲۳	مطبوعات		۶۳۴

بزم ہمالیوں

”ہندو مسلم اتحاد کا انحصار محض اردو کی بقا پر ہے!“

یہ سب سرتیج بہادر پیر وکاسہری قول۔ ایک انصاف پسند و ہستی کی زبان سے نہیں ایسی ہی دل چلنے والی باتیں سننے کی امید ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اس فرقہ واریت و جھگڑوں کے تاریک زمانے میں اپنی شکل بلند رکھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سچائی کا تقاضا یہی ہے۔

سرتیج بہادر نے انجمن بہادر ادب لکھنؤ کے جلسے میں اور بھی بڑے پتے کی باتیں کہیں کہ ”اردو دراصل ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے، اردو زبان کا بڑا کام یہ رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیبی تہذیب کے سمجھنے اور اختیار کرنے میں سہولت پہنچا کر باہمی یک جہتی اور ہم آہنگی قائم ہو سکے۔“

یہ تو بے بقول مولوی عبدالحی صاحب کے ایک قیقت شناس کا قول۔ اس سلسلے کے مقابلے میں بعض اور بڑے بڑے آدمیوں کے عمل دیکھئے۔ کس قدر محبت کا مقام ہے کہ وہ کانگریس جیسے ملک کی واحد سیاسی انجمن ہونے کا دعوے ہے وہ کانگریس جس نے واقعی اس بدبخت ملک کے لئے آزادی کے بارے میں سب سے زیادہ مفید کام کیا ہے وہ کانگریس جو اپنے کراچی کے اور بعد کے ریزولوشنوں میں ہندوستانی کو انکی زبان تکیم کر چکی ہے جو اردو اور ہندی کے بارے میں انصاف کی ترازو تھامے رکھنے کی مدعی ہے جو اردو اور ناگری دونوں خطوں کے متعلق غیر جانبداری کا اعلان کر چکی ہے دونوں کو قومی خط بھی تسلیم کر چکی ہے دیکھئے اسی قومی اور قوم پرست اور فرقہ پرست پروردگان کانگریس کا قول کیا ہے اور عمل کیا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد و مٹھنچاک کی فرقہ پرستی پر قومی تہذیب پر برساتے ہوئے ان کی اس شکایت کو کہ کانگریس ہندی کا پروپیگنڈا کر رہی ہے جہالت کا اظہار بچا کرتے ہیں لیکن مولانا کا تجاہل عارفانہ ملاحظہ ہو کہ محض کانگریس قرار دادوں کا پلٹا استعمالے واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کئے اردو کی حمایت کرنے والوں کو برا بھلا کہہ جاتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں جماعت ہندی!

قرار دادوں اور اعلانات کا بلند آواز سے نعرہ ادا کرنے کے بعد آئیے ہم دیکھیں کہ غریب اردو پر ان قوم پرستوں کے بقول کیا گورہی ہے؟ اور چنانچہ ممکن ہے کہ ہمیں فرقہ پرست اور کوتاہ بین سمجھا جائے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم بعض انصاف پسند قوم پرستوں ہی کے قدموں میں جا بیٹھیں اور ان کی زبان میں سنیں کہ وہ کیا فرماتے ہیں؛

اس وقت اردو کے تین بڑے فرقہ پرستوں کے سامنے پڑے ہیں: ”انڈین“ بابت اپریل ۱۹۳۸ء جس کے مترجم ایڈیٹر کو سب اصحاب

متفقہ طور پر ایک غیر سیاسی انصاف پسند غلام زبان جانتے ہیں۔ ”ایشیا“ بابت جنوری فروری مابین جس کے لکڑی شخصیت رکھنے والے مدیر کو کانگریس سے محبت اور بھارت مائے سچا عشق ہے۔ ”نگار“ بابت جون ستمبر جس کے فاضل مدیر ہینے سے ملے ایک کے مخالفین کے حلقے میں شریک رہے ہیں۔ ذرا نیچے یہ تینوں فاضل ادیب جنہیں اسلامی فرقہ پرستی سے ذرا واسطہ بھی نہیں کانگریس کی فضا پسندی کی لکڑی تصویر کھینچتے ہیں۔ ذیل میں مدیر اردو نے پہلی میں کانگریس وزیر عظیم کی توجہ کو برائے اس اعلان کی طرف منطقت کرانی کہ ہمیں میں ہندی کی اشاعت و ترقی کے لئے ایک رقم مختص کر دی گئی ہے جو اب ملا کم سے غلطی ہوئی ہماری مراد ہندوستانی تھی۔ اس پر مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہے کہ یہ غلطی اکثر کانگریس حکومتوں اور ان کے وزراء سے ہوتی ہے۔ اور ان سے ہے کہ مجھے کانگریس کی حکومتوں اور کانگریس کے وزراء کو یہ بتانا پڑتا ہے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اس کی اصلاح کر دی جائے گی اور جو آپ کا منشا ہے وہ مجھے کھس دیتے تاکہ اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ لیکن مولوی صاحب کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے بعد میں انڈیا موخرہ اپریل ستمبر میں انہیں وزیر صاحب کی تقریر پڑھی کہ سب نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ مشترکہ زبان ہندی ہوئی چاہئے، مولوی صاحب کہتے ہیں ”یا تو یہ لوگ ہندی ہندوستانی کا فرق نہیں سمجھتے یا کسی طرح سے ہندی کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔ اول ہندی کہتے ہیں جب اعتراض ہوتا ہے تو ہندی یا ہندوستانی کہہ کر خاموش کر دیتے ہیں۔“ بہت دلوں کے غور کے بعد ”ایک“ راز کھلا اور وہ یہ ہے کہ کانگریس سے بھی بالا اور اعلیٰ ایک جی ہے جس کے ایک اشارے ایک لفظ کے سامنے کانگریس کے تمام ریزولوشن اس کا دستور اور اس کے ضوابط اور قواعد سب میچ ہیں۔ گاندھی جی نے چونکہ ملک بھر میں ہندی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اس لئے کانگریس کا ہر وزیر اور سرکار وہی کہتا ہے جو ”ماتما جی“ کہتے ہیں۔ جو نیت نامہ کی وہی ان کی۔“ اور طے یہ ہے کہ گاندھی جی سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو گئے ہیں اس لئے ان سے کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ آپ کانگریس کے ریزولوشن کی کیموں یا بندی نہیں کرتے۔ باوجود اس کے کانگریس ان کی انگلیوں پر ناجاتی ہے۔ اور پھر ٹٹ ہے کہ ہندوستانی کا ریزولوشن جو کانگریس نے منظور کیا وہ حضرت گاندھی جی ہی کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، کانگریس والے تو ان کے منشا اور نیت کو دیکھتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگریس کا نام بدل کر گاندھی کانگریس رکھ دیا جائے کہیں تو قول فعل میں مطاب ہو۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گاندھی جی مسٹر جنرل سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس پر میرے صاحب کا یہ مصرع یاد آتا ہے

”دریا کا پھیر پائینے تیرا نہ پائینے“

”کانگریس حکومتوں کے اکثر وزیر محض ایک بڑے شخص کی تقلید میں اندھوں کی طرح کام کر رہے ہیں۔“ گاندھی جی کیا جانیں کہ ہندوستانی تہذیب کا ہندوستانی زبان ہے کیا گفتار ہے ہندوستانی زبان سے غفلت کرنا ہندوستانی تہذیب کا برا کرنا اور ہندو مسلم اتحاد کی جھوٹائی ہے۔“

”فرز بات یہ ہے کہ جناب سوباش چندر بوس نے گاندھی نیشنل کانگریس میں جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا وہ ایسی مشکل ہندی میں تھا کہ

خود بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور ایک شخص تجھے پیچھا ہوا، ہمارے قلمدہ دیتا جا رہا تھا۔ شاید اسی لئے لگ گئے ہیں کہ کانگریس والوں کے قول اور فعل میں بڑا میل ہے۔ یہیں ۲۰ فروری کو کانگریس ہی کے پنڈال میں راشٹر بھاشا رومی زبان کا اجلاس ہوا۔ یہ راشٹر بھاشا خدا کے فضل سے ہندی تھی؛

ایسا کیا کہ دیر کانگریس کی جی کھول کر تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

’کانگریس زبان کے مسئلہ کے متعلق بارہا اپنا فیصلہ بیان کر چکی ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے اس کا اعادہ بھی کرتی رہتی ہے لیکن کانگریس کے تمام لیڈر جس میں گاندھی جی بھی شریک ہیں ناگری رسم الخط اور خالص ہندی زبان کے مؤید ہیں۔‘ اس حیثیت کے صدر کانگریس جی اقامت ہند کی محبوب ترین متاع ہیں مسلمان یہ دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہری پور کانگریس میں جس زبان میں انہوں نے اپنا خطبہ صدارت فرمایا کیا اُس زبان کو ہندوستانی کہا جاسکتا ہے؟ ”اس کے معنی کیا ہیں؟ کآپ رولیشنوں قرار دادوں اور اجلاسوں میں بلند بانگ نعرے کرتے ہیں اور آپ کا کل ستر ستر آپ کے قول کے خلاف ہوتا ہے۔ کرتے آپ ہیں اور بھرتی ہم کو بڑی ہے یعنی آپ کا طرز عمل اُن لوگوں کو مخالفین کے سامنے منگوں کر دیتا ہے جو آپ کے سامنے اور ہندوستان کے فطرتاً دیوانے ہیں۔“ ”مستندہ قومیت کے بلند اور ارفع تصور کی پیداوار وہ زبان ہے جس کو اردو اور ہندوستانی کہتے ہیں۔ یہ زبان ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے میل جول اور ربط و اتحاد سے بنی، مسلمان قوم کی ہند پرستی کا اندازہ اس تاریخی حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ مسلم بادشاہوں نے قلمی و ترک کی کو اس زبان کی خاطر ترک کر دیا جو ہندوستان کی خالص پیداوار تھی اس لئے اس کو بجا طور پر قومیت متحدہ کی قومی زبان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔“

”گاندھی جی اور اُن کے خاص متبعین جو کانگریس کے ہائی کمانڈے تعلق رکھتے ہیں کلی طور پر فیصلہ کر چکے ہیں کہ تمام ہندوستان کی زبانوں اور رسم الخطوں کو دفن کر دیا جائے اور ناگری رسم الخط کو جاری کیا جائے اور اگر بیخیال غلط ہے تو کوئی نہیں بتائے کہ تم مسلم لیگ کے سامنے اس حقیقت کی کیا تاویل کریں کہ ہری پور کانگریس کے پنڈال میں آل انڈیا ہندی سلیں ’منعقد ہوتا ہے‘ ہندوستان کی واحد سیاسی نمائندہ مجلس کانگریس صدارت ٹنٹن صاحب کی اُس زبان میں پڑھا جاتا ہے جس کو وہودی سمجھتے ہیں جو مسلمان ہری پور کانگریس میں شریک ہوئے اُن کا بیان ہے کہ خطبہ صدارت کا ایک لفظ بھی وہ نہیں سمجھ سکے۔ کیا راشٹر بھاشا کا یہی تصور ہے جس کی بنا پر آپ ایک زبان پیدا اور وضع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟“

”ایک طرف اس کی کوشش ہوتی ہے کہ مسلم ناگنٹیکٹ کمیٹی ’بلئے اور دوسری سمت وہ ایسا طرز عمل اختیار کرتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس ناگتشی شکل میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔“ ”کانگریس کے لئے یہ طرز عمل نازیبا و ناروا ہی نہیں نظر آئے گا“ اس کا واحد حل یہ ہے کہ جب ۱۹۳۹ء کے اجلاس کانگریس میں صدر اس عجیبے غریب زبان میں خطبہ ارشاد فرمائے تو ایک لمحے

سے ۵۰ دہاڑا سلمان کھڑے ہو کر اس سے صاف کہ دیں کہ ہم نہیں سمجھتے۔ اگر ہم کو سمجھانا چاہتے ہو تو ہندوستانی زبان میں ہم کو مخاطب کرو۔ خدا کرے میرے عزیز دوست ساغر صاحب کا یہ واحد صلہ کہ اگر گزشتہ ہو اور ان کا پچاس ہزار کا اُردو لشکر اپنی بیٹیاں پوری طرح کامیاب و مظہر مند ہو جائے (امین)۔

جناب مدیر نگار فرماتے ہیں :-

”میں کانگریسی خیال کا آدمی ہوں“ ”میں اب تک کہ میں نے مسلم لیگ کے وجود کو ہمیشہ بے کار سمجھا“ ”جس وقت کانگریس کی طرف سے“ ”پورنا سراج“ کا اعلان ہوا تو میں نے غور کیا کہ کیا واقعی وہ مذہب و دولت کی دنیا سے علیحدہ صفت (انسائٹ) کے اصول پر عمل کرے گی لیکن قبل اس کے کہ میں کسی نتیجے پر پہنچا خود کانگریس ہی کے طریقہ عمل نے بتا دیا کہ اتنی بلند چیز سے اس کو نسبت دینا درست نہیں“

”اگر ہم کو گاندھی جی کی ذہنیت کا اندازہ ہو جائے تو کانگریس کا اصول کار آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے“ ”لفظ پورنا کی جو عملی صورت گاندھی جی کے ذہن میں ہے وہ یا تو اتنی ناقص ہے کہ ہم اس کا ترجمہ کابل کر ہی نہیں سکتے یا پھر وہ اتنی انتہا پسند ہے کہ ہم صرف عصیت کہہ سکتے ہیں یا زیادہ واضح الفاظ میں ”ہندو راج“ ”الغرض گاندھی جی کا منیر کیسا ہی پاک و صاف ہو لیکن جو دل انہوں نے کانگریس کے لئے متعین کیا ہے اس میں ضرور ایسی آلودگیاں نظر آتی ہیں جو ایک بلند خیال کی ڈھکائی کے لئے ناقابل برداشت ہیں“ ”گاندھی جی کے ڈپلرٹ ہونے میں شک نہیں۔ ان کے عہدہ میں ایک شیر کا سادولہ نہیں ہے بلکہ گھٹا میں لگے رہنے کا سا انداز ہے“ ”گاندھی جی کی ڈکلیئر شپ نے کانگریس کی طرف سے ملک کے بعض مہقول کو بدظن کر دیا ہے اور وہ کانگریسی حکومت میں وہ صاف باطنی نہیں پاتے جو مختلف انجمنوں میں اعتماد پیدا کر کے مرکزیت پیدا کر دیتی ہے“ ”حقیقت یہ ہے کہ ہندو جماعت جس کا ذہن آزادی کا مل کے تصور سے بالکل خالی ہے اس سے شعراقی آزادی سے زیادہ کی تن کر بھی نہیں سکتی“

”دنیا کی اور چیزوں کی طرح حکومت کے بھی دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ داخلی و خارجی۔ خارجی پہلو کے متعلق توضیح کچھ کہنا ہی فضول ہے کیونکہ صفائی و پاکیزگی کا جو مفہوم ہندو قوم نے متعین کیا ہے وہ بالکل علیحدہ ہے اور اس لئے انہیں کانگریسی حکومت کے دفاتر میں ظاہری بدترقی کی گندگی اور بھید پر مبنی نظر آتا ہے تو حیرت نہ کرنا چاہئے لیکن انہیں اس توہین سے کہ اس کا داخلی پہلو بھی قابل تعریف نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ ہندو دل کا واقعی منشا کیا ہے اور گاندھی جی کی رہنمائی میں کونسی ذہنیت نشوونما پا رہی ہے؟“

یہ سب نیا لہجہ صاحب کے ارشادات ہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں :-

جہاں نما

گیتا کا پیغام

ہندوؤں کے نزدیک زندگی کے تصور میں دھرم کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا یہ کافی ثبوت ہے کہ ہندو قدیم زمانے ہی سے ویدوں کے مبینہ حقیقت کو دھرم ہی کی تفسیر و تشریح سمجھتے رہے ہیں۔ دھرم کی اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے البتہ اس کی غرض و نفاذ کے متعلق خاصا اختلاف رہ چکا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انسان کے معاشری اور ہر قسم کے اجتماعی مفاد پر دھرم کا اثر کچھ ہی کیوں نہ ہو دراصل اس کا مقصد محض کسی نہ کسی قسم کے ذاتی فائدے کا حصول ہے۔ خواہ یہ ذاتی فائدہ اس دنیا کے متعلق ہو یا دوسری دنیا کے متعلق۔ بعض اور لوگوں کا خیال تھا کہ دھرم کا یہ تصور اس کے مرتبہ کو بہت کر دیتا ہے اور اس کی حیثیت محض ایک وسیلے کی ہی رہ جاتی ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ دھرم اپنا مقصد آپ ہے۔ یہ بجائے خود سراسر بھلائی ہے اور ایسی بھلائی ہے جسے خود اسی کے لئے نہ کسی اور مقصد کے لئے حاصل کرنا چاہئے۔ ہندوؤں کے فلسفے کی کتابوں میں اس بات کے بہت سے ثبوت ملتے ہیں کہ ایک زمانے میں ان دونوں نظریوں کا کافی زور تھا۔ لیکن اب بہت عرصے سے ویدانت کے نظریے نے ان کی جگہ لے لی ہے اور یہی نظریہ اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق اوپر کے دونوں نظریوں میں سے کوئی بھی پورا پورا درست نہیں۔ ویدانتی خیال کے مطابق یہ بات درست نہیں کہ دھرم بجائے خود کوئی مقصد ہے کیونکہ جس قسم کی جدوجہد کی ترغیب یہ دیتا ہے وہ کبھی غلط معیتیں، مقصد کے بغیر جاری نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اوپر کے دونوں نظریوں میں سے پہلے نظریے کی طرح یہ نظریہ بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ دھرم ایک وسیلہ ہے لیکن اس کے خلاف یہ اس بات کی تردید کرتا ہے کہ اس کا آخری مقصد کوئی اس قسم کا شخصی مفاد ہے جو اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ یہ درست ہے کہ دھرم کا کام ایک وسیلہ کا سا ہے لیکن جو مقصد یہ وسیلہ حاصل کرتا ہے وہ نظری خواہشات کی تسکین نہیں۔ ان خواہشات کی تو اہمیت ہی ایسی ہے کہ وہ کبھی اور اعلیٰ تعلیق تک نہیں پاسکتیں۔ دھرم کا مقصد یہ ہے کہ ان خواہشات پر انسان پورا پورا غلبہ پالے۔ کیونکہ اسی طرح انسان اپنی اہمیت کو پہنچ سکتا ہے۔ اصطلاحی الفاظ میں یہ بات یوں بیان ہو سکتی ہے کہ دھرم پورا پورا عمل کرنے سے انسان متواسدھی یعنی مٹائے قلب ماہمیل کر سکتا ہے۔ اور اس طرح "موکشا" یا خود شامی کے مرتبہ کو پہنچ سکتا ہے یہ گیتا کی مشہور تعلیم ہے۔ ظاہر ہے کہ قیہیم محض فرض بلکہ فرض کے عقیدے سے بہت زیادہ ہے۔

بعض لوگ اس خیال کو دوسری طرح پیش کرنا پسند کرتے ہیں کہ چونکہ گیتا کے خدا پرستانہ پہلو زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس نظریے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان آخر کو "موکشا" کے قابل بننے کے لئے فرض کو سب سے بڑا مفاد قرار دے کر اس پر عمل کرے۔

یہ ہے کہ وہ تمام دھرم و سرودھرم مان کو چھوڑ کر اب اور اسی دنیا میں خدائی زندگی کی پیروی اختیار کرے۔ اور اس طرح خدا کی ذات میں پناہ حاصل کر لے۔ سرگرد و بند و گمشدہ کا عقیدہ بھی یہی تھا اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سری کرشن ایک سے زیادہ مرتبہ ارجن کو جس قسم کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، وہ ویسی ہی زندگی ہے جیسی خود کرشن گزار رہے تھے۔

بدھ کی اخلاقیات

سرپس رادھا کرشن جو کہ سکھ و دیونیر سنی میں مشرقی مذاہب کے پروفیسر ہیں لکھتے ہیں کہ بلند نظر اندیشیت اور اخلاقیات تو ہمت کی یکجائی سے آتی کہ وہ بڑھاپا ہو گئی ہے کہ بعض عام مذہبی مبلغ بہت سی خارج از قیاس اور بعض اوقات محدود تعلیمات کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ یہی حال بدھ کے زمانے میں ہو گیا تھا۔

بدھ دھرم تمام ان آئاد اور باریک بین دماغ رکھنے والوں سے مخاطب ہوا تھا جو نہ صرف مذہبی معاملات میں تنہا مہم آزار سے گھبرائے ہوئے تھے بلکہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کو مذہب کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کے لئے خدا کی حقیقت ایک لفظ سے اور مذہب کی حقیقت ایک حدیم غلطی سے زیادہ ذہنی۔ بدھ نے اس جہم کے لوگوں کی ہدایت کے لئے ان کے سامنے ہموال اخلاق کو ان کی حیثیت مطلقہ میں پیش کیا۔ اُس نے کہا کہ ہم ضبط نفس، ہمدردی اور محبت کی زندگی بسر کرنے سے اپنی ہمتی میں ایک ایسی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں جو ہمیں انسانی معراج تک پہنچا سکتی ہے۔ یہ راستہ مدعویت اور غریب سب کے لئے کھلا ہے۔

پروفیسر صاحب نے بتایا کہ اخلاقیات کا اعتقاد بدھ کی تعلیم کی کٹھی ہے اور حقیقت اس کی زندگی اور خیالات میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ زیادہ نفس پرستی کو اور نہ ہیست اور زیادہ نفس کشی کو دیرا لگی اور وہم پرستی سمجھتا ہے۔

اس نے اپنے پیروؤں کو حد سے زیادہ نفس کشی سے روکتے ہوئے اعتدال کا راستہ دکھایا ہے۔

بدھ کا نانت اور اس کی غرض و غایت کے متعلق فلسفیانہ غور و فکر کرنے سے منع کرتا ہے۔ کیونکہ نجات کا جو طریقہ اُس نے بتایا ہے اُس سے ان باتوں کا کوئی تعلق نہیں۔

دنیا اور رُوح کے مطلق بدھ نے جو حقائق پیش کئے ہیں ان کی محرک بھی محض یہی بات ہے کہ بدھ کو اخلاقیات سے بعد دیکھی تھی۔

سکھ مذہب کی نشوونما

پروفیسر تھیا سنگھ نے سکھ مذہب کے متعلق ایک مضمون لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس مذہب کی بنیاد رکھنے والے گرو جیوں

کے اقتدار، بت پرستی اور شرک سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کسی قومیت کی بنیاد نہیں رکھی تھی بلکہ بعض مختلف اقلیتوں کے مذہبی فرقوں کو لٹوڑنا ہی تھی جو ان کے مرنے کے بعد بھی اپنی حالت پر قائم رہے۔

اصلاح کے صحیح طریقوں کے استعمال کی سعادت گرو نانک کے لئے مقدر ہو چکی تھی اور گرو نانک ہی نے گرو گوبند سنگھ کے لئے سستہ صاف کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے گرو نانک کی قائم کردہ بنیادوں پر ایک نئی ملت کی تشکیل کی اور مذہبی سیاسی اور نسلی مساوات کے اصول کو عملی صورت میں پیش کیا۔ دس بڑے گروؤں میں سب سے پہلے گرو نانک (۱۵۳۹ء سے ۱۵۸۱ء) نے خدا کی وحدانیت کا اعلان کر کے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے مذہبی ضروریات کے لئے مقامی زبان کا استعمال کر کے لوگوں میں قومیت کا جذبہ پیدا کر دیا اور چونکہ ہر لوگ اکٹھے ہر کر ایک ہی قسم کے مذہبی گیت گاتے تھے، اس لئے مقدر و خیال کی یکساں تھی سے یہ جذبہ اور بھی قوی ہو گیا۔ گرو نانک جہاں جاتے تھے وہاں اپنے چیلوں کی "سنگتیں" قائم کر دیتے تھے۔ یہ سنگتیں ادھر چیلوں کو آپس میں متحد کر دیتی تھیں اور ادھر اس نظام کے مرکز کے طور پر گرو سے بھی لوگوں کا تعلق استوار ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد گرو انگد نے رہبروں سے پوری طرح نجات حاصل کرنے کے لئے ایک نیا رسم الحظ اختیار کر لیا۔ گرو امرواس نے سنگتوں کے بہتر انتظام کے لئے انہیں چھوٹے چھوٹے دائروں میں تقسیم کر دیا۔ گرو رام داس نے امرت سرکھ مرکز بنایا اور مہرط مشند (مبلغ) بھیج کر جماعت کو مضبوط بنایا۔ گرو ارجن نے امرتسر میں دربار صاحب تعمیر کر لیا اور اُس میں اپنا مقبرہ گزشتہ صاحب لکھا۔ مذہبی حیثیت سے یہی گزشتہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ اس گزشتہ صاحب میں گرو ارجن اور ان کے پیشروؤں کی تحریروں کے علاوہ بعض ہندو اور مسلمان بزرگوں کی تحریروں بھی جمع کی گئی ہیں۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ان بزرگوں میں سے بیشتر چھوٹے تھے۔

اسلام

اسلام ایک معاشری نظام ہے جس کے قوانین انسان کی فطری زندگی سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔ ان قوانین میں ہر موقع اور محل پر کام کرنے کے لفظی و دست اور لکھ کا ہے۔ اسلام کا مجموعہ یہ ہے کہ یہ دست و پا لکھ کا اسلام کا باوجود اس قدر ہر گز کرنے کے انسانی فطرت کی ان بنیادی صداقتوں کی حد سے کسی طرح باہر نہیں بھٹے دیتی جو قرآن مجید میں رکھا ہے۔ زندگی کے تعلق کے اسلام کی نظر ارتقائی ہے اور وہ معاشرہ کی ہم تہذیبی بنیادیں کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے معاشری و انسانی فطرت کے ان قوانین کی سختی سے پابندی کو لے کر جس میں فطرت انسانی کو مستلزم ضروریات متبادل ثابت کر چکی ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کے معاشری سیاسی اور اقتصادی قوانین اس طرح ڈھالے گئے ہیں کہ وہ انسانی فطرت کے کسی طرح متصادم نہ ہوں۔ انسانی فطرت کی عالمگیری اور ناقلیت ضروری تو ہر حال مستم ہے ہی۔

دوسرے قوانین کے علاوہ اسلام نے تقسیم دولت و تقسیم جائیداد کے متعلق بھی نہایت واضح اصول رکھے جو ان قوانین بنائے ہیں اور یہ قوانین ایک نہایت متبادل اور قابلِ اشتراکیت کی انیس انسانی بنیادوں پر دیئے جاسکتے ہیں۔ یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان قوانین کے فائدہ اور جبر و انسانی کی روک تھام کے لئے اسلام ایک طاقتور مذہب و حکومت کے ساتھ ضروری ہوتا ہے۔ وحمد للہ عز و جل ذکر و مثلاً و اسدا

امیر حمزہ اور عمر و عیار

داستان نامے اردو کے طویل القدر کردار اس دفتر کے کراں سے تعلق رکھتے ہیں جسے داستان امیر حمزہ کہا جاتا ہے۔ یہ داستان ایک مصنف کی مشرقی فلم نہیں، اور نہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پہلے پہل یہ کب لکھی گئی۔ سب سے پرانا نسخہ جو میں نے دیکھا ہے دو ایک قسم کا نسخہ ہے اور وہ ۱۲۵۷ء میں کلکتہ میں طبع ہوا۔ اور شاہزادہ فتح حیدر خٹک ابراہیم شاہید کے داماد و نواب میرزا امان علی خاں لکھنوی نے فارسی زبان سے اس کا ترجمہ کیا۔ نواب امان علی خاں تیار لکھتے ہیں کہ اس داستان کی بنیاد سلطان محمود غزنوی کے وقت سے ہے اور وجہ اس کی تصنیف کی یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے ہر طرح کی خلعت کا طریق معلوم ہوتا ہے اور قلعہ تانی اور ملک گیری کا خیال دل میں آتا ہے۔ اس لئے بادشاہ مذکور ہمیشہ اسے شوق سے سنا کرتے تھے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔ اصل فارسی میں یہ داستانیں غواہ کس مطلب کے لئے لکھی گئی ہوں، اردو میں انہیں لکھنے کے محرک کھنڈ اور اس کے اطراف کے روسا اور امراء کی بیکاری اور انیسویں صدی کا رواج داستان گوئی ہے۔ چنانچہ تین نامور داستان گوئوں کے نام اس طویل حکایت کے دل بستہ ہیں۔ شیخ تصدق حسین، سید محمد حسین جاو اور منشی احمد حسین قمر، اگرچہ تین اور حضرات یعنی مولوی محمد علی میرزا احمد علی اور منشی انبیر پرشو کا نام بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ سچھنے سے پہلے یہ داستان جو کم از کم تیس دفاتر پر مشتمل ہے، روسائے کھنڈ اور شاہزادگان اودھ کے سامنے ہر بار کسی نہ کسی قارئین کے ساتھ پڑھی جا چکی تھی۔ ان حضرات کے حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے بہت سے محقق شیخ ابوالفتح نفی نے لکھے تھے۔ تفریح طبع شہنشاہ اکبر فارسی میں رقم کئے تھے جن میں سے مندرجہ ذیل بہت مقبول ہوئے :- نو شیر داں نامہ، ہمرزنامہ، کوچک باختر، بالا باختر، ایرج نامہ، طہر ہوشیار، صندلی نامہ، نوج نامہ، اعلیٰ نامہ۔ ان کے علاوہ بھی ان حضرات نے زمرہ تصرف اور تصنیف کی بدولت درج ذیل دفاتر اور قرب لکے۔ الفہرست میں ایسی چھالیس جلدوں کے نام درج ہیں۔ فقط شیخ تصدق حسین نے ہی ان تیس جلدوں میں سے چھ جلدیں یعنی کے کم از کم چھتیس جلد صفحات۔ یہ سب منشی ابوالخیر اور ان کے شاگرد منشی پرپاک ان کے ان حضرات کے کھنڈ کے ساتھ کے ذریعہ چھپائیں انیسویں صدی کے بدیع سوم میں اس داستان کے سات دفتر سلطان نصیر الدین شاہ ایران نے تاجروں کے ذریعہ مندرجہ سے مواد گواہ اور اپنے ہاں کے شاعروں اور شاعروں سے لکھا کر دویم جلدوں میں طبع کرائے۔

۱۔ منشی احمد حسین قمر، اس کا حوالہ طہر ہوشیار کی جلد ششم کے قریب دیتے ہیں۔

اس داستان کے سب دفاتر میں زلزلہ لگات، ثانی سلطان یعنی امیر حمزہ صاحبقران، ان کے بیٹوں، پوتوں، نواسوں اور بہتر ہنر، بہتر ہنر یعنی ہر سب عیاری خواجہ عمرو بن اسیر نیمیری اور ان کے فرزندوں اور شاگردوں کی ملک گیری طلسم کشانی اور جہاں گروی کا حال بالتفصیل درج کیا ہوا ہے۔

آغاز ہندوستان کا کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ امیر حمزہ اور ان کا لشکر کسی جھوٹے خدا کی بیخ کنی کرنے کے لئے حکم عائد ملتے ہیں یا بوقت شکار یا بین لڑائی میں امیر حمزہ کے لشکر سے کوئی باؤدگد یا جادوگر کی کسی شہزادہ کو لے اٹکتی ہے اور کہیں جا کر یا اسے دشمنی سے قید کر دیتی ہے یا طالب میل یا مدد ہوتی ہے، ہر سہ مندرتوں میں کسی نہ کسی کو اس کے پیچھے جانا پڑتا ہے چنانچہ علم نجوم سے معلوم کیا جاتا ہے کہ فدا لطلسم کا فتح کو نسا فرزند یا نبیرہ حمزہ ہے، پھر وہ شاہزادہ بعض دفعہ اپنے عیار کے ساتھ اور اکثر تنہا طلسم کشانی کو نکلتا ہے۔ بعد از ہندو صوبہ دہلی میں چند شاہزادیاں طلسم کی مدد سے منظور اس آفتاب جن اور صاحب سلطنت و سلطنت پر عاشق ہو جاتی ہیں وہ شہزادہ جرات اس طلسم کو فتح کر لیتا ہے۔ اس طرح سینکڑوں طلسم پسران اور نبیرگان حمزہ نے فتح کیے ہیں۔ ہر جگہ، ہر وقت، ہر صوبہ میں عیار کر ان کی مدد کرتے ہیں۔ جادوگروں کو دھوکا دے کر انہیں قتل اور صدمہ منوں میں طلسم توڑتے ہیں۔ مختلف فنون میں امیر حمزہ کے نامور فرزندوں اور پوتوں کے خرمی اور فتاحی کے قصے درج ہیں۔ مثلاً ہر زمانہ میں قاسم غفری نقاب اسرخ پوش بن کرتا ہے اور امیر حمزہ سے مقابلہ کے دعوے کرتا ہے اور بانہائے صاحبقرانی چھین لینے کا دم بھرتا ہے۔ کوچک باختر میں شاہزادہ بدیع الزماں ملک سنبان کو فتح کرتا ہے اور بہت شوکت کے سلاطین پیدا کرتا ہے۔ بالا باختر میں نصر شاہ باختری سے جو خدائی کا دعوے کرتا ہے مقابلہ ہوتا ہے اور یہاں بدیع الزماں اور قاسم اور آفریں آمد بن کرب اور شاہزادہ نور الدہر بہت معرکہ آرائیاں کرتے ہیں۔ ایرج نامہ میں ایرج بن قاسم جو ایام طفلی میں گم ہو گیا تھا آفتاب پستوں میں پرورش پا کر انیس کا ذہب اختیار کر لیتا ہے اور امیر حمزہ کے لشکر سے مقابلہ کرتا ہے اور بہت عروج پاتا ہے۔ اسی میں نور الدہر بن بدیع الزماں کی جنگ نمایاں بھی درج ہیں۔

صندلی نامہ میں منصور بن حمزہ اور حمزہ ثانی کے خرمی کا قصہ ہے اور توح نامہ میں رستم ثانی بن ایرج اور بدیع الملک بن نور الدہر کی رستمی اور طلسم کشانی کے قصے لکھے گئے ہیں۔

یہ جہان صفت فطن اور شاہزادگان جہتہ شمار سب امیر حمزہ کی طرز پر وضع کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ایک اور خصوصیت ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے کے لئے منظور میں لکھ دی جاتی ہیں۔ جو صفات امیر حمزہ میں موجود ہیں وہی ان سب میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ امیر ان سے علم میں زور میں برداشت میں اور مدت میں قدرے بڑے ہونے میں علیہاں لشکر جن کی تعداد ایک لاکھ چار سو ہزار ہے، خواجہ عمر عیار کے شاگرد ہیں اور ان کی کل دست مہاست میں فرق ہر ایک لاکھ چار سو ہزار ہے۔

طریق عیاری میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ سچی ایک حسین جمیل عورت کا عیس بدل کر سارول کوٹھتا ہے۔ اور داروئے ہوشی شرب میں ہلا کر کبھی پھول سنگھا کر یا گنگا کوٹھال کے احباب مار کر ان کو ہوش کرتے ہیں اور اسی صورت میں انہیں قتل کرتے ہیں۔ ان عیاروں میں سب سے نامور مترقرآن خلیفہ عمر عیاسی ہے جو پہلے ملک حبش کا بادشاہ تھا، خواجہ عمرو کبھی براؤ شفقست اسے تمیہا بنش یا میرا کالیا کہہ کے پکارتے ہیں۔ پھر متر برق فریقی جو قوم کا انگریز ہے، پھر متر بک خطائی اور متر حلالک بن عمرو۔ ان چاروں کے بعد چودہ سرہنگ میں جن میں سے یہ چند بزرگ بہت مشہور ہیں: ۱۔ ابوالفتح سیارہ بن عمرو، براہر بن عمرو، امیر بن عمرو، اسک پیلانی، گھبار عاتی، شاہر شریول وغیرہ۔ ان کی عیاروں کا رنگ لکڑی کے سرے سے بہت مشابہ ہے۔ سوائے مترقرآن اور برق فریقی اور کسین کچھ چٹانک بن عمرو کے۔ مگر ان سب کے استاد اور دراصل شنشا ابج عیاری خواجہ عمرو ہیں جن کے پاس تعفجات ہفت نیل ہیں اور چوٹانی عیاری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

امیر حمزہ خواجہ عبد المطلب بن ہاشم کے فرزند ہیں اور قوت میں جبارت میں جلالت میں صاحب قرآن ہیں۔ ان کے حزیج کا قصہ یہ ہے۔ نوشیروان شاہ ایران نے ایک لک ایک ہمایا نک شواب دیکھا، جسے وہ صبح اٹھتے ہی پھول گیا۔ برسر دربار اس نے اپنے وزرا سے یہ کینیت بیان کی۔ اس کے وزیر بزرگھرنے جو علم کمانت میں کمال رکھتا تھا، ناچ کینچ کر یہ تیسویاتی کہ مشرق کی طرف سے شہر خبر کا بادشاہ کسی زمانہ میں آپ پر چڑھائی کرے گا اور شہر مکہ سے ایک جوان عمرو نامی آکر آپ کو سچائے گا۔ نوشیروان نے بزرگھرن کو اسی وقت کہ بھیجا کہ وہاں جاؤ اور اگر وہ لڑکا پیدا ہوا ہو تو ہمارا فرزند مشورہ کر کے اس کی مناسب پرورش کا انتظام کر کے آؤ۔ بزرگھرن نے کچھ کرنا خواجہ عبد المطلب کا گھر دیانت کیا اور پھر مکہ کے ان فرزندوں کو طلب کیا جو ایک دن ہی پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ حمزہ اور عمرو اور قبل تین بچے اس کے سامنے لائے گئے۔ اسے علم نجوم سے معلوم ہوئی چکا تھا کہ قبل اور خصوصیت سے اول الذکر دو بڑے بہت نامور ہوں گے۔ چنانچہ ان کا خاطر خواہ انتظام کر کے واپس مدائن آگیا۔

جب یہ جوان ہوئے تو اپنے اپنے مہینے فرید روزگار اور نیچروں کے منظور نظر ہوئے۔ جب شام میں معلق خبری نے نوشیروان پر چڑھائی کی تو امیر حمزہ نے جاکر اسے زیر کیا۔ چنانچہ ان کی اور ان کے یاران ہمد یعنی عمرو عیاری اور قبل وفادار کی بہت قدر ہوئی۔ امیر حمزہ ملکہ مہرنگار دختر نوشیروان پر عاشق ہوئے اور اس عشق میں بہت مصیبت اٹھائی۔ نوشیروان کو دھڑا وزیر تنجک بہت شیطان صفت تھا، وہ ہمیشہ اسے بڑی ملاح دیا کرتا تھا۔ اس کے مشوروں سے نوشیروان بہت تباہ حال ہوا۔ اول تو اس نے عمرو کو ہندوستان بھیجا کہ دارائے ہند لند حور بن سعدان جیسے کو پیکر پہلوان کو زیر کرے جس کا قادیک مسیح پس گو کا دھڑ کا گز ایک ہزار سات سو تین کا تھا۔ امیر اس سے پہلے دو بہادروں یعنی عمرو و مدی کرب اور ہرام گرد بن فاتحان مہین کو زیر کر چکے تھے۔ ہندوستان پہنچ کر لند حور کو بھی زیر کیا۔ کہہ مہرانی پ پر خواہ میں انہیں انیلے کر ام نظر آئے اور انہیں بہت

سے تحفے عطا کئے۔ عمر دینار بھی ساتھ تھے۔ انہیں بھی وہاں سے بہت تحائف ملے جن میں سب سے افضل حضرت آدم کی زنجیل تھی جو بلخ ہر ایک بڑے کسان کی ہدیہ تھی مگر اس کے اندر بہت سے ملک آباد تھے، اس میں جو بھی بڑا تھے اسے سہا جاتی اور جو بھی چھوٹا تھا بھل آتی، اس پر اتنے رکھ کر اگر دھار کرتے تو جس طرح چاہتے مورت تبدیل ہو جاتی، حضرت داؤد نے جن داؤدی اور موسیقی میں کمال عطا فرمایا۔ اسی طرح حضرت دانیال نے ایک بار گاہ دی جو چاہتے تو سمیٹ کر کچھ پھری بن جاتی اور اگر کھیلانے تو اس میں ہزاروں آہنی بیٹھ سکتے، حضرت الیاس نے ایک جال دیا کہ جوا درجن قدر ہٹا اس میں باندھتے بندھ جاتیں اور اٹھانے والے کو جو محسوس نہ ہوتا۔

ہندوستان سے واپسی پر جنگ کے پھر نو شیر وال کو بہکا یا کہ اتیر کو اب کسی اور ہم پر بھیج دینا کہ وہاں جا کے مارا جائے اور نہیں اپنی بیٹی اسے نہ دینی پڑے۔ چنانچہ نو شیر وال نامہ میں انہی مہمات کا ذکر ہے۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے اور امیر نے بہت سے ممالک فتح کئے کہ ایک دن امیر کو شہنشاہ بن شہر خ بادشاہ پر دہائے قاف نے دنیا سے اٹھوا سٹھوایا کیونکہ دیوں نے بغاوت کر کے اس کا پایہ تخت چھین لیا تھا۔ امیر نے قاف میں اٹھارہ سال صوف کئے اور تمام دیوں کو زیر کیا اور زرہ لافاق لقب پایا وہاں آسمان پر دھڑک رہا تھا شادی کی۔ ۸۰ سال بعد دنیا میں واپس آئے۔ اس دوران میں عمر دینار جیسے وہ اپنا نائب کر گئے تھے لشکر کو اور ملکہ ہرنکار کو جسے امیر نو شیر وال کے جو روحنا سے تنگ آ کے ملائے سے نکال لانے تھے مختلف قلعوں میں چھپاتا اور شہنشاہ امیر سے ہٹا رہا۔ اکثر سردار منتشر ہو گئے تھے، زندگی اجیرن ہو گئی تھی، دشمن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے کہ امیر واپس آئے اور سب کو شکست دی۔ نو شیر وال جسے جنگ ملک ملک پھرتا اور حمزہ سے دشمنی پر ہمیشہ اگسا تارہتا تھا لڑا لڑکے عاجز آچکا تھا، آخر ایک جگہ شکست فاش کھانکے اور مجبور ہو کر اس ظہیر کی مہرنکار سے شادی پر رضامندی ظاہر کی اور بڑی دھم دھم سے شادی ہوئی، ملکہ مہرنکار کے بلطن سے شاہزادہ قباد پیدا ہوا جسے امیر نے بادشاہ کر اسلام کیا۔ بعد میں امیر نے بہت سے محل کئے جن سے چند ایک نامور فرزند پیدا ہوئے جن میں رستم سلطین اور بدیع الزمان بہت مشہور ہیں۔ رستم کے لڑکے قاسم خوزین خادری اور پوتے اسد سلطین (جو ان اور بدیع الزمان (جن کا لقب گرد و شتر شترن مشہور تھا) کے بیٹے نور الدہر نے بہت نام پایا۔ امیر حمزہ کی ایک دختر بلند اختر بھی تھیں جن کا نام زبیدہ شیرگیر تھا اور وہ بدیع الزمان کی حقیقی بہن تھیں ان کے بلطن سے اسد غازی پیدا ہوا جس نے مسلم ہند پر مہم جو اور ہندوستان امیر حمزہ کا مقبول ترین جتھے ہے عمر دینار اور بلخان اور علیا بان جانا بڑا کی امداد سے فوج کیا۔ امیر حمزہ عمر کے آخری جتھے میں دہلی سستی حمزہ ثانی کو کئے کر مکہ منظر چلے جاتے ہیں اور وہاں بشراکت رسول اکرم جنگ بھد میں لڑتے ہیں اور اسی غزوہ میں شہید ہو جاتے ہیں۔

امیر حمزہ اور عمر دینار کے کردار شالی ہیں اور ان کے اوصاف مافوق الفطرت، اس لئے ان کو جانتے وقت ہم وہ قوانین نہیں بچھا میں نہیں رکھ سکتے، جنہیں عالم انسانوں یا جانوروں کی تنقید کے موقع پر ہم منتر کی طرح جیتے ہیں۔ ان پر افسانہ نگاری کا

پہلا اہم عمل ہی عیا نہیں ہوتا۔ یعنی ان کی ترکیب میں حقیقت نگاری سے کام نہیں لیا گیا اور ان کے کاروائے نمایاں میں واقعیت سے ہے ہی نہیں۔ مگر صاحب کمال ہرگز اور غیر مختل اوصاف کے مالک ہوتے ہوئے بشریت کے کام لینا بھی تو ایک قسم کی حقیقت نگاری ہے، مثلاً امیر حمزہ کے کردار کو لیجئے، امیر شجاع ہیں، شکیل ہیں اور ایک بلند نظر خوش خلق اور با مروت انسان کا نمونہ ہیں۔ ان کی خلقت ہی اس طرح ہوتی ہے کہ ان سے کوئی کم ظرفی، بد عہدی یا ظلم نہیں ہو سکتا۔ ذخیرہ وال کی لڑائی پر عاشق ہو گئے ہیں۔ مگر پھر خود ان پر ہائل ہے اور باوجودیکہ بختک کے پنجہ بستم و کرے مامون کرنے کے لئے اُسے خود اپنے لشکر میں لے گئے ہیں مگر بغیر رضا مند ہی ذخیرہ وال کے شادی سے گریز کرتے ہیں۔ یہ بات غیر معمولی جذب اور تدبیر کا پتہ دیتی ہے۔ آپ مگر نگار سے عذر کرتے ہیں کہ جب تک اس سے شادی نہ ہو کہیں اور یہاں نہیں کریں گے مگر بد وقتافت میں ایک چھوڑتین نکاح کر لیتے ہیں آسمان پر می سے، اور پھر پری سے اور پھر و سے۔

نوشہروال، اربار دھوکا دیتا ہے سینکڑوں دفعہ وعدہ خلافی کرتا ہے مگر طرح دیتے ہیں اور اگرچہ اس پر قبضہ کر کے اس کی فزب کا دیوں کی سزا دے سکتے ہیں مگر باز رہتے ہیں مگر جب عمر و عیار بختک کی شیطنت سے تنگ آکر اسے قتل کر کے اس کا حل پس پکاتا ہے اور ذخیرہ وال کو کھانا دیتا ہے تو امیر اس کمزور حرکت کو نظر انداز بھی کر دیتے ہیں۔ پھر اگرچہ امیر حمزہ بہت علیم ہیں مگر جب انہیں غصہ آجاتا تو بے وجہ اور بہت جلال سے آنا بوشا امیر حمزہ نامہ میں لندھور بن سدان کا مقابلہ ایک پہلوان سے ہوتا ہے۔ مبارزہ میں لندھور جھلا کے اپنے حریف کو ایک گھونسلا سید کرتا ہے جس سے اس کا بڑا مقابلہ تیرا جانا ہے اور لندھور اسے گرا دیتا ہے۔ وہ بہادر زیر تو ہوتا ہے مگر جب امیر حمزہ مسلمان کرنے پر اس سے سوال کرتے ہیں کہ تجھے لندھور نے کیسے زیر کیا تو وہ شکایت کرتا ہے۔ امیر حمزہ لندھور سے ناراض ہوتے ہیں اور بہت نازیبا طور پر اور اسے لشکر سے نکال دیتے ہیں۔ لندھور ان کا یاد غار ہے، ان کا جانشین ہے، اور اسے راستے کے بہادروں کا سردار ہے مگر نہ اس کی منتوں کی پروا کرتے ہیں اور نہ ہی کی سفارش کو منظور کرتے ہیں۔ سچے اکو حکم دیتے ہیں کہ لندھور کی سفارش میں زبان ہلانے کا اسمی دبار سے نکال دیا جائے گا۔ لندھور صافی مانگتا ہے اسے سافی نہیں دیتے مسئلہ کہ وہ سب ہتھیار چھوڑ، فرزند اور فوج چھوڑ جنگل میں نکل جاتا ہے اور فقیروں جاتا ہے اور اس پر بہت بھینٹیں آتی ہیں مگر امیر بہت مدت تک غصہ نہیں چھوڑتے۔ یہ مندرامہ میں موجود ہے۔

پھر ابرج نامہ میں امیر اپنے راجائی اور محبوب خواجہ عمر و عیار سے لڑ جاتے ہیں اور اسے ایک دشمن کے حوالے کر دیتے ہیں کیونکہ عمر و عیار نے اس دشمن کو کوڑوں سے مارا تھا۔ وہ دشمن عمر و عیار کو باندھ کے کوڑوں سے بے حد مارتا ہے۔ امیر حمزہ اس سے س نہیں ہوتے۔ آخر عمر و عیار اس بے عزتی کو برداشت نہ کرتے ہوئے لشکر سے نکل جاتا ہے اور ابرج کو ڈھونڈ کر اسے قتل کر دیتا ہے اور فرنگ سپہ گری میں طاقی کر کے امیر پر حملہ کرتا ہے۔ مگر امیر عمر و عیار سے ناراض ہیں کہ اس کا نام نہیں

لیتے۔ یہ خصوصیت ان کے علم کے منافی ہے مگر جیسے ہم سب کبھی نہ کبھی بنے دھ اور نامناسب طریقہ پر پناہ میں ہو جاتے اور پھر اپنی جگہ پر قائم رہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں، اسی طرح امیر حمزہ میں بھی یہ کمزوری پائی جاتی ہے۔ اپنے رواداری اور وقت اور حرم سلوک کے اصول کو اس شدید طریقہ سے نباتے ہیں کہ کئی دفعہ انہوں سے نا انصافی ہو جاتی ہے اور امیر پروا نہیں کرتے۔ ان متضاد خصوصیات کی موجودگی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ امیر حمزہ کے کردار میں کمزوری یا کمزوری کے آثار ضرور پائے جاتے ہیں۔

مگر ان کا کردار جامد ہے۔ یعنی طبیعت ان کی جراتی کے عالم میں ہے، آخر تک بغیر کسی تغیر یا ترقی کے رہتی ہے بڑھاپے میں مصنفین ان کے بال سفید کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر ان کی قوت و شہادت میں کوئی فرق نہیں آتا شاید بزرگان دین کی نظر کے طفیل سے یا شاید صاحب نظرانی کی وجہ سے کسی پہلوان یا بہادر سے زیر نہیں ہوتے، جہاں رسم سہلین جیسے بہادر اور بدیع الزمان جیسے زور آور اور قاسم خوزید غازی جیسے تند مزاج اور امیر ج اور نور الدین ہر اور اسد بن کرب غازی جیسے صفت شکن بہادر لڑتے لڑتے نماز آجاتے ہیں وہاں امیر اس عمر میں بھی جا کر دشمن کو زیر کر لیتے ہیں۔

پھر شہزادوں کا بیک عجیب قاعدہ ہے۔ امیر اور ان کے فرزند جہاں کہیں پہنچتے ہیں شادی کر لیتے ہیں اور دوایک ماہ وہاں رہ کے آگے روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے لڑکے جب سن بلوغ کو پہنچتے ہیں جس کے لئے انہیں اکثر بارہ برس ہی لگتے ہیں، تو کوئی ایک ملک فتح کر کے نفاذ بادشاہی کر امیر کے لشکر سے آکر مقابلہ کرتے ہیں۔ اپنے بھائیوں جتنیوں سے لڑتے، ان سے نہ زیر ہوتے ہیں اور نہ اکثر انہیں زیر ہی کر سکتے ہیں، سوائے بدیع الزمان کے جو زور میں باتوں سے کچھ فوجیت رکھتے ہیں۔ آخر امیر کے ہاتھ سے زیر ہو کر اپنا نام بتاتے ہیں۔ یہ قاعدہ آخر تک جاری رہتا ہے اور امیر حمزہ آخر تک ہر جوان بیٹے یا پوتے پر خواہ وہ کتنا ہی بہادر اور کیسا ہی بطلان زمان کیوں نہ ہو، عادی رہتے ہیں۔

اگر آپ یہ کہیں کہ امیر بمقابلہ لندھ و زمر و شمشان، ہر دم، سر بال یا گاؤں کی جوقد میں امیر سے کم از کم نہ گزرتے ہیں کیسے ان کے سروں پر گرد لگا سکتے ہیں یا ان کے سر پر امیر کی تلوار ہی کیسے پہنچتی ہے یا یہ کہ دوران جنگ یا مہارت میں امیر کے لڑکے کو کوئی نہیں ہلا سکتا اور یوں ہر ایک عیار انہیں ہمیشہ کر پستارہ باندھ اپنی راہ لیتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ سرانہیب پر حضرت آدم نے امیر سے وعدہ کیا تھا کہ لڑائی کے وقت تمہارے بازو کسی حملہ یا ضرب کی وجہ سے ختم نہیں ہونگے اور تم جس کسی حریف پر حملہ آور ہو گے خواہ وہ کتنا ہی بلند قوت کیوں نہ ہو تمہارا بازو اس کے متراک پہنچے گا۔ اور عیار جو انہیں ملتا لیتے ہیں تو ہمیشہ اس کے اٹھاتے ہیں۔ جب امیر ہوش میں ہوں اور بوقت کشتی لنگر مارا میں تو کوئی انہیں ایک رچ نہیں ہلا سکتا۔ دوسرے یہ کہ ہم ممکنات کی دنیا کی میری نہیں کر سب ہم تو اس دنیا میں جتنی جتن کی سداۃ المنتہا ہے۔ یہاں کا کارخانہ ہی الگ ہے یہاں ہم جیسے بندے نہیں لیتے، یہاں ہزار ہزار امن کے گزر عام ہوتے ہیں اور ایک سو اسی گواہ ہے پہلوان۔

اور سندھوں ہزار دست جیسے دیو، یہاں میرے اور آپ کے وضع کئے ہوئے تنقیدی اصول بیکار ہیں۔ اس دنیا میں داخل ہونے کی شرط ہی یہی ہے کہ آپ اعتراض نہ کریں اور خوش اعتقاد دی سے کام لیں۔

اب رہے خواجہ عمر و عیار۔ یہ حضرت عیاری اور بکادی کے دیوتا ہیں۔ دوران جنگ میں اس طرح لغو لوگاتے ہیں۔

عمر و ہوں میں عیار صاحبِ نفل	مرے کمرے کا بنتا ہے جہاں
ترہنہ ریش لفت رہوں	زمانے کا مکار غذا رہوں
مرا تیز رفتار ہو کر قدم	مباحثہ کریں کھائے ہر ہر قدم
اڑا دوں مہا کے بھی میں ہوش کو	پائے مری گرد پاؤں پاشش کو
دوندہ جہاں گرد و طرار ہوں	بہانگیر عالم کا عیار ہوں

خواجہ کی تعلیق بلا سبب نہیں۔ بڑے بڑے نامور ساحروں نے جو خدا کی کا دعوے رکھتے تھے اور عیاروں کی حقیقت پیشہ کے برابر بھی نہیں سمجھتے تھے آخر عمر و سے دعو کا کھایا اور مٹے گئے۔ ان کا علیہ بیان کرنے میں جس ظرافت کو کام میں لایا گیا ہے۔ اس کا عیار بہت بلند نہیں اور میرے خیال میں میسٹفین کے فن تخلیق پر ایک بدنام دھبا ہے۔ خواجہ کو انہوں نے ڈبلا، بتلا، تانٹیا، بدفل اور بد قطع لکھا ہے۔ بدنامس اور غول بیابانی کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا تفصیل سے ان کا سراپا یوں کھینچتے ہیں۔ تو مڑیا سا سر تھا، زیرہ سی آنکھیں، خوابانی سے کان، کچھ کی طرح گال، تا گا سی گردن، اسی سے اٹھ پاؤں، اچھے کا جسم چھ گز اور اور اوپر کا تین گز تھا۔ یہ علیہ کما خیر ضرورت ہے کہ خواجہ کا کردار محض مسخرے کا نہیں، خواجہ سے آپ ہر قسم کی حرکت کی توقع کر سکتے ہیں۔ مگر وہ بھانڈ پن پر کبھی نہیں اترتے۔ عیاری کے موقع پر بھونڈے مذاق بھی ان سے بھجاتے ہیں اور بڑے بڑے ساحروں کی خدائی کے بعد عیاروں کی واڈھی پیشا بے موند نا بھی ان سے لیتی نہیں مگر اس سے لازم نہیں آتا کہ ان کا علیہ بھی کرہ بد بنا یا جائے، تاکہ عورتیں انہیں دیکھ کر ڈر جائیں مگر مسٹفین نے انہیں ایہ جمرہ کے حُسن کے مقابل میں بدکل بنا کر دیا ایک قسم کا توازن یا فائدہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر خواجہ کے کمالات کو دیکھ کر کوئی بھی ان کے علیہ کو یاد نہیں کھ سکتا۔

ان کی عیاری کیا تھی کرامات تھی، طلسم ہر شہر با میں اور دوسرے دفاتر میں ان کی بہت سی بے نظیر عیاریاں مرقوم ہیں۔ ایک دفعہ خداوند ننگ بن کر کھانا دراز شاہ بادشاہ میان بان لکھنؤ کو کپڑا لیا اور اسے سلجھ کیا۔ لاہوت جادو اور اس کی بیوی زلیخا انہیں کے باغ میں جو سمہر مند سواران لشکر اسلام قید تھے، افزا سیاب جادو و شمشاد طلسم ہر شہر و بان بنس نفیس وہاں موجود تھا۔ اس کی عیاریاں مگر ہر مری ہمراہ تھی، عمر و عیار پہلے ایک کالی بی بی بن کر کئے، پھر شمشاد و جنات بنے اور اس لعلت سے عیاری کی کہ ہر صحرے جسے دھڑے تھا کہ عمر و کوئی عیاری کہے وہ یہ جان لے گی سب بیکردی بھول گئی اور شاہ و جنات کو دیکھتے ہی کانپ اٹھی اور عمر و

نے اپنے سب رفیق قید سے بچھڑائے۔ خداوند جشدِ جادو بن کر افراسیاب جادو سے لڑ چکے تھے، لہٰذا وہاں شاہِ طلسم اور بدیع الزمان جو س سال سے طلسم میں قید تھے ان کی قید کا مقام دریافت کیا۔ پھر حیاتِ جادو نے جو ملک حیرت جادو و جادو ہوا، اس کا والد اور بڑا ہی جتہ سا حضرت غلامِ بیجا تو وہاں جاکے عیاری کی ادعا ضرورت کے دھوکے سے امیر حمزہ کی زمر و شاہِ خداوند لقا کے نکتہ کا نقشہ دکھایا اور صاف سچ کئے، اے۔ یہی وہ عیاریاں ہیں جن کی وجہ سے ساحران کے نام سے کانپتے تھے۔

کیوں وہ نازنین بنے کسی جادوگر کا مال ہفتیلنے کی نگر میں ہیں، کیوں اپنی خوش وقتی کے طور پر کسی جادوگر کو ٹوٹ کر اس کا مال زنیل کی نذر کرتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہیں جہاں طائر و ہم بھی نہ پر مار سکے۔ جب افراسیاب جادو رب کچھ مکھو بیٹھتا ہے تو آفتاب فلک سیر جادو سے چند تباہی طلسمی کو جو اس کے آباد اجداد نے سامری و جمہد سے حاصل کئے تھے، افراسیاب لاتا ہے اور ایک گنبدِ سحر تعمیر کر کے وہ تحفہ جات وہاں لٹکا دیتا ہے ان کی تاثیر سے جو دشمن بھی اس گنبد کے سایہ میں پہنچتا ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا ساحر کیوں نہ ہو، اسے بچھے اور بھالے اور تلواریں اس پر پڑتی ہیں کہ وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ خواجہ قمر و جان پر کیمل کر آفتابِ فلک سیر سے آئینہ طلسمی لاتے ہیں اور اس کی بیوی گلزارِ جادو کی شکل میں وہ آئینہ اس گنبد کو دکھا کے اسے برباد کرتے ہیں۔ افراسیاب کو تو آخر میں دم ہو جاتا ہے کہ جہاں خواجہ کا نام کسی نے ایک نغہ لیا، انہیں معلوم ہو گیا اور دوسری دفعہ نام لینے پر وہ اس طرف چل پڑے اور تیسری دفعہ جو نام لیا وہ اُسے اور پھر کسی کی قضا آئی۔ اسی لئے سب انہیں شہنشاہِ تعلیم عیاری کہتے ہیں۔

بعض حادثاتِ خواجہ کی بہت دلچسپ ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ حد درجہ کے سخیل اور عیسیٰ ہیں اگر کسی جادوگر کو مارتے ہیں تو اس کے کپڑے ننگ اتار لیتے ہیں۔ شاگردوں کو خلعت ملے تو ان سے وہ بھی رکھوا لیتے ہیں۔ جب امیر حمزہ نے خواجہ قمر و، مترانِ برق فرنگی، صرافام اور جاسوز کو شاہزادہ اسد کے ساتھ طلسم پوشِ ربانی کی طرف جانے کو کہا تو خواجہ نے کہا ہم تو کہ زیارت کو جاتے ہیں جب میرے پانچ لاکھ روپیہ زادہ دیتے کا نام لیا تو خواجہ نے روپیہ چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور اسد کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے جب کبھی کسی ہم پر جانا ہو تو پہلے خواجہ اسی طرح بڑے جب کچھ روپیہ مل جاتا تو ہتے۔ بعض دفعہ ان کی اور اسد یا امیر بادیع الزمان کی خوب لوک جھونک ہوتی، وہ کہتے ہم وہاں پر روپیہ دیں گے خواجہ پیشی پر اصرار کرتے۔ مگر یہ سب کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ہمانے ہیں، خواجہ جانے کو پہلے سے ہی تیار تھے۔ مگر جب میر نے اس دفعہ باقی کے چار عیاروں کو بھی پانچ لاکھ روپیہ عنایت کیا تو عمرو نے کہا "یا امیر آپ ناقص میرے شاگردوں کو روپیہ نہ کر خواجہ کرتے ہیں" پھر ان عیاروں سے کہا "اونا شہنشاہِ نور تم پر پانچ لاکھ روپیہ لے کر سب برباد کر دے گا" پھر وہ کچھ گود میں رکھ چھوڑ دوں، وقت پہنچاے کام آئے گا۔ اتنا روپیہ لے کر تم عیاری خاک کر دے گی کی اپنے پانی کا روپیہ صرف کر کے طلسم میں مھاؤ گے۔ عیار سمجھے کہ اُستاد روپیہ دیکھ کچھ ہیں، چھوڑیں گے نہیں۔ عرض انہوں نے وہ روپیہ میری عمرو کی نذر کیا۔

جہاں لشکرِ اسد کو فتح ہوئی اگر خواجہ ساتھ ہوتے تو پہلے ہی جا کر جال ایسا ہی مار کر ایک ہی ہل میں سب فرعون داخل زنبیل کر لیتے اور بارگاہ میں آ کر سکین سی صورت بنا کر بیٹھ رہتے اگر کوئی پوچھتا تو کہتے کہ لڑائی میں خیال نہ رہا، دو صندوقچے جہازت سے بھرے ہوئے کہیں گر پڑے۔ اب مہاجنِ مود کے لئے پیچھے پڑے ہیں۔ اگر کسی زبردست ساعر سے مقابلہ ہوتا اور سردارانِ لشکرِ خواجہ سے کہتے کہ خواجہ بہرِ خدا جاؤ اور عیاری کر دو تو منہ پھلکا کے کہتے "میں مفرض ہوں، فرسخواہِ مود کے لئے پیچھے پڑے ہیں۔ باہر نکلتا بند ہے۔ باہر جاؤں تو کیسے جاؤں؟ سب سردارِ غر شاد کرتے مگر خواجہ کہتے "بھائیو باتوں سے کچھ نہیں بنتا۔ کچھ روپیہ خرچ کرو تو بٹنے سب طرف سے اشرفیاں اور زیورات انہیں دیئے جاتے تو وہاں سے ہٹتے خواجہ کو روپیہ اتنا سوزینا کہ اگر حیرتِ جادو کی مدد کو کوئی اس کا معرکہ لڑ کر لے کر آتا اور حیرتِ جادو اس پر زرخچا اور کرتی آتی تو خواجہ کسی شہدے کا بھیس بدل کے یہ روپیہ ہی لٹتے پھرتے جب افرسیابِ جادو مارا گیا اور اس کا فرعونِ اسد کے ہاتھ آیا تو خواجہ کی طبیعت کو جانتے ہوئے انہوں نے باغبانِ جادو اور سمارِ قدرت و دافنِ انراں لشکر کو فرعون کا روپیہ شمار کرانے پر مستظم مقرر کیا اور حکم دیا کہ خواجہ کو ادھر نہ آنے دینا چنانچہ انہوں نے خواجہ کو تو ادھر آنے سے منع کیا۔ مگر خواجہ نے منت کی کہ وہ اور کچھ نہیں چاہتے فقط ادھر سے ادھر پھر کے روپوں کے انباروں سے گزر جائیں گے۔ ان کا کیا حرج ہے۔ مگر اسد بن کرب جو حوانی کے عالم میں خود قزاقی کیا کرتے تھے خواجہ کی چالاکیوں سے وقعت تھے انہوں نے خواجہ کی جو تیروں کی طرف نگاہ کی۔ دیکھا گیا کہ خواجہ نے تلوں کے نیچے موم لگا رکھا ہے اور ادھر سے ادھر گزرنے پر کچھ اشرفیاں تلوں سے چھٹ گئی ہیں۔

خواجہ کی اس خصوصیت پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ بعض دفعہ تو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ ظرافت میں بھی غلو کا م نہیں دیتا مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ خواجہ نے بھی روپیہ خرچ نہیں کیا۔

جب کرب غازی کی نسبت ملکہ زبیدہ شیرگیر سے بچتہ ہو گئی تو کرب غازی جنیس خواجہ عمرو نے اپنا فرزند بنا رکھا تھا اور جن سے انہیں بہت اُلفت تھی بہت ملول و پریشان ہوئے کہ میں اتنا امیر نہیں کہ دخترِ امیر کا ہم پلہ ہو سکوں، اس کی حیثیت کے مطابق ہرات اور زیورے ہا سکوں تو خواجہ نے تمام خرچ اپنے ذمے لیا اور اس فرزند کی سے خرچ کیا اور اس دعوہ و دعام سے ہرات لے کر گئے کہ شاہانِ عالم رنگ رہ گئے۔ پھر حسیب میر نے خواجہ کو ملکِ بخان میں شاہزادہ بدیع الزمان کی خبر کو بھیجا تو خواجہ راہ میں زمرِ شاہ کے پایہ تخت پہنچ گئے۔ زمر جو باختر میں خدائی کرتا تھا وہاں کئی ایک توڑے اشرفیوں کے گرد و حصار سے شرطیں جیتے۔ اس شہر میں خواجہ کی ہمشیر اور بہن کی بی بی بہت تھیں۔ خواجہ جب اپنی ہمشیر سے ملنے گئے تو وہ سب توڑے اشرفیوں کے اپنی بہن کی نذر رکھے۔ مگر ایسے واقعات خواجہ کی زندگی میں شاذ ہی گزرتے تھے اور عام طور پر ان کی حرص کی کمی نہت سے بیان میں ظرافت کی چاشنی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔

خواجہ عمرو دنیائے ظرافت کے ایک اور مشہور کردار کی طرح خود ہی ظریف نہیں بلکہ دوسروں میں بھی ظرافت کا باعث بنتے ہیں۔ یعنی ہتھیارک بن بٹنگ جو پہلے نو شیر والے پھر فرمزا اور ہمزاد فرزند ان نو شیر والے کا وزیر ہوتا ہے اور بعد میں خداوند لکے لکے بھڑکی کا شیطان بنتا ہے، ایک اور مزاحیہ کردار ہے۔ خواجہ اس سے ہمیشہ ریش کا علاج لیتے ہیں۔ وہ ان کے نام سے کا پتا ہے جب کبھی اسے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ مغل میں موجود ہیں تو انہی آوازیں ملتا ہوا برابر آہیں کہنے لگتا ہے اور ایسی سحر و پن کی باتیں کرتا ہے کہ بڑھنے والا اکثر بے ساختہ مسکرا دیتا ہے۔

مگر خواجہ کا کردار بھی امیر حمزہ کی طرح جامد و ساکن ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک ان کی طبیعت میں کوئی فرق اور فطرت میں حوادث زمانہ یا تحریکات زندگی سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ یعنی وہ شروع ہی سے ایک مکمل شخصیت کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں اور آخر تک ان میں وہی خصوصیات قائم رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دونوں کردار دو قسم کی شخصیتوں کے نونے ہیں مکمل جیتے جاگتے گوشت پوست رکھنے والے کردار نہیں۔ یہیں تیسری بہادری، پہلوانی اور جہانگیری کے علاوہ سولے ان کے متعدد معاشقوں کے جو ایک دوسرے سے سرگورز نہیں رکھتے، اور کچھ مظلوم نہیں۔ امیر کسی قتال و جہاں کو دیکھ کر اسی طرح بہیش ہو جاتے جیسے دو حسد آپ کو دیکھ کر اوہی طرز عشق بازدی دوسرے شاہزادوں اور شاہزادیوں کی ہے۔ چند ایک مصائب کے بعد کہ یہ مصائب بھی تقریباً ایک ہی تراش غراش سے جوتے ہیں، ان دونوں عشق زدوں کا انجام پیچھے ہو جاتا ہے۔ یہ کہ امیر ان یوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں، صبح اٹھتے ہیں تو ان کا مزاج کیسا ہوتا ہے، اتنے فرزند اور پوتے ہیں، کس کو کس سے زیادہ چاہتے ہیں اور کس کی ہی اور باتوں کے متعلق ہیں کچھ علم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی فقط ایک ہی شکل دیکھتے ہیں۔ انہیں ہر رخ اور ہر پہلو سے نہیں دیکھ سکتے۔

ایسے ہی خواجہ عمرو کو ہم ایک مابنا ز کی حیثیت سے ایک نذر، چالاک، میاں، ملاکار، عیار کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، یا ایک لالچی اور ظریف شخص کے روپ میں یا ایک بے مثال گوتے کے رنگ میں۔ ہمیں ان کے خیالات، ان کے ذاتی افکار ان کے خانگی حالات، ان کی صحت، ان کی طرز و دو و ماند ان کی چھوٹی چھوٹی جڑی باتوں سے مصنف آشنا نہیں کرتے۔ لہذا ان کی کوا فنی لحاظ سے ادھر اور ایک روضہ جاتا ہے۔ مگر اس کے مقابل میں ان کی باتیں سننے، ان کی عیاریاں دیکھنے، ان کی بذلغی، حافطی اور دانشمندی کا مطالعہ کیجئے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بیشک خواجہ عمر عیار اور دوسرا نگاری کے ایک لعل عظیم ہیں۔

اب ذرا دو دیکھیں ان داستانوں کی طرز نگارش کے متعلق کہنا چاہتا ہوں :-

اس داستان طویل میں غنیل کی جو فردانی پانی پانی ہے وہ شاید دنیا کی کسی اور داستان میں صرف نہیں کی گئی۔ اس فہر اس امر کا ہے کہ اگر تخلیق کے موقع پر غنیل سے کام نہیں لیا گیا تو مضبوط اور مٹوں کی پابندی کا باطل خیال ہمیں رکھ رہا ہوتا ہے۔ یہی کسی تنگ

ایسی داستانوں کی جان ہوتی ہے مگر نہ اس حد تک کہ بدلتے الزماں گنہگار شاہ سخاں کے لشکر تیس شب خون اکیلا ماتا ہے اور پھر جب اس کا ہم قدم قاسم غزنوی باختری میں جا کر لٹا ہے باختری کے لشکر پر اسی طرح اکیلا ۳۵ شب خون ماتا ہے تو بدلتے الزماں چالیس روز خون ماتا ہے۔ لاکھوں کا لشکر اور یہ شب خون، اور روز خون ہر شب ادھر روزا دران دونوں کو کوئی خفیت سی ضربے چائے تو آجسے در نہ کوئی زخم کاری نہیں لگتا۔ ایک اور ظلم ملاحظہ ہو، اور یہاں تو قاعدہ اور تائب سب چھوڑ کر کچا جہالت اور کور زوقی سکام لیا گیا ہے۔ سرفراز فاشل ہیں مندرجہ ذیل شاہزادے برائے فتاحی طلسم بکھلتے ہیں: شاہزادہ سکندر زین علم بن ایرج، شاہزادہ ضیغم شیر شاہ بن اسد غازی، شاہزادہ سرویہ قبا بن سعد بن قبا بن حمزہ اور شاہزادہ مہراں جواں بہت بن نور الدہر۔ یہ امیر جو کہ پوتوں کے بھی پوتے ہیں اور طلسم کشاں امیر حمزہ کے ہاتھ سے ہوتی ہے جہاں شاہزادیاں طلسم ان جواں شاہزادوں پر عارض ہوتی ہیں وہاں امیر و بھی اسی طرح فدا ہوتی ہیں اور امیر کی وجاہت اور شکل و صورت کی بھی انہیں العافیاں میں تعریف ہوتی ہے جن میں ان پڑ پوتوں کی۔

نوشیرواں نامہ میں مصنف کو رستم پلٹین فرزند حمزہ کی شوکت دکھانی منظور ہے، چنانچہ ایک جگہ لندھو بن سعد ان جانشین امیر کو جسے امیر جوانی کے عالم میں بھی سر سے بلند نہ کر سکے تھے رستم پلٹین مع لندھو کے ہاتھی میوند کے سر سے اڈھاٹھا لیتے ہیں۔ یہاں اس بات کی شوکت نہیں کہ یہ شاہزادے دیوں کو اٹھا کے پھینک دیتے ہیں اور اڈھوں کو چیر ڈالتے ہیں اور شیروں کو گھونسا مار کے ہلاک کر دیتے ہیں، ہاتھی کی سٹنڈ پکڑ کر زعفران اس کی گردن بکھینچ لیتے ہیں۔ یہ تو ان کا روضہ ہے مگر یہ اعتراض ضرور ہوتا ہے کہ فقط امیر کے ایک فرزند کی شوکت نمائی کے لئے ایسے بہادر کی یوں تو بین کرنا محمول داستان نویسی کے خلاف ہے۔

اکیلا ورامر جو خاص طور پر ان دستاویز میں ناظرین کی آنکھیں کھٹکتا ہے وہ مصنفین کا ان بہادروں سے برتاؤ ہے جو امیر یا اس کے فرزندوں سے زبرد ہوجاتے ہیں، یا ان جادو گروں اور جادو گر نیوں سے جو لو کر طبع لشکر اسلام بھجاتی ہیں۔ یہ بہادر جب قتل اول مقابلے میں آتے ہیں تو ہر شاہزادے سے لڑتے اور بہتوں سے برابر رہتے ہیں اور یہی ہوتا ہے کہ بہت زبردست سپہاں ہی ان کی بدعت سے خراب ہجائے مگر کوئی نیا سپہاں یا بہادر یا بادشاہ لڑنے کو آتا ہے تو یہ سپہاں پر اتنی فوجیت رکھتا ہے کہ اس کو زیر کرنے میں پھر صاحب قرآن سے جرح کرنا پڑتا ہے۔ سوائے محدو سے چند مثلاً لندھو مالک اژدر، بہرام گردیا ایک آدھ اور کے طلسم مشربا میں جو جی جادو گر کی جادو گر آتا ہے بہت زبردست دکھائی دیتا ہے مگر جب طبع بھتا ہے تو پھر اس سے کوئی خاص نمایاں کام سرزد نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر فقط دوشہرادیوں کو لیجئے، ملک نارائن زمین کن اور ملک لعل عثمان یہ دونوں جب فراسیاب کی طرف سے آتی ہیں تو ان سے سب لشکر اسلام کا پنا ہے اور جب یہ طرفدار امید بھجاتی ہیں تو ان کا رتبہ ان شاہزادیوں سے بہت کم ہوتا ہے جو اول اول طبع نہیں مثلاً ملک بارگھندار اور محمود رستم چشم اور برقی والدہ سعد جادو اور برقی لایع وغیرہ۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس داستان کا چونکہ ہر کردار جامد و ساکن ہے اس لئے ان پر دس پندرہ سال کی مدت کچھ اغریہ نہیں کر سکتی۔ مثلاً خضہ بن اسد غازی طلسم ہوشربا کی جلاؤل میں جب اپنے قرائن سمیت لشکر اسد کی مدد کو آتا ہے تو اس کی عمر بارہ برس کی ہوتی ہے اور پندرہ سال گزرنے پر جب جلد بزم میں شریک لشکر طلسم کٹا ہوتا ہے تو اسی طرح کسن ہوتا ہے اور گھوڑے پر اس کی پٹری ابھی تک ٹھیک طور سے نہیں جھتی۔

ایک بات جو عیاروں یا عیارچیوں کی عیاریوں میں سمجھ میں نہیں آتی یہ ہے کہ خواجہ عمر جن کا تذکرہ کاہے کیسے مرثیہ شیر زن عیارچی افزایاب جادو کا بھیس بدل سکتے ہیں یعنی وہ اپنے تذکرہ کو کیا کرتے ہیں، یا صحر جب عمرو عیار کا بھیس بدل کر اور شکل بنا کے لشکر اسلام میں جاتی ہے تو وہ اپنے بوٹے سے قد کو کھینچ کر اتنا لمبا کیسے بنا لیتی ہے۔ اسی لئے ہر مترقران کی عیاری ہمیشہ پسندیدہ سادہ اور ادا لکھی ہوتی ہے، وہ کبھی حرکت کا بھیس نہیں بدلتے اور نہ کسی چھوٹی عیاری میں شرکت ہی کرتے ہیں۔

اب رہا ان مستغزل کا اسلوب بیان:-

ہر سرخسٹرانے زنجیر کرتے وقت نہایت فراضلی سے داستان میں تعریف کیا ہے اور سبھی اضافہ کرتے وقت سلسلہ بیان کو قطع کر کے اس امر کا فخر یہ اظہار کر دیتے ہیں جو ان کا پڑھنے والے کو ناگوار بہتا ہے۔ ان تینوں حضرات میں سے شیخ تصدق حسین میں محفل زیادہ ہے، یعنی اگرچہ اکثر سلیس زبان لکھتے ہیں مگر متقی ہونے کے سبب زبان آج کل کے ناظرین کو تقریباً نامعلوم ہوتی ہے۔ منشی احمد حسین قمر کی زبان نسبتاً علمی ہے۔ سید محمد حسین جاہ کی زبان میں روزمرہ کی چاشنی اور سادگی زیادہ ہے خصوصاً عمر و توں کی زبان وہ خوب لکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ چند بطور لیجئے:-

مفرغام لہدین کرب کا عیار حیرت جادو کے لشکر میں عیاری کرتے گیا، گرفتار ہو گیا، ایک زنجیر میں لنگ گیا۔ حیرت نے سحر پڑھا وہ زنجیر مفرغام کو حیرت کے سامنے لے آئی۔ حیرت نے اسے زنجیر سے چھوڑا اور اچھا بچا کر ایک طلاخچہ ڈھیلے ہاتھ سے اسے مارا کہوٹے تو یہاں کہاں آیا۔ اسے موڑی کہ ٹوٹم تو ہمارا ہو گئے کہ جہاں جادو ہاں ساتھ۔ مفرغام نے کہا میرا بھی جی سیر کو چاہا آپ کے ساتھ چلا آیا مثل جلی آتی ہے کہ گھرا آتے کتنے کبھی نہیں نکالتے، تم نے تو طلاخچہ مارا۔ ملکہ اس بے باکانہ کلام سے منہس پڑی اور کہا ہم اچھے ہی بے مروت ہیں مگر آپ تشریف لے جائیے۔ اس نے جواب دیا کہ کیا میں اس زمین کے مرقی توڑ لوں گا، اتنا اڑانا اچھا نہیں، سیر کو کائے تھے چلے جائیں گے، یا اس مثال کو لیجئے:- "کیران حیرت جادو میں ایک کو احتیاج ہوئی۔ اس نے اپنے ساتھ والیوں کے کہا مینا مجھ کو ہائے ضرور پر جانا ہے کوئی چلتا ہے میرے ساتھ سب نے کہا، مجھ کو ہر راہی ہی جگہ پر احتیاج ہوتی ہے، بھلا یہ کون موقع ہے، ہنشناء آئے تو لے لیں، نہ بی بی ہم سے کوئی نہجائے گا۔ یہ کیا تو نے عادت کی ہے کہ ایک تو آپ جاتی ہے اور دوسرے اور کونے جاتی ہے۔ ایک مورٹنے ان میں سے کہا کہ یہ رعڑی اپنے پیچے چڑنے پر اڑاتی ہے۔ اس ناظرین نے جواب دیا کہ کوئی تمہارا

پوچھنا کہ ساتھ چلو غضب ہو گیا، ہزاروں باتیں ستم نے مجھ پکڑا ہیں، اگر تم میرے ساتھ نہ جاؤ گی تو مجھ کو کوئی کھانا نہ جائے گا؛
گرمب کی زبان عام طور پر نفی ہوتی ہے مثلاً یہ چندش لیس ملاحظہ ہوں :-

”اے مروان عالم سے آنکھیں چا کر، ہم پروا رکھ، غیر سحر کو دیکھ کر بہت بھولا، اپنی حقیقت بھولا؛ یا ملک طلس نے قہقہہ مار کر
آواز دی“ اور فریاد کیا کہ ”ہاں سے باہر ہے ہمارے بندوبست سے نہیں باہر ہے، ہمارا تیرا چلی دامن کا ساتھ ہے، لیکن اب تیرا
گریبان ہے اور زیر الاتھ ہے“ یا پھر :- ”جسے یالی آنکھوں میں سہائی، کبر و غرور کی مزاج میں رسائی، شیطان کا مسک بھائی“۔

ہر حضرت نے تعلیق میں یا ملاحظہ قدرت یا کیفیت عشاق یا رزبیاں میں ایک مہربانی ترکیب استعمال کی ہیں اور ایک جیسا انداز
پایا ہے۔ ہر نازنین کے سخن کی ایک جیسے الفاظ میں تعریف کرتے ہیں مثلاً ”طاؤس طناز، ماہ رخسار گلندار، لکب رشدار، شیریں گنثار، سرو
بوستانِ خرمی، غنچہ حدیقہ، محبوبی، دیوانے ہر جاہ میں غوطہ زن، معشوقِ برفن، رشکِ چمن، عاشق کسی محبوبہ کو پکارتے ہیں ”اے گلِ گلزار
خوبی، اے سرو نوحہ، حدیقہ، محبوبی، اے سرو خراپان، بخششِ لغوی، اے شلخ نہالِ جنت، ان رنگیں مزاجی، ورنہ خواجہ عمر و لغوی کرتے
میں تو، صبح عبارت میں مثلاً ”نہم ہر سپر عیاری، دہر، بردشت طاری، ماہ آسمان مگدای، آفتاب چرخِ خنجر گزای، اگر کسی شاہزادہ کی تعریف
کرتی ہو تو اسد بن کرب غازی کی تعریف کو نو نہ سمجھ لیجئے :- ”شاہبازِ چشموک، عقابِ شکارِ گاہِ جزات و لیاقت، یکتا تازمیدانِ لیاقت،
شہسوارِ مرکزِ ہمت، صاحبِ جاہ و وقار اسد نامدار“۔

عاشق و معشوق کے فراق یا وصال کے بیان میں بھی وہی مشابہت ہے عورت کے سراپا اور وصل کی کیفیتوں کے بیان
کرنے میں کہیں کہیں عربی کے کام لیا گیا ہے، یہ بات شخصیت کے محمد میں جاہ میں پائی جاتی ہے۔

مگر جہاں تفسیق موجود ہے وہاں ناموں کی شوکت اور جنگ کی کیفیت بیان کرنے میں یہ لوگ بہت کمال رکھتے ہیں۔ طلسم
ہو دھڑا میں جب فراہیاب سب طرف سے گھیرا تا ہے تو اس کی آخری لڑائی سے وہ شوکت اور جلال نکلتا ہے کہ ہر کس و ناکس خواہ دشمن خواہ
دوست اس کے سحر سے مغرب ہو جاتا ہے۔ واقعی یہ لڑائی بہت پُر زور انداز میں لکھی گئی ہے۔ پہلو ازل، جادو گروں اور شہزادیوں
کے نام بہت دلچسپ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے نام ملاحظہ ہوں ”شیرنگ سیہ فام سگ پیکر شوک دندان، اژدہ چشم تیر و پیشانی جادو“۔ اس کی بیوی کا
نام یہ ہے ”لغات تیر و فام سیون صورتِ شرن دندان شیر صورت دراز لب بند پیشی جادو“ چند پہلو ازل کے نام جو ایک ہی صفحہ سے لے
گئے ہیں یہ ہیں :- ”توسن اشمب سوار، عیون برف بار، سالار آسمان سیر، منقار کرگدن سوار، اختر گلگون پوش، شیدائے لہنت آواز
ارہم دراز بینی، مہوت شیر پیکر، بہران سحرانرد و وغیرہ“ فقط ان شہزادیوں کے نام ملاحظہ ہوں جو شاہزادہ اسد بن کرب غازی پر عاشق
ہوئیں، ”تربیس الماس پوش، لالان غول قبا، لعل شندان، مولج قطرون، طاؤس چیمپرو، ملکہ نہاید کا کل کشا، ملکہ گلنار گلنار
پوش اور ملکہ خورشید روشن جال“ وغیرہ۔

روزمرہ کو بالکل لکھنؤ کے انداز میں ہے۔ خواہ ماں بیٹی کی گفتگو ہو خواہ کنیزوں کی لڑکچہنک، بیوی خاوند سے لگ کر سے خواہ ماں بیٹی کا بہن کر سے سب نہایت سلیس با محاورہ اور پُر لطف زبان استعمال کرتی ہیں۔ بازاریار کے لوگوں کی گفتگو، فوجیوں کی توڑ تھیں، شہدوں، غیروں اور گھومسیوں کی زبان ان کے اپنے طبقے کی زبان ہوتی ہے مگر ایک نقص منور ہے کہ خواہ حیرت جادو و ملک و مسلمہ ہر شے یا افراسیاب کو دوسری بیوی کر لینے پر کوسے خواہ گچھن جادو و زوجہ باغبان قدرت و وزیر عظم افراسیاب جادو اپنے خاوند سے ہنکار کر کے ان میں اور عام طبقہ کی عورتوں کی زبان اور انداز میں کم فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً حیرت جادو اپنی بہن بہادر جادو کو جو شریک عمر ہے یوں کہتی ہے "ارے تو ناشاد مرے، اپنی جوانی سے جائے تو ٹوٹی میرے وارث کو کوستی ہے، تیری سلطنت کو فناک میں ملاؤں" تجھے گہری گور میں توپوں، ناخوس جادو کے مرنے پر اس کی بیوی نے نتھ اتاری، چوڑیاں توڑیں، لاشہ پر پین کرنے لگی کہ ہے ہے وارث میرے، ہے ہے راج مہاگ میرے۔ اسے میرے سرے بادشاہی جتڑ اٹھ گیا، میرا راج لٹ گیا، اب میں کس کی رہوں گی؟ ہائے افسوس مجھ کو لاندہ کر گئے۔ اسے صاحب کچھ میرے لئے کہہ بھی نہ گئے، اس لوندی سے کیا نصیب ہوئی جو خفا ہو گئے؟

پھر بھی سید محمد حسین جاہ نے جو زبان میں محاسن پیدا کی ہے اور جو نقشے فوجی لوگوں، میاں بیوی، خاوند و کنیز کے کھینچے ہیں، وہ لکھنؤ کی تندہ سب کے آئینہ دار ہیں۔ مثال دیتے وقت ایک جادو گر سے جسے عمر و عیار نے اپنی زنبیل میں کچھ عرصہ قید رکھا تھا، یہ کہلاتے ہیں "عمر و کی قید بدتر از قید فرنگ ہے" فوج میں بھگدڑ پڑی ہے۔ محض میں جاہ اس حالت کو یوں بیان کرتے ہیں "سب سردار بیدل ہوئے، رعایا و غیو اپنا اپنا انعام کرنے لگے کہ شاہ عظم نے ملک کو پکڑا اسگوایا ہے مبادا کوئی آفت آجائے تو اسباب لٹ جائے گا، غفلت میں جان جائے گی، اس سے مناسب ہے کہ اسباب مبادا میں، آپ ٹل بیٹھیں پھر جس راجہ کا مارچ ہوگا دیکھ لیا جائیگا" یہ خالص ہندوستانی افواج کا نقشہ ہے۔

غرض یہ کہ اگر آپ جادو گری اور نامکنات داستان کو ایک لمحہ نظر انداز کریں تو عام لوگوں کی زندگی کے بیان پر دھتے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ لکھنؤ کے اطراف کا حال بیان کیا جا رہا ہے۔

سید فیاض محمد

کاہنی

(۱)

بدن چرائے، نظر جھٹکائے
یہ کون نازک سی کاہنی ہے؟
غرام کا لوچ کیا ہے گویا
ندی کی خاموش راگنی ہے

حسین قیامت کی شونیوں میں
عجب قیامت کی دکشتی ہے
کہ جیسے چمپا کی نرم ٹہنی،
ہوا کی رو میں لچک رہی ہے

نگاہ اٹھ اٹھ کے رُک رہی ہے دراز پلکوں کی چلمنوں میں
کہ جیسے سہمے ہوئے پرندے جھجک رہے ہوں نشیمنوں میں

(۲)

میں آواز خم لبوں سے
پھوار بن کر ٹپک رہی ہے

بست کی چاندنی میں گویا
کُم سے شبِ نم چمک رہی ہے

شباب یوں مسکرا رہا ہے
رُخِ حسیں کی صباحتوں میں
کنول کوئی جیسے کھل رہا ہو
سحر کی دوشیزہ طلعتوں میں

سیاہ زلفوں کی کچھلٹیں مستیوں میں عارض کو چومتی ہیں
کہ جیسے سادون کی غم گھٹائیں افق پہ لہرا کے کھبومتی ہیں

(۳)

عمیق جھیلوں کی ظلمتیں ہیں
سیاہ آنکھوں کی دلکشی میں
شفق کی گلزنگ سرخیاں ہیں
لبوں کی نورس شگفتگی میں

جہاں رُخ کے سلونے پن میں
عجب طلسمی صباحتیں ہیں
ملاحاتِ اندروز تازگی ہے

حباب کی سی نزاکتیں ہیں

ابھی ابھی سانولا تھا چہرہ، ابھی ابھی رنگ کھل گیا ہے
کہ جیسے کچنار کا شگوفہ کہ مینہ برسنے سے دھل گیا ہے

(۴)

جبیں پہ معصومیت کی لہریں
نظر میں عفت کی سادگی ہے
یہ وہم ہے شوق کے فسوں کا
کہ واقعی مکرار ہی ہے؛

لبوں پہ ہلکا سا کچھ تبسم
مگر تبسم ملول سا ہے
ستا ہوا ہے حسین چہرہ
حسین چہرہ جو پھول سا ہے

حیاءیں کچھ ایسی تمکنت ہے کہ سب کی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں!!
اگرچہ حیرت کا ہے یہ عالم دلوں میں سانسیں رُکی ہوئی ہیں!!

ذوقی

سفینہ راحل

تجسسی کی یاد

(۱)

یاد ہے کچھ؟ اے چاند اودہ نقشہ
آئے تھے یاں بر لب دریا
محرم راز ہمارا تو ہے
اک شب ہیں اور وہ بُت ترسا
اور الفت کا عہد کیا تھا
اس لئے مجھ کو پیارا تو ہے!!
عندلیب

(۲)

سکوتِ شام تھا ہم تم تھے دریا کا کمنار تھا
سفینہ چاندنی کا تھا رواں دریا کے سینے پر
جدا ہونے سے پہلے کس قدر دلکش نظر آ رہا تھا
ہمارے عیش کے دن جا رہے تھے اس سفینے پر
تابش

سوزِ ناتمام

(۱)

گلستاں گرمیِ انفاسِ گل سے تہمتا اٹھا
گھر آیا جھومتا، دھو میں مچاتا، برا آزاری
صبا کے ست بھرا انجیر جھونکے پے پے آئے
کہ رُوحِ عشق لے کر زندگانی کا شر آرائی
اور اُس کی پیشوائی کو یہ چشمِ اشکبار آئی
بھلانے پر بھی یاد اُس بے خبر کی بار بار آئی
حاملہ علی خاں

(۲)

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب
چشمک چلی گئی تھی ستاروں کی صبح تک
تارے سے میری ہلکوں پہ قطرے ہر شام کے
مجھ دل زدہ کو نہیں نہ آئی تمام شب
کی آسمان نے دیدہ درائی تمام شب
دیجے رہے ہیں متاثر دکھائی تمام شب
مید تقی

اقبال اور گارڈز

”ایک زندہ سے میرے نام سٹر گارڈز کا یہ خط بہ زبان انگریزی میری فائل میں پڑا تھا۔ اتنا قافیہ ایک ساتھ دو ایسی باتیں پیش آئیں کہ طبیعت خواہ مخواہ مجھ پر گئی کہ اس کا اردو ترجمہ شائع کروں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی ابھی سٹر کوئٹہ کی کتاب ”معانی گارڈز“ پر میری نگاہ پڑی، اسی لمحے خط کو منظر کی شکل میں اس میں پہنچ پایا اور دوسرے یہ کہ اس مضمون کے آخری حصہ میں اس مایہ ناز ہستی کا تذکرہ آگیا ہے جس کے کلمہ جانے کی تکافی کم از کم اس مہدی میں نہیں ہو سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلا مضمون اس مرحوم کی طعنہ شاعر کر رہا ہے۔ آہ — اقبال!“

کوکت

۱

مافی ڈیر سٹر گارڈز!

میں چونکہ انگریزی جریدہ ”ویسی“ کی دنیا میں مرتب آپ ہی کا قائل ہوں، اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ ایک نہایت ہی اہم سوال آپ کے سامنے پیش کروں اور مجھ کو یقین ہے کہ آپ اس کا بہترین جواب دیں گے جس کے بعد ایک طویل مضمون ”ہندوستانی رسالوں کے لئے قلمبند کروں گا۔ سوال: موجودہ ہندوستان میں آپ کس کس کو سب سے بڑا انسان سمجھتے ہیں اور کیوں؟“

خاکسار سیٹھ ظفر احمد کوکت

۲

فلیٹ اسٹریٹ لندن۔

ڈیر سٹر ظفر!

یہ ممکن تھا کہ میں بتا سکتا کہ دنیا نے جدید کے مشہور کار بر کن کون ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں پوچھ کر کہے اور لانا بارج، برنارڈشا اور چارلی چپلن، آڈوٹسکی اور مسولینی اور آئنسٹائن اور رورر فورڈ کے موازنے دنیا کے سامنے پیش کر سکتا لیکن آپ کے سوال کا تشبیہ پیش جواب دینا صرف میرے لئے نہیں بلکہ تمام لوگوں کے لئے غیر ممکن ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اندازہ کر سکتے ہیں، اولاً میں غلطی کا امکان ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا آدمی کسی اور جگہ چھپا رہتا ہے مرنے کے بعد البتہ اس کی شہرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ ٹیکس پیکر کو کہیے۔ کس کو معلوم تھا کہ وہ ایک دن فاکس شہرت کا سب سے بڑا ستارہ مان لیا جائے گا! اس کے مرنے کے دو سو سال بعد اس کی حقیقت معلوم ہوئی اور اس پر طرہ یہ کہ پہلے میل غیر ملکی نقادوں نے اس کو ثابت کیا۔ کیا آپ کو تیار بخ کے اولیٰ بنیں

یا قومی لیڈر نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ دنیا میں ایک ہیجان ڈالنا ضرور جانتے ہیں لیکن خاص طور پر یہ کوئی ایسی بات نہیں نکالتے جس پر مستقل طور پر عمل کر کے آئندہ نسل ترقی کر سکے۔ نوع انسان کا سب سے بڑا فرد بے ظاہر یا کھل خاموش ہوتا ہے۔ اس کی آواز دیر میں پہنچتی لیکن پہنچتی ہے تو اس طرح کہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔

آپ منصفی کا دم طے دے کر یہی سوال اپنی قوم کے اکابر سے کر سکتے ہیں۔ کیا ان کو نہیں معلوم ہے کہ جگدیش بوس، رابندر ناٹک اور اقبال کی آواز جو ابھی دھیمے طور پر ان کے کانوں تک پہنچتی ہے بلند ہوگی اور ایسی بلند ہوگی کہ ہمیشہ ایورسٹ کی پہاڑی کی گویا گویا میرا یہ طویل جواب بھی بالکل ناکافی ہے لیکن آپ سیری مجبوری سمجھ کر مجھے ضرور صاف فرمائیں گے۔

آپ کا

اے۔ ایچ۔ گارڈنر

سید ظفر احمد کوکب

اے ندی

اے ندی تیرے کنارے نہن ڈھلے پانی بھرنے آتی تھی لڑکی کوئی
جب بجاتی تھی تو اپنا جلت رنگ چھوڑتی تھی وہ بھی کوئی راگنی
اور یونہی کھوئی ہوئی سی دیر تک کھیلتی رہتی تھی لہروں سے تری
اب کہاں ہے وہ بتا سکتی ہے تو؟

گیت اُس کا یا سنا سکتی ہے تو؟

تاجور سامری

ریل کاراگ

محافظ نے جس وقت سیٹی بجائی
 سٹیشن سے اُس دم رداں ہو گئی ہیں
 لگی موج میں آ کے بھر نے سپانا
 چملا وہ ہوں سیما پاہوں ہوا ہوں
 مراحل کو پیوستہ لکار ہوں میں
 بصد جوش میں پابجولاں چلی ہوں
 کتے پے سپر میں نے کتنے ہی جل تھل
 عجب زور میں بھر رہی ہوں طرارے
 مری سدا رہ ہے نہ گنگا نہ جمنا
 میں ندیوں کے پل سے گزرتی ہوں بغم
 ہیمیسا نہ آتی ہوں جب دزدناتی
 ہوں پاسبان گوجادہ آہستہ میں کی

بہ اذن سفر سبز جھنڈی دکھائی
 ہوئی تیر بھرا اور دواں ہو گئی میں
 تو میلوں کی منزل کو منٹوں میں کاٹا
 بجولا ہوں آندھی ہوں برق و بلا ہوں
 دھواں دھار گرگرم رفتار ہوں میں
 گرجتی ہوئی شکل طوفان چلی ہوں
 چلم چل - چلم چل - چلم چل
 دہن سے نکلنے لگے ہیں شرارے
 جو منزل سے چلنا تو منزل پہ پھٹنا
 زدم دم - زدم دم - زدم دم - زدم دم
 زمیں کی دہتی ہے یکجہنت چھاتی
 ابھی کھینچ دوں گی ملک میں نہیں کی

بہت کم رہی اب تو منزل بلا شک
 چھکا چھک، چھکا چھک، چھکا چھک

سید حمید کاظمی بی۔ اے
 (ملک)

”سراقبال دے نال میل“

”پیر خانے دے اندر“

علاؤ اقبال علیہ الرحمۃ سے ملاقات کی یہ کچھ تفصیل پنجابی رسالہ سانگ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں چھپی تھی۔ اس رسالے کے ایڈیٹر ایک ہندو مولوی سنسکریٹ، ایل۔ پراسر تھے۔ علاؤ اقبال سے یہ ملاقات غالباً مشرقی ایل پریشر ٹیبلٹ کی تھی جس نے اس جھگڑا کا اعلانیٰ ترجمہ کیا ہے اور حقے الامکان کو کشش کی ہے کہ اصل پنجابی نامدا زبان بڑی حد تک قائم رہے۔ حامد علی خاں

آج ڈاکٹر سراقبال کا نام دنیا میں بڑے فخر سے لیا جاتا ہے۔ سارے ہندوستان کو اس کی ذات پر ناز ہے۔ واقعی اقبال نے پنجاب کو سراسر اچھا کرنے کے قابل بنادیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بہت کم یہ خیال آتا ہے کہ اقبال پنجاب کا رہنے والا اور پورا پنجاب کی کوئی جگہ شاید یہ ہے کہ اقبال کی ساری شاعری اردو یا فارسی زبان میں ہے۔ اور اس میں پنجاب کی زندگی یا پنجاب کی خوبصورتی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی شاعری کا پیغام کسی خاص ملک کے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے ہے۔ اس کی نظموں کے مردوں، عورتوں، پرندوں، جانوروں، گھاس، پھوس، بھجوروں اور پھولوں کی کوئی کوئی حسرت نہیں ہوتی۔ یہ سب خیال کی تخلیق ہیں۔ شاعری ہی انہیں پیدا کرتا ہے۔ شاعری ہی مارتا ہے اور شاعری ہی بجاتا اور اٹھاتا ہے۔ اقبال اپنے خیال کی دنیا میں خیالوں کی آمد و رفت کا تماشہ دیکھنے میں مست ہو چکا ہے۔

میر ترشاد فکر ماہر دم خداوند دگر

خیالوں کا یکمیل اقبال کے لئے شعر و سخن کی بازی سے بھی زیادہ چٹلفت ہے، وہ شاہد کلمات کرنے کی دھن میں لگا ہوا ہے کسی وقت دم بہرے کے لئے وہ جتنے کا ایک آدھ کرش لگاتا ہے اور پھر اپنی بازی میں محو ہو جاتا ہے۔ اسے کسی دوسری بات کی شہ نہ بڑھ نہیں۔ کوئی کا احاطہ دیرا سا ہوا ہے۔ کلاد فاک حوال کی کثرت سے جگہ بڑی اجڑی لگتی ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بیروں کی ایک قطار کسی غارتگاہ کے چھوڑے کی راہ دکھاتی ہے۔ معانیوں کو اس کو دھیان ہے؛ کون یہاں بیٹھا گھاس پھوس لگا گیا کرے بجا کر کے حال کی کسی کو خبر بھی ہو!

ہمیں یاد ہے جب ہم اقبال صاحب سے ملے گئے تو وہ بیٹنگ میں کیف آرام کر رہے تھے۔ سخت کا لڑکھا تھا اور

یہ یہ جاہر منزل سے پہلی کو بھی کاٹ کر ہے۔

پڑانے زمانے کا کالا انگریزی ٹوٹ چنے خُرقی سب سے تھے شکل و موثر سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی یونیورسٹی کے فلسفے کے استاد ہیں۔ پل بھر کے لئے ہم نے سامنے بیٹھے ہوئے دو کونزین سے اکٹھ بچا کر کمرے کی چیمبروں پر ایک نظر ڈالی۔ ہمارے سامنے ہی انگلی پر ملکہ کوٹریا کی تصویر پڑی تھی۔ ہم نے شکر لئے نذر لگایا اور ہم نے اُن سے پوچھا۔ اس تصویر سے کوئی خاص پیار ہے؛ یا کسی خاص مطلب کی یہاں کمی لگی ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا "یہ تصویر ایک دفعہ میرا چھائی کیں سے لے آیا تھا اُس نے یہاں رکھ ڈالی ہے۔ اور یہاں پڑی ہے میں نے تو کبھی خیال ہی نہیں کیا کہ یہ بھی یا نہیں؟ یہ آقبال کا حال ہے۔ وہ اپنی دنیا میں مست ہے اُسے باہر کی چیزوں کے دیکھنے بھلنے کی فرصت ہی نہیں۔"

اُنہوں نے خود ہی ہمیں بائیں ہاتھ کی دیوار پر دو کونزوں کی طرف توجہ دلائی اور ہمیں کر ایک مولوی صاحب کی بات سنائی، "ایک دفعہ ایک مولوی میرے پاس آیا ہوا تھا۔ نماز کا وقت ہوا تو وہ اس کمرے میں نماز پڑھنی شروع کرنے لگا لیکن اُن تصویروں کو اپنے سامنے دیکھ کر رُک گیا اور بولا یہ تصویریں یہاں سے ہٹوا دیجئے؟ میں نے کہا آپ ان تصویروں کی طرف دھیان ہی نہ کیجئے۔ یہ اس جگہ دیوار کا عجیب چھپانے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ لیکن مولوی نہ مانا؟"

ہم نے اقبال صاحب سے پوچھا کہ "آپ کا پنجابی بولی کے متعلق کیا خیال ہے؟" اُن کا جواب یہ تھا کہ "پنجابی بولی اس وقت علمی زبان نہیں، اس میں شریعت کم ہے لیکن کوئی وجہ نہیں کہ شریعت کے لکھے جانے سے یہ علمی زبان ذہن سے پنجابی میں جھکاؤ بہت ہے لیکن اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ عام طور پر کم پڑے لکھے آدمی ہی اسے پڑتے لکھتے رہے ہیں۔ پڑے لکھے آدمیوں کی ہمت اس میں لطافت اور نزاکت پیدا کی جاسکتی ہے۔ پنجابی میں "بنتر" (بنتر) پر بہت کم زور دیا جاتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کا حافظہ کم نہیں رہتا۔ بہادپور کے احمدیہ نے تھوڑی بہت ہمت کی ہے اُس کا دعویٰ ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے بحر قافئے اور ردیف کا اتنا خیال نہیں کیا تھا۔ پنجابی شاعری بڑی بڑیا شاعری ہے اور خاص طور پر جذبات سے بھگی ہوئی ہے۔ پنجابی شاعری کی زبان بڑی سیدھی سادھی نرم اور میٹھی ہوتی ہے، جذبات سچے ہوتے ہیں اور بڑے کھلے الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں لیکن ٹیپوں میں بعض افراط مذاق پست ہوجاتا ہے۔ ایک شعر میں تھکا بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔

جے بئیسری تھک لباباں تے آئی کوئی آب حیات جے پونے لول
یا دت پت جلیب حن دسی پئی کڑاہ تلیو نے لول
(علی حیدر)

مشرق کے دوزخ پنجابی میں خوب بیان کیا جاسکتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پنجابی شاعری میں صرف مجازی عشق ہی ہوتا ہے نہیں بلکہ عشق حقیقی زیادہ ہوتا ہے۔ پنجابی شاعری تعون سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری عشق کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ پنجابی شاعری میں ایک اور خصوصیت ہے۔ اس میں وطن کی محبت کے متعلق بڑے پرجوش گیت ملتے ہیں پنجابی

گیتوں کی بھی کمی نہیں۔ عام لوگوں کے گیتوں اور بولوں کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ امد میں نصرت کی شاعری ہے ہی نہیں۔ مرثیہ ایک میر درد کا ہم لیا جاسکتا ہے۔ امد میں وطن کی محبت کی شاعری اور غوجی گیت بھی نہیں ہیں۔ اس کی غنیمت شاعری میں ہندوٹ زیادہ اور عذبت کا ذکر کم ہے۔ عام لوگوں کے گیت اس میں بالکل نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری برابر اور امیروں اور مصاحبوں کے ہاتھوں میں چلی پھرتی ہے۔ وہ لوگ یا لوارانی تھے یا ایرانی مذاق کو پسند کرتے تھے۔ ان کا میل جول عام لوگوں سے نہیں تھا۔ اسی وجہ سے امدو شاعری میں امیرانہ رنگت آگئی تھی سوہ شعر کہنے کا ایک فیشن سمجھتے تھے۔ شعر کوئی پر قدرت حاصل کرنا ہی شاعر کی خوبی سمجھتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض وفات صرف بھرتا بننے اور ردیف کی خاطر بناوٹی جذبے اور بناوٹی خیال گھڑنے کی ضرورت پڑتی تھی لیکن پنجابی کے لئے امد کی ضرورت کی ضرورت کے پنجابی شاعروں کو اردو شاعروں کی طرح "بنتر" پر قدرت حاصل کرنی چاہیے اور اردو شاعری کی قوت اور پاکیزگی کی پنجابی شاعری میں پیدا کرنی چاہیے۔

ہم نے اقبال صاحب کے بڑے گاڑے یا ترجمین صاحب کے سن رکھا تھا کہ اقبال صاحب پنجابی شعر پڑھنے سننے کے بڑے شوقین ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ غلام قادر کی چھٹیاں سننے ہوئے وہ رو پڑے تھے۔ پھر بھی ہم پنجابی شاعری کا تھینکے ان کی یہ واقفیت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ انہوں نے اردو شاعری سے مقابلہ کر کے دونوں زبانوں کی شاعری کے ملاق کا کلام بیان کر دیا تھا۔ پنجابی شاعری کی بنیاد عام لوگوں کی زندگی پر ہے اور اردو شاعری کی بنیاد امیروں اور مصاحبوں کی زندگی پر۔

اس موقع پر ہمیں بہت افسوس آیا کہ پنجابی کی بہت سی کتابیں گورکھی حروت میں ہیں جس کے باعث لوگوں کو پنجابی کے علمی حوالوں کا حال معلوم نہیں۔ پنجابی بولی کے متعلق اقبال صاحب کے خیالات سن کر ہماری ہمت بڑھی اور ہم نے پوچھا کہ کیا آپ کے لئے بالکل سوال پیدا نہیں ہوا تھا؟ آپ کو پنجابی زبان میں لکھنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا؟

اقبال صاحب نے جواب دیا "نہیں میری تعلیم ہی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ مجھے کبھی پنجابی لکھنے کا خیال نہیں آیا تھا اور میں اب لکھ سکتا ہوں۔"

ہم نے پوچھا "فارسی میں لکھنے کا خیال آپ کو کس طرح آیا؟" انہوں نے جواب دیا "میں نے دیکھا تھا کہ فارسی میں میرے خیالات اچھی طرح ادا ہو سکتے ہیں دوسرے فارسی دنیا کے بہت سے عقیدوں میں بھی جاتی ہے؟"

ہم نے کہا "ہمیں تو بڑا افسوس ہے کہ آپ کے سے جانے اور مانے ہوئے پنجابی نے اپنی زبان میں نہیں لکھا پنجابی کو تو آپ جیسے آدمی کی ضرورت تھی جس طرح گوٹے نے اپنے وقت کی بے حقیقت جڑوں بولی کو دنیا کی ایک ستر علم لٹان زبان بنادیا تھا اسی طرح آپ بھی پنجابی زبان کو ترقی دے سکتے تھے؟"

سزا بقال نے کہا "کوئی بولی بھی ہو لیکن بروست شخصیت اسے بنا سکتی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پنجابی کو بھی کوئی شخصیت دے دے۔" پنجابی گیتوں کا ایک قسم جس میں محبوب کے منہ پر لکھا جاتا ہے۔

گوئے میسا آدمی بل جائے؟

ہم سے یہ پوچھ بغیر درہ گایا کہ کیا آپ نے محسوس نہیں کیا تھا کہ اپنی شخصیت کا پورا اظہار اپنی زبان کے سوا اور کبھی زبان میں نہیں ہو سکتا؟

انہوں نے جواب دیا "میں نہیں مان سکتا کہ اپنی زبان کے سوا آدمی اور کسی زبان میں اپنا مطلب پوری طرح بیان نہیں کر سکتا یہ یقیناً تو یہ ہے کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا خواہ کوئی زبان ہو وصف شش ہونی چاہئے۔ ہر ایک زبان میں کھیا جاسکتا ہے۔ اصل چیز تخیل ہے۔ ہم اقبال صاحب کے اس جواب پر حیران ہوئے کہ ایک شاعر کا یہ خیال ہے کہ آدمی اپنی سچ کی زندگی کا اظہار اپنی بولی میں کر سکتا ہے مگر ہم سمجھ گئے کہ انہوں نے صوفی شاعری کو پیش نظر رکھا ہے جس میں زیادہ تر تخیل کا اظہار صوفیوں کا کیا گیا ہے۔

ہم نے پھر کہا "معاف کیجئے آپ کی یہ عقیدہ کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا ایک ناول یا ڈراما لکھنے والے کیلئے کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ ناول یا ڈراما لکھنے والے کو ہر حال لوگوں کی زندگی سے سابقہ پڑتا ہے۔ اُس کے لئے لوگوں کی زبان سمجھ کر لکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "ہاں ناول یا ڈراما لکھنے کے لئے لوگوں کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص پنجابی ناول لکھ رہا ہے تو کیا حرج ہے اگر وہ پنجابی میں لکھے؟

ہم نے کہا "یکمبج یونیورسٹی کے پروفیسر ریچرڈ کا خیال ہے کہ ایک بیشی آدمی دوسرے ملک کی شاعری سے پوری طرح نطف نہیں اٹھا سکتا۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

اقبال صاحب کے جواب نے ان کی صفائی میں کر دی۔ انہوں نے کہا "میں اپنی شاعری کو شاعری نہیں سمجھتا۔ اصل شاعری صبح کی شادی ہوتی ہے اور وہ ساری دنیا کے لئے ہوتی ہے۔ گفتگو کا نسخ بدلتے گئے اقبال صاحب نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس کا مطلب بابائے نامک کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے:- رُلْ لِّیْ مِنْہٗوْ صُفْیَا بَیْہَا لَیْ

يَا اَهْلَ الْكِتَابِ لَعَنَّا اُولَٰٓئِکَ اِلٰی گِلْمَۃِ سَمَوٰءٍ بِیْسَۡنَا وَ بَیْسَۡنَا کُمْ (قرآن مجید)

مطلب یہ ہے کہ ہم سب خدا کو ماننے میں ہیں۔ ہمیں مل جل کر رہنا چاہئے، اس لحاظ سے جو بھی خدا کو ماننا ہے وہ مسلمان ہے۔

ہم نے کہا "تو پھر آپ کی شاعری میں مسلمانوں سے خطاب ایسے ہی مسلمانوں کے لئے ہوتا ہے؟"

اُن کا جواب تھا "ہاں آپ نے سبک بوجھ لیا ہے؟

ہم کہنے ہی والے تھے کہ پھر آپ اپنی شاعری میں مسلمانوں کے بغیر کسے نام اور ان کی روایتیں کیوں لے آئے ہیں کہ انہوں نے غصہ کیا کہہ دیا "میں اپنے ہندو اور سکھ دوستوں سے کہتا ہوں کہ آپ مسلمان، اہل دیوبند، سیریل کے مسلمانوں کی جگہ بیک ہندو اور سکھ بزرگوں کے نام استعمال کریں گے۔ میں جو مسلمان بزرگوں کے نام لکھتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک مسلمان گھر میں پیدا ہوا اور پورا دل چاہتا ہوں کہ میری تعلیم اسلامی کی تاریخ اور

کیلاش کنول

تراجم از پیام شرق
حسب اجازت علامہ اقبالؒ

(۳۰)
بول از وسط بود و عیش
فزون تر زین جهان کینیت
خودی تعجب کن در یک یک
چو بار باریم مہا خیر

(۵۰)
چو تاب از خود گوی و قطرات
میان سب گم گریب داند کرد
جہانم ہمینو بیاں اپنی
کر گلشن بر تو غلوت خانہ کرد

(۲۰)
لجھاؤ آجھاؤ کے گھیرے بار
نور آؤر گلگشت سے آؤ
اسے نورسنی پورا
آؤر سنس نام
اسے نورسنی پیکر
جہاں کارسنی پیکر حیات
اسے نورسنی پیکر
اسے نورسنی پیکر

(۲۰)
سیپ میں بوند چائے اپنی
سیکڑوں میں موتی کی کلاوے
رکھ ایسی سنگت جیون میں
سیپ کی بجائے گلگت ہو جائے

مقبول احمد پورنی

کچھ مرد بھار کس (بیل گاڑی۔) دالوں سے معاملہ کرنے اور سائی دینے چلے گئے۔ باقی سودا صلت خریدنے جاسے ہیں جچا بھپ چیریں منگانی جارہی ہیں۔ اوڑھنے پھونسنے ٹھیک کر کے ہارے ہیں۔ لات بھر سونے کی فرصت کم بٹے گی۔ آخر مری مرچیں اور قیمہ زنی اور بیسی روپیاں، اشتوا داسم کا اچار بھی تو تیار کرنا ہے! ابھی مرغ نے آمد بیج کا اعلان نہیں کیا، تین ہی بیجے ہوں گے مگر رول اور بچوں نے ناک میں دم کر دیا ہے کہ جلدی گاڑی لاؤ، دیر ہو رہی ہے اتنی دیر جانا ہے، سستی کرو گے تو قطب کیلے پیچھے؟ مرد کسماتے اٹھے اور گرجہ دمقا منی کے ہنسنے پہنچے۔ بھار کس والے بیل جوت ہے ہیں۔ ”کچھ دھری کیا دیر دھارے؟ آسمان کو تو دیکھو، گھٹائی کھڑی ہے۔“

”آئیے مایعاب! بس تیار رہی سمجھئے۔ اسے بخوڑا زلدی (جلدی) کر۔ دیکھ ترون بچا دل کو خود آنا پڑا“

ابھی پونہیں پیٹھی، آسمان کے کناروں پر سیاہ بدلیوں کی گوٹ ٹنگی ہوئی ہے۔ دلی دروازے سے باہر سڑھن کھینچا ہے

”بیچے لین ڈوری بنائے چلی جارہی ہیں۔ بیلوں کے گھنگرو اور گھنٹیاں اور ہنگانے والوں کی شخ، اور بچا کایں سنائی دے رہی ہیں۔ ہلکی ہلکی بھوار پڑ رہی ہے۔ بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مرد بھی ہنسنے لگے گاڑیوں کے دائیں بائیں بیدل چل رہے ہیں۔ جب تھک جائیں گے تو دو گھوڑی کے لئے سوار ہو جائیں گے۔ جنت منتر سے آگے نکل کر عورتوں کی بادشاہت ہے کیوں نہ بڑھتے اتنا کر گھنٹوں کے پیچھے دبا لے ہیں۔ البتہ دو چار بچا چارہ ہیں مگر باقی کیوں چپ رہیں؟ ایک ادھیر عمر کی بیوی بولیں، دلی بوا یاں کونسا گھوڑا غیر مردو ہے جو تم اپنا دم گھوٹ رہی ہو؟“ ون ڈھلتے فیروز شاہ کے کوٹلے، پڑا نئے قلعے، نظام الدین، دلیا اور ہمالیوں کے مقبرے ہستے ہوتے در سے (مصدق جنگ) پہنچے۔ بھوک نے بلایا دیا ہے۔ اس پر غضب یہ ہے کہ بارش کے ایک ایک ٹک جانے سے کچی گرمی پڑ گئی ہے۔ دوپہر کا کھانا نہیں کھایا جائے گا۔ ذرا دم لے کر پھر لباس کرنا ہے۔ ان دنوں مد سے میں میلہ سالگا ہے۔ ہر طرف سیلابی جیوڑوں، خوش باش بے فکروں اور بڑی چھوٹی عورتوں کے جھگمگے ہیں۔ یہ سب بھی سپر کہیں بیٹھ جائیں گے۔ دسترخوان پھیلا دیا گیا۔ سب ساتھ مل کر کھا رہے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں نکال رہی ہیں، کنواری بیٹیاں ایک ایک کے آگے رکھ رہی ہیں۔ جب سب کھا جائیں گے تو سچا کھانا کے جھپٹے میں آئے گا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں ان بچا ریلوں کو اپنے گھوڑوں میں اچھی طرح کھانے پینے دو، پھر تو یہ سادوں کی چرویاں ہیں، کچھ دنوں میں سسرال کا ڈو لا دروازے آگئے گا۔ کون جانے ہاں ان کی جنت میں کیا لکھا ہے! بچے تو پیچھے ہی ہیں، انہوں نے آکر کھول سے اپنے ہاتھ منان لئے ہیں تو کیا ہوا، بڑوں کو دیکھو بچوں میں بچے بنے ہوئے ام چوس چوس کر چھلکے اور گھٹیاں نہر کے پانی میں کیسے خوش ہو بڑھ کر پھینکتے ہیں۔ یہی کون سی ذہنی تو کھانی سب جلدی جلدی سوار ہو گئے۔ پڑوا ہوا چلنے لگی ہے۔ بادل گھر گھر کر آئے ہیں۔ کہیں برس گیا تو کچے گھوڑوں کو لے بیٹھے گا۔ ابھی تو آدھا راستہ باقی ہے۔ ڈرنے ڈرنے چلنا ہی پڑے گا۔ مصلح ابرا کو دھرتی ہی مرنے دے گئے ہیں۔ مرنے والے

کے آس پاس ملازسی رنگ کیا کھل رہا ہے۔ کوئل کی کوک اور سپیہ کی "پی کماں" سن کر بیامی نہیںوں کو سامن یاد آکر رہے ہیں۔ جیکے آنے اور سادون منانے کی غرضی میں ایک دکھ بھری یاد بھی تو شامل ہو گئی ہے۔ مگر کیا کریں، والدین کی غرضی مہم ہے۔

خدا نے بڑی نصرت کی۔ بدایاں ہوا میں تیرتی رہیں اور یل گاڑیاں دونوں وقت ملتے صحیح سلامت قطب صاحب پہنچ گئیں۔ اور جرمیں آج کل کا زمانہ ہوتا تو جان ست ہی ست پر نہ ہوتی۔ موز میں بیٹھے اور آکھ جھپکاتے قطب صاحب پہنچ گئے لیکن اس سے فائدہ تو کچھ نہ ہوتا۔ زلف تو اس میں ہے کہ جھپک رہے ہیں اور بکر رہے ہیں مگر راستہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہونے پاتا۔ بل تو ہی ہولے ہولے ڈلگ ڈلگ چلیں گے۔ قطب صاحب کی پشت پر مہرولی ہے جہاں ان دنوں بڑی رونق اور جہل پل ہوتی ہے جھوٹے چھوٹے بازاروں کے دونوں طرف دو منز لے ہیں۔ نیچے ڈکانیں اور اوپر کوٹھے۔ برسات میں یہ کوٹھے کرائے پر لے جاتے ہیں پچھل کی بھی لکھ لگی ہی تھی کہ ایک نور کا کڑا کا ہوا اور آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی چپک لیاروں پر سے پلتی ہوئی ایک کھٹ غائب ہو گئی۔ پھر تو چھوٹے جہاں بانی پڑ گیا، گویا اب بس کہ پھر کبھی نہ برے گا۔ صبح ہوتے تک دھائیں مانگی گئیں۔ اُٹھی ابھی جھڑی نہ لگے ورنہ ہم چار یوں کا سزا کر کر رہا ہو جائے گا! اشتریاں عورتوں کی دعا جلدی قبول کر لیتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھواں دھار طوفان بولندا باندی ہو کر رہ گیا۔ دکانیں کھل گئیں، لوگ باگ ادر ادر صر پھرنے پھرانے لگے۔ بازاروں کی گھاگھی سیو تفریح کی دعوت دینے لگی۔ مزدوروں کے گرد بیٹھتے ہیں۔ روے میدے کے پرائے اور بین کی روٹیاں کچا کر لونگ چڑھے، شامی کباب، آم اور جامین خریدیں گے۔ اتنے میں عورتیں چٹنی، اچار اور سادون تیار کر لیں گی۔ پھر کچھ گھر پر رہیں گے باقی سیر کے لئے نکلیں گے۔ کم از کم آٹھ دس دن ٹھیرنا ہے اس لئے باری باری سب ہی میر کر لیں گے۔ کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ پھر کوئی منڈکیوں بچلائے۔

شمسی باغ کے پیچھے اندھیری باغ میں بڑی بہار ہے۔ دنی لٹلے میلے پھیلوں کے صیا برسات کا لطف اٹھانے آئے ہیں۔ سارا باغ آم اور جامن کے درختوں سے چاڑھا ہے۔ امروں میں آج کل کوئے کوئے اور چتے چتے پر بہا ہی ہے۔ کم گڑے ہیں، جھوٹے پڑے ہیں، اکڑا ہیاں جڑی ہوئی ہیں۔ پکوان ہوسے ہیں۔ گھٹا جھوم جھوم کر چھا رہی ہے۔ پھوڑ بھی پڑنے لگی ہے لڑکی بالیاں جھولنے میں مشغول ہیں۔ پیٹنگیں بڑھانی جا رہی ہیں۔ سنہنی مذاق ہو رہا ہے۔ رنگ برنگی کپڑوں اور رنگا رنگی جھولوں نے عجیب سماں پیدا کر دیا ہے۔ جھولنے والیاں ہولے ہولے گاتی بھی جاتی ہیں۔ کنواری بچھول کا گیت سنئے۔

نبی نبی بوندیاں رے سادون کا مورا جھولنا

ایک جھول لاڈ لایا میں نے اموا کے ڈال پر چھوٹی بڑی پیٹنگیں سے سادون کا مورا جھولنا

نبی نبی بوندیاں رے

بیامیوں کا گیت مختلف ہے:۔

جھلوا جھولت ناگن ڈس گئی اور ڈس گئی انگلی کی پور
 ساس جی سے کیڑتا ہے پنیاں لگوں اور نند جی سے کیڑو سلام
 سیال جی سے کمنٹ ناگن ڈس گئی جھلوا جھولت ناگن ڈس گئی
 کوئی زیر لب یہ الاپ رہا ہے:-

چھائی بدریا کالی

اور کہیں سے یہ گانے کی آواز آ رہی ہے:-

جھولاکن نے ڈالورے امریاں

دو ٹنکھی جھولیں، روہی جھلایں، چاروں بل لگیاں - شوخ رنگ ستیاں، بھول بھلیاں

جھولاکن نے ڈالورے امریاں

باغ اندھیری اتال کن سے، مڑلا جھنگارے - بادل کاسے بن لگیں بونیدیں بھولیاں بھولیاں

جھولاکن نے ڈالورے امریاں

قلب صاحب اور مولیٰ کی سیر کے بعد دوسری جگہوں کا نمبر ہے۔ ادھر جوں خاص اور منصور کا مقبرہ اور ادھر قلع آباد اور اوکھلا خاص مقامات ہیں۔ جھلایہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قلب کی لائن تک آئیں اور ان یادگاروں کی سیر نہ کریں؟ بھری برسات ان مقامات پر رنگ رلیاں اور چین رہتے ہیں۔ لوگوں کی آجاریں کوئی فرق نہیں آتا، بلکہ جل جل گھٹائیں زیادہ کالی کالی اٹھتی ہیں سب جاتی جہیزوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔

برسات اب بھی ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جو لطف اگلے وقتوں کے جاہل اور غریب لوگوں نے اٹھایا ہم ترقی یافتہ اور دولت مند لوگ قیامت تک نہیں اٹھا سکتے۔ وہ یہ ہے کہ اس وقت لوگوں کے پورے ترستے۔ وسیلی بارہ آنے کا تھتے، تو پاؤں جی جمع بھی کرتے تھے۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ روپیہ کی آمدنی ہو تو سواروپیہ خرچ پھر ان کا دل بڑا تھا اور وہ خوشی کے وقت خوش ہونا جانتے تھے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ خوش ہونا چاہیں تو بھی معذہ میں۔ اُن کے سینوں میں طاقت اور جسم میں جان تھی۔ اسی لئے اُن کے قہقہے دیوار کے پیچھے تک سنائی دیتے تھے۔ برسات اس کے ہماری ہنسی مدقوتی کی کھانسی سے یادہ نہیں۔ بس بھائی! رات جا چکی صبح کا ستارہ جھللا رہا ہے۔ صحبت خب کے افسانے ختم ہوئے۔ اب پل چلاؤ گا وقت ہے۔ ہم بڑے عاتے قبول میں پیر لٹکائے موت کے منتظر ہیں۔ کچھ ہم نے سنا اور دیکھا تو اگلے وقتوں کے میلے نیلیوں کبیل

تماشوں، رنگ رلیوں کی ایک جھلک دکھا بھی دی، کل کوئی یہ جھلک دکھانے والا بھی نہ ہوگا۔

سچ تو یہ ہے، بد نصیب دلی کی داستانیں اسکوئی کتنی ہی عمدگی سے سنائے، ان میں وہ عداوت اور پاکیزگی نہیں جو دلی کے اُس ازلی پرستار کی تحریرِ تقریر میں تھی جو علامہ راشدِ انجیریؒ کی سہیت میں جلوہ آرا ہوا اور اُن خاکے میں اُن اکرار سے جو خواجے۔

صادقِ انجیری

غزل

تمہاری یاد میں ہے روح بے قرار ہنوز ہے اشکبار مری چشم انتظار ہنوز

مرے چمن پہ ہے چھائی ہوئی خزاں ابتک مری خزاں نہیں شرمندہ ہزار ہنوز

اگرچہ مذتیں گزریں تمہیں بھلائے ہوئے تمہارے نام پر آتا ہے پھر بھی پیار ہنوز

اگرچہ مذتیں گزریں نہیں سلام و پیام مگر ہے دل کو کسی شے کا انتظار ہنوز

لولِ روح میں کوئی خلا سا رہتا ہے اُسی طرح دلِ محروم ہے سوگوار ہنوز

وہ شرحِ دردِ محبت جو میں نے کی تھی کبھی اُس اک خطا پہ ہوں میں آہِ شرمسار ہنوز

اگر دلوں کو نہ تھا کوئی ربطِ آپس میں

تو پھر ضمیر ہے کیوں روح بے قرار ہنوز

سید ضیاء جعفری

اختلاج کے لمحے

دوستو! اس بے دلی کا بھی ہے کیا کوئی علاج؟
 بولتی ہے فاختہ ہوتا ہے مجھ کو اختلاج
 چاندنی راتوں میں جب آتی ہے کونل کی صدا
 چھاؤں میں تاروں کی اکیوں دم اُجھتا ہے مرا
 جھٹپٹے کو گاؤں میں مڑتے ہیں جب روشن چراغ
 دیکھ کر اُن کو اُبھر آتے ہیں کیوں سینے کے درغ
 جھوم کر آتی ہے جب برسات کی پہلی گھٹا
 دل پہ چھا جاتی ہے کیوں رقت یہ کیا ہے باجرا
 مطربوں کے راگ کیوں دل میں جُھجکتی ہو چٹس
 جب سنتی ہیں ہوائیں کیوں اُکھڑ جاتی ہو سٹس
 شعر سن کر اُجھتا ہے دم یہ کیوں بے اختیار
 اشک بھرتے ہیں کیوں جب شب کو بختا ہوتا
 جب کوئی ماضی پہ کرتا ہے خیال آرائیں
 وہ کیا ہے سرد پڑ جاتی ہیں میری انگلیاں

قہقروں کو سُن کے میں آنسو بہا دیتا ہوں کیوں؟

جب کوئی کرتا ہے ماتم مسکرا دیتا ہوں کیوں؟

جلال ملک پانی

انقلاب ایران کا ایک شاعر

آزادی تقریباً ایشیا کے کسی شاعر کے جیسے میں نہیں آئی۔ ان کی فہمت میں کسی بے راہ روی کی مع خوانی ہے یا کبھی حقیقی یا خیالی معشوق کی استمال ایسی۔ مگر مغیران سخن سے کوئی زمانہ خالی نہیں۔ ہر بلا انجیر۔ دور میں جب بیدار و ستم کی حکومت ہو۔ فرعون طاعتیں سر بلند ہوں اور سچی بات کرنے پر زبان کٹی ہو، کوئی مرد خدا رسوم شاعری اور آداب مدح کو بلائے طاق رکھ کر سیدئے حق بلند کرتا ہے، ایسی مثالیں کم ہوں مگر ملتی ضرور ہیں۔ ہر فرعون کو ایک نمونہ اور ہر فتنہ کو ایک ربانی قوت سے زیر ہونا پڑتا ہے۔ فارسی شاعری کی تاریخ بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ فتنہ تاتار کو جس بیباکی سے سعدی نے لکھا تھا اسے کون نہیں جانتا اور فتنہ قاجار کو جس طرح ادیب الملک اتہری نے دعوتِ مقابلہ دی اس کا بیان ان نمونوں میں آئے گا۔

خاندان قاجار اپنے آخری دور میں جنگیہ اور بلا کو کی تباہ کاریوں کی یاد دلاتا ہے۔ اگرچہ روسی جنگوں نے شاہی قہار کو خاک میں ملا دیا تھا اور ملک پہ در پہ شکستوں سے کمزور ہو چکا تھا اور خزانہ مصارف جنگ اور شاہی اسراف کا قفل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن قاجاری غور و حسب دستور و فرعون و فرعون کی روایت کو تازہ کرتا رہا، شکست خوردہ شاہ کی بد نصیب رعایا صبر و کمزوریوں سے دوچار اور زہر و گدازِ ظلم کا شکار ہوتی رہی۔ ایک عرصہ تک ان انسانیت سوز مظالم کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہوئی مطلق العنان شاہ اور اس کے نالائق مشیر خداوند مطلق بنے رہے اور جمہورِ فرخ کے گھونٹ پی کر میہ کرتے رہے لیکن آخر صبر کا یہ اندلبریز ہو گیا اور حق اپنی بے سرو سامانی کی پروا نہ کرتے ہوئے باطل کی قوتوں سے معکوز آ رہا۔ حق و باطل کی اس جنگ میں سب سے پیش پیش ادیب الملک شیخ اتہری فراہم فرماتے تھے جنہیں اپنے وقت کا سعدی کہنا چاہئے۔ کیونکہ شیخ شیراز کی طرح شیخ فراہان بھی انعام و اکرام کی طمع سے بیباک ہو کر قید و بند کی سختیوں کو خاطر میں نہ لا کر اعلانِ حق کرنا اپنا فرض ہی نہیں بلکہ مقصدِ حیات سمجھتے تھے۔

حق پرست اتہری نے اپنے مقصدِ زندگی کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے:

- ۱۔ براہِ کرم اگر بخت نیرودہ دہ ستارہ مرا فالِ نمیکو دہد
میرا ارادہ ہے کہ اگر بخت یاد ہو اور ستارہ نیک ہو (نور)
- ۲۔ براہِ کرم زمینِ بخت بیداد را بچھودوں زخمِ پایہ داد را
ظلم و ستم کو جزو سے اکھیڑ دوں اور انصاف کا نام بلند کروں

۳۔ جی تو گرنی کا سجا حدیقۃ الموت است
جہاں سرور کی جگہ نیرہ اور سرور کی جگہ نیرہ

۴۔ بجائے نادرول بید لال طبعیدہ بجز
بجائے سرور والی جگہ خوں شدہ دل ہیں

۵۔ ریاضیں آں ہمہ آگندہ از بلاد نعیم
حیاضیں آں ہمہ انباشتہ بزم و شرنگ

۶۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۷۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۸۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۹۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۱۰۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۱۱۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۱۲۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۱۳۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۱۴۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۱۵۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۱۶۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۱۷۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۱۸۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۱۹۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۲۰۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۲۱۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۲۲۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۲۳۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۲۴۔ نریں اشک یتیمیاں و خون نعل کولیاں
تیموں کے آفسوں دل رہے گناہوں کے خون

۳۔ زین تجارت آتشم در دل زوزد چونکہ سینم
 سود سوداگر ز سوسے حسرت مغبول زکیو
 اس تجارت کو دیکھ کر سدا دل مل جاتا ہے
 کہ ایک طرف سوداگر نفع اٹھاتا ہے دوسری طرف غم کمال گیا ہے وہ دہتا ہے
 تیسرے شعبے میں ان وطن فرغوں کی طرف اشارہ ہے جو شیروا کتاب کی سرزمین کا انکار کے حوالے کرنے پر فرماندہ ہو گئے تھے۔
 شیخ فراہان وطن کی حفاظت کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا ہر شعور وادہ جذبات کو ابھارتا ہے اور قوت عمل
 کو اکٹا ہے۔ اس کا ملوہ اور پرچوش انداز تحریر اخروہ کائے بغیر نہیں رہتا۔ ہر ایرانی کا دل اس کے اشعار سن کر تڑپتا ہے اور ایران کے
 ہر گوشے میں اس کا نغمہ جنگ گونجتا ہے:-

- ۱۔ زمر دل میں دلش با عزم باش شب و روز آمادہ زرم باش
 محنت سے ڈرو اور لادلوں کو کڑو رو نہ دو۔ ہر وقت جنگ کے لئے کمر بستہ رہو
- ۲۔ چرا باید اندیشہ کردن ز جنگ نہ ما از کلوزیم و دشمن ز سنگ
 جنگ سے ڈرنا فضول ہے۔ نہ ہم کچی مٹی کے بنے ہیں اور دشمن چھرے
- ۳۔ چرا تن بر تنخیر دشمن دہیم بزندان اہریمیں تن دہیم
 ہم دشمن کی زنجیروں کو کیوں سنبھل کریں اور اس کے زندان میں رہنا اختیار کریں
- ۴۔ گراورا بود دست و شمشیر تیور ترا ہم بود دست و شمشیر نیز
 اگر اس کے ہاتھ ہیں اور ہاتھ میں تلوار ہے تو تمہارے بھی ہاتھ ہیں اور تمہارے بھی تلوار ہے
- ۵۔ مہر دستی نام ہنگام جنگ مہر دل ز نام و مدہ تن بہ رنگ
 جنگ کے وقت صلح کا نام نہ دو۔ دل سے حرکت کے خیال کو دور نہ کرو اور بے غیرتی قبول نہ کرو۔

ان اشعار سے اس نتیجہ پر نہ پہنچنا چاہئے کہ شیخ فراہان کو جنگ کے شعلوں سے عشق ہے اور وہ ہر حالت میں امن سوزی کو بجا سمجھتا
 ہے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ وہ جنگ کو باہر مجبوری اختیار کرتا ہے، وہ جنگ کا نہیں بلکہ ان قابلِ قدر اصولوں کا شہید ہے جن کے لئے
 جنگ کی جاتی ہے، جن اصولوں کی قیمت ان لاتعداد جانوں سے بھی زیادہ ہے جو جنگ میں قربان کی جاتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں جب جنگ
 کے میسٹائل فضا میں منڈلا رہے ہیں شیخ فراہان کا کلام آفتابِ ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ کو جنگ کی تباہ کاری اور ہلاکت آفرینی کا
 پورا احساس ہے اس لئے وہ اس کا نقشہ کھینچنے کے لئے ایک صحیح اور سبق آموز سپر ایما اختیار کرتا ہے، ذیل کے اشعار کسی موجودہ یا آنندو
 کی جنگ پر صادق آئیں گے۔

بہم زندہ منزل و ماوا ہے یکدگر ویراں کند خیمہ و حرگا و غلش تن
 ایک دوسرے کے گھروں، شہروں اور اپنے خیمہ و حرگا کو تباہ کرتے ہیں

مختل ادب

اطائف اقبال

(جناب فضل کریم صاحب زلانی بی لے)

حسرت صاحب کو اصرار ہے کہ میں اقبال کے تعلق کچھ لکھوں اور مجھے اُردو نویسی کی مشق نہیں۔ علامہ مرحوم کے ساتھ میری گفتگو عمرِ دینی یا سیاسی مباحث پر ہوا کرتی تھی اور یہ دونوں موضوع شیرازہ کے لائحہ عمل سے باہر ہیں۔ اس ازراہ امتثال امر صرف دو لکھ لکھنے پر اکتفا کروں گا۔ جن سے اقبال کی سیرت اور عقاید پر روشنی پڑتی ہے۔

آنحضرت صلعم سے عشق :-

۱۹۳۵ء کے گرامیل ختم نبوت کی بحث بہت گرم تھی۔ علامہ مرحوم نے اس سال کے ماؤنٹی میں قادیان میں کے خلاف ایک بیان دیا تھا۔ جس نے اس جماعت کے دونوں رفیقوں کو ڈاکٹر صاحب کے ناراض کر دیا تھا اور انہوں نے ایک لایعنی بحث چھیڑ دی تھی یا نہیں علامہ مرحوم نے کس غرض سے طلب فرمایا تھا۔ آسانیا دے کہ گفتگو زیادہ تر ختم نبوت کے مسئلہ پر ہوئی تھی۔ آپ نے مقام نبوت پر تصور کرتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی سیرت کے ایک واقعہ بیان فرمایا اور کہا حضرت ابو بکرؓ سے کبھی نے پوچھا۔ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ زیادہ محبت ہے، یا اللہ کے رسول کے ساتھ۔ ایک شکست زاہد نوعمر بانی جواب دے گا کہ مجھے اللہ کے ساتھ زیادہ محبت ہے، کیونکہ رسول کے ساتھ زیادہ محبت اس کے نزدیک شرک ہوگا لیکن حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، مجھے اللہ کے رسول کے ساتھ زیادہ محبت ہے۔ کہنے لگے رسول اللہ کی ہر شے پہلے ہم بھی ہیں تھے اور اللہ بھی ہمیں تھا۔ اس نے ہم کو پوچھا نہ ہم نے اس کو پہچانا۔ اب جو اللہ کا رسول آگیا تو ہم نے اللہ کو پہچان لیا اور اللہ نے بھی ہم کو پہچان لیا۔ علامہ مرحوم نے فرمایا میں نے یہ واقعہ میں بیان کیا ہے چنانچہ آپ نے دوشعر منائے۔ علامہ مرحوم کو آنحضرت صلعم سے عشق تھا اور یہ ایمان ہے کہ حضور صلعم سے عشق ایک انسان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ آپ نے ایک شعر تو صاف پڑھ لیا۔ تیسرے مصرع پر رقت طاری ہوئی۔ لگائی بندھ گئی۔ آپ لکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بڑی شکل سے شعر پورا کیا۔ شعر روزِ پنجادی میں ہیں :-

بس گری بادِ مدینِ پیگر
از خدا محبوب تر گرد و نبی

مسخی حرفِ کئی تعجبِ پیگر
تو تلب و جگر گرد و نبی

الارض للند

علامہ مہر مہر نے ایک دن ذیل کا لطیفہ بیان فرمایا۔

جنگ سے غالب پہلے یا شاید جنگ کے دہل کا واقعہ ہے پنجاب گورنٹ انڈیا پر ملے جات تقسیم کر رہی تھی۔ میں ان دہل تارکلی میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن مغربی پنجاب کے ایک پیر صاحب تشریف لائے۔ عموماً آیا کرتے تھے، شریف آدمی تھے اور سیرانی کی بدینہ ملاقات تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان پیر صاحب کا نام و مقام بھی بتایا مگر مجھے یاد نہیں رہا۔ کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب مجھے لکھنے و لکھنے کو بھیج کر مجھے کچھ مرے دیئے جائیں۔ میں نے کہا۔ یہ بھی آپ نے دریافت کر لیا ہے کہ زمین کس کی ہے؟ پیر صاحب میرے سوال سے کچھ پریشان سے ہو گئے اور جلدی میں کہنے لگے۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا۔ پہلے آپ یہ دریافت کر آئیں کہ زمین کس کی ہے۔ پھر میں درخواست لکھ دوں گا۔ چنانچہ پیر صاحب چلے گئے، دوسرے دن پھر آئے اور کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کا سوال سمجھ میں نہیں آیا۔ زمین گورنٹ کے ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ زمین گورنٹ کی اپنی ہی ہوگی۔ میں نے کہا۔ شاہ صاحب ایک کتاب ہے بہت پرانی، اس کو لوگ قرآن کہتے ہیں۔ ایک شخص ہمارے یہاں سے دُور ملک عرب میں ہوا ہے، اس کا نام تمام معلوم، یہ کتاب اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی، اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ہے۔ اب آپ فرمائیں تو میں اللہ تعالیٰ کے نام پر جی لکھ دیتا ہوں۔

پیر کے سینے میں ایمان کی رسد بھی باقی تھی، وہ بے حد متاثر ہوا اور کہنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کوئی درخواست نہ کیجیے میں زمین کے لئے انگریز سے درخواست نہیں کروں گا۔

اتفاق سے پیر صاحب کو دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں فوج میں ان کے بہت سے مرید تھے۔ انہوں نے پیر صاحب کی ضیافت کی۔ جس میں اپنے انمول کو بھی بلایا جن میں کمانڈر انچیف بھی تھا۔ کھانے کے بعد کچا یک ایک مرید نے اٹھ کر تقریر کی کہ ہم سب لوگ ان پیر صاحب کے مرید ہیں۔ ہمارے پیر کو زمین ملی چاہئے۔ کیونکہ ان کے لنگر کا خرچ بہت زیادہ ہے، فوجی افسر سادہ لوح ہوتے ہیں اور ان کو اسے سہا پیوں کی ملاقات کا بہت خیال ہوتا ہے۔ قبضہ منظر کمانڈر انچیف نے اپنے طور پر سوسائٹل اور ڈائریکٹ گورنٹ پنجاب کو لکھا اور پیر صاحب کو اس مریدہ زمین البیہ درخواست مل گئی۔

شان بے نیازی

علامہ مہر مہر کو کچھ دن ریاست بامول پور کے تالوئی شیر بھی رہے تھے۔ ایک دفعہ ریاست کے کسی کام پر ان کو وائسرائے سے ملاقات کے لئے دلی جانا پڑا۔ عدالت ملاقات میں وائسرائے نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ کل شام کو کھانا آپ کے ساتھ کھا میں۔ وائسرائے کی محنت اہل جاہ کے لئے بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اس تہم کی دعوت حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے جاتے ہیں

پھر ان دعوتوں کا استمار اخباروں میں شائع ہوتا ہے۔ سرکاری گزٹ نکلتا ہے اور جن کو بغیر حاصل ہوجائے، وہ اس گزٹ کو خرید کر بنائے دیکھتے ہیں اور پشت در پشت اس گزٹ کی حفاظت کرتے ہیں لیکن ۵

گدا گداے دیکھو کی شانیں بے نیازی دیکھو پہنچ کے چشمہ جیواں پر توڑتا ہے سب کو
علامہ مرحوم نے والٹر لے کی دعوت کا جواب دیا۔ میں کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔ میں تو آج شام کو لاہور واپس چلا جاؤں گا۔ والٹر لے
نے امر کیا کہ ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ کل چلے جانا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اگر آپ کو کھانا کھلانے پر بہت اصرار ہے۔ تو آج شام کو کھانا
دینے تاکہ میں رات کی گاڑی میں سوار ہوسکوں۔ لیکن کل تک تو میں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ اُدھر سے اصرار اُدھر سے انکار۔ آخر والٹر لے
مجبور ہو گیا، اور پہلے کے تمام انتظامات کو دور ہر ہم کر کے ڈاکٹر صاحب کے لئے کھانے کا جلدی جلدی اسی دن انتظام کیا گیا اور ڈاکٹر
صاحب کھانے کی رسم ادا کر کے اسی شام لاہور روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچنے پر ان کو دیا ست کی طرف سے ایک تار ملا کہ فوراً ہمدان پور
پہنچو۔ ڈاکٹر صاحب کو تار دیکھ کر سخت غصہ آیا۔ کہنے لگے ان کشتوں نے مجھے اپنا لاکڑ سمجھ لیا ہے۔ میں نہیں جاؤں گا جتنا سچہ ایک کھار
روپیہ ہمارے کی آمدنی پر لات مار دی اور استغناء بھیج دیا۔

شیخ زادہ

ڈاکٹر اقبال

(علی بخش کی زبانی)

(۲)

میاں علی بخش کا تادم ہے کہ وہ علامہ اقبال کی زندگی کے حالات بیان کرتے کرتے غیر متعلق باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں خبر
اس کا تو یہ علاج ہے کہ لکھتے وقت ان باتوں کو قلم انداز کر دیا جائے، لیکن ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ کسی ترتیب کے حالات بیان
نہیں کرتے بلکہ عشوائے کے ملاقات بیان کرتے کرتے دفعتاً سن ۱۹۳۰ء کے حالات بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا
ہے کہ علامہ مرحوم کی زندگی کے کسی پہلو کے متعلق انہوں نے ایک ملاقات میں چند باتیں کہیں اور چپکے ہو گئے۔ دوسری ملاقات میں ان کا
موضوع کے متعلق چند اور باتیں بیان کر گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ سوانح نگاری کے عام اصولوں کے پیش نظر ان تمام باتوں کو یکجا اور
ایک خاص ترتیب سے بیان کرنا چاہئے تھا لیکن اس طرح یہ مضمون میاں علی بخش کا بیان نہ رہتا بلکہ ڈاکٹر صاحب کے مزاج و
حیات کی ضرورت اختیار کر لیتا۔ اس لئے ہم نے کسی ترتیب کا خیال نہیں رکھا بلکہ میاں علی بخش نے جو جو باتیں کہیں ہیں انہیں
اسی طرح غلط فہم نقل کر دیا ہے۔

حضرت

یہ بات نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو اچھے کھانے کا شوق نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ بہت خوش خوراک تھے۔ دسترخوان پر ہمیشہ دو

تین تہم کاساں منور ہوا کرتا تھا۔ البتہ وہ کھاتے بہت بخورٹا تھے۔ عام طور پر ہر ایک وقت کھانا کھاتے تھے۔ بہت ہزاروں رات کو نکلین چائے پی لی۔ صبح کو چائے بھی نہیں پیتے تھے۔ اکثر اوقات کچھ کھائے پئے بغیر کالج چلے جاتے تھے اور دوپہر کو آکے کھانا کھاتے تھے۔

خشک ان کی طبیعت کو اس نہیں آتا تھا۔ اس لئے وہ عام طور پر روٹی ہی کھاتے تھے۔ شب بیک کا بہت شوق تھا اور شب بیک ہمیشہ خشک کے ساتھ کھاتے تھے۔ آخر آخیں صبح کو چائے بھی پینے لگے تھے اور بلاشبہ بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے صبح کی نماز اور قرآنی خوانی مدرسے ان کا معمول تھا۔ قرآن بلند آواز سے پڑھتے تھے، آواز ایسی شیریں تھی کہ ان کی زبان سے قرآن سن کر بچوں کے دل پانی ہو جاتے تھے۔ یہاں کے زمانے میں قرآن پڑھنا چھوٹ گیا تھا۔ نماز بھی کم پڑھتے تھے۔ موت کے کچھ عرصہ پیش ہی مجھ سے کہنے لگے۔ علی بخش میرا بھائی چاہتا ہے کہ آج نماز پڑھوں۔ میں نے کہا۔ آپ ہلنگ پڑھیٹھ جائے۔ میں آپ کو وہیں بیٹھے بیٹھے وضو کر دیتا ہوں۔ وضو کر چکے تو میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب میں نے ہر صاحب کو لیٹھ لیٹھ نماز پڑھتے دیکھا ہے خدا جانے یہ کیا بات ہے؟ کہنے لگے، ہاں مجبوری کی حالت میں یہ بھی جائز ہے۔

جن دنوں ہم بھائی دروازہ میں رہتے تھے ایک دفعہ وہ پچیس دو مہینے بڑی باقاعدگی سے تہجد کی نماز پڑھتے رہے۔ ان دنوں ان کا عجب حال تھا۔ قرآن اس خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے تھے کہ جی چاہتا تھا بس سارے کام کاج چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اس کے پاس بیٹھا رہوں۔ اس زمانہ میں کھانا پینا بھی چھوٹ چکا تھا۔ صرف شام کو تھوڑا سا دو دو چینی لیا کرتے تھے۔ خدا جانے اس میں کیا برکت تھی۔ جوانی میں ورزش بھی کرتے تھے۔ بھائی دروازے والے مکان میں تو صبح سویرے اٹھ کر ڈنر پلینا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی مگدر بھی ہلاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اونٹیل کالج میں پڑھتے ہی دن ہے، وہاں سے گورنمنٹ کالج میں چلے گئے۔ اس زمانے میں سید تقی شاہ۔ بلاویر انجمن، فقیر افتخار الدین اور شیخ عبدالقادر سے ان کا بڑا میل جول تھا۔ مولوی حاکم علی سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن ان کے وقت کا زیادہ حقد۔ لیکن پڑھنے میں مصروف رہتا تھا۔ لکھتے کم تھے۔ پڑھتے زیادہ تھے جس کی وجہ سے وہ سوتے تھے اس میں ایک بڑی ہیر پرکٹا نہیں پڑی رہتی تھیں کبھی کبھی میرا ان کا بل کتا بل کو ترتیب کے الماری میں رکھ دینے کا ارادہ کرتا تھا تو لکھتے تھے انہیں پڑا رہنے دو۔

کانگریس کے زمانہ میں لاہور بھی بڑی آفت آئی۔ شہر میں بہت سے مکان گر پڑے۔ ہر طرف کھربم بچا ہوا تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ کبھی گھر آکر کھٹے پڑھ دیتا۔ کبھی بیٹھے آکھاتا تھا جب زلزلہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں جا رہا تھا پڑھنے کا باب پڑھ رہے تھے۔ لیکن جس طرح لیٹھ تھے۔ اسی طرح لیٹھ رہے۔ ذرا بے چلتک نہیں۔ ہاں یہی بے تابی دیکھ کر لکھتے تھے کہ

پڑھتے پڑھتے سر اٹھایا اور کہنے لگے۔ علی بخش! ایوں بھاگے بھاگے نہ پھرو یہ طریقوں میں کھڑے ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر پھر ہی اطمینان سے کتاب پڑھنے لگے۔

زلزلہ کے بعد میں گھر سے نکلا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے دوست شیخ عبدالقادر کا مکان گر پڑا۔ شیخ صاحب اس وقت لڑایت میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ خبر سن کر بہت افسوس ہوا اور اسی وقت انہیں یہاں کے سارے حالات لکھ بھیجے۔

ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب پڑنگ پر بیٹھے ہیں۔ سامنے کاغذ اور پینل ہے۔ کبھی کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ کبھی کاغذ پینل سے کچھ لکھ لیتے ہیں۔ کبھی پیشانی پر پل پڑے ہوئے ہیں اور سر جھکا ہوا۔ کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہے ہیں اس وقت تو میری نگاہ میں کوئی بات نہیں آئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب شاعر ہیں اور ان کے شعر کہنے کا یہی انداز ہے۔ لیکن اہل بات یہ ہے کہ شعر شاعر اور شاعری کا مطلب بہت دیر کے بعد ہی سمجھ میں آیا۔

شعر کہنے وقت ڈاکٹر صاحب کی عجب کیفیت ہوتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے لیٹ جاتے، بار بار سہلو بدلتے، بھراٹھ بیٹھے کبھی چہرہ پر اضطراب ہوتا تھا کبھی ہنسانت۔ ان کے پڑنگ کے پاس ایک میز ہوتی تھی اس پر ایک کاپی پڑی رہتی تھی۔ جب شعر کہنے کو طبیعت چاہتی لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ملنے کو آجاتا تھا تو اسے شعر کہہ کر دیتے تھے۔

ایک دفعہ شیخ عبدالقادر کو شعر کہوانے شروع کئے اور دونوں ساری رات بیٹھے لکھتے لکھاتے رہے۔ صبح ہوئے ہوتے نظم ختم ہو گئی۔ یہ نظم انہیں کے جلسے میں پڑھی گئی۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ کونسی نظم تھی؛ شکوہ، نہیں مشکوہ نہیں تھا، شکوہ جس جلسے میں پڑھا گیا۔ اس میں میں بھی موجود تھا۔ اسی ڈاکٹر صاحب نے چند شعر ہی پڑھے تھے کہ ایک بورڈ آدی نے جس کے بال بدلتی کی طرح سیدھے سیدھے سارا اللہ کہا اور جلسہ گاہ کے درمیان میں آگیا اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر دوسرے لوگوں پر بھی بہت اثر ہوا۔ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔

میں پڑھا لکھا نہیں اور نہ ڈاکٹر صاحب کے شعروں کا مطلب سمجھ سکتا ہوں۔ ان کی باتوں میں ایسی بھڑی میں کہ لفظ والے ہی انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ مگر شکوہ کے کچھ شعر مجھے بھی یاد ہیں اور اسی زمانے سے یاد ہیں۔

علی بخش نے یہاں پہنچ کے حکم کو سنا ہوا شروع کر دیا۔ اس وقت ملت کی تاریکی پوری طرح جاوید منزل پر چھا چکی تھی۔ یہ سید پیل پاویں ملتی ملت تاریک فضا میں سر اٹھائے کچھ سوچتی لکھ کر کرتی معلوم ہوتی تھی۔ میں اور علی بخش آٹھ منٹے سلنے پار پا جیوں پر بیٹھے تھے۔ اس کے پہلو میں ڈاکٹر صاحب کا دوسرا ملازم صلا بیٹھا تھا۔

میں نے کہا، میاں علی بخش۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا لباس کیا تھا؛

دو کفنے لگا۔ ان دونوں ڈاکٹر صاحب عام پنجابیل کی طرح شلوار اور قمیض پہنتے تھے قمیض پر کرٹ، انہیں خاک کرٹ نہیں۔ یہی عام کرٹ۔ جو آپ ادرہم پہنتے ہیں، لیکن اتنا چھوٹا نہیں، البتہ جالٹے ہیں وہ ہندو گھگھ کا فرک پہنتے تھے۔ سر پر سپر میل کی بگڑی ہوتی تھی، مرتیہ رنگ کی بگڑی کا بھی شوق تھا۔ بعد میں ٹرکی ڈوٹی بھی اوڑھنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب نے ولایت جانے سے پہلے سوٹ بھی نہیں پہنا۔ اور سوٹ بھی کبھی کبھار ہی پہنتے تھے، اور وہ انہیں دل سے پسند نہیں کیا۔ ان دنوں کو میر سگھ کے قلعہ میں نظام الدین نام ایک بڈھا داری تھا ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کپڑے اسی سے سلاٹے تھے اسے بھی ڈاکٹر صاحب کے بڑی محبت تھی اور ان کے کپڑے بڑی محنت سے ریا کرتا تھا۔ ایک دن مجھے کہنے لگا، علی بخش میں شیخ صاحب سے بہت دور تھا ہوں، بھئی آخر شراعت میں کہیں غنیمتیں آکر میرے خلاف ایک آدمہ شرفکدین تو میں کہیں کا نہ رہوں؟

سچ پرچھے تو ڈاکٹر صاحب کو اچھے لباس کا شوق نہیں تھا، جیسا کہ ایک کسی نے لادیا یہ سن لیا۔ کپڑے پسند کرنے کا کام یا منشی طاہر الدین کے سپرد تھا یا میرے، انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ کپڑا اچھا نہیں۔ اس کا رنگ خراب ہے۔ اہل میں انہیں ان چیزوں کی پروا ہی نہیں تھی۔ بیماری کے زمانے میں کچھ انگریز سٹوڈنٹس ان کا لین لے کے آئے۔ ظاہر ان کے رنگ بہت شیخ اور خوبصورت تھے۔ اس وقت جتنے لوگ پاس بیٹھے تھے۔ سب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب انہیں خرید لیجئے، غرض بارہ سو روپیہ کے تعلیم خرمیے گئے، لیکن کوئی مینہ ڈیڑھ مینہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کھنت، وگنی گنی قیمت لے گئے۔ دینے والین بہت گھٹیا ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب نہایت باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ منشی طاہر الدین کے پاس آج بھی ہمیں پچیس سال کا حساب لکھا ہوا موجود ہے۔ کیا حال ہے کہ اس میں ایک پائی کا بھی فرق ہو۔ منشی طاہر الدین کو آپ جانتے نہیں گئے، وہ مدت تک ڈاکٹر صاحب کے پاس رہے ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب وکالت کرتے تھے تو سارا کام کاج منشی جی کے سپرد تھا لیکن انہوں نے وکالت چھوڑ دی تو منشی جی نے اپنا علیحدہ کاروبار شروع کر دیا۔ لیکن آخری وقت تک حساب کتاب انہیں کے سپرد رہا۔ انہیں اس کام کی باتا قدر توجہ ملتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے ولایت جانے سے کچھ عرصہ پہلے ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب پرچوان دونوں فرزند مسند دین میں انجیئر تھے ایک مقدمہ بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس سلسلے میں بلوچستان جانا پڑا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ بیلبل کی فریاد بہر ان کی مشہور نظم ہے۔ انہوں نے راستہ میں ہی لکھی تھی۔ مقدمہ بہت دیر چلا۔ آخر شیخ عطا محمد بری ہو گئے۔ شاید یہی مقدمہ کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو قانون کی طرف توجہ ہوئی اور انہوں نے بیرسٹری کی تعلیم کے لئے ولایت جانے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد یہ روڈ کار پینڈ کے بنے والے تھے۔

انہوں نے خود جمع کر رکھا تھا۔ کچھ شیخ عطا محمد سے لیا اور ولایت روانہ ہو گئے۔ کنگڑوہ کا زلزلہ کس سال آیا تھا؟ ۱۹۰۵ء میں تو زلزلہ سے کوئی سال بھر بعد یعنی ۱۹۰۶ء میں وہ ولایت گئے ہوں گے۔

اصل میں ڈاکٹر صاحب دنیا دار آدمی نہیں تھے اور دنیا والوں کے اس بچ بچ اور اٹ پھیر انہیں نہیں آتے تھے، وہ کبھی اپنے پاس روپیہ پیسہ نہیں رکھتے تھے۔ منشی طام الدین ان کے خزانچی تھے اور ان کے اکتھول روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ مجھے کئی دفعہ ان کے ساتھ سفر کا اتفاق ہوا ہے۔ سفر میں روپیہ ملکہ ریلوے کا ٹکٹ ایک میرے پاس رہتا تھا۔ اپنے پاس وہ پٹوئی کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں ان کو چھاپنے کے فروخت کیا جاسکتا ہے۔ کچھ نظمیں شیخ عبدالقادر چھاپنے کو لے جاتے تھے۔ کچھ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار میں چھپ جاتی تھیں۔ ان دنوں منشی فضل الہی مرغوب رقم ایک سو تین سو پڑا کرتے تھے۔ انہوں نے بھی ڈاکٹر صاحب کی بہت سی نظمیں کتاب کی صورت میں چھاپیں اور ہزاروں روپے کمائے اور شاید انہیں کئی کتابیں چھاپنے کا خیال ہی نہ آتا سچا ہو تو دھری محمد حسین صاحب کا جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ بات بھائی۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاں جو دھری صاحب کا آنا جانا مدت سے ہے جب وہ کالج میں پڑھتے تھے اس زمانے میں بھی اکثر آیا کرتے تھے لیکن جب وہ کالج چھوڑ کر ملازم ہوئے تو روزانہ آنے لگے۔ شاید ہی کبھی کوئی ایسا اتفاق ہوا ہو کہ جو دھری صاحب نہ آئے ہوں ورنہ مینہ آئے یا آندھی جو دھری صاحب مزدور شام کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پہنچ رہتے تھے۔

اسرار خودی اور رموز خودی پہلی کتابیں ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے خود چھاپیں۔ ان کے بعد تو سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بانگ درا چھاپنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کو بڑی محنت کرنی پڑی۔ بانگ درا کی ساری نظمیں مختلف اخباروں اور رسالوں میں چھپ چکی تھیں اور ان میں سے اکثر ایسی تھیں جن کی نقل بھی ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود نہیں تھی۔ البتہ بہت سے لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کا کلام جمع کر رکھا تھا۔ بڑی شکل سے یہ ساری نظمیں جمع کی گئیں اور بہت سی کاپیاں پٹ کے بعد انہیں چھاپا گیا تھا۔

شیرازہ

مطبوعات

طریقہ پابندی - یہ جناب پابندی کے چودہ طرز پر مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین دلچسپ اور بعض مقامات پر قابلِ داد ہیں۔ مجلہ شائع ہوئی ہے۔ قیمت بربع نہیں۔ پتہ: منیر صاحب رسالہ "ندیم" گیا۔

ہمارے نبی کے صحابہؓ - از محمد اعجاز الحق صاحب قدوسی بدیع کتاب اسوۂ صحابہ رسول کا ول افروز مرقع ہے۔ اسلامی و آیات کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ اس میں موجود ہے۔ حجم ۱۲۰ صفحے۔ قیمت ۸ روپے۔ عبدالقادر صاحب تاج کتب چارمینار حیدر آباد دکن۔

سراپائے رسولؐ - یہ بھی اعجاز الحق صاحب کی کتاب ہے۔ حضورؐ کا حالیہ مابک، عادات و خصائل، لباس، معاشرت، مآدب و اطوار اور عام طریق زندگی کی مختصر سرگزشت۔ قیمت ۴ روپے۔ عبدالقادر صاحب تاج کتب چارمینار حیدر آباد دکن۔

شمسِ راہ - محمد سجاد مزائیگ صاحب مولوی مرحوم کے مذہبی خطبات کا مجموعہ۔ حسبِ قیاس و موضوع زیرِ بحث لائے گئے ہیں (۱۱) کتبہ، (۱۲) شائع، تیسرے منزل (۳) ذکر میلاد، (۴) تعلیم مضمون پر حصے کے قابل ہیں۔ حجم ۱۱۳ صفحات۔ کاغذ نفیس قیمت ۸ روپے۔ دفتر کتابت صفحہ الشریک صاحب مولوی سجاد منزل دہلی۔

سرسید و حالی - یہ جناب تیسرے قریشی کی نظم ہے جس میں سرسید و حالی کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شہر اچھے ہیں۔ قیمت ۱ روپے۔ تیسرے قریشی صاحب ناظم بزمِ سیرت گجرات پنجاب سے طلب کیجئے۔

مولویت اور اسلام - از حاجی نبی احمد صاحب بریلوی۔ یہ کتاب مولوی حضرات کے خلاف لکھی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خود کام مولویوں کے حمل و زلزلہ پرستی اور خود غرضی نے اسلام کو کیا نقصان پہنچایا۔ قیمت ۱ روپے۔ حاجی نبی احمد صاحب بریلی۔

احکام القرآن - بزبان اردو۔ یہ کتاب مسلمانوں کے لئے دستورِ عمل کا کام لے سکتی ہے۔ اس میں ۱۱۵ احکام درج کئے گئے ہیں اور ہر حکایت غیر و کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مؤلف مولوی حبیب حسین صاحب مدنی قیمت ۸ روپے۔ اسحاق حسین عبدالرزاق صاحبان، اردو دلی - ضلع بارہ بنگی۔

النبیؐ الخاتم - سوانح رسولِ مقبول از مولانا سید مناظر حسن صاحب گیلانی پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ یہ مختصر مگر جامع اور بصیرت افروز کتاب ہر مسلمان کو پڑھنی چاہئے۔ حجم ۱۱۱ صفحات، کاغذ کتابت نفیس قیمت ۸ روپے۔ مکتبہ الاسلامیہ حیدر آباد دکن۔

جگِ بیتی - یہ ایک سنہ نظر کی مثنوی ہے جو اردو مثنوی کی تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کرتی ہے۔ اس کے مصنف اردو کے ذہن پرست عالم اور سرپرست علامہ مجاہدین و قاتر یا کہنی دہلوی ہیں۔ مثنوی کا انداز نگارش اور طریق بیان ہی نیا نہیں بلکہ اس میں

حالات و واقعات بھی بالکل جدید و معروضہ کے ہیں۔ حجم ۶۶ صفحات۔ قیمت دیرج نہیں۔ پتہ: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔
نغمہ قصیر: مرتبہ مشہور مومن لال ماسٹر دہلوی ایم اے پروفیسر اردو و فارسی ہندوستان کالج امرتسر قیمت قسم اعلیٰ نمونہ ۳۴
 اس کتاب میں نثری گوری ستمگر صاحب قصیر دہلوی کی بے نظیر مٹھریاں، دوا سے، رنگین ہولیاں، دلکش ملائیں اور انجمن دیرج ہیں۔
 حجم ۶۰ صفحات۔ پتہ: کراچی اردو سماج دہلی۔

خدا مات خلق: بی خواہ ظالمین و غلامین کے حالات مرتبہ حور سریدہ خاتون صاحبہ، حجم ۱۲۱ صفحات، کتابت طباعت اور کاغذ سب
 قیمت ۱۰۔ پتہ: مکتبہ جامعہ مدنیہ دہلی۔ اس کتاب میں ژلان دارک، سارہ مارٹن، گرئیس ڈارلنگ، فرانسس ویلارڈ سٹورڈ
 مس ویلڈ، فلورنس ٹائٹنکیل، انکس جونز وغیرہ کے سبق آموز حالات جمع ہیں۔ یہ کتاب ہر گھر میں موجود ہونی چاہئے۔

پیام حریت: جناب ظالعاری کی حریت آموز نظم قیمت ۱۰۔ پتہ: عبدالقادر صاحب منٹا شاہ گنج، الہ آباد۔

غائب الشجر: از امام الغزل، ریزا یگانہ چنگیزی لکھنوی۔ حضرت امام الغزل نے اس کتاب میں غریب غالب کے غزلان چنگیزی
 کے خوب جرم دکھائے ہیں، الشجر کے زور قلم اور زیادہ۔ اس کتاب سے کسی قسم کا علمی یا ادبی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کاش

میرزا صاحب کی مفید کام میں وقت صرف کریں اور غالب کو شاعر کے بجائے اُن شعرا کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں جو ان کو دامن قبل تجھ میں پتہ: اردو
رقص حیات: یہ جناب کامدار الدینی کے لافان کا مختصر مجموعہ ہے۔ الدینی صاحب ایک جوان اور ہونہار انسانہ نویس معلوم
 ہوتے ہیں۔ قیمت ۸۔ پتہ: آفتاب بک ڈپو علی گڑھ۔

حسن کلام: مجموعہ کلام حضرت نغز انجمی حجم ۱۲۰ صفحات قیمت فی جلد ۵۔ پتہ: حضرت نغز۔ رائٹ انسٹیٹیوٹ ۲۱ اسٹریٹ لنکاتر
 جرنل کسلی۔ حضرت نغز ایک خوش گو زبان شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں مذہب تقوت اور تغزل کا امتزاج ہے۔

گلشن فانی: مجموعہ کلام محبوب الدین احمد صاحب لدھیانوی تلمیذ حضرت مخدوم دہلوی۔ حجم ۱۳۰ صفحات قیمت ۸۔ مطبوعہ جدید ترقی دہلی
 اشاد و بخش ہیں اور زبان صاف ہے۔

ماہ عرب: سوانح رسول مقبول۔ مؤلفہ نید محمد ہادی بی۔ اے۔ حجم ۵۵ صفحات قیمت ۲۔ یہ کتاب بچوں کے لئے بہت مفید ہے
 سادہ اور سلیس زبان میں دلکش طریقے سے لکھی گئی ہے، پتہ: نید محمد ہادی صاحب ہیڈ ماسٹر انجمن اسلام ہائی سکول، احمد آباد۔
گیتا ولی: یہ معنیہ میڈل انڈر جیت صاحب شرمادرا چور منسل میرٹھ قیمت ۴۔ یہ گیتوں کا مجموعہ دلکش اور سادہ ہندوستانی زبان
 میں لکھا گیا ہے۔ گیت پڑھنے کے قابل ہیں جناب مصنف سے طلب کیجئے۔

نواب حیدر علی خاں: اورنگزیو سلطان کے شاہکار۔ مؤلفہ آرمہ القادر۔ حجم ۲۰ صفحات قیمت ۵۔ پتہ: ہمدرد کراچی
 یزداکت بنگلور۔ مسلمانان میٹرک میں دراصل التہذیب تمدن، منہج و تحیات اور زراعت وغیرہ پر تصورات قدیمہ کے حالات تاریخ

کے شائقین کے لئے قابل مطالعہ ہے۔

آفتاب رسالت۔ یہ سرکارِ دو عالم کی منظم سیرت ہے، شرفِ جنابِ راؤ بہادر محمد عبدالجبار خاں صاحب نے یہ کتاب مسلمان بچوں کے لئے خاص طور پر بنی ہے۔ حجم ۱۱ صفحات قیمت بیس نہیں۔ پتہ: سکریٹری بزمِ ادب۔ باغیت مندرجہ پتہ۔
یادگارِ مشرق۔ جو اندرگ شاعر عبدالرشید مشرقی مرحوم کا مجموعہ کلام۔ کاغذ گنا بت اور طباعت نفیس ہے۔ حجم ۴۴ صفحات۔
پتہ: عاصی پریس گورکھپور۔ یو پی۔

قادیانی قول و فعل۔ اس کتاب میں صلاح الدین صاحب الیاس برنی ایم اے ایل ایل بی علیگ پرنسپس جامعہ عثمانیہ کین نے دلائل کے ساتھ قادیانی مذہب کو غلط ثابت کیا ہے۔ حجم ۱۰۰ صفحات قیمت ۲/۱۱۔ پتہ: اکمال احمد صاحب فاروقی بی بی ٹی کمپنی حیدرآباد دکن۔

نورِ مشرق۔ مجموعہ کلام نرمل لعل صاحب نیا ایم اے فوج آبادی۔ نیا صاحب ایک ہونہار اور نوجوان شاعر ہیں۔ ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی وقت اردو شاعری میں نام پیدا کر لیں گے۔ حجم ۱۳۶ صفحات۔ قیمت محلہ ایک پیسہ۔ پتہ: جگندر لال صاحب سوئی، اکثر، کرانا، پھانک شش خان، دہلی۔

۱۔ مولشی۔ ۲۔ کسان کے حقوق و فرائض ۳۔ مٹی ۴۔ پنجاب کی فصلیں ۵۔ پنجیت ۶۔ قانون اور پولیس ۷۔ کسان کے دوست پرندے ۸۔ کسان کے دشمن پرندے ۹۔ حکومت اور انسدادِ امراض ۱۰۔ انسان اور شہریت ۱۱۔ عالم نباتات ۱۲۔ کسان اور اس کا مکان ۱۳۔ آبپاشی ۱۴۔ آلاتِ زراعت ۱۵۔ بری زمیں اور ان کا انسداد ۱۶۔ زمیندار اور اس کے ذاتی معاملات ۱۷۔ کیڑے +

مندرجہ بالا ۱۷ رسائل ہیں گورنٹ نارمل سکول گکھڑ کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ ان سب کا تعلق دیہاتی سائنس سے ہے۔ یہ بیمنوں حال میں پنجاب کے نارمل اور وٹیکر مل سکول کے نصاب میں داخل کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا رسائل گورنٹ نارمل سکول گکھڑ کے ہونا طلبہ کی کاوش سے تیار ہوئے ہیں۔ یہ رسائل اپنے اپنے موضوع کے متعلق بہت مفید اور دلچسپ معلومات کے پُر ہیں۔ زمینداروں اور دیہاتی سائنس کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے ان کا مطالعہ خاص طور پر مفید ہوگا۔ زبان صاف تھری ہے اور حکیمانہ تصویریں دے کر سمجھنے کی وضاحت کی گئی ہے۔ ہنر مند سکول گکھڑ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس کے طلبہ اس قدر زمینداروں کا بلا کلام کر سکتے ہیں۔ تمام رسالوں کے مجموعہ کی قیمت غالباً ایک پیسہ ہے اور گورنٹ نارمل سکول گکھڑ ضلع گوہاڑی پنجاب سے مل سکتے ہیں۔
انتظارِ کرم تب خاتمہ۔ قیمت ۴۔ اس کتاب میں کتب خانے کے انتظام کے متعلق مفید ہدایات درج ہیں۔ مجموعہ کا نصفانہ چھپ سادی حیدرآباد دکن سے طلب کیجئے۔

نظم اقبال۔ مرتبہ تصدق حسین صاحب تلج۔ یہ دو نظمیں ہیں جو علامہ اقبال نے ۱۹۱۸ء میں سفر حیدر آباد کے اثرات کے طور پر لکھیں۔ نظموں کے متعلق سر عبد القادر علامہ اقبال کی مختصر تحریریں بھی ساتھ شامل ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان ”نگارِ شبہ اور یہاں لاجسہ سرکش پرشاد کے متعلق ہے اور دوسری نظم کو رستان شاہی شان ان گولکنڈہ کے مزاروں کو دیکھ کر لکھی ہے قیمت ۴۰ پتہ: احمدی پریس چارمینا حیدر آباد دکن۔

تین افغانی۔ یہ سر عبد القادر کے حسب ذیل تین افغانوں کا مجموعہ ہے (۱) تاج شہر (۲) وطن آخر وطن ہے۔ (۳) دل ہی تو ہے۔ سر عبد القادر کا نام ان افغانوں کی خوبی کا ضامن ہے۔ پتہ: احمدی پریس حیدر آباد دکن۔

تعلیم بالغائل۔ یہ بڑی عمر کے لوگوں کو اردو سکھانے کے لئے نہایت کارآمد قاعدہ ہے جو ایس ایم شاہ ولی پٹنوی صاحب بی۔ اے آذربائیجان سرگورنٹ نارل سکول لکھنؤ نے لکھا ہے۔ اس قاعدہ میں بالغوں کی نسیات کو مد نظر رکھ کر مناسب طریقہ استعمال کیا گیا ہے اور قاعدے کے اسباق میں اس بات کا خاص خیال لکھا گیا ہے کہ پڑھنے والے جلد نوشتہ مخزن کے قابل بن جائیں۔ قیمت ۴۰ پتہ: احمدی پریس حیدر آباد دکن۔

نظم ہاشمی۔ یہ مولوی سید ہاشمی صاحب کی تین نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہاشمی صاحب جدت پسند اور صاحبِ فنی تھے لیکن کم گوشتوار میں سے ہیں۔ ان کی یہ تینوں نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ قیمت ۴۰ پتہ: انجمن ترقی اردو اور انگریز آباد دکن۔

آئی سی ایس اور دوسری کہانیاں۔ ازیسی عباس علی صاحب جینی۔ یہ ہندوستانی زندگی کے چودہ دلکش مرقع ہیں۔ زبان سناں اور سلیس ہے۔ کاغذ اور کتابت و طباعت اچھی ہے۔ قیمت مجلد پیر پتہ: انڈین پریس الدہ آباد۔

میشاق اہلین۔ مولوی عبد الحق صاحب دیرپا سنی نے جو سنسکرت اور عبرانی کے فاضل ہیں اس کتاب میں ان پیشینگوئوں کا ذکر کیا ہے جو تہذیبِ مذاہبِ عالم کی کتابوں میں رسولِ قبول کی آمد کے متعلق موجود ہیں۔ مذہبی معلومات کے لئے کتاب بہت اچھی ہے حجم ۲۴ صفحات قیمت جامع محفل۔ دارالکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگ لاہور سے مل سکتی ہے۔

طب العرب۔ یہ پروفیسر ایڈورڈ جی ہارلن کا پہلا طبی تاریخی لکچر ہے جس کا ترجمہ حکیم سید علی احمد صاحب نیز واصلی نے کیا ہے عربی کے طب کے نشو و ارتقاء کے متعلق یہ تاریخی مقالہ بہت قابلِ قدر ہے۔ ترجمہ بہت اچھا ہے اور فاضل ترجمہ نے جگہ جگہ نہایت اچھے خوشی لہجے کے میں قیمت ۴۰ پتہ: منیور سال ٹیٹل لائبریری جونی، بھائی دروازہ لاہور۔

اسلامی معاشرت۔ یہ کتاب جناب پوزی نے اسلام کے معاشرتی قوانین کے متعلق لکھی ہے۔ جگہ جگہ قرآن مجید سے استشاد کیا ہے۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۴۰ پتہ: شیخ فضل الرحمن۔ ایل وڈ چورجی میٹ لاہور۔



فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۸ء



تصویر: معصومیت

صفحہ	صاحب مضمون	مضمون	شمار
۶۳۹	بشیر احمد	برہم ہمایوں	۱
۶۴۱	حامد علی خاں	بھال نسا	۲
۶۴۶	"	"بھین بھرا دے گیت"	۳
۶۵۴	شیخ الازہار الحق صاحب ایم اے	شرح مبادلہ	۴
۶۶۱	جناب مولانا سید احمد حسین صاحب مجید آبادی	قد برکس (نظم)	۵
۶۶۴	حضرت حفیظ ہریشیار پوری ایم اے	اگے و قتل کی دہلی	۶
۶۷۰	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی	امید (نظم)	۷
۶۷۱	جناب سید علی عباس صاحب بی اے	گلندر (افسانہ)	۸
۶۸۶	معالج الشعرا مرزا عاشق حسین صاحب برہم آفندی کیر آبادی	غزل	۹
۶۸۷	جناب کا مدار الدینی	واقعات سنہ ہجری پر ایک نظر	۱۰
۶۹۸	جناب منور لال صاحب ہادی	یاد اقبال (نظم)	۱۱
۶۹۹	جناب ہریش لال صاحب نسیم	نغمہ اقبال (نظم)	۱۲
۷۰۰	"چاند"	ماضی حال اور مستقبل	۱۳
۷۰۳		مختل ادب	۱۴
۷۱۰		مطبوعات	۱۵

قیمت فی پرچہ ۸

چند سالانہ ہر ششماہی سے مع محصول

بزم ہمایوں

میرے ایک پنجابی پروفیسر دوست جو لدیانہ میں خاموشی سے اپنا کلمہ کرتے ہیں جلی وطنی جگہوں سے بھی الگ رہتے ہیں بلکہ جنہوں نے اردو میں خط لکھنا بھی میری ترغیب پر شروع کیا۔ میری طرف اپنے ایک خط میں ایسے جذبات کا اظہار کرتے ہیں جو بعد کی اس دنیا میں ایک علمی و ادبی ذوق رکھنے والے شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ایک حد تک اُسے اس جذبہ و جذبہ میں کسی نہ کسی شکل میں حصہ لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

مجھے ڈیر سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”یہ دیکھ کر سچی ڈیر نہیں ہے اگرچہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس کا اردو مترادف کیوں نہیں لکھا۔“
 ”بیرونی کمانے کے لئے تنگ و دو بھی ضرورت سے زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے کبھی کبھی اس سے تنگ آکر خیال کرتا ہوں اگر میرا وقت میرا اپنا وقت ہوتا تو اس کا بہتر ہتھمال کر سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس محبت میں میری کابلی کا رونا ہوا اور غمزدگی سے نجات پا کر میں سینکڑوں دوسرے ہندوستانیوں کی طرح نہایت لغز و زار کا رونا کر سکتا۔“

”کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ رونی کمانے کا تازیانہ میری کابلی کے دور کرنے کے لئے لازمی ہی ہے لیکن میری آمدنی قلیل کیوں ہے؟ اب نا فکری کی گئی واز میرے دل کے کانوں میں گونج اٹھی ہے اور دل کی آنکھ میں اُن ہزاروں خطوں کا نقشہ پھر رہا ہے جو میری آمدنی کے دسویں پندرہویں حصے کے لئے بھی بے تابی کے ساتھ ستاشی ہیں اور پھر یہ مجھ سے کس نے کہا تھا کہ تین نہ چار اکٹھے چھ بچوں کا باپ بن سکیں۔“

”یہ مسئلہ خیالات ایک گونہ Anti-illiteracy Campaign سے متعلق ہے۔ گزشتہ سال سے میں کالج کے طلباء کو ان پڑھوں کے پڑھانے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں چند طالب علم نواہلے اپنے گاؤں یا قصبے کے ان پڑھوں کو پڑھائیں گے اور میں چھٹیوں کے بارہ ہفتے ضائع کیا کروں گا۔ کہیں خود بھی پڑھاؤں گا کہیں طالب علموں کی مدد کروں گا اور یہ بھی کوشش کروں گا کہ یہ کام کالج کھلنے کے بعد گاؤں کے پڑے لکھے خود جاری رکھیں۔ طالب علموں کو لڑیاں بنانے انہیں ضروری ہدایات دینے انہیں پڑھانے کے طریق سکھانے میں رات کے گیارہ بارہ گونہ نہیں بچ جاتے ہیں۔“

یہ کام سہ بڑا نیک لیکن مشکل بھی بہت ہے۔ مجھے ہنسی آتی ہے کہ کڑی حکومت مغرب کے ماہرین اس قدر روپیہ صرف کر کے ہلائی ہے کہ وہ ہمیں نئے نئے تعلیم کے طریق اور نصاب تدریس کو بامعنی و مستانی یا ہندوستان میں ملازم انگریز قلمی لاعلم اور بے وقوف ہمارے ہاں نہیں

آج تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ تعلیم تو علم چیز کیا ہے۔ موجودہ طریق تعلیم و نصاب کے نقصان کے معلوم نہیں لیکن ان کی اصلاح سے بھی زیادہ ضروری چیز ہمدرد حکومت اور بے لوث و شفیق استاد کی بے عرض معلوم ہے حکیم نہیں ملتا اور مرضیں بھی محدود رہنا پڑا ہے، اگرچہ میں اسے چند اہل تصور و انہیں بھڑاتا گاؤں کا رہنے والا صدیوں کی جہالت و غفلت اور اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کی خود غرضیوں کا شکار بنا رہا ہے جو بھی اُس کے پاس جاتا ہے عموماً کسی ذاتی مقصد کو لئے ہوتے جاتا ہے اور اُس کی قربانی سے اپنی فلاح و صونڈ تباہ ہے، پھر کیا عجب کہ باقی ایسی اصلاح اور ایسے مصلحتوں سے میرا رہے اور ان کی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ ہی ہمدردی اور بے غرض خیریت اُس کے دل میں گھر کر سکتی ہے۔ لیکن آسان ہے اُس کی خامیوں گناہوں اور جرموں پر ہنسنا، کسی چائے پارٹی میں صوفیوں کے نرم نرم گدیوں پر بیٹھ کر یا سرمایہ داری کی دنیا کے سامان پیش و عشرت دیتا یا اگر اتنا قیہ حکومت کی کرسی پر بیٹھ کر اُس کی غلاظت جہالت توہمات و سوجھ بوجھ قرض، ادا نیاں، عجب گئے نقل کس قدر مکروہ اور قبیح معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کبھی کسی نے سوچا کہ اگر ہماری یاد و باش بھی انہیں حالات میں ہوتی تو پھر؟ اُس آدمی کے لئے جس کی روحانی آنکھ تعصب اور تنگ نظری نے بالکل بند نہیں کر دی کی کافی تکلیف دہ اور پریشان کن سوال ہے!

میں دیہات کے رہنے والے کی خامیوں اور جرموں سے ہمدردی نہیں رکھتا لیکن خود اُس سے ضرور رکھتا ہوں اور یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ اُس کی اس حالت کی ذمہ داری زیادہ تر سرمایہ داروں پر یا سوسائٹی یا حکومت پر ہے۔ لہذا اُسے اُجھانے اور غفلت اور جرم کے گڑھوں سے نکالنے کا فرض بھی بدرجہ اتم ان پر عائد ہوتا ہے۔

اُس کی اصلاح کے لئے کئی ممالک کی متوازی اور بے غرض محنت اور ضرورت دیکھ رہے اور اگر میسر نہیں تو محض نیک الفاظ یا خواہش نہ کبھی کچھ کر سکتی ہیں اور نہ کر سکیں گی۔ میں عموماً ناامید نہیں ہوتا، شکست بھی سننے والا مکان نہیں مانتا لیکن یہ ڈر مجھے ضرور ہے کہ اگر ابھی یہ پڑ جانے کا زور شور محض تجویزوں کے دھکالے اور پورٹ بازی میں ختم ہو کر رہ گیا تو کئی ایک دل سے کام کرنے والوں کو نہ صرف مدد ہوگا بلکہ کام کرنے میں ان کے حوصلے بھی کچھ نہ کچھ پست ضرور ہو جائیں گے۔ دُعا کریں کہ جس نیک جوش سے اس کام کو پہنچائی اور دوسرے صوبوں والے شروع کر رہے ہیں وہ بڑھتا چلا جائے اور ہمارے ملک کے بھی جہالت کی لعنت کچھ تو دور ہو!

”یہ خط ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا ہے۔ اپنی مع خراشی اور اُردو کے اس ”قتل“ کی ذمہ داری آپ پر ہے۔“ بہر حال شاگرد حاضر اور متقانی ہے، اب اصلاح آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

ڈیر سس! کام کرنے والوں کی باتیں بنانے والے کیا اصلاح کریں گے۔ اور اُردو کے بارے میں تو ہم پنجابوں کو خاصی آزادی حاصل ہے۔ سو آپ بید صراطِ اُردو میں لکھتے جائے اور اپنا شہری اور دیہاتی کام لے جائے!

بشیر احمد

جہاں نما

میاں محمد شاہنواز موم

افسوس کہ ۱۱ اگست ۱۹۳۸ء کی صبح کو ہم سب نے موتی محل، سولن میں فالج کے ایک ناگمانی حملے سے میاں محمد شاہنواز کا انتقال ہو گیا۔ میاں صاحب اکتوبر ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک کامیاب بیرسٹر ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے زمیندار بھی تھے۔ سیاسیات میں انہیں بے حد دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ آٹھ سال تک مرکزی اسمبلی اور سات سال تک پنجاب کونسل کے ممبر رہے۔ کچھ عرصے تک مرکزی اسمبلی کی جمہوری اور ایچ آف کنسنٹ کمیٹی کی رکنیت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اب کئی سال سے مرحوم علامہ کے باعث علمی سیاسیات میں علیحدگی اختیار کر چکے تھے اور زیادہ تر صاحبِ فراش ہی رہتے تھے۔

اس دردناک حادثے میں جمہور کے علاوہ اکابر ملک نے جن میں وائسرائے، گورنر اور وزراء وغیرہ شامل ہیں مختصرہً بگم شاہنواز سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد ہی میاں محمد شاہنواز کا انتقال خلوص و محبت کے اُس رشتے کی یاد تازہ کر دیتا ہے جو ان دونوں بزرگوں کے درمیان ابتداء سے قائم تھا۔ گزشتہ یوم اقبال کے موقع پر میاں محمد شاہنواز نے علامہ اقبال کی اجازت سے اپنی ارضی میں سے دس مربعت اُن کے صاحبزادے جاوید اقبال کے نام منتقل کر کے اپنی دیرینہ آرزو پوری کی۔ یہ گویا ایک محبت کا علمی ثمر تھا۔

اب چند سال سے دونوں دوست بیماری کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو کر فرائض ہو چکے تھے اور ابھی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑی حد تک منقطع ہو گیا تھا لیکن پھر بھی جب میاں صاحب کو علامہ اقبال کی شدید علالت کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ملازم سے کہا کہ مجھے نوٹس میں بٹھا کر جاوید منزل لے چلو۔ نوٹس جاوید منزل کے برآمدے کے سامنے جا کر رُک کر ڈاکٹر صاحب کے محلِ برائے میں پلنگ پر لیٹے تھے۔ ڈاکٹر صاحب میں ملاقات بھی کہ وہ اپنے دوست کی پیشوائی کے لئے اُنہیں اور نہ میاں صاحب میں سکت تھی کہ اُنھ کو اُن تک پہنچیں۔ دونوں دوستوں کی حسرت آمیز نگاہیں ایک دوسرے کی عبادت کر رہی تھیں۔ اس موقع پر علامہ اقبال کی فطری بذلہ سچی کو تحریر کیا ہوئی اور انہوں نے اس ملاقات پر ”چکوری چکوسے کی ملاقات گئی چھٹی گئی۔“

علامہ اقبال کی موت کی خبر میاں شاہنواز سے خاص اہتمام کے ساتھ چھپائی گئی تھی لیکن ایک مہینے کے بعد کسی ملاقاتی نے

بے خبری میں یہ راز افشاں کر دیا۔ یہ پرنسز کرمیاں صاحب کو ناقابل بیان صدر بہ ۱۱ اور وہ اُسی وقت مرحوم دوست کے بچوں سے ملنے کے لئے کسی نہ کسی طرح "جاوید منزل" میں پہنچ گئے۔

اس کے تقریباً تین ہی مہینے بعد وہ اپنے دوست کے پاس حقیقی جاوید منزل میں جا پہنچے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

نئی ترکی پر ایک نظر

حال میں "مجلس ملی کبیر" کے ایک اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کمال اتاترک نے کہا کہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ترکی تو کم کر، تہذیب اور خوشحالی کے بلند تر پس معیار تک پہنچا دیں۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قول اور عمل کی رفتار یکساں کامیابی کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ایک باقاعدہ نظام عمل تیار کر کے اس پر پوری تہذیبی سے عمل شروع کر دیا جائے۔

ترکی قوم کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے کہا کہ کوئی ایسی رکاوٹ جو ہمارے قومی مفاد کی راہ میں حائل ہو نہ ایک پشت کی جاتی ہے اور نہ آئندہ کبھی برداشت کی جائے گی۔ انقلاب سے ہمارے ملک میں جو اہم تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، ان کا قائم رکھنا ہر حال میں ضروری ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے شخص کو مسلسل جدوجہد کرنی چاہئے۔

حکومت کی زراعتی حکمت عملی کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے کہا کہ ملک میں ایک بھی کاشتکار زمین کے بغیر نہ رہنا چاہئے اور مناسب ہے کہ زمین ناقابل تقسیم قرار دی جائے، بڑے زمینداروں کی ملکیت میں جو زمین رہے اس کی مقدار بھی حکومت کی نظر ہی سے مقرر ہوگی، اس سلسلے میں یہ بھی لازم ہے کہ زمین کی زرخیزی اور مقامی معاشی حالات پر نظر رکھے جائیں۔ چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو ہر ممکن سہولت ہم پہنچانی چاہئے گی، اور انہیں نئے زراعتی آلات دینا چاہئے گے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے اتاترک ملک کو مختلف زراعتی رقبوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ ہر رقبے میں کاشتکاروں کی مدد اور رہنمائی کے لئے ایک زراعتی مرکز قائم کیا جائے گا۔

اتاترک نے کہا کہ ترکی کو ہر طرح ترقی یافتہ اور خوش حال بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ صنعتی کارخانوں کو فروغ دیا جائے اور ملک میں جگہ جگہ نئے کارخانے قائم کئے جائیں۔ یہیں لازم ہے کہ اپنے پہلے چار سال صنعتی منصوبے کو جلد از جلد پائی تکمیل تک پہنچا دیں۔ اور باقی چند مجتہدہ کارخانے بھی جلد قائم کر دیں تاکہ اس کے بعد مزید ترقی کی تجویزوں پر عمل کیا جائے۔

صنعت اور زراعت کی مناسب تنظیم اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ حکومت ملک کی تجارتی سرگرمیوں کی کڑی نگرانی کرے ہماری میرمنی تجارتی حکمت عملی کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ ہم اسے ملکی اور خارجی معاشی حالات کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں۔

تجارتی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہمیں جہازوں کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے بیرونی ممالک سے انتظام کیا جا چکا ہے اور وہ آئندہ ہم ہمیں مل جائیں گے۔ یہ سچ ہے کہ جہازوں کی یہ زائد تعداد بھی ہماری آئندہ بعضی ہوئی ضروریات کے لئے ناکافی ہوگی مگر ہمیں اطمینان ہے کہ اپنے منصوبوں پر باقاعدہ عمل کرنے سے ترک قوم جلد ہی ایک بڑی بھری قوم بن جائے گی کیونکہ ہمارے ملک کی تین اطراف سمندر سے گھری ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اتارک نے ترکی کی ان ترقیوں کی طرف اشارہ کیا جو ریوے کی توسیع سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر اور قوم میں ابائش و بہنیت پیدا کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تبدیلیوں نے نہ صرف وقت اور فاصلے کی طنائیں کھینچ دی ہیں بلکہ ترکی کی معاشی ترقیوں میں مدد دے کر ملک کو زیادہ طاقت ور اور خوشحال بھی بنا دیا ہے۔

اس کے بعد اتارک نے ترکی کی قابل اطمینان مالی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا برادریہ نہ صرف متوازن ہوتا ہے بلکہ اس میں ہر سال ملکی حفاظت اور تعمیراتی مقاصد کے مصارف کو پورا کرنے کے لئے بھی گنجائش رکھی جاتی ہے۔ تعلیمی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے اتارک نے ترکی میں تین نئی یونیورسٹیوں کے قیام کا ذکر کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ”مجلس تاسیخ“ اور مجلس ترقی زبان ترکی کی سرگرمیوں کو سراہا۔

فرج کا ذکر کرتے ہوئے اتارک نے اس کی قوت، اس کی تربیت اور اس کی حُب وطن کی تعریف کی اور کہا کہ فرج ہی ہمارے ملک کی ناقابلِ تخریب محافظ ہے اور یہی اس منظم جدوجہد کے جاری رہنے کی ضمانت ہے جو ہم اپنے بلند مقاصد کے لئے عمل میں لائے ہیں۔ ہماری ہوائی فوج بھی دور دراز قریب یا قریب ہی ہے اور اس سلسلے میں ہمارا سارا منصوبہ تخیل کو پہنچ چکا ہے مگر آئندہ یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمارے تمام ہوائی جہاز اور ان کے انجن ترکی ہی میں بنیں۔

ترکی افغانستان، عراق اور ایران کے درمیان اتحاد کے معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے اتارک نے کہا کہ اس سے اخوت اور دوستداری کی اس عکبت علی پر روشنی پڑتی ہے جو ہم نے مشرقی ممالک میں اختیار کر رکھی ہے۔

آخر میں جمہوری جماعت کے اعلیٰوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان اعلیٰوں کو عالمی کتابوں کے آسمانی اصولوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہمارے المام کا ماخذ آسمان نہیں بلکہ جتنی بھرتی زندگی کا تجربہ ہے۔ ہمارا نظام عمل ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ملک کے کسی خاص فرقے کی طرف زیادہ توجہ کریں کیونکہ ہم تمام ترک قوم کے خادموں ہیں۔

غذائیں اور حیاتین

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی تحقیق ہوئی ہے کہ مختلف غذاؤں میں مختلف قسم کی قوت حیات یا غذائی جوہر ہوتا ہے۔ ۱۔ مصلح

کلی



کلی

”بھین بھرا دے گیت“

پنجابی شاعری میں اپنی ایک مخصوص دلکشی ہے۔ اس میں جذبات کا جو غلوس ملتا ہے وہ زیادہ علمی زبانوں کی شاعری قریب قریب نامید ہے۔ پنجابی بڑے بڑے شہروں اور اونچے اونچے محلوں میں رہنے والے امراء کی زبان نہیں ہے چھوٹے چھوٹے اور نیچے نیچے کچے گھرؤں میں بسنے والے غریب کسانوں کی بولی ہے۔ جیسے سید سے سادے دیات کے رہنے والے میں ویسی ہی سادہ اور ٹکٹ سے پاک ان کی شاعری ہے۔

علامہ اقبال نے ایک مرقع پر اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ پنجابی شاعری میں شعر کی ظاہری تراش خراش کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا۔ اسی وجہ سے اس میں بحر و کلمات کبھی کوئی خاص لحاظ نہیں رہا۔ علامہ اقبال کی رائے بالکل درست ہے لیکن پنجابی شاعری کے اسی عیب نے اس کی جذبات نگاری میں غلوس اور زبان میں لوچ پیدا کر دیا ہے چنانچہ اسی مرقع پر علامہ اقبال نے یہ رائے بھی ظاہر کی تھی کہ پنجابی شاعری بڑی اچھی شاعری ہے اور اس کا صرف صرف جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر پنجابی شاعری میں بعض جدید پنجابی ادباء کی کوششوں کے طفیل بحر و کلمات کی سخت قید و قافیہ اور عروض کی جکڑ بندیں چھین گئی تو پھر اس کی سادگی اور غلوس بھی اہل علم کی منقلبیاں ظاہر پرستی اور ضابطہ بندی کی نذر ہو جائے گا اور یہی بعض زیادہ ترقی یافتہ زبانوں کی طرح محض اہل علم یا اہل دولت کے محدود طبقے کی مصنوعی زندگی کی بے روح تصویر بن جائے گی۔

ملک کے قومی ادب میں وہانی گیتوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ ان میں سے بعض گیت بہت پُرانے ہیں اور ہمارے قدیم تمدن و معاشرت اور رسوم و رواج اور ان کے تاریخی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ گیت جہاں ہیں اپنے بہت سے تمدنی و معاشرتی انفاض کی طرف متوجہ کرتے ہیں وہاں گیت ہی ایسی غویلوں کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں جو اب ہماری معاشرتی زندگی کا جوہر نہیں رہیں۔

پنجابی گیتوں کی کئی قسمیں ہیں :- ہزاراوری، گھوڑیاں، سہنگ، ڈھولے، اچھے، ماہیے، اتھال، اکلکی وغیرہ۔ ہر قسم کے گیتوں کا موضوع مخصوص ہوتا ہے لیکن یہاں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ہمیں پنجابی گیتوں کی ایک خاص نوع سے سروکار ہے یعنی پنجابی سن کی محبت کے گیت۔ دنیا کی بہت کم زبانوں میں سن کی محبت کے ایسے پُر غلوس ترانے مل سکتے ہیں جیسے پنجابی میں ہیں۔ زیادہ علمی زبانوں میں شاعری کی اس شائع کو ایسی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہر ملک کی بہنوں کو بھائیوں سے محبت ہوتی ہے لیکن ہندوستان اور بالخصوص پنجاب میں دیات کے غلوس معاشرتی

نورین اور قدیم سہم درواج کی پابندی نے بھائی کے وجود کو بہن کے لئے اور بھی محبوب تر بنا دیا ہے۔ وہات میں شادی کے بعد لوکیوں کی حالت صدیوں سے قابلِ رحم رہی ہے۔ دوسرے اسباب کے علاوہ وہات کا افلاس و جہالت اور متہدن دنیائے علیحدگی بھی اس غرابی کا باعث قرار دی جاسکتی ہے۔ سسرال میں لوکی کی حیثیت ایک کاماٹن یا لونڈی کی سی رہ جاتی ہے۔ ساس، سسر، صیٹھ، دیور، اندرب کی خدمت اُس کے سپرد ہوتی ہے اور سب کی ڈانٹ ڈپٹ اور طعن و تعریض اسے برداشت کرنی پڑتی ہے۔ شوہر کی شرافت کا معیار یہ بھی لگایا ہے کہ وہ کس ظلم و ستم کے خلاف بی بی کی حمایت میں ایک حرف تک منہ سے نہ نکالے۔ بی بی کو سب سے بڑا کمانے کو اور سب سے بڑا پسندے کو مٹا ہے اور ساس، سسر، دیور اور صیٹھ وغیرہ بعض اوقات اسے ذرا ذرا سی بات پر جہانی سزا بھی دے سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوکیاں سسرال میں رہنے پر عورت کو ترجیح دیتی ہیں۔ ساس کے ظلم و ستم کا وہات میں گھر گھر چہا ہوتا ہے اور اُس کی سخت گیری ہی نے وہاتی بہنوں سے اس قسم کے گیت کہلے ہیں:-

جگمدی

تے سنے پیڑ لگ لین دے اے ساس ذرا میرے قدم ہی میاں جم لینے دے

تیری گت گلمپاں وچ گرلدی پھر تجھے دکھا دوں گی کہ تیری کی چنی کس طرح گاؤں کی گلیوں میں خوار ہوتی پھرتی ہے۔
وہات کی لوکیاں عموماً ساووں کے مینے میں میکے جاتی ہیں۔ اس موقع پر اکثر بھائی ہی بہن کو لینے کے لئے جاتا ہے چنانچہ بہن اپنے بھائی کو قدرہ گنجائش دہندہ اور سوا سمجھتی ہے اور اسے دیر یا پیر یعنی بہادر کتھی ہے اور کیوں نہ کہ بھائی ہی اُس کی حفاظت کرتا ہے۔ سسرال والوں سے اس کی حمایت میں لڑتا جھگڑاتا ہے اور اسے عورت، بڑا قدر و سزا دے لے لے اپنے ساتھ لے جاتا ہے غالباً اسید حالات نے وہاتی بہن کے دل میں بھائی کی محبت و چند کردی ہے۔ سسرال کی کیفیت کو پیش نظر رکھ کر مظلوم لوکی کا میکے کی یا دیس جڑ پناہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ جہاں وہ آزادی اور خودداری کی فضا میں بے فکر سی سے بچپن کے پیائے پیارے کھیل کھیل چکی ہے۔ ساووں کے شروع ہوتے ہی وہاتی پولیس میں گئے کیلئے بیکاری کے ساتھ بھائی کا انتظار کر لگتی ہیں۔

بچانی شاعری میں بہن کی محبت کا سرائے جگہ جگہ ملتا ہے۔ مشہور پنجابی نظم بہر میں مذکور ہے کہ جب بہر اور نا بھما کے عشق کا راز کھلا اور لوگوں میں اُن کا چرچا ہونے لگا تو بہر کو بھائی سلطان غیر کے مائے اپنی ماں کے پاس گیا۔ وارث شاہ کہتا ہے سہ

سلطان بھائی آیا بہر سنا آکے ماں ملل بہر لونا ڈالناں جگر پھیر میں باہر ایہ ڈھٹیاں پھیرال ایہ فی جون تلوار اتل
ابدے گنجیاں جمنیاں ڈوب دتا امیں جگ سنا رونا ڈالناں ایہ دھی بڑیا نہ رکھ مائے موہر مائے کے ایسوں ملالناں

ترجمہ :- بہر کے بھائی سلطان نے بہر کو اس کے کمانوں سے لے کر بہر کو سختی سے ڈانٹ ڈپٹ کر کہہ - اگر تیرے اب اسے گھر سے باہر تو مٹھتے دیکھ لیا تو تلوار سے اس کو لڑکائی نہ بھگدوگوں کے چھوڑا۔ اسیوں سے میری جان بھگان ہوئی جاتی ہے اور ہم ڈھٹیاں جہاں میں ذلیل ہوئے ہیں۔ اے ماں یہ بدتماش بی بی نہ دیکھنے

کے قابل نہیں اسے نہ ہوس کر مار ڈال۔“

بھائی کی یہ درشت اور دلاست آہیہ تقریر سن کر میرے جو جواب دیا وہ جہاں عشق کی مسرتی میں ڈوبا ہوا ہے وہاں اس سے پنجابی ہن کی محبت بھی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے۔

اکھیں لگیاں مڑن نہ دیر میرے بیا وا گتھی بلہاریاں مے
دیں پئے دیا نہیں کدی مڑ دے وڈے لاپے نہ ورتے تاریاں دے
بدی لکھی ہے ایہ نصیب میرے بھائی مڈھ تو نال تلاریاں مے
اول روز دا لکھیا اکن دلیا ہیر گھول گتھی وارو واریاں دے

ترجمہ :- میرے بدلے بھائی میں پھر واری جاؤں۔ جب آنکھیں اُچھ جائے تو بس نہیں چلتا۔ دریا بہ مجھے تو اس کا رخ کون مڑ سکتا ہے؛ اس کوشش میں بے بسے زور آزمائی کر کے آخر کار دوھو چکے ہیں تو چاہے مجھے تلوار سے کاٹ ڈال کر میری قسمت کی لکھی یہ بدی نہیں مل سکتی۔ میری زندگی پھر پار بار تروان بر بھائی! ازل کا لکھا ہوا آخر پتھر آچکا ہے۔

وہاتی ہن سسرال میں بھائی کے انتظار کے دن گن کر کاٹتی ہے اور اس کی تواضع کے لئے اچھی اچھی چیزیں جمع کرتی رہتی ہے
کھانڈا، بادام، گری، جھو باسے، اودھ، اوگھی بہت مغرب غذا نہیں ہیں۔

ایک پنجابی ہن اپنے بھائی کی راہ دیکھتے دیکھتے تنک جاتی ہے اور بے اختیار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔

چاندی

چاندی

پیاے بھائی اب تو ادھر کا رخ کر

نئے چھیتی چھیتی آویرا

اب تو تیرا انتظار کرتے کرتے میری کھانڈ بھی اتنی پڑانی ہو گئی ہے کہ اس میں سسرال
سسرانے لگی ہیں۔

میری کھنڈ سسری پئی کھنڈی

یہ منہ ہے۔ پتوں کا ابتدائی لفظ محض قافیہ لانے کے لئے نکل پڑا ہے۔

ایک ابدر سنکتی ہے۔

چھاواں

چھاواں

اے میرے بھائی مجھے سسرال کے اندھے کنویں سے نکال

تے کھوہ و پتوں کڈھ ویر دے

کہ میں تجھے یہاں کی پیتا سناؤں۔

تینوں سسرہریاں دا حال سناواں

بھائی ہی مصیبت سے نجات دلانے والا ہے اور وہی ہن کے دکھڑے منتا ہے۔

سادن آگیا ہے لیکن بھائی ہن کو سیکے لے جانے کے لئے نہیں آیا۔ لڑکی عالم خیال میں ماں سے کہتی ہے :-

انماں پان سات پنڈیاں بنا کر میرے بھائی کو

بیج مت پنیاں پاکے میرے مائے نی

بیج کہ سادن آیا ہے۔

دیر میرے نول بیج سادن آیا ۔

کھرتی ہے۔ اُچھڑا چڑا چڑا تے موہنا میرا ویر
میرا چوڑہ بلند ہے ادیرا بھائی خوشنور ہے۔
کھلی میں اُدیاں راہ ساون آیا۔
میں چوڑے پرکھڑی اس کی راہ دیکھ رہی ہوں کہ ساون آیا ہے۔
اتے میں بھائی آپہنچتا ہے ادیرن کوڑے حال میں دیکھ کر پوچھتا ہے :-
رتے رتے پر پڑے تول ٹہنی اٹاں جالیے نی
میری ماں جانی تو سرخ سرخ پیر پڑے پڑی ہے۔
کیا تیرا کیا تھیں ساون آیا۔
لیکن تیری پوشاک ایسی کی کی کیوں ہے؟
کس نے دیکھے تول دکھی میرے پنے نی
اے میری بہن کس نے تجھے دکھایا دیا ہے۔
کون دوسے دوسے بول ساون آیا۔
کون بڑے بڑے بول بولتا ہے۔

بہن جواب دیتی ہے :-

ساوے دیکھے تیں دکھی اٹاں جالیوے
میرے ماں جانی ماس کے آواز نے میرا یہ حال کر دیا ہے
نند دوسے دوسے بول ساون آیا۔
ادیری نند بڑے بڑے بول بولتی ہے۔
یہ سن کر بھائی تلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ساون آگیا ہے، اب میں تجھے سرخ ڈولی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔
رتے رتے دوسرے تول بیٹھیں اٹاں جالیے نی
(میری پیاری بہن غم نہکا) میں تجھے سرخ ڈولی میں بٹھا کر ساتھ لے جاؤں گا
ویرا گھوڑی اسوار ساون آیا۔
تیرا بھائی گھوڑی پر سوار ہو کر آں پہنچا کہ ساون آیا ہے۔
بہن کہیں پر گھڑا بھر رہی ہے، ارادہ کر لیں گے کہ جھگڑا ہے۔ اتنے میں ایک سیلی اچانک آکر بھائی کی آمد کی خبر سناتی ہے۔ یہ خوشخبری
سن کر بہن خوشی سے بے خود ہو کر پٹا اٹھتی ہے :-
کیہڑی سیلی آن دیا ویر آیا اے
پیاری سیلی یہ خوشخبری میں نے کس کے منہ سے سنی کہ بھائی آیا ہے۔
لنٹی شتی دوزر کوڑے واما دودھ پیایا اے۔
اب چھا چھا دھکا ہام بھی خلو اور میرے بھائی کے لئے بھینس کا گاڑا دودھ لاؤ۔
بھائی کی آمد کی خبر سن کر ایک بہن خوشی خوشی اس کے بغیر قدم کی تیاریاں کر رہی ہے۔ فرط سرور سے اس کے گھر کے در و دیوار سب جگہ گٹھنیں
چالوں پک رہے ہیں ادیرن علم طرب میں اُلتی ہوئی دیکھی سے مخاطب ہو کر کہتی ہے :-
اُبل اُبل دلٹو پٹے نی لپ چلاں دی پاواں
اُبل اُبل لے تنگ تنگ کیچی اُبل جیں تھ میں ٹٹھی بھر چالوں ڈال دوں۔
جے ویر ڈھا آوند اپ بوروی پاواں
بھائی کو آتے دیکھ تول کی تو ٹٹھی بھر چالوں اور ڈال دوں گی۔
جے ویر آ کر وٹے، اروٹے ہوئے شاواں
بھائی گاؤں کے میدان میں پہنچے گا قرانتے کے کندہ اٹھا کر بھینس کو ادوں گی۔
جے ویر آیا گھیاں پٹ دریائی چھاواں
بھائی گلی میں پہنچے گا تو میں دہل ٹٹھیم کا فرش بھا دوں گی۔
جے ویر آیا ویرے رتا پٹنگ ڈاواں
بھائی صحن میں پہنچے گا تو میں اس کے لئے سرخ چنگ بھرا دوں گی۔

بھائی پانی مانگے گا تو میں اسے سموری سمیں گا (کا دھا) دھندھا ملاؤں گی۔

بھائی روٹی مانگے گا تو میں اسے گری اور چھوڑے کھلاؤں گی۔

بھائی آکر سڑی میں بیٹھے تو برتن اتنے چکان کر دشی کہ کنیں پھٹ نکلیں

بھائی اندر گیا تو دیئے کی لاٹ اور بھی زیادہ روشن ہو گئی

بھائی کوٹھے پر چڑھا تو ساتھ ہی رُچ کا چاند بھی نکل پڑا۔

جے ویر سنگے پانی لُورے مجھ چکا وال

جے ویر سنگے روٹی گری چھوڑے کھلا وال

جے ویر بیچا چوٹکے بھانڈیاں شال چھڑا وال

جے ویر اندر وڑیا۔ دیوالٹ لٹ بلیا

جے ویر چڑھیا کوٹھے بالا چنڈی چڑھیا

ایک لڑکی ساون میں اپنے سسرال والوں سے بھائی کے ساتھ نیکیے جانے کی اجازت طلب کرتی ہے۔ سسرال والے طرح طرح

کے جیسے تراشے ہیں اور کبھی مسج اسے اپنے کاموں سے فارغ نہیں ہونے دیتے۔ اس کا گیت بھی سنئے :-

لڑکی۔ نینداں آئیاں سسٹو ساون چیتے پنچا

ساس۔ میں کی جانال لُوریں، کونت لڑ چُکے جاویں پچھا کے جاویں جھبے مُڑاویں

اے ساس اب مجھے ساون کی نیندیں آتی ہیں۔ مجھے جلد نیکیے پنچا دے۔

ترجما۔ میں کیا جاؤں ہوا اپنے خاندن سے پوچھ پچھا اور چلی جا کر جلد واپس آ جاؤ۔

لڑکی۔ کون کا کم کریندیا میں گھر آیا ویر سونے دا تیر لنگی پٹ دار جُتی تے دار میں جانال پتے

خاوند۔ میں کی جانال ناسے سوہرے لُور چُکے جاویں پچھا کے جاویں جھبے مُڑاویں۔

ترجما۔ میرے کام میں لگے ہوئے شوہر گھر پر آیا سونے کا تیر آیا۔ لنگی ریشمی، جوتا طلائی کا مدر میں نیکیے جانال پاتے ہیں۔

ایک بہن میں کیا کہیں ہوں۔ اپنے سسرے پوچھ پچھا اور چلی جا کر جلد واپس آ جاؤ۔

لڑکی۔ سوہر یا پلنگ بیٹھیا میں گھر آیا ویر سونے دا تیر لنگی پٹ دار جُتی تے دار میں جانال پتے

سسر۔ میں کی جانال دینے جیٹھ لُور چُکے جاویں پچھا کے جاویں۔ جھبے مُڑاویں۔

ترجما۔ پلنگ بیٹھے ہوئے شوہر میرے گھر پر آیا سونے کا تیر آیا۔ لنگی ریشمی جوتا طلائی کا مدر مجھے نیکیے جانے دے۔

بیٹی میں کیا جاؤں اپنے جیٹھ سے پوچھ پچھا اور چلی جا کر جلد واپس آ جاؤ۔

لڑکی۔ جیٹھا کھو تے بیٹھیا میں گھر آیا ویر سونے دا تیر لنگی پٹ دار جُتی تے دار میں جانال پتے

جیٹھ۔ میں کی جانال بھائی نند لُور چُکے جاویں پچھا کے جاویں جھبے مُڑاویں۔

ترجما۔ کنوئیں پر بیٹھے ہوئے جیٹھ میرے گھر پر آیا سونے کا تیر آیا۔ لنگی ریشمی جوتا طلائی کا مدر مجھے نیکیے جانے دے۔

بھائی میں کیا جاؤں اپنی نند سے پوچھ پچھا اور چلی جا کر جلد واپس آ جاؤ۔

لڑکی۔ نند سے چٹھا کھو تے میں گھر آیا ویر سونے دا تیر لنگی پٹ دار جُتی تے دار میں جانال پتے۔

نند۔ بھالو گھرا کر مل، تولی پچا کے جاویں، کتا کے جاویں، وٹا کے جاویں، اُنا کے جاویں، دھوا کے جاویں، رکھا کے جاویں، جھبے مڑا دیں۔
 چرخا کاٹنے والی نند میرے گھر پر آیا۔ سونے کا تیرا کیا۔ لنگی لٹسی چڑا ملائی کا مدار مجھے بیٹے جانے سے۔
 (بھائی گھر دلی آئی ہے اسے دھوا کر جانو، کٹا کر جانو، بڑا کر جانو، بڑا کر جانو، دھوا کر جانو، رکھو کر جانو، پھر جلد واپس آجاؤ۔
 لڑکی جھٹلا کر کہتی ہے :-

ویرا سُن مے میری نند دا مرگیا آتا۔ میں بن ورج ڈال، میں دھردھڑ پٹاں میں نہیں جانا پتے۔ ویرا تولی جاوے۔
 میرے پیارے بھائی سُن میری نند کا باپ گیا۔ میں بن اس کی قبر سناؤں گی میں دھردھڑ پٹوں گی میں یکے نہ جاؤں گی۔ اب تُو جادھا حافظ۔
 بچپن کے زمانے ہی سے دہاتی لڑکی کُل میں بھائی کی محبت راسخ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے کھیلوں میں جو گیت گاتی ہے اُن
 میں ہی بہن کی مضموم محبت کی جھبکیاں نظر آتی ہیں۔ دہاتی لڑکیاں بچپن میں کچے سوت کی گیندوں سے کھیلتی ہیں اور اُچھلتی گیند کی تال کے
 ساتھ اس قسم کے تعال گاتی ہیں :-

تَن کتیر۔۔۔۔۔ میں گلی گلی۔۔۔۔۔ بیر نہ کو کھلاتی پھولوں
 گلی گلی گھر گھر دلوں کی صدا سے جھنجھٹا اُٹھے
 ویر میرے تُوں اللہ رکے
 رکتن والا اللہ
 ویر میرے بھائی کی نگہ بانی کر
 میرے بھائی کا رکھو والا اللہ ہے
 کھڈا ن والا چھٹا
 اُس کا دل بدلانے والا چھٹا ہے۔

کلکلی دہاتی لڑکیوں کا ایک ثابت مرغوب کھیل ہے۔ ایک دوسری کا ہاتھ پڑے لڑکیاں چُھدک چُھدک کر چکر کھاتی ہیں اُس اور ساتھ ہی
 ساتھ اس قسم کے گیت گاتی ہیں :-

کلکلی کلیر دی

پگ میرے ویر دی

دو پڑ میرے بھائی دا

لال سپاہی دا

اس گیت میں بھائی کی پڑی اور چادر وغیرہ کی پائیں لے کر بہن نے فخر سے اُسے لال سپاہی کہا ہے۔ دہاتی بہنیں ہمیشہ اپنے بھائیوں کو
 اچھے سے اچھے ہندول پر نائز دیکھنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ ایک بہن کہتی ہے :-

آری۔۔۔۔۔ دو ویر دے وے رہا
 آری۔۔۔۔۔ یارب مجھے دو بھائی عطا کر
 آری۔۔۔۔۔ ایک ٹنچھی تے راک ٹھاری
 جن میں سے کیت نہی بنے اور ایک ٹھاری ہو۔

کیوں نہ ہو، ہن کے لئے بھائی سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ ایک لوگ کہتی ہے اسے

چھوٹی — گم گم گم مرگ ورگے بھوٹی — مرگ پر داہ گورل کی بڑی گما گئی ہے

میرے ویر جیسا نہیں کوئی گران میرے بھائی جیسا گورل کوئی بھی نہیں۔

لیکھ لکھ تیز میں سوئی نکا رہی ہے۔ اتنے میں ڈاکیا اے بھائی کا خط دے جاتا ہے۔ وہ روٹیل کو بھٹاتا ہوا چھوڑ کر اس کے پیچھے خطا پڑھتا ہے

کے لئے بھاگتی ہے کہ روٹیاں جائیں بھاڑیں ”ہیرن“ کی چٹھی تو سن لوں، سہ

توڑی تانی ہوئی آ

تے کھساں لوں کمان روٹیاں — چٹھی ویر دی آئی ہوئی آ

ایک ہن نے گو بھی پکائی ہے بگھارتے وقت اسے خیال آتا ہے کاش آج بھائی بھی آتا اور گو بھی کھاتا۔ اس خیال سے وہ گو بھی کا کچھ

سالن الگ رکھ دیتی ہے، اتفاقاً آدھی راست کے وقت بھائی بھی ان پہنچتا ہے سہ

اساں گو بھی تو کی اے

تے آدھی راتی ویر آیا — گڑ گائی کھڑکی اے

لاڈلا بھائی عام ذاتیوں کی طرح بھدا لگائے شاہی جوتا پہن کر نہیں آتا۔ اس کے قدموں کی چاپ ہی بنا دیتی ہے کہ ”گڑ گائی کھڑکی اے“

ایک لوگ کہ بھائی سنگدل اور اکل کھڑے لیکن پنجاب کی ہن کو کڑی طرح یقین نہیں آ سکتا کہ کوئی بھائی بھی ایسا بڑا ہو سکتا ہے۔

چنانچہ وہ اس کی بڑائی کا لازم اپنی سیال کوئی بھابھ کے سر پہ پکڑتی ہے، سہ

فیتا — تے بھائی سیال کوٹنے

کیا ویر دا پتھر دل کبیت

گویا ”ویر“ کا دل سیال کوٹن بھائی ہی نے پتھر بنایا ہے۔ وہ تو بچا راموں کی ناک ہے۔

لوگوں کو نہر کے کنارے ایک نوجوان کی لاش پڑی ملتی ہے جسے چروں نے مار ڈالا ہے۔ لاش کو دیکھ کر دہائی لوگ کی خواہش جلت

جوش میں آجاتی ہے اور وہ کہتی ہے۔ آہ! یہ بھی کبھی نفسیوں جلی ہن کا بھائی ہو گا۔ بھائی کی موت اسے ہر دوسرے عزیز کی موت سے

زیادہ دردناک معلوم ہوتی ہے سہ

کھیرا — تے نہر کنڈے چور مارا

کے بھین تھی دا ویرا

غور کیجئے وہ یہ نہیں سوچتی کہ یہ کسی کو کھ کھلی ان کا بیٹا کسی کے بسے بچے کا باپ، ایک کسی نوجوان رانڈ کا شوہر ہے۔ اسے سب سے زیادہ

دردناک موت بھائی ہی کی معلوم ہوتی ہے۔

آزمیں ایک پُرلطف گیت سنئے۔ اس میں رہائی لڑکی کی یکے سخت اور سُسرال سے نفرت بہت چھپ چھپ کر دیکھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔
 یہ گیت بڑے کے گیت کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ہر مصرعہ میں بہن اپنے بھائی کی بلائیں لیتی ہے اور ساتھ ساتھ اپنے پسندیدہ بڑے پر
 فخر کا اظہار بھی کرتی جاتی ہے۔ گیت کا مضمون یہ ہے کہ عالم خیال میں جو بڑے کے کنائشے شرم کے ایک نکتہ پر پہنچتی ہیں وہ دوسرے بھائی
 پہلے وہ بھائی کو قصور میں اپنا سیکہ دکھاتی ہے جہاں اُن کا خوشحال باپ موٹی تازی دو حیل سمیںس جراتاً نظر آتا ہے اور سمیںس کی کمر بول کی
 حفاظت پر اُس کا چھوٹا بھائی مامور ہے۔ اس کے بعد وہ اُسے سُسرال کی ایک جنگ دکھاتی ہے جہاں اُس کا سُسر کنیاؤں کو ہانک رہا
 ہے اور اُس کا دیور کتے کے پلوں کے پیچھے پیچھے پھرتا نظر آتا ہے۔

بڑے کا گیت

واری چچو کنڈے دوٹا ملیاں واری اگلیاں سدھیاں تیر

میرا بٹوا زمے دا

واری اکی ٹاٹلی میں چو دھال، واری اکی جزے میرا دیور

میرا بٹوا زمے دا

واری اُتر دیویرا اُن میں چو دھال واری دیکھئے پکا دیس

میرا بٹوا زمے دا

واری پکیاں دا کی وکیمناں، واری پکیاں دا کی وکیمناں

میرا بابل تے مجھیں چار داتے کنیاں مغر میرا دیور

میرا بٹوا زمے دا

واری اُتر دیویرا اُن میں چو دھال واری دیکھئے سوہرا دیس

میرا بٹوا زمے دا

واری سوہراں دا کی وکیمناں واری سوہراں دا کی وکیمناں

میرا سوہرا تے کنیاں چار داتے کتوریاں مغر میرا دیور

میرا بٹوا زمے دا

حامد علی خاں

یہ مضمون کسی قدر مختصر صورت میں آل انڈیا ریڈیو بورڈ سے نشر کیا گیا تھا اور یہ جیل جانت شائع ہو گیا ہے۔

موسیٰ نے اسی کو طور پر دیکھا ہے

(۴)

خطاب صوفی صاحب :-

صوفی صاحب ! ذرا مراقب ہو کر کچھ آپ اپنی زباں سے فرمائیے گا
کہتے ہیں کہ خدا؛ تو ارشاد ہوا وہ ساتھ ہے آپ کے جہاں جائیے گا
مظہر ہیں اسی کے سب، یہ سافل عالی
خود اپنا وجود، اس سے کب ہے خالی

(۵)

خطاب شاعر :-

شاعر صاحب ! خدا کو تم کیسا سمجھ شاعر بھی تو دور کی خبر لاتے ہیں
کچھ وزن میں گنگن کے یوں فرمایا ہم اپنے خیال میں اسے پاتے ہیں
دنیا والے خیال کہتے ہیں اسے
ہم اجلوہ ذوالجلال کہتے ہیں اسے

(۶)

خطاب امجد صاحب :-

امجد صاحب ! کچھ آپ ارشاد کریں ہم بھی تو نہیں کہ آپ کیا کہتے ہیں
فرمایا کہ یُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ کے تحت ہم طاقتِ غیبی کو خدا کہتے ہیں
وہ طاقتِ غیبی، جو محیطِ اکمل ہے
ثابت کرتی ہے جس کا ہونا، ہر شے

راوی

کوئی نہ ملا، اس سے بلا نے والا دیکھا نہ گیا، کوئی دکھانے والا
اس دور میں ایک بھی کو لبس نہ ہوا امریکہ کا پستہ چلانے والا

ہم موردِ الطاف و کرم کس کے ہیں یا غورِ صد جو رستم کس کے ہیں
ہر چیزِ جہان میں ہے اس کی، اس کی لیکن نہیں معلوم کہ ہم کس کے ہیں؟

سمجھایا ہر اک نے اپنے اپنے ڈھب سے لیکن ہم کو تو کوئی رستہ نہ ملا
پہچے ہم اسی فکر میں اک دوست کے گھر وال کھیل رہا تھا ان کا کم سن بچہ
پھولے ہوئے گال، رخ پر بکھرے ہوئے بال اک چاند کا ٹکڑا، بدر کا ل کی مثال

ہم نے اسے گود میں اٹھا کر پوچھا معصوم فرشتے! تم ہی کچھ سمجھاؤ
بولو، کہ خدا کہاں ہے؟ اور کیا ہے؟ ہنس کر بولا، کہ وہ گھر میں آؤ

جس کو تم لو پچھتے ہو، وہ تو بیاں ہے
کیا تم کو بتا ہی دوں؟ وہ میری ٹاں ہے
بچوں کی زباں پر ہے ہر دم انی
تم کہتے ہو ربّی، ربّی، اور ہم، انی
رباعی

متوالہ مثل :-

تم بھی یوں ہی تمام رحمت ہو جاؤ دُنیا کے لئے موجبِ راحت ہو جاؤ
بن سکتے ہو تم خود بھی خدا، اگر چاہو بس کچھ نہیں بندہ محبت ہو جاؤ

رباعی

رب، اپنے ہر اک بندے کے ہمراہ ہوا اس واسطے انتظامِ دل خواہ ہوا
ہے رحم و کرم ہی سے خدا کی کاواج اللہ بھی محبت ہی سے اللہ ہوا

سید احمد حسین امجد

اگلے وقتوں کی دلی

تذکرہ دہلی مرحوم کا اسے دوست چھپڑا دے سنا جائے گا ہم سے یہ فانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح دیکھ اس شہر کے گھنڈروں میں نہ جانا ہرگز (رحاں ج)

جنا کے اس پاس کے اُس علاقے میں جوار دلی کی پہاڑیوں کے انتہائی شمالی سرے کے قریب ہے قدیم زمانے سے
کئی بڑے بڑے شہر ایک دوسرے کے بعد بس کر اُجڑتے رہے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا شہر اندر پرست تھا جو سماجیات
کی روایت کی رُو سے پانڈوؤں کے سردار یدیشٹر نے آباد کیا تھا۔ اس میدان پر قبضہ جمانے کے لئے بڑی خوزیر لڑائیاں
ہوئیں۔ یہ شہر عظمت و شوکت میں ہومرا دور و جل کے یونانی شہروں الیڈ اور آئینیڈ سے کم نہیں تھا۔

دلی بھی اسی علاقے میں مختلف مقامات پر بس کر اُجڑتی رہی اور جتنے انقلاب اس نے دیکھے ہیں ہندوستان کے کسی اور شہر
نے نہیں دیکھے ہوں گے۔ یہ شہر صرف بڑی بڑی سلطنتوں کی راجدھانی رہا ہے بلکہ اس کے دامن میں کئی تہذیبوں اور تمدنوں کے
پردہ نش پائی جن کے آثار آج تک ہماری آنکھوں کے لئے عبرت کا سرمایہ ہیں۔

زشتہ لکھتا ہے کہ سب سے پہلے راجہ دتو نے سکندر اعظم کے حملے سے پہلے دلی کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن یہ نظریہ قابلِ اعتبار
نہیں۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

اول یہ کہ یونانی غور غزل نے سکندر اعظم کے حملے کے جو حالات لکھے ہیں اُن میں دلی کا کہیں ذکر نہیں۔ اگر اُس وقت دلی
آباد ہوتی یا اُسے وہ نمایاں حیثیت حاصل ہوتی جو بعد میں ہوئی تو اس پر سکندر کی نظر ضرور پڑتی یا کم از کم یونانی مؤرخ اس کا ذکر ضرور
کرتے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مسیح ستین سال پہلے جو سکندر اعظم کے حملے کی تاریخ ہے دلی کا نام و نشان تک نہیں
تھا۔ اس کے بعد دوسری صدی قبل مسیح میں یونان و باختر کی متحدہ فوجیں حملہ آور ہوئیں۔ اُن کے تذکرہ میں بھی دلی کا نام کہیں
نہیں آتا۔

چینی سیاح فاہیان اور ہون سانگ جو پانچویں اور ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آئے اُن کے سفرناموں میں مذمت
کے مقدس مقامات کا ذکر تو ہے لیکن دلی کا نام موجود نہیں۔

اب ذرا آگے چلے۔ محمود غزنوی نے پہلی دفعہ ایک ہزار عیسوی کے قریب حملہ کیا اور اس کے بعد کئی متواتر حملے کئے۔ اس کے

حاصل میں قنوج اور تنہا کے ساتھ دلی کا ذکر کہیں نہیں آیا۔

دلی کا نام پہلی دفعہ ایک پڑائے منظم قصبے میں آتا ہے جس میں لکھا ہے کہ آٹھ سو برس تک یہ شہر ویران رہا۔ اس کے بعد بارہ آباد ہوا۔ افسوس کہ پچھلے دو تین ہزار سال کی تاریخ ہی نہیں ملتی۔ مکتبوں سے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں، ان کا تعلق زیادہ تر مذہبی امور سے ہے۔

تاریخ میں پہلی دفعہ دلی کا ذکر راجہ انگ پال کے نام کے ساتھ آتا ہے جس نے سن ۱۰۵۲ء میں یہ شہر آباد کیا۔ دلی کی مشہور ہے کی لاٹ بھی یہی تاریخ درج ہے۔ اگر اس منظم قصبے کی روایت درست مان لی جائے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دلی تین سو مہیسوی کے قریب آباد ہوئی۔ پھر آٹھ سو سال تک ویران رہی اور انگ پال نے اسے نئے سرے سے بسایا۔ انگ پال کو ماٹھ قوم کا راجہ تھا۔ اُس نے دلی کا شہر اُس مقام پر آباد کیا تھا جہاں آج کل قطب مینار ہے۔ اس علاقے کے ارد گرد جس پڑائے قطعے کے سنے ہوئے آثار موجود ہیں وہ انگ پال ہی نے بنایا تھا۔ وہی کی لاٹ بھی انگ پال نے تنہا سے لاکر یہاں نصب کی تھی۔

لاٹ کے متعلق ایک عجیب غلط روایت مشہور ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ ایک برہمن نے راجہ کو خوش کرنے کے لئے یہ افساد تراش کا لاٹ اتنی گہری چلی گئی ہے کہ مٹیش ناگ کا سر جو دھرتی کو سمٹھا لے ہوئے ہے اور دنیا کے انقلابات کا باعث ہے اس سے زخمی ہو گیا ہے۔ اور اب وہ کوئی حرکت نہیں کر سکے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شہر پر ہمیشہ راجہ انگ پال کا خاندان حکمران رہے گا اور یہاں کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ راجہ یوگیش کو بہت خوش ہوا لیکن اُسے یقین نہ آیا۔ اہلینان حاصل کرنے کے لئے لاٹ کو کھدوایا تو واقعی اُس کا سر اخون سے بھرا ہوا تھا۔ راجہ نے حکم دیا کہ لاٹ کو اُسی مقام پر دوبارہ نصب کر دیا جائے لیکن اُسے برہمن کی بات پر یقین نہ کرنے کی یہ سزا ملی کہ لاٹ پہلی سی مضبوطی کے ساتھ زمین میں نہ جم سکی اور ”میلی“ رو گئی۔ اسی وجہ سے شہر کا نام ”دہلی“ پڑ گیا۔ یہ روایت اس اعتبار سے بھی ناقابل یقین ہے کہ دلی کا لفظ تو ماٹھا خاندان سے بہت پہلے کا ہے۔

انگ پال کا خاندان سو سال تک دلی پر حکمران رہا۔ اس کے بعد اجمیر کا چوہان راجہ وصال دیو اس شہر پر قابض ہو گیا۔ وصال دیو کا پوتا پرتھوی راج اجمیر اور دلی دونوں پر حکومت کرتا رہا۔ اُس نے ”لے پتھور“ کے نام سے دوسرا شہر آباد کیا جس کی کشتہ دیواریں قطب مینار کے ارد گرد دوڑتے نظر آتی ہیں۔

پرتھوی راج کی موت کے ساتھ ہندو دہلی کی تاریخ ختم ہو گئی۔ ہندو دہلی کے تمدن کی تاریخ ختم ہو گئی۔ لیکن کم از کم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی کے اخیر میں یہ ہندوؤں کا مشہور ترین شہر تھا۔ اس میں ستائیس کے قریب مندر تھے۔ لوگ امن و امان کی زندگی بسر کرتے تھے اور ابتدائی مسلمان حملہ آور بھی اُن کے آرام و سائش اور دینی زندگی کی آزادی پر بخیر نظر

نہیں ہوتے تھے۔

محمد غوری کے انتقال کے بعد اُس کے غلام قطب الدین ایک نے دلی کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور غلامانِ غلامان کی بنیاد رکھی۔ دلی کی بُرائی عام مسجد قوت الاسلام کی تعمیر فتح دہلی کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔ قطب مینار اسی عظیم الشان مسجد ایک مینار ہے جس پر سے اذان دی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کی یادگار ہے لیکن اس کی مغربی دیواروں اور بعض دُھڑے جھٹول پر باریک نقاشی ہندو فنِ تعمیر کی یاد دلاتی ہے۔ ابن بطوطہ نے جو سلطان محمد تغلق کے زمانے میں دلی آیا اس مسجد کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ مسجد اس قدر وسیع و خوبصورت اور اس کا مینار اس قدر عظیم الشان ہے کہ اسلامی دنیا میں ان کی نظیر نہیں، امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن الشہیدین میں بادشاہ کے ذکر کے ساتھ اس مسجد کا ذکر یوں کیا ہے

مسجدِ واجبِ مع فیضِ الہ
نہرِ مرزِ خطبہ اوتا بہ

غلامانِ غلامان کے بادشاہ خود عالمِ وفا منسل اور علماء و فضلاء کے قدر دان تھے۔ اُن کے زمانے میں علوم و فنون نے بہت ترقی کی۔ آتشِ عدل و انصاف کے ساتھ علم و فضل کی دولت سے بھی ملامال تھا۔ بلین کے متعلق بھی یہی لکھا گیا ہے۔ بلین کا بڑا دوکا خان شہید جو ولی عہد اور سندھ کا گورنر تھا عالمِ ادب و سخن فہم تھا۔ اہل علم کی بہت قدر کیا کرتا تھا۔ اس زمانے کے مشہور فقیہ اور صوفی سلطان نظام الدین اولیاء کے مرید ابنِ خاص امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی کے علاوہ اور بہت سے علماء اس کی ملازمت میں تھے یہی خسرو کے شراب بھی حمد و ثناء میں ہیں اور اُس زمانے کی یادگار میں سے

رہے نہ ایک غوری کے عرصے کے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمہ خسرو

اس زمانے کے ایک اور عالم و فاضل اور خدا رسیدہ بزرگ قطب الدین بختیار کاکی تھے۔ ایک دفعہ قوال شیخ احمد صیام زند پیل

کا یہ شعر پڑھ رہے تھے

کشتگانِ خجستہ تسلیم را
ہر زمان از غیب جانے دیگر است

کہ بعد کی حالت میں آپ کا وصال ہو گیا۔ سلطان شمس الدین آتش نے بھی اسی سال وفات پائی۔

آتش سے سلطان علاء الدین خلجی تک کا وہ زمانہ تھا کہ منلوں کے لشکر تمام ایشیا اور یورپ کے مشرقی جھٹول کو تہہ بالا کر رہے تھے، ان بادشاہوں نے منلوں کے پے درپے حملوں کا مقابلہ کیا۔ حملہ آوروں کی روک تھام کی مشکلات کے باوجود اس عہد میں علوم و فضل کی جو قدر ہوئی وہ قابلِ تعریف ہے۔

علاء الدین خلجی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے سہری کے مقام پر فوجیں رکھا کرتا تھا۔ جب منل واپس چلے گئے تو پُرانے شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھ کر اُس نے اس جگہ تیبہ و آشور کا بادیا۔

غیاث الدین تغلق نے مشرق کی طرف چارسل کے فاصلے پر ایک نیا دارالخلافہ تغلق آباد کے نام سے بنایا۔ یہ دلی کا چوتھا شہر تھا۔ اس کے کھنڈر بھی اب تک موجود ہیں۔ شاہی خزانے اور محل یہیں تھے۔ اس نئے شہر میں بادشاہ نے ایک عالیشان محل تعمیر کرایا تھا جس کی اینٹوں پر سونا چڑھا ہوا تھا۔ جب اس پر شریع کی شاعیاں پڑتیں تو کوئی اس کی طرف آنکھ جکارتیں دیکھ سکتا تھا۔ تغلق خاندان کے دوسرے بادشاہ محمد تغلق نے علاء الدین کے زمانے سے پہلے کی دلی اور سہری کے ارد گرد ایک تفصیل کھینچ کر دو ذول شہرول کو ملا دیا اور اس پانچویں شہر کا نام جہاں پناہ لکھا۔ اس شہر میں ایک ہزار مدرسے اور ہزار مسجدیں اور شہر ہسپتال تھے۔ شہر کے باہر دوسیل لہا اور ایک میل چوراہے میں تھا جس کا نام ”حوض شمس“ تھا۔ اس کے علاوہ چالیس گنبدوں والا ایک ”حوض خالص“ تھا جہاں اہل طرب کا جھنگٹا لگا رہتا تھا اور اسی نسبت سے اسے ”طرب آباد“ بھی کہتے تھے۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ محمد تغلق کے زمانے میں دلی آیا۔ بادشاہ نے اسے شہر کا قاضی بنا دیا اور وہ کوسال تک وہیں رہا۔ اس نے اپنے سفر نامے میں ”شہر کی خوبصورتی، پابنداری اور فراخی کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی تفصیل جس کی کوٹھڑیوں میں غلے کے کتے یا نابار معذور رہتے ہیں بے نظیر ہے۔ شہر کے اٹھائیس دروازوں میں سے بعض مشہور یہ تھے۔

(۱) تپالیوں دروازہ (۲) مندوی دروازہ (۳) گل دروازہ (۴) کمال دروازہ (۵) ”غزنی دروازہ“۔

محمد تغلق کے زمانے کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ اس نے اپنی رعایا کو دلی چھوڑ کر دولت آباد جانے پر مجبور کیا یہاں تک کہ شہر بالکل ویران ہو گیا۔ اسی پھر دوسرے شہروں سے لوگوں کو لاکروہاں آباد کرنا پڑا۔

محمد تغلق عربی اور فارسی کا ماہر اور فصیح و شاعر بھی تھا۔ شاعر اور خوش نویس بھی تھا۔ تاریخ، طب، حکمت، نجوم، ریاضی اور منطق میں مہارت حاصل تھی۔ سفروں پر بادشاہ اسے علوم و فنون جاننا ہو وہ دوسرے عالموں اور فاضلوں کی بھی قدر کرے چنانچہ بادشاہ کے ساتھ خاص دسترخوان پر دو ذول وقت دوسرا عالم اور فاضل کھانا کھایا کرتے تھے اور اس وقت علمی گفتگو ہوتی تھی۔

اس نے نہ صرف دلی کے علما کو اپنی سخاوت سے مالامال کیا بلکہ دوسرے ممالک کے فضلاء کی بہت افزائی بھی کی کہ انھیں شہر میں اندگانی حکیم اور شاعر کو رخصتوں کے قصیدے کے صلے میں ہر بیت کے عوض ہزار دینار کے حساب سے انعام دیا۔ عبدالعزیز بن ابی نعیم اور محدث کو سنسنے کی تھالی میں دو ہزار اشرفیال پیش کیں۔ خواجہ حافظ کے ہم عصر قاضی عبدالعزیز بن دس ہزار روپیہ بھیجا اور جب اسے معلوم ہوا کہ برہان الدین واصل کو قرض لے کر سخاوت کرنے کی عادت ہے تو اسے اپنے وطن میں چالیس ہزار دینار بھیجے اور ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس رقم سے قرض ادا کر دیا اور ہندوستان نہ آئے۔

فیروز شاہ تغلق نے سری کے شمال مشرق کی طرف اپنا نیا دارالخلافہ فیروز آباد کے نام سے بنوایا۔ یہ گویا چھٹی دلی تھی۔

محمد تغلق کے زمانے میں امیر تیمور نے حملہ کیا۔ اگرچہ محمود نے شکست کے بعد سلطنت کا کچھ حصہ دوبارہ حاصل کر لیا۔ لیکن چوڑہ

بس کے بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ پندرہویں صدی کے وسط تک خاندان سادات نے حکومت کی جس کے بعد لودھی خاندان نے اگرہ کو دارالخلافہ بنالیا۔

ہمایوں نے پھر دہلی کو دارالخلافہ بنایا اور پڑانا قلعہ تعمیر کیا۔ ہمایوں شہر و سخن کا دلدادہ تھا اُس کے دربار کے فارسی شاعروں میں یہ نام قابل ذکر ہیں :- جذبِی بخشائی، انکا حیرتی، نادری سمرقندی، شیخ ابوالواحد فارغی اور حیدر قوتبائی۔ یہ شیر شاہ سُوری نے ہمایوں کو شکست دے کر فیروز آباد کے مقام پر از سر نو دلی تعمیر کی اور اس کے گرد ایک فصیل کھنچوائی۔ یہ دلی کا سابقہ شہر شیر شاہ کے عہد میں اس نے بہت ترقی کی۔ نئے باغی اور درگوں سے اس کی رونق کو چارچاند لگ گئے۔ ڈاکوؤں اور شیروں سے محفوظ ہو گیا۔ مریضیں لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں دلی کے اس دامان کی یہ حالت تھی کہ اگر سڑک پر کسی چیز نظر آتی تو کسی کو اُسے بڑی نیت سے دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ شیر شاہ نے بہت سی سماجی اصلاحیں بھی کیں۔ ہمایوں نے دلی پر دوبارہ قبضہ کیا تو چھ مہینے کے بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ اکبر اور جلالگیر کے زمانے میں دلی دارالخلافہ یا اگرہ تھا یا لاہور۔ اس لئے دلی کی اگلی بھی حالت نہ رہی۔

آخری اور آٹھویں مرتبہ شاہ جہان نے ۱۶۳۸ء اور ۱۶۵۶ء کے درمیان فیروز شاہ اور شیر شاہ کے شہروں کے کھنڈروں پر موجودہ دلی بنائی اور اس کا نام شاہ جہان آباد رکھا۔

برنیر لکھتا ہے کہ شاہ جہان آباد جہاں کے دائیں کنارے ہلال کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ فصیل کا دو چھ سات میل کے قریب تھا۔ دروازوں کے باہر امراء کے لئے بہت سے باغات اور عشرت گاہیں تھیں۔ شاہی محل اگر دُنیا بھر میں نہیں تو مشرق میں اپنی نظیر آپ تھا۔ فنون لطیفہ اور صنعت و حرفت کا بازار اس قدر گرم تھا کہ کارواں سرائیں ہمیشہ سودا گروں سے آباد رہتی تھیں۔ مستوروں اور کارگیروں کی حوصلہ افزائی بھی کھول کر کی جاتی تھی۔

امراء نے بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق وسیع اور عالیشان مکانات بنوائے۔ ان میں قمر الدین خاں، علی مردان خاں، غلام علی خاں اور صفدر جنگ کی حویلیاں بہت مشہور تھیں۔ حویلیوں میں، مطبل، حمام، باغ اور محل سرائیں بھی شامل تھیں۔ دوسرے کچھ بہت عمدہ تھیں۔ ایک قلعے سے دہلی دروازے کو جاتی تھی جس میں فیض بازار اور نہرتھی۔ دوسری قلعے سے لاہوری دروازے کو جاتی تھی۔ جس میں چاندنی چوک اور کھارسی باؤلی ہے۔ چاندنی چوک جس میں بارہاٹن کی ندیاں بہ چکی ہیں، دُنیا کے پر رونق اور سب سے قیمتی بازاروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ شاہ جہان نے ڈیڑھ کروڑ روپے کے صوف کپڑوں سے ایک شالہ مار باغ بھی بنوایا تھا مگر اب اُس کا کوئی نشان باقی نہیں۔

لال قلعے کی تعمیر شاہ جہان کی حکومت کے پہلے دس سالوں کے درمیان ہوئی۔ اس کی عمارت میں دیوان عام اور دیوان

خاص تہا بل ذکر میں۔ دیوان عام کا طرز تعمیر سبب دانہ ہے۔ یہ عمارت کس طرح کے ساتھ ستونوں پر کھڑی ہے تختہ طاؤس جسے نادر شاہ ایران لے گیا تھا اسی ایران کی کھلی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ فرانسیسی جہزی ٹورسیر جس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا، لکھتا ہے کہ یہ عظیم الشان تخت بیس یا بیچس اینچ بلند چار سہری پاؤں پر کھڑا تھا۔ تخت کے اوپر چھتر کے نیچے بارہ تنوں تھے۔ تخت لعلوں، زمردوں اور موتیوں سے جڑا ہوا تھا اور اس کی لاگت کا اندازہ ساٹھ لاکھ پونڈ تھا۔ دیوان خاص میں سنگ مرمر پر نقاشی نخل آرٹ کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔

قلعے کے دوسال بعد جامع مسجد کی تعمیر ہوئی۔ اردو یعنی ہندوستانی زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر کے ملاپ کی یادگار ہے، اسی کی سرچسوں پر پھلی بھولی، اور یہی سرچسبیاں اس زبان کے بچپن کا گوارہ تھیں۔

یہ سب وہی جس نے سات شمال میں نعمت درجن سے زیادہ انقلابات دیکھے، جس کی عظیم الشان شاہی عمارتیں جس کے کندہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عظمت کا افشاں سنار ہے ہیں اور جس کی خاک میں علم و فن، فضل و حکمت اور فقر و شاہی کے وہ گوبر نایاب پوشیدہ ہیں جن کی آفتاب اب بھی آنکھوں میں چمکا چوند پیدا کر رہی ہے، یہ سب دلی، جس کا آغاز شمشیر و سال سے اور جس کا انجام طاؤس و رباب "پر ہوا۔ علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے سے

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیر اُمم کیا ہے

شمشیر و سال اول، طاؤس و رباب آخر

حفیظ ہوشیار پوری (برجانت آمل انڈیا ریڈیو)

اردو

ہند کی ساری زبانوں کی سہ سالار اردو	{	سب زبانوں سے ریلی ہے زبان اردو
کسی عنوان سے بھی دیکھو تو ہے سر دار اردو		سادہ و دلکش و شیریں ہے بیان اردو
میرسی و شامی و رومی کو بھی آساں ہے یہ		اس میں کچھ مذہب و ملت کی نہیں ہے تخصیص
ہندو والوں کی تو بے شبہ ہے مخوار اردو		عام ہے سب کے لئے لذتِ خوان اردو

غلام السین (لدھیانہ)

غزل

وہ نہ ہوں تنخیل میں بھی دل کا جب ماتم رہے
ہم نفس اُن کا تصور کیوں شریکِ غم رہے
صورت ایسی بے تماشا حسرتِ پیہم رہے
جلوہ ایسا آنکھ دیکھے اور نامحسوس رہے
دیدنی ہے اختیارِ گریہ پر یہ صبر و جبر
ہائے وہ آنسو کہ جو آنکھوں میں آ کر تمہارے
تم سراپا حُسن ہو پر عشق سے بیگانہ ہو
یہ وہ دُنیا ہے کہ اس دُنیا میں ہم ہی ہم رہے
دینے والے لذتِ غم ہی نہ کھو دینا کہیں
لے اور اتنا دے مجھے احساسِ رنج و غم رہے
فکر رہتی ہے یہی بگڑے نہ ظالم کا بناؤ
ہم کو الجھن ہو تو ہوزلفوں میں تیج و خم رہے
سب ہی اچھے ہو گئے گلزارِ خوبی کے مریض
اُن کے پیاروں میں اک نرس رہی اک ہم رہے
ضبط کے معنی یہ ہیں ٹپکے نہ آنسو ایک بھی
عاشقوں کی آبرو اُسے دیدہ پر خم رہے
قصۂ فرقت نہ سُننا ہی بہت اچھا ہوا
آپ کے عشرت کدہ میں کیوں کسی کا غم رہے
چار کے کاندھوں پہ ہوں اندر سے بیچارگی
پائے نافرماں لحد کا قرب پا کر تمہارے

مکراتے بزم کی بالیں پہ آجائیں جو آپ
زندگی کو رشک ہو وہ موت کا عالم رہے

مرزا عاشق حسین بزم

واقعات سنہ ہجری پر ایک نظر

۱؎ ہلالی تھا۔

۲؎ تمام اطراف عرب کے نہایت کثرت کے ساتھ سفارتیں آئیں اور ہزاروں لاکھوں آدمی اسلام کے حلقہ میں آئے۔

۳؎ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا اور خلافت کا سب سے پہلا زینہ قائم ہوا اور تمام امت نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنا امام تسلیم کیا۔

۴؎ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنا امام تسلیم کر کے انتقال فرما گئے اور اسی سال حضرت عمرؓ نے غنائم فتح اپنے ہاتھ میں لی۔

۵؎ حضرت عمر فاروقؓ نے تراویح کی نماز کے لئے رب کو جمع کیا۔

۶؎ حضرت سعدؓ نے کوفہ آباد کیا۔

۷؎ بعد ازاں کے شہر حبلہ لایں ایسی زور سے آمدنی آئی کہ زمین و آسمان میں اندھیرا چھا گیا اور اسی زمانہ میں ادویہ ایروں کی زبردست لڑائی ہو رہی تھی حضرت سعدؓ نے عراق میں سب سے پہلی بار جمعہ پڑھا اور اسی سال بیت المقدس فتح ہوا۔ حضرت عمرؓ صحابہ کرام و دیگر مرزا کے مشورہ سے سنہ ہجری قائم ہوا۔ آنحضرتؐ مسلم نے

۱؎ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور اسی سال مسجد نبویؐ کی تعمیر ہوئی۔

۲؎ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ ابوجہل اسی لڑائی میں مارا گیا اور نماز روزہ بھی اسی سال فرض ہوئے۔

۳؎ جنگ اُحد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے اور اسی سال آپؐ نے حنفہؓ سے نکاح کیا۔

۴؎ شراب حرام ہوئی اور امام حسینؓ کی ولادت ہوئی۔

۵؎ الاسفانیہ کی سپہ سالاری میں دس ہزار قزاق کے سیلاب نے مدینہ کا رخ کیا۔ آنحضرتؐ نے مدینہ سے باہر نکل کر سنگ کے آگے ایک خندق تیار کر رکھی جس کا رواج اس سے پہلے عرب میں نہ تھا۔

۶؎ آنحضرتؐ نے چودہ سو پیدل اور دو سو سواروں کے ساتھ خیبر کا رخ کیا اور اسی سال عرب حضرت عائشہؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔

۷؎ آنحضرتؐ نے کعبہ فتح کیا۔

۸؎ آنحضرتؐ نے ازواج مطہرات کے ناراض ہو کر علیحدگی اختیار کر لی جس کی وجہ سے لوگوں کو گمان ہوا کہ آپؐ تمام ازواج کو طلاق دے دی ہے۔ اس سے سب کو رنج تھا لیکن حضرت عمرؓ کے کہنے پر آپؐ نے سب کو

۳۵ حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ بنائے گئے۔
 ۳۶ کوفہ میں حضرت علی کو جبکہ نماز میں جمع کے واسطے
 مسجد جا رہے تھے عبدالرحمن ابن عجم نے زہر کر دیا تو زہر
 سے زخمی کیا۔

۳۷ حضرت امام حسن کے بعد حضرت معاویہ تمام عالم
 اسلام کے خلیفہ مانے گئے۔

۳۸ امیر معاویہ کا رویوں سے پہلی بار مقابلہ ہوا۔
 رویوں نے شکست فاش کھائی اور ان کے بطریقوں
 کی بڑی تعداد کام میں آئی۔

۳۹ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کربلا کے شہید کر ڈالا گیا۔
 ۴۰ جنادہ بن امیہ نے روم کو فتح کیا اور مصر
 امیر معاویہ نے یہاں بہت سے مسلمان آباد کیے۔

۴۱ یزید خلیفہ ہوا۔
 ۴۲ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت امام حسین بمقام کربلا
 میں کثیر رنقا اور عزیروں کے شہید ہوئے۔

۴۳ یزید نے مکہ معظمہ میں منعقد سے پتھر برسائے
 جن کے شراروں سے کعبہ شریف کا پردہ اور اس کی
 چھت اور اس دُنب کے بیگ جو حضرت اسماعیل علیہ السلام
 کے مذہب کے لئے بھجایا تھا اور جو اب تک خانہ کعبہ کی
 چھت میں آویزاں تھے اسب جل گئے اور اسی سال خدا
 نے یزید کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا۔

۴۴ یزید کا بیٹا معاویہ وراثتِ خلافت ہوا۔
 لیکن وہ خود ہی چند روز کے بعد خلافت سے دستبردار ہو

ربیع الاول میں ہجرت فرمائی تھی۔ اس لئے ہجری کی
 ابتداء ربیع الاول سے ہونی چاہئے تھی۔ مگر چونکہ عرب میں
 سال محرم سے شروع ہوتا ہے اس لئے دومینہ آنکھ دن
 چھوڑ دیئے گئے۔

۴۵ شام و مصر و عراق میں سخت وبا پھیلی۔ اور اسلام
 کی بڑی بڑی یادگاریں خاک میں مل گئیں۔ کوفہ میں آگ
 لگ گئی جس سے جامع مسجد، ایوان حکومت، دفتر اور قیادہ
 کی عمارتیں جل گئیں۔ حجاز میں سخت قحط پڑا۔ لیکن جب
 لوگوں نے صدقِ دل سے دعائیں مانگیں تو اسی وقت
 بارش شروع ہوئی اور کئی روز تک متواتر رہی۔

۴۶ حضرت عمر نے حنیفہ اور بخراں سے یہود کو
 جلاوطن کیا اور اسی سال نمازِ فسخ ہوا تھا۔ اس فسخ
 پورے عراق و عجم پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس لڑائی میں
 تیس ہزار عجمی مارے گئے۔

۴۷ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہادت نصیب ہوئی۔
 ۴۸ حضرت عثمان بن عفان تختِ خلافت پر فائز ہوئے۔
 ۴۹ حضرت عثمان نے کچھ مکانات خرید کر مسجدِ حرام
 کو وسیع کر دیا۔

۵۰ امیر معاویہ پہلی مرتبہ اسلامی بیڑائے کھڑوے
 میں اترے۔

۵۱ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو دیئے گئے۔ اور
 امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلافت پر بطورِ فرائض

کر دوسرے ماہ وفات پا گیا۔

۱۲۸۰ء حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ کو قہر میں پیدا ہوئے۔

۱۲۸۳ء حجاج نے شہر واسط کی بنیاد ڈالی۔

۱۲۸۵ء ولید نے جامع دمشق کی بنیاد ڈالی اور اسی سال

مسجد نبوی کی توسیع اور تعمیر کے احکام جاری کئے۔

۱۲۸۶ء عربوں نے طارق بن زیاد کی قیادت میں

ہسپانیہ کو فتح کیا اور اسی سال ہندوستان میں مسلمان

داخل ہوئے۔

۱۲۸۷ء منصور نے شہر بغداد کی بنیاد ڈالی۔

۱۲۸۹ء منصور بغداد کی تعمیر سے فارغ ہوا۔

۱۲۹۰ء حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ نے بغداد میں انتقال فرمایا۔

۱۲۹۱ء منصور نے شہر امام کو بنایا اور اُس کی دیواروں

میں مضبوطی کے واسطے چوڑے گچ وغیرہ لگایا۔

۱۲۹۲ء مہدی نے مکہ منکرہ کی سروک اور سرائے اور

حریم بنوائے۔

۱۲۹۳ء امام احمد بن حنبل بغداد میں تولد ہوئے۔

۱۲۹۴ء مہدی نے چین میں سب سے پہلے انڈول و پتھر کو

کی ڈنگ مقرر کی اور اُسی نے تجار اور عراق میں بھی۔

۱۲۹۵ء مہدی نے توسیع مسجد حرام کے متعلق حکم دیا اور

اس میں بہت سارے شہل کرے۔

۱۲۹۶ء مہدی نے شکار کے لیے چھ گھوڑا ڈالا۔ شکار

ایک ہڑے گھریں جاگسا۔ گھوڑے نے تھما ڈولا تھما ڈولا

میں گھس گیا۔ مہدی کی کمر میں دروازہ کے اندر داخل تھے

ہوئے ایسی چٹ لگی کہ مہدی اسی وقت جاں بحق تسلیم ہو گیا۔

۱۲۸۰ء عہد ہارون الرشید میں ایک سخت زلزلہ آیا جس

کے صدر سے اسکندریہ کے مناروں کے اوپر کا حصہ

گر پڑا۔

۱۲۸۳ء ارمینیہ میں ہر دورت خندہ ہوا۔ قوم خراج نے

مسلمانوں کی بہت زیادہ غزیری کی۔ حتیٰ کہ انہوں نے

ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو قید کر لیا اور بہت شہید کر دیے

۱۲۸۹ء رومیوں نے اپنے یہاں سے مسلمانوں کو نکال

دیا اور وہاں کوئی بھی مسلمان نہ رہا۔

۱۲۹۲ء ماموں نے حدود روم کے قریب قوا میں جو

ایک سموری قصبہ تھا ایک شہر بنایا۔

۱۲۹۶ء بادشاہ روم نے طاعون وغیرہ سے بچ کر نہایت

بے رحمی سے دو ہزار مسلمان شہید کر دیے۔

۱۲۹۸ء خلیفہ المعتصم ہاشمی نے بابک کے مقابلہ میں جب

فتح پانی توبہ سے پہلے بغداد میں اس کی فوج کو بھڑکایا۔

۱۲۹۹ء عراق میں نہایت زور سے باوجود مہدی علی بن علی کی

وجہ سے کوڈا، بقرہ اور بغداد کی تمام کمینیاں جل گئیں

اور سا فرماک ہو گئے۔ یہ نقشہ پچاس روز تک اسی طرح

رہا۔ حتیٰ کہ ہمدان میں بھی آگ پہنچ گئی۔ اور وہاں کی گھنیا

بھی جل گئیں اور میثی مر گئے۔ شکاریاں میں بھی یہی حال

ہو گیا۔ لوگوں نے بازوؤں میں نکلنا بند کر دیا اور ہتھوں

کی آمد و رفت ترک کر دی اور ایک خلعت عظیم اس قیامت

کی نند ہو گئی۔ اس کے بعد دمشق میں زلزلہ آیا اور ایسا

میں پھیل گئی۔ پھر آسمان سے ایک پادری گری جس کا وزن تقریباً ڈیڑھ سو درہم تھا۔ اس ہوائے پانچ سو درخت گھیر دیئے۔ پھر آسمان سے سیاہ سفید پتھر برسے۔

۳۲۹۳ء جلوس بے حد طغیانی آنے کی وجہ سے بغداد کا اکثر حصہ تباہ ہو گیا۔

۳۲۹۴ء منصور اوٹ پر سوار ہو کر بغداد آیا اور اتنا سختی کا دعوے کیا۔ المعتد بائند نے اُسے قید کر لیا۔

۳۲۹۵ء معتد بائند نے اپنے پانچ لوگوں کے غنڈے کرائے میں چھ لاکھ دینار خرچ کئے اور اسی سال قوم دیکم جو جمعی تھی جن بن علی کے ہاتھ پر سلمان ہوئی۔

۳۲۹۶ء حامد بن عباس نے جو بغداد کا حکم تھا۔ بغداد پر بڑا ظلم کر دیا۔ جس کی وجہ سے رعایا میں بے چینی پھیل گئی اور غارت گری شروع ہو گئی۔ کئی روز تک لڑائی جاری رہی۔ قید خانوں میں آگ لگا دی گئی۔ وزیر مملکت کو پتھر مار کر ہلاک کر ڈالا۔ اور دولت عباسیہ کا بدتر حال کر دیا۔

۳۲۹۷ء قاضی ابو عمر حفصہ کے فنودوں کے موافق منصور سولی پر چڑھا دیا گیا۔

۳۲۹۸ء دجلہ کا پانی اتنا بھجھ بڑا کہ جالوز اس پر چلنے لگے۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔

۳۲۹۹ء دیماط میں رومی گھس آئے۔ شہر کو ٹوٹا اور جامع مسجد میں ناقوس بجا دیا۔ اور دیکم نے رے اور جبال پر حملہ کیا۔ غنڈے کو قتل اور بچوں کو ذبح کر ڈالا۔

۳۳۰۰ء معتد بائند نے قزامل کے متعلقہ کچے علاقے میں

ایک ہزاروں مکان گر گئے اور اُن کے بچے مدافط میں دب کر مر گئے اور یہی حال ان کا کچھ جزیرہ اور موصل میں بھی ہوا۔ اس خوفناک دہشت میں پچاس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔ ۳۳۰۱ء متوکل نے تمام نعلی کو گورنر باغیچے کا حکم دیا۔ ۳۳۰۲ء عثمان میں آگ لگ گئی۔ تین روز میں تمام گھر اور شہر جلا کر ڈھیر کر دیئے۔

۳۳۰۳ء المستعین بائند نے زکی فرج سے بغداد کا مجاہد کرایا جس سے کہ بغداد کو سخت نقصان پہنچا۔

۳۳۰۴ء رومیوں نے نشت و خون کر کے دیا کچھ قبضہ کیا اور اہل جزیرہ اور اہل موصل وہاں سے نکل چکے۔ اس سال اعراب خانہ کعبہ کے پردہ کو ٹٹ کر لے گئے۔

۳۳۰۵ء بغداد میں اس شدت سے اولے پڑے کہ عمارات کو بہت ضرر پہنچا اور ایک بیک کچھ ایسی شدید پید ہو گئی کہ تمام بننے والی چیزیں جم گئیں۔

۳۳۰۶ء دریائے نیل کا پانی ٹوٹ گیا۔ کہیں بھی تری کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ جس کی وجہ سے مصر میں قحط پڑ گیا۔

۳۳۰۷ء رے، طبرستان میں پانی کی کمی آگئی۔ سختہ کہ تین مہل پانی اب تک درہم میں ملنے لگا۔ لوگوں نے قحط کے سبب سردار کا نام شروع کئے اور اسی سال معتد بائند نے مکہ مندر میں دارالندو نہدہم کر کے الحاح کے پانی ایک اور بچہ تعمیر کرائی۔

۳۳۰۸ء بعصر میں ایک زرد رنگ کی آدمی آئی پھر سبز ہو گئی اس کے بعد سیاہ پڑ گئی اور تمام اطراف

۳۲۲؎ مصر میں ایک زبردست زلزلہ آیا جس کی وجہ سے

بہت سے مکانات منہدم ہو گئے تین ساعت بار بار زلزلہ ہوا۔

۳۲۳؎ سمندر اسی زلزلہ میں اُس میں بہاؤ اور

جزیرے اور ایسی ایسی ہشیاں نظر آنے لگیں جو پہلے کبھی

نہ دیکھی تھیں۔ رے اور اُس کے اطراف میں سخت زلزلہ

آیا اور مصافات میں ڈیڑھ سو گاؤں زمین میں اتر گئے۔

مردوں کی ہڈیاں زمین سے باہر نکل پڑیں۔ چشمے جاری

ہو گئے۔ ایک گاؤں ہوا میں اٹک گیا۔ پھر گر کر جھنسا گیا۔

۳۲۴؎ حلمان اور بہاؤں میں پھر زلزلہ آیا۔ جس کی

وجہ سے بہت سی خلعت مر گئی۔ اس کے بعد ٹنڈی آئی۔

اور دنیا میں پھیل گئی جو کھیتوں اور درختوں کو صاف کر گئی۔

۳۲۵؎ جدیرہ اور فلش کر دیوں نے مسلمانوں سے

چھین لیا۔

۳۲۶؎ عراق میں ایک ستارہ آتا ہوا ٹھکانہ جس کی روشنی

دنیا میں پھیل گئی تھی کہ شمع آفتاب کے مثل ہو گئی۔ ستارہ

ٹٹنے کے بعد ایک سخت گرج کی آواز آئی۔

۳۲۷؎ عز اللہ کے وزیر ابو الفضل شیرازی نے بغداد

میں ایسی آگ لگا دی کہ بہت سے گھر اور آدمی آگ کی نذر

ہو گئے تھے کہ وزیر تک بھی نہ بچ سکا اور جل گیا۔

۳۲۸؎ بصرہ میں سخت گرمی پڑی اور لوہے پر آہنی

آئی۔ دجلہ کا پانی اس قدر ٹھک گیا کہ زمین نظر آنے لگی۔

۳۲۹؎ ہندوستان میں سخت قحط پڑا جس کی وجہ سے

بہت سے آدمی ہلاک ہو گئے۔

روانہ کیس۔ گر شکست کھا کر واپس آ گئیں۔ نوبت باہر تارید

کے جہ بند ہو گیا۔ سکر والے مکہ شریف چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگے

اہل روم غلامان پر حملہ آور ہوئے اور وہاں کی جامع مسجد سے

منبر بچال کر اُس کی بجائے سبیل قائم کر دی۔

۳۳۰؎ عین حج کے دن ابوسید بن حسن بن بہرام جبالی

کے لوہے نے خانہ کعبہ کو تاخت و تاراج کیا۔ چارہ نذر مراد

حرم کعبہ لٹھوں سے بھر دیا۔

۳۳۱؎ محمد بن علی سمنانی کا ظہور ہوا۔ اس کا دعویٰ تھا

کہ میں خدا ہوں اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں لیکن قتل

کر دیا گیا۔

۳۳۲؎ جمادی الاول کے عینے میں آندھی آئی جس سے

تمام دنیا سیاہ ہو گئی اور ذوالقعد میں تمام رات بڑے

بڑے سائے ٹٹتے رہے جسے اس سے پہلے کبھی نہ ٹٹتے

۳۳۳؎ دجلہ میں انیس گز پانی چڑھ گیا جس کی وجہ سے

بغداد غرق ہو گیا۔ آدمی اور چوپائے ڈوب گئے مکانات

منہدم ہو گئے۔

۳۳۴؎ بغداد میں اس قدر گرانی ہوئی کہ لوگ سردار اور

لیڈ تک کھانے لگے بہت سول نے کٹے کاٹ کاٹ کر

کھائے۔ مسکینوں کے پاس چھوٹے چھوٹے بھینے ہوئے

بچے پائے گئے۔ گریا لوگ بچوں کو بھین بھین کر کھا گئے۔

۳۳۵؎ الطبع اللہ الواسع نے حجر اسود پر اپنی جگہ رکھا

اور اس کے گرد ایک چاندی کا حلقہ بنوا دیا جس کا وزن ت

سوماونے ستر سو درہم تھا۔

سیلاب آیا اور اکثر حجاج کو بہا لے گیا۔

۳۹۰ھ اہل فرنگ نے شام پر پہلی پیش قدمی کی تھی اور جو لوگ دریائے قسطنطنیہ کے کنارے سے ایک بڑی فوج کے ساتھ آئے تھے انہوں نے یہاں اپنی مرضی کے موافق خوب کفر جاری کیا۔

۳۹۲ھ اہل فرنگ نے ڈیڑھ سال کی قلعہ بندی کے بعد بیت المقدس کو فتح کیا اور اس کے ساتھ علماء و زہاد کی ایک جماعت کو جس کی تعداد ستر ہزار سے بھی زائد تھی قتل کر ڈالا۔ یہودیوں کو ایک کینسہ میں جمع کر کے اُس میں آگ لگا دی۔ باقی ماندہ لوگ بغداد آگئے اور انہوں نے وہاں کے ایسے ایسے مظالم بیان کئے کہ جن کو سن کر لوگوں کے آنسو بے اختیار نکل آئے۔ ان اندوہناک مظالم کو سن کر شاعروں نے ایسے پر زور قصیدے لکھے کہ بادشاہوں نے غیرت زدہ ہو کر بالافاق حملہ کر دیا اور بیت المقدس فرنگیوں سے چھین لیا۔

۳۹۴ھ عراق میں باطنیوں کا زور پھیل گیا۔

۳۹۵ھ بغداد میں چچیک کے مرض کا اتنا زور ہوا کہ لاتعداد بچے مرنے لگے۔ اس کے بعد سخت باپسل گئی۔

۳۹۶ھ نہاوند میں ایک شخص نے نبوت کا دعوے کیا بہت سے آدمی اُس کے ساتھ ہو گئے۔ آخر قتل کر دیا گیا۔

۳۹۷ھ قلعہ استہان جو باطنیوں کے قبضہ میں تھا،

سلطان محمد نے ایک سخت محاصرہ کے بعد چھین لیا۔

۳۹۸ھ مصر میں ایسی کالی آمدی آئی کہ باطنیوں سے

بغداد کے اندر شیعہ بنی فساد بہت زبردست ہوا۔

۳۹۹ھ دجلہ چودہ آیا جس سے سخت نقصان ہوا۔

۴۰۰ھ سلطان محمود غزنوی نے دارالسلطنت غزنین میں ایک مدرسہ جاری کیا اور فتوحات ہندوستان کا ایک قیمتی حصہ اس پر صرف کر دیا اور مصارف کے لئے دوا می جاگیر بھی وقت کر دی اور مسلسل لڑائیوں کے بعد سونائے کے بند پر فتح حاصل کی۔

۴۰۱ھ مصر کے اندر لیا قلعہ پوجا بن کی نظیر سوائے یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے اور کسی زمانہ میں نہیں ملتی یہ قلعہ سات سال تک ہاچس آدمیوں نے دوسرے آدمیوں کو کاٹ کاٹ کر کھایا۔

۴۰۲ھ جامع دمشق میں آگ لگ گئی۔ اس کے نقصان کا جل گئے۔ اس کی تمام خوبصورتی جاتی رہی۔ چیت میں جو چاندی سونا لگا ہوا تھا وہ بھی جاتا رہا۔

۴۰۳ھ بغداد میں سیلاب چڑھ آیا۔ دجلہ میں تیس گز سے بھی زیادہ پانی آگیا جو اس سے پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ چوٹا مرگے۔ لوگ کشتیوں میں پناہ گزین ہو گئے۔ ایک لاکھ ملکس سے بھی زیادہ مکان مسمار ہوئے کی وجہ سے بغداد ایک چیل میدان بن گیا۔

۴۰۴ھ سوائے تارہ زحل کے تمام بہت سیارے برج حوت میں جمع ہو گئے اس پر نجوموں نے متفقہ حکم لگایا کہ مغرب حضرت نوح جیسا طوفان آئے گا مگر اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوا کہ کچھ جن جن وقت دارالانقلاب میں جمع ہوئے تو ایک

گر یہ بات تعجب کی ہے کہ اس تند پانی ہونے کے باوجود
دیل کے باغات اور کھیت بغیر پانی کے ٹھک گئے۔

۵۴۶ھ بغداد کے اندر نہایت زور و شور کی آندھی
رات کے قریب آئی اور آسمان کے اطراف میں آگ کے
مینار سے قائم ہو گئے لیکن صبح کو یہ بات جاتی رہی۔

۵۴۶ھ الانام لمدین کے واسطے ہندوستان سے ایک
آدمی ایسا طوطا لے گیا جو "عل ہوا اللہ احد" پڑھتا تھا لیکن
جب وہ بغداد پہنچ چکا تو رات کو طوطا مرا ہوا پایا۔ صبح کو وہ
شخص بہت پریشان ہوا اس نے اسے خلیفہ کا ایک غلام آیا۔
اور اس نے اس سے وہ طوطا طلب کیا۔ یہ روپڑا اور کا
کہ وہ تو رات کو ہی مر گیا۔ غلام نے کہا ہاں مجھے معلوم
ہے کہ وہ مر چکا۔ لا مارا ہوا ہی دے دے اور یہ بتلا کہ تجھے
خلیفہ سے کہتے العام کی توقع تھی اس نے کہا پانچ سو دینار
کی امید کر کے چلا تھا۔ غلام نے پانچ سو دینار کھول کر رکھ
دیئے اور کہا یہ۔ خلیفہ نے تجھے عنایت کئے ہیں جس
وقت تو ہندوستان سے۔ چکر لگاتا تھا اسی وقت خلیفہ کو
تیری خبر ہو گئی تھی۔

۵۴۷ھ ساتوں سال سے ہجرت میزبان میں جمع ہو گئے۔
اس پر نجوموں نے حکم لگایا کہ جہادی الاکھر کی نویں رات کو
سخت آندھی آئے گی جس سے تمام شہر کے سارے ہونے
کا اندیشہ ہے۔ لوگوں نے یہ سن کر گڑھے کو دو کھود کر ان
میں یہنے کا ارادہ کر لیا۔ کھانا اور پانی بھی ان گڑھوں
میں لے گئے اور نہایت تشویش کے ساتھ اُس رات کا

کے ہاتھ کو ہاتھ نہ بچائی دیتا تھا۔

۵۴۸ھ ایک میل آیا اور سخت بارش ہوئی جس کی وجہ
سے بخارا اور گرد و نواح کے اکثر گاؤں ڈوب گئے بہت
سے آدمی ہلاک ہو گئے۔ حتیٰ کہ شہر کے دروازے تک ٹانی
پہنچ گیا۔ دروازہ کو چند فرسخ تک پانی بہا لے گیا اور
وہابی کے اندر چھپ گیا۔

۵۴۸ھ بغداد میں بردار کچھو ظاہر ہوئے جن کے دو کانٹے
ہوتے تھے۔

۵۴۹ھ ۲۹ رمضان شریف کو چاند نہ دکھلائی دیا۔ ہلال
بغداد نے تمام دن سونہ رکھا۔ اور جن وقت شام ہوئی
تو ۳۰ تاریخ کو بھی چاند نظر نہ آیا، حالانکہ طلوع بالکل صاف تھا
یہ ایک ایسی بات تھی جو کبھی نہ ہوئی تھی۔

۵۴۹ھ بغداد میں سخت زلزلہ آیا سا اور اس مرتبہ بغداد
پانی کی طرح جل گیا۔ علوان کا ایک پہاڑ ٹوٹ کر گرا۔

۵۴۹ھ یس میں غزنوی کی بارش ہوئی۔ زمین کئی روز تک
سرخ رہی۔ لوگوں کے کپڑے بھی سرخ ہو گئے۔

۵۴۹ھ سلطان نور الدین نے آشیانہ خلافت میں بہت
سے تحائف روانہ کئے جن میں ایک گدھا بھی تھا جس کے
بدن پر خط بنے ہوئے تھے اور گدھا بہت کو دے نہ والا تھا۔
خلو کی وجہ سے اس کو عتابی کہتے تھے۔ اس سال نارنگی
کے برابر اڑے چمن کی وجہ سے گڑھے پڑ گئے۔ ہولشی
مر گئے۔ دجلہ اس قدر چڑھ آیا کہ بغداد ڈوب گیا۔ خرات
چڑھ آیا جس کی وجہ سے گاؤں اور کھیتیاں غرق ہو گئیں

انتظار کرنے لگے جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ قوم عادی کسی اندھی آئے گی۔ لیکن اُس رات اتنی بھی ہوا نہ چلی کہ چرخ بھی گل اڑے۔
۵۹۱ء ناصر الدین اشرف نے ناصر بکبک تروں کے لئے ایک وسیع حکمت نافذ کیا۔

۵۹۲ء مکہ منہ میں کالی آنہی آئی جس کی وجہ سے دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ لوگوں پر سونچ ریت برسی۔ لوگوں کو کانی سے ایک قطعہ گر گیا۔

۵۹۳ء ایک بہت بڑا ستارہ ٹوٹا اور اس کے ٹوٹنے کے ساتھ اس قدر سخت دھماکا ہوا جس کی وجہ سے مکان اور دیواریں ہل گئیں۔ لوگوں نے خیال کیا قیامت آگئی۔ اس سال ملک العزیز سلطان صلاح الدین کے بیٹے نے لاہور میں ممبر کو ڈھانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

۵۹۴ء دریا نے نیل کو پانی اتر گیا اور تیرہ روز تک پانی نہ کی طرف ہو گیا اس کی وجہ سے اتنا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے مڑو اور چھوٹے مکمل کھلا کھانے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ لوگ بھوک کے مارے مڑوں کو قبر سے اٹھا کر کھا کر کھانے لگے۔ مصر بالکل تباہ ہو گیا بھوک کے مارے پستی مفلک مر گئی کہ جبرہ قدم یا آنکھ پڑتی تھی۔ مڑوں پر پڑتی تھی، مڑوں سے سر دک پٹی رہتی تھی۔ ان کا گوشت پرند یا چوپائے کھاتے کھاتے کھانے لگے۔

۵۹۵ء مصر شام میں نہایت سخت زلزلہ آیا جس کی وجہ سے مکان اور قلعے منہدم ہو گئے اور مصر کے قریب گڈوں و صحن گئے۔

۵۹۸ء مصر کو قحط ختم ہوا۔

۵۹۹ء مصر کی پادشاہت کو صبح تک اس قدر تباہی ہوئی کہ ٹوٹے کھنڈیوں کی طرح اڑتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اہل فرنگ نے دریائے نیل کے راس سے اشہر پر حملہ کیا۔ شہر پر قبضہ کر کے اس کو خوب لوٹا اور قتل غارت عام کر کے چلتے بنے۔

۶۰۲ء عدن میں ایک آگ ظاہر ہوئی۔ اُس کے شر سے رات کو سمندر کی طرف اڑتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور دن کو دریا سے دھواں اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا اور اسی سال مدینہ طیبہ میں بھی آگ ظاہر ہوئی۔

۶۰۳ء بہت سے تاتاریوں نے مالک اسلام میں کوفت اختیار کی۔

۶۰۴ء مصر میں ایک سخت زلزلہ آیا۔

۶۰۵ء قاہرہ کے مختلف مقامات میں آگ لگی اور اسی سال تاتاریوں کا سردار ملا کو صرا۔

۶۰۶ء الحاکم باللہ نے حنین میں حلیہ مسجد کی تعمیر کا کمپنا لکھنؤ کی جنگل میں فطرت نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں۔

۶۰۷ء دیباہ مصر میں عرفہ کے روز بڑے بڑے اولے پڑے اور بھٹی گری۔

۶۰۸ء تاتاری لشکر شام پہنچا اور مسلمانوں سے گھسان کی لڑائی ہوئی اور فتح مسلمانوں ہی کو ہوئی۔

۶۰۹ء مصر اور شام میں ایک بہت بڑا زلزلہ آیا جس کا

کے پنجے اکثر آدمی دب کر مر گئے۔

۸۱۸ء دریاے نیل برابر چارہا اور اسٹھے پہنچے

متزلزل کھڑا اس کا نقصان اس کے نفع سے بہت زیادہ تھا

۸۱۹ء دریاے نیل میں اتنی لمبائی آئی کہ کہیں سننے

میں بھی نہ آئی تھی۔ بہت سی بستیاں اور آدمی ڈوب گئے۔

۸۲۰ء مکہ مندر کی مسجد حرام اور اس کے دروازوں

کی تعمیر کی گئی۔

۸۲۱ء کسپرین کا دروازہ آہوس کا بنوایا گیا۔ اور اس

پرسوں کے پترے چر دھوالے گئے جن کا فنان تیس ہزار

تین سو تیس تھیں۔ باب تین جس پر والی سن کا نام

کندہ تھا اٹھا دیا گیا۔

۸۲۲ء محمد علی دہلی کے تخت پر بیٹھ کر ہندوئی کے سلسلہ

میں سب بادشاہوں پر فوقیت لے گیا۔

۸۲۳ء ایسا طاعون پھیل گیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

۸۲۴ء ہندوستان میں سخت قحط پڑا جس میں آدمی نے

آدمی کو کھایا۔

۸۲۵ء طاعون بڑھ گیا جس نے ہزاروں

لوگوں کو ہلاک اور شہروں کو تباہ کیا۔

۸۲۶ء دمشق میں سخت قحط پڑا۔

۸۲۷ء آذربائیجان و متساب دہلی کو پورا گن لگا۔

۸۲۸ء کیسپین کے ساحل پر کھجوریں لگا ہوا تھا اور وہ شہر

کے کھجوریں نکال کر گن لگا ہوا تھا۔

۸۲۹ء حلب میں جامع مسجد کے اندر امام صاحب نماز

پڑھا رہے تھے کہ کسی نے یہودہ کہنا شروع کیا۔ امام صاحب

نے نیت نہ توڑی بلکہ نماز پوری کر کے جب سلام پھیرا تو گولہ

نے دیکھا کہ اس یہودہ دیکھنے والے کی صورت سڑک سی ہو

گئی ہے اور وہ جھگ کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔

۸۳۰ء پہلے دن دریاے نیل اس قدر بڑھ گیا کہ

جس کی کوئی انتہاء تھی۔ پھر خود بخود ہی اتنا چڑھ آیا کہ معمول

سے بائیس گز اوپر ہو گیا۔

۸۳۱ء مصر میں ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ میں آسمان پر

گیا اور وہاں خدا کو دیکھا اور بھلا بھلا کہیں لوگوں نے

پاگل خیال کر کے پاگل خانہ میں بھجوا دیا۔

۸۳۲ء آذربائیجان میں ایک سخت زلزلہ آیا جس کی وجہ

سے اکثر آدمی مر گئے۔

۸۳۳ء شہر عفرہ میں ایک اونٹ ذبح کیا گیا تو اس کا

گوشت اس طرح چمکتا تھا جیسے چراغ چمکتا ہے۔ اس میں

سے متولا سا کتہ کوڑا لایا تو اس نے بھی نہ کھایا۔

۸۳۴ء دریاے نیل اپنے پورے منہ تک چڑھ آیا۔

جس کی وجہ سے بہت سی زراعت غرق ہو گئی۔

۸۳۵ء قاہرہ میں ایک خفیف زلزلہ آیا اور دریاے نیل

بڑا ہو گیا۔

۸۳۶ء ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا۔

۹۱۱ء اسپین کے ساحل کو لمبے نے سب سے پہلے

امریکا کا پتہ لگا دیا۔ سپانیوں نے غرناطہ پر حملہ کیا اور بول

کونڈس سے نکال دیا۔

قبضہ ہو گیا۔

۱۱۷۸ھ امریکہ میں جنرل ٹولمن نے کوئیک کی لڑائی میں

فرانسیسیل کی ایسی خبر لی کہ ان کے اس ملک قدم نہ رکھ سکے۔

۱۱۷۹ھ نکل شمالی امریکہ پر انگلستان کا پھر ریا لہر لے لگا۔

۱۲۰۶ھ انگلستان کو امریکہ کی آزادی تسلیم کرنی پڑی۔

۱۲۰۸ھ دسٹنکٹن امریکہ کا صدر مقرر ہوا۔

۱۲۲۴ھ نیو لین پیس میں داخل ہوا۔

۱۲۳۲ھ انگریزوں کا لٹکا پر قبضہ ہوا اور اسی سال پتھر

کے چھاپے کی کل ایجاد ہوئی۔

۱۲۴۹ھ ولایت میں پہلی مرتبہ ریل جاری ہوئی۔

۱۲۵۷ھ حصار و گروگلاؤ، ادہلی، اٹارہ و مین پور میں پوری

میں سخت قحط پڑا۔

۱۲۵۸ھ چین کی پہلی جنگ۔

۱۲۷۶ھ ہندوستان کا غدر شروع ہوا۔

۱۲۷۷ھ عمر خیام کی چھتر باعیت کا انگریزی ترجمہ

سے پہلی بار شائع ہوا۔

۱۲۸۰ھ اس قحط سے زیادہ ہندوستان میں کوئی

سخت قحط نہ پڑا۔

۱۲۹۵ھ چین میں ریل جاری ہوئی۔

۱۲۹۶ھ روس اور ترکی میں لڑائی اسی سال ہوئی۔

۱۳۰۰ھ مصطفیٰ اکمال پاشا سالونیکا میں پیدا ہوا۔

۱۳۲۴ھ پنجاب میں ایک زبردست زلزلہ آیا۔

۱۳۲۵ھ روس اور جاپان میں جنگ ہوئی۔

۱۹۴۷ھ ترکوں نے وائٹا پر حملہ کیا۔

۱۹۷۵ھ ہندوستان میں اکبر اعظم تخت نشین ہوا۔

۱۹۹۶ھ عمر خیام نے اس رمضان المبارک کو سندھ جلی

کی بنیاد ڈالی۔

۱۹۹۸ھ گرمی گورین اول گفران اسپتال، اٹلی، اریگال، فرانس

سوشل ریلینڈ، جرمنی، نیدرلینڈ کے کیتھولک فرقوں میں

جاری ہوا۔

۱۹۳۲ھ ہندوستان میں انگریز پہلی مرتبہ داخل ہوئے۔

۱۹۵۸ھ شاہجہاں نے تاج محل کی یادگار میں اگرہ کے

اندرونیکی سب سے حسین عمارت تاج محل کی بنیاد

تاکیم کی۔

۱۹۷۵ھ شاہجہاں نے تاج محل کی تعمیر کرایا۔

۱۹۹۰ھ دہلی کی جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔

۱۹۶۱ھ بمبئی کا احاطہ قائم ہوا۔

۱۹۹۰ھ کلکتہ کی بنیاد رکھی گئی۔

۱۹۲۶ھ اورنگ زیب فوت ہوا۔

۱۹۷۵ھ مشہور جنگ ہفت سالہ چمپائی سلویپ، ہندوستان

اور امریکہ میں کارنار قرار پائے۔

۱۹۷۶ھ انگلستان کے سادون فریڈرک اعظم نے فرانس کو

ایک ایسی زبردست شکست دی کہ وہ پھر اس کی ہوا

اٹھ نہ سکی اور اس فتح سے سلطنت جرمنی کی موجودہ عظمت کی

بنیاد پڑی۔ کلایوٹ نے بھی اسی سال ہندوستان میں پلائی

کی مشہور لڑائی جیتی جس سے کلایوٹ بنگال پر انگلستان کا

۱۳۳۵ء افغانستان کی لڑائی مشہور ہے۔

۱۳۳۶ء اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور تمام قوم

پرستوں کو جریرۃً مالٹا میں بھیج دیا۔ مجلس ملی کبیر کا اجلاس
انگورہ میں۔ یونان کا حملہ۔ یونانیوں نے ترک قوم پرستوں

کو قسطنطنیہ سے نکال دیا۔

۱۳۳۷ء یونانیوں کی شکست اور مصطفیٰ اکمل ترکی کا
پہلا ڈکٹیٹر بنایا گیا۔

۱۳۳۸ء سمرنا پر ترکوں نے قبضہ کر لیا اور چنگ کے
مقام پر انگریزوں سے لڑے۔

۱۳۳۹ء انگورہ کو دار السلطنت بنایا گیا۔

۱۳۴۰ء مصطفیٰ اکمل پاشا نے خلافت کو ملیا میٹ کر
کے جدید ترکی کی بنیاد ڈالی اور قدامت پسند دیواہش
کے لئے خانہ کر دیا۔

۱۳۴۱ء شام کو ایک زلزلہ آسمان پر پیدا ہوا اور اس زلزلہ
میں ”محمد“ کا نام بخیر و بُخیر نظر آیا۔ جو بہت دیر تک
قائم رہا اور اس کو بہت سے شہر میں لاکھوں ہند
مسلمانوں نے دیکھا اور اس واقعہ کی تصدیق جلیپور کے

ایورپین کلکٹر نے کی۔

۱۳۴۲ء کشمیر میں زبردست سیلاب آیا جس سے بڑبڑ

تباہی ہوئی۔ امیر امان اللہ شغل شاہ کابل بھی اسی سال
تحت سے دست بردار ہوئے۔

۱۳۴۳ء صوبہ بہار میں زلزلہ آیا جس سے بہت زیادہ
نقصان ہوا۔

۱۳۴۴ء کوئٹہ کا زلزلہ عظیم اب تک دلوں سے نہیں
بھلا جا سکا۔

۱۳۴۵ء حبشہ والوں کو اپنی آزادی اٹلی کے حاکم کرنا پڑی۔

۱۳۴۶ء شندھ جابج ششم کی تخت نشینی اور سکون کی لڑائی۔

۱۳۴۷ء ترکی میں اقامت خیر زلزلہ آیا کہ جس کی مثال پہلے
کبھی ترکی میں نہیں ملتی۔ آٹھ سو آدمی ہلاک ہوئے اور تیس ہزار
اشخاص بے گھر ہو گئے۔ پھر سے پل غار کا ڈھل مٹھ ہستی سے
تقطعی ہو گیا۔ نابھہ ہو گئے اور ہر گاہ دل تباہ و برباد ہو گئے زمین میں
گئی اور اس میں سے گام پانی ابل ابل کر نکلتے دکھایا جان میں لکے ہوئے
سیلاب آیا اور اس سال خیر عظیم علامہ اقبال کی وفات ہوئی۔
اب آگے آگے دیکھتے ہوئے کیا؟

کامدار الدینی

نوٹ :- اس مضمون میں بعض واقعات غیر اہم اور بعض مشتبہ نوعیت کے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی مضمون مفید ہے۔ اور نوجوان قارئین کا مددگار
کی کاوش و مساعیروں کی کستھی ہے۔ ”ہمایوں“

یادِ اقبال

آہ! اے اقبال! اے ہندوستان کے رہنما
 یاد آتی ہیں تری رنگیں نوائیں آہ آہ
 کیا ہوا بزمِ جہاں میں گر نہیں موجود تو
 موت کیا ہے؟ صورتِ ظاہر کچھ جا نکلیں
 موت پا کر جاودانی ہو گئی، ہستی تری
 روز و شب پیغامِ آزادی ہمیں دیتا ہے تو
 تو پڑھاتا ہے ہمیں اب بھی وہی درسِ خودی
 رہنمائے نوعِ انساں اب بھی تیرا فلسفا
 اب بھی کرتی ہے تری تعلیمِ دل پر وہ فوں
 کاروانِ قوم کے سارے جہاں کا رہنما
 خواب بن کر رہ گئیں تیری صدائیں آہ آہ
 نامِ دنیا میں ترا درِ زباں ہے چار سُو
 اس سے ہو جاتے ہیں لیکن جو ہر شاعر نہیں
 موت نے پیغامِ تیرا کر دیا ہے سہمی
 اب بھی کشتیِ قوم کی، گرداب میں کھیتا ہی تو
 سوئے ہی تدبیر کو تو نے عنانِ تقدیر کی
 ہے جہاں میں جادۂ روشن بڑے ارتقا
 چند لمحوں میں اُلٹ جاتی ہے تقدیرِ نگول

کھول دیں گے اک زمانے پر خودی کا راز ہم

بسکہ ہیں گر علمِ سنکر تری آواز ہم

منہم لال ہادی

نغمۂ اقبال

مبارک تجھ کو اے اقبال فوقِ زمزمہ خوانی
فضائے اوجِ انسانی پہ تو آباد ہے گویا
سوادِ ہند میں چھیڑا ربابِ لاشیں تُو نے
ترمیِ تخیل نے مرہ دلول کو زندگی بخشی
وہ تیرا نغمہ رنگیں نشاطِ روح کا سماں
ترا نغمہ جنودِ ہند کو ہے دینِ بیداری
ترا نغمہ عدو کے مکر کو بیکار کرتا ہے
فضائے روح پر چھایا سحابِ ندگی بن کر
عراق و ہند بگڑا گئے تیری لٹاؤں سے

فرغِ محفلِ ملت ہے تیری شعلہ افشانی
غلامی کے جہاں کا طائرِ آزاد ہے گویا
دیا دُنیا کو پیغامِ محبتِ آفریں تُو نے
جبینِ ذرّہ ناچیں نہ کو تا بندگی بخشی
مجتسمِ رقص و موسیقی، سرِ پاشعلہ لرزاں
خرامِ مہجِ آزادی، پیامِ اوجِ خودداری
جو انسانِ وطن کو خواب سے بیدار کرتا ہے
گیا ہر باغِ ملت میں شبابِ تازگی بن کر
عرب کے تاغم چھائے ہوئے ہیں زمزمے تیرے

حجازی نغمہ کی لہریں ہیں بھارت کی ہواؤں میں

ہے بوئے گلشنِ لطیفِ ہمالہ کی فضاؤں میں
ہیں لعلِ نسیم

ماضی حال اور مستقبل

یہ مضمون انگلستان کے مشہور مضمون نگار و فلاسفر سٹراچ جی۔ ویلز کے آئندہ زمانے کے متعلق خیالات کا پتہ دیتا ہے۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ یورپ کے حالات پر مبنی ہے۔ یعنی جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۷ء میں یہ حالت تھی اب یہ ہے اور پچاس سال کے بعد یہ ہوگی تو وہ صرف انگلستان یا زیادہ سے زیادہ یورپ کے حالات ہی کو مدنظر رکھ کر خیالات کا اندازہ کرتے ہیں۔ یہ جاننا خالی ازدحامی نہ ہو گا کہ جو حالات وہ آج کل کے زمانے کے بتاتے ہیں وہ موجودہ ہندوستان پر عائد نہیں کرتے بلکہ یورپ میں پچاس سال پہلے کی جو زندگی بیان کی گئی ہے وہ کم و بیش آج کل ہندوستان کی زندگی ہے۔ (سچ)

مستقبل کے متعلق کوئی صحیح اندازہ لگانا ناممکنات میں سے ہے۔ باوجود اس کے ہم یہ ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ آئندہ زمانے میں کیا کیا امکانات موجود ہیں۔ آج کل کی دنیا میں چاروں طرف جنگ و جدل کے مہیب بادل چھائے ہوئے ہیں جو یقیناً انسانی زندگی کے لئے خطرناک ثابت ہوں گے لیکن پھر بھی پچاس سال آئندہ کے عام لوگ ہم لوگوں سے کئی باتوں میں اچھے ہوں گے۔ یہ بر بادیاں اور فتنیں جو آج کل ہم لوگوں کے سامنے نازل ہو رہی ہیں عام زندگی کی ترقی اور نئی ایجادات کو ہرگز نہ روک سکیں گی بلکہ نئی ایجادوں میں کچھ تاخیر بھی نہ ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی زندگی کا لازمہ ہے۔ شاید آدمی بھی "انسان" نہیں بنا۔ قدیم وقتوں میں جب دنیا میں تمام طوفان تاریکی تھی اس وقت بھی دنیا ساکت و ساکن نہ تھی بلکہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اور وقت کی تقسیم فنِ جازمانی، علمِ کیمیا اور دھاتوں کے صاف کرنے کا فن — یہ تمام ترقی کر رہے تھے اور واقفیت کی روشنی میں آہستہ آہستہ نمودار ہو رہے تھے۔

۱۸۸۷ء کی زندگی :-

۱۸۸۷ء میں عام لوگ گرمی زندگی بسر کرتے تھے۔ صاحبِ خانہ کی ایک بیوی اور تین چار سے لے کر درجن بھر تک بچے ہوا کرتے تھے۔ تمام کام گھر میں ہی ہوا کرتا تھا، گھر کی صفائی گھر والے خود ہی کیا کرتے تھے۔ کپڑے گھڑی میں دھوئے جاتے تھے۔ بچوں کے کپڑے گھر ہی میں سستے تھے۔ کھانا گھر ہی میں پکنا اور گھر ہی میں کھایا جاتا تھا۔ ابھی لوگ "تیل کھانا" اور بند ڈبے کے مرتبے اچار وغیرہ سے ناواقف تھے۔ دیہات میں زراعت کی کھیت تھے۔ بچوں کو جس قدر صلہ کن ہو سکتا تھا گھر کے کام میں لگا دیا جاتا تھا۔ ان کی تعلیم بارہ تیرہ برس کی عمر تک یا اس سے بھی پیشتر ختم ہو جایا کرتی تھی اور تعلیم کے مدارج اکثر گھر ہی میں ملے

ہوتے تھے۔ یہ سچی وہ گھریلو زندگی جو ان لوگوں کے نصیب میں تھی۔

معاشرتی زندگی بھی زیادہ وسیع نہ تھی۔ چند احباب کچھ مہماے اور زیادہ اپنے عزیز و اقارب بس انہی لوگوں سے ربط مضبوط اور میل جول ہوتا تھا۔ مرذیل ملاکے لئے لکشر شرافتوں میں کچھ دقت گزارتے تھے۔ اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کے نام سے وہ لوگ گھبراتے اور خوف کھاتے تھے۔ مہرنگی چیر اور نئے خیال کو ایک الٹھی حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

آج کل کی زندگی :-

آج کل مذکورہ بالا قسم کے گھر کا وجود اقتصادی حالات کی وجہ سے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ گھر میں بچوں کی تعداد میں نمایاں کمی ہوگئی ہے اور اب ان گھر کے کاموں میں بھی مدد نہیں لی جاتی۔ اب گھر کے معنی صرف وہ چند کمرے ہیں جس میں ایک کنبہ سوتا ہے اور کھا نکھاتا ہے، اسکول اب بچوں کی تعلیم و تربیت کا مرکز ہو گیا ہے اور بچوں کے کسب کو د اور تفریح کا سامان بھی وہیں مہیا کر دیا جاتا ہے۔ اسکولوں کی تعداد اور اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ گھروں میں اب بہت تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں گھر کی زندگی تو اب غائب ہو رہی ہے۔

آج کل کا ایک عام شہری ۱۸۵۰ فٹ کے عام لوگوں سے زیادہ قد درست ہے اور زیادہ دلچسپ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کو مقابلہ عام واقفیت بھی زیادہ ہے۔ اپنے آبا و اجداد کے مقابلہ میں اچھا کھاتا اچھا پہنتا اور اچھے مکانوں میں زندگی گزارتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز میں ایک حق ہوتا ہے جس کو معلوم کرنے کے لئے انسان اس پر غور کرتا ہے کلم کرنے کے صحیح طریقے پر متنازعہ آج کل کیا جاتا ہے شاید کبھی یہ کیفیت نہ تھی۔ آج کل کے لوگ روز بروز ترقی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ آپ چاہے ڈکٹیٹر ہوں یا جمہوریت میں اعتقاد رکھتے ہوں۔ کوئی افسر ہوں یا کسی بھی عہدہ پر متنازع ہوں اگر آپ پانی کا جھاریا ہوائی جہاز بنانا چاہتے ہیں یا بجلی سے ایک شہر کو روشن کرنا چاہتے ہیں یا مدرسوں کی استعداد بڑھانا چاہتے ہیں، آپ کو مہجرات میں چند خاص طریق اختیار کرنے پڑیں گے اگر ایسا نہ کریں گے تو کامیابی حاصل نہ ہوگی۔

آج کل کی دنیا بہت متنوع ہے۔ روس کا مشہور حکمران پیٹر اعظم عوام اور دنیا سے چھپکا کر ایک بات کر سکتا تھا مگر زبردست اسٹینن ایسا نہیں کر سکتا۔ آج کل کے نام شہری کو خواہ وہ حاکم ہو یا غلام حکومت ایک خاص طرح رکھنے پر مجبور ہے حکومت کو سب کے لئے رہنے کی جگہ کا اور کھانے پینے کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ یہ تفریح کا سامان بھی مہیا کرنا پڑتا ہے۔ عوام کی دلچسپی کا خیال رکھا جاتا ہے اور انہیں کسی قدر آزادی بھی دی جاتی ہے۔

دنیا روز بروز ترقی کر رہی ہے لاکھوں دماغ زندگی کو بہتر بنانے میں دن رات کوشاں اور مشغول رہتے ہیں۔ ہم کبھی بھی بنا پر یہ یقین نہیں کر سکتے کہ یہ ترقی بند ہو جائے گی یا یہ کوششیں رک جائیں گی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ دنیا کی ہر ایک

چیز میں بھی ترقی ہوتی رہے گی۔ آہستہ آہستہ یہ انقلاب آتا رہے گا۔ دھیمے دھیمے بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح، جو اس کے سمنے آنے کی کوشش کرے گا مگر نہ کیگا۔

۱۹۷۷ء کی زندگی :-

انہی حالات کو مد نظر رکھ کر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء کی زندگی کیا ہوگی۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خانگی زندگی کو زبردستی زوال پر ہے پس ہم بلاشبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء میں خانگی زندگی کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔

اس زمانے کے لوگ ہم لوگوں سے زیادہ توانا اور صحت مند ہوں گے اور قریب بھلا وسطاً ایک سو پانچ کے لگ بھگ اڑھائی ہو گئے۔ وہ لوگ زیادہ آزاد زیادہ صاف گو اور صحیح اصول میں خوش حال ہوں گے۔ ایک دوسرے کے کام سے انہیں کوئی پیچیدگی ہوگی جس کا مادہ جاتا ہے گا عالم لوگوں سے انہیں اس ہوگا۔ طبیعت کے سبب ہونے کی شکایت باقی نہ رہے گی۔

یہ خوش طبعی ان کے لباس، ان کی آرائش اور اسٹائی کے سامان ان کے مکانات بلکہ شہروں کے نقشہ و بنا کے نکلا ہوگا کسی جگہ یہ فرش لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی کہ یہ شارع عام نہیں ہے یا گزرا منع ہے۔ تمام راستے، گلیاں، سڑکیں کھیت ہر ایک کو خوش آمدید کہیں گے۔ ہر شخص ہر جگہ رک ٹوک کے بغیر چاسکے گا۔ بڑے بڑے مکانات میں بھی لوگ زادی سے داخل ہو سکیں گے اور کاریگروں کو پہنچتی ہوئی مشینوں پر کام کرتے ہوئے دیکھ سکیں گے۔ کوئی بات پوشیدہ نہ رہے گی اور زندگی جائے گی۔

دنشکاروں کو سب سے پہلی چیزیں استعمال میں لانے کی حل جائیں گی۔ مکانات اب تک کلاسیک پتھر اور اینٹوں سے ہی بنا کرتے تھے۔ پھر لہجہ استعمال میں آنے لگا۔ اب چند ہی سال کے شہر بھی استعمال میں لایا جا رہا ہے کپڑے ہمیشہ سٹون لٹنی، ہلکے یا مٹھو کے بنتے چلے گئے ہیں۔ کراچی کل دس ہزاروں اور کاریگروں کو ہزاروں زیادہ پائیدار اور زیادہ خوبصورت نئی نئی چیزیں حاصل ہو گئی ہیں۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے مگر نو فوڈ کہہ ہاتھ کلاب میری موٹریں سویا ہیں کے بچوں سے بنائیں گی؛ کئی پڑنے خیالات کے کوٹ بڈ سے اپنی آنے والی لپٹوں کو بدکار کٹر ہسٹوٹی جسے افضل طرح اور بے وقف سمجھتے ہیں۔ شاید وہ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: واہ تم بھی خوب ہو خوب تھاری زندگی ہے۔

واہ ری ٹی وی واہ! آئینہ آنے والی لٹوں سے ہمیں بہت امیدیں ہیں۔ چاہے کتنی ہی تباہ کاریاں اور حادثات پیش آئیں پھر بھی وہ لوگ ہم سے زیادہ محنت منانے والے اور زیادہ وسیع تعلقات والے ہونگے۔ ہر چیز سے انہیں کچھ ہوگی۔ دن خوب بڑے بڑے ہوں گے۔ لوگوں کو خوب فرصت ملے گی کیونکہ بہت سے کام مشینوں سے ہو کر رہ گئے۔ عام شہری اس نطفے میں بھی ایک کاریگر ہوگا لیکن زیادہ گندہ و گشت طلب کام مشینیں کیا کریں گی۔ اس زمانہ کا ایک ادنیٰ ترین کام ایک کھانے کے اچھے اچھے کاریگروں سے بہتر ہوگا آپ یہ سوچئے گا کیا وہ لوگ کچھ زیادہ خوشی اور تنہا کی زندگی بسر کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ وہ بھی ہر ایک نئی چیز کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں گے۔ نئی مٹی کی اوندھن خیالات کو بڑا بھلا کتنے پتھر چلانے والے کو وہ ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھیں گے اور کریں گے کہ وہ مٹی میں جب وہ بھی تبدیلیاں ہو جائیں گی زندگی نہیں رہے گی۔

”چاند“

محفلِ ادب

آستانِ اقبال پر سجدہ ہائے عقیدت

(محمد قبال)

حضرت علامہ مرحوم کی شخصیت کی عظمت و مرتبہ کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ کروڑوں دلوں نے ان کے قدروں پر چین نیاز خم کی لاقعد انسانوں نے ان سے ملاقات کرنا اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور موجبِ فخر و مباحات واقعہ سمجھا۔ انہیں شہرِ دہم حاصل ہوئی اور ان کا نام ان کی زندگی ہی میں اقصائے عالم میں پھیل گیا۔

حضرت علامہ مرحوم کا نام میں نے پہلے پبل اپنے گاؤں کے سکول میں سنا۔ ”پوٹھوہار“ تحصیل گوجر خاں کے اسی مقامی علاقہ میں جہاں علم و ادب کو عفا و ہما کا درجہ حاصل ہے اور جس علاقہ کے باشندوں کی جہالت دیکھ کر اُسے جاہلستان ”کننا زیادہ موزوں ہے۔ لوگ دنیا کے تمام شیب و فراز سے ناواقف مگر حضرت مرحوم کے نام سے شناسا تھے۔ چوتھی یا پانچویں جماعت میں حضرت کا نام کافلوں میں پڑا اور ساتھ ہی اپنے بعض استادوں سے سننے میں آیا کہ سر محمد اقبال بڑے شاعر ہیں، لاہور رہتے ہیں اور ڈاکٹری پیشہ کرتے ہیں لیکن وہاں اس سے زیادہ کچھ مزید پتل رکا کر ڈاکٹر صاحب نے ”نالہ بلبل“ اور ”ہندوستانِ ہمارا“ کے سوا کچھ اور بھی لکھا ہے۔

مڈل کی جماعتوں میں حضرت علامہ کی نظم ”کوہِ ہمالہ“ سماعتِ نواز ہوئی۔ اس نظم سے ہم اور کچھ چال نہ کر سکے۔ البتہ اس کے پہلے بند کے معانی پر اپنے اساتذہ کو خاموش اور نکتہ بدندان دیکھ کر یقین ہو گیا کہ سر اقبال کوئی بڑے آدمی ہیں کیونکہ ان کے شعر ہائے اُستاد بھی نہیں سمجھ سکتے حضرت علامہ کی شہرہ آفاق نظم ”شکوہ“ تعلیمِ تم کر چکنے کے بعد کسی کے پاس دیکھی اور پڑھی۔ ”شکوہ“ پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ اس نظم کا لکھنے والا بڑا شاعر ہی نہیں بہت بڑا انسان بھی ہے۔

انہی ایام میں حضرت علامہ کو نادر شاہ شاہِ افغانستان کی دعوت پر افغانستان جانا پڑا اور خوش قسمتی سے ایک اخبار میں ان کے جانے کی تاریخ بھی مجھے معلوم ہو گئی۔ ”فریڈریک میل“ جس پر حضرت مرحوم کو سفر کرنا تھا ہمارے گاؤں کے نزدیک گوجر خاں ٹیشن پر ہی ٹھہرتی تھی۔ گوجر خاں ہمارے گاؤں سے ۱۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ حضرت علامہ کے ساتھ متیہ راس محمد مرحوم اور سید سلیمان ندوی بھی ہم سفر تھے۔ مولانا غلام رسول ہر رائیٹیٹ سکرٹری کی حیثیت سے حضرت مرحوم کے ہمراہ تھے۔ میں اپنے برادرِ محترم نیک محمد صاحب کو ساتھ لے کر گوجر خاں چلا گیا۔ رُبن آئی تو ہمیں حضرت علامہ کا شاہی ڈربہ ڈھونڈنے میں کچھ دقت نہ ہوئی جو کئی ہم ڈربہ کے پاس پہنچے۔

ڈبر کے حصہ کچن، کاروازہ کھٹا اور ایک ہٹا کا فوجوان کرٹ پتلون میں لباس دکھائی دیا۔ میں نے خیال کیا کہ ہونہ ہو۔ یہ یا تو ڈاکٹر اقبال ہیں یا سید اس مسعود وہ بھی نہیں تو ملازمہ ہوں گے ورنہ اس مسعود کے پرائیویٹ سکریٹری ہوں گے۔ بہر حال میں نے جھجک کر نہایت مؤدبانہ سلام کیا۔ اور مرحوب ہو کر کچھ بے معنی سا سوال کیا۔ معلوم ہوا کہ میرے قیاسات غلط تھے اور وہ چائے کے کوئی ملازمین میں سے تھے انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب بیرون کوئٹہ میں مگر وہیں وہ ڈبر کی اگلی طرف ہیں۔ ہم آگے کی طرف بھاگے۔ دروازے بند تھے ڈرتے ڈرتے شیفل میں سے جھانکنا شروع کیا۔ تین آدمی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جن میں مولانا غلام رسول تھر غالباً نہیں تھے ہم نے تینوں حضرات میں سے ایک کو ڈاکٹر اقبال، ایک کو اس مسعود مرحوم تصور کر کے دیکھ لیا اور مطمئن ہو گئے کہ آج ہم نے اپنی قوم کے دو بڑے آدمیوں کو دیکھ لیا۔ سید سلیمان ندوی غالباً وہاں نہ تھے کیونکہ ان تینوں میں داخلہ والا کوئی آدمی نہ تھا۔

مدنی کے مختصر سے زمانہ میں لاہور کے اخبارات اور ادبی رسائل کو دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ اسے کاش! میں بھی اسی علم و ادب کی دنیا میں چل رہوں۔ جو علوم و فنون کا مرکز اور اس کا، ہر جہت سے تاثیر اور نظر علی غان اور سب کے بلو کر اقبال کی قیام گاہ ہے۔ ان باتوں اور ان کے علم سے نکلے ہوئے جواہر پاروں کو پڑھ کر دل بے اختیار پکارا اٹھتا تھا۔ یٰ لَیْکَ تَجَنَّبُ کُنْتُ مَحْضَةً خِدَاسِ نَبِیِّ فُحَّاسِ لی اودیں اپنے ایک کافر مافکی لٹرائش سے اچھی یا بُری زندگی گزارنے کے لئے لاہور آگیا۔

لاہور آمد کے بعد قسطنطنیہ سے مجھے احمدیہ بلڈنگز کے لوگوں میں رہنا نصیب ہوا جو بیشتر کر ذوق اور جذبات و احساسات لطیف سے محروم تھے۔ ان کی گورڈ زونی نے مجھے بھی ایک عرصہ تک لاہور کی علمی، ادبی، فضا اور بار بار بے وق کی صحبتوں سے محروم رکھا۔ مگر بلا غرض قسطنطنیہ میں ان طبع تمام پابند میل پر غالب آیا۔

ادھر میرے سمنڈ شوق نے پابندیوں سے آزاد ہونے کے لئے پُر توڑے۔ ادھر قسطنطنیہ میں سالک صاحب کی مہربان غیبت نے اپنی طوفان کھینچا۔ سالک صاحب کے نیاز مند راز راہ و رسم مجھ نے اور ان مجالس سے فیضیاب ہونے کے بعد اقبال کی عظمت معلوم کرنے لگی۔ اور اقبال کو اقبال کی حیثیت سے میں نے سالک صاحب کے فیضان سے ہی دیکھا۔ ان ہی ایام میں حضرت علامہ کے نیاز حاصل کرنے کے لئے بے تابی پیدا ہوئی اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتی رہی۔

انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہونے والا تھا حضرت مرحوم کی سمدارت کا اعلان ہو چکا تھا۔ میری مسرت و شادمانی کی کوئی انتہا نہ تھی اور میں اس خیال سے بے خود ہوا جا رہا تھا کہ فقیر کس کس پر غم غم فصل کے دیار سے مشوق ہونے والا ہوں جو فخر ایشیا، شام و مشرق اور غیر آزادی ہے۔

جلسہ سے دو تین روز قبل ایک کافر مافکی زبان سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت علیل ہے اور وہ غالباً جلسہ میں شرکت نہیں لا سکتیں گے۔ اس خبر سے دل میں بالخصوص میری مگر آتش شوق اور تیز ہو گئی۔ اور میں نے اس احساس کے باوجود کہ

ایک حقیر ذہن آفتاب کب فیض تو کر سکتا ہے مگر اس سے بل نہیں سکتا حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے اور شفقت پائی حاصل کرنے کی خواہش ملی۔ انہیں کا جملہ دیکھنے کی غرض سے میرے ہمپن کے ہم قدم دوست قاضی گلزار احمد صاحب آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے حضرت علامہ کی خدمت میں حاضری کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں پہلے ہی، بیتاب تھا۔ قاضی صاحب کو ساتھ لیا اور حضرت علامہ صاحب کی کوٹھی کا رخ کیا۔ ان ایام میں حضرت مرحوم یکلو ڈروڈ پر ہا کرتے تھے۔ اپنے مکان سے لے کر کوٹھی کے دروازہ تک ہم ہمہ تن شوق بنے چلے گئے مگر دروازہ پہنچ کر ہیست طاری ہو گئی۔ قاضی صاحب جو پہلے بہت بیتاب تھے دروازہ پر پہنچ کر کہنے لگے کمال جا رہے ہو۔ ذرا سوچو تو میں اور تم جہالت ماب علاقہ کے دو اکھڑ تو جوانِ علم و ادب کے بے بہرہ اور آفتابِ اقبالِ علم کے دربار میں دو حقیر قطرے بھر بیکراں کے سامنے، کیا کرو گے وہاں جا کر۔ اور مجھے بناؤ تو وہی کد گرم آستانِ حضرت اقبال تک پہنچ بھی گئے تو تم وہاں جا کر کہو گے کیا؟

یہ باتیں غمخیز سر دل میں بھی پیدا ہو رہی تھیں۔ میرے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ تاہم بے پناہ جذبہ آستانِ بوسی اور آفتابِ علم کی کشش میں باوجود کہ وہاں تک لے ہی گئی۔ حاضری کی اجازت حاصل ہونے پر ملازم نے جس کمرے کی طرف ہماری رہنمائی کی اُسے دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی۔ دروازے پر لٹکی ہوئی جن زمانہ قبل کسج کی معلوم ہوتی تھی، متعدد مقامات کے ٹوٹی ہوئی اور پڑائی مکان کے کس پاس کوئی امیر لاء محلات کا سامان نہ تھا۔ بائیں ہمہ ہم دواؤں کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ حق اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو ظاہر ٹوٹی چھوٹی اور دھیلی سی چارپائی اور سادہ مگر صاف ستھرے لستر پر تاجدار فلسفہ و شعر معلوم ہوا تھا۔ بیچوال ختمہ پاس ہی پڑا بایں لے ہاتھ اعلیٰ علیک سلیک کے بعد حضرت علامہ نے بیٹھ جانے کو اشارہ فرمایا اور ہم دونوں بائیں ہی رکھی ہوئی کرسیوں پر بوسہ و جبران بیٹھ گئے۔ یہ معلوم ہوا کہ ایک کائنات بیٹھے رہتے مگر حضرت علامہ نے ذرہ فاذی نہ ملتے ہوئے مزاجِ پُرسی کی۔ جو کچھ نرسکا جواب یا حضرت علامہ کے گلے میں تلاش تھی اور بایں کرتے ہوئے تخلیق محسوس کرتے تھے، مگر اپنے باتیں کہیں ہمہ تن گوش بنے سنتے رہے۔ آدھ گھنٹے کی مختصر سی ملاقات کے بعد میں نے یہ کہہ کر اجازت لی کہ حضرت! آج میں جہاں علم و ادب کی سحرانہ نصیب ہوئی۔ یہ بھی حسرت بیٹ گئی کہ ہم زندگی میں خلائقِ عشق و پیہر شعور و شاعری سے نہ مل سکے۔ حضرت نے مسکرا کر اجازت دی۔ ہم باہر نکلے تو موسم کے اعتدال کے باوجود ہمارے جسم پینہ میں شرارِ روبرو ہے تھے۔ جیسے ابھی ابھی بجلی سے بجھکے ہوں۔ یہ حاضری گوشتِ مخمور تھی۔ مگر حضرت مرحوم کے فیضانِ فطرنے ان مختصر لمحات میں ہی اپنے مقام سے آگاہ کر دیا۔

حضرت علامہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد جذباتِ عقیدت کئی اور منزلیں طے کر گئے حضرت علامہ کی شفقت نے اور بھی حرارتِ بوحادی اور کئی باضا ضر ہوئے کا شرف حاصل ہوا۔ بعض اوقات کہ کئی گھنٹے بیٹھے رہتے اور ارشادِ است سے تنہی ہونے کا موقع ملا۔ میں نے حضرت کو اس بیماری کی حالت میں دیکھا تھا جو آسٹریا کی جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس کے باوجود ان کی شیریں گفتاری اور حقائقِ بیری کا خیال آتا ہے تو ان لوگوں کی قیمت پر دھڑک کر تابل جنوں نے اس بلبلِ شیریں کو فاکویم ہمار میں پھینکتے سنا۔

جب حضرت مرحوم یکلو ڈروڈ سے جاوید منزل میں چلے گئے تو میں جاوید منزل کو کوچِ محبوب کھلایا۔ کبھی دروازہ تک جا کر دیکھی مکان

کے گرواگر طواف کر کے واپس آجاتا اور کبھی نیاز بھی حاصل کر لیتا۔

جون ۳۳ء میں لبنان کے ایک عرب شاعر نے جمال صاحب یاحت کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے خوش بختی سان کولابھور کی یہ کرانے اور لاہور میں مقیم اکابر سے ملاقات کرانے کی خدمت میں شیخ محمد امین صاحب سوداگر جو ہم اور فاکہ کے پڑھو ہوئی مینہ سال صاحب حضرت علامہ کے موہندوستان کے کسی بڑے آدمی سے ملنے کے زیادہ خواہندہ نہ تھے۔ صرف حضرت علامہ مرحوم سے ملنے کے لئے جلتے تھے۔

ایک شام کو یہ جمال صاحب اور شیخ محمد امین صاحب کی محبت میں حضرت کے دولکدہ پر حاضری ہوئی۔ خوش نصیبی سے حضرت صحن میں تنہا پلنگ پر دلرز تھے طبیعت بھی سرد و سخی۔ شیخ صاحب نے تنہا کر لیا تو اٹھ کر بیٹھے گفتگو شروع کی تو حقائق کے دریا بہنے لگے۔ اپنے سفر اور پکے حالات، مسئلے خاص پاشا سابق وزیر غلسم ہمد اور دیگر عائدین و موفیائے مصر سے ملاقاتیں، مصر میں ایک قادیانی کی محبت کے دلچسپ حالات۔ ممالک اسلامیہ یا بعضوں کی طبیعت کی سرکے تاخرات حضرت اور نگارنے بیٹا لکھنے کا زہد و تقویٰ مسلمانان عالم کا مستقبل غرض کہ بے شمار مسائل پر گفتگو فرمائی جو دل و دماغ کو موجب نشاط بھی تھی۔ اور ایمان و ایمان کا ذریعہ بھی میگفتگو مزاج کا یہ عالم تھا کہ بعض موانع پر ہم بے اختیار ہنس پڑتے تھے۔ حضرت علامہ نے یہ جمال صاحب سے پوچھا کہ مجھ جیسے فقیر بے لوائے ملنا تو آپ کی نوازش ہے مگر آپ ہندوستان میں کی بڑے آدمی سے بھی ملے، یہ صاحب نے جواب دیا، "قبہ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کی روحانی طاقت بہت قوی ہوتی ہے، ماورائے پرانی ہی سبک پوری ہمت کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے انبیاء شہداء و مسلمانوں پر آپ بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ آپ کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ساری حقیقت اس لئے کو دیکھ لیا۔"

حضرت مرحوم نے یہ سن کر انھیں ہلکا پس میں نے گزارش کی کہ حضرت یہ صاحب کے نظریہ پر کلام مجیدی میر تصدیق ثبت کرنا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ کان ابراہیم امة واحدة اعلیٰ کما برہم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرد واحد تھے۔ حضرت اس پر سرسود ہوئے اور قرآن مجید کی آیت سے متاثر ہو کر انھیں پر آب ہو گئیں۔

حضرت مرحوم نے صاحب صاف سلامہ مشہور عربی میں گفتگو فرماتے ہے۔ جس میں بھی بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ حضرت مرحوم عربی ذرا لغت سے جانتے تھے۔ اس شام ہم نے حضرت کی محفل قدسی سے پورے تین گھنٹے غلط اٹھایا۔ مجھے اپنی ترقی تخریک کی تنگ دماغی کا علم ہے تاہم اگر اسی ایک ملاقات کے ارشادات گرامی کا تذکرہ تفصیل سے کروں تو ایک مکمل کتاب تیار ہجائے۔

چلتے وقت حضرت نے ایک ان جہود کو یہ جمال کو لکھانے پر بلایا۔ شیخ محمد امین صاحب اور فاکہ بھی اس شفقت و رافت کی لپٹ میں آ گئے۔ حضرت نے رخصت ہوتے وقت تاکید فرمایا کہ ہم دعوت والے روز وقت سے دو تین گھنٹے پہلے آجائیں تاکہ کچھ باتیں ہو سکیں۔ یہ جمال صاحب حضرت کے اخلاق عالیہ سے بے حد متاثر ہوئے اور میں نے دیکھا کہ واپس آنے پر ان کا ہر اتنا مسرور تھا جیسے

انہیں مقصد حیات حاصل ہو گیا۔

حضرت مرحوم کے ارشاد دعوت کو میں نے نصیحت ہوش وحواس اپنے کانوں سے سنا تھا۔ پھر بھی دل تعین نہ کرتا تھا۔ شاعر شرقیؒ نے مجھے یہ بات ایک نگین اور شیریں خواب سا معلوم ہوتی تھی اور ہونی بھی چاہئے تھی۔ میرے ماموں جان ایک دفعہ اپنے گاؤں کے فوجی جہدار کے ہاں گئے۔ کھانا کھانے کا وقت آیا۔ تو جہدار صاحب نے رسمی طور پر کھانا کھانے کو کہا۔ سولی سے اصرار و انکار کے بعد ماموں جان نے کھانا کھالیا۔ گھر آئے تو پھولے نہ ماتے تھے۔ بڑے فخر و مباہات سے بیان کرتے تھے کہ میں نے جہدار صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالیا۔ کئی دواں تک اسی نشہ میں محو رہے۔ آپ ہی فرمائیے ایسے غریب گھرانے کا ایک حقیر فخر اگر دُنیا کے عظیم المرتبت انسان کے دو لکھ روپے ہو تو کیوں فخر نہ کرے۔ سچ پوچھئے تو میں نے یہ دو دن زمین پر نہ کئے بلکہ اسی دعوت کے خیال میں مت آسمان کی بلندیوں پر اڑا تھا۔

دعوت والے دن شیخ محمد امین صاحب کی مصروفیت کے سبب ہم ذرا دیر کر کے پہنچے حضرت علامہ ہمارا انتظار فرما رہے تھے اور اصرار کی باتوں کے بعد کھانا کھالیا۔ مجھے حضرت مرحوم کے بائیں پہلو میں بگڑی حضرت مرحوم کما بھی کھاتے رہے اور مہمانوں کے لئے علی بخش کدھیات بھی دیتے رہے۔ مجھے کھانا تو کیا کھانا تھا۔ اسی نشہ میں محمود اور محویت رہا کہ آج میرا نصیب اچھا ہے کماں ڈھکیا۔ میں نے دورانِ گفتگو میں گزارش کی کہ حضرت اس زمانے کے مسلمانوں نے تو آپ کی قدر نہ کی۔ آئینہ نسل آپ کی ذاتِ بابرؒ سے محروم ہو جائے گی۔ توقع تھی کہ آئینہ نسل کے لئے خدا اور کئی دانا ئے راہِ صحیح دے گا مگر آپ نے فرمادیا ہے۔

از تب و تا ہم نصیب خود بگیر بعد ازین ناید چو من مرفقیر

تو اس حالت میں مسلمانوں کا کیا حال ہوگا؛

یہ سن کر حضرت کے چہرے پر انتہائی سوز و درد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ فرمایا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مسلمانوں کا حشر کیا ہونے والا ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اب ذلت کی انتہا ہو چکی۔ اب یا تو خدا مسلمانوں کی حالت کو سدھائے گا یا پھر موجودہ نسل کو دنیا کرتی اور زندہ قوم پیدا کرے گا۔ ہاں! یہ بات میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں موجودہ نسل کا "آخری مسلمان" ہوں۔

وفات کے دو تین مہینے قبل ایک روز عابد منزل میں پہنچا تو علی بخش نے اندر جانے سے روکا اور کہا ڈاکٹروں نے حضرت کو کسی سے ملنے یا بات چیت کرنے سے منع کر دیا ہے۔ میں نے یہ سن کر پہلے تو ڈاکٹروں کے لئے بارگاہِ الہی میں حصولِ ہدایت کی کئی علامتگی۔ اور پھر علی بخش سے کہا کہ میں خاموش بیٹھا رہوں گا مگر نیاز حاصل کئے بغیر حائل گا نہیں۔ علی بخش نے یہ الفاظ حضرت سے جا کر کہہ دیے۔ آپ نے حاضر ہونے کی اجازت دے دی۔ میں سلام دُعا کے بعد خاموش بیٹھ گیا حضرت نے مزاجِ پرہیز کی۔ تو میں علی بخش سے عہد کا ذکر کیا۔ اور گزارش کی کہ مجھے ایک درویش "اور قدر" کے دروازے پر دربان دیکھ کر کوفت ہوئی ہے۔ آپ نے علی بخش کو کہا

کرفز یا کہ آئندہ یہ آئیں تو ان کو بلا روک ٹوک آنے دینا۔

اسی ملاقات میں میری گزارش پر حضرت مرحوم نے مجھے ایک ہلوی صاحب کا مقدمہ سنایا۔ ہلوی صاحب حضرت مرحوم کی تحریر چاہتے تھے۔ پہلے تو حضرت نے انکار کیا اور ہلوی صاحب کو کلامِ الہی کی طرف توجہ دی۔ ”مقامِ میری دین سے آگاہ کرنا چاہو گویا ہلوی صاحب کے عقیدت مند امر میں کمی نہ ہوئی تو حضرت نے فی البدیہہ یہ قطعہ لکھ دیا ہے

بگوار ما بسلا یاں سلاے کہ پیانے خدا گفت در مارا
مگر تاویل شان حریرت اندخت خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

ایک دفعہ میں حاضر ہوا تو کچھ ارادت کش بیٹھے ہوئے تھے مسلمانوں کی زبوں حالی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باقی لوگ اٹھ کر چلے گئے تو حضرت نے میری طرف توجہ کی اور مسلمانوں کی پستی پر گفتگو فرمانے لگے۔ باتوں باتوں میں حضرت کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور فرمایا خدا نے ایسی موت تم میں پیدا کیا ہے جو باوجود زور سے پکڑو جھنجھوڑنے کے خواب غفلت سے بیدار ہوتی ہی نہیں، اس قوم کا مرنے کو رنگا بھی، بہت دیر بہہ ہو گیا ہے۔ حضرت کا یہ شعر بھی ان ہی تاثرات کا منظر ہے۔
میں نے تو کیا پردہ اسرار کو بھی پاک دیر بہہ تیرا مرنے کو رنگا بھی

حضرت کی بارگاہ میں میری حاضری کا سلسلہ نہ بہت عرصہ رہا اور نہ بہت طویل طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ علی بخش کی کہہ کر جب حضرت نے مجھے حاضر ہونے کی کھلی اجازت دے دی تو پھر شاید میں ایک آدھ بار ہی حاضر ہوا ہوں گا۔ تاہم تھوڑی ہی ملاقاتوں میں فیضانِ نضر حضرت کی عظمت و درجت سے شناسا کر دیا۔ میں اور مجھ جیسے اور ہزاروں عقیدت مند جب آپ کے نصرت ہوتے تھے تو زبانِ حال و قال سے کہتے جاتے تھے کہ

نتاجِ حقیت میں نے لشکر و سپاہیں ہے جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

حضرت سے ایک ہی ملاقات کر کے انسان کو یہ یقین ہو جاتا تھا کہ حضرت دورِ حاضر و کے سب سے بڑے شاعر اور فلاسفی نہیں بلکہ سب سے بڑے انسان، عاشقِ رسول اور مکتبِ فرائض بھی ہیں۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہی آپ پر ہر طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کی تعائین میں بھی جہاں کہیں حضور سرورِ کائنات کا ذکر آ جاتا ہے۔ آپ پر ذوق و وجدان کا بے پناہ جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔ انہی عشقِ تیر ہو جاتی ہے اور آپ عشقِ رسولِ صلعم کے بھرے کراں میں بے اختیار کود پڑتے ہیں جن لوگوں کی نظر سے روزِ بے خودی کے آخر کی نظم ”اتجا حضور رجۃ اللعلین“ گزری ہے وہ رجۃ اللعلین سے اس مردِ قلندر کے عشق کا رتہ سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت مرحوم کی طبیعت میں انحرارے مدد تھا۔ وہ حقیقتہً شکوہ خسروی اور شانِ سکندری پر درویشی اور فلسفہ دہی کو ترجیح دیتے تھے۔ یومِ اقبالؑ سے چند روز پیشتر میں حاضر خدمت ہوا۔ اور گزارش کی کہ میں نے یومِ اقبال پر بڑھنے کے لئے اقبال لکھنؤ کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔ فرمایا۔ مجھے نفسِ مضمون سے بحث نہیں جو چاہو سو لکھو مگر عنوان بدل دو۔ یہ دال کے ساتھ اقبال اچھا نہیں لگتا۔ بہتر ہو کہ اس عنوان کو پھیلا کر اقبال کی شاعری میں فلسفہ یزدان و ابلیس "کردو میں نے تعیل ارشاد کی مگر یمنین پر دھننے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

حضرت کی وفات ہوئی تو میں کراچی تھا۔ ایک صاحبِ فات کی خبر سُن کر دوڑے دوڑے آئے۔ اور کہنے لگے کہو بھائی حضرت کے معصوم بچوں کی ہتھی کا کیا ہوگا؟ میں نے کہا۔ آپ یہ کیا سوچ رہے ہیں۔ معصوم بچوں کا تو اٹھو لگا ہے۔ سوچنا تو یہ ہے کہ اب ملتِ اسلامیہ کی تہی کا کیا ہوگا۔

کراچی کی ایک مسجد میں حضرت علامہ کے بہت سے قطعے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے امامِ مسجد صاحب کے کہا۔ آج رانِ قلعوں کو لکھنے والا شاہِ جہاں بسا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکے میں نے کہا "حضرت اقبال فوت ہو گئے۔" کہنے لگے "اقبال کون تھا؟" اللہ اکبر! یہ ہمارے قادیان اور ہریانِ اسلام کی حالت ہے کہ وہ اقبال جیسے جلیل القدر فرزندِ اسلام سے نادانف ہیں۔ ان مولوی صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ اقبال داڑھی نہ رکھتے تھے تو کہنے لگے۔ ایسے شخص کا سرمہ کیا کرنا۔ یہ سُن کر سیرِ اسٹیشن ہو گیا اور میں نے شیت کی تنگ بخشی پر قلم کیا کہ وہ مولوی تو بہت پیدا کر سکتی ہے لیکن ایسے دو چار داڑھی منڈے نہیں پیدا کرتی تاکہ قوم کا بیڑا پار ہو جائے۔

لاہور گریس نے سلطنتِ صاحبِ قبلہ سے پوچھا کہ مولانا اس وقت دُنیا میں کم و بیش ستر کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ فرمائیے ان ستر کروڑ مسلمانوں میں کون ہے جسے منہ قبل پر بٹھایا جائے اور جس کے عالمِ فانی سے رخصت ہونے پر اسی طرح علم کی گھٹائیں دُنیا پر چھا جائیں۔ جس طرح اقبال کی وفات پر اس کا جواب سالکِ صاحب کے خنیں آنسوؤں نے دیا۔

اقبال جس کے قلم نے ہزاروں دلوں کو حیاتِ تازہ بخشی جس نے ملتِ اسلامیہ کے ترقی مدہ میں زندگی کی لہر دوڑادی جس نے نوجوانوں کے قلوب میں انقلاب برپا کر دیا جس کے وجود میں بیک وقت لینن، ٹلٹس، ٹالسٹائی، امام ابنِ تیمیہ، شاہِ ہمدان، برگسان، کارل مارکس، بائرن رومی اور جلال الدین افغانی کے کمالات نظر آتے تھے جس کے معلقہ سخن میں ایسے ایسے گدا زیرِ تربیت تھے جو خود اسی کے الفاظ میں راہِ درسم کچھ کلاہی سے آگاہ تھے۔ آہ! وہ اقبال، جہاں اسلام کا وہی آفتابِ علم ۲۱ اپریل ۱۹۳۶ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝

مطبوعات

خاتم النبیین مؤلف ابراہیم صاحب عمادی - استاذ اسلامیات کینیل ہائی سکول بمبئی - یہ سیرت نئی طرز میں لکھی گئی ہے۔ زیادہ حجم نہ ہونے کے باوجود خاصی جان ہے۔ انداز بہت مختصر ہے حجم ۲۰۴ صفحات قیمت ۱۰-۱۱- پتہ: ابراہیم عمادی صاحب استاذ اسلامیات کینیل ہائی سکول بمبئی -

مولود ہمالیہ - مرتبہ حاج محمد علی خاں صاحب رئیس ذوالفی شمس علی گڑھ - اس کتاب میں اصل قبول کی ولادت سے ہجرت تک کے حالات نہایت دلکش انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مؤلف توفیق سے کام لیا گیا ہے حجم ۶۶ صفحات قیمت ۳- پتہ: - مکتبہ محمد آفرین ازب بازار - حیدر آباد روکن -

محبوب خدا - مرتبہ چودھری افضل حق صاحب - یہ کتاب چودھری صاحب نے حیل میں لکھی ہے، اس کا صرف صرف حضور کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ حجم ۲۰۴ صفحات، زبان سادہ و سلیس - قیمت مجلد غیر - پتہ: تاج کنبی ایٹل لاہور -

مکتوبات امجد - مرتبہ مولوی نعیم الدین صاحب ہاشمی - ملک حضرت امجد سے زیادہ تر ایک مؤلفی شاعر کی حیثیت سے واقف ہیں لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ حضرت محبوب بہت صاف و سلیس اور بے تکلف لکھنے پر بھی قادر ہیں۔ یہ دلچسپ کتاب حضرت امجد کے خطوں کا مجموعہ ہے۔ آج کل ادبیات میں غلطی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول ہوگی۔ قیمت ۸- پتہ: - شمس المطالع عثمان گنج حیدر آباد روکن -

شاہیر اردو کے خطوط - مرتبہ پروفیسر حبیب پشاور صاحب مولوی فاضل مہدی عربی، فارسی و اردو ڈیپارٹمنٹ بنارس یونیورسٹی الہ آباد - اس کتاب میں اردو ادب و مشاہیر کے خطوط جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب بہت دلچسپ ہے اور حبیب صاحب شکاری نے سختی سے اس کو انہوں نے یہ اہم خطوط یکجا جمع کر دیئے۔ قیمت ۸- پتہ: - کے بی اگر وال صاحب - شانتی پریس الہ آباد -

وفاق مہندر - از خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین صاحب جعفری - آج کل مسئلہ وفاق ملک کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد جدید دستور اور وفاق حکومت کی شرح و کلامت درج ہیں۔ کتاب پڑا معلومات اور پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۸- پتہ: - اردو و لٹریچر کمپنی دہلی -

ہندوستان کا نیا دستور حکومت - مؤلف کن پشاور صاحب کل ممبر سر ڈس آف انڈیا سوسٹی لکھنؤ اس کتاب میں جدید دستور فیڈریشن اور دیگر اہم سیاسی مسائل پر بہت قابلیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ موجودہ سیاسیات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید

ہے قیمت عمر - پتہ: ہندوستانی الیڈمی آباد -

جدید دستور کا خانہ کارزین العابدین صاحب بی ایس سی پی ایچ ڈی لندن جدید دستور کے متعلق یہ مختصر سالانہ خاص پرائز معلومات ہے قیمت ۲ روپے، مکتبہ جامعہ دہلی -

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش :- از سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی - ایڈیٹر ترجمان القرآن پٹھان کوٹ پنجاب - اس کتاب میں اسلامی ہند کی گزشتہ تاریخ موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک دلکش تبصرہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے لئے آئندہ مذہبی سیاسی نظام عمل پیش کیا گیا ہے۔ مسلمان اگر اس کا مطالعہ کرنا چاہئے - پتہ اور پریچ ہے قیمت دس روپے - حجم ۱۲ صفحات -

اسلام اور اشتراکیت - انھان بہادر صاحب محمد بیروت احمد پانی انیری محضری دہلی - مؤلف نے بہت محنت اور تحقیق سے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اور ان کی یہ قومی خدمت قابلِ داد ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو مفت تقسیم کیا ہے - پتہ اور پریچ ہے -

ضمیمہ - مذاہن حال کی زندگی کا ایک اخلاقی ناول از مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب سابق صدر انجمن جامعہ عثمانیہ - ترک اور انگریز اہلکے ساتھ مصنف نے اصلاح معاشرت، ترک توہمات اور احیائے قومیت پر بحثیں کیں، یہ ناول ان کا چوتھا ہے۔ جگہ جگہ نہایت مفید اور دلچسپ معلومات ہیں کتاب پڑھنے کے قابل ہے قیمت دس روپے - پتہ مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب ریجنل سیکریٹری حیدر آباد ایکریٹیشنل کانفرنس، ایگم پیٹ، حیدر آباد (دکن) -

بنات - حضرت علامہ راشد انجیری مرحوم کا فنمیں ان کے بعد بھی جاری ہے - علامہ منغور اردو کے شہرہ آفاق ادیب اور عورتوں کے محسن و عظیم تھے - ان کی حیات اور بھرتی کے لئے انہوں نے جو زبردست کوششیں کیں وہ ان کے رسالوں کے ذریعہ متعلق طور پر ہمارے سامنے ہیں - ان رسالوں میں ایک "بنات" ہے جو گیارہ سال سے باقاعدہ کم عمر بچوں کے لئے نہایت مفید اور دلچسپ مضامین شائع کر رہا ہے - اس میں بچوں کی لیاقت اور زبان کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے - ہر صفحہ کے نیچے لفظوں، تاریخ، جغرافیہ، حساب و درسیات کے مضامین کے علاوہ پہیلیاں، مسعے، دستکاری اور ہنر کشیا کی ترکیبیں بھی شائع کی جاتی ہیں - زبان اتنی سادہ اور دلکش ہوتی ہے کہ بچی بچیاں بھی مزے لے لے کر پڑھیں - غرض بالوں بالوں میں ایسے بہت سے سبق پڑھا دیئے جاتے ہیں جو ایک بچی بچی کے لئے ضروری ہیں - سال بھر کا چند صرف ڈیڑھ روپے ہے - پتہ: دہلی میں رسالہ بنات دفتر ممت دہلی -

قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں - از حضرت عارف تھوری - جو ان منصف نے جن کا تعلق دہلی کے شاہی خاندان سے ہے، اس کتاب میں اپنے بزرگوں کے حالات لکھے ہیں - اگرچہ واقعات سرسری طور پر پیش کیے گئے ہیں اور ان میں کوئی خاص ربط بھی نہیں لیکن پھر بھی اس سے قلعہ شادی کی معاشرت اور شوکت و عظمت کا دھندلا سا اندازہ ہو جاتا ہے - کتاب عامی دلچسپ اور مطالعہ کے قابل ہے - قیمت ۸ روپے، مکتبہ جمال شاہ - اردو بازار جامع مسجد - دہلی -

قطر اش بنم۔ یہ جناب گورنر داس صاحب بی۔ اے کے مختصر ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مقدمہ حضرت افسر الشہداء آغا خان عظمیٰ دہلوی نے اور دیباچہ سید امتیاز علی تاج نے لکھا ہے۔ دو جہان مصنف نے مختلف شخصیات کو شاعرانہ شہیں پیش کیا ہے اور وہ ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ متعدد تصاویر زینت کتاب میں قیمت مجلد ایک روپے کاٹنے پتہ: بیچ رام اینڈ سنز لاہور۔

الربعہ عن مصر۔ یہ حضرت محمود ماہر طبیب اکبر آبادی کی رباعیات کا دلکش مجموعہ ہے جو خوشنما کاغذ پر مجلد چھپا ہے۔ شروع میں حضرت امیر کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ رباعیات زندگی پرورد میں قیمت عر۔ پتہ: خاں صاحب محمود علی خاں صاحب تاجر، فرخش خانہ، دہلی + ایوان تہمتن۔ ازاد اکثر مرزا ریاض احمد بیگ صاحب چغتائی۔ اس ناول میں تہذیب، فاضلہ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت عر۔ پتہ: البان برنی پریس، سرکی دالال، دہلی +

تفویض۔ یہ میرزا غنیم بیگ صاحب کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ مرزا صاحب کا انداز بیان بہت دلکش ہے۔ تفسیر ہفتی معاشرت کا ایک نہایت دلایز مرقعہ ہے۔ قیمت ۵ روپے ساتی ہکٹ پو دہلی +

کیمیا گراور دیگر افسانے۔ یہ پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (اکسن) کے نو دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے جو نہایت حُرانِ اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ یہ افسانے ہندوستانی زندگی کے بہت اچھے مرقعے ہیں۔ کتاب بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۱۵۵ صفحات قیمت دس روپے نہیں۔ پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی +

راہِ سبوتین۔ از حضرت طبع آبادی۔ یہ اُس مشہور شیطان بیت راہب کے حالات ہیں جس کی سازشوں اور نفسیہ ریشہ دوانیوں نے روس کا تختہ الٹ دیا۔ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ حجم ڈیڑھ سو صفحات قیمت ۵ روپے۔ پتہ: دفتر اخبارِ ہند دہلی

طوفانِ تبسم۔ یہ حضرت شوکت قمانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ شوکت صاحب کے مزاحیہ مضامین مقبول ہو چکے ہیں۔ کتاب میں خاصا نفرتی سال ہے۔ پتہ: مینجر شوکت بک ڈپو لکھنؤ +

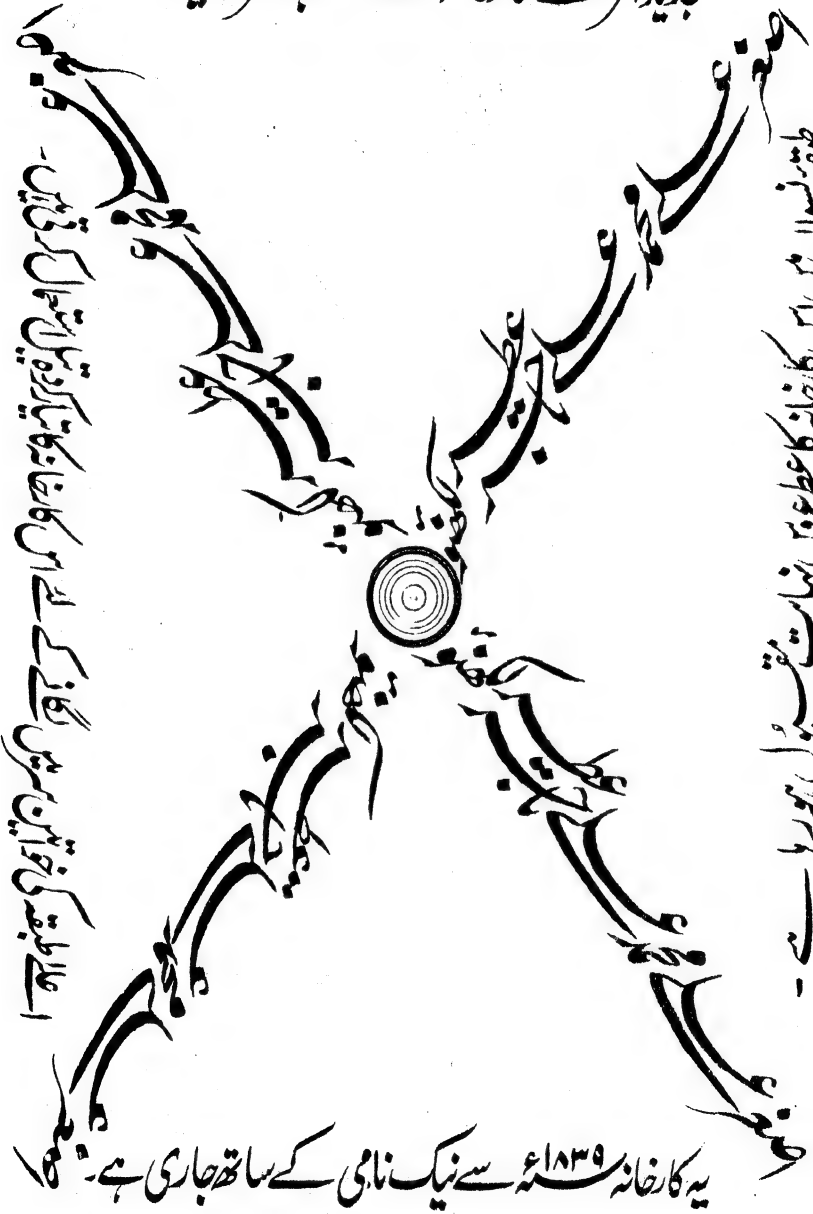
صیدِ زبول۔ از امتیاز حسین صاحب قریشی ایم۔ اے۔ یہ ایک بلند مرتبہ معاشری ڈراما ہے جس کا مقصد اصلاح حالات ہے۔ اشتیاق صاحب یوں بھی اُردو ڈرامے کی اصلاح چاہتے ہیں اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ حجم ۱۰ صفحات پتہ: مکتبہ جامعہ لدیہ دہلی۔

فکر و نشاط۔ یہ حضرت جوش ملیح آبادی کی روکین لٹروں کا ایک نہایت دلکش مجموعہ ہے۔ حضرت جوش کے کام کی تعریف تحصیل حاصل ہے۔ مجموعہ اُردو شہر سے کبھی نہ لکھنے والے شخص کے پاس ہونا چاہئے۔ قیمت مجلد غیر۔ پتہ: مکتبہ جامعہ لدیہ دہلی +

السامی افسانے۔ یہ لفظی احوالِ سبب کش کی یہ جہت قابلِ ادب ہے کہ انہوں نے مذہبی کتابوں کے قصص کچھ کر کے اُردو زبان میں شائع کر دیے ہیں۔ گویا اُن کی دلچسپ کتابِ سبب کش کا ایک حصہ سے بھی آدمی کو واقف کر دیتی ہے۔ حجم ۱۰ صفحے ہیں۔ موصفا کے تریبے اور نیچے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ہر کتب خانے کی زینت بننے کے قابل ہے۔ پتہ: تاج کتبانی لدیہ لاہور +

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے۔

طبقہ نسواں میں اس کارخانہ کا عطریوں نہایت قیمت بول ہو رہا ہے۔



یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے۔

فہرست مضامین

”ہمالوں“ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء

تصویر: ————— ونیش لٹ مائو



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۴۱۴	بشیر احمد	۱	بزمِ ہمالوں
۴۱۶	حامد علی خاں	۲	جہاں بنا
۴۲۱	”موسیقی“	۳	یورپ کا ات دسیاست
۴۲۷	جناب ہارنی علیگ	۴	شکرِ جاپان
۴۲۸	جناب احمد علی خاں صاحب شاد عارفی	۵	سرگزشتِ دانہ (نظم)
۴۳۰	جناب کرشن چندر صاحب ایم۔ اے	۶	دو فلاںک لمبی سروک
۴۳۶	جناب خواجہ عبد التیمم صاحب پال انٹر صلیبی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی	۷	تجلیات
۴۳۷	جناب ربیع ظفر احمد صاحب کوکت بی۔ اے۔ وی ٹی سی	۸	ہندوستانی
۴۴۰	حضرت حفیظ ہوشیار پوری ایم۔ اے	۹	اردو کا ماضی و حال
۴۴۱	”میراجی“	۱۰	الاؤپر، رات کا بجیت
۴۴۲	راجہ محمد علی خاں صاحب	۱۱	افسانہ نویس (افسانہ)
۴۴۶	صاحبزادہ احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔ اے	۱۲	سپلی اور آخری آرزو (نظم)
۴۴۷	جناب فضل الدین صاحب اثر اکبر آبادی	۱۳	”چاند نکلا“
۴۴۸	جناب عبد المجید صاحب حیرت	۱۴	قطرہ
۴۴۹	حضرت حامی عثمانی	۱۵	بیامری ریح (افسانہ)
۴۵۵	جناب نذکر رضا صاحب جھنگن ایم۔ اے	۱۶	جبریل و ابلین رڈ (اما)
۴۵۷	جناب واثق	۱۷	برباد شہر
۴۵۸	جناب حمید نظامی بی۔ اے	۱۸	دنیائے ادب
۴۶۱	حضرات شاعر، صدیقی، عبدالرشید، تپش، محمود و عرش	۱۹	غزلیات
۴۶۳	جناب مسعود حسن صاحب سنی دانا پوری	۲۰	مٹا سٹنڈا داماد (افسانہ)
۴۷۱	پرنسپل رام پرشاد صاحب ناشاد ایم۔ اے (راکھن)	۲۱	جہان کی حالت (نظم)
۴۷۲	جناب ابراہیم صاحب پورٹس کلکتہ	۲۲	درائے کار و دل (۷)
۴۷۴		۲۳	محفل ادب
۴۸۲		۲۴	مطبوعات

چند سالانہ ہفتہ ماہی سے (زمین محفل) قیمت فی پیچہ ۸

بزم ہمایوں

ہمارے کرم دوست مولوی عبدالحق صاحب سرکاری انجمن ترقی اردو سے بڑھ کر اردو کا سرگرم اور بے تقصیب کارکن کون ہوگا؟ وہ نے مدت تک سیاسیات بلکہ لسانی سیاسیات میں آنے سے پرہیز کئے رکھا، پچھلے سال وہ لکھنؤ تو تشریف لائے مگر انہوں نے لیگ میں شرکت نہ کی۔ وہ زبان کے مسئلے کو سیاسیات سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہتے تھے اور اس پر انہوں نے نیک نیتی سے عمل بھی کیا۔ اور اردو کے مخالفین کو اپنے قول و فعل سے ثابت کر دیا کہ اردو ہندوستان دونوں کی مشترکہ زبان ہے۔

لیکن محض ایک طرف کی نیک نیتی سے کیا بنتا ہے اور دوسرا پہلے ہی سے اپنے دل میں پورا فیصلہ کر چکا ہو تو ثبوت بھی سب حصرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہی اس اردو کے معاش میں ہوا۔ مولوی صاحب کی معصومیت پر پہلی بجلی بھارتیہ راہنہ پر شدیں ڈھانی سال ہوئے گئی جب گاندھی جی نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، وہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے مسلمان ہیں تو اسے رکھیں اور پھیلانیں۔ گاندھی جی ۱۹۳۷ء میں سیاسیات سے استعفا دے کر اچھوت ادھار اور ہندی پرچار میں مصروف ہو چکے تھے یہی ان کے نزدیک سراج حاصل کرنے کا سیدھا راستہ تھا اور اب بھی جب کہ وہ کانگریس کے چار آنے کے ممبر نہیں لیکن کانگریس کے کرتا دھرتا میں وہ کانگریس حکومتوں کے ذریعے سے اچھوتوں کو ہندوؤں میں ملائے اور ہندی کو بڑھانے اور غریب اردو کو گرانے میں نہمک ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب بھی ان ڈھائی سالوں میں فارغ نہیں بیٹھے۔ نہ محض اہی عظیم الشان ڈکٹریوں کی تابلیف میں مشغول رہے، بلکہ ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی محبوب اردو کے لئے ماسے ماسے پھرا گئے۔ علی گڑھ میں اردو کانفرنس منعقد کی، صوبے صوبے میں شہر شہر میں انجمن کی شاخیں قائم کیں، اردو مدرسوں کو امداد دی، لکھنؤ مسلم لیگ کو ذرا دُور ہی دیکھتے ہی کہہ کر اردو کے حامی کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں، پھر کانگریس لیڈروں اور وزیروں اور خود مہاتما جی سے ملاقاتوں کے پتھر میں رہے، کہا کھلایا سمجھایا جیسے کہ گروہان کان پرچوں تک نہ رہی کہ ہندوستان کا "قومی" پروگرام پہلے ہی سے مرتب ہو چکا تھا اور اس میں اردو کو دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔

آخر بہت سے سمبر کے بہ مولوی صاحب نے پچھلے مہینے گاندھی جی کے نام "مسلمان اور دیوانہ سیکریم" کے متعلق ایک کھلی کھلی کلمہ جو ملک کے ہمت سے اخباروں میں چھپی مولوی صاحب نے واقعی بہت صبر کیا۔ سیاسیات کے متعلق برسوں چپ سا مٹی کبھی بھولے سے بھی مسلمان اور اردو کا ایک جا ذکر نہ کیا، بڑی نرمی سے اور دل بہا بیٹے والی دلیل سے سمجھایا کہ اردو ہندوستان دونوں کی بنائی ہوئی زبان ہے ان دونوں قوموں کے اتحاد کی نشانی ہے، تمدنوں کے ملاپ کی یادگار ہے بلکہ یہ ہندو مسلمانوں کی ایک جتنی اور وطنیت کی علامت قرار ہے لیکن وہاں محض وہیروں اور شیروں کے زمانے کی طرف منہ نہ چکا تھا۔ یو کسی نے اس "مسلمانی" شورش کو نہ دیکھا نہ سنا، اسلام آباد کی مٹھن کو اس میں نہی ایک زبان اداس کے ادب نہی، ایک قوم اور اس کے کچھ پھر کی گنجائش کہاں تھی؟

”دیواندریکیم“ ”واردھاسکیم“ کا ایک بچہ ہے جسی بی بی پیدا ہوا ہے۔ ”واردھاسکیم“ گاندھی جی کے دماغ سے پیدا ہوا کہ گاندھی خاں اولوں کی گود میں پل رہی ہے۔ اس میں شیعہ نہیں کہ باوجود بعض نفائس کے ”واردھاسکیم“ کا مقصد اہل ملک کو کھوٹے سے کھوٹے عرصے میں تعلیم یافتہ اور خود دانشوری بنانا ہے اور وہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔ لیکن شکل یہ ہے کہ ان ملکی اور نیک نیتی کے کاموں میں جب وہ عقدہ عمل میں آجائیں مسلمانوں پر کوئی مذکورہ نازل نہ ہوجاتی ہے۔ اس لئے مجبوراً ادھر آل انڈیا مسلم یونیورسٹی کا نفرنس کی ایک کمیٹی نے اگست میں واردھاسکیم کے متعلق اپنی خیال اور انہیٹے کا اظہار کیا، ادھر مولوی عبدالحق صاحب نے گاندھی جی کے نام ستمبر میں ایک کھلی چٹھی لکھی۔

کھلی چٹھی میں لکھا ہے کہ جنوری ۱۹۳۷ء سے سی بی کے مسلمان رازشور مچا رہے ہیں لیکن ان کی مذکورہ توجہ نہیں دیتی، جنوری میں انہیں اردو ناگپور کا جلسہ ہوا اور ایک قرارداد آئریل ذریعہ کی خدمت میں بھیجی گئی۔ پھر انہیں کے ایک رکن نے معرود شدہ مسلمان ذریعہ کی صحبت میں گاندھی جی سے ملاقات کی۔ گاندھی جی نے تسلی بھی کر لیا کہ واقعی دیواندرنام بعض حیثیت سے قابل اعتراض ہے اور ایک مذکورہ کیا۔ پھر اسی سال کا ایک عام جلسہ ناگپور میں ہوا۔ انہیں ترقی اردو نے بھی دوبارہ ایک جلسہ کیا۔ جھیلو سہلی کے مسلمان بھڑوں نے بھی اپنے نقطوں سے اعلان کر دیا۔ نیشنل مسلمانوں کے ایک وفد نے شری ہنس صد کا گروس سے ملاقات کی اور انہوں نے وفد کے مطالبات کے قابل اتفاق بھی ظاہر کیا موصوفے کے کانگریسی مسلمانوں کی ایک کانفرنس نے بھی دیواندر کے خلاف قرارداد منظور کی۔ اسی طرح یونیورسٹی کانفرنس بارہنہ بھی دیواندر کے خلاف سخت بیچ فائرس کا اظہار کیا یعنی جہاں تک اس سکیم کا تعلق ہے باوجود شدید سیاسی اختلافات کے موصوفے کے سب مسلمانوں نے یکجا دلا ہوا کہ اس کی مخالفت کی، غل چایا، ڈاٹائی دی کہم کو اس سکیم کی کسی کمی نہیں دلیا گیا لیکن ادھر مصروفیت و شمولیت نہیں بے پروائی و بے نیازی کا یہ علم تھا کہ ملکی و معنوں کی اہمیت میں گویا اردو زبان کو زبان ہندی کا غم مل چکا تھا!

مولوی صاحب دیواندر کی جگہ ”پڑھائی گھر“ کا سبک و آسان ”ہندوستان“ نامہ تجویز کرتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کے لئے اردو دار و مضاب کی کتابوں اور اردو مدارس کے متعلق معقول مطالبے پیش کر کے آخر میں کہتے ہیں:-

”انڈین نیشنل کانگریس کا یہ دعوئے ہے کہ وہ اقلیتوں کی زبان و تہذیب کی محافظ ہے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ میری انہج کا نام نہادہ قضیہ پانڈھرنار ضلع چھند داواہ کے مدرسے میں بھیجا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ اسکول کے شروع مجھے سے پیشتر ہندو اور مسلمان لڑکے رسوئی کی ثمرت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پراختہ کر رہے ہیں۔ مسلمان لڑکے ان مدرسوں میں پڑھ کر سلام تک قبول کئے ہیں اور اب وہ سلام کی جگہ ”نستے“ اور ”رام جی کی جے“ کہتے ہیں۔ کیا زبان و تہذیب کی حفاظت کے یہی سوتی ہیں؟“

”جہاں تا جی! ہم نے ہر جاہز اور آئینی کوشش کر کے دیکھ لیا۔“ آپ سے یہ آخری گزارش ہے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی شافی جواب نہ ملا تو میں آپ کو بعد عاجزی و تنہب کرتا ہوں۔ پھر مسلمانوں کے لیے مجھ اس کے کوئی چارہ کار نہ ہے گا کہ وہ آپ ہی کے ہتھیار آپ کے مقابلے میں استعمال کریں۔“

یہ ہوگی ہندوستانی قوم کے اندر قومیتوں کی فکر! خدا! اس ملک کو بچائے!

بشیر احمد

جہاں نما

انسانی عمر پر غلامی کا اثر

اعداد و شمار جمع کرنے والوں نے مختلف ملکوں میں مردوں اور عورتوں کی عمر کے اوسط کے نقشے بنا رکھے ہیں۔ ان نقشوں سے عموماً ایسے کی کمپنیوں والے بہت کام لیتے ہیں کیونکہ انہیں دیکھ کر وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سمیرا کرانے والا اپنی موجودہ عمر کے بعد تقریباً کتنے عرصہ اور زندہ رہے گا۔ ذیل کے نقشے سے مختلف ملکوں کے اوسط عمر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ اعداد و جیت اقوام کے سالانہ مجموعہ اعداد و شمار بابت ۱۹۳۶ء سے لئے گئے ہیں :-

ملک	مرد	عورتیں
مصر	۳۱	۳۶
کینیڈا	۵۸/۹۶	۶۰/۷۳
ملائیکہ متحدہ امریکا (سفید رنگ لوگ)	۶۰/۷۲	۶۴/۷۲
(غیر سفید فام)	۵۰/۸۲	۵۳/۷۴
ہندوستان	۲۶/۹۱	۲۶/۵۶
جاپان	۴۴/۸۲	۴۶/۵۴
جرمنی	۵۹/۸۶	۶۲/۸۱
آسٹریا	۵۴/۷۷	۵۸/۷۳
بلجیم	۵۶/۸۰	۵۹/۸۳
بلغاریہ	۴۵/۹۲	۴۶/۶۴
ڈنمارک	۶۲/۸۰	۶۳/۸۸
اسٹونیا	۵۳/۱۲	۵۹/۶۰
فن لینڈ	۵۰/۶۸	۵۵/۱۴

فرانس	۵۴٫۳۰	عورتیں	۵۹٫۰۲
آئرلینڈ	۵۷٫۳۷		۵۷٫۹۳
اٹلی	۵۳٫۷۶		۵۶٫۰۰
لیٹویا	۵۵٫۳۹		۶۰٫۹۴
ناروے	۶۰٫۹۸		۶۳٫۸۴
نیدرلینڈز	۶۱٫۹		۶۳٫۵
انگلستان و ویلز	۶۰٫۱۳		۶۴٫۳۹
سکاٹ لینڈ	۵۶٫۰۰		۵۹٫۵
شمالی آئرلینڈ	۵۵٫۴۲		۵۶٫۱۱
سویڈن	۶۱٫۱۹		۶۳٫۳۳
سوئٹزرلینڈ	۵۶٫۲۵		۶۳٫۰۵
چیکوسلوواکیہ	۵۱٫۹۲		۵۵٫۱۸
یورپی سوویٹ یو س	۶۱٫۹۳		۶۶٫۷۹
آسٹریلیا	۶۳٫۴۸		۶۷٫۱۴
نیوزیلینڈ	۶۵٫۰۴		۶۷٫۸۸

مندرجہ بالا اعداد و شمار پر ایک سرسری نظر ہی ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام یورپی و امریکی ممالک، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ کا اوسط عمر ہندوستان سے بہت زیادہ ہے۔ جاپان کا اوسط عمر بھی ہندوستان کے مقابلے میں کافی زیادہ ہے۔ مگر کی حالت بھی ہندوستان کے اچھی ہے۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اکثر ممالک جن کا اوسط عمر ہندوستان سے اچھا ہے آزاد ہیں۔ کینیڈا، آئرلینڈ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی عملاً آزاد ہی سمجھے جاتے ہیں۔ مگر کوشمار بھی ازلی غلاموں میں نہیں ہے اور اب بھی ہندوستان کے مقابلے میں یہ ملک کافی آزاد ہے کیونکہ اپنے تقریباً تمام داخلی معاملات میں اسے خود مختاری حاصل ہے۔ حالات کے اس منشا پر سے اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ درازنی عمر کا انحصار ایک بڑی حد تک کسی ملک کی سیاسی آزادی یا سیاسی غلامی پر ہوتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ بغیر یہ خیال عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے لیکن ہے درست معمولی سوچ بچار کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ جو اسباب رازنی عمر کا موجب ہو سکتے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:۔ اچھی غذا، اچھا گھر، اور مناسب کپڑے جو صحت کے بحال رکھنے میں مدد دیں۔ صحت

جسمانی کے اصول کا علم اور شرعی و عالمی صفائی کے قواعد سے واقفیت، ان اصول و قواعد پر عمل پیرا ہونے کی معاشی استطاعت بچوں کی پیدا
سے متعلق ضروریات کا انتظام، بیماری کے وقت طبی امداد حاصل کرنے کی سہولت، دہائی امراض کو روکنے اور ان کا تعاد کرنے کی طاقت وغیرہ
ان سب باتوں کا انتظام اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ملک کی معاشی حالت اچھی ہو لیکن کسی قوم کے معاشی حالات اس وقت تک اچھے
نہیں ہو سکتے جب تک وہ کامائیس کو کم از کم ایک بڑی حد تک آزاد نہ ہو تعلیم کے بغیر کسی ملک کے لوگ صفائی اور صحت کے اصولوں سے
واقفیت نہیں بہم پہنچا سکتے لیکن غلام ملکوں کی تعلیم کا انتظام ہمیشہ بہت ناقص ہوتا ہے بغیر ملکی حکمرانوں کا فائدہ ہی اسی میں ہے کہ وہ
اپنے غلاموں کو زیادہ سے زیادہ عرصے تک بے خبر اور بے علم رکھیں۔ اگر کوئی ملک چاہے کہ اس کا ہر فرد بڑھا بڑھا کر لپٹے لپٹے انسان
کو پہچاننے والا ہو تو یہ مفید بھی آزادی حاصل کرنے سے پہلے ہو نہیں سکتا۔ بات یہ ہے کہ اگر لوگوں کو صحت اور صفائی کے قواعد تعلیم
بھی ہوں تو ان پر عمل کرنے کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کبھی غلام ملک کے پاس کبھی اتنا روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی اس قسم
کی ضروریات کے عہدہ براہر سکے۔ شرعی اور انسانی صفائی کے ہندو میاں کو پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کے مالیات پر اہل ملک
کو پورا اختیار حاصل ہو لیکن یہ اختیار آزادی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

ہمارا مدعا یہ نہیں کہ ملک کے محض آزاد ہو جانے ہی سے عمر کے اوسط میں اضافہ ہو جاتا ہے (اگرچہ نفسیاتی نقطہ نظر سے یہ خیال
بھی صداقت کے شائبہ سے خالی نہیں ہے) بلکہ اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ وہ حالات جو لازمی عمر میں محدود و محدود ہوتے
ہیں اسی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں کہ ملک کم از کم معاشی طور پر کاملاً آزاد ہو۔
ان معمولات کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ اہل ہند کو قبل از وقت موت سے بچنے کے لئے آزادی حاصل کرنی چاہئے حقیقت
تو یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے کوئی وجہ پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔
آزادی ہر انسان کا طبعی حق ہے۔

ہندوستانیوں کا باہم انگریزی بولنا شرمناک ہے

پریزڈنٹ جمشاش چندربوس نے حال ہی میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا:-

”گزشتہ سال جب میں دائیامیں تھا ایک یورپین دوست نے مجھے چند اور ہندوستانی دوستوں کے ساتھ کھانے

کے لئے مدعو کیا جب وہاں ہم سب باہم انگریزی میں گفتگو کرنے لگے تو ہمارا وہ یورپی دوست بہت حیران ہوا اور

اس نے پوچھا کہ آپ لوگ آپس میں انگریزی زبان کیوں بولتے ہیں۔ اس سوال پر ہم نے شرم سے اپنے منہ جھوکا لئے۔“

اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے میرا مڈلن دلیوی نے لکھا ہے کہ اگر تمام ہندوستانیوں کی کوئی ایک مشترک زبان نہیں ہے تو ہم

میں شرمائے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہندوستان دراصل ایک بڑا عظیم ہے اور اس کا رقبہ یورپ منفی روس کے برابر ہے۔ اگر کوئی شخص ایک پر یہ اعتراض کرے کہ یورپ مختلف ملکوں یا خطوں میں منقسم ہے اور ہندوستان کے تمام موبلے ایک ہی ملک کے حصے ہیں تو یہ بھی درست نہیں۔ بلاشبہ موجودہ سیاسی حالات ہی نے ان موبلوں کو ایک سلسلے میں پردہ دیا ہے لیکن بعد میں ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ یہ موبلے بالکل علیحدہ علیحدہ ملکوں میں تقسیم ہو جائیں۔

در اصل مدیر ماڈرن ریویو ہندوستانی زبان کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستانی نے ملک کے عام ذریعہ تعلیم کی حیثیت اختیار کر لی، تو سو بھائی زبانوں کی ترقی ترک جائے گی حقیقت یہ ہے کہ انہیں کچھ لی زبان کی مخالفت کا خیال مضطرب کئے ہوئے ہے لیکن تعجب ہے کہ وہ دینی زبان سے انگریزی کی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنے کی حالت بھی کرتے ہیں اور اس کو بنگالی کی ترقی کی راہ میں کسی تسم کی رکاوٹ نہیں سمجھتے۔ یہ ہندوستانیوں کے ایک طبقے کی وہی تنگ دلائے ذہنیت ہے جو انہیں پرانی بدشگونی کے لئے اپنی ناک کٹوانے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ انگریزی ہندوستان پر چھا جانے کو ہر جہ نہیں لیکن کوئی ہندوستانی زبان اگر ملک گیر حیثیت حاصل کر چکی ہو تو اسے مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہئے۔

مدیر ماڈرن ریویو نے ہندوستانی کی مخالفت کے جوش میں کانگرس کے قوم پرستانہ نصب العین کے بھی پرچے اڑا دیے ہیں اور یورپ منفی روس کے مساوی بڑا عظیم ہندوستان کو کئی ملکوں میں تقسیم کر کے متحدہ ہندوستان کے خیال کو ایک خواب پریشاں ثابت کر دیا ہے۔ معلوم نہیں پاکستان کی تشریک کے تعلق مدیر ماڈرن ریویو کو کیا خیال ہے؛ البتہ اپنے مضمون کے آخر میں مدیر ماڈرن ریویو نے کیا خوب کہا ہے:-

”کیا کانگرس والے واقعی انگریزی کے ہندوستان سے شرمائے ہیں۔ یا یہ بھی سو فیصدی سوڈیشی بن جانے کا ایک غیر شعوری ڈنگ ہے؛ جب فی الواقع اس مشرم کی جڑیں گہری چلی جائیں گی اور شعلہ کبھی گئیں۔ تو کانگرس والے اپنی کتابیں، رسالے، اشتہار، اخبارات، مضامین اور خطبات وغیرہ انگریزی زبان میں لکھنا اور چھاپنا وغیرہ ترک کر دیں گے۔ اُس وقت خواہ وہ وائس میں ہوں گے تو اگلی ہندوستانی شہریا گاؤں میں، وہ ایک دوسرے سے انگریزی زبان میں گفتگو کرنا قطعاً چھوڑ دیں گے۔“

سوویٹ روس میں اعلیٰ تعلیم اور بارونز گاری

موسکو یونیورسٹی نے گیل روس کے اساتذہ کی انجمن میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ برطانیہ جرمنی، اٹلی، فرانس اور جاپان کی تمام یونیورسٹیوں اور ہائی سکولوں کے طلبہ کی مجموعی تعداد چار لاکھ سے کچھ ہی زیادہ ہے لیکن ایسے سوویٹ روس میں ایسے طلبہ کی تعداد ساڑھے پانچ لاکھ

تک پہنچ گئی ہے۔

مرلٹون نے ایک اور اہم انکشاف کیا۔ اُس نے یہ کہہ کر کہ سرمایہ دار ملکوں میں گریجویٹوں، ریسرچ کرنے والوں، سائنس دانوں اور ہر قسم کے علمی کام کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہے صلائے عام دی کہ اگر کوئی شخص روس میں ایک بھی ایسا سائنسدان یا ماہر فن یا پڑھا لکھا تلاش کر کے دکھائے جو بے روزگار ہو تو ہم اُسے پیش ہوا انعام دیں گے (تہنہ)

روسی یونیورسٹیوں اور ہائی سکولوں سے ہر سال ایک لاکھ فاضل تحصیل طلبہ اور ماہروں فن نکلتے ہیں لیکن بایں ہمہ اُن کی کاروبار کے تمام شعبوں میں آدمیوں کی کمی ہے۔ پڑے لکھے آدمیوں کے بیکار رہنے کا تصور ہی روس میں اجتماعاً معلوم ہوتا ہے۔

مرلٹون نے بتایا کہ دوسرے ملکوں کے سکولوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی الگ الگ تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱) برطانیہ ۵۱۰۰۰

(۲) جرمنی ۷۴۰۰۰

(۳) اٹلی ۷۳۰۰۰

(۴) فرانس ۷۴۰۰۰

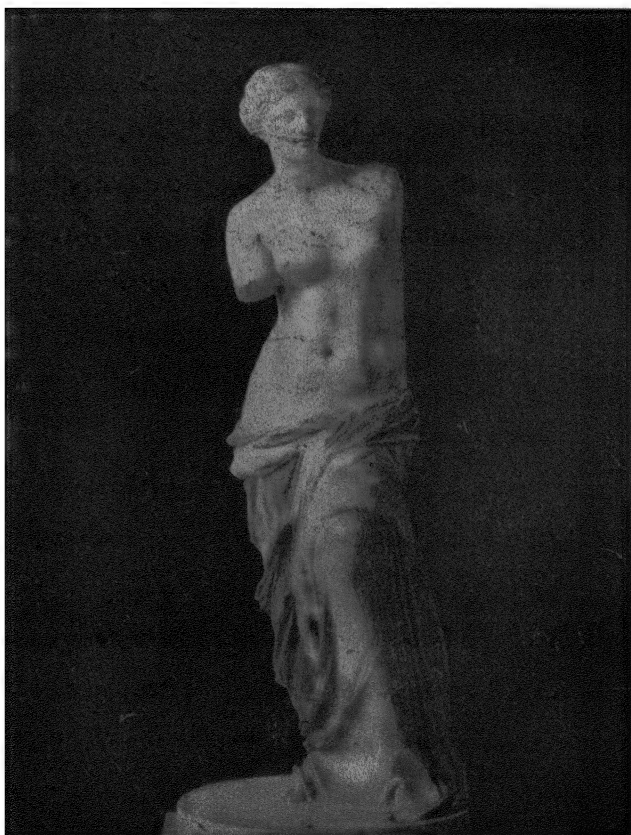
(۵) جاپان ۱۴۶۰۰۰

اس موقع پر مزلٹون نے روس کے موجودہ اعلیٰ تعلیم کے مقابلہ میں ہمارے روس سے کیا۔ اُس زمانے میں روس نے اعلیٰ تعلیم کا ہمیں بتایا، جن میں ایک لاکھ پچیس ہزار اعلیٰ تعلیم پاتے تھے۔ ان تعلیم گاہوں کی تعداد سات سو ہے اور اُن میں ساڑھے پانچ لاکھ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ مزلٹون نے اس بات کی طرف حاضرین کو خاص طور پر متوجہ کیا کہ تعلیم روس کی طرح آج کل کے طلبہ صرف نام اور دستخط احوال طبقے کے بچوں پر مشتمل نہیں بلکہ اُن میں وہ تمام بچے شامل ہیں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ روس کے اُن بڑے افتخارہ علاقوں میں جہاں زاروں کے عہد میں سو فیصدی لوگ اُن پڑھتے تھے اب بڑے بڑے سکول اور عظیم الشان یونیورسٹیاں مزلٹون ترقی حاصل کر رہی ہیں۔

روس کے تمام تعلیمی مصارف کا بار حکومت برداشت کرتی ہے اور عوام کے بچے اُس سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ روس میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بھی پڑھے لکھوں کو ہندوستان کی طرح بے روزگاری کے عذاب میں گرفتار نہیں کرتی۔ اعلیٰ تعلیم اگر ملک کے نظام حکومت اور معاشی حالات سے ہم آہنگ ہو تو بے روزگاری کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

آہ غلام ہندوستان!

حامد علی خاں



“ڤيفس آف مائلو”

شکریہ جاپان

نیم گرسنہ اور نیم مریاں،
جاپان نے حصین لینا چاہا،
چین سے
زندہ رہنے کا حق۔ سانس لینے کا اختیار
چین تھرا اور قومی ہو گیا
جاپان کے ظلم سے
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

جنگ سے علیحدہ رکھنے کے لئے،
چینی مسلمانوں کو
مسجد بنائی ٹوکیو میں، جاپان نے
جب مسلمان ہوتے دیکھا،
جاپان کے ہاتھوں
سیکڑوں مسجدوں کو،
بیدار ہوا، صف آرا ہوا،
چینی مسلمان،
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا
”ارض آفتاب“ کی آتش فشاںوں کا
جنہوں نے بیدار کر دیا
خواہیدہ چین کو —
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

جس کے ہم بارطیاردوں نے
ہموار کر دیا سطح زمین کے ساتھ
خوبصورت شہروں کو،
اس دہائی ہوئی راکھ سے،
چنگاریاں نکلیں،
جو جلا کر خاک کر دیں گی
جاپان کو،
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

چین کمزور تھا سخیف و لاغر

سرگزشتِ دانہ

پہلے میں بویا گیا جوتے ہوئے اک کھیت میں
 کچھ دنوں طاری رہا اعصاب پر کسیر جمود
 اب کھیتوں میں لگا جس وقت موتی ڈولنے
 آ کے قدرت نے صدائے قم باذن اللہ دی
 دی شعاع مہر نے تابندگی ادراک میں
 کوشش و سیدگی نے پھر دیا چلابدل
 اب یہ کٹا "دل" میں گھبرا کر سکو تار ش سے
 غُرفہ ہستی میں مصروفِ نظارہ ہو گیا
 دُھوپ کی گرمی سے جب آہ ہوا اس لگائی
 کھیت کے آغوش میں پروان چڑھتا ہی رہا
 کھو گیا برگ و نوائے زندگانی ریت میں
 خوابِ غفلت کا مرادفِ طلسمِ بہت بود
 راہِ می مجھ میں طوبت کو مرے ماحول نے
 بحرِ اعضائے بدن میں دلولوں کو ادا دی
 میٹھا میٹھا درد جاگ اٹھا دلِ صفاک میں
 قلب کے پہلو سے شاخِ آرزو آتی نکل
 قوتِ نشوونما کو لے کے طولِ عرض سے
 دامنِ عافیتِ دل پارہ پارہ ہو گیا
 زرد پودے کے رگ ریشہ پہ سبزی چھا گئی
 مختار ترقی کے لئے میدانِ بڑھتا ہی رہا

رفتہ رفتہ نرم و نازک بالیاں آنے لگیں سبز پتوں میں ہوا کے ساتھ لہرائے لگیں
 بالیوں میں دودھیا دانے نظر آنے لگے منظرِ جوشِ جوانی بن کے گدرا نے لگے
 ہوتے ہوتے ختم انجامِ شباب آہی گیا فصلِ پک جانے سے کھیتوں غلبہ آہی گیا
 کھیت کو پامال کرنے پر تلے مہتل کے تھے میری شہِ رگ بھی کٹی اپنے جگر گوشوں کے تھے
 آہ میں باندھا گیا۔ کوٹا گیا جھٹکا گیا صرصر متوج کی امداد سے پھٹکا گیا
 اڑ گیا بھوسا ہوا میں رہ گیا غلے کا ڈھیر پھیر لایا اصل کی جانب مری قسمت کا پھیر
 شعری دنیا میں مستلزم ہے خرم کو شرر مجھ کو بجلی تھی مگر سرمایہ داروں کی نظر
 دوسری جانب مری تختہ خیل کا رخ پھر گیا خود غرض چیلوں میں غنقائے تفکر گھر گیا
 ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا، سوچ لوں، یاد آ گیا میں لباسِ اولیں میں ہو کے برباد آ گیا

محفلِ ہستی میں افسانہ در افسانہ ہوں میں

آج کن تبیلیوں کے بعد پھر دانہ ہوں میں

شاد عارفی

دو فرلانگ لمبی سڑک

کچھ لوگوں سے مل کر لاکھ پچاس ہزار روپے کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی، ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا ہے کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر، سڑک کے دورویہ شیم کے ٹوکے ٹوکے اُداس سے درخت کھڑے ہیں، ان میں نہ مچن ہے نہ چھاؤں، سخت کھڑے تنے اور مٹیوں پر گدھوں کے چھنڈ، سڑک عات، ایسی ہی اور سخت ہے، متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں، انداس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھتا ہے، نہ شگاف، سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے، اور اب اس پر کول تار بھی بچھی ہے، جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں، لمبی لمبی چوڑی چوڑی سڑکیں بُرائے سے دہنی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر مڑخ ہجری بھی ہوئی تھی، سڑکیں جن کے گرد سرواٹھا دکے درخت کھڑے تھے، سڑکیں — گرنے مگرنے سے کیا فائدہ، اس طرح تو ان گزت سڑکیں دیکھی ہوگی، لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں اور کسی اپنے گھر سے دورست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا، متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں، اور ہر صبح اپنے گھر سے بچھڑنے کے قریب ہی ہے اٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لاکھ کے پاس ہی ہے، اُس یہی دو فرلانگ کی سڑک، ہر صبح اور ہر شام، کچھ لوگوں سے مل کر لاکھ کے آفری دروازے تک کبھی سائیکل پر، کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا، اس کی منیت میں تبدیلی نہیں آتی، اس کی صورت میں دیکھا پن، دستور موجود ہے، جیسے کہ رہی ہو، مجھے کسی کی کیا پروا ہے، اور یہ ہے بھی سچ، اس کے کسی کی پروا کیوں ہو؟ سینکڑوں ہزاروں انسان گھوڑے، گاڑیاں، موٹریں اس پر سے ہر روز گزر رہی ہیں، اور قہقہے کی نشان باقی نہیں رہتا، اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ ہے جیسی پہلے روز بھی جب ایک یورپین ٹھیکیدار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے، یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے ہی ان لوگوں میں اس نے کیا کیا واقعات، حادثے دیکھے، ہر روز ہر لمحہ کیا نئے نئے شے نہیں دیکھتی، لیکن کسی نے اسے شکر اتنے نہیں دیکھا، نہ دتے ہی، اس کی چھتری چھاتی میں کبھی ایک درز بھی پیدا نہ ہوئی۔

”ہائے، بالو، اندھے محتاج غریب فقیر، ہر ترس کرورے بابا، اسے بالو، خدا کے لئے ایک پیسہ دیتے جاؤ رے بابا، ارے

کوئی بھگوان کا پیارا نہیں، صاحب جی میرے ننھے ننھے بچے ہلکے ہیں۔ اسے کوئی توڑس کھاؤ ان تھیموں پر۔
درجنوں گداگر اسی سرک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے تو کوئی لٹھا، کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک گنہم ہے
تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے بچوں کے ساتھ گدیوں کے لئے حسرت بھری نگاہوں سے راگیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے، کوئی پیسہ دے
دیتا ہے، کوئی تیری چڑھنے کو روکتا ہے، کوئی گایاں مے رہنے، عوام زادے، مسندے اکام نہیں کرتے، بھیک مانگتے ہیں۔
کام، بیکاری، بھیک۔

دور کے سائیکل پر سوار ہتھتے ہوئے جا رہے ہیں، ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فن میں بیٹھا سرک پر بیٹھی ہوئی بھگوان
کی طرف دیکھ رہا ہے، اپنی آنکھوں سے ٹوٹھوں کے ٹاٹے رہا ہے، ایک سسٹ مضحل کنٹین کے پیسوں تلے آگیا ہے۔ اس کی پہلی
ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لوہہ رہا ہے، اس کی آنکھوں کی اندر دگی، اسے چارگی، اس کی ہلکی ہلکی درونک ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ
نہیں کر سکتی، بوڑھا آدمی اب گدیوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوشنما، یاد رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے اپنے
لوکر کے ساتھ سڑاقی ہوئی بائیں کرتی ہوئی جا رہی ہے، اس کی سیاہ ساڑھی کا تقری حاشیہ بوزے کی ٹریس آنکھوں میں چاند کی کرن کی
طرح چمک رہا ہے۔

* * * * *

پیر کبھی سرک سناں ہوتی ہے، سرف ایک ٹیکہ شیشم کے درخت کی چھری چھاؤں میں ایک ٹانگے والا گھوڑے کو سستا رہا
گدھے دھوپ میں تھیموں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں، پولیس کا سپاہی آتا ہے، ایک زور کی سیٹی اٹانگے والے، یہاں کھڑا کیا کر رہا
کیا نام ہے تیرا، کر دوں چالان، 'بھجرا، بھجرا، بھجرا' چل تمنا ہے، 'بھجرا' یہ تھوڑا ہے، 'اچھا جا بھجے معاف کیا۔
ٹانگے والا ٹانگے کو سر پر دوڑائے لئے جا رہا ہے، راستے میں ایک گورڈ آ رہا ہے، سر پر ٹیڈی ٹوپی، ہاتھ میں بید کی چھری
رخساروں پر پسینہ، بالوں پر کسی ڈانس کا سر۔

کھڑا کر دو، کنٹونمنٹ

آٹھ آنے صاب

دل، چھ آنے

نہیں صاب

کیا بکنا ہے، ٹم۔۔۔۔۔

ٹانگے والے کو راتے راتے بید کی چھری بٹ جاتی ہے، پھر ٹانگے والے کا چھڑے کا ہنر کام آتا ہے، لوگ اکٹھے ہو رہے

ہیں۔ پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے، حرمِ آزادے، صاحبِ بہادر سے معافی مانگو، تانگے والا اپنی سلی بگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے، لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

اب سڑک پھر سناں ہے،

شام کے دھندلکے مین بجلی کے قہقہے روشن ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ کپھریوں کے قریب چند مزدور، بال بکھرے، میلے لباس پہنے باتیں کر رہے ہیں۔

بھیتا بھرتی ہو گیا

ہاں

تنخواہ تو ابھی ملتی ہوگی

ہاں

بڑھنوں کے لئے کمال لائے گا، پہلے بیوی تو ایک ہی پمٹی سڑی میں رہتی تھی۔

سنا ہے، جنگ شروع ہونے والی ہے

کب شروع ہوگی؟

کب؟ اس کا تو پتہ نہیں، مگر ہم گریب ہی تو مارے جائیں گے۔

کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر

نقما کیسا ہے؟

بخار نہیں ملتا، کیا کریں، ادھر جیب میں پیسے نہیں ہیں، ادھر حکیم سے دوائی

بھرتی ہو جاؤ

سوچ رہے ہیں

رام رام

رام رام

بھٹی ہوئی دھوئیاں، ننگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم۔ یہ کیسے لوگ ہیں، یہ تو آزادی چاہتے ہیں نہ عسرت۔ یہ کیسی عجیب باتیں

ہیں۔ پیٹ، بھوک، بیماری، پیسے، حکیم کی دوائی، جنگ!

مفتول کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں۔ ایک بوڑھی، ایک جوان، اپلوں کے ٹوکے اٹھائے، نچرتوں کی طرح بانہنٹی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی کپال تیز ہے۔

"بھئی، ذرا اٹھو۔" بوڑھی عورت کے چہرے پر بے شمار جھڑپاں ہیں، اس کی کپال مدھم ہے، اس کے لمبے میں بے کسی ہے۔

بھئی، میں ذرا اٹھ رہی ہوں، میں تنگ لگتی ہوں۔ میرے اٹھ

اناں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے، تو تو باؤلی ہوئی ہے،

اچھا، بھئی، اچھا بھئی

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے، بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں

ڈنگ رہے ہیں۔

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے، اپلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے، کوئی اس کا بوجھ ہکا نہیں کرتا، کوئی اسے ایک لمحہ سنبھال

نہیں دیتا، وہ بھاگی ہوئی جا رہی ہے، اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں، اس کے پاؤں ڈنگ رہے ہیں، اس کی جھڑپوں میں غم ہے اور بھوک

اور فکر اور غلامی، صدیوں کی غلامی!

تین چار نوخیز لڑکیاں، بھڑکیلی ساڑھیاں پہنے، باہول میں باہیں ڈالے ہوئے جا رہی ہیں۔

ہسن، آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں،

ہسن، آج لائٹس گاڑوں چلیں

ہسن، آج انارکلی

ریگل؟

شٹ اپ ٹوڈل

* * * * *

آج سڑک پر سڑخ حلوان بچھا ہے، آریا بھنڈیاں لگی ہوئی ہیں، جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں، کبھی بڑے آدمی کی

آمد ہے، جھبی تو سکول کے چھوٹے لڑکے بنی بچکدیاں باندھے سڑک پر دو دو یہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں

میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہیں، ان کے لبوں پر پسیناں جم گئی ہیں، ان کے گال دھوپ کی حدت سے تپتا اُٹھے ہیں، اسی طرح

کھڑے کھڑے وہ ڈیرہ گنٹھ سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں، جب وہ پہلے پہلے یہاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس

ہنس کر باتیں کر رہے تھے، اب سب چپ ہیں، چند لمحوں کے ایک دھت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے، اب استاد انہیں کان سے

پڑا کر اٹھا رہے ہیں، اشیعہ کی گڑی کھل گئی تھی، استاد اُسے گھور کر کہہ رہا ہے، اوشنی، پگڑی ٹھیک کر، پیارے لال کی خنوار اُس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور ازراہ بند جوتیاں تک لٹک رہا ہے۔ "تمہیں کتنی بار بچھایا ہے پیارے لال"

"ماسٹر جی، پانی"

پانی کہاں سے لاؤں، یہ بھی تمہارے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے، دو تین منٹ اور انتظار کرو، بس ابھی چھٹی ہوا چاہتی ہے۔
دو منٹ، تین منٹ، آدھ گھنٹہ

ماسٹر جی، پانی

ماسٹر جی، پانی

ماسٹر جی، بڑی پیاس لگی ہے۔

لیکن استاد اب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے، وہ ادھر ادھر دوڑتے ہوئے پھر رہے ہیں، لڑکوں کو ہٹایا رہا ہوا ڈاؤ، دیکھو جھینڈا اس طرح بلانا، ابے تیری جھینڈی کہاں ہے، قطار سے باہر ہونا، بدعاش کہیں کا، سواری آرہی ہے،
دو سائیکلوں کی چھٹ پھٹ، بینڈ کا شور، پٹی اور چھوٹی جھینڈیاں بیل سے ملتی ہوئی، ٹوکھے ہوئے گھول سے پرمردہ نعرے۔
بڑا آدمی سڑک سے گزریا، لڑکوں کی جان میں جان آگئی سے، اب وہ آچھل آچھل کر جھینڈیاں توڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔

خواتین والوں کی صدائیں، ریلوئیاں، گرم گرم چنے، اٹوا پوری، امان کیاب،

ایکے خواتین والے ایک طرف سے بالوں سے جھگڑ رہا ہے، مگر آپ نے میرا خواتین اٹ ڈیا، میں آپ کو نہ جانے دول گا، میرا تین روپے کا نقصان ہو گیا، میں غریب آدمی ہوں، میرا نقصان پورا کر دیجئے تو میں جانے دول گا۔

* * * * *

صبح کی ملکی ملکی روشنی میں بچے سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے، اُس کے منہ اور ناک پر کپڑا بندھا ہے، جیسے بیلوں کے منہ پر جب وہ دکھو چلاتے ہیں، وہ گرد و غبار میں اٹا ہوا ہے اور جھاڑو دینے جا رہا ہے۔

نیشنلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر پانی چھڑک رہا ہے، چھکڑے کے آگے جتے ہوئے دو بیلوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہو گئے ہیں، چھکڑے والا سردی سے ہنسنے لگا، کوئی گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے، بیلوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حصہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے سے ایک بوڑھا لگا کر مارا پڑا ہے، اُس کے پیلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اُس کی کٹائی ہوئی

بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تیک رہی ہیں۔

خدا کے لئے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ رے بابا

کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا، سڑک خاموش اور سنسان ہے، یہ سب کچھ دیکھتی ہے، سنتی ہے مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی، دن کے دل کی طرح بے رحم، بے حس اور وحشی ہے۔

انتہائی غلیظ و غصب کی حالت میں اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر اسے ڈانٹ لیا کر اڑا دیا جائے، تو پھر کیا ہو، ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے مجھے نفی میں پرواز کرتے نظر آئیں گے، اس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہوگی، اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہوجاتا ہوں، چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر رنگ سڑک پر پانچنے لگوں اور چلا چلا کر کموں، میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت ہے، مجھے انسانوں سے نفرت ہے، مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو، میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔

سڑک خاموش ہے اور سنسان، بلند آوازوں پر گدھے بیٹھے اؤنگھ رہے ہیں۔

یہ دو فرلانگ لمبی سڑک

کرشن چمنہ

اپنے سپاہیوں سے گیری بالڈی کا خطاب

سپاہیو! میں جو کچھ بتائیں پیش کر سکتا ہوں، مانگی ہے، خطرات ہیں اور
 مشقت ہے۔ رات کو میدان میں کوکڑا قی سرد ہو جائیں اور دن کو دیکھتے ہوئے
 سورج کی چمچ لاتی دھوپ۔ زمر چھپانے کا ٹھکانا ہے، مگولی بارود ہے اور خوراک۔
 بلکہ جبری کوچ میں خطرناک چڑکیاں ہیں اور ٹیکلیوں کے ساتھ تیشاؤنوں کا مسلسل مقابلہ
 ہے۔ وہ جنہیں آزادی اور وطن عزیز ہے، میرے پیچھے آ سکتے ہیں۔

حامد علی خاں

تجلیات

بجھتے نہیں نگاہ میں سر و سمن ہیاں کشت خیال میں ہیں ہزاروں جہن ہیاں
 میرے حرمِ دل میں ہے وہ نورِ موزن صد مہر و مہ بدوش ہے اک اک کن ہیاں
 طاری ہے ایک نقصِ طربِ فرش و عرش پر خود مطربِ است ہوا نغمہ زن ہیاں
 ہوں بادہ نوشِ میکہ ہست و بود کا اک ساغِ شکستہ ہے چرخِ کہن ہیاں
 کچھ اٹھ کے چل دیئے تو کئی اور آگئے صبحِ است سے ہے بیا آئین ہیاں
 راہِ حرم نہیں ہے یہ ہے راہِ عاشقی ہر گام پر ہیں سینکڑوں دار و زن ہیاں
 باطل کی فوج تیرے مقابل ہر صفتِ صفت لا ذوالفقار و بازوئے خیرِ شکن ہیاں
 یہ بزمِ لطف و عشق نہیں زرِ مگاہ ہے زخموں کے لالہ زار سے ہے بانگین ہیاں
 حُرّ عسل کی تیغ و سپر کبریا سے مانگ ہے جنگ میں حریفِ تراہن ہیاں
 تاریکیوں کا ایک سمن ہے موزن تاریکیوں میں غرق ہیں شتِ دمن ہیاں

منزل بے گی مشعلِ عرفاں سے اے اثر

کچھ کام آسکے گی نہ شمعِ سخن ہیاں

انثرِ صبا

ہندوستانی

ابھی ابھی سرسری جی گریوز پر ویگنڈ آف سر کیمین سوسائٹی مدراس نے ایک مختصر کتاب "تاریخ ادب ہندی" زبان انگریزی شائع کی ہے۔
دیباچہ میں آپ نے "ہندوستانی" کی ناکمل ہی بحث بھی اٹھائی ہے۔ آپ اردو سے بھی کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں نے ایک خط اس سلسلے میں ان کو
لکھا تھا جس کا جواب مجھ کو فوراً مل گیا۔ دونوں خطوط کے تراجم درج ذیل ہیں:-

ڈیر مسٹر گریوز،

کچھ دنوں سے ہندوستان میں "ہندوستانی" کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ شمالی ہندوستان میں
عام طور پر دو زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں یعنی ہندی اور اردو۔ ہندی خاص طور پر ہندو قوم کی زبان ہے اور اردو عام طور پر سب
لوگوں کی مشترکہ زبان ہے لیکن مسلمانان ہند اس سے خصوصاً اس لئے وابستہ ہیں کہ ان کے طرز معاشرت، اخلاقیات اور مذہبی جذبات
کی اس سے متجانی ہوتی ہے۔

اب مؤرت حال یہ ہے کہ سیاسی تفرقہ کے ساتھ ہندی اور اردو کا بھی جھگڑا پیدا ہو گیا ہے اور طرفہ نشاہ یہ ہے کہ اردو دنیا کا ایک
بڑا ادیب جو ایک زبردست مذہبی پیشوا بھی ہے اس بات کا مدعی ہے کہ ایک نئی زبان "ہندوستانی" کی طرح ڈالی جائے۔

ایک دفعہ کسی تقریر کے سلسلے میں جہاں سے میری ملاقات موضع اوکھدی (ضلع مونگر) میں ہوئی تو اس "ہندوستانی" کا ان کو
دعوت دیا کہ "ایک خدا کی پناہ۔ آپ نے فرمایا کہ گذشتہ سال جب میں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم اے کے امتحان ہوا تو میں نے طلبہ سے اسی
"ہندوستانی" پر رائے طلب کی تھی اور نتیجہ کے طور پر دیکھا کہ نوے فی صدی طلبہ نے اس کے حق میں رائے دیں۔ کسی منجھے نے فوراً وہیں
کہہ دیا کہ "علی گڑھ" کے طلبہ آپ کے جذبات سے واقف تھے چنانچہ صوف منبر حاصل کرنے کے لئے مصاحبت انہوں نے ایسا کیا ہو گا!

چونکہ ابھی ابھی آپ کی کتاب "تاریخ ادب ہندی" میری نظر سے گزری ہے جس میں آپ نے سرسری طور پر اس ہندوستانی کا
مختصر تذکرہ کیا ہے، میں آپ سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ آپ مہربانی فرما کر یہ بتائیں کہ یہ ہندوستانی "کمال تک ملک کے لئے مفید
ثابت ہو سکتی ہے اور کہاں تک مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

نیاز مند

نظر احمد کوکب

مدراس

ذی شہر ظفر

آپ کا خط ملا۔ اگر بڑا مانیتے تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں اس طرح کے اختلافی سوالات کے جواب دینے کا بالکل اہل نہیں ہوں میں نے اپنی کتاب میں ہندوستانی کہ بتنا تذکرہ کیا ہے وہ صرف مضمون کے تعارف کی غرض سے ہے، بہر حال چونکہ آپ نے اپنے سوال میں میرے لئے کافی دلچسپی پیدا کر دی ہے اس لئے اس کے متعلق مختصراً بہت بھی لکھ دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ انسان کی قدرت ہم لوگوں کا فرض ہے۔ میں جو کچھ لکھوں گا اپنی ذاتی رائے کی بنا پر لکھوں گا۔ ممکن ہے اس میں چند ایسی باتیں ہوں جو آپ کے حسب منشا ہوں لیکن اشتراکات ایسے ہی ہو سکتے ہیں جو آپ کے جذبات کے خلاف ہوں، اس کے لئے اُمید ہے کہ آپ مجھے قابل معافی سمجھیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں فی الحقیقت اردو اور ہندی سے مل کر کوئی ایک نئی زبان پیدا ہو جائے تو یہ ملک کی خوش قسمتی ہوگی، رانام سے کوئی بحث نہیں۔ آپ اس کو ہندوستانی کہیں یا عربی، الفاظ کے ضرائف کے لحاظ سے اپنی جگہ اردو اور ہندی دونوں فخر کر سکتی ہیں۔ اگر موجودہ ہندی پر زیادہ تر سنسکرت کا احسان ہے تو اردو پر فارسی اور عربی دونوں کا ہے۔ لیٹول کہ اردو نویس بڑے بڑے عربی اور فارسی الفاظ اور ہندی نویس سنسکرت الفاظ ترک کر دیں، مجھ کو بالکل بچہ سا معلوم ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اردو کی خوبصورتی فارسی اور عربی سے اور ہندی کی نچلے سنسکرت اور مہاشا سے ہے۔ اہل اگر یہ انتظام ہو سکے کہ ہندی اور اردو کے تمام الفاظ ایک زبان میں جمع کر دیئے جائیں اور ان کا استعمال عام ہو جائے تو خیر اس طرح کی ایک زبان قابل قبول ہو سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ قابل عمل نہیں۔

موجودہ ہندوستانی کی تحریک خدایت مغل ہے۔ زبان کو مصنوعی طور پر سہل بنانے سے تو بہتر یہ ہے کہ وہ بازاری زبان بولی اور کہی جائے جو روزانہ ہم آپ شہروں کے بازاروں میں، کارخانوں میں اور ریل گاڑیوں پر ایک صوبہ والے کو دوسرے صوبہ والے سے بولتے ہوئے سنتے ہیں۔ یہی ایک بہترین ہندوستانی ہو سکتی ہے، مگر پھر اس کے لئے اہتمام اور پروپیگنڈا کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسی زبان تو ایک صدی سے اس ملک میں بولی جا رہی ہے، صرف ضرورت اتنی ہے کہ علمائے ادب اس کا فنی لے لیں، کہ ہر عامی جو زبان بھی جس طرح الٹ پیٹ کر بولتا ہے فصیح ہے۔

اگر زبان کو بچوں، نوجوانوں کے سہل بنانا ضروری ہو تو ظاہر ہے کہ ہندی سے زیادہ اردو میں اس کی صلاحیت موجود ہے۔ اردو کی طرح ہی اس لئے پڑتی تھی کہ اکثر زبانوں کے اپنے الفاظ، محاورے، چھوڑ کر اس میں لے لئے جائیں۔ مثال کے طور پر اردو میں "پوچھا" اور "پرستش" دونوں رائج ہیں، "گل اندازی" اور "بٹی بھرنی" دونوں صحیح، مگر اردو میں چند الفاظ فارسی اور عربی سے لے کر اس طرح

بنے ہیں کہ اگر ان کے لئے ہندی لفظ لایا جائے تو بالکل پھر ہوگا۔ مثلاً فارسی کے لفظ "چشم" اور عربی کے لفظ "عین" سے الفاظ "چشمہ" اور "عینک" بنے ہیں۔ ہندی میں لفظ "آگھ" یا "نین" ہے۔ اگر ہندی لازمی کے پھر میں اگر ہم "عینک" کی جگہ "نینک" لکھیں تو یقیناً فصاحت کا خون ہوگا۔ علاوہ اس کے اردو میں چند ایسے الفاظ ہیں جن کے لئے آپ ہندی لاہی نہیں سکتے۔ جیسے اگر آباجا کے لئے دھوتی، مسجد کے لئے مندر اور ناز کے لئے پوجا لکھیں تو مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی میں بھی چند ایسے الفاظ ہیں جن کے لئے فارسی یا عربی سے مدد نہیں لی جاسکتی لیکن ساتھ اس کے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندی کے ایسے الفاظ تو اردو ہی سمجھے جاتے ہیں۔

میر خیال ہے کہ وہ "فوق" اسلام علیکم کے بدلے "آداب عرض" لکھائے تو ہرج نہیں۔ "محبت" کے لئے "پریم" اور "دل" کے لئے "ہرے" استعمال کیا جائے تو بعد معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اردو زبان کی ایک گونہ ترقی ہو سکتی ہے۔ ہاں مجھ کو یہ اچھا نہیں لگتا کہ اردو میں لوگ "زلزلہ" کے بدلے "بھولیس کمپ"، "امید" کے بدلے "آشا"، ہندوستان کے بدلے "ہندوستان" لکھیں۔

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے جس کو صحیح معنی میں برعظیم کہا جاسکتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس میں قطعی اس کی ضرورت نہیں کہ ایک ہی زبان بولی اور لکھی جائے۔ اس سے سیاسی اتحاد میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ اردو ایک ایسی زبان ہے کہ بغیر پڑھے لکھے ہر شخص بول سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے لیکن ہندی ایک ایسی چیز ہے کہ خصوصاً مسلمانوں کے لئے لکھنا تو کجا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ رسم الخط میں اس کو بڑی آسانی ہے اور خصوصاً طباعت کے معاملے میں۔ لیکن جہاں عام طور پر ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے، وہ اردو ہے۔ اب رہا رسم الخط کا معاملہ تو اصل جگہ وہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو چھاپخانہ کی سائنس کو ترقی دی جائے لیکن ہر حرف کو علیحدہ لکھنے کوئیں بڑا سمجھتا ہوں۔ اس میں انگریزی کی فٹل ہوتی ہے۔ یوں بھی انگریزی میں پارہ قسم کے حروف ہیں۔ چھاپنے کے دو حروف ہیں ایک بڑے اور ایک چھوٹے، اس طرح لکھنے کے بھی دو۔

اخیر میں عرض ہے کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ آپ میرے خیالات معاذ کر لیں اور معاملہ طے ہو جائے۔ زمانہ کا انتظار کیجئے اور دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اتنا یقین رکھئے کہ ایک سوال تک یہی اردو قائم رہے گی۔ صرف فرق اتنا ہوگا کہ اس لکھنؤ میں اردو کو ایک نو ہزار الفاظ ہندی کے بل جائیں گے اور جو کثرت استعمال سے عام ہو جائیں گے۔

آپ کا

سی جی گریوز

اُردو کا ماضی اور حال

۱۹۰۳ء میں

”انڈین میزمر (Indian Mirror) کو ایک انگریزی اخبار کے ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ سینکڑوں پروفیسر اور ہزاروں اور آدمی اس بات کے نہایت خواہش مند ہیں کہ ایک ایسی زبان بنائی جائے یا ایجاد کی جائے جو تمام یورپین قوموں میں کام لے سکے۔ ایک جنٹلمین نے لندن کے ایک اخبار کو لکھا ہے کہ یہ خیال ہندوستان میں پیدا ہوا اور یہاں بار آور ہوا۔ ہندوستانی زارو (اُس قسم کی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کی یورپ میں اب ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے)۔ اس معاملہ میں تو ہندوستان شامش کا مستحق ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے بعض ملکی بھائی اُس ترقی کو جو ہمارے ملک میں زبانوں نے کی ہے روک کر ملک کو دس بیس پشت پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔“

(زمیندار، ۸ جون، ۱۹۰۳ء)

۱۹۳۸ء میں

سردار سکندر حیات خاں وزیرِ اعظم پنجاب نے اسمبلی کے ایوان میں ۵ جولائی کو پہلی مرتبہ اُردو میں تقریر کرتے ہوئے

فرمایا :-

”میری مادری زبان وہی ہے جو تمام ہندوستان کی مادری زبان ہے یعنی اُردو!“

(موسل اینڈ میٹری گزٹ، ۶ جولائی، ۱۹۳۸ء)

حفیظ ہوشیارپوری

”چاند نکلا“

(انتساب: اپنی ایک عزیزہ محمودہ خاتون کے نام جو اس نظم کے وجود کی ذمہ دار ہیں۔)

چاند نکلا آسمان پر نورا برساتا ہوا
تنگی مشرق سے اٹھتا آ رہا ہے اس طرح
دولت تابندگی دیتا ہوا ظلمات کو
خامشی میں بجلیاں بھرتا ہوا اکسار کی
اٹھ رہا ہے دُور اُفق سے رفتہ رفتہ اس طرح
اضطرابِ رُوح کو دیتا ہوا اذنِ شگفت
اپنی تابانی سے خود ہوتا ہوا حیراں کبھی
روشنی دیتا ہوا وادی کے خوشبو پھول کو
شاعری کو لگداتا رُوح کی گہرائی میں
حُسن کے معصوم چہرے سے نقاب اُٹھتے ہوئے

کم ضیاء تاروں کو اپنی ضو سے شرماتا ہوا
جیسے زنداں سے رہا ہو کوئی گھبراتا ہوا
اور ہوا پر ابر کے ٹکڑوں کو سرکاتا ہوا
نیند میں کھوئے ہوئے فزوں کو چوکھاتا ہوا
جیسے آئے کوئی بیجو ڈھوکریں کھاتا ہوا
زندگی کی خشکیوں پر کیف برساتا ہوا
جیسے شبنم کا ستارہ گلِ تحیراتا ہوا
برگ ہائے خشک کو کرنوں میں اُلجھاتا ہوا
دل کی گہری ظلمتوں میں قیچکاتا ہوا
ذہن شاعر میں محبت کی قسم کھاتا ہوا

تک رہا ہوں میں تجھے نو عمر بچوں کی طرح
اور تو گزرا چلا جاتا ہے کتراتا ہوا

یا شریکِ حال ہو جاؤ مری تنہائی میں
یا فلک سے ٹوٹ کر گر جا کی گہرائی میں

فضل الدین انوار کربادی

قطعہ

کہہ رہا تھا کوئی یہ دن ڈھلتے دِنِ مصیبت کے کیوں نہیں ٹلتے
اُور بھی اہل حرص ہیں، لیکن دانے دانے کو یوں نہیں ڈلتے
خُون پیتے ہیں جو غریبوں کا پھُولتے ہیں، مگر نہیں پھلتے
دل ہی رکھا نہیں ہوس سے جدا ورنہ اس آگ میں نہیں جلتے
ہم تو اس آستین کے قائل ہیں سانپ جس میں کبھی نہیں پلتے
جن کا دامنِ عمل سے خالی ہے کفِ افسوس کیوں نہیں ملتے

بھٹو کریں کھا رہے ہو کیوں حیرت
راہ کیوں دیکھ کر نہیں چلتے

الحبیب رحمت

جبریل و ابلیس

(حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم جبریل و ابلیس ایک مختصر ڈرامے کی صورت میں)

کردار

جبریل ————— ابلیس ————— اقبال

مقام ————— ہمالہ

زمانہ - دُور پہچنے کی طرف اے گردشِ آیام تو (جبلا و جس مدی میں علامہ منظور جاہیں)

زپس منظر :- ایک برفنا جگہ ہے۔ سبز و نارنگل پونے اور تنا درختوں کے جھنڈ کے چھنڈ پہاڑی ڈھلان پر کھڑے ہیں۔ پہاڑی تپنے کا پانی ٹپ رہا ہے اور آبشار کی صورت میں گر رہا ہے۔ شام کی تاریکی طبعی چلی آ رہی ہے۔ رنگ و شفق کی ہر پار کا پینا پھرتا ہے۔ خوش گھم پڑوں کی عبادت اثر انگیزوں کے دریاں اقبال، موزور ورن کا نناٹ، مزہ خیر و شر، اور قنہ آدم کی گینچی جیسے مسائل کی گہرائیوں میں گھسے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک دُور سے ایک سامہ لڑا آوازِ توحید کا نغمہ گاتی قریب آتی ہوئی سنائی دیتی ہے)

اللہ ہو! اللہ ہو! اللہ ہو! اللہ ہو! اللہ ہو! اللہ ہو! اللہ ہو! اللہ ہو!

[ابلیس (درختوں کا کبھی استاد تھا۔ اب اندہ درگاہ کبریائی) اُدھر سے بھٹتا ہے۔ 'اللہ ہو' کی آواز سن کر کھٹکتا ہے اور پھر گویا حیرت

سے کہتا ہے] آہ جبریل!

(اللہ ہو کی آواز قریب آجاتی ہے۔ حضرت جبریل نمودار ہوتے ہیں۔ ابلیس کو پہچان کر اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ صاحبِ سلامت کے بعد

دونوں سبز، نوحات کے فرشِ نمرودی پر آبشار کے پاس ہو بیٹھتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو سننے قہیل سے سنتے ہیں :-)

جبریل ————— ہمدردِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؛

ابلیس ————— سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبریل ————— ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیرہری گشتگو

کیا نہیں ممکن کہ تیرہرا چاک دامن ہو رفو

ابلیس ————— آہ! اے جبریل! تو واقف نہیں اسی راز سے

مر گیا سرمست مجھ کو نوٹ کر میرا سبُو

اب وہاں میری گور ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے وہ عالم بے کاخ و کو
جن کی توفیدی سے ہو سوزِ درون کا بنات
اُس کے حق میں تقطُّوا اچھا ہے یا لا تقطُّوا؛

جبریل ————— کھو دیئے انکار سے تو نے مقامتِ بلند

چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو؟
ہے ہری جرات سے شتِ خاک میں ذوقِ نمو

ابلیس ————— میرے فتنے جا مہِ عقل و خیرِ دکا تار و پُو

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفان کے طہا بچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟

بخضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفانِ یم بریم دریا بدریا جو بجو

گر کبھی خلوتِ میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
تفصُّہ آدم کو رئیسِ کرگسب کس کا لہو؟

میں کھکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

شفق غائب ہو جاتی ہے، تاریکی اپنے داس میں دنیا کو چُپا لیتی ہے۔ فرشتے جا چکے ہیں۔ ہمارا شاعرِ عظیم زریب کچھ گنگنا تا ہوا اُٹھتا ہے،
اور بادلِ ناخاستہ قیامگاہ کا رخ کرتا ہے۔ (پردہ گرتا ہے)

معذرت بہ حضرت علامہ کے نظم کے محض ایک شعر میں مولیٰ سالتعزت اس لئے کرنا پڑا کہ ڈرامے کے اسٹیج کو آسمان سے زمیں پر لانا اس کے
مرد ممکن نہ تھا۔ ہم صدقِ دل سے اس گستاخی کے لئے اُن کی توجہ سے عذر خواہ ہیں۔

”اب یہاں میری گور ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو“

میں یہاں کی بجائے وہاں اور یہ کی بجائے وہاں کرنا پڑا۔

نند کشور جھنگن ایم۔ اے

برباد شہر

اُس جگہ جہاں شب و روز ماندہ خلیج میں سُست پانی رہتا ہے
میں نے بیکاری کے شغل کے طور پر نہری ریت کا ایک ڈھیر جمع کیا
جو نہی میری نظر اُس پر پڑی ایک شاداب قطعہ زمین پر ایک شہر کا
نہایت ہی روشن اور دلکش تصور میرے پیش نگاہ تھا۔

مجھے سوائے نفیس برجل، الگندوں اور میناروں کے جو
ہزاروں گھنٹیوں کی آواز سے گونج رہے تھے کچھ بھی
دکھائی نہ دیا۔ ان کے کلس فضا ئے نیگول میں سفید نظر آرہے تھے
اپنی خواہشات سے بے قرار ہزاروں انسان شعلہ کی طرح متحرک
ادھر اُدھر چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اس سے قبل کہ میں کچھ سوچوں میں نے بے پروائی سے اس چھوٹے سے ڈھیر کو برابر کر دیا۔
اور ساتھ ہی عالم تصور کا وہ شہر بھی غائب ہو گیا۔
وہ تباہ ہو کر میرے پاؤں میں پڑا تھا۔
اودھ راٹو نے کتنی بستیاں دیکھیں جو
خاموش پہاڑ اور ماندہ خلیج کے کنارے آباد ہوئیں اور ویران ہوئیں۔

دنیاۓ ادب سنسکرت

سچی دوستی :-

جھوٹے دوست بہت ہیں
لیکن جب فطرت دوسید روح کو دوستی کے مقدس رشتہ میں سنسکرت کر دے
تو اس سے بیش قرار نعمت اور کیا ہو سکتی ہے؟

مصیبت کے وقت :- بیوی، ماں، بیٹے اور بھائی کبے بجائے سچے دوست پر بھروسہ کر!
زمانہ حقیقی دوستی کی سترتوں کے جامہ زیبوں کو مکہ نہیں کر سکتا۔
کوئی بد باطن اس خزانہ کو چرانے پر قادر نہیں صرف موت ہی اس رشتہ کو توڑ سکتی ہے۔
(شیخ قنٹر)

جھوٹا اور بیوقوف آدمی :- دانا اور پاکباز آدمی کی دوستی ایک نعمت ہے۔
اسے حاصل کر!

جھوٹے اور دانا آدمی سے بڑی احتیاط کے ساتھ پیش آ!!
ایک بیوقوف اور سچا آدمی تیرے رحم کا مستحق ہے۔
لیکن ایک بیوقوف اور جھوٹے آدمی کے سایہ سے بھی بچنا لازم ہے!!!

ایک گداگر قبرستان میں گیا، اور کہنے لگا

افلاس :-

”مرنے والو! میری زندگی لے لو اور کم از کم ایک لمحہ کے لئے میرے سینہ سے افلاس کا بوجھ ہٹا دو۔“

میں اب گھبرا گیا ہوں اور مجھے سکون کی تلاش ہے
 تم اگرچہ مردہ ہو لیکن مجھ سے اچھے ہو
 مرے دالوں نے کچھ جواب نہ دیا
 وہ جانتے تھے کہ موت انھیں سے بہتر ہے!

جاپانی

ایک سوال :-

تم تنہا خزاں کے پہاڑ کو کیسے عبور کر سکو گی؟
 وہ تو اس وقت بھی بڑا دشوار گزار تھا
 جب ہم دونوں اکٹھے وہاں گئے تھے۔

(دی نیا شو)

میری محبت :-

میری محبت اُس گھاس کی طرح ہے جو پہاڑ کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے
 اگرچہ یہ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ لیکن کسی کو اس کا علم نہیں

(کاکن شو)

گل لازوال :-

دنیا میں صرف انسان کا دل ہی ایک ایسا پھول ہے
 جو کبھی نہیں مڑھ جائے گا

(کاکن شو)

وہ صبح :-

میں جانتا ہوں کہ دن بہت جلد ختم ہو جائے گا
 اور رات واپس آ جائے گی
 اس کے باوجود مجھے اُس صبح سے کتنی نفرت ہے جو
 مجھے یہاں سے چلے جانے کا حکم دے گی

(ہیا کوئن شو)

دو نظمین :-

اے تیردی سے گرنے والی شبینہ!

کیا میں اس ذلیل زندگی کو تجھے دھو سکتا ہوں؟

(باشور)

اے جھینگرا!

تیری سرور آواز سے

رکھی کو شک بھی نہیں گزر سکتا کہ تو بہت جلد مر جائے گا

(باشور)

چینی

ایک ہشیار آدمی شہر کا بد کرتا ہے

اور ایک ہشیار عورت اسے تباہ کرتی ہے

اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ہشیار عورت ایک منحوس پرندہ ہے!

زبان دراز عورت ایک ایسی سیدھی ہے جو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔

کیونکہ نصیبیت آسمان سے نہیں آتی

اس کا باعث تو عورتیں ہیں!

خواجہ سراؤں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت قطعاً ناممکن ہے۔

(دشی لگ)

حمید نظامی

کہیں بچہ خوشد و غم بیٹے کہیں نام
اقبال

موتوں نادان غم از تازی کشی بکشد تازی

غزلیات

(۱)

آہ۔ مجبور زندگی میری جو تھاری۔ مٹی خوشی میری
کٹ گئی کیسی آنکھوں آنکھوں میں اک تماشا تھی زندگی میری
جو کبھی بار بار آتی تھی وہ۔ مولا تی ہے ابھی میری
اپنے آنکھوں سے جو کیا ہیں نے مٹی تقدیر بن گئی میری
چشمِ محنور اور شرمِ آلود دیدنی ہے یہ بے خودی میری
اب بچکنے لگے وہ غیروں سے اب تو کئی ذرا دبی میری
شاعر اس کو خیال کتے ہیں
خواب تھی خواب زندگی میری

آغا شاعر قزوالباش دہلوی

(۲)

دے دے کو وہ بل روزِ نیا زلفِ دونا کو کرتے ہیں اسیر اور اسیرانِ بلا کو
دیکھو نہ کہیں مجھ کو نگاہوں سے گرانا دیتے تو ہوا آنکھوں میں جگہ شرم و حیا کو
ٹھہرے دل مضطر تو کریں وصل کی تدبیر سینے سے جدا ہوں تو اُنھیں ہاتھ دُعا کو
منظورِ مٹا ناہی مجھے ہے تو مٹاؤ پہلے مری ہستی سے ہرے نقشِ وفا کو
نازک ہے بہت حالتِ بہارِ محبت اب دُخل ہے اس وقت دُعا کو نہ دُعا کو

صدق جالبی

(۳)

جذبہٴ دل کا اثرِ شادانِ کھائے کا نہیں مر گئے پر بھی وہ یاد اے دوست آہنگا نہیں
پیلے جب تم رُو مٹھتے تھے تو مالا تھا وہ اب جو رُو مٹو گے تو کون آکر منائے گا نہیں
دینِ دولِ ایمانِ مہمان و آبرو اس کی طرح اے شکر! کون سب کچھ کھو کے پائے گا نہیں

عبدالرشید چشتی شادانِ بی اے (مرحوم)

(۴)

حُسن اور پھر شباب کیا کہنا اب بھلا اے جناب کیا کہنا
 قلع کر دی زبان شکوہ سرا میرے حاضر جواب کیا کہنا
 ساری دُنیا میں کرو یا بدنام آرزوئے خطاب کیا کہنا
 خاک میں مل گئے تیشِ آخر
 عاشقِ بُرز اسب کیا کہنا

عبد اللطیف نیش

(۵)

کتنے کو ٹکڑوں کی وادی سے سو حُسن کے دریا بہتے ہیں لیکن ہیں یہ جلوے دودن کے جو بزمِ حُسن میں رہتے ہیں
 مڑگاں کے تصور سے کیا کیا۔ دیتی ہے لہو رگ رگ دل کی اللہ یہ کیسے نشتر ہیں جو حُسن میں ڈوبے رہتے ہیں
 کیا بچھلے پیر کا عالم ہے اک حُسن کا چشم بھڑوٹا ہے جتنا اے اس میں رقصاں تھے وہ دھیمے دھیمے بہتے ہیں
 گوہر کی چاک ہے شبنم میں، عنبر کی مہک ہے پھولوں میں دیکھو تو یہ جلوے کس کے ہیں ہر شے میں پھنسا رہتے ہیں
 جانے سے ترے کیا کیفت رٹا کیا ہوش ہوا یوں کو بخود جو ہمیشہ رہتے تھے ہیوش وہ اب بھی رہتے ہیں
 جو رنگ تھا دل کے زخموں کا، محمود وہی رنگینی ہے
 ناسور جو پہلے بہتے تھے دیسے ہی اب بھی بہتے ہیں

محمود علی خاں

(۶)

عشق کا سوز کیا ہوا، عشق کا ساز کیا ہوا تو ہی بت کر اے جگر تیرا گدا کیا ہوا
 آہ نہ بن، فغاں نہ بن، آگ نہ بن، ادھواں نہ بن سینے سے جو نکل گیا راز وہ راز کیا ہوا
 کچھ عشق چھوڑ کر چھپتا ہے تو جو درد برد تیری جبین شوق کا ذوقِ ناز کیا ہوا
 طبعِ بندِ عرش اب فرشِ نیش ہے کس لئے
 پستیوں میں نہاں تھا جو اب وہ فساد کیا ہوا

عرشِ مسیانی بی۔ اے

جہان کی حالت

زمیں ہے گر مائل شکایت تو خوفِ زیاد آسماں ہے
 یہی ہے بزمِ جہاں کی حالت کہیں ہے شکوہ کہیں فغاں ہے
 بشر ہے صحرا کا اک بگولا، قیام ہو کس طرح سے اس کو
 پھرے نہ کیوں در بدر وہ ہر دم کہ تابع گردشِ ماں ہے
 ادھر ہے چین اور اس میں ہوا ہے تہی کے ننہ جھونکے
 ادھر ہے شلخ کن اور اس پر غریب بلبل کا اشیاں ہے
 قدم قدم پر ہے دامنِ پنہاں، نگاہ کھٹنا بھٹل کے بہنا
 قفس ہے اے مرغِ دل یہ تیرا جے سمجھتا تو گلستاں ہے
 ہے شوق پر وا ز تجھ کو بیشک، مگر ہے محدود تیری وسعت
 کہ ایک جانب تے زمیں ہے تو دوسری سمت کہاں ہے
 نگاہِ صیاد سے بچے گا کہاں تک آخر چین میں رہ کر
 کہ زد میں تیر قفس کی اے دل بنا ہو تیرا اشیاں ہے
 پڑے گا نآشاد شوقِ دل سے ترے سوانح کو سارا عالم
 یہ دردِ اُلفت کا ہے فسانہ یہ دردِ ہستی کی داستاں ہے

درائے کارواں

برادرانِ نوجواں پکار و حریت کی ہے !

مجاہدینِ حریت بڑھے چلو غور سے رُکے نہ اپنا کارواں چلا ہے تو چلا چلے

عبرت ہے خوفِ ناکساں غلط ہے فکرِ این و آں

جو دل میں ہے کرو عیاں

پکار و حریت کی ہے برادرانِ نوجواں رُکے نہ اپنا کارواں جھکے نہ ہند کاشاں

دکھا دو اپنا حوصلہ اچھا لو نامِ قوم کا

کرو بلا کا سامنا

کلاہِ کچ کئے ہوئے نشانِ دوش پر دھسے جہادِ حریت میں پیش پیش ہر جواں ہے

ہوا ہے تیز اگر - تو ہو بھنور پہ ہے بھنور تو ہو

فغاں ہے بے اثر - تو ہو

امیدِ دیروطن ہو، نازشِ چمن ہو تم غصائے سیکساں ہو تم، چرخِ سخن ہو تم

غلامِ ہم رہیں تو کیوں ؟ جفا و غم سہیں تو کیوں ؟

نہ اب بھی کچھ کہیں تو کیوں

اٹھو کہ بندگی کا شتہ آج مل کے توڑ دیں اٹھو کہ پست بہتہ کی گردنیں موڑ دیں
 مٹا کے اپنی مفلسی بسر کریں وہ زندگی
 بڑھادیں شان ہند کی

اٹ دو صفحہ زمیں کو اپنے جوشِ عزم سے بدل دو صورتِ زمانہ کو فروشِ رزم سے
 فدا اتھارے عزم کے نثار، شانِ رزم کے
 بنو چراغِ بزم کے

عزیز ہے جو آبرو تو فخرِ حریت کرو ہر ایک نوجوان کو اسی کی تربیت کرو
 عبث ہے خوفِ باغیاں قفس کی توڑ و تسیلیاں

بساؤ اپنی آشتیاں

وطن کے دشمنوں سے چین لو عنانِ بھری انہیں سر چڑھاؤ تم کہ ہے اسی میں بہتری
 وطن کی فکر ہے اگر نہ سمجھو ان کو راہِ بر

یہ راہِ بر میں پُر خطر

پکار و حریت کی بجے برادرانِ نوجواں
 رُکے نہ اپنا کارواں جھکے نہ ہند کا نشان

ابراہیم انوش ملکتہ

مختل ادب

بدحواسیاں

ایک دفعہ کا ذکر ہے، چند دوست بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بدحواسیوں کا ذکر چلا تو ایک نے کہا کہ بعض اوقات آدمی کے منہ سے آواز اُٹھ جاتا ہے جو الفاظِ ناپسندیدہ جاتے ہیں اور دماغ کی غیر عارضی کے باعث حرفوں، لفظوں اور آوازوں کی ترتیب بگڑ جاتی ہے، مثلاً خانے کی نماز کو نماز کے جنازہ کہہ دیا، گھٹنے کی چوٹ کو ”چھٹنے کی گھوٹ“ کہہ گئے۔ ایک دوست جن کو اپنی ہوشمندی کا بہت بڑا دعویٰ تھا کھٹے لگے کہ صبح دماغ آدمی سے ایسی بدحواسی سرزد نہیں ہو سکتی۔ کوئی یاغل ہی ہوگا جس کی زبان قابو میں نہ ہوگی۔ اُن کو بتیرا سمجھایا گیا کہ یہ ایک نہایت عامۃ الورد و بات ہے۔ اس کو دماغ کے خلل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کو انگریزی میں *Apoplexy* کہتے ہیں کیونکہ ایک مشہور پروفیسر ڈاکٹر سچونز سے ایسی بدحواسیاں اکثر سرزد ہوا کرتی تھیں اور وہ نہایت قابل، فاضل اور عالی دماغ انسان تھے۔

لیکن ہوش مند دوست نہ مانے۔ انہیں اسی وقت کہیں جانا تھا۔ اصرار کر رہے تھے کہ ایک تانگہ منگوا دو۔ اتنے میں ہماری ٹشنگاہ کے آگے سے جو سرباز مارو واقعی تھے۔ ایک خالی تانگہ گزرا۔ ہمارے ہوشمند دوست نے بے اختیار اُٹھ کر کھڑکی کاٹھن کیا۔ اور پکار کر کیا فرماتے ہیں ”اے بھئی کو چران۔ ٹانگی خالہ ہے؟“

بس پھر کیا تھا۔ دوستوں نے ہتھکڑیوں پر دھر لیا اور ہمارے ہوشمند دوست بہت ہی کھسیا نہ ہوئے۔

ایک صاحب بھاگم بھاگ ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہے تھے گاڑی کے آنے کا وقت بالکل قریب تھا۔ اور ان کے اضطراب کی کوئی انتہاء تھی۔ گھڑی ان کے پاس نہ تھی۔ سڑے میں ایک خوش پوش جنٹلمین نظر آئے جن کی کلائی پر گھڑی بندھی تھی۔ ان صاحب نے آواز دے کر جنٹلمین کو شیرایا اور فرمایا ”حسنت معاف فرمائیے، آپ کی بجلی میں کیا گھڑا ہے؟“

اب آپ خود ہی تصور فرمائیے کہ یہ فقرہ سن کر اُس جنٹلمین پر کیا کینیت طاری ہوئی ہوگی اور اس نے ان صاحب کے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی۔

ایک دفعہ ہمارے مرحوم دوست مولانا حامدین، بیدل شاہ جہانپوری کے پاس ایک لکھنوی صاحب تشریف لائے اور مولانا سے نہایت ناز و محبت کے ساتھ ملے۔ دورانِ گفتگو میں مولانا نے سوال کیا۔ آپ کا دولت خانہ لکھنؤ کے کس محلے میں ہے؟ لکھنوی صاحب نے جواب دیا ”غریب خانہ حکیم متھری کے محلے کے پاس ہے۔“ یعنی حکیم ہمدی کے مقبرے کے پاس۔ مولانا ہنس پڑے اور فرمانے

لئے حکیم منقری تضرع کیا۔ یہ ”مدا“ تو اپنی مثال نہیں رکھتا۔

ایک دفعہ ایک خضاب کے موجد تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے جو بعض احباب کے ساتھ موجد صاحب کا تعارف کرتے پھرتے تھے۔ کتنے لگے ”حضرت“ یہ فلاں صاحب ہیں۔ انہوں نے ایک تیل ایجاد کیا ہے جو دونٹ میں کال بالے کو دیتا ہے۔ مخاطب کچھ سمجھ نہ سکا۔ تو آپ نے اپنے فقرے کو زیادہ صحیح کر کے ارشاد فرمایا: ”اجی بس دونٹ میں بالے کال ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی تولی بدحواسوں کی مثالیں بے شمار ہیں لیکن آج کی تقریر میں میرا ارادہ زیادہ تر علمی بحثوں کے تذکرے کا ہے۔ آپ کے پاس تار کا چہرہ اسی آتا ہے۔ آپ نیپل آئے! کر سید کے کاغذ پر دستخط کر دیتے ہیں اور وہ کاغذ چہرہ اسی کے حوالے کر کے تار کاغذ کھولتے ہیں، لیکن بارہا یہ بدحواسی دیکھنے میں آئی ہے کہ رسید پر دستخط کر کے رسید کا کاغذ تو اپنے پاس رکھ لیا اور تار کاغذ اور نیپل چہرہ اسی کے حوالے کر رہے ہیں۔

کیا سگڑت جلاتے وقت کبھی آپ کو یہ اتفاق نہیں پڑا کہ آپ دیا سلائی جلا کر اپنے منہ کے قریب لائے ہیں۔ حالانکہ سگڑت بھی وہاں تک نہیں پہنچا۔

انگلنڈ میں بدحواسی کا یہ واقعہ بے حد شہور ہے کہ ایک ہم صاحب کسی دوسرے شہر کو جا رہی تھیں۔ شوہران کو ریلوے سٹیشن تک پہنچانے گیا۔ نفی نے ہم صاحب کا سامان ریل گاڑی میں رکھ دیا۔ یہ ہم صاحب کا شوہر اور وہ قلی دونوں پلٹ فارم پر کھڑے تھے۔ اس نے منجن نے سیٹی دی، ہم صاحب نے بدحواس ہو کر قلی کا تو بوسہ لے لیا اور دونوں نکال کر اپنے شوہر کے ہاتھ پر رکھ بیٹے۔ میں عینک لگاتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ غسل خانے میں داخل ہو کر نہانے کا ارادہ کیا۔ تو عینک اتارنا بھول گیا اور یہ غلطی اس وقت معلوم ہوئی جب چہرے پر پانی کا چھینٹا مار کر آنکھوں کو ملنے کی کوشش کی۔

ایک دفعہ کا واقعہ سن لیجئے اور یہ واقعہ عینک والوں کو اکثر پیش آتا ہے۔ دفتر جانے کے لئے کپڑے پہننے تو سامنے عینک کا کیس نظر آیا۔ اس کو کھول کر دیکھا۔ تو عینک اس میں دھپی۔ اب تلاش شروع ہوئی۔ کھنکھی میز۔ بستر غسل خانہ غرض جہاں جہاں عینک کے رکھنے کا گمان ہو سکتا تھا۔ کوئی نہ دیکھ ڈالا۔ پتہ پتہ جہاں مارا۔ لیکن عینک کہیں نہ ملی۔ آخر گھر والی کو بتا کر اپنی یہ مشکل اس کے سامنے پیش کی تو گھر والی میں کھل کھلا کہنہ رہی ہیں اور بات نہیں کرتیں۔ عینک نہ ملنے سے کھیا نے تو موہی رہے تھے۔ غصے میں مار کر دو چار رسا دیں۔ یہ کیا بیہودگی ہے میں تو ایک گھنٹہ سے عینک کے لئے پریشان ہو رہا ہوں اور تم ہو کہ یہی جی ہی کیے عینک ہی ہو آخر بڑی نے کہا، اسے تم تو بوسے لڑتے ہو، عینک تو حضور کی آنکھوں پر چڑھی ہوئی ہے اور گھر بھر میں تلاش کر رہے ہیں۔ دھندلا شہر میں لڑا کہ لٹل میں! ہاتھ لگا کر جو دیکھا تو سچ! آنکھوں پر موجود تھی! •

ایک اور جوان نے اپنی بدحواسی کا نہایت دلچسپ قلم سنایا۔ وہ کہتا ہے کہ میں منٹریس کے امتحان کا امیدوار تھا۔ جب امتحان

شروع ہوا تو ایک دن کا ذکر ہے۔ میں رات کے دو بجے تک پڑھتا رہا۔ صبح سات بجے امتحان میں بیٹھتا تھا۔ کوئی ساڑھے چھ بجے میری آنکھ کھلی۔ جب گھڑی دیکھی تو بدحواس ہو گیا۔ سامنے کھڑی پرکھپے لٹک رہے تھے۔ آؤ دیکھیں نہ تاؤ۔ جھٹ پٹ قمیص شنوار پس ایک کٹاؤر سے ڈال امتحان کے بال کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اور میں اس وقت وہاں پہنچا جب تقریباً تمام طلبہ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر بعض فوجوالوں نے آواز سے کہے "شری شری جی۔ لڑا کیوں کا امتحان دوسرے کمرے میں ہو رہا ہے۔ کسی نے کہا "تو اپنی ذرا بہار سے پاس تو کر مگر بیٹھو! سرفراز طرح طرح کی دلیاں کا دل میں پونے فلیس۔ میں نے خفیہ سا ہنر کر رکھا تھا۔ سر کا جھکنا کمرے پرش کے طوطے اڑنے کے۔ میں غلطی سے اپنی ہنس کی سفید ریشمی قمیص اور شنوار پس آیا تھا۔

پچھلے دنوں ایک دوست نے کسی مشینیں کا واقعہ سنایا۔ آپ دفتر جانے کے لئے تیار ہوئے۔ تو پڑوسی کہیں نظر نہ آئی۔ بڑی کواکر کوچھا کیوں جی۔ بہار دستار کا کس ہے؟ بیوی جی نے ہنس کر جواب دیا۔ دستار! وہ تو آپ کے سر پر سج رہے اور آپ کو معلوم ہی نہیں۔

آپ نے سر کو اٹھا لگا لیا۔ تو سچ مچ پڑوسی سر پر موجود تھی۔ اس وقت آپ کی مڑاتے ہیں واہ واہ۔ تم نے اچھا کیا۔ مجھے

سنا بتایا۔ نہیں تو شاید میں ننگی ہی سر دفتر چلا جاتا۔

جلیل القدر اہل علم اور کاجوں کے پروفیسر چونکہ اپنے علمی مشغلوں میں بہت زیادہ منہمک ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے دماغ دنیا کے عام کاموں سے باہل بیگانہ اور غیر حاضر رہتے ہیں۔ ایک بہت بڑے پروفیسر کے تعلق ایک اقد بہت مشہور ہے۔ میں نہیں کہتا اس میں اصلیت بھی ہے یا نہیں۔ لیکن بدحواسی کا اس سے بہتر نمونہ شاید آج تک تصنیف کبھی نہیں کیا گیا۔ پروفیسر صاحب کا پیر میں طلبہ کے ساتھ معذرتی کرنے کے بعد چھڑی گھماتے ہوئے گھر کو چلے تو بچہ جھکے ہوئے تھے۔ آپ نے یہ بچہ اڑا کر رکھا تھا گھر پہنچے ہی چھڑی کو نے میں رکھ کر کپڑے اتارے بغیر ہی بستر پر لیٹ جاؤں گا۔ اور جب تک دماغ تر و تازہ نہ ہو جائے گا۔ بستر سے نہ اٹھوں گا۔ اسی خیال میں غرق آپ گھر پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی دماغی ترتیب بدل گئی۔ آپ نے چھڑی کو تو بستر پر لٹا دیا۔ خود کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کھڑے ہو گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

ایک پروفیسر صاحب کاج سے اپنی موڑ کا میں موڑا ہوئے اور گھر کو چلے۔ اس وقت آپ رگڑا پنی رہے تھے اور بارش بہت زور شور سے ہو رہی تھی۔ جب گھر پہنچے اور اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک ہاتھ میں ہیٹ تھی اور دوسرے میں رگڑا۔ آپ نے ہیٹ تو کھڑکی میں سے باہر چھینک دی اور جتنے ہوئے رگڑا کو کھونٹی پر رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب رگڑا فرش پر گر پڑا تو آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ رگڑا کو وہیں چھوڑ کر باہر بھاگے۔ آپ کی ہیٹ سر کا پیکچر دیوانی میں لٹ پٹ پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر بھیجتے بھاگتے کمرے میں آئے۔ تو رگڑا کی وجہ سے قاتلین ٹھگ رہا تھا؟

ایک اور پروفیسر صاحب کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپ اپنے دولکدے کے کتب خانے میں تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں نذر نے اطلاع دی کہ چھوٹی لڑکی بیہوش ہو گئی ہے۔ آپ گھبرا کر اٹھے اور سیدھے ایک الماری کی طرف گئے تاکہ لگا جکے عرق کی بوتل ساتھ لیتے جائیں۔ جھٹ پٹ بوتل نکالی اور وہاں پہنچے۔ جہاں بھی بیہوش پڑی تھی۔ آپ نے لگا نکال کر بوتل کی بوتل بھی کے سر و سر پر اندر لے دی۔ اب دیکھتے کیا ہیں کہ بچی کا سر منہ اور بستر اور نگینہ۔ بلیک سیاہی سے شرار اور ہوسے ہیں۔ پروفیسر صاحب بدحواسی میں گلاب کی جگہ سیاہی کی بوتل اٹھا لائے تھے۔

ایک ڈاکٹر صاحب کا ملازم ہر روز دوپہر کے وقت گھر جا کر ڈاکٹر صاحب کے لئے ناشتہ دان میں کھانا لایا کرتا تھا اور ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر کھ دیا کرتا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ڈاکٹر صاحب اس کمرے میں داخل ہوتے اور کھانا تناول فرما لیتے۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ملازم کا بدعنوانی شروع ہو گئی۔ ایک تو غریب آدمی اپنے بعض تفکرات میں غرق تھا۔ اور پورے پڑا منہ، کچھ بدحواس سا ہو گیا جب ڈاکٹر صاحب کے دفتر کے پاس پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ بارش کا پانی سوک پر جمع ہو رہا ہے۔ اس نے اپنے جوتے اُتار کر ایک ہاتھ میں لے لئے اور دوسرے ہاتھ میں ناشتہ دان اٹھائے پانی میں سے شپ کرنا ہوا آخر میں فضل ہو گیا۔ حواس بالکل پرانگہ ہو رہے تھے۔ اس نے ناشتہ دان تو دروازے کے پاس ہی پاندا ز پر رکھ دیا۔ اور اپنے جوتے کھانے کے کمرے کی میز پر لگا دیئے۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب اس کمرے میں داخل ہوئے تو میز پر عجیب و غریب کھانے کی چیز دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے۔ بچا سے ذکر کرنے پاؤں پڑ کر معافی مانگی۔

انگلستان کے ایک نوجوان پروفیسر کا حال بیان کرتے ہیں کہ وہ نہایت خود در خواست اور غیر حاضر طبیعت کا آدمی تھا اور طالب علم اس سے اکثر دل لگی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پروفیسر صاحب نے اس نوجوان پر ایک لکچر تیار کر رہے تھے۔ بے شمار کتابیں میز پر رکھی پڑی تھیں کہ اتنے میں لوکر لئے ایک لفافہ لا کر دیا۔ پروفیسر صاحب نے اس کو کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا:-
"جناب پروفیسر صاحب! تسلیم۔ آپ کی کئی اور آپ کی عیبت میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن آپ کی میم صاحب کے علمی انماک کی وجہ سے بہت آوارہ ہو رہی ہیں۔ چنانچہ فلاں ریسرچر کے ساتھ ان کا تعلق ہو چکا ہے۔ محض خبر غلطی کی وجہ سے آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آپ شام کے چھ سات بجے ہائیڈ پارک کے شمال مغربی گوشے میں پہنچ جائیں، وہاں ریسرچر صاحب کے اپنی میم صاحب کی خوش فعلیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔
اس خط کے نیچے کسی کا نام نہ تھا۔ بلکہ صرف یہ لکھا تھا۔ "آپ کا حقیقی خیر خواہ"

اس خط کو پڑھ کر پروفیسر صاحب کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ غصہ و نفرت کے جوش سے ان کا سر دم دم کرنے لگا۔ یکایک لکچر اور کرسی تیار رہی۔ یہاں اب رو پڑ پڑ گئی تھی۔ شام ہونے میں ایک آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ یہ وقت پروفیسر صاحب نے انتہائی اضطراب میں بسر

کیا اور وقت منقرضہ پر آپ ہنسیا پارک کو روانہ ہو گئے۔ ”خیر خواہ“ نے جو مقام بتا رکھا تھا۔ اس پر جا کر کھڑے ہو گئے اور نگے انتظار کرنے لگے۔ وہ مقام اپنے آشتا کے ساتھ کب یہاں آئی ہے۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ باغ سیلانپول اور قاشائیں سے غالی ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ رات کے بارہ بج گئے۔

پروینسر کے پیٹ میں بھوک سے آگ لگ رہی تھی اور میں اس وقت جب وہ کسی ہوٹل کی تلاش میں ادھر ادھر اپنی نظریں دوڑا رہے تھے، دفعہ آپ کو یاد آ گیا کہ میں تو ابھی کنواریوں۔ میری نوشادی بھی نہیں ہوئی۔ پھر یہ بیوی کیسی اور اس کی آوارگی کیا معنی؟ پروینسر صاحب اپنی بہاؤسی پر لامل پڑتے ہوئے گھر کو روانہ ہوئے۔

شیرازہ

ساکت (ریڈیو، جہان)

سرٹے حیدری خاں

ذیل کا کھڑا مولانا عبدالمجید شہر کی مشہور تصنیف ”گذشتہ لکھنؤ“ سے لیا گیا ہے۔ (شیرازہ)

غازی الدین حیدر کے زمانے میں اس فن کا ایک بڑا کامل و اکمل شخص لکھنؤ میں موجود تھا جس کا نام حیدری خاں تھا۔ یہ صاحب اپنی وارفتہ مزاحیہ کی وجہ سے ”سرٹے حیدری خاں“ مشہور تھے اور گو کہ گنج رہتے تھے۔ غازی الدین حیدر کو ان کا گانا سننے کا بلاواسطہ تھا مگر کبھی اس کا مرتع نہیں ملا تھا۔ ایک وز سپر کہ غازی الدین حیدر ہوا در پر سوار دریا کا سے تغریز کو بکھٹے۔ رومی دروازے کے نیچے لوگوں نے دیکھا کہ ”سرٹے حیدری خاں“ چلے جاتے ہیں۔ بادشاہ سے عرض کی قبلہ عالم حیدری خاں یہی ہیں۔ بادشاہ کو تو اشتیاق تھا ہی۔ حکم دیا کہ بلاؤ۔ لوگ کچلاؤ اور سامنے کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے کہا ”اے میاں حیدری خاں کبھی ہمیں اپنا گانا نہیں سناتے؟“ بولے ”جی ہاں کیوں نہ سناتاؤں مگر مجھے آپ کا مکان نہیں معلوم ہے۔“ بادشاہ بے اختیار ہنس پڑے اور کہا ”اچھا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم خود یا اپنے مکان پر لے جلیں گے۔“ بہت خوب، کہہ کر ساتھ ہوئے۔ چتر منزل کے قریب پہنچے تھے کہ حیدری خاں ہتھ پڑے اٹھ گئے اور بولے ”میں چلتا تو ہوں مگر پوچھنا اور بالائی کھلوانے کا تو گاؤں گا۔“ بادشاہ نے وعدہ کیا اور محل میں بیٹھ کر گانا سننے لگے۔ بخوشی ہی دیر سن کے بہت محظوظ ہوئے۔ وجہ کا عالم طاری ہوا اور بے خود دے تاب ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر حیدری خاں خاموش ہو گئے۔ بادشاہ نے پھر گانے کو کہا تو بولے ”حضور یہ تنہا کو آج کے چچان میں بھرا ہوا ہے، بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے، آپ کس کی دکان سے منگواتے ہیں؟“ غازی الدین حیدر خود بھی آشتہ مزاج تھے اور سردی مشہور تھے۔ اس سوال پر منھس ہوئے تو صاحبوں نے عرض کیا ”قبلہ عالم! یہ سڑی آشتی ہے، ابھی تک یہی نہیں سمجھا ہے کہ کس سے باتیں کر رہا ہوں۔“

اب لوگ بادشاہ کے ایما سے حیدری خاں کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ پوچھنا، بالائی کھلوانی حقہ پلویا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا کھڑا اور ایک جیبہ کی شکر منگوا کے اپنی بی بی کو کھوانی (جوان کاہر جگہ منزل تھا) جب تک ان کاموں میں ہے۔ بادشاہ نے طبعاً آتا۔

کے جام پئے۔ اور جب نشے کا زور ہوا تو پھر حیدری خاں کی یاد ہوئی۔ فوراً بھلا کے گانے کا حکم دیا۔ مگر جیسے ہی انہوں نے اپنا غنہ شروع کیا۔ روک کے کہا ”حیدری خاں سنئے ہوا، اگر مجھے خالی خوش کیا اور ٹلایا نہیں تو یاد رکھو کہ گوشتی میں ڈوا دول گا۔“ اب تو حیدری خاں کی عقل چکڑ میں آئی، سمجھ کر یہ بادشاہ ہیں۔ کہا ”حضور اشد مالک ہے۔“ اور جی توڑ کے گانے لگے۔ خدا کی قدرت یا یہ کہنے کے حیدری خاں کی زندگی سچی کہ توڑی ہی دیر میں بادشاہ پر اثر پڑا۔ بے اختیار رونے لگے اور خوش ہو کے کہا ”حیدری خاں مانگ کیا مانگتا ہے؟“ عرض کیا ”جو مانگوں گا دیجئے گا؟“ بادشاہ نے وعدہ کیا اور حیدری خاں نے تین دفعہ قبولوا کے کہا ”حضور یہ مانگتا ہوں کہ مجھے پھر کبھی بھلائیے گا نہیں اور نہ گانا سنئے گا“ بادشاہ نے تعجب سے پوچھا ”کیوں؟“ عرض کیا ”آپ کا کیا ہے مجھے مروا ڈالیے گا۔“ پھر مجھ سا حیدری خاں نہ پیدا ہوگا۔ اور آپ مر جائیں گے تو ڈوڑا دوسرا بادشاہ ہو جائے گا۔“ اس جواب پر غازی الدین حیدر نے ناراض ہو کر منہ پھیر لیا۔ یہ موقع پاتے ہی حیدری خاں اپنی جان لے کے بھاگے اور اپنے گھر آئے۔

(نیرت اعظم)

مرزا غالب کا آخری خط

دیگر انخوشیم غمیر بنو دکھت بر طرف

ایں قدر دائم کہ غالب نام بار سے داکشتم

ہجوم غم سے فراغ نہیں۔ عبارت آرائی کا دماغ نہیں، اگرچہ گوش نشین و خاندان خراب ہوں لیکن بحسب رابطہ ازلی اکثر اہل احباب ہوں۔ اطراف و جواب سے خطوط آتے ہیں۔ ادھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں۔ بلا صلح بھیج دیئے جاتے ہیں۔

ان صاحبوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ نہ میں نے انہیں نہ انہوں نے مجھے دیکھا ہے۔ محبت دلی و نسبت روحانی ہی لیکن جان بلا دور دست کیا جانیں میرا حال کیا ہے۔ ہشتاد و یک سالہ عمر کی کتاب میں سے فصل آخر کی حقیقت یہ ہے کہ کس پندرہ برس سے ضعیف سامہ اور قلت اشتہا میں مبتلا ہوا اور یہ دونوں علتیں روز افزوں رہیں۔ جس حافظہ کا بطلان علاوہ جوں جوں عمر بڑھتی گئی یہ امر ازل بھی بڑھتے گئے۔ قیمتہ مختصر اب سامہ کا حال یہ ہے کہ ایک تختہ کا غدکاح دوات قلم سامنے دھرا رہتا ہے، جو درست آتے ہیں، پرسش مزاج کے سوا اور کچھ نہ کہتا ہوتا ہے۔ وہ لکھ دیتے ہیں۔ میں ان کی تحریک کا جواب نہ زبانی دیتا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو کھانے کا سامہ کا خیر، دوپہر کو کبیر، گھڑ گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب، انیسان حد سے گر گیا۔ رشتہ دوران و ضعیف بصر یہ بارانِ ناکامہ سے ہیں۔ میر تقی میر حرم کا مطلع درو زبان ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کیس ہم
العقدہ دہلے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

خط میں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور قبول جاتا ہوں۔ آگے لیٹے لیٹے خط لکھتا تھا اب رشتہ یوں بھی نہیں لکھتے دیتا۔ صاحب اکمل الاخبار اور صاحب اشرف الاخبار نے جو ہمیشہ مجھ سے ملنے جلتے رہتے ہیں اور میرا حال جانتے ہیں اندوئے شاہدہ میرے کام کی تصدیق کر کے اسی اعتدار کو اپنے اخبار میں چھپا دیتا ہے۔ کل دیگر صاحبان مطبع اور راغبان اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کریں گے تو فقیہان کا احسان مند ہوگا۔ اس نگارش کی شہرت کے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں۔ اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل درمیں پہنچے تو قضا اور اگر نہ پہنچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گزار میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا، جب بالکل بچھا ہو گیا نہ جو حس باقی نہ طاقت، پھر اب کیا کر دل بقول خواجہ وزیر حج

میں دف کرتا ہوں لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی کو میری طرف سے بے ملامت ہو تو خالصاً للہ معاف فرمائیں۔ اگر جو ان ہوتا تو احباب سے دُعا سے صحت کا طلب گار ہوتا اب جو بڑھا ہوں تو دُعا سے منفرت کا خواہاں ہوں۔ غالب

”دین و دنیا“

فیض اقبال

۱۹۳۵ء میں ایک روز شام کے وقت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا کہ علی بخش نے اطلاع دی کہ چند طالب علم ملنے کو آئے ہیں، جاڑے کا موسم تھا، ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے میں بیٹھے تھے، بالعموم وہ شام کے وقت بستر پر بیٹھے تھے اور ملاقاتی وہیں کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے، لوگ اندر آئے، یہ اسلامیہ کالج کے طلبہ تھے، میں چونکہ اسلامیہ کالج میں ملازم تھا، اس لئے ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں وہ شام کے وقت وفد کی صورت میں کیوں حاضر ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا ”کیوں بھیجیے کیسے آئے؟“ انہوں نے جواب دیا کہ ایک مشاعرہ کرنے کا ارادہ ہے اجازت والا اگر اس کی صدارت قبول فرمائیں تو عزت افزائی ہوگی اور لوگ بھی بہت جمع ہوں گے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ”صدر تو میں کسی مجلس یا جلسہ کا بننا نہیں چاہتا، البتہ ”شعرازی“ سے متنبیں روکتا ہوں، اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو شعرازی کی ضرورت نہیں، اور نہ ہر شخص شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے، لوگ شعرازی کی طرف اسی لئے جلد متوجہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر کوشش، مطالعہ اور محنت کے انہیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دائر ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں جن کے کام میں بقول غفر موجود ہو، آپ کو جو ان ہیں، آپ کو اس غلط روش پر گز نہ چلنا چاہئے، ضرورت ہے نشر نگاروں کی جو

محنت اور مطالعہ کے بعد اردو زبان میں مختلف موضوعوں پر کتابیں، رسالے، تراجم وغیرہ لکھیں اور اپنی قوم کو اور خدا اپنے آپ کو بہتر بنائیں، ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا کم کر دیش ہی حاصل تھا، چنانچہ ان کی تقریر نے ان نوجوان شعراء کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور وہ یہ لیکچر سن کر رو کر ڈنگ ہاؤس سدھائے۔

۱۹۲۵ء میں ایک نامور بزرگ لاہور میں تشریف لائے، ان کی لیاقت، وسعت علم اور بالخصوص فصاحت و بلاغت کے متعلق عوام میں بہت مبالغہ آمیز باتیں مشہور تھیں۔ فن تقریر میں بہت کم لوگ ان کی ہمسری کر سکتے تھے اور انگریزی زبان، محاورہ، لفظ اور ادب میں تو انہیں بلا کی دسترس حاصل تھی۔ میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے ان کی بہت تعریف کی، وہ بزرگ ابھی نئے نئے وارد ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انگریزی فن تقریر میں ان کا پایہ کم ہے، لیکن یاد رکھو کہ انبیا و مصلحین اقوام کو چھوڑ کر جو لوگ بے ضرورت اُٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں ان میں ردجائیت کا فقدان ہوتا ہے

In people other than prophets and great national reformers, too much of public speaking is very often a sign of spiritual poverty.

”باتو“ حضرات کے متعلق تو یہ نظریہ بالکل صحیح ہے، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ بعض بڑے بڑے تقریروں کے متعلق بھی یہ نظریہ غلط ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اگلیات ان میں طالب علمی کے زمانہ میں ہیں بھی تقریروں کے شغل میں کچھ عرصہ کے لئے بہت منہمک رہا۔ لیکن بعد میں میں نے اسے بالکل ترک کر دیا۔

”معارف“

مانلو کا مجسمہ ونیس

آج سے دوہزار سال پہلے کے یونانی متاعوں نے تہ ترائشی کی صنعت کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا کہ اس فن میں آج تک کوئی ان کا ہمسر ہوا نہیں ہو سکا۔ اس پرچوں میں ونیس کے بُت کی تصویر شاہجہاں پوری ہے اس کا متعارف ایک قدیم یونانی بت زرشش مانلو تھا اگرچہ مانلو کے حالات زندگی سے دنیا ناواقف ہے لیکن اس کا یہ مجسمہ ساری سن تہذیب کا بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرماتے کہ اس میں مناسباً عشاء اور سکون قلب کا اظہار جس دلاویزی سے کیا ہے وہ انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے۔

حامد علی خاں

یا مٹور نے کش این چٹیں یا ترک کن مٹور سے مگوئی

نامعلوم

ہر چند و منت کی ستم دھن ازالا لا تری
بسرا رخباں دیدہ ام میگز تو جہیزے دیکھی

خسرو

صنعت گز نقاش میں رومور سے یارم بسبیں

اے چہرہ زیبا سے تو رشک بیتان آ زری

آفتاب را گردیدہ ام، میر سبباں وز دیدہ ام

لہ نہرو۔ محبت کی یونانی دیوی

مطبوعات

ریاض ضوال۔ یہ حضرت ریاض خیر آبادی مرحوم کا دیوان ہے جو قاضی محمد حسین صاحب ایم اے کی توجہ اور اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ دیباچہ نگاروں میں ہمیں استغلت مبارک سکرشن پر شادی شامل ہیں۔ ریاض غزل نگار اساتذہ قدیم کے سلسلے کی ایک نئی چمکتی ہوئی ٹکڑی ہیں۔ ان کے بعد اب اس پڑنے رنگ کی شاعری ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔ شراب کے متعلق حضرت ریاض کے شعر خاص طور پر پُر لطافت ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

وہ جانا مرا رُوٹھ کر مسکدے سے
مُراجی کا مجھ کو وہ آواز دین
توہ سے ڈرایا مجھے ساقی نے یہ کہہ کر
توہ شکنی کے لئے اصرار نہ ہوگا
یہ اپنی وضع آور یہ دشنام تے فوٹ
سُن کر جوہی گئے یہ مرا منسلکی کا سقا

تغزل کا رنگ ملاحظہ ہو:-

کبھی سرفروخت تاب لب آبیانا چمکے سے
اُسی نے رفتہ رفتہ طول کھینچا دستاں میں
چمکے میں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج بتا رہے شباب کی
کوئی مُنہ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جلنے گی یونہی جب میں پر
اس طرح کہ گھٹنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چہم سے چلیں گودیں چمکے سے اٹھالے

ایک دوسرا رنگ ملاحظہ ہو:-

یہ محشر ہے یہاں اب بھوش میں دیوان آتا ہے
خداوند امرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے
بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خرم رکھ دیں
جہاں سانچہ رنگ دیں چشمہ زمزم نکلتا ہے

ریاض نے بہت پاکیزہ زندگی گزاری لیکن اس کا ایک ایک شعر صبا کے شاعری کا ایک ایسا مست و طربناک جام ہے جسے پنی گردن ان سیاہ مست بھی اگر افسردہ انگور کو قبول جائیں تو تعجب نہیں۔ کتاب کا فذا کتابت، طباعت اور حد کے لحاظ سے نہایت نفیس ہے۔ حجم تقریباً ۸۷۲ صفحات، قیمت ۱۰ روپے، مدارۃ الادب حیدرآباد (دکن) یا دفتر شاربکا رگو رکھوڑہ۔

مکاتیب مہدی۔ مرتبہ عمر مہدی بیگم صاحبہ۔ یہ کتاب "افادات مہدی" کے مشہور مصنف جناب مہدی حسن صاحب فاضل الاقتصاد کے خطوط کا مجموعہ ہے خطوط چونکہ آدمی کی زندگی کا ایک نہایت بے تصنع اور بے تکلف دمرقع ہوتے ہیں، اس لئے مشاہیر کے خطوط سے عوام

بہت دلچسپی لی جاتی ہے، اور ادیب کی اس صفت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مقام سرستھ ہے کہ اردو کتب کے ناشرین بھی اس باب میں اب پیش از پیش سرگرمی دکھا رہے ہیں اور آئے دن اردو زبان کے اُدب کے مکاتیب کے مجموعے شائع ہونے لگے ہیں۔

مولوی ہمدی جن کوئی بہت بڑے عالم نہ تھے لیکن ادیب اور دو معتقین زبان اردو سے انہیں بہت دلچسپی تھی اور اردو زبان کی وقتی تحریکات کے سلسلے میں وہ خاصے وسیع المعلومات آدمی تھے۔ ان کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ان کی کامیاب پرطری اور نگشتہ اندازِ تحریر ہے۔ مکاتیب ہمدی میں بھی قدرتی بے تکلفی کے ساتھ اندازِ بیان کی وہی شگفتگی ملتی ہے جو ”افاداتِ ہمدی“ میں نظر آتی ہے۔ اس مجموعے کے خطوط مشاہیر اردو کے نام ہیں لیکن ہمدی بگیم صاحبہ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر اہل مکاتیب کی قدر کی تو وہ ہمدی جن مرحوم کے خانگی خطوط کو بھی ایک مجموعے کی صورت میں شائع کر دیں گی۔ ہمدی جن ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

”بچ کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا یعنی اندازِ خیال میں صنعتِ گری طبع کی جگہ صرف اہم جذبات

ہوتی ہے، اس لئے لٹریچر کا یہ ایک ایسا اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبہ انشا پر داری کی صحیح غمازی کا تابع ہے۔ اچھے اچھے بولنے والوں، چوٹی کے شاعروں کو دیکھا کہ دو سطریں سیدھی سا دھی نہیں لکھ سکتے۔“

یہ خیال عام لوگوں یا قدیم اُدب کے خطوط کے متعلق درست ہو، لیکن آج کل کے مشہور اُدب کے غیر خانگی خطوط کے متعلق اب یہ خیال زیادہ درست نہیں رہا کیونکہ انشاءِ باخط لکھتے وقت یہ احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں کہ ان کے چھپنے کی نوبت بھی ضرور آئے گی اور بعض حضرات خط لکھتے ہی چھاپنے کی نیت سے ہیں چنانچہ ان کے ہر خط کا مسودہ ان کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مستوفیٰ کی اس ہوشیاری یا پُرکاری سے خطوط کی اشاعت کا اصل مقصد بڑی حد تک فوت ہو چکا ہے۔

ہمدی جن صاحب کے خطوط میں خاصی بے تکلفی بلکہ شوخی موجود ہے، اس شوخی کے ڈانڈے کہیں کہیں عربیائی سے جا ملتے ہیں۔ جو شاید کچھ ناگوار سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہمدی صاحب کے خطوط بالعموم نہ صرف خاصے دلچسپ ہیں بلکہ اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہیں کہ ان سے آج سے پچیس تیس سال قبل کی ادبی زندگی کے حالات و کوائف کے متعلق قابلِ قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بیضاً اس قابل ہیں کہ اردو کے ہر کتب خانے میں موجود رہیں۔ حجم بڑی قطع کے ۳۰۲ صفحات، کاغذ اور طباعت نفیس ہے۔ قیمت پندرہ روپے ۱۔ محترمہ ہمدی بگیم صاحبہ بہت پور ضلع گورکھ پور +

ذکرِ غالب :- گزشتہ تین سال سے غالب کے متعلق گراں قدر ذالبعات کا جرسہ شروع ہوا ہے اس میں تازہ ترین اضافہ مسٹر مالک رام ایم۔ اے کی مونسہ بالاکا تب ہے۔ یہ مرزا غالب کی مختصر مگر جامع سوانح عمری ہے جو انگریزی اصطلاح میں ”خارجی“ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اور حق یہ ہے کہ اس طرز کے فن سوانح نگاری میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے پہلے جناب غلام احمد دہلوی بھی اسی ”خارجی“ انداز میں سوانح غالب کے متعلق اپنی پیش بکتاب شائع کر چکے ہیں، ان کے بعد اسی موضوع پر ایک ایسی سیر حاصل پور پناز

مکتوبات کتاب مرتب کرنا یقیناً سختی تھیں وافر ہیں ہے۔ جناب تہر کی کتاب کو بوجہ اولیت وہ تمام مباحث جو صحیح طور پر حاشیہ کتاب کا حصہ تھے جن میں لینے پڑے تھے۔ اس سے ان کی کتاب کی مباحث بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ مسٹر مالک رام نے نواح غالب کو ایک مناسب حجم کی کتاب میں منتقل کر دیا ہے جس کی زبان دلکش اور سلیس ہے۔ کتاب کے حجم کو دیکھ کر شاید کسی کو شبہ ہو کہ سوانح میں انتخاب کیا گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مسٹر مالک رام کی کتاب "بقامت کہتر و بقیت بہتر" کی مصداق ہے۔ انہوں نے نہ صرف تمام پہلوؤں پر مشرود مواد اپنی کتاب میں درج کیا ہے بلکہ بعض نئے اور مفید انکشافات کا بھی اعنا ذکر کیا ہے اور غلطی یہ ہے کہ اس اختصار میں مطالب کی فراوانی کے باوجود تحقیق کے انداز کو قائم رکھا ہے جس ترتیب اور کھسے ہوئے انداز بیان کے لحاظ سے اس کتاب کو غالب کی سوانح عمریوں میں ایک مستقل حیثیت حاصل رہے گی۔ ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ، دہلی۔ قیمت ۸ روپے۔

تجلیاتِ تجل - از گلشنزادہ صاحب و راجہ بیٹاب - یہ مصوری کے متعلق بارہ مکتبہ آموز معنائیں کا مجموعہ ہے۔ ذیل کے عنوانوں سے اس کے موضوع کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے :- ہندو قدیم کی مصوری، بدھ مصوری، مٹھل مصوری، راجپوت مصوری وغیرہ۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۸۸ صفحات، قیمت مجلد غیر - پتہ :- رائے صاحب دیال گردال پبلشر، الہ آباد (دہلی) +

سبد گل - یہ "بزم ادب" نیرودی (مشرقی افریقہ) کے حلیوں اور شاعروں کے مضامین نظم و نثر کا ایک دلکش اور دلچسپ مجموعہ ہے۔ مشرقی افریقہ جیسے دور دراز مقام میں بزم ادب اردو کا قیام اور طباعت و کتابت کی ہزار بادشاہیوں کے باوجود کسی روزگاروں کا ایک دلکش مجموعہ کی صورت میں چھپ جانا اردو زبان کی حیرت انگیز مقبولیت کا ایک روشن ثبوت ہے۔ بزم ادب میں غالب و لعلیال وغیرہ مشہور شعرا پر تنقیدی مضامین بھی پڑھے جاتے ہیں اور شاعروں میں تمام ہندوستانی ملا اقبالیہ مذہب ملت حیتہ لیتے ہیں۔ غیر متعصب ہندو مسلمانوں کو اردو سے جو محبت ہے اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اپنی تفریح اور ذہنی ترقی کے لئے وطن سے دور انہوں نے جو انجمن بنائی ہے اس میں خیالات و افکار کا ذریعہ انہا رہی اردو زبان ہے۔ شعر ارمیں محمد حیات اختر اور عبداللہ بن بیل جیسے ناموں کے ساتھ راکش من مشوا، دیوار راج دیو، لکشی زبان گردش اور دیپ سنگھ غریب جیسے نام بھی نظر آتے ہیں۔ بزم ادب نیرودی کے کارپرداز ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ قیمت مجلد ایک شلنگ پچاس سینٹ - پتہ :- محمد شریف قریشی ناظم عمومی بزم ادب پوسٹ بکس ۱۱۳۲ - نیرودی - مشرقی افریقہ۔

شعرا کا گراموفون ریکارڈ - گراموفون کمپنی لمیٹڈ نے ہمیں اپنا ایک ریکارڈ ۱۶۲۴۲۰۰۰ زیو لو کے لئے بھیجا ہے جس میں حضرت جو ش حضرت تاجور حضرت سیاب اور حضرت جود دہلوی نے اپنی ایک ایک غزل خود سنائی ہے۔ یہ ایک دلچسپ جذبہ ہے۔ ریکارڈ سننے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے، گویا ہم شاعر سے میٹھے ہیں۔ اس ریکارڈ کی ایک تاریخی حیثیت رہے گی۔ ہر مشہور دکان سے مل سکتا ہے۔



فہرست مضامین

جہا یوں "بابت ماہ نومبر ۱۹۳۸ء"



تقریر:- پرنس بہارک

صفحہ	صاحب مضمون	مضمون	شمار
۷۹۰	بشیر احمد	ہزم تہا یوں	۱
۷۹۲	حامد علی خاں	بہاں نما	۲
۷۹۵		بہارک	۳
۷۹۷	جناب پروفیسر سید فیاض محمد صاحب ایم۔ اے۔	شعرا اس کی تخلیق اور پستی شاعری	۴
۸۱۳	مشر محمد ہادی حسین ایم۔ اے۔ آئی سی ایس سابق ایڈیٹر سہارواستان	مقبولہ شیعہ جلی پر (نظم)	۵
۸۱۵	حضرت حفیظ ہوشیار پوری ایم۔ اے۔	اوداقی پابینہ	۶
۸۱۶	جناب مرزا یار علی صاحب	پرسکیلا (افسانہ)	۷
۸۲۲	جناب سید علی منظور صاحب حیدر آبادی	محبت کا پہلا مظاہرہ (نظم)	۸
۸۲۴	جناب عبدالحمید صاحب	جاپان کے تعلق برطانی حکومت علی	۹
۸۳۰	جناب سید مقبول حسین صاحب مقبول احمد پوری بی۔ اے۔ ایل ایل بی	کیلاش کنول (تراجم پیام شرق)	۱۰
۸۳۳	جناب ویندرو ناتھ صاحب کلک بی۔ اے۔ ایل ایل بی	موتی (افسانہ)	۱۱
۸۴۰	محترم زید عثمانیہ و حضرات برہم دت و شیم و عیش و سرور و نگر	غزلیات	۱۲
۸۴۲	حضرت حمید نظامی بی۔ اے۔	مریم صاحب	۱۳
۸۴۷	جناب مجید لاہوری	چند پڑا مضطرب لمحے (نظم)	۱۴
۸۴۸	جناب نام کرشن صاحب بھارتی	آہ اقبال (نظم)	۱۵
۸۵۹		مضی ادب	۱۶
		مطبوعات	۱۷

بزمِ ہمایوں

”گتے مبرکتے ہیں مگر کارواں چلے جاتا ہے“ — چند سال ہوئے انگلستان کے ایک مشہور قدامت پسند ریاست کرنے والوں کے قومی غور و خروش برپا کرنے والوں پر یہ فقرہ کسکتا تھا۔ اس زوردار فقرہ کے حصول ہی عرصے بعد کاغذ اس کارواں کو ذرا تسخیم ہی دیا تاکہ یہ سبھو ولے گتے، اس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ یہ کارواں اب پھرواں ہے لیکن اب کی بار ان پست ہتھیروں کو ساتھ لئے ہوئے جھڑکی شان آج اس کارواں کی نگہبانی کا کام دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں!

جس وقت یہ فقرہ چپاں کیا گیا تھا کانگریس کی سرگرمی کی حکومت میں مخالفت پارٹی کے فرائض پورے کرتی تھی۔ آج جبکہ کانگریس مات آٹھ صوبوں میں خود حکومت کر رہی ہے، برطانوی حکومت کا اور اس کا کم از کم صوبوں میں چولی دھن کا ساتھ ہے۔ اب یہ دنیا کارواں گاندھی جی صاحب کی جے پکا رتا ہوا چلے جاتا ہے اور اُس کے جن میں بیچارے اُردو پڑھنے بھی شریک ہیں اس بفضل بھونکے ہیں۔ کیا دنیا کارواں بھی کسی دن تھکے ہوئے چھوڑے گا؟ اس کا جواب نہانے کے پاس ہے!

حکومت میں مفید عنصر کے کم ہونے پر ہندوستانی کو خوش ہونا چاہئے لیکن اس کو کیا کیا جانے کر کیا یہ عنصر میں حکومت پاتے ہی مختلف جھکیاں نظر آنے لگی ہیں جو بہت سی سیاہ آنکھوں کو چند ہی دینے والی ہیں۔

ان میں ایک جھکی زبان کی ہے جب سے کانگریس نے وزارت کا قلمدان سنبھالا ہے غریب اُردو کی جگہ ہندی ہندوستانی کا چہرہ اسی اُس کے دایں بائیں گھومتا نظر آتا ہے۔

زبان کے متعلق اس قلابازی سے اُردو والے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہیں تو انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا جاتا ہے کہ کانگریس کے ریزولوشن کو دیکھو اور سنو، وہ تو کھلے فظوں میں ہندوستانی کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دے چکی ہے۔ اس کے بعد ہندوستانی کی باقاعدہ تعریف بھی کر دی جاتی ہے کہ یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور فارسی، پنجابی، ہر دور ہندوستان میں لکھی جاتی ہے۔ چلنے پھرنے کے لئے اب اس کے بعد جو زبان کے جھگڑے کا نام لے دو اس قابل ہے کہ اُسے قومیت کی قربان گاہ پر سینٹ چڑھا دیا جائے! قول قرار ہو گیا اصل کی کیا ضرورت ہے؟ وعدہ کافی ہے۔

زبان کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک کپڑے کی طرح صبح پہن لی اور شام کو اتار کے کھد دی لیکن قیمتی ہے کانگریس کو تین زبان کے ساتھ کچھ ایسا ہی پرتاؤ کر رہی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ جیسے بھارتیوں کو کٹ کی جگہ ہم نے حکومت کی کرسی پر بیٹھنے ہی حوتی اور گاندھی ٹی پی پی لی ایسی طرح ہندوستان کی گاندھی ہندی ہندوستانی کی جگہ بھی ہندوستانی استعمال کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کو تمام انہی اثرات کے کیکر ہاں بھجوا دیا جائے۔ اور نئے سرے سے پھر پورے زمانے کی طرف متوجہ نہ کیا جائے۔ اس کے لئے خاص پورتر اور شرمیاشا کارواں دینا ضروری ہے۔

زندہ دہلی اچھی چیز ہے، انسان پڑھ کر دلی کیوں چھائی سبے لیکن حیف زندگی کے اُس جوش پر جو دوسرے کے جذبات کا دھیان

رکے۔ آج کل دنیا میں ایسی ہی زندگی کا جوش ہے۔ قیمتی سے نئے ہندوستان میں بھی اس کا جلوہ نظر آ رہا ہے۔

ہوا کا رخ یکدھر ہے؛ شمال اور مغرب سے نہ پھر چکا ہے۔ اب پوربہ اور دکن پر نظر ہے۔ اب پروا اور دکنی ہوا چلتی ہے، اب شیواگوں کی زبان ہندوستان کی زبان بن رہی ہے کم از کم بنائے جانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔

جناب سپوران نندو نیز تعلیم یونی نے ۱۹ اگست کو ناگہری پر چارنی سبھا بنارس کے ایڈریس کے جواب میں فرمایا کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے ہمارے جنوبی ہند کے ہم وطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں۔

اس کے دوسرے ہی دن بنارس کے پاٹ شالوں کے طلسم اور پنڈتوں کے ایک وفد نے آریہل وزیر کو ایک ایڈریس سنسکرت میں دیا جس کے جواب میں وزیر صاحب نے فرمایا کہ میں سنسکرت اچھی طرح نہیں جانتا اس لئے میں ہندی میں ہی لوں گا۔ ٹوٹی چھوٹی سنسکرت میں نہ بولوں گا۔

لیکن لازم بھلا کرے محکمہ اطلاعات یونی گورنمنٹ کا جس نے شری سپورنا نندجی کا ایک ”دیا کھیان“ چھاپ کر شتاب کر دیا ہے کہ شری جی ہندی سے محض نا بلند اور ٹوٹی چھوٹی سنسکرت کے ماہر بے بدل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے چند شرطیں اس مشہور تقریر دل پذیر کی:-

”آدھنک کال جس میں کہ ہم کہہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک پشیمتا ہے کہ ششکشنہ شیمیا کے پندت لوگوں کا اگر شش بہت وشوہ اور بیکانک ہو گیا ہے۔ یہ بات اور کانش سینیہ سنار پر گھٹت ہوتی ہے اور ترن سارم اپنے دل میں بھی اس شیوہ بیکانک اندولن کے جن جن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا اُن بھوکہ کر رہے ہیں۔ آج کل ہم اپنے کو جس مانک اور پندھارک پرستیت میں پاتے ہیں اور ہماری اس اس استمت کا جو مافک راج نینک اور آرہنک ادھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پورو جن سے جو سنسکرت پائی ہے اس سے اس وشوہ پانی پرگت کو ہمارے محکمہ نیش سند یہ ایک ششکشنہ روپ میں اپنی بخت لیکہ اور ایک وشیس ہمارے سستی بنا دیا ہے۔“

یہ ہے بقول نگار ”شترک ہندوستانی زبان کا نمونہ جس کی سفارش ہائی کمانڈ نے کی ہے“ اور جس کی داوینے کی مدیر مالہ نے مولانا ابوالکلام آزاد سے درخواست کی ہے۔

اس تقریر کو نگار سے اس لئے بھجہ نقل کیا گیا ہے تاکہ کبھی آئندہ وزیلنے میں پوربی درکشی قوتیت شمالی ہندوستان پر چھاکر استخانت تالیاں کرے اور لاہور کے کشتلات میں تہا بیل ”کے فائل برآمد ہوں تو ہندوستانی زبان کا یہ نمونہ کبھی رحمہ دل ہندو محقق کے کتب خانے کی زینت بن جائے

بشیر احمد

جہاں نما

یادگار اقبال

علامہ اقبال جے کے عقیدت مند قریبی منتظر تھے کہ علامہ مرحوم کی کوئی مناسب یادگار قائم کرنے کا فیصلہ جلد ہو جائے۔ اور وہ اس میں جتنی لینے کی سعادت حاصل کر سکیں اس بارے میں اب تک جو ذیل ہوئی اس کا باعث یہ تھا کہ وہ اکابرین کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کچھ عرصے کے لئے لاہور سے باہر رہنے پر مجبور تھے۔

اقبال علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد لاہور کے ناؤن ہال میں ایک عظیم الشان تعزیتی جلسہ ہوا اجتماع میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہر فرشتے اور ہر قوم کا فرادہ شامل ہوئے تھے۔ سرسکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب نے اس جلسے کی صدارت فرمائی تھی۔ اسی جلسے میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ سر محمد اقبال کی یادگار قائم کرنے کا کام ایک خاص کمیٹی کے سپرد کیا جائے جس کے صدر آرتھر ویل سٹوڈنلنگ چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ ہوں۔ سر ڈگلس نے تجویز صدارت قبول کر لی تھی۔ اور فلنٹ کزل سر سیر لڈ ویل فرانسس بل، سر سید گلہ راجا زند سنا تھے، سرسکندر حیات خاں، نواب صاحب ممدوٹ، مسٹریس بی سنگھ، امیر مراتب علی اور مسٹر جی رستم جی اس مجلس کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ نواب احمد یار خاں وقت نہ مجلس کے ممدوٹ لگا گوال داس اور سردار اجل سنگھ نائب ممدوٹ چارہائے تھے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، صدر اور ارکان کی لاہور سے غیجاٹری کے باعث کچھ عرصے تک کمیٹی کوئی کام نہ کر سکی۔ لیکن اب سر ڈگلس ریگ کی انگلستان سے مراجعت اور دوسرے ارکان کی شملہ وغیرہ سے واپسی پر یادگار کا کام نہایت مستعدی سے شروع کر دیا گیا ہے۔

اس کمیٹی کے ارکان نے بہت غور و غوض کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ علامہ مرحوم کی مناسب ترین یادگار یہ ہوگی کہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور کے ساتھ ایک نئی عمارت کا اضافہ کیا جائے جس میں شعرو فلسفہ کی نادر آراء اور فارسی کتابیں جمع کی جائیں مجوزہ کتب خانے کا نام "اقبال میوریل لائبریری" قرار پایا ہے۔ عمارت اور کتابوں کے مصارف کا اندازہ ڈیڑھ لاکھ روپے کے قریب ہے اور اقبال میوریل فنڈ کمیٹی کی طرف سے چندے کے لئے اپیل شائع ہو چکی ہے۔

یہیں یقین ہے کہ اہل ملک اس فنڈ میں حصہ لینا پائے لئے باعث سعادت سمجھیں گے اور یہ قلیل سی رقم بہت جلد جمع ہو جائے گی۔ اس کام کے لئے کم استطاعت حضرات کم سے کم رقم بھی بھیج سکتے ہیں۔ ہر رقم امیر ویل ہنگ آف انڈیا لاہور کے نام بھیجی جائے گا اور وہی آرڈر کے کوپن پر صلحت کر دینی چاہیے کہ یہ رقم "اقبال میوریل فنڈ" کے لئے بھیجی جا رہی ہے۔

اسلام اور بولشوزم

روس میں بولشویکوں نے مذہب عیسوی کے خلاف جوش و خروش دکھایا اس کا ذکر اخباروں و رسائل اور کتابوں میں اکثر ہوتا رہا ہے لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ سوویتوں نے ان لاکھوں کروڑوں مسلمانوں سے کیا سلوک کیا جو روس میں آباد تھے۔ اکثر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ سوویتوں کے ماتحت کتنی زبردست اسلامی آبادی تھی۔ روسی سلطنت کی توسیع کے زمانے میں ترکستان جو بدلتوں اسلامی سلطنت و جبروت کا گوارہ رہ چکا ہے روس کے زیر نگیں ہو گیا۔ تدریجاً ترکستان کے بہت سے باشندے یورپی روس میں بھی داخل ہو کر آباد ہو گئے جب اس میں سوویت حکومت برسرِ اقتدار آئی تو لازم تھا کہ اس اسلامی عنصر کو بھی کسی نہ کسی طرح سوویت میں مدغم کیا جائے۔

ابتداء میں جدید روسی حکومت کے لئے اسلام ایک حقد و دشوار بن گیا لیکن بولشویکوں نے جلد ہی فیصلہ کر لیا کہ اس معاملے میں کامیابی حاصل کرنے سے قبل بہت احتیاط و ملحوظ رکھنی چاہئے۔ چنانچہ روس نے مسلمانوں کے دلائل کو مضبوطی میں لینے کے لئے اعلان کیا کہ آزادی ہر قوم کا طبعی حق ہے۔ اور روسی ترکستان آزاد کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سوویت حکومت نے مقامی بولیوں اور مقامی ثقافتوں کی سپرستی شروع کر کے عوام میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ اس کے بعد بولشویکوں نے قرآن مجید کی ان آیتوں سے فائدہ اٹھایا جن میں غیر منصف اور مغرور اہل دولت کو جو غریبوں پر ظلم کرتے ہیں برا بھلا کہا گیا ہے بولشویکوں نے اس پراپیگنڈا کے سلسلہ میں کہا کہ دراصل بنیادی طور پر اسلام اور بولشوزم ایک ہیں۔ عیسائی کلیسا پر بولشویکوں کے جبر و تعزیر نے عام مسلمانوں کو اس کا یقین دلادیا۔

بولشوزم کے ابتدائی ایام میں کئی مسلمان اس بات سے خوش تھے کہ بولشوزم اسلامی اصول و مسلمات کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن بہت جلد سب کو معلوم ہو گیا کہ بولشوزم میں کسی مذہب کی گنجائش نہیں۔ آخر اسلامی مساجد اور مدارس کا بھی وہی شر ہو گا جو عیسائی گرجاؤں اور سکولوں کا ہو چکا تھا۔ غالباً بہت سے مسلمانوں نے بولشوزم قبول کر لی لیکن اب بھی ان میں ایک ایسا زبردست عنصر رہا عنصر ترکستانی عنصر جو اسلام کو کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔

ریاست جے پور میں اصلاح دیہات

ہندوستان کی ریاستوں کی حالت برطانیہ ہندوستان سے بھی زیادہ پسماندہ ہے۔ اس لئے جب ہم کسی ریاست کو ترقی کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو قدرۃً خوشی ہوتی ہے۔ حال ہی میں ریاست جے پور کے محکمہ مال کی ایک رپورٹ ہماری نظر سے گزری ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ریاست کے بنیاد رفرنگھم نے اپنی رعایا کے مرض کی تشخیص کر لی ہے اور اس مرض کے دغیبہ کرنے لئے نہایت کامیاب علاج شروع کر دیا ہے۔ ہندوستان کی زیادہ آبادی دیہات میں ہے اور بدقسمتی سے

یہی آبادی دنیا کی تقریباً پسماندہ ترین مخلوق پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کے مرض کا علاج و بہت کی تعلیمی اور اقتصادی حالت کی اصلاح کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارا جہ صاحب جے پور کے ایما پر ریاست کے قابل ریلوینڈسٹر نے تعلیمی، قانونی اور انتظامی معاملات میں وہاں کے رہنے والوں کی امداد اور رہنمائی کا بیڑا اٹھایا ہے اور ایک نہایت قلیل عرصے میں ہر شعبہ نے نہایت اچھی کارگزاری دکھائی ہے۔

یہاں ہم مختصر ریاست کی تعلیمی ترقی پر ایک نظر ڈالتے ہیں تاکہ دیگر شعبوں کی ترقی کا اندازہ بھی کیا جاسکے۔

۱۹۳۵ء میں لڑکوں کے لئے ۳۹۵ ورنیکلر مدرسے تھے جن میں ۲۳۱۵۰ طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں اس قسم کے مدرسوں کی تعداد ۴۲۲ ہو گئی اور طلبہ کی تعداد ۲۴۹۵۹ تک پہنچ گئی۔

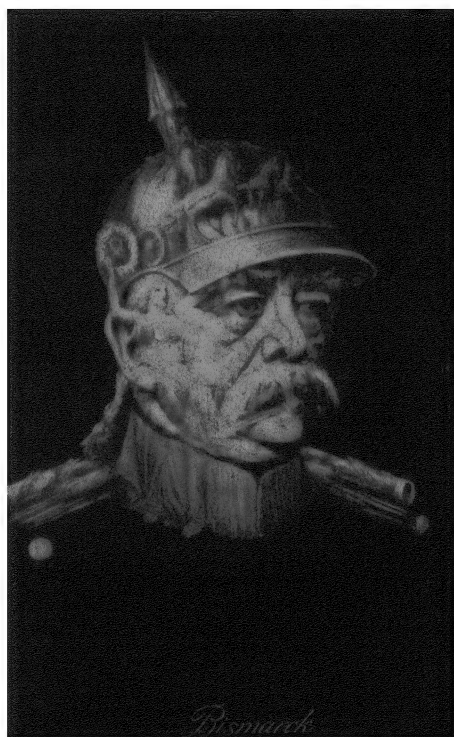
جے پور کے دیہاتی مدارس میں صرف ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو اہل دیہات کے حالات کے مطابق ہو اور انہیں پڑانا یا پڑھنا سکے۔ انہی مسلمانین کے علاوہ زراعت، صنعت و حرفت اور حفظانِ محنت کے قواعد و اصول کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ تجربے کے لئے مدرسوں میں باغ لگا دیئے گئے ہیں اور تعلیم کا وقت دیہاتی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر معین کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فصل کے وقت والدین اپنے لڑکوں سے بھی کام لے سکتے ہیں۔

ان مدرسے کے علاوہ دیہاتی استادوں کے لئے ٹریننگ سکول بھی قائم کئے گئے ہیں۔ ہر ایک ٹریننگ سکول میں باغ اور کھیت موجود ہیں۔ اور بہت سے ایسے مدرسے تیار کر لئے گئے ہیں جو طلبہ کو حفظانِ محنت اور کاؤٹنگ کی تعلیم کے علاوہ درزی، برصنی کا کام، کشیدہ، چمڑے کا کام، نو اڑ بننا، لوکری بنانا، کاتنا، جلد سازی، روشنائی بنانا اور ٹوپی بنانا وغیرہ بننا سکھاسکتے ہیں۔

سب سے زیادہ مسترت کام عام یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جا رہی ہے اور ان کے لئے بھی بہت سے مدرسے کھول دیئے گئے ہیں جن میں لڑکیاں بہت شوق سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

مدرسوں کے جے پور میں خاص طور سے ہدایت کی جاتی ہے کہ تعلیم کے ساتھ طلبہ کی اخلاقی ترقی کا بھی خیال رکھیں۔ اگر ریاست جے پور کی یہ کوششیں کامیاب ہوئیں اور کوئی وجہ نہیں کہ کامیاب نہ ہوں تو اس ریاست کا شمار ہندوستان کی بہترین ریاستوں میں ہونے لگے گا۔

حامد علی خاں



Glen?

بہارک

۱۸۱۵ء - ۱۸۱۵ء

آئیڈیو اور پوپولڈ فان بہارک کا نام تاریخ عالم میں اس لحاظ سے عید النظیر ہے کہ اس نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر کے ایک دوسرے شخص کو شہنشاہ بنادیا۔ ۱۸۱۵ء سے جرمنی میں جمہوری طرز حکومت کی خواہش میں لہر بھگی تھی، چنانچہ ۱۸۳۱ء میں فرانسیسی انقلاب کے بعد جرمنی میں بھی کچھ فسادات ہوئے۔ ۱۸۱۵ء میں جب فریڈرک ولیم چہارم پرنس شیا کے تخت پر بیٹھا تو عوام کو خیال پیدا ہو گیا کہ اب ہمیں نیابتی طرز حکومت حاصل ہو جائے گا۔ شاہ پرنس شیا کی حالت بہت بے چارگی کی تھی۔ باوجود ۱۸۳۱ء میں برلن میں بغاوت ہو گئی اور بادشاہ قلعہ میں نظر بند کر کے مجبور کیا گیا کہ حکومت کے اختیارات عوام کے نمائندوں کی ایک مجلس کے ہر ذرہ کرے۔ بہارک جو ایک جرمن جاگیر دار کا بیٹا تھا بڑا ذرہ درست شاہ پسند تھا۔ وہ اس وقت تک مختلف جمیٹیوں سے سیاسی امور میں دخل نہ چکا تھا۔ جب اس نے بادشاہ کو اس کم پرسی کے عالم میں دیکھا تو وہ ہمیں بدل کر کسی نہ کسی طرح محل میں داخل ہوا اور بادشاہ سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے بعد بہارک کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ نہایت کمزور آدمی ہے لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس بادشاہ کے باوجود بادشاہی قائم رہے گی۔

۱۸۱۵ء کے یوم گرامیں بہارک نے بہت محنت کی۔ اس نے شاہ پسندی کے خیالات کی نفرو شاعت کے لئے ایک اخبار جاری کیا اور انقلاب پسندی کے سیلاب کو روکنے کیلئے ایک مجلس قائم کی۔ ان کو کشنول کا متعجب ہو کر بہارک جرمن فوج کو برلن لاکر انقلاب پسند کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سلسلے میں عوام کو بلا حکومت میں کسی قدر نماندگی حاصل ہو گئی لیکن بہارک کے اثر سے عوام کے نمونہ اپنے حقوق کا قلعہ استعمال نہ کرتے تھے۔

جرمنی ان دنوں انٹلیس متحدہ ریاستوں پر مشتمل متحدہ ریاست کا الگ خود مختار بادشاہ تھا۔ اب بہارک کی شخصیت اتنی ہم ہو گئی تھی کہ ۱۸۱۵ء میں وہ ڈیٹ آف ڈیپنڈنٹ میں پرنس شیا کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہوا۔ مجلس جرمنی کی انٹلیس ریاستوں کے باہمی تعلقات اور دیگر مشترک امور کا فیصلہ کرتی تھی۔ تمام جرمن ریاستوں میں آسٹریا کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور آسٹریا کا نمائندہ ہی ہمیشہ ڈیٹ کا صدر ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں آسٹریا کی کوشش تھی کہ پرنس شیا کی ریاستی طاقت یا تو مٹ جائے یا کم از کم محدود ہو جائے۔ بہارک کو آسٹریا کا ریفر ونا قابل برداشت معلوم ہوتا تھا چنانچہ ایک دفعہ وہ مجلس متحدہ میں پرنس شیا کی اہم حیثیت اور ترقی تسلیم کرنے کے لئے آسٹریا کے نمائندے سے ڈول بھی ادا تھا۔

۱۸۱۵ء کے موسم خزاں میں شاہ پرنس شیا کا داغ چل گیا اور کچھ عرصے کے بعد وہ مر گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ولیم اول تخت حکومت پر بیٹھا۔ ولیم کے دل میں بہارک کی بہت قدر و منزلت تھی اور وہ اسے وزیر اعظم بنانا چاہتا تھا لیکن پارلیمنٹ کے باقی رکن بہارک کے دل میں کچھ درد تک حاصل ہے کہ نہ وہ اس کے سب جمہوریت پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے نہ آگاہان، اب اس جماعت کی مرکز پارلیمنٹ کے فیصلے بادشاہ حکومت سے دستبردار ہونے کا ایک اعلان سامنے رکھے بیٹھا ہوا نظر آیا۔ مگر اس اعلان پر متحفظ نہ تھے۔ بہارک جو ان دنوں اس میں تھا ان حالات سے بے خبر تھا۔ وہ خشک وقت پر برلن پہنچا اور کل میر جاکر اس نے اپنے اہل خانہ سے اعلان دستبرداری چاک کر دیا۔ سب وزیر اعظم فان ٹون نے جو بہارک کی قابلیت کا مدح تھا خود وزارت عظمیٰ کا قلمدان بہارک کے سپرد کیا اور ایک جدید وزارت مترب ہوئی مگر چارپا

بھی عبوریت پسند جماعت کی سرگرمیاں روزِ اندول ترقی پختیں لکھن کی نہ کسی طرح ہمارک کامیابی سناں کا مقابلہ کرتا رہا۔
 داخل ہمارک کی حکمت عملی یہ تھی کہ آئسٹریا کو رفتہ رفتہ باقی جرمن ریاستوں سے علیحدہ کر دے۔ آخر یکایک باوقعت بھی یہ کام پڑا اور آسٹریا کے دیہاں جنگ چھڑ گئی۔ پڑشیا کی فوجیں زیادہ باقاعدہ تربیت یافتہ اور بہتر طریقے سے مسلح تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا کو شکست پہنچی اور تمام شمالی مغربی جرمنی پڑشیا کے زیرِ قبضہ آ گیا۔ اس طرح مزید پچاس لاکھ افراد کی آبادی شاہِ پڑشیا کی عساریں شامل ہو گئی اور آسٹریا بالکل علیحدہ کر دیا گیا۔

اب ہمارک نے ایک نئی فوج جو جنِ سلفنت قائم کی جس کا صدر آسٹریا نہیں بلکہ پڑشیا تھا۔ تمام شمالی جرمن ریاستیں متحد ہو گئیں اور پڑشیا کے نام سے ایک مجلسِ حکومت قائم کی گئی۔ اب پڑشیا کی پارلیمنٹ بھی پرنس ہمارک سے خوش ہو گئی اور پارلیمنٹ کی طرف سے بعض بہانہ مل گیا۔ سلسلہ میں پرنس کا بادشاہ کوئی وارث تختِ جہیز نہ ملے۔ اس سلسلے میں جرمنی کے ایک شہزادہ کو بادشاہی قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ پرنسین ثالثہ شاہِ فرانس کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور بالآخر جمہوریت کی ناساھت کے بلوٹ پڑھت اہل لے کی اپنی فوجوں نے جرمنی کو ایک بہت ہی کم عمر خلیفہ یعنی فرانس کے ریان ایک فیملی کن جنک ہوئی جس نے اہلِ فرانس کے چھٹے چھوٹے اور فرانس کا ایسا مارتھ جرنی کے قبضہ میں لیا۔ اس اثنا میں ہمارک بارہ اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ تمام جرمن ریاستوں کو متحدہ کر کے پڑشیا کے زیرِ قبضہ کر لے۔ سلسلہ کے انگریز جب آخری ریاست بوریسے بھی ہمارک کا معاہدہ ہو چکا تو اتحاد کا یہ کام مکمل ہو گیا اور ہمارک کی کوششوں سے تمام ریاستیں ایک جرمن شہنشاہی قائم کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ چنانچہ ہمارک کے ایما پر خود شاہِ بوریس نے شاہِ ولیم اول کو جرمنی کی شہنشاہی قبول کرنے کیلئے دعوت دے کر بلوایا۔ اس دعوت نامے کا سواہی ہمارک نے خود تیار کیا تھا، جرمنی سلسلہ میں تمام جرمن بادشاہوں کی موجودگی میں قیصر ولیم اول کے شہنشاہِ جرمنی ہونے کا اعلان کیا گیا۔ گویا اب ہمارک نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کر لیا۔ بہت کم لوگ ایک سلفنت بنا سکتے ہیں لیکن سلفنت بنا کر بھی کھڑے کھڑے پروردگار دینا ایسا کام ہے جو دنیا میں غالباً صرف ہمارک ہی نے کیا۔ فرانس کی شکست اور جرمنی یا آسٹریا کے اتحاد کے بعد جرمنی پر ظلم اور پاب کی سب سے زبردست طاقت بن گیا۔

ہمارک اور اس کا آقا شہنشاہ ولیم اول ساتھ ساتھ جڑے ہوئے۔ آخر وہ اپنی جہت سے کو شہنشاہ کا انتقال ہو گیا۔ ولیم اول وہ ستون تھا جس پر پرنس ہمارک کی طاقت کی علامت تھا۔ سچی، نیا شہنشاہِ فرحان قیصر ولیم ثانی مطلق العنانی چاہتا تھا لیکن اسے ہر جگہ ہمارک کے اختیاراتِ عامل نظر آتے تھے۔ قیصر پر موصوت حال دیکھ کر تنگ آ گیا۔ آخر ایک دن فرحان شہنشاہ اور ولیم اول دونوں ٹرین چروں کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے نظر آئے۔ ہمارک نے انگریزی میں کہا: "ایلیفٹر، معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کا راستہ روک کر کھڑا ہوں؟" قیصر ولیم نے جواباً فرمایا: "ہمارک کے لئے یہ جواب کافی تھا۔ اس نے نصیحت چاہی اور اپنا استعفا لکھنے کے لئے کھڑے چلا گیا۔

مستعفی ہونے پر ہمارک اعزازِ اکرام کے ساتھ رخصت کیا گیا تاکہ اس کا استعفا دولتِ اور اور ضمانتِ ظاہر ہو لیکن بوڑھے وزیر کی اتنی سال گرہ کے موقع پر قیصر ولیم ثانی خود اسے بارگاہِ جہنم کے لئے شوکرنگ کر گیا اور دونوں میں صلح ہو گئی۔ آخری وقت تک ہمارک سیاسی طاقت کا سامانِ خاطر سے مطالعہ کرتا رہا اور بالآخر فرحان شہنشاہ میں ڈونا سے رخصت ہوا۔

ہمارک کو سیاسی خدمات پر ۱۸۹۶ء میں کاؤنٹ اور ۱۸۹۸ء میں پرنس کا خطاب ملا تھا۔

حامد علی خاں

شعرا اس کی تخلیق اور چینی شاعری

کسی غیر زبان کی شاعری پر تبصرو کرنا شاید اس وقت غیر معقول نہیں کہا جاسکتا جب مبصر کو اس زبان سے کما حقہ واقفیت ہو۔ مگر کسی ایسی زبان کی شاعری پر کچھ لکنا جس سے لکھنے والا مطلقاً ناواقف ہو کم از کم تعجب انگیز ضرور ہے۔ چینی شاعری سے میری آشنائی اس کے انگریزی تراجم کے ذریعہ سے ہے۔ ان تراجم در ترجمہ منظومات سے چند اصحا کو اور بھی الجھن ہوگی مگر میں اس کی حمایت میں ایک ہی غدر پیش کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ مشرقی نظریوں کی روشنی میں چینی نظموں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے خود چینی زبان کے عالم ہیں اور ترجمہ کی تمام مشکلات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا ترجمہ حتی الوسع اصل کے مطابق ہے اور ظاہری شوکت اور مستندوں سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اکثر واقعات اصل جذبہ کی کسک اور کیفیت کا مزہ آجاتا ہے۔ راجہ ہمدی علی خان بھی جن کے چند تراجم میں نے اس مضمون میں تہلیل کیے ہیں چینی شاعر کے احساسات کا احترام کرتے ہیں۔ اور تکلف اور تصنع کو کام میں نہیں لاتے۔ خود میں نے ترجمہ کرتے وقت حتی الوسع سادگی اور خلوص سے کام لیا ہے۔

چونکہ میں نے اپنا مضمون ترجموں کے ذکر سے شروع کیا ہے شاید یہ مناسب ہوگا کہ میں شعرا اور اس کے ترجمہ کے متعلق کچھ کہوں۔ اس لئے بھی کہ میری مثالیں ہر وقت آپ کو یہ بات یاد دلائیں گی کہ آخر میں کسی چینی نظم کا چرہ ہی آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ مگر اس سے پہلے لازم ہوگا کہ خود شعرا اور اس کی تخلیق کے متعلق کچھ کہا جائے۔ کیونکہ اس کو بیان سے اور پھر ترجمہ سے بہت گہری نسبت ہے۔

شاعری کی تعریف کرنا غالباً بے فائدہ ہے۔ کیونکہ اکثر اوقات شاعر کسی تعریف، یا قانون اور کلیہ کے جاننے کے بغیر ہی اپنے جذبات کو یا دنیا کی خوبصورتی کو الفاظ کی مدد سے کوئی حسین شکل دے کر، اشعار کی صورت میں جہاں سے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ وہ قدرتی طور پر عام لوگوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے، اس لئے اس کے جذبات اور اس کے احساسات عام لوگوں کی نسبت زیادہ گہرے، زیادہ رنگین اور متنوع ہوتے ہیں، الفاظ کی مدد سے وہ اپنے تجربہ زندگی کو حسین سے حسین اور مرنے سے مرنے قابل بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اسے شعبیوں اور استعاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یعنی اسے اپنے احساسات کو بیان کرنے کے لئے کسی مرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر خود کے نظام عمل کے

روزمرہ زندگی سے، عام سے کام اشیاء کی ضروری یا معنوی گنگت سے اپنے جذبات کو مستور کرتا ہے۔ ان سب باتوں کے لئے اسے وہ الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں جو مناسب سے مناسب طریق پر اس کی کیفیات کو بیان کر سکیں۔ اب یہ ایک اتفاق حسنہ ہے کہ اکثر اوقات جب ہم اپنی روزمرہ کی زبان کو بھی کسی جذبہ کے ماتحت استعمال کرتے ہیں تو الفاظ میں ایک ایسی ترتیب قائم ہو جاتی ہے۔ جس سے آواز اور پھر الفاظ میں ایک قسم کا زیر و بم یا رقص سا پیدا ہو جاتا ہے جس سے الفاظ اور بھی متحرک ہو جاتے ہیں۔ تقریباً ہر زبان میں یہ ملکہ قدرت موجود ہوتا ہے۔ شاعر کی زبان چونکہ نام تر جذباتی ہوتی ہے اس لئے شعر لکھتے وقت اس کے الفاظ میں خود ہی موسیقی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب اظہار کے لئے وہ کوشش اور تلاش کے بعد الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اور فقط وہی الفاظ، جو اس کا مطلب بدرجہ اتم ادا کر سکیں، تو ان الفاظ میں ایک خاص قسم کی جھلکی آ جاتی ہے۔ وہی الفاظ جو عام طور پر ہر شخص نہیں تو ہر تعظیم یافتہ شخص روزانہ کام میں لاتا ہے، جب کسی شاعر کے کلام میں استعمال ہوتے ہیں تو وہ ایک سے زیادہ معنی کے حامل ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب شعر کی تخلیق شاعر کے دماغ میں ہوتی ہے تو اس وقت ضروری نہیں کہ شاعر ایک ہی جذبہ کے اظہار کی کوشش کر رہا ہو اور چونکہ یوں بھی اس کا دماغی ماحول مختلف حسیات کی آماجگاہ بنا ہوتا ہے، اس لئے شاعر کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا بیان مبتلا جامع ہو سکے جو بھائے چنانچہ ہوتا ہے کہ الفاظ جب اس کے دماغ سے اُترتے ہیں تو وہ اپنے ذاتی معانی کے علاوہ شاعر کے وجدانی ماحول سے متاثر ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ایک شعر اکثر اوقات کئی ایک مطالب کا متحمل ہو سکتا ہے۔

اب ایک طرف شاعر کے تاثرات ہوتے ہیں اور دوسری طرف الفاظ۔ چونکہ شاعر صانع کی حیثیت میں اپنے جذباتی مواد سے اوصیالات کی مدد سے پڑھنے والے یا سننے والے کے لئے ایک جذباتی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اسے ایسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو خود اس کے حواس کا بدل بن سکے۔ شاعر اپنے حواس کے ذریعہ سے دُنیا کو اور زندگی کو محسوس کر چکا ہوتا ہے اور اس کے تاثرات انہی حواس لطیفہ کے ذریعہ سے اس کی دماغی دُنیا میں اُتر چکے ہوتے ہیں۔ مگر وہ یہ چاہتا ہے کہ یہ جذبات کسی طرح سامعین یا قارئین پر وہی اثر پیدا کر دیں جو خود اس پر ہوا تھا۔ فخر ہے کہ سامع سے بیان سے سامع کو یہ علم ہو سکتا ہے کہ شاعر نے ٹہل کو دیکھا ہے یا پھولوں کو، بلکہ ہم سب کئی دفعہ پھولوں کو دیکھ کر ان کے خوشنما رنگوں سے متاثر ہوئے ہوں گے، ہم نے یہ بھی کہا ہوگا "کیا خوب رنگ ہیں، کیا ہمارے با۔ اگرم ہلا انداز شاعرانہ ہے تو ہم نے یہ بھی کہہ دیا ہوگا کہ زمین جو بن پر ہے، کسی فلسفی نے یہ بھی خیال کیا ہوگا کہ پھول زمین کی ایک جلدانی حالت کا اظہار ہیں۔ غالب کہتا ہے: ہنہ نشہ رنگ سے ہے داشتہ گل۔ مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

شاعر کی نظر موجودات کی سطح سے گزر کر اس کی مابیت تک پہنچ جاتی ہے اور اس دُنیا میں اسے ہر چیز کی حقیقت ایک معلوم ہوتی ہے اسی لئے شاعر دُورُ افتادہ اور بظاہر اعلق چیزوں میں ایک نسبت محسوس کرتا ہے اور اس احساس کے ماتحت وہ اپنے ذاتی جذبہ کو نظامِ دہر کا ایک جزو تصور کرتے ہوئے دُنیا کی ہر چیز کے ذریعہ سے جس میں اسے کوئی نسبت دکھائی دے، واضح کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی احساس کی بنا پر وہ اپنے خیالات میں ایک ایسی قدرت پاتا ہے جس سے وہ ایک نئی دُنیا اور ایک نیا نظام تخلیق کر لیتا ہے۔ اس قدرت کو ہم تخلیق کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر ایک معمولی سے جذبہ کو ظاہر کرتے وقت بھی اپنے دائرہ احساسات میں عالمِ موجودات کی ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ دیکھ سکتا ہے اور ان میں ایک نسبت قائم کر دیتا ہے۔ جو ہم عام میں پہلے نہیں آتی ہوتی۔ مثلاً معشوق سے شکوہ سب ہی کرتے ہیں۔ غالب کہتا ہے۔

نفسِ بزمِ محیط بے خودی ہے تفاہماتے ساقی کا گلہ کیا

ایک عام سے جذبہ کو پہلے شاعر نے ذاتی طور پر محسوس کیا ہے، پھر اس کے دلکڑے میں اس نے کائنات کی ایک چیز سے نہیں ساری کائنات سے ہی مدد لی ہے۔ اس سے بیان میں جو زلائق پیدا ہو گیا ہے وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ شاعر اپنے جذبہ کو مؤثر اور پُر زور بنانے کی غرض سے تشبیہ اور استعارہ یعنی کائنات کی ہر ممکن چیز کی مدد و عونڈاتا ہے۔

اس طویل پیکر کے بعد بھی اگر شاعری کی تعریف درکار ہو تو یہ سمجھ لیجئے کہ شاعری سے میری مراد کسی جذباتی لہلہ یا چند جذباتی تاثرات کو نہ سب الفاظ کے ذریعہ اس طرح ظاہر کرنا ہے کہ اس موقع پر وہ الفاظ فقط معمولی الفاظ ہی نہ ہوں بلکہ ایک فضا اور کیفیت کے حامل ہوں۔ یوں تو ہر شخص ہی ردِ لیت و قافیہ لے کر، تھوڑی سی دماغی کاوش کے بعد کچھ نہ کچھ مترنم نہیں تو متوازی اور ہم وضع سطور لکھ سکتا ہے، سبیلے الفاظ بھی استعمال کر لینا زیادہ مشکل نہیں مگر وہ الفاظ اپنی مناسبت اور پیکر کیلئے پن کے علاوہ کسی جذبہ کو ظاہر کرنے کے متعل ہوسکتیں، ملنے ضرور مشکل ہوتے ہیں۔ اور پھر زبان میں الفاظ ضروری کسی خاص اثر اور فضا اور ہم رنگ خیالات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ گویا جب شاعر کسی لفظ کو استعمال کرتا ہے تو اس کے لونی معنوں کے علاوہ وہ اس لفظ کے جذباتی ماحول اور متعلقہ خیالات سے بھی اظہارِ مطلب میں مدد لیتا ہے۔ ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب شاعر کسی چیز یا انسان یا کیفیت سے متاثر ہوتا ہے تو ضروری نہیں کہ فوراً ہی اسے مناسب الفاظ بنے بنائے کو سمجھ جاتے ہیں۔ بہت دفعہ اسے خاص ذہنی کاوش کرنی پڑتی ہے۔ پھر حس ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں چھوٹے چھوٹے اثرات اور حیات ہر وقت نقش ہوتے رہتے ہیں، جس وقت کوئی زبردست تجربہ یا احساس اسے اظہار کی تحریک کرتا ہے تو یہ عام اثرات اسے نئے احساس کی تعمیر اور تخلیق میں لاشعوری طور پر مدد دیتے ہیں۔ یہ شاعر کا جذباتی نظر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر شعر علاوہ لغوی معانی اور ذاتی احساس کے ایک خاص فضا کا حامل ہوتا ہے، جو شاعر کی زندگی

ماحول اور حالات کا پرتو لئے ہوتی ہے۔

مگر ترجمہ میں جو الفاظ استعمال ہو تھیں ان کی تاریخ، شعری اثر، اور متعلقہ خیالات اور فضا اور ہوتی ہے۔ اسی لئے اگر مترجم صحیح معنوں میں صاحب بصیرت نہ ہو تو ترجمہ کے الفاظ اور ہی اثر پیدا کر دیتے ہیں جو بعض دفعہ اہلی فضا اور احساس کے منافی نہیں تو اس سے مختلف ضرور ہوتا ہے۔ مگر جیسا کہ میں اوپر ذکر کر آیا ہوں آنکھروں کی اور ہمدی صاحب جن کے تراجم سے میں نے مدد لی ہے ترجمہ کرتے وقت ایسے الفاظ چنتے ہیں جو نظر کو یا ذہن کو اپنی طرف نہیں کھینچتے اور دونوں حضرات ترجمہ میں اسی کفایت کے کام لیتے ہیں جن سے چینی شاعر۔ میں نے اپنے تراجم میں بھی انہیں امور کو ملحوظ رکھا ہے اور چونکہ شاعری کی نوع، شاعر کے جذبات ہیں اس لئے ترجمہ میں بھی اُس کی آواز ہم تک آتی رہتی ہے۔

میرا ارادہ چینی شاعری کی تاریخ بیان کرنا یا مختلف شعراء کا ذکر کرنا نہیں۔ یہ سب کچھ باسانی کسی کتاب سے لیا جاسکتا تھا۔ اور اس سے آپ حضرات کی معلومات میں کوئی قابل قدر اضافہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون کے لکھنے کا محرک یہ خیال تھا کہ چینی شعرا اپنے افکار اور جذبات کو غیر مبالغہ اور فضول استعارات کے بعض دفعہ کسی خیالی تصویر کی مدد سے ساؤ الفاظ میں بہت اختصار کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے خلاف ہمارے شعور عام طور پر رنگین الفاظ اور خواب آور اور خارا کو تراکیب کے بہت دلدادہ ہیں اور بعض دفعہ تو وہ کسی خاص جذبہ کے بجائے ایک مبہوم اور مبہم جذباتی دھند کو فقط قوت بیان سے نظم کی صورت میں تبدیل کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا اچھا جو اگر وہ دوسرے ملکوں کی شاعری کو خواہ وہ تراجم میں ہی مل سکے، پڑھیں اور ان سے اپنے جذباتی نشوونما میں مدد لے سکیں۔ اسی خیال کو مد نظر رکھ کر اپنے تاثرات کی بنا پر یہ چھوٹا سا مقالہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ چینی شاعر کو چینی مصوٰف کی طرح غیر ضروری اذکار اور جزئیات کا شوق نہیں۔ وہ الفاظ کے مختلف مطالب کے معرب نہیں ہوتا اور اپنا خیال صریح اور سادہ بلکہ تقریباً ”عریاں“ انداز میں بیان کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نظم کو لیجئے۔ عنوان تنہائی ہے :-

شام کا نہری شوب گاہوں کے بازار پر چمک رہا ہے
تنہائی میں میرے خیالات کس قدر غمناک ہو جاتے ہیں
سڑک پر مجھے کوئی مسافر نہیں ملتا

صرف غمراں کی اُداس ہوا گھیتوں پر سے ہوتی ہوئی اس طرف آ رہی ہے۔

پہلی سطر میں شاعر نے نہایت اختصار کے ساتھ لیکن واضح طور پر ایک سینہ کو ہمارے دماغ میں قائم کر دیا ہے۔ شام کا نہری شوب

گاؤں کا بازار اور بن - جزئیات ہمارے تخیل پر چھوڑ دی گئی ہیں - دوسری سطح میں اس کے احساس کا سادہ سا اظہار ہے تیسری میں بالواسطہ اور اشارۃً یہ کہا گیا ہے کہ اس وقت سافر بھی شاعر کے لئے ہم نشین اور ہم دم ثابت ہوتا - چوتھی سطح میں فطرت کی طرف توجہ دلا کے موسم کے حزن اور اراد گرد کے سیدھا علاقہ کا اپنی تنہائی سے مقابلہ کر کے نظم کو اور بھی مؤثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے - اس چھوٹی سی نظم میں نہ استعارہ ہے نہ کوئی تلمیح نہ کوئی صنعت - شاعر کا بیان روشن اور یقینی ہے - اس نے لفظی آرائش سے کام نہیں لیا - یا اختصار کا ایک اور نمونہ لیجئے عنوان جُبلنی سمجھ لیجئے - نظم ہے :-

میرا پلنگ اتنا خالی ہے کہ میں رات کو جاگ جاگ اُٹھتا ہوں

رفتہ رفتہ سردی بڑھتی ہے رات کی ہوا چلنے لگتی ہے

وہ پردوں میں اپنی سرسراہٹ پیدا کرتی ہے جیسے سمندر کی موجوں کی آواز

کاش یہ موجیں ہر تین اور مجھے تنہا سے پاس واپس لے جاتیں -

(شدشاہین - دہلی - چھٹی صدی ب م)

مگر قبل اس کے کہ میں چینی شاعری کے متعلق تفصیل سے کچھ کہہ سکوں دو ایک اور باتوں کے متعلق ذکر کر دینا شاید بے محل نہ ہوگا - ہر زبان اور ادب کی روایات الگ ہوتی ہیں - مثلاً انگریزی شاعری میں کئی اساتذہ بہت مقبول ہیں مگر جس صنف کے ساتھ شروع ہی سے سب شاعروں کو لگاؤ رہا ہے وہ لیرک ہے - لیرک سے مراد ایسی نظم ہوتی ہے جس میں شاعر اپنے ذاتی جذبات کو خواہ وہ گریز یا پے گریز یا نازک یا مہموم سے مہموم احساس پر مبنی ہوں اور خواہ وہ کسی عشق یا جامع یا وسیع جذبہ سے متعلق رکھتے ہوں - بلاواسطہ اور مؤثر طریق سے بیان کر دے - اس میں شاعر عام طور پر ایک جذبہ کو داخلی پہلو سے لے کر اسے وسعت دے دیتا ہے یا کبھی دفعہ شاعر اس جذبہ کو جامع نقطہ نگاہ سے اپنی حالت کی طرف، یا اپنی ذات تک محدود کر دیتا ہے - ہر دو حالتوں میں شاعر اپنے جذبہ کو ظاہر کرنے میں دنیا کی ہر چیز جس میں اسے اپنی حالت سے کوئی شائبہ دکھائی دے، مدد لے لیتا ہے - بلکہ بعض دفعہ تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبہ یا درو یا احساس کو مرنی یا محسوس اشیاء بلکہ دنیا یا تمام فطرت کے محسوسات کے ذریعہ سے بیان کر رہا ہے - اس کے لئے فطرت کوئی علیحدہ چیز نہیں - وہ خود فطرت کا حصہ ہے - چنانچہ فطرت کی اشکال کا احساس اسے ہر وقت رہتا ہے - بائرن کے ایک مشہور لیرک کی پہلی سطح کھلیں

طرح شروع ہوتی ہے :-

اس کے حن میں نکھرے ہوئے آسمانوں کی دکشی پنہاں ہے

اس کا حن تاروں بھری راتوں کا سا ہے

تجربات جو ہم سب پر یکساں طور پر وارد ہوتے ہیں یعنی جو متفقہانہ زندگی ہیں۔ اسی لئے ہمارے شاعران نفیاتی اور جذباتی انکشافات کی جو مشابہت حیات انہیں سکھاتے ہیں، تعمیم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جہاں حفظہ کا یہ شعر ذاتی سوز سے بھرا ہوا ہے کہ

رازِ بق دو جہاں کے غزانوں کو کیا ہوا
میتا ہے رنج وہ بھی کسی کا دیا ہوا

وہاں ایسے شعر بھی شاذ نہیں جہاں شاعر کا نقطہ نگاہ تمام جنس آدم کو شامل ہے:۔ مثلاً

غالب: غم اگرچہ جہاں گسل ہے پر پھیں کہاں کزل ہے
علم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

یا درد: دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری شاعری میں شاعر اپنی ذات اور اپنے جذبات میں منہمک رہتا ہے یا زندگی اور کاروائی کے ان حالات میں جن کا اثر ہماری جذباتی زندگی پر پڑتا ہے چنانچہ وہ اپنے آنسوؤں اور اپنی ہنسی کی کیفیت میں اس سچائی سے، کہ ان کا اثر وہی ہو جو شاعر کے اپنے دل میں تھا، مترنم الفاظ کے ذریعہ سے دیتا رہتا ہے۔ یا وہ دینے انسان کا عزن اور سرت ہم پر نکشت کر رہتا ہے۔ مگر تعمیمی نقطہ نگاہ سے دیکھنا اس کے خمیر میں خلل ہے۔ یہ وسعت نظر مشرق کی بہت سی شاعری میں ہے۔

مگر چینی شاعری میں اگرچہ چینی لوگ فطرۃً کار پسند واقع ہوئے ہیں تعمیمی نقطہ نگاہ کم پایا جاتا ہے۔ چینی شاعر نہ انگریز کی طرح فطرت کے مظاہر کی تشبیہات سے اور نہ اپنے جذبات اور فطرت کے گونا گوں مظاہر میں یکسانیت کی مثالوں سے اور نہ اردو شاعر کی طرح کلیتہً بلکہ گرد و پیش کے منظر کو اپنے احساس کے لئے بطور پس منظر کے استعمال کرتے ہوئے ایسی ہی جمیدگی یا جذباتی وسعت کے، صراحت اور نہایت اختصار کے ساتھ اپنی کیفیات کا اظہار کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ نظم لیجئے:۔

موسمِ خزاں کی ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی کہاں سے آتی ہے؛
اور تفریق گزرتے ہوئے بطوں کے جھنڈ کہاں سے آئے ہیں؛

آہ! جب موسمِ سوا کی ہوا میں پیلے لگیں گی

پہلے پہل، تنہا مسافر ہی ان کی آواز کو سنے گا۔

ہر جگہ جاگ

یہاں شاعر نے استنباطی انداز میں اور فطرت خزاں کی ہوا اور بطوں کے جھنڈ، دو جگہوں سے ایک فضا پیش نظر کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر آخری سطح میں پہلے پہل کے لفظ سے ساری نظم میں ایک عجیب سا درد پیدا کر دیا ہے۔ یا اس نظم کو پہلے جو پہلی صدی قبل مسیح میں کسی گننام شاعر نے لکھی تھی:۔

سبز، بہت سبز

دریا کے کنارے اُگنے والی گھاس
گھنے، گھنے، بہت گھنے

بارغ میں لگے ہوئے بید کے درخت
اُداس، بہت اُداس

محل میں رہنے والی خاتون
سفید بہت سفید

کھڑکی میں بیٹھنے والی
حسین بہت حسین

اس کا پھول سا گلابی چہرہ
نازک بہت نازک

زر درباہتہ جو وہ باہر نکالتی ہے +
وہ کبھی ایک رقاصہ تھی

اب ایک سیلائی شخص کی بیوی ہے
سیلائی امیر چلا گیا، مگر واپس نہ آیا +

اکہا ایک جوڑے پننگ پر سونا کتنا مشکل ہے؛

{ انیس قدیم چینی نغیں }
{ آؤں صدی قبل مسیح }

اس میں بھی دریا، گھاس، بید کے درخت، محل فقط پس منظر کا کام دیتے ہیں، پیش نظر ایک ننگیں عورت کا دکھ اور اُس کی
حسرت ناک جوانی ہے۔ یا ایک اونٹن لہجے پر شہنشاہ دو۔ ٹی نے دوسری صدی قبل مسیح میں اپنی محبوبہ کی وفات پر لکھی تھی ۱۔
اس کے ریشمی لٹگے کی آواز اب نہیں آتی

مرمر میں فرش پر گرد جم گئی ہے

اس کا خالی کمرہ سرد اور خوش ہے

مُرجھائے ہوئے پتے دروازوں کے باہر آکر ڈھیر ہو رہے ہیں

اس حسین محبوبہ کی یاد میں دلگیر

میں کس طرح اپنے دکھ بھرے دل کو آرام کے لئے کہوں؛

اس سے زیادہ مختصر اور خوش پیرایہ اور کیا ہو سکتا ہے ؟

ایک اور بات جو چینی شاعری میں قابل ذکر ہے وہ شاعر کا چھوٹی چھوٹی چیزیات سے ایک سماں باندھ دینے کا کمال ہے۔ یہ قوت تخلیق چینی شاعری کا خاص جوہر ہے۔ شاعر دو تین اشارات سے ایک کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا بیان مفصل یا مکمل ہو۔ وہ یہی چاہتا ہے کہ جذبہ کی کیبل پر دھننے والے کا دل اور اس کے تاثرات کریں۔ عام طور پر چینی مصوّر کئی دو تین خطوط سے اور رنگ کے ہلکے یا گہرے دو تین دھبوں سے ایک تصویر وضع کر لیتا ہے۔ مثلاً چینی یا جاپانی شاعری اور مصوّر میں بہت مماثلت ہے۔ خصوصیت کے چونکہ جاپانی مصوّر کا آغاز چینی تاثرات سے ہوتا ہے۔ اس لئے دونوں کی مصوّر میں بہت ہی مشابہت ہے۔ مجھے ایک بہت مشہور جاپانی مصوّر ہانسو کی ایک تصویر یاد آتی ہے۔ اس میں مصوّر نے دو خدیہ اور باریک سیاہ خطوط سے، جن میں کہیں کہیں ذرات کی طرح کچھ باریک نقطے پڑے ہوئے ہیں، دو ایک نیل کا خاکہ کھینچا ہے۔ دونوں خطوں کے درمیان کچھ عجیب ہلکا سا نیلا رنگ کر دیا ہے۔ اس نئی زمین میں کہیں کہیں باریک عودی خطوط سے سر کندوں اور کچھ سیاہ دھبوں سے درخوں کا اندازہ دے دیا ہے اور بس۔ تصویر کو دیکھ کر ہرگز یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی کمی یا کوئی خامی ہے۔ تصویر مکمل ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان دُور سے نظر آتا ہوا ایک دلغریب زیر آب قطعہ ہے جس میں کچھ سر کندے اُگ رہے ہیں اور جس کے کناروں پر دھت کھڑے ہیں۔ اسی طرح چینی شاعر دو ایک باتوں سے ایک منظر قائم کر دیتا ہے اور ایک اشارہ کے ذریعہ سے ایک مکمل جذبہ اور اس کے متعلقہ احساسات دماغ میں پیدا کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر دو نظمیں ملاحظہ کیجئے:-

وہ دروازہ مفید پانیوں کے سامنے کھلتا تھا

کڑھی کے پل کے قریب

یہاں ایک جوان عورت تہی ہتی

تہما، بغیر کسی عاشق کے

چنگ۔ سی

اور :-

میری پردیش پتھر کے قلعے میں ہوئی

میری کھڑکی قلعے کے مینار کی طرف کھلتی تھی

مجھے قلعے میں خوفِ صورتِ نوجوان نظر آتے

جب وہ اندر یا باہر جاتے تو مجھے ہاتھوں سے اشارہ کیا کرتے

سنگ چ
لچنی صدی

ان دونوں نظموں میں شاعر نے معذور کے انداز کو استعمال کرتے ہوئے دو ایک نقش سے ایک منظر قائم کر کے ایک سادہ بیان کے ذریعہ پہلی نظم میں ایک عورت کے رائگاں شباب کی مکمل تصویر کھینچی ہے۔ دوسری میں اشارۃً ایک جوان لڑکی کی بے کیف زندگی اور لاحقہ حاصل ہستیاق کو پوری طرح ہم پر روش کر دیا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ یہ اظہار خشک اور بے رنگ نہیں، بلکہ ان میں حقیقی شاعری کے تمام اوصاف درد و گداز، صداقت، عمق، جذباتی ماحول سب تاثرات موجود ہیں۔ البتہ ایک مصنف زیادہ ہے اور وہ اس کفایت اور اختصار سے ایک مکمل کیفیت کا اظہار ہے۔

ہمارے ہاں خواہ تغزل کو لغوی خواہ اصطلاحی معنوں میں لیا جائے، خواہ ادبی روایات کی رو سے اسے دیکھا جائے اس کی بنا محبت اور عشق پر ہے۔ مگر چینی شاعری تمام تر عشقیہ نہیں۔ اس میں ایسا ہی محترم جذبہ دوستی بھی ہے۔ دوستوں کے فراق میں وہ اتنے ہی محزون و ملول ہوتے ہیں جتنے ہمارے ہاں لوگ عشق میں۔ اگرچہ ہمارے شعرا نے غزل کو وہ وسعت دی ہے کہ اس میں وہ اپنے جذبات سے لے کر تمام کائنات کی حقیقت تک کو ایک ہی نازل میں بیان کر جاتے ہیں مثلاً غالب کی ایک غزل کے فقط چار شعر لیجئے:۔

نالہ پابند نے نہیں ہے	فریاد کی کوئی نے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے	ہر چھ سنی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھانی موت فریب ہستی	ہر چہ کمیں کہ ہے نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہو	اُردی جو نہ تو دے نہیں ہے

ان اشعار میں سوائے ایک خاص جذباتی فضا کے کوئی ربط نہیں ہے۔ اور ان میں شاعر نے ہستی، رُوح، کائنات اور دہو سبکی، خوشی، غم جیسے دقیق لغویاتی مسائل کا علمی نقطہ نگاہ سے نہیں، جذباتی پہلو سے ادراک کیا ہے۔ ان اشعار میں عقلی ادراک اور جذباتی احساس کا اس طور پر امتزاج ہے کہ حقیقت اور تاثر نے اشعار کو بہت بلند بنادیا ہے۔ بخلاف اس کے چینی نظموں میں غراہ وہ حسنِ فطرت کے متعلق ہوں، خواہ وہ دوستی، جذباتی، زندگی، شہرت یا بے ثباتی کے تاثرات کا اظہار ہوں، وحدتِ مضمون ضرور ملحوظ رکھی جائے گی۔ یہی بات انگریزی یا مغربی لڑک میں بھی پائی جاتی ہے۔

چینی شاعر ایک وقت میں فقط ایک مضمون یا جذبے یا احساس پر قلم اٹھاتا ہے۔ اور اس میں بھی اسے تزیین و زخمت کا بہت خیال رہتا ہے۔ وہ عام طور پر مضمون کو پوری طرح سے ادا نہیں کرتا بلکہ مقصود سے مقصودے الفاظ میں اور اگر ہو سکے تو اشارۃً اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اور ہمارے تخیل میں ایک مکمل جذباتی فضا اور اثر پیدا کرنے کے لئے فقط ان الفاظ کو استعمال کرتا ہے، جن سے وہ جذبہ بہتر سے بہتر طریق پر مرگیا اپنی تمام کیفیات کے ساتھ پڑھنے والے کو محسوس ہو سکے مثلاً

ایک نظم ملاحظہ کیجئے۔ لئو ژن نامی ایک جرنیل نے اپنی بیوی کو کسی اور لڑکی کے عشق میں پڑ کر اس کے میکے بھیج دیا۔ اس کی بیوی نے یہ نظم کہی :-

ہلتا رہا ہمارے بستر کے سامنے لگے ہسے پردے، ہلتا رہا !
میں نے تجھے اس لئے لٹکایا تھا کہ تُو سو بچ کی روشنی کو ہمارے پاس نہ آنے دیگا
میں تجھے اپنے ساتھ لائی۔ جب میں اپنے باپ کے گھر سے آئی تھی
اب میں تجھے واپس وہیں لے جا رہی ہوں
میں تجھے ترک کر دوں گی اور صندوق میں سیدھا لٹا دوں گی
پڑے! کیا میں تجھے پھر کبھی نکالوں گی؟

(تیسری صدی)

یا پہلی صدی قبل مسیح کی یہ نظم لیجئے :-

میرے محبوب کا گھر ہے
بڑے سمندر کے جنوب میں
میں اس کے لئے کیا تحفہ بھیجوں؟
دو موتی اور سیپ کی بنی ہوئی لنگھی
میں سنگِ سبز کے ڈبے میں یہ چیزیں اسے بھیجوں گی۔
وہ مجھے بتاتے ہیں، میرا محبوب با وفا نہیں
وہ کہتے ہیں اس نے میرا ڈبہ زمین پر دے مارا
زمین پر دے مارا اور اسے چلا دیا
اور اس کی راکھ ہواؤں میں کھیر رہی
اس دن سے لے کر قیامت تک
مجھے اس کا خیال نہ کرنا ہوگا!
پھر کبھی اسے یاد نہ کرنا ہوگا!
مُرخِ بانگ دے رہے ہیں۔
کُتے بھونک رہے ہیں۔

میرے بھائی اور میری بھانج کو سب کچھ جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔

غزال کی ہوا چل رہی ہے

صبح کی ہوا ٹھنڈی سانسیں لے رہی ہے

ایک لمحہ میں سورج مشرق سے نکل آئے گا

اور پھر اسے بھی معلوم ہو جائے گا!

ایک توحیدِ راز کی کے لطیف جذبات کو کس نزاکت سے بیان کیا ہے!

یا ایک اور نظم دیکھئے :-

غزال کی راقول میں حبس چلے گا جاڑا ہوتا ہے

میں ہاتھ میں بربط لے باہر جا کر آوارہ پھرنے لگتا ہوں

اس وقت میرا دل تنہا سی یا د میں رہتا ہے

لوگ سمجھتے ہیں، یہ بربط کے نفول کی آواز ہے!

جب صنوبر کا پھل گر گر کر ہیاڑیوں پر بکھرتا ہے

کیا تُم میرے خوابوں کو جگا رہی ہوتی ہو؟

لی۔ پو

ان تینوں نظموں میں مختلف وقتوں کے شاعروں نے ایک ہی انداز میں اپنے اپنے جذبہ کو مختصر سے مختصر طریقہ پر بھجائے کی کوشش کی ہے۔ کسی کا بیانِ منتقل نہیں، کسی نے جذبات کو استعمال نہیں کیا اور ہر ایک نے ہمارے ہی تخیل کی مدد سے ہمارے دل و دماغ میں اپنی نظم کی تکمیل کر دی ہے۔ یہ بے شاعری کا کمال کہ شاعر دو غیر زبانوں کے قالب میں ڈھل کر بھی اپنی آواز اور اپنا جذبہ دل بہت تک پہنچا دیتا ہے۔

چینی شاعر فطرت نگاری میں بھی اسی باہمت اور سادگی سے کام لیتا ہے۔ کسی منظر کا نقشہ لیجئے۔ محض بھیکے الفاظ ہی سے کسی سین کا خاکہ نہیں کھینچا ہوتا، بلکہ پُر اثر الفاظ سے اس نقش میں جان ڈالی ہوتی ہے۔ مثلاً شنشہ یا ناگ۔ تی نے ساتویں صدی عیسوی میں، جب کہ چینی شاعری اپنے پہلے عروج کے دن پورے کر چکی تھی، یہ نظم لکھی تھی۔

شام کا وقت ہے اور دریا کی سطح ہموار اور نیم جان ہو چکی ہے۔

پتھوروں کے دل فریب نظارے اب بھی دکھائی دے رہے ہیں

یہ ایک ایک لہر جانند کو بہا لے جاتی ہے :-

اور ستارے کانپتے رہ جاتے ہیں۔

(بانگ قی)

یا ایک اور نظم لکھیے:-

ایک کچھو کنول کے پھول پر بیٹھا آرام کر رہا تھا
ایک پرندہ نے کے پودوں اور جھاڑیوں میں گھونسا بنا رہا تھا
کسی طالع کی حسین لڑکی، چھوٹے سے ڈونگے میں بیٹھی ٹیکر کر رہی تھی
جس کے گیت تیز بہتے ہوئے پانی پر دفنا میں غلبہ ہو رہے تھے۔
پہلی نظم میں شاعر نے فطرت کو خارجی پہلو سے محسوس کیا ہے۔ دوسری میں ہر چیز اس کے دل میں پیوست ہو کر اور اس کی
داغی کیفیت سے لبریز ہو کر ظاہر ہوتی ہے۔ مگر دونوں کس قدر شگفتا ہیں! یا ان دُکھوں کو دیکھئے۔

میں اپنے وطن کو واپس آیا
عمر نے میری کمر جھکا دی تھی
بال چاندی کی طرح سفید ہو چکے تھے
لیکن میرے خیالات اب بھی وہی تھے
افسوس میرے ہی بچوں نے مجھے نہ پہچانا
منکرا کر پوچھنے لگے

ہوج: چانگ

"اور پریشی تم کہاں سے آئے ہو؟"

دوسری نظم یہ ہے:-

تمہارے گھوڑے اور گاڑیاں چلی گئی ہیں
اور میں منہم ہوں
اُس محبت کے لئے جسے میں کبھی نہیں بھول سکتی
دُور دراز ملکوں میں بسنے والے مسافر!
کاش میں تمہارا سایہ ہوتی
اگرچہ کبھی بادل کاسایہ مجھے تم سے دُور کر دیتا
لیکن سٹیج کی تیز روشنی میں تو میں تمہارے ساتھ ہوتی!

کس قدر سادگی سے، کتنے لطیف انداز میں، کتنے صاف الفاظ کے ذریعے سے شاعر نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے! دونوں نظموں میں جذباتی کثافت کا شائبہ تک نہیں پہلی نظم میں درد ہے رقت نہیں، دوسری میں نزاکت جتنی ہے مگر ہندال نہیں۔ دوسری نظم کو لکھتے ہوئے مجھے پنجابی زبان کے ایک دلکش گیت کا پہلا لہول "یاد آیا ہے۔ یہ گیت بھی کسی عورت ہی کا کہا ہوا ہے۔ جذباتی کے دن قریب ہیں۔ کتنی ہے اے

جے کو چلیوں چپا کر سی بیٹھی ہرل دیوال دھول
شالا نکھ وٹے اوہ دیسڑا جتھے سافر توں!

طوالت کے غوت سے میں لمبی نظموں کی مثالیں نہیں دے سکا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ مذکور بالا سطور سے سب حضرات کو چینی شاعری سے کچھ دلچسپی ہوگئی ہوگی۔ میرے خیال میں فنی لحاظ سے چینی شاعری دنیا کی مہذب ترین شاعری میں سے ہے۔ لفظ مہذب سے میری مراد یہ ہے کہ چینی شاعر اپنے خیال میں کفایت اور ضبط سے کام لے کر فقط اتنا ہی لکھتا ہے جس سے ایک ذہین سامع یا قاری کا دل، دماغ اور تخیل اس کے جذبہ کی ماہیت اور کیفیت کو پوری طرح سمجھ لے۔ افراط اور غلو، دونوں اس شاعری میں آپ کو نہیں ملیں گے۔ سادہ تشبیہات کہیں کہیں استعمال ہوتی ہیں مگر دیگر صنائع و بدائع سے کامل احتراز ہوتا ہے۔ چینی شاعر فطرت کی طرح کبھی بے غیر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں کے شاعر، مگر مغربوں کی طرح وہ فطرت میں کسی قسم کی رقت کا متلاشی بھی نہیں ہوتا۔ فطرت اس کے لئے کوئی غیر یا اجنبی چیز نہیں۔ وہ اس کی زندگی کا ایک جزو ہے، اسی لئے وہ اس کے ہر جذبہ میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

ایک اور بات جس کے متعلق میں پہلے بھی اشارہ کر آیا ہوں، قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ عشق کے علاوہ دوستی کا جذبہ، چینی شاعری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً ایک نظم ملاحظہ فرمائیے، پہلی مدی قبل سچ میں لکھی گئی تھی۔

شنگ یا!

یہیں مٹا را دوست بننا چاہتا ہوں
ہمیشہ ہمیش کے لئے، بغیر شکست اور زوال کے
جب سب پہاڑیاں میدان بن جائیں گی
اور رب دریا کو کھ جائیں گے
اور جب سردیوں میں بادل چمکنے اور گر جنے لگیں گے
اور گہریوں میں بارشیں اور برفباریاں ہوں گی

جب آسمان اور زمین مل جائیں گے

(پہلی صدی قبل مسیح،

اس وقت سے پہلے میں تم سے جدا نہیں ہوں گا

زندگی کی کشاکش آدمی کو کمین سے کہیں لے جاتی ہے، اس لئے دوستوں کی جذباتی اور ملاقات کے تاثرات سے

چینی شاعری کو کوئی دور خالی نہیں۔ اس کی بڑی وجہ چین کا تہذیبی ہے۔ جہاں مردوں کا نصف نازک سے تعلق محض ادبی

زندگی تک محدود تھا۔ اس لئے ان کے تعلقات خواہ وہ سماجی ہوں، خواہ علمی اور ادبی، مردوں ہی سے ہوتے تھے اور ان

تعلقات کی وہ لوگ بہت قدر کرتے تھے۔ مگر اس سے یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ چینی شاعری کا رجحان اسی طرف رہا ہے۔

چینی شاعر دنیا اور فطرت کی ہر بلعورت چیز سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کی حسین سے حسین تشکیل کر دیتا ہے۔ صداقت اور

سادگی اس کے کلام کا جوہر ہیں۔ اس کے احساسات سے پڑھنے والے کا دل ٹنگتا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک آخری نظم ملاحظہ

فرمائیے۔ ٹو مانگ جو ایک جوان شاعر ہیامی کی وجہ سے درباری ملازمت علیحدہ ہو گیا۔ ایک دن چو۔ وین چن ایک

امیر کی لڑکی نے اُسے اپنے باپ کے ہاں کسی تقریب پر شہر گاتے سنا۔ اسی رات وہ دونوں وہاں سے بھاگ نکلے، اور

انہوں نے کہیں اور جا کر ایک چھوٹی سی شراب کی دکان کھول لی۔ کچھ عرصہ کے بعد سنگ جو اپنے شہروں کی وجہ سے

مشہور ہو گیا اور اسے دولت کی بوس ہو گئی۔ وہ اپنی نظموں کو امیر زادیوں کے پاس بیچ دیتا، آخر ایک دن اس نے شہر

”مونگ“ کی چند خواتین کو تنہا ہی بچھڑا کر اسے ایک خوبصورت کنیہ حاصل ہو جائے۔ اس بات سے دل برداشتہ ہو کر

اس کی سابق معشوقہ چو وین چن نے یہ نظم لکھی۔ یہ واقعہ پہلی صدی قبل مسیح کا ہے۔ اس کا عنوان ہے ”سین باؤں کا گیت“۔

ہماری محبت پاک تھی

جیسی پہاڑوں پر بچھی ہوئی برف

اس چاند کی طسج سفید

جو بادلوں سے گھرا ہو +

لوگ مجھ سے کہتے ہیں

تمہارا دل اب میرا نہیں رہا

اسی لئے میں آئی ہوں

کہ ہم اس رشتہ کو توڑ دیں +

آج ہم شراب کا ایک پیالہ اکٹھے نہیں گے

کل ہم بھدا ہو جائیں گے
 نہر کے پاس
 اس کے کنارے کنا سے چلتے ہوئے
 جہاں اس کی در شاخیں ہو جاتی ہیں۔
 مشرق اور مغرب کی طرف +
 افسوس ! افسوس !
 صد افسوس !
 اسی طرح لڑکی کے لئے ردنا ہوتا ہے
 جب اس کی شادی ہو جائے
 اور اسے ایسا سچا مرد نہ ملے
 جو اس کے ساتھ رہے

پتہ: دین پٹن

یہاں تک کہ اس کے بال سفید ہو جائیں

آخر میں فقط دو ایک جملے اور کہوں گا۔ ہمارے نوجوان شعراء کے احساسات میں، شاید ہماری معاشرت یا ہماری زندگی میں، اچھے مواقع کی کمی کی وجہ سے یا شاید حسرت و یاس کی بروقت کے سبب ایک قسم کا جمود پیدا ہو جاتا ہے جسے وہ رنگین اور خسار آگئیں الفاظ سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ اکثر اوقات وہ اپنے الفاظ کی رعنائی یا اشعار کے صوری حسن سے خود ہی مرعوب ہو جاتے ہیں، برعکس اس کے چینی شاعر احساس کی سادگی سے، اگر وہ کسی دلی کیفیت کا نتیجہ ہو، نہیں شرماتا۔ اس لئے اس کا بیان بھی سادہ، بے حلف اور نکھرا ہوا ہوتا ہے۔ اچھا ہو، اگر چینی شاعر کی یہ صفت ہمارے نوجوان شعراء میں آجائے۔

سید فیاض محمود

مقبرہ شیخ چلی پر

مشہور تاریخی مقام کو روڈ پتھر میں ایک مقبرہ ہے جو شیخ چلی کے مقبرے کے نام سے مشہور ہے میں نے یہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ آیا یہ شیخ چلی وہی بزرگ ہیں جن کا نام طاعت و طرافت میں مندرج ہے یا کوئی اور شیخ چلی تھے جن کا مرقہ عیت مندوں کی زیارت گاہ ہے۔ بہر حال ٹکٹ شہری کے لئے میں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ وہی مشہور زمانہ فرد ہیں۔

ہادی

یہ بوسیدہ عمارت یادگار شیخ چلی ہے
ہم اب تک یہ سمجھتے تھے کہ یہ لچسپ شخصیت
مگر اس مقبرے کو دیکھ کر ثابت ہوا ہم پر
وہ لطف انگیز قصے جن سے ہر منسوب اُس کا
ہوئے تھے وہ بساط دہتر سیچ مچ عیال اک دن
ادافہی نے دنیا کی دیا ہے یہ صلا اُس کو
مگر اُس نے دہل نے بھی غضب کی آدمی اسکی
کہ مر جانے پہ رتبہ دے دیا اُس کو ولایت کا
ستم کا یلطف ہے غضب کا یہ تماشا ہے
یہاں انہوہ در انہوہ اب تک لوگ آتے ہیں

نشان بے نشاناں یہ مزار شیخ چلی ہے
فقط افسانہ گویوں کے تخیل کی ہر اک حدت
کہ تھی جلوہ نما وہ فی الحقیقت روئے عالم پر
وہ لکش کا نام جن کے مہر ہے دوام اُس کا
بنے تھے باعث لچسپی اہل جہاں اک دن
بنا کر اُس کا مرقہ غیر فانی کر دیا اُس کو
نظیر اُس کے لطیفوں میں بھی مل سکتی نہیں جسکی
نرالا کس قدر ہے اعتراف اُس کی ظرافت کا
کہ مرقہ شیخ چلی کا زیارت گاہ دنیا ہے!
چڑھاوے آکے رُت پر عقیدت کے چڑھاتے ہیں

ادب اے دل نہیں ہو یہ مقام اخذ ہے جا
تجھے افسانہ گوئیوں نے غلط نقشہ دکھایا ہے
حقیقت میں وہ شاہنشاہ تسلیم تخیل تھا
یہ زنداں خانہ اسباب تھا ناسازگار اُس کو
وہ شکر اتا تھا منطق کو سپائے تغافل سے
جہاں اُس کا تخیل اُس کو لیجاتا وہ جاتا تھا
وہ دُنیا میں کہ جن میں تو ہشول کو کامرانی تھی

تو اُس مردِ یگانہ کی حقیقت کو نہیں سمجھا
اُسے سالانِ تیغ و تفتن کا بنایا ہے
کہ جس کی بہتِ عالی کے آگے ہیچ تھی دُنیا
یہ جھگڑے علتِ معلول کے تھے ناگوار اُس کو
بجائے عقل کے وہ کام لیتا تھا تختِ س
مدو سے اُس کی دُنیا میں نئی اپنی بناتا تھا
وہ دُنیا میں کہ جن میں زلیست کیسرِ دامانی تھی

جو سچ پوچھو تو اُس کی زندگی تھی شکستِ قبل
خوشی کی جستجو میں آدمی پھرتا ہے سرگرداں
کہ دھونڈے سے کبھی دُنیا میں حاصل نہیں سکتی
سمجھتے ہیں جنہیں دُنیا کے قلعِ جاہلِ ناداں

اور اُس کے سامنے ہر زلیست اپنی سچی لالچاں
مگر ہے یہ سعادتِ مبدعِ فیاض کا احساں
تلاشِ راحتِ دل راحتِ دل ہو نہیں سکتی
وہ اپنے جہلِ نادانی میں اُن سے بڑھ کہیں شاداں

زمانے بھر کی حکمت سے ہے قلبِ دماں بہتر
ہے داناؤں کی دوزخ سے بہشتِ اہلِ ماں بہتر

محمد ہادی حسین

(آئی سی۔ ایس۔ سابق ڈیڑھ ہزار داستان لاہور)

محبت کا پہلا مظاہرہ

میرے حق میں تیرا جلوہ عشرت اندوز حیات
 ہاں تجھی سے مطمئن میری نگاہ شوق ہے
 دل بردھائے خور اپنے رلزدانِ حُسن کا
 کاش ادھر بھی دیکھ لیتی تو اُسی انداز سے
 تیرے ہی آگے جھکے گا اب مرا فرق نیاز
 ہے تنخیل خور عیس کا تیرے ہی زیر اثر
 تیرے اس معصوم جلوہ پر فردا حُسنِ ہلال
 ہاں، یہی پروردگار حُسن کا شبہ کار ہے
 جس کا دل قائل ہے وہ اعجاز ہے تیرا جمال
 تیرے دکش رنگ کے رنگیں بہار حُسن ہے
 تیری صورت سے عیاں میری محبت کا ہے از
 ذوقِ فطری پیش کر دیتا ہے ساری کائنات
 اس عروسِ شان سے پاتا ہوں میں فرقِ شہود
 ہے تجھے بھی میری جاں میری محبت کا لحاظ

اے شریکِ زندگی اے طلعتِ افروزِ حیات
 تیرا ہر انداز کیف آورِ پیامِ ذوق ہے
 تو جہاں حُسن، ایں ناظرِ جہاں حُسن کا
 اپنے کنگن و بھیتی بیٹھی ہے اب جس ناز سے
 تیری ان نیچی نگاہوں کی قسم اے دلنواز
 یہ تری شرمیلی آنکھیں ہیں نشیلی کس قدر
 پاک ہر اک عیب سے دہن ترا اے مرجال
 یہ "سراپا" میرے ذوق دید کا مہیار ہے
 نازش حُسنِ آفریں کا راز ہے تیرا جمال
 تیری خوش وضعی سے قائم اعتبار حُسن ہے
 مجھ کو تیرے حُسن نے سمجھائے اسرارِ نیاز
 جانتا ہوں میں جو تجھ کو حاصلِ کشتِ حیات
 کائنات آرزو کی جان ہے تیری نمود
 میرے دل میں چٹکیاں لکے ہوں نہ تیرا لحاظ

نیند کے آتے ہیں جھونکے پھر بھی تو ہشیار ہے! سوس

مانعِ خواب آج میرا طالع بیدار ہے

علی منظور حیدر آبادی

جاپان کے متعلق طانی حکمت عملی

ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے کہ جاپان نے چین پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت سے جاپان قتل و غارت گری میں سرگرمی سے مصروف ہے۔ دنیا حیران ہے کہ یہ چھوٹا سا ملک جو پچاس سال قبل بالکل "غیر تمدن" تھا۔ آج ظلم و ستم اور ہوس ملک گیری میں "تمدن" ممالک کے کس قدر قریب ہے۔ بلکہ ان سے دو چار قدم آگے نظر آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خون آشام طاقت جس کے مظاہرے جاپان چین میں کر رہا ہے اس نے "کن" کہہ کر پیدا انہیں کی۔ یقیناً کچھ حالات اسباب کچھ تاریخی واقعات ضرور ہوں گے جو اس طاقت کا موجب بنے، جنگ عظیم کے بعد ۱۹۳۱ء سے چین پر جاپانی حملوں کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس سال سے یہ لڑائی منگولستان سے تھوڑے وقفے کے بعد جاری رہتی ہے۔ اس سات سال کے عرصے میں جاپان منچوکو، جیہول، اندرونی منگولیا اور شامانی کو فتح کر چکا ہے شمالی چین کے کئی صوبوں پر اسے عسکری اقتدار حاصل ہے۔ اس مفتوحہ علاقے کا رقبہ انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی اور اسپین کے مجموعی رقبے سے کہیں زیادہ ہے۔ اس علاقے کی آبادی دس کروڑ ہے۔ اب جاپان، بیرونی منگولیا فتح کر کے سوویت روس پر حملے کرنے کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ اٹلی جرمنی اور جاپان کے درمیان جو "معاہدہ ثلاثہ" ہوا ہے وہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

جاپان کی اس طاقت اور قوت کی سب سے بڑی وجہ برطانیہ کی وہ حمایت ہے جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک یعنی اس چینی جنگ سے پہلے ہمیشہ جاپان کو حاصل رہی۔ اس کے علاوہ اور وجہ بھی ہیں مثلاً جاپان کی فاشی عسکری حکومت جس کا اصل اصول ہی قتل و غارت گری ہے۔ (۱) جاپان کی طبقہ وارانہ کشش (۲) چین کی وسعت اور زیری جس پر ہمیشہ جاپان کی لچائی نظر میں رہتی ہیں۔ مگر یہ تینوں اسباب سب سے اہم اور سب سے قدیم سبب یعنی برطانیہ کی حمایت کے پیدا کردہ ہیں۔ آج برطانیہ کی اس حمایت کی مختصر تاریخ بیان کی جائے گی۔

انیسویں صدی تک دولت برطانیہ کو جو ملکہ بحر "کملاتی تھی مشرقی اسی میں پورا پورا اقتصادی اقتدار حاصل تھا اور چین پر تو انگریزوں نے طرح حادی تھے جیسا کہ انیون کی لڑائیاں ہمیں بتاتی ہیں + ہانگ کانگ پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور یہی برطانوی درآمد کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی بین الاقوامی بستی (International Settlement) بھی انگریزوں ہی کی نگرانی میں تھی اور دوسرے ممالک بھی ان کے توسل سے چین میں تھوڑی بہت تجارت کر لیتے تھے

مگر تجارت کا بڑا حصہ انگریزوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے علاوہ ریلوں، بنکوں اور صنعت و حرفت کے تمام کام غافلوں کے ہاتھ میں تھے۔

انیسویں صدی کا اختتام تھا۔ دوسری قومیں (خصوصاً روسی، جرمن اور امریکن) بھی صنعت کے میدان میں آگئی تھیں۔ شنشاہیتوں کے اندرونی اختلافات اپنے لئے ڈاکہ باریات یعنی کٹ مرنے کے لئے نئی رزم گاہیں تلاش کر رہے تھے۔ امریکہ نے جہاز ران فلپائن فتح کر لئے تھے اور بحر الکاہل پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی فکر میں تھا۔ جاپان نے ۱۸۹۰ء میں چین سے طبعی کچھو سمنداری تھی۔ روس نے پورٹ آرٹھر اور فرانس نے خلیج وانگ چاؤ چینی حکومت سے حاصل کر لی تھی۔ ادھر یہ نئی شنشاہیت پسند قومیں انگریزی شنشاہیت سے چین میں "ملائے عام" ہے یا ران بکتہ وال کے لئے "کا اصول منوانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ادھر یورپ میں جرمن شنشاہی برطانوی شنشاہی کے لئے کچھ بوشمالی (North Sea) میں ایک سمتان رہی تھی۔ واقعات کی رفتار نے برطانیہ پر یہ حقیقت بالکل واضح کر دی تھی کہ اسے مشرق و مغرب میں بہت سخت حربیوں کا مقابلہ کرنا ہے اور مغربی حریف چونکہ گھر کے قریب ہے اس لئے اس کا سبب سب سے زیادہ فوری ہے اور ساتھ ہی اسے مشرق بعید خصوصاً چین میں بھی ہینگ پھنگوی لگے بغیر اپنی "جو دھرات" بٹھکانی ہے۔ اس وقت اور اس صورت حالات میں اس نے جاپان کے ساتھ رابطہ اتحاد پیدا کرنے کا "نوٹس وار" فرض انجام دیا۔ اس زمانے میں جاپان اگرچہ ترقی کر رہا تھا مگر ابھی تک مشرق کی سیاسیات میں بہت ہی ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ اور برطانوی شنشاہیت پسندوں کو پورا یقین تھا کہ اگر جاپان کی بیٹھ بھونک دی گئی اور اسے برطانیہ نے اسلحہ جنگ سے سنبھال کر دیا تو وہ برطانیہ کا ہمیشہ نمونہ ہو گا۔ کٹ پتلی بن کر ان کے اشاروں پر چلے گا اور ساتھ ہی امریکن اور روسی شنشاہی کے لئے زبردست حریف کی صورت اختیار کر لے گا اور ان کی بھرتی ہوئی طاقت کی خوب روک تھام کر لے گا۔

ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر ۱۸۹۲ء میں برطانیہ نے انگریزی جاپانی معاہدہ کیا جس کی رو سے اس نے جاپانی بحری طاقت کو شکم اور مضبوط بنانے کا وعدہ کیا۔ اس کے پندرہ ہی دن بعد اس معاہدے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔

۱۹۰۲ء میں ایک انگریزی جاپانی معاہدہ ہوا جس میں دونوں ملکوں نے اپنے تعینات زیادہ خوش آئند اور استوار بنانے کا وعدہ کیا۔ برطانیہ کے اس دستِ شفقت نے جاپان کا حوصلہ اتنا بڑھا دیا کہ اس نے اسی سال کوڑیاں چھلک کر کے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ جرمنی، امریکہ، فرانس اور روس نے متفق ہو کر (برطانیہ ان سے الگ رہا) جاپان کو کوڑیاں پرستہ بھینا لینے کے لئے مجبور کیا اور جاپان نے مجبوراً کوڑیاں چھوڑ دی۔

۱۹۰۵ء تک چین کی درآمد کا پچھلے انگریزوں کے ہاتھ میں تھا، پچھلے جاپان کے ہاتھ میں اور پچھلے امریکہ کے ہاتھ میں تھا۔

۱۹۰۵ء میں ایک اور معاہدہ جاپان اور برطانیہ کے درمیان ہوا جس کے الفاظ بہت ہی گول مولی تھے مگر جس کا مطلب یہ ہے سادے الفاظ میں یہ تھا کہ دونوں جنگ کے موقع پر ایک دوسرے کی مدد کریں گے، ظاہر ہے کہ جاپان برطانیہ کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ خود بہت کمزور تھا اور اس سے محض برطانیہ کو جاپان کی امداد مقصود تھی۔ اسی سال جاپان اور روس کے درمیان جنگ ہوئی جاپان کو فتح ہوئی۔ کیونکہ برطانیہ اس کی پشت پناہ تھا۔ غرض کہ اس طرح جاپان برطانوی شہنشاہی کے ساتھ عافیت میں ترقی کرتا اور یہ بھی اپنے مذکورہ بالا مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کی بہت بڑا تارباہیان تک کہ جنگ عظیم چھڑ گئی۔ جاپان نے اس جنگ کے فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۵ء میں چین کی گورنمنٹ کے سامنے ۲۰ نکات پیش کیے اور اس کے بعد ہی شاننگ فو، کن، ہنچو، ریا اور اندرونی منگولیا پر قابض ہو گیا مگر جنگ عظیم کے بعد پیرس کانفرنس اور واشنگٹن کانفرنس میں امریکہ نے جاپان کو مجبور کیا کہ وہ ہنکوہ علاقے چین کو واپس کر دے۔ جنگ کے بعد امریکن شہنشاہی دنیا پر چھائی ہوئی تھی اس لئے جاپان کو بھی اس کی بات مان لینی پڑی۔

جنگ عظیم میں گونگ انگریزی شہنشاہی کو ہوئی تھی مگر یہ فتح امریکن شہنشاہی کی بروقت امداد سے ہوئی تھی اور اب امریکہ ہی دنیائے سیاست کا بادشاہ آدم تھا۔ اس کے خواب کی جو اس نے سیاسیات عالم کی کرسی صدارت پر صلوہ کر ہونے کے متعلق دیکھا تھا، اب تعبیر پوری ہو رہی تھی۔ وہ خطرہ جو جنگ سے پہلے برطانوی شہنشاہی کو روسی اور امریکن شہنشاہی سے چین میں لگا رہتا تھا اب کئی گنا طاقت کے منور ہو رہا تھا۔ ایک طرف امریکہ اپنی برتری ظاہر کر چکا تھا اور دوسری طرف اس میں اشتراکی حکومت قائم ہو چکی تھی جو یورپ کے شہنشاہیت پسندوں کی نظروں میں عموماً اور برطانیہ کی نظروں میں خصوصاً جو جنگ سے پہلے ان کا علمبردار رہ چکا تھا غار کی طرح کھٹک رہی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ خاص چین میں انقلابی تحریک آزادی قوت پکڑ رہی تھی۔ برطانوی شہنشاہی کی بقا اور موت کا سوال تھا اسے ان تینوں خطروں سے نبھانا پڑتا تھا۔ ان کو کچلنا تھا۔

روس میں ابتدا میں اس نے رجعت پسندوں کی جو اشتراکی حکومت کے خلاف لڑ رہے تھے۔ روپے پیسے اور سامان جنگ سے خوب مدد کی گروہاں اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے چین کی حکومت سے امریکن درآمد کے خلاف ساز باز کرنا چاہا مگر وہاں بھی اس کی کوشش کوئی ثمر نہ لائی، امریکن درآمد کی مقدار چین میں بڑھتی رہی۔ اس نے دوسری شہنشاہیت پسند حکومتوں کے ساتھ مل کر چین کی انقلابی تحریک کو کچلنے کی کوشش کی مگر یہ تحریک ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک کنگنگ پارٹی کی سرکردگی میں خوب چھوٹی پھیلی اور اس نے ہر موقع پر رجعت پسند جرنیلوں کو ٹنگت دی جو ممالک غیر کے سرمایہ داروں کی مدد سے اس وقت جاپان کی اس فتح نے ایشیا والوں کے دلوں میں ایک بیاجذہ پیدا کر دیا تھا اور سب کی آنکھیں جاپان کی طرف تھیں۔ مگر بعد کے حالات نے گول کمر بہت دیرس کیا اور اب جاپان کی بجائے سوویتوں سے اظہار عقیدت ہو رہا ہے۔

سے ان کی مخالفت کر رہے تھے اور قریب تھا کہ سنگائی پر غم آزادی بلند ہو کہ متوسط طبقہ جس کا لیڈر جنرل چیانگ کانگائی تھا تھا اور امریکی اکثریت کی طاقت سے ڈر کر رجعت پسندوں سے جاپان اور تحریک کو کچل ڈالا۔

جنگ سے پیدا شدہ ان خطرات کے پیش نظر برطانیہ نے پھر اپنی بڑائی پالیسی اختیار کی اور پھر جاپان کے ساتھ جس نے جنگ کے بعد مشرقی سیاسیات میں غامبی اہمیت حاصل کر لی تھی اپنے تعلقات خوشگوار اور پابند بنائے تاکہ امریکی شنشائی اور روسی اشتراکیت کی روک تھام ہوتی رہے۔ مگر ۱۹۳۹ء تک امریکن شنشائی ڈیپا پری صادی تھی، اس لئے برطانوی شنشائی کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور جاپان نے جہاں ذرا ابھرنے لگا، امریکہ نے فوراً ڈانٹ کر ڈرا دیا، ۱۹۳۹ء میں وہ اقتصادی لڑا لہ آیا جس نے امریکہ کو خصوصاً اور یورپ کو عموماً بہت شدید نقصان پہنچایا۔

جنگ عظیم کے بعد یورپ کے اکثر ملکوں نے امریکہ سے قرضہ لے کر اپنی صنعت و حرفت کو فروغ دیا تھا۔ صنعت و حرفت کے تمام آلات وہ امریکہ ہی سے خریدتے تھے۔ یہ حالت جنگ کے بعد ۱۹۲۹ء تک تھی۔ اس زمانے میں امریکن صنعت و حرفت خوب زوروں پر تھی اور وہاں اقتصادی خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ مگر اب وہ وقت آیا کہ ہر ملک میں کارخانے غلبہ کھل چکے تھے۔ اور ہر ملک تجارتی پیمانے پر چینیں بنا رہا تھا اور اس بات کی کوشش میں تھا کہ ملک غیر میں اس کا بنایا ہوئی فروخت ہو، فروخت کرنے والے زیادہ تھے اور خریدار کم۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کساد بازاری شروع ہو گئی، ہزاروں کارخانے بند ہو گئے۔ لاکھوں مزدور بے کار ہو گئے۔ اقتصادی پڑمڑوگی چاروں طرف چھا گئی۔ ادھر یہ حالت اور ادھر امریکہ کے ٹیٹو اپنا قرضہ وصول کرنا چاہتے تھے، وہاں جواب یہ تھا کہ قرضہ اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے جب ہمارے ملک میں امریکن مال کی درآمد کم ہو اور امریکن ہمارے ملک کا مال زیادہ خرید جائے۔ یہ قطعی ناممکن تھا کہ امریکہ میں درآمد کی مقدار بڑھ جائے۔ لہذا ان ممالک نے اپنے ملک میں امریکن درآمد کم کر دی۔ اسلئے امریکہ کے سرمایہ کو زوال آیا۔ اس کے اس خطا طے نے اس کی قدریاسیات عالم میں بھی بہت کم کر دی۔

جاپان بھی اس زریں موقع کی تلاش میں تھا اس نے ۱۹۳۱ء میں منچوریا پر حملہ کر دیا۔ امریکہ نے چاہا کہ اسے پس ڈالے مگر یہ اکیلا لڑنے سے گھبرانا تھا، اس نے مجلس اقوام میں جاپان کی اس دست دلازی کے خلاف کوئی متحدہ اقدام کرنے پر زور دیا مگر پھر جان سائن نے جو برطانیہ کے خزانہ دے تھے اس کی شدید مخالفت کی اور جاپان کا ساتھ دیا۔ لارڈ لٹلٹن نے برطانیہ کے اس رویہ پر ان الفاظ میں انوس کا اظہار کیا ہے ”ریاست ہائے متحدہ نے اپنا دست تعاون ہماری طرف بڑھایا مگر اندوس ہم کہ ہم نے اس سے بے زنی برتی۔ ہادی گورنٹ کا یہ سکوت اس کی انوس کا کمزوری ہے“ مگر شاید انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بے زنی برطانوی شنشائی ہی کے مفاد کے عین مطابق تھی۔

لارڈ لٹلٹن مجلس اقوام کے اس تحقیقاتی کمیشن کے صدر تھے جو جاپان میں تحقیقات کرنے اسی سال گیا تھا۔

۱۹۳۳ء میں جاپان نے جہول فتح کر لیا اور مجلس اقوام سے مستغنی ہو گیا۔

۱۹۳۳ء میں جاپان نے یہ اعلان کیا کہ "دانشگاہیوں کا خلاف عدل" عہد نامہ ختم ہو چکا ہے۔ یورپ اور امریکہ چین کے حالات اور یہاں کے باشندوں کی روایات سے قطعی ناواقف ہیں اس لئے انہیں کوئی حق چین کے معاملات میں دخل دینے کا نہیں رہتا۔ اس اعلان کو سن کر امریکہ نے پھر برطانیہ سے کہا کہ آؤ مل کر اس "حرلینہ گرم گفتار" کی زبان بندی کر دیں مگر وہاں جواں غلامی تھا۔ برطانیہ دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اب چین میں امریکن شنشاسی کی شکست اور اس کی فتح یقینی ہے، اسے یقین تھا کہ جاپان اسے کبھی دھوکا نہ دے گا۔ اب وہ وقت آیا جو برطانیہ کی ساری امیدوں کو سپرد خاک کرنے والا تھا۔

۱۹۳۵ء میں چینی نے "لنچو اس کا صنعتی مشن" جاپان بھیجا تاکہ جاپان کے مفتوحہ علاقے میں برطانیہ کے لئے تجارتی مراعات حاصل کرے مگر جاپان نے کسی قسم کے مراعات دینے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ اب بھی مایوس نہ ہوا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہو صبح کا بخیر لاٹام کو گھر لوٹ آئے۔ مگر یہاں تو بھولے ہوئے نے اپنے لئے ایک الگ شاندار گھر بنالیا تھا۔

۱۹۳۵-۳۳ء میں جاپان نے اندرونی منگولیا اور شمالی چین کا کافی حصہ فتح کر لیا۔

۱۹۳۷ء میں جاپان میں صدر بنوا۔ جاپانی سپاہیوں نے ان تمام اندروں کو مار ڈالا جو جاپانی فاشی عسکریت کے مخالف تھے اور ہر دھاک کی وزارت قائم ہوئی جس نے اپنے اور چین کے درمیان سمجھوتے کی تین شرائط قرار دیں:-

(۱) چین اور جاپان کا اشتراک کمیونزم کے خلاف

(۲) چین یہ وعدہ کرے کہ کبھی دوسرے ملک سے جاپان کی مرضی اور رائے کے بغیر کسی قسم کے تعلقات پیدا نہ کرے گا۔

(۳) چین جاپان اور مانچو کو ایک واحد اقتصادی حلقہ قائم کریں گے۔

چین نے ان شرائط کو مسترد کر دیا اور اس کے کچھ عرصے بعد جاپان نے چین چھل کر دیا۔ اب وہ صوبہ شانشی، مین الاقوامی ہستی، چین کا شمالی میدان، اعظم اور وادی نیگ سی پر قابض ہو گیا ہے۔ جنگ برابر جاری ہے۔ جاپان بغیر کسی امتیاز کے ہر ملک کو مفتوحہ علاقہ میں کسی قسم کی مراعات دینے سے انکار کر چکا ہے۔ برطانوی امپیریلزم زوال پر ہے۔ اور بین الاقوامی سیاسیات اس قدر پیچیدہ ہو چکی ہیں کہ برطانیہ جاپان سے نہرو آزما ہونے کی حجرت نہیں کرتا + اقبال نے شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہا تھا

آشنا ہم نے جسے لطفِ محکم سے کب

اُس حرلینہ بے زبان کی گرم گفتاری بھی دیکھی

امریکہ برطانیہ سے ناامید ہو کر ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری میں مشغول ہے + فتح و شکست کا دار و مدار تین ہاتھوں

پر ہے :-

- (۱) برطانیہ کا رویہ - اگر برطانیہ نے امریکہ اور روس کے ساتھ مل کر کوئی مؤثر کارروائی کی تو جنگ یقیناً رک جائیگی۔
 (۲) چین کی تحریک آزادی - جس میں پھر نئی جان پڑ گئی ہے اگر اس نے عوام میں اعتماد حاصل کر لیا تو یقیناً جاپان کو شکست ہوگی۔
 (۳) سوویت روس کی پالیسی - کیونکہ روس کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فاشی عسکری جاپان اس کے پہلو میں خنجر کی طرح پیوست ہو جائے۔

عبدالحمید

دُعا

اے خدا مجھے دانشمندان اور نیکیوں کی غلیوں سے بچا !

(ڈرامیٹ لیٹن)

زندگی

جوں جوں زندگی گزرتی جاتی ہے، مجھے دنیا کو چہرہ زیادہ پسندیدہ نظر آنے لگی ہے وہ اس کی محبت، قربانی اور علم ہے۔
 اس کی عقل، اچالائی، اور شکر کی علم نہیں (گو علم کی شکر ستر ہے) بلکہ جہو نے جوں کے قہقہے، دوستوں کی دوستی، سرزیدوں میں انگلیشی کے گرد و جی
 دہی باتیں، پھولوں کا نظارہ اور گانے کی آوازیں !
 جان رچرڈ گرین

قدرت کا راگ

خدا ارگن بجا رہا ہے
 اور ایک عظیم الشان راگ کی آواز دُور و نزدیک گونج رہی ہے
 خدا ارگن بجا رہا ہے
 اور اس ارگن کے کان میں ملتے ہوئے سمندر طوفان زدہ دل لیس اور مجھے سب مل رہی ہیں۔
 خدا ارگن بجا رہا ہے
 اور ایک عظیم الشان راگ کی آواز دُور و نزدیک گونج رہی ہے۔

البرٹ سینیٹل فڈرٹ
 حامد علی خاں

سلاہ جی یہ مضمون ختم ہوا خبریں آ رہی ہیں کہ روس اور جاپان میں ہانچ کوڑکی سرحد پر جنگ شروع ہو چکی ہے۔

یہ مضمون اگست ۱۹۳۸ء کو موصول ہوا۔ (مہاراجہ)

بیکلاش کنول

ترجمہ از پیام شرق (جلد دوم) (حسبِ اجازت علامہ اقبال ج)

(۳۵)

اگر درشتِ خاکِ تو نہا دند
دل صد پارہ خونناہ بارے
ز ابرِ نوبہا راں گریہ آموز
کہ از اشکِ تو روید لالہ زائے

ترجمہ

پریت کے دکھ سہ دکھی ٹوٹا دل
خاک میں تیری لکھے جو وہ الیشور
بیکھ لے برکھا میگھ سے رونا
بھڑویں یہ انسو کنول سے ساگر

سے رکھا، برنگمال، بارش کا موسم، سے میگھ، ابر، بادل

سے لائے میں دماغ عشق ہوتا ہے اور کنول میں برہ کے آئینہ، فارسی اور ہندو مت دونوں
نظائر ہیں حسب مراتب یہ رعایتیں مستند تحکیمت کھتی ہیں۔

(۳۴)

سریرِ کعبہ و اکیلِ جمِ خاک
کلیسا و بُتستان و حرمِ خاک
ویکین من نہ انم گوہرِ جمیت
نگاہم بر تر از گرد و تنم خاک

ترجمہ

خاک ہوئے راون در یو دھن
خاک میں کعبہ اور مہابن
کون رتن ایسا جیون میں
آکھ ہے عشقِ خاکِ یثن

لطفی راون اور یو دھن کا غور اور ان کی سیم ٹام۔

راون راج رام چندر کا دشمن تھا اور یو دھن سری کرشن کی ساتھیوں میں
پاؤ کا حلیہ تھا، ایک نوجوان لڑکی سے اور دوسرے کا مہابن رہے۔

(۳۶)

دما دم نقش ہائے تازہ بریزد
بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویرِ دوشل است
بخاک تو شہرِ از زندگی نیست

(ترجمہ)

پہل پہل، نئی نئی، یکھاٹش
بیانِ کل اس جیون کو بنائیں
چتر جو کل کا ہے آج بھی تیرا
آگ نہ راکھ میں تیری پائیں
لے نقوش لے تصویر

(۳۷)

چو ذوقِ نغمہ ام در جہلوہ آرد
قیامت افگنم در محفلِ خویش
چو می خواہم دے خلوتِ بگیم
جہاں را گم کنم اندر دلِ خویش

(ترجمہ)

اپنی سبھا میں ہوں ڈالتا پھل
دھن جو کبھی سنگیت میں لاتی
چاہوں اکیلے رُخ کو جو دم بھر
یہ دُنیادل میں کھوجاتی

(۳۸)

چرمی پُرسی میانِ سینہ دلِ حسیت
خرد چوں سوزِ پید اکر دِل شد
دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن
چو یک دم از تپش افتاد گل شد

(ترجمہ)

پوچھتے کیا دلِ تن میں کیا ہے
پریت سے گیان تپا تو بنا دل
یہ دل اسی تپن تک دل تھا
تج کے تپن مٹی میں گیا بل

(ترجمہ)

بھید نہ پوچھو بھلے بُرے کا
بھید کہن سے کانپنے بانی
پھول کے ساتھ نکلتے کانٹے
پیڑ کو سینچے ایک ہی پانی

(۸۶)

چہ گویم نکتہ زشت و نوحیت
زباں لرزد کہ معنی ہیج دار است
بروں از شاخ بینی خار و گل را
درون او نہ گل پیدا نہ خار است

سہ بانی معنی زبان ۔ سہ آخری بیت کا نقلی ترجمہ یہ ہے "پھول اور کانٹے کھین باہر سے شاخ کے اندر پھول نہ کھائے"

(ترجمہ)

رجیون بھید کلی بتلاوے
اپنے سروپ سے تڑو دکھاوے
یوں تو کلی مٹی سے اُتے
سُوج سے پر آنکھ بلاوے

(۱۰۸)

ولامز حیات از غنجہ دریاب
حقیقت در مجازش بے حجاب است
ز خاک تیرہ می روید و لیکن
نگاہش بر شعاع آفتاب است

سہ توضیحی حقیقت ۔ پڑھنے میں آئے ت "کیں گے ۔ سہ اُتے معنی نکلے ۔ اُگے ۔

مقبول احمد پوری

آگہ و شربت عشق خالی ہے جنوں قیس سے سچی پہیم سے نشانِ قیس پھر پیدا کریں
 حُسن کے پندارِ باطل کو جنوں سے توڑ دیں آگہ سازِ زندگی میں پھر نوا پیدا کریں
 آپٹ دیں کائناتِ زندگی کا نظام
 آگہ بازِ جنوں میں عقل کو رسوا کریں

مظفر حسین شمیم

صدائے بے نوا

دلِ مُردہ کو پھر پیامِ بقا دے مری موت کو زندگی بنا دے
 میں اس شمعِ ہستی کو نورِ شید بجا دے کہ ہلکی سی اک سانس جو بجھا دے
 دلِ بدگماں میں نہ اتریں گے جلوے یہی ایک پردہ ہے اُس کو اٹھا دے
 مرے مُردہ ارماں ترے منتظر ہیں تو ان سونے والوں کو اب توجھا دے
 میں تیرے لئے اک دُعا کر رہا ہوں یہ مقبول ہو مجھ کو اتنی دُعا دے
 سمجھتا ہوں تجھ کو میں اپنا مقتدر بنا دے مجھے یارِ سے مرثا دے
 بنا اپنا کعبہ تو اک آستان کو
 نہ ہر در پہ اُسے عرشِ جا کر صدا دے

عرشِ ملیانی بی۔ اے

غزل

ہر اشکِ یاسِ ہمد ہے جانِ آرزو کی تقویِٰ حُسنِ دل بوندیں مرے لبوں کی
 ہٹ ہٹ کے بن رہی ہے ٹینائےِ دلِ خلیا بن بن کے میٹ رہی ہے ہر شکلِ آرزو کی
 سب باعثِ محبت، سب کارِ سازیِ دل! اک خوابِ زندگی کا ہر شکلِ آرزو کی
 عہدِ وفا سے پہلے اُسے کاش بہم سمجھتے مشکلِ غمِ نظر کی حُسن کی جستجو کی
 احساسِ نامرادی، اُسے کاش تو نہ ہوتا
 دامنِ دل کو حاجتِ ہر وقت ہے ٹوکی!

”میسرؤ منکر“

میر صاحب

لایک اشتراکی دوست کے نام

میر صاحب کا پورا نام تو دلچسپ ہے خواہ مخواہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے ناراض ہو جائیں گے البتہ اتنا ضرور بتائے دیتا ہوں کہ میر صاحب ہیں بہت بڑے آدمی! خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ بیوی ہے، بچے ہیں، موط ہے، کوٹھی ہے، بنک میں بھی دو چار لاکھ سے کیا کم جمع ہو گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قیام ازل نے انہیں دردمند دل عطا کر رکھا ہے۔ اس دل میں سائے جہاں کا درد موجو ہے۔ کبھی میر صاحب غریبوں کے غم میں بے قرار ہیں تو کبھی انہیں مزدوروں کی ہمدردی کے باعث نیند نہیں آتی۔ ہم نے توجہ دیکھا انہیں غریبوں اور مزدوروں کی اصلاح کے خیال میں سرگرداں پایا۔

میر صاحب میرے پڑانے دوست ہیں اور میرے حال پر بہت شفقت فرماتے ہیں۔ ہماری دوستی اکثر لوگوں کے لئے اچھے کی بات ہے۔ میر صاحب موطوں کے مالک ہیں۔ میرے پاس ایک ٹوٹی چوٹی بائیسکل ہے جس کے نہ گھنٹی ہے اور نہ بریکیں۔ میر صاحب شہر سے باہر ایک خوش وضع اور کٹا دو کوٹھی میں رہتے ہیں۔ میرا مکان لاہور کی ایک نو آبادی میں واقع ہے اور ابھی تک بجلی کی روشنی سے محروم۔ پھر اسی پر بس نہیں میر صاحب ایک مشورہ لیں اور مجھے محلے والے بھی نہیں جانتے۔ خود مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میر صاحب مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں؛ اور سچ پوچھتے تو میں نے کبھی اس مسئلہ پر غور ہی نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ میر صاحب بہ غریب آدمی کے حال پر اسی طرح شفقت فرماتے ہیں۔

مجھے سیاسیات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں اور ابھی کیسے سکتی ہے؛ تیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور چھ گھنٹے روزانہ دفتر میں گھس گھس کر رہی پاتی ہے۔ والدین نے چھوٹی عمر میں شادی کر دی تھی۔ ہمارا گھر جامع مسجد کے قریب ہی تھا۔ مولوی صاحب ہر عرصہ میں اس بات پر بہت زور دیا کرتے تھے کہ شادی کے بغیر ایمان ناقص رہتا ہے۔ اب والد صاحب ہمارے ایمان کی تکمیل کے درپے تھے اور والدہ کو یہ فکر دہانگیر تھی کہ مرنے سے پہلے اپنے لاڈلے کو دُلہا بنا دیکھ لوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے احتجاج کے باوجود ہمیں چچا کی لڑکی سے بیاہ دیا گیا۔ مولوی صاحب کی دوسلہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن رسول کریم اس مسلمان ہی بہت خوش ہوں گے جو اُمت کی تعداد میں اضافہ کیے گا۔ ہم تو مولوی صاحب کے کچھ زیادہ متقدم نہیں تھے البتہ والد صاحب کے نزدیک ان کا ہر ارشاد الہام کا دیر رکھتا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب کے عطا

والد صاحب کی خوش اعتقادی، والدہ کی ماعول اور ہندوستانی ورطائے کی بلاؤں کا یہ اثر ہے کہ آج ہم خدا کے فضل سے تین بچوں کے باپ ہیں اور ابھی صغ۔ آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا؟

خیر یہ تو ایک جملہ معترفہ تھا۔ تذکرہ میر صاحب کا تھا اور ہم اپنی دوستان لے بیٹھے۔ ہمارا مطلب صرف یہ تھا کہ ایک غریب آدمی سیاسیات میں دلچسپی لینے کے لئے دقت ہی نہیں نکال سکتا اور پھر میں تو یوں بھی بانیقہ و واقع ہوا ہوں شادی سے پہلے تھوڑی بہت ذہانت اور زندہ دلی پائی جاتی تھی۔ وہ بیوی کے ہم میں ادھر چکا ہوں۔ میری پارلیمنٹ میرا گھر ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں اس پارلیمنٹ کا رکن جمہور و دوسری نہیں ہوں۔ سپیکر، منسٹر، و سب سب کچھ میری بہوی ہیں۔ البتہ میرے تین بچوں کو نامزد ارکان سمجھ لیجئے اور وہ بھی غیر سرکاری نہیں بلکہ سرکاری، انہم کو بھی پیش کریں گے اور نہ میں ہندو ہر حکومت عطا کی جائے گی۔ لیکن بائیں ہمہ جب ہم میر صاحب کی خدمت میں جا پہنچتے ہیں تو زیادہ تو نہیں لیکن پارلیمنٹ میں سب سے پچھلے، بچ پر بیٹھنے والے ممبر ضرور بن جاتے ہیں۔ میر صاحب حد سامنے رکھ دینا بھر کے سیاسی معاملات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ میں کہی ان کے منہ کی طرف دیکھتا ہوں اور کہی ان کے صاف ثقات اور چمکدار تختے ہیں اپنا منہ دیکھ لیتا ہوں۔ بہت تیر مارا تو کبھی کبھار بھی ہاں کہہ دیا۔

ایک دن میر صاحب بڑے معنوم نظر آ رہے تھے۔ میں سمجھا بیگم صاحبہ کی طبیعت ناساز ہوگی اس لئے چمکا ہوا رہا۔ بات یہ ہے کہ میں میر صاحب کے ہر معاملے میں دخل دے دیتا ہوں لیکن ان کی بیگم صاحبہ کے کسی معاملے میں نہیں ہوتا۔ خود میر صاحب بیگم صاحبہ سے بہت دبتے ہیں۔ آخر میں تو لبی ڈر ہی نا۔ مانا کہ انگریزی حکومت سے نہیں ڈرتے لیکن بیوی اور حکومت میں تو بہت فرق ہے۔ حکومت ناراض ہو تو اسے کلاس بلاتی ہے۔ صبح چائے، انڈے اور سٹینس مین، دوپہر کو پکھلت لٹچ۔ سہ پہر کو پھر چائے اور شام کو ڈنر۔ بیوی ناراض ہو تو میر صاحب کی چائے بند اور ہمارے پان موقوف۔ لیکن ہمارا انداز غلط نکلا۔ اُس دن میر صاحب مزدوروں کے غم میں گھل رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے:۔

”تم جانے ہو کہ دنیا کا مظلوم ترین انسان کون ہے؟“

میں نے عرض کی ”میں جسے تیس روپیہ ماہوار میں اپنے علاوہ ایک بیوی اور تین بچوں کے پیٹ کی دوزخ بھرنی

پڑتی ہے۔“

کہنے لگے ”بالکل غلط۔ تم میری بات ہی نہیں سمجھے۔ دنیا کا مظلوم ترین انسان مزدور ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ بیگم صاحبہ کی طبیعت تو ناساز نہیں البتہ بیوی نے کسی بات پر میاں کی گوشمالی ضرور کی ہے۔ میں نے

کہ ”جی ہاں“

کہنے لگے۔ ”کچھ عرصہ بھی کیا کہ کیوں یا یونہی جی ہاں کہہ دیا؟“

میں نے کہا ”میر صاحب جب آپ ایسا عالم و فاضل یہ کہہ رہا ہے کہ مزدوروں کا مظلوم ترین انسان ہے تو مجھے سمجھنے

کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

فرمانے لگے ”لیکن کبھی کبھی اپنے دماغ سے بھی تو کام لیا کرو۔ جب تک ہندوستانیوں میں عزت و فکریں نہیں آئے گی، ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ اُمرار کے سرنگٹک اور عالیشان محل کون تیار کرتا ہے؟ مزدور۔ لیکن محل کی تکمیل کے بعد اسے کوئی ڈیڑھ مہینے میں بھی قدم نہیں رکھنے دیتا۔ آخر یہ بے انصافی کیوں؟ یہ صریح ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ سماج کے مظالم کی اس سے زیادہ شرمناک مثال اور کیا ہوگی؟“

اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ میر صاحب خود ایک عالیشان کونٹھی میں رہتے ہیں لیکن اگر ان مزدوروں میں سے جنہوں نے یہ کونٹھی بنائی تھی کوئی شامت کھانا چھانک پر بھی آنکھیں تو اسے کسولی جانا پڑے کیونکہ ایسے لوگوں کی پشت پناہی کے فریضے جو مزدور پر نہیں یا انگریزی لباس میں ملبوس نہ ہوں میر صاحب نے اپنے کتے ”جان“ کے سپرد کر رکھے ہیں۔ اول اول ایک درجہ مرتبہ انہیں میری شرافت کے متعلق بھی شبہ پیدا ہو چلا تھا اور ایک دفعہ تو انہوں نے میری بوسیدہ جاکین سے شیشے کی شیشی فراموشی سے تھکی مگر بزرگوں کے نیک اعمال آٹھ آٹھ آگئے اور میر صاحب ہماری امداد کو آنکھیں۔ میں اس سلسلہ میں کچھ کتنا ہی چاہتا تھا مگر میں نے سوچا میر صاحب بڑے آدمی ہیں ان کی باتیں ہی جانیں۔ شاید اس میں بھی کوئی مصاحت ہو اس لئے میں نے کہا تو صرف یہ کہا:۔

”بھائی مایا آپ نے میر صاحب، واقعی اس سے بڑی بے انصافی اور کیا ہو سکتی ہے؟“

ایک دفعہ مقامی کاشن مل میں ہڑتال ہو گئی۔ مزدوروں کا مطالبہ یہ تھا کہ کام کے گھنٹے گھٹا دیئے جائیں اور اجرت میں اضافہ کیا جائے۔ کارخانے کے مالکوں کو یہ شرائط منظور نہ تھیں۔ مزدوروں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس ہڑتال میں میر صاحب نے مزدوروں کی بہت امداد کی۔ سچ پچھے تو مزدوروں کے اصل قائد وہی تھے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے انہیں مل کے چھانک پر پکڑنگ کرتے دیکھا ہے۔ انہیں کارخانہ داروں کو جھگٹنا پڑا اور مزدوروں کی فتح ہوئی۔ اہاں اس سلسلہ میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ میر صاحب کا ڈرائیور زانا لنگو تھا۔ اس نے ہڑتال میں مزدوروں کی قیادت میں متاثر ہو کر میر صاحب کی غریب پروری کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا اور میر صاحب سے کہنے لگا میں روپے ماہوار میں میرے بیوی بچوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ میری تنخواہ کم روپے کر دیجئے۔ اور جب میر صاحب نے ذرا ڈانٹ بتائی تو اس نے انہیں ہڑتال کے صربے سے ڈرانا چاہا۔ میر صاحب نے اسی تھکے کونٹھی سے نکال باہر کیا۔ دو تین دن بعد اس کے جلس

درست ہو گئے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ میر صاحب اسے صحت کرویں اور دوبارہ ملازم رکھ لیں لیکن میر صاحب بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے کہ ایسے منکمر ملازموں کے بھڑے میں آجاتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے آزمودہ را آزمودن پھل است کے پیش نظر اسے دوبارہ ملازم نہ رکھا۔

میر صاحب گرمیوں میں ہمیشہ کتیرے چلے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ناک میں پھنسی بھل آئی تھی اس لئے وہ اس خیال سے سوٹزر لینڈ چلے گئے تھے کہ گرمیاں بھی مرنے سے گزر جائیں گی اور ناک کا اپریشن بھی ہو جائے گا۔ اچھے اچھے سرجن تو ہندوستان میں بھی مل جاتے ہیں لیکن آزاد ملکوں کے ڈاکٹروں کے ہاتھ میں جو ٹنڈا ہے وہ بچا سے غلام ہندوستانیوں کو کمال نصیب۔ اس کے علاوہ سوڈیشی کی تحریک کو صرف کھدر تک ہی محدود رکھنا چاہئے۔ اگر تعلیم اور طب کو بھی جبرِ فانی محدود میں قید کر دیا جائے تو تہذیب کی ترقی رُک جائے گی۔

ایک دفعہ میر صاحب کو زکام کی شکایت ہو گئی۔ میں نے پوچھا ”میر صاحب کہیں آپ نے سینما کا دوسرا مشق تو نہیں دیکھا؟“

کہنے لگے ”میں سینما بہت کم جایا کرتا ہوں۔“

میں نے کہا ”کیوں؟ آپ کے خیال میں سینما جانا معیوب ہے؟“

کہنے لگے ”نہیں تو۔ البتہ جو چیز عوام کو میسر نہیں اس سے ہم کیوں فائدہ اٹھائیں؟“

بات تو ٹھیک تھی لیکن مجھے خیال آیا کہ پچارے عوام کو تو موٹر چھوڑنا لگے بھی میسر نہیں اور میر صاحب کے پاس دو موٹر ہیں۔ آخر میں نے جرات کر کے پوچھ ہی لیا۔

”میر صاحب اگر یہ بات ہے تو آپ موٹر پر کیوں سوار ہوتے ہیں۔ عوام کو تو یہ بھی میسر نہیں۔“

کہنے لگے ”تم نے بدعویٰ نہ کی۔ اے میاں موٹر تو میری ضروریات زندگی میں سے ہے۔ اور سینما محض ساراں

تفریح ہے۔ موٹر سے وقت بچتا ہے اور میں اسے قوم کی خدمت میں صرف کر سکتا ہوں۔ سینما جانے سے وقت ضائع ہوتا ہے اور قوم کی حق تلفی ہوتی ہے۔“

جواب معتدل تھا اس لئے میں خاموش ہو رہا۔

سینما کے تذکرے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا ہے۔ ایک دفعہ میر صاحب مجھے اپنے ساتھ سینما لے گئے۔

انقلابِ فرانسیسی کی فلم تھی۔ میر صاحب باکس میں بیٹھے۔ میں چوٹی میں بیٹھنے والا اس دن یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی ہے۔ میں ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کسی بشخسا پر نظر پڑ جائے تو اشاروں

ہی اشاروں میں اُسے بتاؤں کہ دیکھو ہم کہاں بیٹھے ہیں۔ میرے صاحب کئے گئے۔
 ”پچھلے درجے میں بیٹھنے سے بچت تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن یہ کفایت شعاری جھوٹی کفایت شعاری ہے۔ کیونکہ
 پچھلے درجے میں بیٹھنے سے آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔“
 ”تصویر“ واقعی بہت اچھی تھی۔ مزدوروں پر اُمراءِ فرانس کے زہر و گداز مظالم کے مناظر بہت دردناک تھے جب
 ”دفعہ“ ہڑاتوں نے دیکھا کہ میرے صاحب کی آنکھیں پرلیم ہیں اور زوالِ آسٹوئس سے تر۔ اثر تو مجھ پر بھی ہڑا تھا لیکن بڑوں
 کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ میرے صاحب نے مجھ سے کہا:-

”تم بہت سنگدل ہو۔ تم اس غربت و افلاس سے متاثر نہیں ہوئے۔“

میں نے کہا ”میرے صاحب آپ نے یہ نظر صرف سینما کے پردے پر دیکھا ہے۔ میں اس سے زیادہ تلخ منظر ہر روز اپنے
 گرد و پیش دیکھتا ہوں۔ دُور کیوں جلیے میں خود اسی افلاس اور غربت کا زخم خوردہ ہوں۔“
 اتنے میں ”تصویر“ دوبارہ شروع ہو گئی اور ہمارا مسئلہ گفتگو منقطع ہو گیا۔ جب ”تصویر“ ختم ہو گئی اور ہم باہر نکلے تو میوز
 پر سوار ہوتے وقت ایک بڑھیا نے میرے صاحب کو گھیر لیا اور ایک پیسہ کا مطالبہ بڑی شدت سے شروع کر دیا۔ میرے صاحب نے اسے
 اس زور سے جھڑک دیا کہ پچاسی سہم گئی۔ مجھے اس تضاد پر بہت تعجب ہوا۔ میں نے کہا ”میرے صاحب۔ یہ بے افلاس کی جتنی جاگتی تصویر
 میرے صاحب کچھ کبیدہ خاطر ہو کر فرمانے لگے ”ہمارا فرض یہ نہیں کہ ہم افلاس کی حوصلہ افزائی کریں۔ ہم تو اس کا خاتمہ کرنا چاہتے
 ہیں۔ اگر ہم برسرِ حکومت ہوتے تو ہمارے نزدیک سب سے بڑا جرم افلاس ہوتا۔“

میں نے جج میں کہا ”آپ کی حکومت پر کیا موتوں ہے۔ سبھی حکومتوں کے نزدیک سب سے بڑا جرم افلاس ہی ہے۔“

حمیت نظامی

بڑے آدمی کی موت

اب زندگی کم شیریں اور موت کم تلخ ہو گئی ہے۔

(محبوب نوریہ لکھنؤ کی موت پر)

حامد علی خان

۲۵ جون کی شام کے چند پرِ مضطرب لمحات

(مجھے اس شام کو علامہ اقبال مرحوم وزیر اشدِ تہذیب کے مزارِ اقدس کی زیارت سے شرفِ ہونے کی سعادت نصیب ہوئی)

غضب غضب کہ وہ فطرت کا رانڈال نہ رہا	ستم ستم کہ خودی کا فسانہ خواں نہ رہا
حذر حذر کہ قیامت کی ساعت آ پہنچی	سکون و امن کہیں زیرِ آسمان نہ رہا
لکٹی مستاع عربیز و یگانہ صدافسوس	رہا ہی کیا جو وہ مستلج عارفان نہ رہا
وہ داغ و حبابی و غالب کا گھر ہوا ویراں	وہ آہ سعدی و رومی کا ہمزباں نہ رہا
ہے کارواں کا ہر اک فرد آج خاک بسر	کہ کارواں میں کوئی زمیرِ کارواں نہ رہا
نشاطِ رُوح و قرارِ دلِ حنین ہے کہاں	وہ انبساطِ نظر وہ سرورِ حیاں نہ رہا
ہیں دیدہ گل و لالہ سے اشکِ نخل جاری	دلِ چین نہ رہا جانِ گلستاں نہ رہا

مجیدِ سرمد ہیں شعر و سخن کے ہنگامے

ادب کی بزم میں اقبالِ نکتہ داں نہ رہا

مجیدِ دلاہوری

آہ اقبال!

بہرِ دل ترے خیال کی مستی سے پُور ہے	اب عالمِ خیال میں تیرا ہی نور ہے
اقبال! تیرے ذکر سے فانی نہیں ہیں ہم	گو سچ یہ ہے کہ ہم سے کہیں اب تو دور ہے
نفلوں سے تیرے زندہ ہوا ہے دیارِ ہند	بانگِ درا نہیں ہے یہ آوازِ صُور ہے

اقبال کا بدل نہیں بھارت میں بھارتی!

یہ قول ہر زبان پر نزدیک و دور ہے

رام کرشن بھارتی

لے بزمِ اقبال کو ٹیڑھے کے شاعر میں یہ نظم پڑھی گئی۔

محفل ادب

اقبال علیہ الرحمۃ کے چند جواہر برزے

(انجذاب پرفیسر خواجہ عبدالحکیم صاحب لکچرار گورنمنٹ کالج، ملتان)

۱۹۲۶ء کے شروع میں ایک شام کو میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بحیثیت مدیر کرینٹ (Crescent) (رسالہ اسلامیہ) کالج لاہور حاضر ہوا، اور ملتی ہوا کہ نئے سال کا پہلا نمبر نکالنا ہے، براہ کرم کوئی پیغام یا ارشاد طلبہ کے لئے دیجئے تاکہ پہلے ورق پر اسے چھاپا جائے، فرمائے لگے مضمون لکھنے کا تو وقت نہیں البتہ یہ شعر چھاپ دو

پیشمال شو اگر لعلے زمیر اسٹ پد رخواہی کجا عیش برون اور دن لعلے کہ درنگ است

میں نے اسے چھاپ دیا، اس سے بہت پیغام مسلمان طلبہ کے لئے تو شاید ناکام رہتا،

۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء میں جب مسٹر منور لال وزیر تعلیم پنجاب تھے، تو مسلمانوں میں اپنی حق تلفی کا بہت چرچا تھا، ڈاکٹر صاحب محکمہ تعلیمات پنجاب ان دنوں سرجاج انڈرسن تھے، مسلمان ممبران کونسل کا ایک مختصر وفد اس معاملہ پر بحث کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا، ڈاکٹر صاحب چونکہ ان دنوں کونسل کے ممبر تھے اور تعلیمی حالات سے واقف، وہ بھی فہم شامل تھے، رسمی باتیں جو ایسے موقعوں پر ہوتی ہیں، ہوئیں، ڈاکٹر صاحب بہادر نے وعدہ فرمایا کہ میں ضرور اس معاملہ پر غور کروں گا، اور جہاں جہاں حق تلفی یا بے قاعدگی ہوئی ہے، اس کی تلافی کی پوری کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً ظرافت سقراط سے کام لیا، اور سرجاج سے فرمائے لگے، اہی صاحب آپ اتنی کاوش مت کیجئے گا، ہم لوگ تو مسلمان ہیں، آپ کے اس وعدہ ہی سے خوش ہو گئے ہیں، اب کچھ کرنے کے لئے کی ضرورت نہیں۔

۱۹۲۲ء میں جب ڈاکٹر صاحب کو نائٹ ہڈ (Knight - hood) کا خطاب ملا۔ تو اسلامیہ کالج کے

کرینٹ ہسٹل کے طلبہ نے آپ کو چاہئے پر مدعو کیا، ڈاکٹر صاحب نے کمال مہربانی سے (جوان کا عمر بھر شیوہ رہی) یہ دعوت قبول فرمائی، چنانچہ وقت مقررہ پر آپ تشریف لائے، آپ کے دوست نواب سر ذوالفقار علی خان صاحب بھی ساتھ تھے۔ چائے کے بعد طلبہ نے درخواست کی کہ ان کی ہدایت کے لئے چند کلمات فرمائے جائیں، ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر،

تقریر کی جن کا حاصل یہ تھا کہ قوموں کے اخلاق کو خراب کرنے والی چیزوں میں سے ایک نہایت خطرناک بلکہ ہلک چھڑوہ نظریہ ہے، جسے "فن برائے فن" (Art for Art's sake) کہتے ہیں، اس نظریہ سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ فن صرف اپنے اصول کو ہی اپنا معیارِ صحت اور نصب العین مقرر کرے، اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اصول (مثلاً اخلاقیات یا روحانیات کا کوئی اصول) اس فن کی راہبری کا حقدار نہ ہو، وہ فن خود اپنا راہبر ہو، اس کی ترویج یا ترتیب یا اس کا ارتقاء کسی فوق الفن اصول کے ماتحت نہ ہو، وغیرہ۔ مختصر یہ کہ حسن خود اپنا معیار ہے، اور اپنے سے بالاتر کسی معیار یا اندعسا یا نصب العین کو ماننے کے لئے تیار نہیں، یہ نظریہ آج کل مغربی دنیا میں بہت مقبول ہے، اور اس کی مقبولیت کی رفتار اگر اسی طرح تیز رہی تو مجھے یقین ہے کہ ان اقوام کو لگ کر ربے گا، میں نے اپنے کلام میں اس ہلک نظریہ کے خلاف جہاد کیا ہے اور میں ہم نوجوانوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس خطرناک غلطی میں نہ پڑنا، فن، جب اخلاقیات اور جمالیات سے علیحدہ ہوتا ہے، تو وہ بہت جلد محض خلاق بن جاتا ہے، اعلیٰ مقاصد کی تکمیل یا پیروی کے لئے جمالیات کے کسی فن کو لوگے تو وہ اپنے بہترین مدارج طے کرے گا، اور قوم ملت میں ایک نئی روح بھونک لے گا، لیکن وہی فن جب ان مقاصد سے بچھڑ جائے گا، تو قوم و ملت کے حق میں ذہرِ قاتل بن جائے گا۔

میں نے اوپر ڈاکٹر صاحب کی مختصر تقریر کا حاصل رجو شاید دس بارہ منٹ سے زیادہ دے بھی، اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، بالخصوص اس نظریہ "فن برائے فن" کی تعریف کو واضح کر کے بیان کرنا میں نے مناسب سمجھا ہے، یہ تقریر نے مجھے کئی سال گزر چکے ہیں، لیکن بعد کے واقعات نے ان خیالات کو میرے ذہن سے محو نہ نہیں دیا، ہر طرف فن برائے فن کی تباہ کاریاں ایک دہائی کی ضرورت اختیار کر رہی ہیں، جرمنی اور آٹمی میں تو ہند اور سوئینی کی کوششوں نے اس نظریہ کی اچھی خاصی سیج کٹی کی ہے، لیکن دوسرے مشرقی ممالک میں اس کے خلاف کوئی منظم جہاد نہیں کیا گیا، ہندوستان میں کچھ عرصہ سے یہ نظریہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ میں رائج ہو رہا ہے آزاد خیال فیڈن (Feyden) اس کے مبلغ ہیں اور ریاضیت ان کے فن کے سرسار کی کلید، ڈاکٹر صاحب نے اس نظریہ کے ہلک نتائج کو جگہ جگہ اپنی تصانیف میں مثلاً محکوم اور زوال پذیر اقوام کے جمالیات کے تذکرہ میں بیان کیا ہے، اس نظریہ کے برعکس انہوں نے اپنی تعلیم اس شعر میں نہایت بلند طریقہ سے بیان کی ہے اسے

دلبری بے تباہری جادوگری است دلبری باقاہری ینبری است

۱۹۳۷ء میں میں نے اسلامیہ کالج کو چھوڑا، ممبرانِ صنف نے کمال مہربانی سے چائے کی میزبان دی۔ ڈاکٹر صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت تھی، اس لئے انہیں بھی مدعو کیا گیا، یعنی اساتذہ کے علاوہ مرت وہی مہمان تھے، وہ ازراہ ڈاڑھ نواری شامل ہوئے، باتیں ہوتی رہیں، دوپہان گنت گومیں منتظم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شرکت کا شکریہ ادا کیا۔

فرمانے لگے، پروفیسر یہ دوست ہے، اس کے ملازمتی جنازہ کے لئے مجھے ضرورت نکالنا تھا۔ *The professor - is my friend - I had to find time for his official funeral*۔ اس پر قہقہہ پڑا، فرمانے لگے کہ میں نے ان الوداعی پارٹیوں کے لئے ملازمتی جنازے کی اصلاح وضع کی ہے۔

اس پارٹی میں ڈاکٹر صاحب، مسٹر یوسف علی (جو پرنسپل تھے) کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ باتوں باتوں میں پردہ کا معاملہ زیر بحث آیا، یوسف علی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا، کیوں صاحب، آپ کو تو پردہ کی مخالفت منور کرنی چاہئے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو پردہ کا بہت حامی ہوں، یوسف علی صاحب نے دہر دیا دنت کی، تو فرمایا کہ پردہ سے اجنبیت کی خواہش تیز تر ہوتی ہے، بے پردگی اور عریانی سے وہ راز کھل جاتا ہے، جو جنسیت کی جان ہے، اس مختصر سے جواب میں انہوں نے انسانی نفسیات کے ایک اہم اصول کو لطیف پیر میں بیان کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب کو پورا یقین تھا کہ ان کا کلام اور ان کا کام باقی رہے گا، عرصہ ہوا، میں نے ایک روز عرض کی کہ یوں زبانوں میں آپ کا کلام اگر ترجمہ کی صورت میں شائع ہو جائے تو نہ صرف خود یورپ کے حق میں مفید ہوگا، بلکہ صحیح اسلامی نقطہ نگاہ اور تعلیم کے متعلق سبھی اہل یورپ میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہ بہت حد تک دُور ہو جائیں گی، آپ ترجمہ کی اجازت ضرور دیں، فرمانے لگے، کہ میرا کام باقی رہے گا (My work shall live) تراجم بہت آہستہ بہت ہو رہی جائیں گے۔

گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں انگلستان میں ڈاکٹر صاحب کو اکابر اور فضلاء سے متبادل خیالات کا موقع ملا۔ ایک بزرگ نے عیسائی پادریوں کا مشہور اور مجنون اعتراض اسلام کے خلاف دُہرایا، اور پوچھا کہ سر محمد کیا یہ سچ ہے کہ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ عورت کے رُوح نہیں ہوتی؟ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا، کیا رُوح سے آپ کی مراد وہی شے ہے جو آپ لوگوں کے خیال میں جسم سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہوتی ہے؟ معترض صاحب نے کہا، جی ہاں۔ انہوں نے جواب دیا، تو پھر صاحب اسلام کے مطابق عورت کیا مرد میں بھی رُوح نہیں ہے؟ اس دقیق اور لطیف جواب کو سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفیانہ مضامین میں اس نظریہ پر بہت زور دیا ہے کہ رُوح اور جسم کی تقسیم قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے، اور یہ پڑنے مذاہب اور فلاسفہ کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہے، قرآن کے مطابق انسان ایک فروسے، جس میں روحانی اور جسمانی خاصیتیں موجود ہیں، لیکن رُوح اور جسم دو الگ الگ چیزیں موجود نہیں، جہی سے وہ ہنا ہوا، روح اور جسم کی یہی غلط تقسیم ہے، جس کی وجہ سے ہمیں ناقابل حل مسئلے فلسفہ مذہب میں پیدا ہو چکے ہیں، اسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت (Spiritual and organic being) تصور کرتا ہے۔

اور یہ معتز قرآن میں نہ صرف اسی ارضی زندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے، بلکہ حشر اور حیات بعد الموت کے لئے بھی قائم رہتا ہے، چنانچہ حیات بعد الموت میں انسان کے لئے جو جزا اور سزا مقرر ہے، جس کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے، وہ وحانی بھی ہے اور جہانی بھی، ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا جواب میں اسی مسئلہ کو واضح کیا ہے کہ اسلام کے مطابق روح جسم سے علیحدہ کوئی شے نہیں، اس لئے نہ وہ عورت میں پائی جاتی ہے اور نہ مرد میں۔ کس بلاغت اور عظمت سے ایک ہی بات میں نہ صرف ایک جھوٹے الزام کی تردید کی گئی ہے، بلکہ ایک اہم اصول کو بھی واضح کر دیا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب کی روزمرہ کی گفتگو میں یہی خاصیت بار بار نمایاں ہوتی تھی۔

دوسری گول میز کانفرنس کے زمانہ میں انگلستان کی مشہور ستیا ج خاتون، جس روزیقا فوربس نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا، چنانچہ جس صاحب نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا، یہ خاتون شمالی افریقہ اور اسلامی ممالک میں بہت پھری ہیں اور ان پر اس سیاحت کا بہت اچھا اثر پڑا ہے، ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ ان کا محل جو لندن میں ہے، وہ ایشیائی بلکہ اسلامی طرز آرائش کا نہایت لطیف اور شستہ نمونہ ہے، سامان، آرائش، خالیچے، زریب و زینت کے انداز بہ لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون الرشید کے بعد اس کے کسی محل کا خاکہ ہے، اسی محل میں ڈاکٹر صاحب کی حیات ہوئی اور پرنسٹن مجلس رہی۔ لیکن انہیں خاتون کے محل کی تعریف کا موقع نہ ملا۔ روانگی کے وقت جس صاحب سے نہ رہا گیا۔ پوچھنے لگیں کہ ”سر مجھ میرے اس مکان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟“ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا ”آپ نے اپنی شہت دنیا میں پائی، میں اپنی بہشت کا منظر ہوں۔“

دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات روما میں موسلینی سے ہوئی، اس ملاقات میں موسلینی نے ان کی تعلیم سے کچھسی کا اظہار کیا، اور اس کی تعریف کی، گفتگو آدھ گھنٹہ سے زیادہ رہی۔ دوران گفتگو میں قوم اور مذہب کا بھی ذکر ہوا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اطالیہ کی موجودہ حالت (اور اس کی حل طلب مسئلہ) بہت حد تک ایسی ہے جیسے کہ قبل اناسلام ایران کی تھی، ایران کی تہذیب فرسودہ تھی اور قوم کے قومی شغل ہو چکے تھے، ان کو تازہ خون کی ضرورت تھی، ایران کی خوش فہمی سے اس کے جوار میں عرب کی جبری اور باہر پیا قوم تھی، جس نے ایران کو اپنا تازہ اور خالص خون دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران میں حیات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، اور یہ قوم ایک پر شکوہ تہذیب کی حامل اور علم بردار ہوئی، عربی خون کی بدولت ان میں بہترین اہل فن، اہل سیاست اور اہل سیف پیدا ہوئے۔ اسی طرح روما کے والوں کے بعد گاتھ اور جرمن قوموں نے اطالیہ کو اپنا خون دیا، اور اسے قرون وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی، اب پھر ایران اور اطالیہ دونوں کو تازہ خون کی ضرورت ہے۔ ایران اب بھی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کے شمال میں جری وندھم ہند

ترکمان موجود ہیں، اور مغرب میں اندونزیا عرب کے بحرِ قزحہ، یہ قومیں اپنا خون نے کر ایران کو پھر زندہ اور قوی کر دیں گی لیکن موجودہ اطالیہ کے گرد اسی کی جیسی مذہب قومیں آباد ہیں جن میں صحرائی وحشت اور تازگی نام کو موجود نہیں، اطالیہ تازہ خون کہاں سے لے گی؟ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ مسولینی اس اچھوتے خیال سے بہت متاثر ہوا۔

ڈاکٹر صاحب چرچن کا اثر بہت گہرا اور فوری ہوتا تھا، روما کے اسی قیام کے زمانہ میں (جو صرف چند روزہ تھا) ان کی ایک دوست خاتون نے (غالباً اسی خاتون نے مسولینی کی ملاقات کے لئے وقت مقرر کر لیا تھا) جو اطالیہ کے طبقہ اُمراء سے تھی، ان سے دریافت کیا، اگر آپ کو یہاں کوئی خاص چیز دکھینی ہے، تو فرمائیے، تاکہ اس کا انتظام کیا جائے، فرمایا کہ اطالیہ کا حق شہور ہے، میں اس شہرِ روم کی حسین ترین خواتین کو مینا چاہتا ہوں، چنانچہ موصوفہ نے ایک ٹی پارٹی میں اعلیٰ سوسائٹی کی چند حسین خواتین مدعو کیں، جن سے ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کی، فرماتے تھے کہ اطالیہ کا حق یورپ میں بہترین ہے اور اس عیافت میں روم کے حق کے بعض لطیف نمونے تھے۔

گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات پیرس میں پروفیسر برگسٹن سے ہوئی، برگسٹن کی تصانیف کا اثر ان پر بہت تھا۔ اس کا نظریہ "واقعیتِ زمان" (Reality of Time) ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اسلامی نقطہ نگاہ کے بہت قریب تھا، چنانچہ دورانِ ملاقات میں اس پر بحث ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے برگسٹن کو یہ حدیث سنائی، مگر زمانہ کو براست کہو کہ زمانہ خدا ہے۔ فرماتے تھے کہ جس وقت برگسٹن نے یہ حدیث سنی تو وہ کرسی سے اچھل کر آگے بڑھا اور مجھ سے پوچھنے لگا "کیا یہ سچ ہے؟"

گول میز کانفرنس کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے ہسپانیہ کا سفر کیا، اس سفر کے واقعات انہوں نے کمال مہولونی سے مجھے مفصل سنائے، قرطبہ کے جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے، اس کے مالک (مینجر) سے آپ نے سب سے پہلے یہی پوچھا کہ کیا اس علاقہ میں قدیم مراکشئی نسل کے لوگ آباد ہیں، اس نے جواب دیا کہ بڑی تعداد میں، آپ نے غواش ظاہر کی کہ مجھ ان میں سے کسی ایک سے مضمون طے کیا جائے۔ مینجر منکر کر دیا، اس کام کے لئے ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہیں، میں خود مراکشئی اصل سے ہوں (دجنبی ہسپانیہ کے ان باشندوں کو مورسکو Morisco) کہا جاتا ہے) حسنِ اتفاق سے آپ کو پڑانی عمارتیں دکھانے کے لئے جو راہبر مقرر کیا گیا تھا، آپ نے شرط یہ رکھی تھی کہ راہبر انگریزی جانتا ہو، کیونکہ میں ہسپانوی زبان سے کٹنا نہیں، وہ بھی مراکشئی اصل سے تھا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس علاقہ میں عربی مراکشئی اثر چروں کی ساخت میں بہت نمایاں ہے، چنانچہ مسجد قرطبہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال اور بجا ہوں کہے تیرا آج بھی ہیں دل نشیں

لوئے میں آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے رنگ حجاز آج بھی اس کی فواہل میں ہے

اسی سفر ہسپانیہ میں آپ کو پروفیسر آسٹین (ASIN) سے بھی ملاقات کا موقع ملا، یہ وہی پروفیسر ہیں، جنہوں نے قریباً پندرہ سال یا شاید کچھ زیادہ ہوئے ہیں، ایک معرکہ الاراقہ تصنیف کی تھی، جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ اطالوی شاعر دانٹے پیرنی بالخصوص ابن حدیث اور رواتیل کا اثر جو معراج نبوی صلعم اور عذاب دوزخ سے متعلق ہیں، کسی قدر غالب تھا، دانٹے کی شہرہ آفاق تصنیف دیوینا کاموڈیا میں یہ اتر صفحہ صفحہ پر نمایاں ہے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ پروفیسر آسٹین کی خواہش تھی کہ مسلمان طالب علم بالخصوص ہندوستان کے مسلمان طالب علم ہسپانیہ میں آئیں، اور ملک کی زبان سیکھ کر ان قیمتی اور بے شمار عربی خطوط کو مطالعہ کریں جو ہسپانیہ کے بعض کتب خانوں مثلاً اسکوریال میں بند پڑے ہیں، (خدا جانے اس خوفناک جنگ میں ان نمایاں خطوط کو کس قدر نقصان پہنچا ہو۔)

ڈاکٹر صاحب کو سفر ہسپانیہ میں معلوم ہوا، کہ اس ملک میں قومیت اور وطنیت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی، ملک میں ایسے نوجوان اور فضلا رنل آئے تھے، جو ہفت صد سالہ اسلامی حکومت ہسپانیہ کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے تھے اور اس کو اندس کا بہترین زمانہ کہہ کر یاد کرتے تھے، اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ مسجد قرطبہ کو کیتھولک چرچ کے مختلف فرقوں سے بھین لیا گیا۔ حالانکہ کئی برسوں سے ان فرقوں نے مسجد کے مختلف حصوں میں اپنی عبادت گاہیں بنائی تھیں، وطنیت کی اس تحریک کا چونکہ مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے مسجد کو محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے حکمت الہی کی ایک دلپذیر مثال یہ سنائی کہ مسلمانوں کے اخراج کے بعد جب مسجد قرطبہ (جو تیسری جمالیات کے لحاظ سے دنیا کی نادر ترین عمارتوں میں سے ہے) عیسائی راہبوں کے قبضہ میں آئی، تو انہوں نے آیات قرآنی پر جو پتھری حروف میں مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر لکھی ہوئی تھیں، پلستر کرادیا۔ آج قریباً پانچ چھ سو سال کے بعد جب وہ پلستر ٹکڑا ہوا قدیمہ کے حکم سے اکھاڑا جاتا ہے، تو وہی نقوش اپنی پرانی شان میں دنیا کے سامنے آتے ہیں اگر پلستر نہ ہوتا، تو یہ نقوش غالباً اس وقت تک بالکل محو ہو جاتے، ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ میرے ذہن میں نقش ہے کہ مسجد اور اس کے نقوش کو دیکھ کر جو لذت قرآن اور اسلام کے مضمون کے متعلق میں نے حاصل کی، وہ بیسیوں تفسیروں سے حاصل نہ کر سکا! ایک بات ڈاکٹر صاحب کو اسپین کے سفر میں خاص طور سے نوٹ کرنی پڑی، کہ اس وقت اس ملک میں پرتلی مساجد کی تعداد نہایت ہی کم ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، یا مسلمانوں کے ہسپانیہ سے اخراج کے بعد غضب کی وجہ سے عیسائیوں نے ان تمام مساجد کو محنت بے دردی سے گرا دیا ہوگا۔ P اور یا خود کشتی اندلی مسلمانوں کو بے ضرورت عاجز و تیر کرنے کا۔ دہ شوق نہ تھا جو ہندوستانی مسلمانوں کو ہے، پہلا خیال غالباً زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ہسپانیہ کی آب و ہوا کی بے حد تعریف کرتے تھے، فرماتے تھے، کہ اس ملک میں دو تین مقامات ایسے ہیں اور ان کی فضا اس قدر پاک اور شستہ ہے کہ آج کا بچا ہوا سالن کئی مہینوں تک نہ بگڑے گا۔

دو سال کے قریب ہوئے جب اسپین کی موجودہ ملکی جنگ کا آغاز ہوا تو یہ خبریں بھی پہنچنا شروع ہوئیں کہ جرمن فوج کی فرج کا زیادہ حصہ خصوصاً وہ حصہ جو یلیٹاروں میں اور فیصلہ کن لڑائیوں میں (Storm Troopers) صف شکنی کا کام دیتا ہے، تمام تر مراکشی سپاہیوں اور رضا کاروں پر مشتمل ہے، کچھ عرصہ کے بعد ان جنگش اور جری سپاہیوں کی تصاویر بھی اخباروں میں چھپنا شروع ہوئیں، ان خبروں سے ہندوستان کے ہر پڑھ لکھے مسلمان پر گہرا اثر ہوا تھا اور ہے، میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس خیال کے اثر کا ذکر کیا، کہ سرزمینِ اُندلس پر فیاً بارہ سو سال کے بعد پھر مسلمان مراکشی بہادروں کے قوی بازوؤں سے سر بہرہ ہوا ہے، ڈاکٹر صاحب فوراً بولے تمہیں میری نظم مسجد قرطبہ کا آخری بند یاد نہیں رہا، اس میں میں نے ہسپانیہ کی کئی۔

آپ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!
عالمِ ذہنی ابھی پردہٴ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہے اس کی کھلے حجاب
پردہٴ اٹھادول اگر چہ زُلفِ افکار سے لاندھے گا رنگِ میری لڑائیوں کی تاب

ڈاکٹر صاحب پھر مزین مفکرانہ کلمت اثر تھا، خودی کے اسرار ان پڑس مضامین اور جدت سے فاض نہ جنتے اگر نیشے کی تصانیف سے وہ لاعلم رہتے، بال جبریل چھپنے کے کچھ عرصہ بعد ملک۔ دفعہ میں نے ان سے عرض کیا کہ پچھلے دنوں میں نے نیشے کی فلاں فلاں کتابوں کو کئی سالوں کے بعد اور شاید تیسری بار پڑھا ہے، لیکن اس کی فکر میں وہ تازگی محض اور گہرائی ہے کہ ہر بار معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بار پڑھ رہا ہوں، اس کے بنیادی خیالات اسلام سے اس قدر قریب ہیں، کہ انھوں نے جوتلمے کہ کسی نے اس کے سامنے اسلامی نقطہٴ نظر پیش نہ کیا۔ قرآن سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے اسے اپنے فلسفہ میں "انکارِ الہیت" (godlessness) کی تعلیم دینا پڑی، عیسائیت نے خدا کے بیٹے کو "برکری کا چچہ" اور اخلاق کو روحانی پست جتنی کے مترادف بنا کر اسے صحیح مذہب سے متنفر کر دیا، وغیرہ، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "متنا را یہ خیال بالکل صحیح ہے، اسی لئے تو میں نے نیشے کے متعلق کہا ہے،

دلش مومن، دماغش کافر است

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف میں شاہن کاغذ پر درویش بننا نیشے کے زرد رشتے کے اس دھڑلے بہت قریب ہے، جس میں اپنے کو بتائی نہیں کہ اس لئے پسند نہ کرتا ہے، کہ وہاں اسے عقاب اور ستاروں کی ہمسائیگی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے میں نے دو تین ہفتوں پر مرزا بیدل کی شاعری کے متعلق پوچھا، بیدل کے متعلق ان کی رائے نہایت اچھی تھی، میں نے ایک بار کہنا کہ اس کی فارسی میں بے ضرورت شکل پسندی ہے، فرمانے لگے، کہ تھوڑی سی کاوش سے یہ شکل دُور ہو سکتی ہے، بیدل نے اپنی خاص اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں جنہیں وہ اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے، اگر ان اصطلاحات کو پہلے سمجھ لیا جائے تو بیدل میں مشکل باقی نہیں رہتی، بیدل اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ لغوی کر لیا جائے۔

پچھلے سال اگست یا ستمبر میں ایک درجہ میں شام کے وقت حاضر خدمت ہوا تو آپ حسب معمول جاوید منزل کے صحن میں بستر پر لیٹے تھے، اس سے چند مہینے پہلے ایک دمرتہ آنہوں نے اپنے بچوں کے لئے ایک مکتبہ یا اتالیقہ کی ضرورت کا ذکر کیا تھا، کچھ دیر سیاسی خبروں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، اس دوران میں ایک یورپین خاتون بچوں کے گزریں، میرے دریافت کرنے پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ یہ خاتون بچوں کی اتالیقہ ہیں، جو منسل سے ہیں، اور نہایت منتریب الطبع ہیں، انہیں ہر وقت بچوں کی پرورش کا خیال رہتا ہے، اور فرصت کا کوئی وقت بھی وہ بے گار نہیں گزارتیں، کچھ کام نہ ہو تو کمرہ ہی جھاڑنا شروع کر دیتی ہیں، چنانچہ بچوں کی طرف سے تو میری طبیعت اب بالکل مطمئن ہے۔ البتہ مجھے کچھ عرصہ سے تنہائی بہت محسوس ہو رہی ہے، علی گڑھ میں میری ضروریات کی نگہداشت کرتا ہے، لیکن میرے لئے اب زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، صبح سے دوپہر تک کا وقت اچھا گزرتا ہے، لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، شام کا وقت بھی اسی طرح گزرتا ہے، البتہ دوپہر سے چار بجے تک کا وقت سخت تکلیف دہ ہوتا ہے، پڑھنا بند ہو چکا ہے، اور سوئے انسان کب تک ہیں نے عرض کی کہ موسیقی کا انتظام ہو جائے تو طبیعت کو تسکین ہوگی، فرمایا کہ مجھے موسیقی کی بہت خواہش ہے میری طبیعت بھی اس کی طرف مائل ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی موسیقی بہت المانگیز اور پڑمردہ ہے جس موسیقی کی مجھے ضرورت ہے، وہ ابھی شروع نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ ہندوستانی موسیقی میں المیت کا عنصر بہت غالب ہے، اور ذوقی حیات اس سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا، میں نے کئی بار ان کی زبان سے سنا، اس نتیجہ پر وہ برسوں پہلے پہنچ چکے تھے۔

۱۹۳۷ء میں سید سراسر اس معذور مہم کی وفات کی خبر اخباروں میں نکلی، اس کے چند روز بعد مجھے ڈاکٹر صاحب نے ملنے کا اتفاق ہوا، مجھے معلوم تھا کہ مرحوم ان کو بہت عزیز تھے، چنانچہ جب میں ان کی خدمت میں اہلکار افسوس کیا تو انہوں نے مرحوم کی بہت تعریف کی، میں نے پوچھا کہ مرحوم میں خاص خوبیاں کیا تھیں، انہوں نے لگے کہ دو باتیں ان میں نمایاں تھیں ایک یہ کہ وہ بے حد فیاض تھے، ہر کسی کے دُکھ و درویش شریک ہو جاتے تھے، کسی کی تنگدستی کو برداشت نہ کر سکتے تھے، اسی لئے ان کی تنخواہ (راگڑ) معمولی تھی، ان کے لئے کافی نہ تھی۔ کوئی مسائل ان کے گھر سے خالی نہ جاتا تھا، میں تمہیں ایک مثال

دیتا ہوں، ان کی بیماری سے کچھ عرصہ پہلے میں نے انہیں لکھا کہ میں نے اپنی وصیت میں چار اشخاص کو اپنے بچوں کا سربراہ مقرر کیا تھا، ان میں سے ایک صاحب فوت ہو گئے ہیں، مجھے بہت خوشی ہو گئی، اگر آپ سربراہ بننا منظور فرمائیں، انہوں نے جواب میں لکھا کہ میں لاہور سے بہت دُور ہوں اس لئے بحیثیت سربراہ نہیں بچوں کو کیا فائدہ پہنچا سکوں گا، البتہ آپ براہِ مہربانی اپنی وصیت میں یہ الفاظ ضرور درج فرمائیں کہ اگر بچوں کو خدا خواستہ کبھی مالی تکلیف ہو تو سب سے پہلے اطلاع کا حقدار مجھے سمجھا جائے، دوسری نمایاں خصوصیت مرحوم میں یہ تھی کہ ان کا دستِ خزان بہت فراخ تھا اور ان کا کھانا بہترین، ان کے پاس بہترین باورچی ملازم تھے اور عمدہ کھانوں اور دنیا فتنوں پر وہ بے دریغ خرچ کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے اسی غرض سے خالص عربی میزبانی کا سامان مکمل جمع کیا تھا، الغرض مرحوم ہندوستان کے خوش وضع اور مختار اکابر میں سے تھے، اب ان کا جائزین یا ثانی مشکل سے ملے گا۔

ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات اخیر دسمبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی، اس وقت وہ خواجگاہ میں پبلنگ پریسیٹ تھے۔ کچھ دیر تک وہیں باتیں ہوتی رہیں، پھر علی بخش نے آکر سلام دی، کہ کھانا تیار ہے، (دوپہر کا وقت تھا) فرمانے لگے، ہلو دوسرے کمرہ میں بیٹھیں، ڈاکٹر صاحب سوفا پر بیٹھ گئے، علی بخش نے کرسی سامنے بکھ دی، اور کھانا اس پرچن دیا، میں کھانا کھا کر گیا تھا، اس لئے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا، آپ اشتہار سے کھانا کھاتے رہے، اور باتیں بھی ہوتی رہیں، اسے سب سے بہتر (دوسرا ملازم) اندر آیا اور اطلاع دی کہ مسٹر یوسف علی اور چھوٹے میاں (نواب سر ذوالفقار علی خاں صاحب مرحوم کے صاحبزادے) آئے ہیں، آپ نے فرمایا ہمیں ملالو، چنانچہ کرسیاں قریب ہی رکھ دی گئیں، اور دونوں صاحب اندر تشریف لائے، مسٹر یوسف علی نے سلام علیک کے بعد مزاج پُرسی کی، ڈاکٹر صاحب نے حسبِ عادت فرمایا، بہت اچھا ہوں، مسٹر یوسف علی نے فرمایا، میرا بھی یہ خیال ہے، کیونکہ کھانا کھا نا خود صحت کی نشانی ہے، (ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا، بتائیے انگلستان سے کیسے آمد ہوئی، یوسف علی صاحب نے جواب دیا، کہ قرآنِ کریم کے آخری تین پاروں کا ترجمہ زیرِ طبع ہے، یہ کام اپنی نگرانی میں کروانے کے لئے آیا ہوں، کبھی بات پر آپ نے مسٹر یوسف علی کو ایک لطیفہ سنایا، جو میں بھول گیا، اس میں دہائیوں کی بزم کا ذکر تھا، میں مسٹر یوسف علی کے سامنے بیٹھا تھا۔ لیکن غالباً وہ مجھے پوری طرح سے پہچان نہ سکے، ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا آپ پر و فیہ رحمہ کو پہچانتے ہیں؟ اسلامیہ کالج میں دو سال آپ کے ماتحت کام کر چکے ہیں، مسٹر یوسف علی بولے، ہاں، ہاں، بعد میں ہتیس گجرات میں بھی تو دیکھا تھا، لیکن بھی تم نے اپنے بال کیل اس قدر سفید کر رکھے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ خاندانی رجحان سفید بالوں کی طرف زیادہ ہے، ڈاکٹر صاحب نے مسٹر یوسف علی کی طرف مڑ کر کہا، آپ کی محنت پہلے سے بہت اچھی ہے، وہ بولے، پہلے (اسلامیہ کالج میں) میں غلام تھا، آج کل آزاد۔

ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کے لئے دوسری طرف اشارہ کر کے (زمان (Time) کی لڑائی کے کی طرف برہی ہے، اور آپ کے لئے پیچھے کی طرف (Time is moving forwards for the -)۔ اس کے بعد حسب ذیل باتیں ہوئیں:-

یوسف علی صاحب - فرمائیے آج کل کچھ زیر تصنیف ہے؟

ڈاکٹر صاحب - اردو اور فارسی دونوں میں کچھ کلام جمع ہو رہا ہے۔

یوسف علی صاحب - آپ کو میرے ساتھ وہ وعدہ یاد ہے، اگر آئندہ فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف دوبارہ متوجہ ہو گئے ہیں۔ بانگ درا کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دو اور کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب - جی ہاں میں اردو میں چند سالوں سے لکھ رہا ہوں۔

یوسف علی صاحب - موجودہ تصنیف کب مکمل ہوگی؟

ڈاکٹر صاحب - اگلے سال انشاء اللہ مدینہ منورہ میں پہنچ کر،

یوسف علی صاحب - آئندہ سال حج کو ضرور تشریف لے جائیے گا؟

ڈاکٹر صاحب - جی ہاں الادہ تویہی ہے، اطالوی کونسل جنرل نے مجھے دعوت دی ہے کہ اطالوی کینی لائڈریشینو کے کسی جہاز میں سفر کیجئے گا، یہ جہاز جتہ میں تو نہیں ٹھہرتے۔ لیکن جتہ کے سامنے اطالوی سمالی بندرگاہ پر ٹھہرتے ہیں، وہاں سے وہ میرے لئے ایک خاص اگن بوٹ کا انتظام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں، جو مجھے جتہ پہنچا دے گی۔ اس طرح سفر میں مجھے تکلیف نہ ہوگی، اس کے متعلق خط و کتابت جاری ہے۔

یوسف علی صاحب - بے شک اطالوی حکومت کو اسلامی دنیا میں آپ کی اہمیت کا پورا اعظم ہوگا، اور وہ ہر طرح سے آپ کو سہولت پہنچانے کی کوشش کرے گی۔

ڈاکٹر صاحب - میں بھی چاہتا ہوں کہ سفر کی کوفت سے بچوں، مصحت کی موجودہ حالت میں اس کوفت کو برداشت نہ کر سکوں گا۔

چند منٹ اور گنگو ہوئی، اس کے بعد دونوں صاحب تشریف لے گئے، اس ملاقات سے پہلے بھی ایک دو بار مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے سفر تھما دے تھے، اس تجویز کا ذکر کیا تھا، انہیں حج کی اس قدر لو لگی تھی، کہ غالباً انتقال کے وقت انہیں اسی ایک آرزو کے پورا نہ ہونے کا رنج رہا ہو گا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد میں بھی اجازت لے کر رخصت ہوا، اس وقت میرے دل میں یہ خیال مگر نہ آ سکتا تھا

کہ چار مہینہ میں کے قلیل عرصہ میں ڈاکٹر صاحب اپنے مفید قندول کو داغ مفارقت دے جائیں گے۔ اس وقت ان کے
 پہرے صحت ٹپک رہی تھی، اس خط تھوڑی دیر پہلے بوا کر بیٹھے تھے، موصوں کو قدرے تازہ بھی دے رکھا تھا، پہر کی شان
 جہن جہنلوں کی سی تھی، طبیعت بہت بشارت تھی، صرف دو کالین تھیں، ایک آواز جو کسی طرح نہ نکلتی تھی، اور دوسرے
 موتیا بند جو کچھ عرصہ سے اڑا آیا تھا، آواز کے نہ نکلنے کا انہوں نے کبھی غور نہ کیا تھا، اور موتیا بند کا وہ پانچ مہینہ میں
 اپرٹن کرانا چاہتے تھے۔ ان کی شکل و ہیئت سے کوئی ایسے آثار ظاہر نہ تھے، جن سے میرے یا اور کسی شخص کے دل میں
 یہ وہم پیدا ہوتا کہ خودی کا یہ دانتے راز سفر آخرت کے لئے تیار بیٹھا ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

”معارف“

بصیرت

کیوں کر نہ زندگی ہو سعادت مرے لئے	ہر جنبش نظر ہے عبادت مرے لئے
جن کی ہر ایک سطحے اک راہِ ستیم	اُتر ابے وہ صحیفہ قدرت مرے لئے
ظاہر کروں تو کفر کے فتوے لگائے خلق	اُتر ہی ہے عرش سے دہرِ لیت مرے لئے
جب ذہن کے افق چمکتی ہے برق فکر	آتا ہے گھر کے ابرِ ہدایت مرے لئے
تا بندہ جس مقام پہ ہے وجہ ذوالجلال	فخّش ہے وہ فرازِ بصیرت مرے لئے
شکرِ خدا کہ ہر سحر و شامِ زندگی	لائی ہے ایک تازہ بشارت مرے لئے
ہر آن ہے نژدِ دل ملائک مرے حضور	ہر سانس ہے نویدِ رسالت مرے لکھرا
اپنے منیرِ زندہ و جہاں کی قسم	اک حرفِ پوچھ ہے بشریت مرے لئے
جن کی چمک سے جبِ ثقیث ہے تابناک	
مضمون ہے وہ گوہرِ حکمت مرے لئے	

جوش

(کلیم)

مطبوعات

پنجابی صوفی پوٹیس - پنجابی زبان کے صوفی شعراء، یہ کتاب بس لاجپتی رام اکر شنبانی (۱۶۱۱-۱۶۱۲) نے لکھی ہے اور اسکے مؤلف کو غیر مسلم ہونے کی خبر نہیں ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر اسے سی ڈی کے تحت لکھا تھا، مگر بعد میں اسے "تعارف کی ابتدا اور نشوونما کے متعلق ایک پڑاؤ" کے تحت لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ تعارف کیونکر ہندوستان میں پہنچا اور پنجابی شاعری میں تعارف کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد مؤلف نے شیخ ابراہیم فریدستانی (۱۵۵۰-۱۵۵۱ء) سے شروع کر کے اٹھ شاہ (۱۶۱۱-۱۶۱۲ء) تک مشہور صوفی شعراء کے مختصر حالات، تنقید کا نام، اور نوٹ لکھا ہے۔ آخر میں چند کم مشہور شعراء کے حالات بھی لکھ دیئے ہیں اور بعض اور مفید اہلکار بھی لکھے ہیں۔ یہ کتاب ہر اس شخص کے مطالعہ کے قابل ہے جسے ادبیات سے کچھ بھی واسطہ ہو۔ حجم ۴۲ صفحات - قیمت ۵ روپے - آگسٹ ٹریڈنگ کمپنی پریس پوسٹ بکس ۱۱۱ لاہور۔

یادِ مریضہ - یہ خان بہادر ڈاکٹر مسیحہ بیگم الدین احمد صاحب جعفری، بیئرٹھ لاہور کے اسلامی اور معاشرتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ چند عنوانات یہ ہیں: سرزمینِ عرب اور ظہورِ اسلام، اسلام اور عالمگیر مساوات، اسلام اور وطنیت، واقعہ کربلا کی اہمیت وغیرہ، گل اکس مسما میں ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ قیمت ۵ روپے - پتہ: مریضہ صاحب آری پریس ٹولہ - شہزادہ زرتاش - سید سعید علی صاحب ایڈیٹر مہول لاہور نے یہ اضافہ کئین کے ذریعہ کی تبلیغ کے لئے لکھا ہے۔ ۱۹۱۱ء صلا ح دیہات کے حکمہ نے سید صاحب کو اس کامیاب کتاب کی تصنیف پر انعام بھی دیا ہے۔ قیمت ۵ روپے - پتہ: دارالاشاعت پنجاب لاہور۔

انسان - از لالہ کاشی رام صاحب چاولہ - یہ چند مضامین کا مجموعہ جس میں انسان کی زندگی کے متعلق مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً انسانیت کا جوہر انسانی خواہشات، تقدیر وغیرہ حجم ۴۲ صفحات - قیمت ۵ روپے - لالہ کاشی رام چاولہ - دفتر ڈی جی کشر ہوسٹل پارہور۔

(۱) برستان منزل ۸ (۲) گلزارِ محبوبی ۸ (۳) آئینہٴ عثمانی ۸ (۴) بہارِ محوری ۴ (۵) گنجینہٴ معانی ۸ (۶) انیسر سعدی گنج خسروانی - یہ نو فیروز عبدالقوی فانی ایم۔ اے کی فارسی نظمیں یا نظمیں کے مجموعے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو

فارسی شعر کہنے پر خوب قدیم حاصل ہے۔ اکثر نظمیں امراء و اکابر کے قصائد پر مشتمل ہیں۔ قیاسی حجم کے لحاظ سے زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ فارسی کام کے شائقین ان سے شنیدہ ہو سکتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقوی صاحب فانی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ بہت اور وطن۔ اس چھپنے سے رسالے میں ادوارہ روزنامہ "س" ملتان نے وہ تمام منظوم و منثور بحث جمع کر دی ہے جو مولانا حسین احمد کے نظریہ وطنیت پر علامہ اقبال رحمتا اللہ علیہ کے اعتراض سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ برسالہ بہت دلچسپ ہے اور چونکہ اس میں علامہ اقبال رحمہ کا مفصل تعریضی بیان بھی درج کر دیا ہے اس لئے نکتہ آموز بھی ہے۔

نہت ۲۔ پتہ اوپر لکھا ہے۔

مشرقیہ اقبال۔ حضرت اسد ملتان۔ حضرت اسد ملتان بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کا لکھا ہوا ہر شے پڑھنے کے قابل ہے۔ نہت ۲۔ پتہ دفتر روزنامہ "س" ملتان۔

عدل جہانگیری۔ جہاں گیر کے انصاف کے متعلق یہ مثنوی پروفیسر عبدالقوی فانی ایم۔ اے نے لکھی ہے پروفیسر صاحب کو فارسی شعر کہنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے۔ یہ مثنوی بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۱۳ صفحات۔ نہت ۲۔ علامہ محمد پروفیسر صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں ہیں اور وہیں سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

تایخ ادبیات ایران۔ مشہور انگریز مشرق پروفیسر ایڈورڈ بلون کی کتاب لٹریچر ہسٹری آف پرسیا انگریزی زبان میں فارسی ادبیات کی مستند ترین تایخ بھی جاتی ہے اور آج کل ایرانی ادبیات کی تاریخوں میں اس کتاب کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کبھی دوسری کتاب کو جیتے نہیں۔ آجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد دکن اہل ملک کے شکریہ کی تھی ہے کہ اس کے کارکنوں نے یہ عبادتیں کیا۔ ایم۔ اے۔ مددگار پروفیسر اردو عثمانیہ یونیورسٹی سے اس مشہور کتاب کا اردو ترجمہ کر کے شائع کر دیا ہے۔ ترجمہ جیسا بھی ہے نہت ہے لیکن یہاں فوس ہے کہ پروفیسر عباد صاحب نے ترجمے کا کام بہت بے پروائی سے کیا ہے۔ جگہ جگہ زبان ابھی ہوئی ہے اور زبان کے غلات محاورہ استعمال کا بیجا اس کے سوا اور بھی کیا مکتا ہے۔ کاش نید صاحب اہل کو سمجھنے میں اور پھر اسے اپنی زبان سے افکار نے میں ذرا سی زیادہ توجہ سے کام لیتے۔

بہر حال نید صاحب کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ آخر انمول نے ایک ضخیم کتاب کا ترجمہ کرنے میں کافی رحمت اٹھائی ہوگی۔ اور پھر اردو جاننے والے تعریف انہیں کی مصافحہ سے بلون کی مشہور آفاق کتاب کے مطالعہ پہنچ سکے ہیں۔ امید ہے کہ طبع دوم کے وقت نید صاحب کو نظر ثانی کرنے کا موقع مل جائے گا اور ان کی کتاب کا نقش ثانی پہلے سے بہتر ہوگا۔ اردو کا کوئی کتابچہ اس کتاب کے خالی بند ہونا چاہیے۔ جلد لیجیے۔ غیر محلوہ للعیر۔ پتہ اوپر لکھا ہے۔

صحیح۔ کتابت ہندی کی قیمت اگر شہر ہے میں میری طرح ہوتی ہے۔ ۱۰ روپے قیمت ہے۔



فہرست مضامین



”ہمایوں“ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء

تصاویر :- (۱) غازی مصطفیٰ کمال پاشا - (۲) رؤف پاشا - (۳) عصمت پاشا - (۴) کمال اتاترک

شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	غازی مصطفیٰ کمال	بشیر احمد	۸۶۲
۲	اُردو ادبیات کی تجدید	جناب مہمداق صاحب قریشی رامداسی بی۔ اے	۸۶۹
۳	دُعا (نظم)	حضرت آرزو سبانی	۸۷۴
۴	جمہوریہ سپانیہ اور خانہ جنگی	جناب عبد الحفیظ صاحب	۸۷۵
۵	تکدو عمل (نظم)	حضرت مایہ القادری	۸۸۴
۶	فارسی شاعری میں ظرافت	مولانا محمد خواں صاحب شہاب	۸۸۷
۷	میری (نظم)	حضرت الطاف مشہدی	۸۹۳
۸	انتقام (افسانہ)	ملک علما اللہ صاحب کلیم ایم۔ اے	۸۹۴
۹	دردِ نغمے	جناب محمد ایوب صاحب	۹۰۴
۱۰	آئینہ حسرت (غزل)	جناب عبد المجید صاحب حیرت	۹۰۵
۱۱	”ساری“	جناب حمید نظامی بی۔ اے	۹۰۶
۱۲	کیلاش کنول (تراجم از پیام شرق)	حضرت مقبول احمد پوری	۹۱۳
۱۳	گداگر	جناب محمد حسین صاحب غازی، ایڈیٹر املا دہائی، جمنوں	۹۱۵
۱۴	نعت	جناب امجد صاحب قیس جالندھری	۹۱۶
۱۵	چچا بھوک کی جائداد (افسانہ)	جناب ف۔ م۔ افضل صاحب ایم۔ اے	۹۱۷
۱۶	آوارق پارینہ	حضرت حفیظہ ہوشیار پوری ایم۔ اے	۹۲۳
۱۷	جوانی (نظم)	خال صاحب حکیم محمود علی خاں صاحب مایہ اکبر آبادی	۹۲۴
۱۸	جوانی	جناب اختر ہوشیار پوری	۹۲۵
۱۹	آرامِ رافانہ (ادبیاتی غائب الوہی)	صاحبزادہ احمد ندیم قاسمی بی۔ اے	۹۲۶
۲۰	مغل ادب		۹۳۰
۲۱	مطبوعات		۹۳۵

غازی مصطفیٰ کمال

”ہم ایک کام کرنے والی قوم ہیں ایک غریب قوم جو اپنی محاش کے لئے کام کرتی ہے جو اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ اب شاید سترہ اٹھارہ سال ہونے کے کمال پاشا نے یہ الفاظ کہے۔ ان سترہ اٹھارہ سالوں میں اُس نے اس کام کرنے والی غریب قوم کو سماجی و روحانی بندشوں سے آزاد کر لائی اور اُسے ایک طاہرہٴ معاشی زندگی کے لئے پرکھا یا یعنی اس مقابلے کی دنیا اور اس تکمیل کی زندگی میں اس نے اپنی قوم کو صحیح طور پر چید و جب کرنا سکھا دیا!

ایک کمال آدمی کا کچھ کر سکتا ہے ایک فراہمی تدبیر و بہت ساری قوم کی ہمدردی ہوئی تقدیر کو اس طرح بنا سکتا ہے کیسا کہ مصطفیٰ کمال ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سالونیکا میں ایک معمولی کلرک تھا جو برقی ٹرک سے اپنا گزارہ کرتا تھا۔ مصطفیٰ کمال کا تعلق کہ اس کا باپ مر گیا۔ پھر شروع سے خود دار اور آزاد مزاج تھا۔ ایک دُرُاس کے مسلم نے اسے خوب پیٹا اس پر وہ بکول سے بھاگ گیا اور پھر نواں جانے سے اُس نے تعلق انکار کر دیا۔ اُس کے باپ کی خواہش تھی کہ وہ تجارت کرے، ماں چاہتی تھی کہ وہ مذہب سے۔ باپ کی وفات کے بعد ایک روزہ موں نے کہا کہ اُسے سپاہی بننا چاہئے۔ یہ تجویز مصطفیٰ کو دل سے پسند آئی، ماں نے بہت سی مخالفت کی لیکن وہ ناشی سے ایک فوجی سکول میں داخل ہو گیا۔ وہاں اُس کی ابتدا دکنان مصطفیٰ اُس کے کام سے اتنا خوش ہوا کہ اُس نے دوسرے سال میں اُسے فارسی طوطا کی تعلیم کا حکم بنا دیا۔ اور اپنے آپ کو تیر کرنے کے لئے اور غالباً اُس کی قابلیت سے متاثر ہو کر اُسے مصطفیٰ کمال کا نام دے دیا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ مناسرت کے فوجی دستہ میں دو بیس سال کی عمر میں منظمیہ کے شرف کالج میں داخل ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں اُسے فوج میں کمیشن دے کر وطن بھیج دیا گیا۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک کمال ترکی کی سب اداروں میں لاء و دیوں کے خلاف انہوں کے خلاف طرابلس میں بغاوت میں درہ دانیال میں فلسطین میں وہ ہر جگہ موجود تھا لیکن غلطی وہ انقلاب پسند تھا اور شروع سے ترکی حکومت کی طرف بول و درکار و بول و دانت مینا تھا جب وہ کالج میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں طلبہ کی ایک انقلابی تنظیم ”دن“ کے نام سے قائم ہے وہ اُس کو گرم رنگ بن گیا سلطان کی حکومت اس کا پیروں پر اُٹھانے لگی۔ اُس نے جنرل اُٹا بیٹے منگولیا میں اس کا خاکہ کر دیا جاتا لیکن خوش قسمتی سے وہاں کر دیا گیا۔ باوجود اس کے کالج چھوڑنے کے بعد بھی وہ جہاں گیا اُس نے اس جگہ کی شائیں قائم کیں اور اس سلسلے میں ترقی ہی سے کام کیا۔ ۱۹۱۰ء کے ترکی انقلاب میں اُس نے نمایاں حصہ لیا لیکن اور پاشا اور اس کے قتل کرنے اُسے لوگوں کی نظر دلانے اور رکھا یہ حال دوسری بلقانی جنگ میں بھی ہوا جب اور پاشا نے مصطفیٰ کمال کی معیت میں اوریا پول پر بمباری کر دیا۔ لیکن جب تکظم کے چھوڑنے پر وہ دانیال میں کمال کی قابلیت چھپانے کے چھپ گیا۔ اُس کی زندگی پر ہی تھا جس کی ذکاوت و بہت تر کی کٹاؤں آئی اور منظمیہ انگریزوں کی گزشتہ کچھ گیا۔ مشہور واقعات یہ ہیں اُس کی گھڑی پر ایک انگریز کی گولی لگی۔ یہ گھڑی کمال نے تھمے جو اس کا مندر کو دے ہی ۱۹۱۲ء میں ترکی حکومت نے ۳ ہزار روپہ کا انعام مقرر کیا۔ اس طرح یہ دھچپ یا گزشتہ ترکی کے قیدی بن گیا۔

جائے قربت سے گھڑی کہیں گم ہو چکی تھی۔ گیلی پولی کے اس سرے کے بعد مصطفیٰ کمال کو کوئی گمنامی میں زندہ سنا تھا۔ ترکی کے سب سے قابل فوجی سرداروں میں ایک وہ بھی تھا۔ لیکن جیسے جیسے غارتے درز کوں کی شکست پر قدرت نے صرف ایک ہی کرتا کا کہ وہی ہے جو اپنے سرور وطن کو ہلاکت اور تباہی سے بچائے گا!

قدرت نے بکار اور مصطفیٰ کمال نے لبیک کہا۔ ترکی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جہنمی اور اُس کے صلیب بھتیجاؤں نے ڈال چکے تھے، دنیا بخادایوں کا لہو مان ہی تھی اور وہ کسی جیسے بجزے کر چکے تھے، جو کچھ بڑے نام باقی تھا وہاں بھی ترکوں کی آزادی پر ہزار ہا شہرناہد کیے جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اسے میں ملک میں فلاح جی شروع ہوئی اور اتحادی ایشیائے یورپائی نے سمرنا میں اُتر پڑے لیکن ترک سرزور نہ ایک ایک گروہ ابھی باقی تھا جو حکومت کو غلامی پر ہزار بار تزیین دیتے تھے۔ مصطفیٰ کمال نے اسے منتشر جماعت کو اکٹھا کیا اور اپنے عزم و ہمت سے مُردہ قوم میں ایک نئی سرخ بھونک دی۔

سلطان نے اسے اناطولیہ بھیجا کہ قومی شورش کرنے والوں کی سرکوبی کرے۔ ۱۹۱۹ء میں سلطان کو جب وہ ہمسوں کی بند گاہ میں اُتر آؤں گے تو فرما کر چادر در پیلے یونانی سمرنا میں ڈیرے ڈال چکے ہیں۔ اُس کے تن بدن میں لگ لگائی۔ وطن ڈوب رہا ہے اسکا بچاؤ لازم ہے۔ یہ خاموشی اللہ انتظار کا وقت نہیں ملے اور صدر و ہمد کی گھڑی ہے سلطان نے اُسے پلاس بکھا بھیجا۔ اس نے جواب دیا کہ میں اناطولیہ میں ہوں جب تک کہ قلم اپنی آزادی حاصل نہ کرے۔ پیلہ ارض و دم در پیر اس میں قومی مجلس طلب کی گئی اور قومی تریخ بنی قلم کا حکم دینے و دستور سے ہونے لگا۔ یہ کہہ کر قسطنطنیہ کی حکومت نے پہلے تو قمر پورستان نائزوں کی گرفتاری حکم دیا جس کے سلسلے میں کمال بال بال بیچ گیا لیکن ابھی اسی حکومت نے قسطنطنیہ میں قمر پور پینٹ کو قسطنطنیہ آنے کی سخت دبی باوجود کمال کی مخالفت کے کہ ان کو انڈان میں خوش خوش پہنچے اور وہاں اُنہوں نے اپنا قومی معاہدہ شائع کیا جس کی رو سے ترکی کو اپنے قومی حدود میں پوری آزادی کا حق حاصل ہونا تھا۔ اس کے ڈیڑھ ماہ بعد اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور قمر پورستان اُن کے ہاتھ آئے اُن کو چکر و کر بول وطن کر دیا۔ جرنیل یونانی سمرنا کی طوت بڑھے بھلائی میں وہ قسطنطنیہ پر چھا گئے۔ اُسے تیس ترکی کی موت کا حکم دینے پر سیر کی مشورے میں سنا لیا اس کے بعد مصطفیٰ کمال کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت باقی نہ رہی اور ایک ایک ترک اُن کے جھنڈے تلے جمع ہونے اور اُنہوں نے قمر پور تیار ہو گیا۔

کمال کا کام نہ تھا مشاورتھا سلطان کی حکومت نے اس کے اور اُس کے قتار کے خلاف موت کا حکم صادر کیا تھا اور مذہبی پیشواؤں کی مدد سے اعلان کیا تھا کہ شورش ان کو قتل کرے گا وہ دونوں جہاں میں سرخ رو ہوگا، فوج نلدرد، روسیندار، دیوینا کی بڑی سے بڑی طاقتیں مخالفت۔ اُدھر سب کچھ تھا لیکن اُدھر ایک عزم کی چگاری اور ہزاروں لکھوں اُن ایک چنگاری سے جل اُٹھے تلے تلے جو ڈر اور محسوس کرنے والے کہ جو ہوسہوہو آواز زندہ رہیں گے تو آزاد ہو کر رہیں گے ورنہ وہیں گے اور تلے تلے جان دے دیں گے۔ کمال ایک تھا لیکن سب لوگ تھے گویا اُس کے کلمات! ایسی آگ کے آگے خاک کی کیا حقیقت تھی؟ ۱۹۲۰ء میں کمال نے ترکوں سے خطاب کر کے کہا کہ "یا فتح یا دھمکٹ باؤ!"

پہلے یونانی بڑے اور کئی نوبل تنک بڑھتے گئے۔ وہ ہر خطہ خلیاب ہرے البتہ ۱۱ جنوری ۱۹۲۱ء کو اٹوٹو کی لڑائی میں ترکوں نے نصرت کی قیادت میں اُن کے پہاڑی محل کی۔ یہ پہلی ترکی فتح تھی اور اسی کی یاد میں کمال نے بعد کو عصمت اٹوٹو کا خطاب دیا۔ پھر جہنمی کی بی بی سلیما نے ترک سکا۔ یہاں تک کہ وہ انجورہ سے چالیس میل پر پہنچ گیا۔ یہاں پہلے سے متعارف کے کائے یہم آگست سے ۱۳ ستمبر ۱۹۲۱ء تک آکس۔ دن تک وہ جنگ بوہاری جو دنیا کی تاریخ میں عجیب یادگار رہے گی۔ یونانی اسی ہزار تھے ترک صرف پچیس ہزار لیکن یہ سلطان توڑ کر لڑے۔ دن کو نہمک راتوں کو

یہ ارمان و زوہب اس فوج و فراہنگ کی فوج و دلاں بنا رہا۔ آخر ایک لاکھ تالیس ہزار سے زائد فوجوں نے کمال نے کہا ”اچھا تو تم کہتے ہو کہ آج لڑائی ہمارے حق میں ہے۔ اس جنگ میں ۱۶۵۰۰ ترک گرام آئے لیکن ان کی موت سے ترکی کو ایک نئی زندگی مل گئی۔“

پھر کیا تھا کمال نے قدم در دیا کامیابی نے پاؤں پڑے۔ ہر طرف حالات ملوث ہونے لگے۔ شاہ ایران کو ایک ہندو نے کاٹ لیا۔ وہ مر گیا تو جرمنی و روس قسطنطنیہ تخت پر بیٹھا ہے دیکھ کر اتحادیوں کی یونان و سربیا گئی۔ فرانس نے چمپے سے ترکی سے ایک معاہدہ کر لیا۔ پہلے ہی دو گارغا، اطالیہ بھی تھپا بیچ رہا تھا۔ کمال کے ساتھیوں نے بیتر اندوہا کھلی کر لینی چاہئے مگر کمال راہ کو کھتا تھا کہ جب تک سائے ملک کو دشمن کے خوفی پنجوں سے نہ چھڑاؤں گا دم نہ دوں گا۔ چنانچہ آئندہ سال ۱۹۱۶ء گشت کو اس نے جابجا کارروائی شروع کی اور ترکی فوج کے ہم پناہ صحیح ”جنگجو! بڑے جلد، ہماری منزل مقصود بحرِ روم ہے۔ اس پڑکوں نے اس زور سے جھکایا کہ چودہ دن میں شکستوں پر تکتیں کھاتے ہوئے یونانیوں کو سربازوں میں ہمارے ہر جہازوں میں ہمارے ہر کھاتے تھے۔“

دُنیا مہا کھڑا مٹی، ملک ملک سے مبارکباد کے پناہ مات آنے لگے، ترکوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی لیکن کمال جانتا تھا کہ اس کے کام کی محنت ابلے ہے ابھی غلط بنا دیکھی گئی ہے۔ ابھی نئی ترکی کی دھمیر ہوئی ہے جس میں ہزاروں مشکلوں کا سامنا ہوگا لیکن وہ مصطفیٰ کمال نہ ہوتا اگر وہ ان مشکلوں سے ڈرنا بھیک جاتا نہیں بلکہ اس عظیم الشان انسان نے خود پرانی آسائیل نئی مشکلوں میں تبدیل کیا اور پھر ان مشکلوں ایک ایک کر کے یوں حل کیا کہ دُنیا حیرت میں لگی!

اُس نے سلطان کا عہدہ اڑا دیا۔ اور لوزان کے معاہدے کے ذریعے جس میں لارڈ کرزن چاراما ہنگ عصمت کے برابر بہرین سے فاعل بحث کرتا رہا ترکی نے جو اعلان چار سال پہلے دُنیا کے سامنے کیا تھا اس کے مطابق مسلح کی شرائط نکالیں۔ ترکی اپنی قومی حدود میں صحیح منسل میں آ کر اڑھا رہی، ایسا مہیا دیکھی اپنی وسیع سلطنت کے زمانہ میں بھی نہ ہوا تھا۔ ترکی کی سب سے بڑی فتح یہ تھی کہ اُس نے دُنیا کی سب سے بڑی طاقت انگلستان کو شکست دی، انگلستان جس کی سلطنت پر سورج کبھی نہیں ڈوبتا، اُس کے غور کا جھنڈا پہلی بار کمال کے سرنگوں آوا۔ ذمہ داریاں میں اور قضا السارہ میں بلکہ دیا سے عادیہ کے کان سے اور لوزان کانفرنس میں ترکی کو فتح نصیب ہوئی اور انگلستان اور اُس کے جہازوں کو شکست ملی۔ لایہ عاجز سے لوگ کی شجی کر کر رہی ہوئی اور کمال کے نام کا چارواک عالم میں دھنکا بھنے لگا۔ اب کسی بیرونی طاقت کو ترکی کے کسی ٹکڑی مٹانے میں دھل دینے کا حق باقی نہ رہا تھا۔ (مجموعہ دارالسلطنت قرار پایا اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو جمہوریہ ترکیہ کا اعلان کیا گیا اور مصطفیٰ کمال اُس کا مستقل صدر بنا۔)

آئندہ سال خلافت منسوخ کی گئی اور کمال نے اپنی ان اصلاحات کو نافذ کرنا شروع کیا جن سے اُسے ترکی کو ایک نیا ترکی بنانا مقصود تھا۔ درویشوں کا اثر اور ملاؤں کا اقتدار مٹا دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں موسمی ٹوپی کی جگہ یورپی ہیٹ کا پہننا لازمی کیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں قوانین سکھنے میں سرٹیفکیٹ کا دیوانہ مضابطہ، اطالیہ کا قاعداری مضابطہ اور جرمنی کا تجارتی مضابطہ رائج کیا گیا۔ پردہ عکس اٹھا دیا گیا۔ جلدوں کے لئے ملازمین کے دروازے کھول دیئے گئے اور تین سال بعد ۱۹۲۷ء میں انہیں مقامی انتخابات میں حصہ لینے دینے کا حق دیا گیا۔ ہر فرد ۱۹۲۵ء کو سرور عورتوں نے ترکی پارلیمنٹ میں رکنیت کا حلف اٹھایا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کمال جس نے ترکی عورتوں کو

اتنے حقوق دینے خود غائی زندگی کی خوشیوں سے زیادہ ملکتا ہوا سار کا جب وہ صاحبِ اقبال ہوا تو وہ اپنی ماں کو استنبول میں لے آیا لیکن وہ سترہ برس وفات پا گئی۔ ۱۹۲۵ء میں شاید مکمل تین سال کی رفاقت کے بعد اس میں اور اس کی بیوی لطیفہ خانم میں تباہی تاسی اس قدر بڑھ گئی کہ کمال نے اسے طلاق دے دی۔ اس کے بعد اس نے ایک لڑکی زہرا کو شہقی بنایا اور اس کو بہترین تعلیم دی لیکن بد قسمتی سے زہرا سترہ برس میں ایک حادثہ میں لگی اور کمال پہلے کی طرح تنہا رہ گیا۔ لیکن کمال کی تنہائی کی تباہیوں میں بھی قومی خدمت کی روشنی جلوہ رہتی۔ اس نے کئی کمیٹیوں کی پدمش کی اور ان میں اچھے تجربے پر ہنپایا۔ اپنے ہم قوں کی ترقی کے سوا اور کوئی چیز اس کے پیش نظر نہ تھی۔

۱۹۲۵ء میں کمال نے سات لمبی اول کی تباہی کے بعد محسوس کیا کہ اس نے ایک نیا دور ترقی کی جبراً پہنچا کرنا پڑا ہے۔ اس میں اس نے بنایا کہ نیا شریک کیا کر چکا ہے اور ابھی کیا کرنا باقی ہے۔

اس نے ملکی زندگی کے ایک ایک شعبے کی طرف توجہ کی۔ زہرا سترہ برس میں لاطینی حروف جاری رکھے گئے۔ کمال خود لاطینی حروف سیکھنے کے بعد اپنے تمام دزیروں کو قسطنطنیہ لے گیا اور وہاں اس نے بڑے پیادہ پر ایک پارٹی دی جس میں تختہ سیاہ پڑ چاک اس نے نئے حروف کا پہلا سبق ترک کر دیا اور کتب ہی نہیں بلکہ تختہ سیاہ اور چاک لے کر وہ شہروں میں دو گڈوں گاڈل پھرا۔ اس پر صمت نے کمال پر پروفیسر اعظم اور پروفیسر (ان جین) کی پھرتی کی۔

(ان اصلاحات پر ملک کے بعض طبقوں میں ناراضی پھیلی۔ لیکن مصطفیٰ کمال اپنا ارادہ پکا کر چکا تھا۔ پہلے ۲۵-۲۶ء میں اور پھر ۲۹-۳۰ء میں کمال کی لہجہ اتھوئی انوشیں نہیں بھلا کہ نعرہ بلند کیا گیا۔ آدم شراک کمال کا انگریزی سیرت نگار جو کمال کی انگریزی سے حلافتا جابجا اس کی شراب نوشی اور زن پسندی کا طعنہ دیتا ہے۔ بیان کرتا ہے کہ ہر حاجب کوئی خوشحال مٹی مٹی تو کمال اپنے پیش قدمی کے ارادہ کو چھوڑ کر اس طرح چلے گا کہ اور میدان جنگ کی طرف پلٹتا تھا جیسے وہ کوئی چنگاڑے والا "مچھڑا بھیڑیا" ہو۔ ہر حاجب تک میں بدامنی پھیلی اور لوگ سمجھ کر شاید کمال میں پہلے صاحبِ وفاداری باقی نہیں رہا تو اس نے انات سینل تک ایسی سرگرمی دکھائی کہ دنیا داہ وا اور قوم آتنا صدقتا کہہ سکتی!

اگست ۱۹۲۵ء میں اس نے تجربے کے طور پر مجلس ملیہ میں ایک مخالف پارٹی کے قیام کی اجازت دے دی لیکن جیسا اس سے ملک میں خرابی پیدا ہوئی تو اسے قوت کر دیا۔ اور اپنی آمریت کا خود اعلان کیا۔

وہ ترکوں کی بغض پر جانتا تھا۔ وہ ترکی کی ضروریات سمجھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسی نے ترکی کو زندہ کیا ہے اور وہ بھی اسی نے نہ ہکھ سکتا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں جب طاقت ہوئی تو اس نے لکھا کہ میں ترکی ہوں۔ مجھے تباہ کرنا تو کی کوتاہ کرنا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں جب صمت نے کہا کہ گوفازی قوم کا نمائندہ ہے لیکن ملک کی حاکم حکومت نے تو کمال نے غمغظوں میں صاف کر دیا کہ حکومت میں کرتا ہوں۔

یہ سب کچھ محض ملک کی خاطر تھا۔ وہ اسے کوئی ہوس نہ تھی۔ جون ۱۹۲۵ء میں اس نے اپنی تمام جائداد و قوم کی نذر کر دی جس پر مجلس ملیہ نے اسے "نا ترک" یعنی ترکوں کے باپ کا خطاب دیا۔

بعض جمہوری افسروں کی رائے اور وہ ہم غلط تھی لیکن واقعہ ہے کہ اس نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا۔ اس کے پیش نظر ترکی کی بہبود تھی۔ اور وہ نے چند خدمت پسندوں کے لیے اس کی مخالفت نہ کی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس کی ہر بات کو درست سمجھتے تھے بلکہ یہ کہ وہ ان کا

اتارک تھا، یہ وہی تھا جس نے اُن کے تباہ شدہ ملک کو زندہ و تابندہ کیا تھا پھر وہ کس طرح اُس کے حکم سے سرتابی کرتے، اُسی نے ترکی کو زندگی بنایا تھا سو وہ ان سب کا محبوب اور اُن کی آنکھوں کا تار تھا اور وہ جان و دل سے اُس کے سپرد تھے۔ کمال نے جس مضبوطی سے ترکی کی جلی بنیاد کو استوار کیا، اُس کا ایک ثبوت یہی ہے کہ اُس کا انتقال پر ہم گھٹنے کے اندر اندر نہایت مطمئنانہ عینیت اور فکری طور پر کمال کا مدد و نصیب کیا گیا اور نئے صدر نے معاً اتارک کی پالیسی پر قائم رہنے کا اعلان کر دیا۔

کمال نے اپنے ہم وطنوں کی نظر میں یہ مرتبہ آسانی سے حاصل نہ کیا تھا۔ آغازِ جوانی میں وہ قید و ہوا پر کئی بار وہ قید ہونے لگے کئی بار اڈا لکھنؤ کی قومی جدوجہد شروع ہونے پر تو اُس کی زندگی ہر وقت خطرے میں تھی۔ صدر جمہوریہ بن کر بھی اُسے چین لینا نصیب نہ ہوا کہ کئی خوشیں اٹھیں، کئی بغاوتیں پر پا بچوس۔ اس کے علاوہ عمر بھر وہ دوسروں کے رشک و حسد کا نشانہ بنا رہا لیکن کمال کی شخصیت میں نہ امن و مصونتی ہیں نہ بچا سکتی ہیں، ایسے انسان مخالفیت اُٹھرتا وہ دُشمنوں میں پھنستے ہیں۔ وہ دوسروں کی تعریف کے بجائے پیسے نہیں بہتے۔ دنیا کی کچھ کام کرے وہ اپنا منصبی کام کئے جاتے ہیں اور اسی کو منہ سائے زندگی تصور کرتے ہیں۔

ایک انٹرویو میں اس پر باندھا جاتا ہے کہ وہ اسلام سے نفرت تھا اور اس کے اثر سے ترک اپنے مذہب کے لیے پروا نہ کئے مگر ناگزیر میں اُس کی شرکت اُس کے اعتقاد کا ثبوت ہے، خطبے میں اُس نے ترکوں سے کہا کہ اپنے دین پر قائم رہو اور اپنے وطن سے محبت رکھو۔ وہ اپنے آپ کو پیغمبرِ اسلام کے غلاموں میں شمار کرتا تھا۔ ڈاکٹر انڈرمن جو ۱۹۳۲ء کے سرمایہ انگورہ میں کمال کے مہمان رہے لکھتے ہیں کہ اُس کے دل میں اسلام کی تڑپ ہے اور سب جہیں پہلے سے دیا دہ آباد ہیں، کمال نے ایک موقع پر کہا کہ ہم نے ناموسِ اسلام کی خاطر مسلسل جاپا کیا اور کئی بھی تلواروں کے لئے یہاں اسلام کی حفاظت کریں گے۔ اسلام ہماری سوز و گریز سے بے جاں فریگ راور دعا باز مذہبی پیشواؤں کے دُشمن ہیں۔

نولین کی طرح کمال میں یہ دھت تھا کہ وہ نہ صرف ایک بہادر سپاہی اور ایک قابل سپہ سالار تھا بلکہ ایک دُور اندیش مدبر اور ایک سرورِ راج ناظم بھی تھا۔ اور اُس نے اپنی معاشی اصلاحات سے ترکی کی قومی بنیادوں کو خوب مستحکم کر دیا۔ بنگ قائم ہوئے اور ملین کارخانے بھی گھومنا لگے۔ ۱۹۲۴ء میں ملک میں نوے کروڑ کی چیزیں تیار ہوتی تھیں۔ ۳۱ء میں ۴ ارب ۳۸ کروڑ کی۔ شکر اُکھڑا، کاغذیہ ملک کے اندر ہی تیار ہونے لگے۔ معاشی ترقی کے لئے دسمبر ۱۹۳۳ء میں پہلی پنجالیہ سکیم کا آغاز ہوا اور ۱۹۳۵ء کے اخیر سے پہلے ہی دوسری پنجالیہ سکیم شروع کر دی گئی جس میں زراعت اور معدنیات کو عام عہدو دی گئی۔

کمال کی آزاد خیالی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے جرمنی کے دھتکار سے بھڑے یہودیوں کو ہٹا کر اپنی معز و ریلوں کی خدمت اُن کے سپرد کی، اُس نے دوسرا ملک بدر دوسروں کو بھی ترکی میں شہری حقوق دیئے۔ شہریت کے سلسلے میں اُس نے ایک اور عجیب و غریب تجربہ کیا۔ خالدہ اویب لکھتی ہیں کہ اُس نے دس سے پندرہ برس تک کے سکول میں پڑھنے والے بچوں کو سال میں ایک ہفتے کے لئے شہرِ دول اور تقبول کا انتظام کرنے کا اختیار دے دیا۔ دُنیا میں کتنے جنگجو گروہ ہیں جنہوں نے آئین بندی اور شہری حقوق کے معاملے میں ایسی توجہ اور اتنی ہمدردی دکھائی ہو، کمال واقعی صاحبِ کمال تھا

زندگی کے آخری چار سالوں میں کمال نے یورپ و ایشیا کی کئی طاقتوں سے ترکی کا رشتہ جوڑا اور معاہدے اور اتحاد قائم کئے۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہوا؟ محض اس طرح کہ پہلے اُس نے ملک کو آزاد کیا، قوم کو متحد کیا، فضول دسیں موقوف کیں، قسمت کی جگہ انسانی ہمت کو اُبھارا۔ معاشی حالت درست کی پھر جب ملک مضبوط ہو گیا اُس کی طاقت ہر طرح دوسروں پر عیاں ہونے لگی تو اُس نے قوموں اور ملکوں کو جڑ جڑ سے ترکوں کے خون کی پیاسی تھیں، ترکی کو سیاسی رشتے قائم کرنے کے لئے انتہائی خواہش مند پایا، اس طرح خود داری حاصل کر کے کمال نے اپنی فیاضی اور دُراندیشی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ سن ۱۹۱۳ء میں یونان سے معاہدہ ہوا۔ سن ۱۹۱۳ء میں بلقانی معاہدہ یعنی ترکی، یونان، رومانیہ اور یوگوسلاویہ کے درمیان صلح کا مہنامہ ہوا۔ یہ محض ترکی کی طاقت کا باعث تھا کہ ۲۰ جولائی ۱۹۱۳ء کو درویشیاں کے متعلق مونترکی اہم معاہدہ عمل میں آئی جس سے اطالیہ کے سولائی اٹروں یورپ نے ترکی کا درویشیاں کی قبضہ بندی کا حق تسلیم کر لیا۔ سن ۱۹۱۳ء میں اسکندرونہ کی جنگ کے متعلق فرانس اور ترکی کا معاہدہ ہوا اور ترکوں کو اسکندرونہ میں خاص حقوق حاصل ہو گئے۔ اسی سال سعد آباد کا وہ معاہدہ اسلامی مہمانانہ ہوا جس کی رو سے ترکی، عراق، ایران، اور افغانستان کی اسلامی حکومتوں نے آپس میں اتحاد قائم کر لیا۔ اپنی زندگی کے آخری سال میں کمال نے انگلستان اور جرمنی سے تعلقات بڑھائے اور اُن سے قرضے لے کر اُسے ترکی کی بھری طاقت اور معاشی ترقی میں صرف کرنا شروع کیا۔ اس سے کمال کا تدبیر اور زمانہ شناسی ظاہر ہوتی ہے۔ درہم ترک کی کو کمال نے اس قدر مضبوط بنادیا تھا کہ صرف چھوٹی چھوٹی بلقانی ریاستیں بلکہ بڑی بڑی یورپی طاقتیں بھی اب ترکی سے تعلقات بڑھانے کی خواہش مند نظر آنے لگیں۔ فلسطین کے متعلق اُس کے احتجاج کا انگلستان پر خاما خراہا۔ ترکی اب ایک الگ تھلک ملک نہ رہا تھا۔ یورپ اور ایشیا کے اکثر چھوٹے ملک خود بخود اُس کی طرف کھینچے چلے آئے اور بڑی طاقتوں نے بھی اس کی طرف دوش کا ہاتھ بڑھایا۔ کمال نے اُدھر اُدھر سے اور اُدھر اُدھر انگلستان اور جرمنی اور فرانس سے رابطہ پیدا کیا۔ مغرب میں وہ بلقانی ریاستوں کا مددگار ہوا، مشرق میں وہ اسلامی ملکوں کا حلیف بنا۔ گویا ترکی مشرق و مغرب کو ملا دینے والی طاقت بن گئی! ترکی کی یہ اندرونی طاقت اور یہ بیرونی وقار سب فقط ایک شخص کی پُر خلوص کوششوں کا نتیجہ تھا۔ پھر اُس کا ملک اور دنیا اس کی جتنی بھی تعریف کرے کم ہے۔ انگلستان کے اخبارات نے اُس کے انتقال پر ایسے ایسے مضامین لکھے جو آج کل کے زمانے میں کسی غیر حکمران کو نصیب نہ ہوتے تھے۔ ٹریبیون اخبار (لاہور) نے لکھا کہ اُس کے کارناموں کی نظر دُنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ متعدد لوگوں نے اُس کے کام کو معجزہ سے تعبیر کیا ہے۔ کمال کی وفات پر ترکی میں جلی نے فیصلہ کیا کہ اس موقع پر ایک لاکھ پونڈ صرف کیے جائیں۔ نیز الفرو کو اُس کی یادگار کے طور پر اتاترک کا نام دیا گیا۔

کمال کی سیرت کی مضبوطی ایک چٹان کی طرح تھی۔ مرنے سے تین ہفتے پہلے ۱۹۳۸ء کو وہ سخت بیمار ہو گیا۔ وزیر

سب استنبول میں جمع ہو گئے اور اُس کے ہائشین کی تلاش ہونے لگی۔ لیکن ایک صبح وہ اُٹھا، اُس نے لمیونیز اور تازہ اخبار منگایا اور پھر بڑا آواز میں کہا ”میں اچھا ہو جاؤں گا اور وزیرِ عظم سے اُس نے کہا کہ ”تم سمجھتے تھے کہ میں مرنے لگا ہوں لیکن میں مروں گا نہیں، میں زندہ رہوں گا۔ چنانچہ صحت بحال ہو گئی اور جمہوریت کی پندرہویں سال گرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔

لیکن تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ چند روز کے بعد پھر مرض کا دورہ ہوا اور ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو یہ عظیم الشان انسان دُنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

۱۸ نومبر کو استنبول میں والہاد جوش کا بے نظیر منظر دیکھنے میں آیا۔ ایک لاکھ سے زائد ترک دود و اور چار چار کی قطاریں جنازے کے پاس سے روتے ہوئے گزرتے تھے۔ ایک وقت میں ہجوم کا اس قدر زور ہو گیا کہ گیارہ آدمی ہلاک اور کئی سخت زخمی ہوئے اور ایک ہزار بچے عورتیں اور مرد بے ہوش ہو گئے۔ جمہوریہ ترکیہ کے سمبول کیل کے سامنے تیس ہزار طلبہ نے جمع ہو کر حلف اٹھایا کہ جس نصب العین کے حصول میں غازی عظم نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اسی کے لئے وہ بھی اپنی جانیں وقف کر دیں گے۔ بالفصوم ترکی طالبات نے ”دُنیا کے سب سے محبوب حکمران“ کی یاد میں جس نے ترکی عورتوں کو مردوں کے برابر رتبہ دیا، سب سے بڑا جوش مظاہر کیا۔

۲۱ نومبر کو استنبول میں کمال کا جنازہ ایسی دھوم دھام سے نکلا کہ آج تک کسی بڑے سے بڑے سلطان کو بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ جنازہ کے ساتھ مختلف ملکوں کے نمائندے تھے۔ سر پر ہوائی جہازوں کا شور تھا۔ دُور سے توپوں کی دھم آواز آ رہی تھی۔ سڑکوں کے دور دیہ ہزار ہا انسان کھڑے تھے اور غزتیں سوتی ہوئی چلتی تھیں ”تم کہاں ہو اتنا ترک؛ اتنا کہ تم کہاں ہو“ توپ گاڑی کے پیچھے پیچھے مرحوم کی بہن بھی روتی جا رہی تھی۔ جنازہ کے بعد ملک بھر میں تین منٹ تک خاموشی منائی گئی اور یہ دن ملکی ماتم کا دن قرار دیا گیا۔

کمال کو فہ الحال استنبول کے ایک عجائب گھر میں عارضی طور پر دفن کیا گیا ہے۔ تجویز ہے کہ اناطولیہ کے پہاڑوں میں جہاں اُس نے ترکی قوم کو تباہی سے بچا کر دُنیا بھر میں سر بلند کیا تھا، کن بزموں مقام پر اُس کا ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ مصطفیٰ کمال مرگیا لیکن ترکی کو زندہ کر گیا! وہ ایک سچا غازی تھا!

اُردو ادبیات کی تجدید

(چند افکار)

اس امر پر سب اُدباء اور محققین متفق ہیں کہ اُردو ادبیات میں ایک زبردست انقلاب کی ضرورت ہے۔ ہمارا ادب بوسیدہ اور کمزور ہے، اس لئے کہ ہم خود بوسیدہ اور کمزور ہیں۔ اسے دیرینہ غلامی کا نتیجہ کہئے یا کچھ اور۔ بہر حال یقیناً ہے کہ ہمارے اعضا منفلوج اور ناکارہ ہو چکے ہیں۔ ہمارا اپنی زبوں حالی، اور پست خیالی پر قانع ہونا اس سے بھی زیادہ افسوس کا امر ہے۔ ہم دوسروں کے پیچھے ہٹے ٹکڑوں اور چبانے ہوئے ذالوں کو چپا کر جسم اور روح کا تعلق قائم رکھتے ہیں۔ زندگی کے تمام شعبوں میں ہماری ذہنیت حد درجہ پست ہو گئی ہے۔

اس کا ثبوت محض ہماری سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی ہی سے واضح نہیں۔ سب سے زیادہ صریح اور میرز بنوٹ ہمارے ادب سے ملے گا۔ ادب قوم کی زندگی کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ عکاس کو جب کسی ملک یا قوم کی زندگی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے تو سب سے پہلے ان کی نظر اس ملک یا قوم کے ادب پر پڑتی ہے۔ غلاموں کا ادب بجائے خود غلامی کی جیتی جاگتی تصویر ہوگی۔ اور اس میں بالضرورت اور بالترتیب وہ تمام عیوب نقائص پائے جائیں گے جو ان کی ذہنیت میں جمع ہو گئے۔ ہمارے ادبیات کا سب سے بڑا نقص اہمیت کا فقدان ہے، ہمارے خیالات ہمارے اپنے نہیں جو کچھ ہم کہتے ہیں اس کا بیشتر حصہ کسی اور دماغ کی اختراع ہوا کرتا ہے۔ ہم دوسروں کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ دوسروں کے ماحول میں رہتے ہیں۔ دوسروں کی باتوں کو دلچسپ اور پُر معنی سمجھتے کرتے ہیں۔ اپنے ماحول، اپنے وطن، اپنے مشاہدات اور ذاتی جذبات قلب بند کرنے کو عار سمجھتے ہیں۔

ہندوستانی راجدھانہ ادب کے محسن، مرثی اور دلدادہ کس چہ کی تلاش میں مائے مائے "دیا ریخ" میں پھر رہے ہیں۔ وہ کونسی چیز ہے جو خود ان کے گھر میں موجود نہیں، ان کے ماحول میں کونسی کمی اور دوسروں کے ہاں کونسی جاذبیت ہے جو ان کا بھپا نہیں چھوڑتی۔

اُسے اُدبائے اکمال! خدا بتائیے کہ آپ قمری و شمشاد، وگن و سترن، لالہ دریا خان اور ساقی و ساغر و مینا و جام کے پیچھے کیوں اچھو دھو کر پلٹے ہوئے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ سمرقند و بخارا کے بجائے دہلی اور لاہور میں رہتے ہیں۔

آپ کا وطن عزیز ایران یا انگلستان نہیں، ہندوستان ہے۔ آپ سرووشا کے بجائے آم اور بھان کا ذکر کیوں نہیں کرتے: بڑا اور پھل کے سامنے آپ کو بلوط کا درخت کیوں پسند ہے؛ چنبیلی اور موتیے کے پھول، کنول و جان کے لہلہاتے ہوئے سرسبز پودے، گندم کے نہری کھیت۔ پھولی سرسوں کے لہنتی فرش۔ فاختاؤں کی کوکو، پیپے کی پی کپا، کوئوں اور بگلوں کی ڈائیں، مور اور چکور، پھلیاں، خرگوش اور گلہریاں — یہ سب چیزیں کیا آپ کو پسند نہیں؛ کیا آپ کو شیشم اور سرس کی ٹھنڈی چھاؤں مرغوب نہیں؛ کیا آپ کو سدان کے کالے کالے بادل نہیں بھاتے؛ کیا کبھی آم کے مور کی ہلکی اور بھینی بھینی خوشبو نے آپ کے مشام جال کو معطر نہیں کیا؛ کیا کبھی پچھلے پھر کوئل کی کوک آپ کے سینے میں اترتی نہیں چلی گئی؛ کیا سردیوں میں آپ کبھی دیر تک دھوپ میں نہیں بیٹھے؛ اور گرمیوں میں دیر تک نہر کے پانی میں کلیں نہیں کرتے سب؛

یقیناً آپ ان تمام باتوں سے بخوبی آشنا ہیں۔ مگر صاحب! آپ کے قلم سے ان کا ذکر بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؛ آپ اپنے ماحول سے کیوں اس قدر بیگانہ رہتے ہیں۔ اسی ماحول میں وہ تمام رومانیت، اور عذبت موجود ہے جس کے آپ شیدائی ہیں۔ غیروں کی خوش چینی درست نہیں۔ آپ بے تکان دوسری زبانوں اور غیر ملکی ادب سے انسانوں کے پلاٹ اور نظموں کے تخیل اڑا لیتے ہیں اور حوالہ دیتے بغیر انہیں اپنے ادب میں منتقل کئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ شہرت تو حاصل کر لیں گے، مگر ادبی گناہ آپ کے سر لازم آئے گا اور اصل مصنف کی رُوح کو جو صدمہ پہنچے گا اس کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔

یقین کیجئے، اپنے دویان زندگی میں مجھے سب سے زیادہ رنج اور دلی بے چینی اس وقت محسوس ہوتی ہے جب میں اپنے ادب میں کوئی ایسا افسانہ یا مضمون پڑھتا ہوں جو بلا حوالہ کسی اور جگہ سے اخذ کیا گیا ہو، چوری اور سید زوری ہی کا نام ہے۔ پلیمیا رزم (Plagiarism) یعنی ادبی چوری دنیائے ادب کا گناہ و کبیرہ ہے۔ ایک دفعہ میں ایک اردو فنّا "اتفاقات" پڑھ رہا تھا۔ افسانہ ختم کر کے دیر تک "افسانہ نویس" کی تعریف کرتا رہا۔ اور رسالہ کے حاشیہ پر اس کے فن واقع سازی کی توصیف میں ایک طویل شذرہ لکھا۔ مگر افسوس کہ وہ شذرہ مجھے حرف غلط کی طرح قلمزن کرنا پڑا۔ اگلے ہی دن ٹیکسین کا ڈرامہ "شب دوازدم" پڑھنے لگا۔ پلاٹ کا مطالعہ کیا تو میرے تن بدن میں گویا آگ لگ گئی اور تمام خمر خندت میں بدل گیا۔ وہی پلاٹ تھا اور وہی کردار صرف ناموں کا تغیر۔ اس مثال سے کسی کی تعحیک متصور نہیں۔ اپنے ادب کی بے بائگی کا ذکر ہمارا مطالبہ ہے۔ یہ ایک ہی مثال نہیں۔ بیسیوں دفعہ مجھ سے ہی اتفاق ہوا ہے۔ یہ فلاں ذہنیت کا کھلا مظاہرہ ہے۔ اگر آپ کسی دیگر ادب کے استفادہ کرتے ہیں تو اخلاقِ جرأت سے کام لیتے ہوئے اس کا اعتراف کیوں

نہیں کر لیتے؟ اور آپ دھڑ دھڑ کیوں مائے مائے پھرتے ہیں؟ آپ کے ہاں کس چیز کی کمی ہے؟

آپ اپنے اسلاف اور معاصرین میں مقامی رنگ پیدا کیجئے۔ کیا آپ کو اپنے ماحول میں بیسیوں اسلاف کے لئے پلاٹ نہیں ملتے؟ کیا آپ کے ارد گرد محبت نہیں کی جاتی؟ اور ناکامی، عداوت، بے گناہی، حسد، رقابت وغیرہ جذبات اور حالات موجود نہیں۔ کیا آپ کے ماحول میں کبھی حق و باطل میں آویزش نہیں ہوئی؟ کیا آپ نے کبھی اپنی آنکھوں سے دو سچائیوں کی انفرادیت نگر نہیں دیکھی؟ کیا آپ کے ملک میں بے وقت اموات واقع نہیں ہوتیں؟ کیا آپ نے کسی ناکام کردار کی خود کشی کی بابت نہیں سنا؟ کیا آپ کے ہاں کبھی واقعات ایسی صورت اختیار نہیں کر سکتے کہ آپ کو امر واقعہ پر افسانہ کا شبہ ہونے لگے اور عالم سیداری میں خواب کا سماں نظر آئے۔ بتائیے اسلاف میں اسی قسم کی باتیں مذکور ہوتی ہیں یا کچھ اور؟ اگر یہی ہیں تو آپ انہیں دور دور سے کیوں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ غیروں کو چھوڑیے اور اپنے گھر کی باتیں کیجئے۔ ڈینیوب اور نیل کے تھبائے جناب اور گنگا کا ذکر کیوں نہ ہو۔ مائیکل اور مارٹھا کے بجائے کریم اور عائشہ، موہن اور سادری، کی طرف توجہ کیوں نہ کی جائے۔ ان کے جذبات قلب بند کیجئے۔ ان کی معاشرے کے خاکے پیش کیجئے، اور اس کے نقائص و خفایاں کیجئے۔ سماج کی اصلاح ادب کے ذریعے کیجئے۔ ادب آپ کی قوم کی ذہنیت، اوصاف و اطوار، سہرت اور تقدیر تک بدل سکتا ہے۔ دنیا میں اگر زندہ رہنا ہے تو اپنے ادب کو زندہ کیجئے۔ اپنے گھر کے ادب کی طرف توجہ کیجئے۔ آپ رؤیو جولیت اور واثق و عذرا کے افسانے تو بڑے غور سے پڑھتے ہیں کبھی میر رانجھا اور سمنی ہینوال کا نام بھی سنا؟ گوٹلڈ ٹیکسلیئر کے ساتھ ہی کالی دس کا بھی کوئی ڈراما دیکھا؟ اصل نہیں تو ترجمہ ہی سہی۔ شیتلے اور حافظ کے رموز عشق کے مقابلہ میں وارث کے خیالات کا بھی مطالعہ کیا؟ حیات کی ربا عیات کے ساتھ جلتے کئے "قوافی" بھی دیکھے؟ کبھی کتبہ اولیٰ جاس کے فلسفیانہ نکات پر بھی غور کیا؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ان سے کسی لحاظ سے بھی ادنیٰ یا کمتر نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم ہر چیز کو مغرب کی عینک لگا کر دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اگر وہ عینک چوری ہو تو ہمیں روشن اور صاف نظر آئیں گی ورنہ دم دم اور دھندلی۔ ہمارے ہی آسام کی چائے مغرب میں جاتی ہے اور وہاں سے خوش نما ڈبوں میں بند ہو کر مختلف ناموں کے ساتھ ہمارے پاس واپس آتی ہے اور ہم اسے بہت زیادہ قیمت پر خریدنے کو تیار ہوتے ہیں۔ بالکل ہی حال ہمارے ادب کا ہے۔ مغرب کی کوئی باریک بین آنکھ اور نکتہ رس دماغ انہیں باتوں کو لیتا ہے اور آپ دکھ پرانے میں پیش کرتا ہے۔ پھر ہمیں بھی وہ بات کچھ پسند آنے لگتی ہے۔ ایران والے حیات کو کبھی کے بھول چکے ہوتے اگر فرجیر اللہ اے ایسے حکم انداز ہیں اہل ذوق کے سامنے پیش نہ کرتا۔ جب مغرب نے نوبل پرائز دے کر نیگرو کی قدر کی تو ہم بھی نیگرو ریور نے اٹھے۔ ہم اپنے مشاہیر کو بلا واسطہ نہیں پہچان سکتے۔ کسی دن مغرب کا کوئی مرد وندا اقبال

کا پیغام سمجھ گا اور اسے سحرت انجیر و نہایت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرے گا۔ پھر ہم اسے سمجھیں گے۔ ہمارے ملک کی تاریخ لکھتے ہیں تو مغرب کے لوگ تجزیہ لکھتے ہیں تو وہ کیا آپ نے کبھی فرشتہ اور بیرونی کی تحریریں بھی دیکھیں یا محض سندھ اور لین پول کے دعویٰ کو ناقابل تردید تصور کئے بیٹھے ہیں؟ ہمارے مذہب کا جائزہ اگر کوئی لیتا ہے تو مغرب کے اگر ہمارے رسم و رواج، ہمارا فن، ہماری عقل و دانش، ہماری معاشرت اور ہمارا اہل حال لکھتے ہیں تو مغربی نقاد

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خوب نہیں آتی

کیا آپ نے کبھی اس امر کی وجہ دریافت کرنے کی سعی کی؟ سبب نہایت آسان ہے، مغرب والے بیدار ہیں اور ہم غور سیدہ۔ ان میں تجسس اور نفیس کا مادہ بہت زیادہ ہے اور ہم میں اندھا دھند پیروی کرنے کی قابلیت لاتعداد ہے۔ ہم زمانے کی نزاکت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ہم کیا کر رہے ہیں اور زمانہ کیا پکار رہا ہے۔ ہم کدھر جا رہے ہیں، اور ترقی خواہ جماعتیں کس طرف رجوع رکھتی ہیں۔ سبیل بچاؤ اور زرخش فشاں کا ذکر چھوٹیے۔ تیشہ، کوکھنی اور کند سے دل اٹھائیے۔ بشیر و سنال کا زمانہ ہو چکا اب توپ اور ٹننگ کا دور دورہ ہے۔ محل اور ناقہ کے بجائے اب طیارے اور جاز ہیں۔ سارا بان اور صدی خوال کے بجائے بڑے بڑے عالی ہمت ہوا باز اور ڈرائیور ہیں۔ شمع کا فوری کی جگہ اب برقی قمیے نے لے لی ہے۔ نامہ بر کے بجائے اب ٹیلیفون اور لاسکی ہے۔ بین، ستار، دف، برلٹ، ملاؤس رہا، طبلہ اور ڈھولک، نمک اور ناڑی وغیرہ کے بجائے اب پیانو، ٹینجو، گراموفون، ریڈیو، ٹاکیو اور مینڈر ہے۔ نقارخانہ و طولی، گنبد افراسیاب، انبخت خانہ چند و دم، کا مطلب اب سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

پالکی، شکر، ہوادار، چکر لڑی، ہاتھی اور ہودج کی جگہ اب ٹریکس، ڈاج، اسٹین، شورلے، این، ڈیوٹیو، آر، اور بی بی اینڈ سی آئی ہے۔ عرض اب زمانہ آور ہے، اس کا تقاضا آور ہے۔ لکیر کے فقیر بنے رہنا معقولیت سے بعید ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر اپنے ادب کو زندہ کریں۔ گل و بلبل کا ذکر چھوڑیں اور اپنی زندگی کے سامان پیدا کرنے کی فکر کریں۔ ادب زندہ ہوگا تو قومیت زندہ ہوگی۔

آخر وجہ کیا ہے کہ آپ زندگی سے اس قدر بیزار ہیں؟ آپ کے دل کو وہ کون آزار لاق ہے جس سے غیر ملک کے لوگ متبر ہیں۔ جب آپ شعر کہتے ہیں تو اس کا ایشیہ حقہ موت، چادر، فاختہ، بالیں، مزار، لحد، یاس، منظر آ، نزع، بیکلی، گفت و غیو الفاظ پر مشتمل کیوں ہوتا ہے؟ آپ جیتے جی کیوں موت سے ہلکا رہا ہوا پہلے ہیں۔ زندہ

قوموں کے افراد کو تلہبیشہ طویل زندگی کی تمنا ہوا کرتی ہے۔ آپ بھی اپنی خبر لیجئے۔ اپنی رگوں میں زندگی کا خون دڑتا ہوا دیکھئے۔ اپنی سانس کو اکھڑتا ہوا تصور نہ کیجئے۔ دریاں حالیکہ سانس نہایت آسانی سے جاری ہو۔ جب آپ جہاں طو پر زندہ ہیں تو معنوی طور پر بھی اپنی زندگی کا وجود ثابت کیجئے۔

رفت پسند لوگوں کو ادنیٰ عشق و محبت کے علاوہ دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ کسی کے ہاتھوں مٹے جا رہے ہیں۔ خدا را اپنے ادب اور اپنی قومیت کی زبوں حالی کی طرف توجہ کیجئے۔ اس کی موجودہ علمی و فنی بے بضاعتی پر غور کیجئے اور اس ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو کسی ساحل تک پہنچانے کی سعی فرمائیے۔

اُٹھو ورنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

محض صادق قریشی راولپنڈی

وقت

وقت سُست رفتار ہے، اُن کے لئے ہر انتظار میں ہوں

وقت تیز رفتور ہے، اُن کے لئے، جنہیں خطرہ درپیش ہو

وقت طویل ہے، اُن کے لئے جو غمگین ہوں

وقت مختصر ہے، اُن کے لئے، جن کی آرام سے گزر رہی ہو

لیکن

وقت ہے ہی نہیں — اُن کے لئے — جو محبت کرتے ہیں

حامد علی خاں

(دہتری دین ڈایک)

دُعا

آگاہ مری رُوح کو اسرار سے کر دے جو یائے حقیقت ہوں حقیقت کی خبر دے
 جو دیکھ سکے شوکتِ باطل کی حقیقت یارب تو مجھے اپنے کرم سے وہ نظر دے
 دُھل جائے مری رُوح کی آلودگی جس سے یارب مجھے وہ اشکِ شبِ آہِ سحر دے
 جو میں چمکِ صدق و صفا مہر و وفا کی یارب مری قسمت کو وہ تابندہ گہر دے
 کر دے جو فنا خرمینِ باطل کو جلا کر یارب مرے غم کو وہ بیباک شر دے
 غم ہو کہ خوشی اجادۂ حق سے نہ ہوں میں یارب بصیرت و عزیمت و ہجر دے

آیا ہوں ترے میکدۂ جود و سخا میں

یارب مئے عرفاں سے مرے جام کو بھر دے

اثرِ صہبائی

جمہوریہ سپانیہ اور خانہ جنگی

اسپین میں خانہ جنگی ۱۸ جولائی ۱۹۳۶ء کو شروع ہوئی تھی اور اس سال ۱۸ جولائی کو اس کی دوسری سالگرہ تھی جسے خانہ جنگی کے دو لڑائیوں میں نے خوب زور شور سے منایا تھا۔ دونوں نے دعوے کے ساتھ کہا تھا کہ فتح و نصرت کا وقت تاج نہیں جس کی قیمت لاکھوں انسانوں کے خون سے ادا کی جائے گی ان ہی کے سرکوزیت بخشے گا۔ اس خانہ جنگی کی نوعیت مداخلت اقوام یورپ کے بہت ہی عجیب و غریب ہو گئی ہے یہ سب اپنے اپنے سیاسی مفاد کے پیش نظر سپانیا کے خون کی ہولی کھیل رہی ہیں اور سیاست یورپ کو ایک نئے راستے پر ڈال رہی ہیں۔ اس کے آغاز سے پیشتر فرانسیسی ملکیت برطانوی ملکیت کے اس اقتدار کو جو اسے بحیرہ روم میں حاصل تھا اس سے بچپن لینے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ مگر اب اطالوی اور جرمن ملکیتیں اس اقتدار کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے جذبہ جہد کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی اور برطانوی ملکیتیں اپنے باہمی تنازعات کو چھوڑ کر کچھ عرصے کے لئے متحد ہو گئی ہیں تاکہ اطالوی اور جرمن ملکیتوں کے اس ہتھے ہوئے سیلاب کو روک لیں۔ اسپین کی اس خانہ جنگی میں وہاں کا شاندار قدیم تمدن اور پرانی عمارتیں تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔ قوطیہ کی مقدس اسلامی عمارتوں اور احرار کے شاہی محلوں کا اب شاید نام و نشان بھی نہ ملے گا۔ اس مضمون میں میں اسی خانہ جنگی کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

آج سے سات سال پہلے ۱۹۳۳ء میں اسپین میں پہلی مرتبہ ایک جمہوریت قائم ہوئی تھی۔ اس سے پیشتر وہاں کا بادشاہ اناٹونسو دہم تھا جس کا خاندان پانسو سال سے اسپین پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اس کی مستبد حکومت کا تعزین ستونوں کے بل پر کھڑا تھا یعنی جاگیردار، فوج اور کلیسا۔ ملک میں جاگیرداروں کی آبادی ایک فیصد تھی اور کاشت کی زمین ۶۲ فیصد تھی، اس زمین کے ۵۰ فیصدی پر انہیں جاگیرداروں کا تعزیت تھا۔ کسان عموماً ان کی رعایا ہوا کرتے تھے اور بے گار اپنی بسر اوقات کتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہیں ایک وقت بھی شکل سے پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا تھا۔ ان بچاروں کی تو یہ حالت تھی اور ادھر ستم ظریفی ملا نظر فرمائیے کہ صرف ایک جاگیردار

اس مضمون کو لکھتے وقت مندرجہ ذیل دو کتابیں اور دو اخبار پیش نظر تھے:

- (۱) Inside Europe by John Gunther (۲) History of Russian Revolution by Trotsky
(۱) The Statesman (۲) The Hindustan Times اخبار

ڈیوک آف البا کے قبضے میں اتنی بڑی جاگیر تھی جتنا مملکت بلجیم کا رقبہ ہے۔ یہ جاگیر وار ان زمینوں کا گریہ اور ان سے پیدا شدہ فائدہ تو غریب کسانوں سے لے لیتے تھے مگر کبھی انہیں یہ توفیق نہ ہوتی کہ ان کی دیکھ بھال اور زرخیزی پر کچھ روپیہ صرف کر دیں۔ ان کی اس بے پروائی کا نتیجہ تھا کہ بہت سی زمینیں بھڑھو گئی تھیں اور بعض میں سال بھر میں صرف ایک فصل کی کاشت ہوتی تھی۔ مگر اس بربادی کا الزام بھی یہ جاگیر دار غریب کسان ہی کو دیتے تھے اور ان پر طرح طرح کے منظم دھاتے تھے۔ اب ذرا فوج کی حالت بھی ملاحظہ فرمائیے۔ فوج کیا تھی بے کار اور کم ہمت عیاشوں کا گروہ جس نے ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں اور سپانیول میں افریقن نوآبادیوں کی تقسیم پر جنگ ہو رہی تھی (کبھی کسی قابل ذکر جنگ میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ اس فوج کے افسروں کی تعداد اکیس ہزار تھی جو ان جرمن افسروں کی تعداد سے بھی زیادہ تھی جنہوں نے جنگ عظیم میں حصہ لیا تھا اور اگر ہم ریاضی کے تناسب و توازن کے قاعدے سے حساب لگائیں تو ہم ایک افسر اور چھ سپاہیوں کی نسبت پائیں گے۔ اب رہا مقدس کلیسا تو اس کے ظلم کی بھی کوئی انتہاء تھی۔ چالیس ہزار پادری ملک کو گھن کی طرح لگے ہوئے تھے جو ہمیشہ بادشاہ، جاگیر داروں اور فوج کے ساتھ مل کر عوام کے حقوق کا خون کیا کرتے تھے۔ کلیسا کے یہ پادری عوامی سروسز فرم (Jesuit Order) سے تعلق رکھتے تھے اور کثیر تعداد میں کانون، بنکوں بھری تجارت، ذرائع آمد و رفت، باغوں اور زمینوں کے مالک ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کی سیاسی پالیسی میں بھی ان کو کافی دخل تھا۔ ان کی قوت ظلم و استبداد کا اندازہ کرنے کے لئے مذہبی تعزیرات کے قانون (Jesuitism) کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو ۱۹۳۱ء تک اسپین کی قانونی کتاب سے خارج نہیں کیا گیا تھا۔ عوام کو تعلیم دینے کی خدمت بھی انہیں پادریوں کے سپرد تھی اور یہ روحانی اور مادی ہر دو قسم کی تعلیم عوام دیتے تھے۔ ان کی اس تعلیم کا اثر یہ تھا کہ اسپین میں ان پڑھوں کی تعداد سوائے پرتگال کے یورپ کے اور تمام ممالک سے زیادہ تھی۔ اگرچہ اسپین میں ایک پارلیمنٹ بھی تھی مگر اس میں بھی اکثریت ان ہی تینوں طبقوں کے افراد کی ہوا کرتی تھی۔ جو عوام کو بہلاؤ پسند کاران سے رائے حاصل کر لیتے تھے اور پھر ممبرانہ جانے کے بعد بادشاہ کے اشاروں پر چلتے تھے اور ان کے حقوق کو خوب پامال کرتے تھے۔

تقریباً تین سو سال سے اسپین میں واقعات اسی رفتار سے چل رہے تھے کہ ۱۹۳۱ء میں ان کی رفتار میں ہلاکی تیزی پیدا ہو گئی یعنی اس سال جب وہاں کی اسی پرانی پارلیمنٹ کا نیا انتخاب ہوا، تو خلافت مہمل اس میں ملک کے جمہوریت پسندوں کو ایک شاندار اکثریت حاصل ہوئی اور انہوں نے بادشاہ کو تخت و تاج چھوڑنے پر مجبور کیا۔ بادشاہ کو ان کے سامنے جھک جانا پڑا۔ دراصل اسپین میں شاہی نظام اپنی عمر سے زیادہ زندہ رہ چکا تھا۔ اور اب وہ اس بات کا منتظر تھا کہ اسے ذرا سا جھکا لگے اور وہ دم توڑ دے۔ ۱۹۳۱ء کے اس انتخاب نے یہ جھکاؤ اسے دیا اور اس ظالم نظام

کا خاتمہ ہو گیا۔ اسپین میں ایک جمہوریت قائم ہوئی جس کے کابینہ وزارت کا صدرِ عظم آڈانا مقرر ہوا اور بادشاہ کو اس کے ظلم و ستم کی جو سزا ملی وہ یہ تھی کہ اُسے صبح سلامت *Castagena* کے شہر میں پہنچا دیا گیا۔ اسپینی تاریخ میں یہ ایک ایسا انقلاب تھا جو بہت پُر امن طریقے سے رونما ہوا تھا۔

اس نئی جمہوریت نے بادشاہ کو تو تخت سے اتار دیا مگر ان فوجی افسروں اور جاگیرداروں اور پارلیوں کے خلاف جو بادشاہ کے پشت پناہ اور مددِ عمل کے سوا تھے یہی اقدام کافی سمجھا کہ ان کے خطابات ضبط کر لئے اور ان کی ذات سے جو ردِ عمل کی جامع تھی کوئی تعزیر نہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوریت کے قیام کے ایک سال بعد ہی ردِ عمل کے یہ سوہیر (ست ۱۹۳۷ء) جنرل سن جبر جو کی قیادت میں اُٹھے اور اس کے خلاف بغاوت کردی۔ جمہوریہ نے ان کی اس بغاوت کو فوراً ہی دبا دیا اور تمام جاگیرداروں اور پارلیوں کی جاگیریں ضبط کر لیں اور فوجی افسروں کو پنشن دے کر فوج سے علیحدہ کر دینے کے قوانین بھی نافذ کر دیئے۔ مگر اس کے ارباب اقتدار کی فراخ دلی ملاحظہ فرمائیے کہ سولے فوجی افسروں کی پنشن کے قانون کے جس میں جمہوریت کا اپنا ہی نقصان تھا اور کسی قانون پر عمل کرنا انہوں نے گوارا نہ کیا۔ شاید وہ اسٹالن کا یہ قول بحال گئے تھے کہ ”الغلاب کبھی ریشیت نہیں لے سکتا کہ سپرانیس کیا جاسکتا“ یعنی انقلاب کے مخالف طبقوں کو ہمیشہ مٹا ہی پڑتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ ان سے فراخ دلی برقی جائے اور انہیں کچھ نہ کہا جائے۔

گفت رومی ہر نئے کلمہ کا بادل کشند می زندانی اول آن بنیاد را ویران کنند

پھر بھی اس اخلاقی کمزوری کے باوجود جس کا ثبوت یہ ارباب اقتداران رجعت پرست طبقوں کو کھلے بندوں چھوڑ دینے سے دے رہے تھے اس قدر ضرور مسلم ہے کہ اسپین کے اس تاریخی دور کی سیادت اور قیادت کے لئے جو اس جمہوری انقلاب کے بعد شروع ہوا تھا ان سے بہتر شخص بھی ملنا مشکل تھے۔ تاریخ ہر جمہوری انقلاب کے بعد ایسے ہی افراد کو منظرِ عام پر لے آتی ہے جیسے کہ آڈانا اور اس کے دوسرے ساتھی تھے۔ یہ لوگ لبرل کھلاتے ہیں اور اس انقلاب کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے اس کی رہنمائی کے لئے بہت ہی موزوں ہوتے ہیں۔ یہ عموماً متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں دفتر کے کلرک، ناول نگار، مصنف، معمولی سرمایہ دار، اسکولوں کے استاد اور یونیورسٹی کے پروفیسر شامل ہوتے ہیں۔ یہ انقلاب اسپین ہی کی کوئی نرالی خصوصیت نہ تھی بلکہ ہر جمہوری انقلاب کے بعد اس کا ہونا ضروری ہے۔ روس میں فروری ۱۹۱۷ء کے انقلاب

نے آڈانا جمہوریت پرستوں کا لیڈر تھا۔ شیٹس بین کی میئر تک (ست ۱۹۱۷ء) میں وزیرِ حملہ کا نام ”*Emora*“ درج ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

Emora کو دروں وزیرِ نظم رہ کر کستنی ہو گیا تھا اور پھر آڈانا ہی وزیرِ عظم مقرر ہوا تھا۔ مگر وزیرِ نظم ہونے سے پہلے ہی جبکہ آڈانا وزیر

خارجہ تھا کابینہ وزارت اور وزیرِ عظم اس کے ہاتھوں میں کھٹکتا کہ طرح سے اور یہ جو جابا تھا ان سے متوالیت تھا

کے بعد جو مخلوط وزارت وہاں قائم ہوئی تھی وہ بھی اس قانونِ تاریخ سے مستثنیٰ نہ تھی۔ ان دونوں وزارتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جتنا تعلق ہوئے ٹراشٹی اپنی کتاب ”تاریخ انقلاب دس“ میں بتاتا ہے کہ کیوں متوسط طبقے کے یہ لبرل اس دور کے بہترین قائد ہوتے ہیں؟ وہ لکھتا ہے:-

”ہماری یاد اسپین کے موجودہ حالات کو دیکھ کر پھر تازہ ہوتی ہے، یہ حالات ہیں بتاتے ہیں کہ کس طرح ہر انقلاب اپنی کامیابی کے ابتدائی زمانے میں پُرانی سیاسی روایات کی حد بندیوں کو توڑ کر شخص کو ایک سہری انجام کی مشاعروں میں دعاب لیتا ہے۔ اس وقت اس کے مخالف بھی ان رنگیں مشاعروں سے اپنے آپ کو رنگ لیتے ہیں۔ یہ رنگ رنگ کا لباس اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ رجعت پسند طبقہ بھی ان تبدیل شدہ حالات کے سانچے میں ڈھلنا چاہتا ہے تاکہ اس نقصان سے بچ جائے جو انقلاب کے بعد اسے براہ راست کرنا پڑتا ہے۔ قوم کا یہ اشتیاق جو صرف مبتذل مقولوں پر قائم ہوتا ہے اپنا نصب العین ”حافظا کروصل خواہی صلح کن بانا“ و عام ”بنالیتا ہے۔ متوسط طبقے کے تخیل پرست طبقہ وارانہ تمیز کو نظر انداز کرتے ہوئے اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ انہیں کرنا کیا ہے، پُرانے خیالات و افکار کی رو میں بہ جاتے ہیں اور ہر شخص کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی افراد اس وقت اکثریت کے رہتا ہوتے ہیں۔“

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ آخر وہ کیا ذہنیت ہوتی ہے جو ان کے اس صلح کے متخیل کی محرک ہوتی ہے؟ یہ ذہنیت عوام کے پرولتاری انقلاب کا خطرہ ہوتا ہے جو ہر جمہوری انقلاب کے بعد جلد یا بدیر رونما ہوتا کرتا ہے اور متوسط طبقے کے ان تمام حقوق کو جو وہ پہلے انقلاب کے بعد حاصل کر لیتا ہے، پائمال کر دیتا ہے۔ یہاں بھی یہی ذہنیت تھی جو جمہوری یا غیر جمہوری طور پر ہسپانیائی ریپبلک کے ان ارباب حکومت کے فزخ دلی کے تخیل میں پوشیدہ تھی۔ یہ حضرات دوسرے عوام کو مراعات و حقوق، استدعا دے گا کہ اس کی اور اراضی کاشت دینے کے وعدوں کا نشانہ بنا کر پرولتاری انقلاب کی جذبہ و جد سے باز رکھنا چاہتے تھے، اور دوسرے رجعت پرستوں سے بھی مل کر رہنا چاہتے تھے تاکہ ان کے ساتھ اشتیاق و عمل کر کے عوام کی انقلابی طاقت کو ابھرنے سے روکتے رہیں۔ ان کی اسی پالیسی کے متعلق ٹراشٹی نے لکھا تھا:-

”اب جبکہ یہ سطر لکھی جا رہی ہیں۔ مئی ۱۹۳۷ء کے شروع میں۔ اسپین کا غیر بخوبی پُر امن اور شاندار انقلاب ران محاسن کی فہرست ہمیشہ یہی ہوتی ہے) اپنے ”ایام جون“۔ اگر ہم فرانسیسی انقلاب کو مد نظر رکھ کر شمار کریں۔ یا ایام جولائی۔ اگر ہم روسی انقلاب کے پیش نظر حساب لگائیں۔ کی تیاری میں معروف ہے۔ میڈوڈ کی ”وقتی گونیزٹ“۔ مقولوں کے نقشے میں مست رہن کا بیشتر حصہ روسی زبان کے مقولوں کا ترجمہ ہے) بے روزگاری کے استدعا اور اراضی کاشت کی مانگ کو پورا کرنے کے وعدے تو دہر دہر کر رہے ہیں مگر اس کی اتنی جرات نہیں کہ کسی نے روسل زخم کو ذرا اٹھ

بھی لگائے ۔ غم و غصے کی اس لہر کا اندازہ کرنا مشکل نہیں جو مزدوروں اور کسانوں کے دلوں میں دھڑ رہی ہے ؛ تحریک انقلاب عوام اور برسرِ اقتدار جماعت کی پالیسی میں ایک سخت کش مکش پیدا ہو رہی ہے جو یا تو پہلے ماہ اپریل کے انقلاب کی بھی تاریخ کنی کر دے گی یا ایک اور انقلاب کی آمد کی خبر دے گی ؛

ریپبلک کے اس طرزِ عمل کے خلاف 'ہو اس' نے انقلاب کے ان مخالفوں کے لئے اختیار کر رکھا تھا اور جسے ٹراسکی نے مندرجہ بالا الفاظ میں بیان کیا ہے ، عوام میں شورش ہوتے ہوئے بالآخر وہ وقت آیا کہ جب ان کے دلوں میں ایک کی کوئی وقعت نہ رہی ۔ انقلاب کے مخالفوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھ کر ۱۹۳۳ء کے موسمِ خزاں میں آؤٹا اور دوسرے وزراء کو کرسی وزارت سے اتار دیا اور دائیں بازو کی ایک مخلوط وزارت قائم کر لی ۔ جس نے برسرِ اقتدار سے ہی سب سے پہلا کام جو کیا ۔ وہ یہ تھا کہ تمام حریت پرست جماعتوں کو تشدد کے ذریعے سے کچل ڈالا ۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں جب ہسپانیائی اشتراکیوں نے اس کی اس پالیسی کے خلاف صدمہ لئے احتجاجِ بلند کی تو انہیں سزائے موت اور سزائے قید دے کر خاموش کر دیا گیا اور جب غصہ ویر کے مزدوروں اور کان کنوں نے ان مظلوم اشتراکیوں سے اظہارِ ہمدردی کیا تو انہیں بھی اسپینی مرکش کے سپاہیوں کی تلواروں نے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا ۔ چودہ سو آدمی مارے گئے اور تیس ہزار اشتراکی قید کر لئے گئے اور ردِ عمل کی وہ پہلی قسط جس کی دوسری اور آخری قسط جنرل فرانکو کی بغاوت ہے ادا ہو گئی اور ماہ اپریل کی تاریخ کنی کے متعلق پیشین گوئی ٹراسکی نے کی تھی وہ بھی پوری ہو گئی +

ردِ عمل کے تشدد کا یہ پہلا دور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک قائم رہا ۔ ۱۹۳۶ء ایسی شروع ہی ہوا تھا کہ عوام میں پھر اس تشدد کے خلاف غصے کی ایک عظیم الشان لہر دوڑ گئی اور انہوں نے دائیں بازو کی اس ظالم وزارت کو سننے ایکشن کے انعقاد کے لئے مجبور کیا ۔ فروری ۱۹۳۶ء میں یہ نیا انتخاب ہوا دائیں بازو کی تمام جماعتوں نے بل کر ایک "Front Populaire" کی بنیاد ڈالی اور اس انتخاب کے لئے اپنے امیدوار کھڑے کئے جو کثرتِ آراء سے کامیاب ہوئے اور "Front Populaire" کی ایک نئی وزارت قائم ہوئی جس کا وزیرِ اعظم پھر آؤٹا ہی مقرر ہوا تاریخ نے جس تاریخی دور کی قیادت کے لئے اسے چن رکھا تھا وہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا ۔ متوسط طبقے کے تمام افراد جس سے شاید وہی اس تاریخی دور کی تکمیل کو ایک علاحدہ نیا نیا سرانجام دے سکتا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ عملِ تاریخ اسے بار بار منظرِ عالم پر لاتا تھا

لے ریپبلک کے قیام کے بعد اسپین کی پالیسیٹ کی تمام جماعتیں مل کر دو جانب تقسیم ہو گئی تھیں (اول) دائیں بازو والے اور دوم بائیں بازو والے ۔ بائیں بازو میں تمام حریت پرست اور قومی فلاح اور بہبودی کے خواہاں شامل تھے ۔ اور دائیں بازو میں تمام جماعت پرست اور ردِ عمل کے پرستار اب ان ہی کی وزارت قائم ہوئی تھی ۔

اس نئے کاہنہ وزارت کو برسرِ اقتدار آئے ہوئے مشکل سے پانچ مہینے گزرے ہوں گے کہ وہ عمل پیر جرنل فرانکو کی قیادت میں سر بلند ہوا مگر پبلک نے اس کے سامنے ٹھک جانے سے انکار کر دیا اور خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ خانہ جنگی کے وقت "Front Populaire" میں مندرجہ ذیل جماعتیں شامل تھیں۔

(۱) متوسط طبقے کی تمام جمہوریت پرست جماعتیں جن کا لیڈر آڈان تھا۔
(۲) Basque اور کیٹلونیا کے خود مختار صوبوں کے لیڈر + ان دونوں صوبوں کو جمہوریہ نے صوبائی خود مختاری عطا کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

(۳) سنڈی کلٹ۔ جن کا کیٹلونیا اور آندلس میں بہت رسوخ تھا۔

(۴) انارکسٹ۔ ان کی تعداد تمام اسپین میں صرف آٹھ ہزار تھی۔

(۵) اشتراکی۔ ان کی دو جماعتیں تھیں۔ ایک جماعت کا لیڈر لاگو کیڈو تھا یہ انتہا پسند مارکسی تھے اور دوسری جماعت جس کا لیڈر اندیشو پرائی ٹو تھا اعتدال پسند مارکسی تھے۔

(۶) اشتمالی۔ جن کے نمائندوں کی تعداد چار سو تہتر ممبروں کی پارلیمنٹ میں صرف چودہ تھی۔

۷) پی۔ او۔ ایم (Party of Marxist Unification) اس جماعت کے افراد اسکی کے پیرو تھے اور ان کے رہنما انڈرزن اور میوزن تھے جن کا زیادہ تر اثر باریکونیا میں تھا۔

علمِ نباتات بلند کرنے سے پہلے باغیوں نے اٹلی اور جرمنی سے امداد حاصل کر لی تھی اور جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی یہ بغاوت ایک کامیاب بغاوت ہوگی تو انہوں نے جمہوریہ کے خلاف علمِ نباتات بلند کر دیا تھا۔ جنرل فرانکو کے مندرجہ ذیل مددگار تھے۔

(۱) اسپین کی تمام جماعت پرست جماعتیں۔ یہ وہاں کے فوجی افسروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور صیہوائٹ فرقتے کے پادریوں اور اسپینی فرطایتوں پر مشتمل تھیں۔

(۲) اسپین کے فوجی سپاہی۔ یہ اپنے افسروں کی فرمانبرداری کرتے مہے جنرل فرانکو کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔

(۳) اسپینی مراکش کے جنگجو سپاہی۔ انہیں باغیوں نے فوج کے بعد کامل آزادی دے دینے کا لالچ دے کر اپنا سامان بنالیا تھا۔

(۴) اطالوی طیارے اور رضا کار۔ ان کی تعداد تھوڑے ہی عرصے میں ساٹھ ہزار ہو گئی تھی۔

(۵) جرمن طیارے، انجنیئر اور رضا کار۔ ان کی تعداد آٹھ اور دس ہزار کے درمیان تھی۔

اس خانہ جنگی کے شروع ہونے پر جنرل فرانکو نے اپنے جملہ طارق کے گرد و پیش تمام ساحلی علاقے اور شمالی اسپین کے ایک بہت بڑے رقبہ پر اپنا قبضہ کر لیا اور صلیح لیسکے میں اطالوی اور جرمن بحری بیڑے کی مدد سے رپبلک پر تمام ذرائع آمد و رفت بند کر دیے۔ رپبلک کے پاس سارا جنوبی ساحل، کیٹال کا وسطی میدان اور کیٹلونیا کا صوبہ باقی رہ گیا۔ خانہ جنگی جاری رہی اور جنرل فرانکو نے تین چار مہینے میں کئی مشہور مقامات فتح کر لئے۔ ستمبر ۱۹۳۶ء میں آذنانا کی وزارت استعفیٰ ہوئی کیونکہ یہ اس خانہ جنگی میں رپبلک کی فوجوں کو ایک عمدہ پہلے پر مشرب کرنے میں کامیاب نہ ہوئی تھی اور لارگو کبیرونے ایک نئی وزارت بنائی اور آذنانا کو رپبلک کا صدر اعظم بنا دیا گیا۔ مئی ۱۹۳۶ء میں لارگو کی وزارت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ڈاکٹر خوان نگران نے پھر ایک اور نئی وزارت قائم کی۔ اس کے کابینہ وزارت میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں مگر ڈاکٹر خوان نگران ابھی تک وزیر اعظم ہے۔

الغرض فروری ۱۹۳۶ء کو باغی جو اس سرے میں طیلطہ، اشیلہ، اسان سبائین اور ارون فتح کر چکے تھے میڈرڈ کی جانب بڑے جس بے مروت سامانی کی حالت میں جمہوریہ کی فوجیں تھیں اس سے تو قیاس ہی چاہتا تھا کہ میڈرڈ جو ہیں گھٹنے میں فوج مہیا کرے گا۔ پبلک کی حکومت نے یہاں سے بھاگ کر یونیا کو اپنا متفقہ حکومت بنایا مگر میڈرڈ کو مذکورہ بالا بین الاقوامی دستے اور روسی طیاروں اور توپوں کی برکت امداد نے بچا لیا۔ دو سال ہرے کو آئے ہیں مگر میڈرڈ ابھی تک فوج نہیں ہوا لاکھ باغی اس کے ایک تہائی حصے کو بمباری کے ذریعے سے تباہ و برباد کر چکے ہیں۔ اور نہ وہ ابھی تک یونیا ہی کو فتح کر سکے ہیں اگرچہ انہوں نے اس پر بھی تقریباً ایک سو بیس مرتبہ بمباری کی ہے۔ باغیوں کو شایہ معلوم نہیں ہے کہ جب تحریک آزادی عوام میں پھیل جاتی ہے تو وہ انہیں کس قدر جو امن و راحت دل بنا دیتی ہے۔

- ۱۔ یہاں قیام عدم مداخلت۔ یہ یقیناً برطانیہ اور فرانس نے تجویز کیا تھا۔ اس میں جتنی وزیر پیش کی گئی تھیں وہ سب خفیہ میں۔
- ۲۔ غیر ممالک کے ان تمام جہازوں کا داخلہ جو جمہوریہ یا جنرل فرانکو دونوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی سامان جنگ لائیں اسپین کی بندرگاہوں میں بند کر دیا جائے۔
- ۳۔ ان دونوں تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک بین الاقوامی عدم مداخلت کمیٹی بنائی جائے۔
- ۴۔ اگر جب ان تجویزوں پر عمل درآمد ہو چکے اس وقت دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کو اسپین کی اس خانہ جنگی کا جائز

Dr. Juan Nigam لے

لکھ حال ہی میں یہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی کہ اس دستے کے بہت سے سپاہی اپنے اپنے وطن کو واپس جا رہے ہیں۔

فریق تسنیم کر لیا جائے۔

اس ميثاق کا جو فائدہ ظاہر کیا گیا تھا تو یہ تھا کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے یہ خانہ جنگی اسپین ہی کی حدود تک محدود ہو جائے گی اور تمام یورپ جنگ کے آتشکد میں کودنے سے بچ جائے گا۔ مگر جن حقیقی خطرات کے پیشِ نظر یہ معرضہ وجود میں آئی تھی اور جو اس کے اصل محرک تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) برطانوی اور فرانسیسی ملوکیتیں اس بات کو خوب جانتی تھیں کہ اگر جنرل فرامنچو قیام ہو گیا تو بحیرہ روم کا وہ اقتدار جسے حاصل کرنے کے لئے یہ ایک دوسرے کی حریف بنی ہوئی ہیں اطالوی اور جرمن ملوکیتوں کے قبضے میں چلا جائے گا اور یہ دونوں اس سے محروم ہو جائیں گی۔

(۴) اس صورت میں اپنی مراکش میں اطالوی اور جرمن حکومتوں کو حلقہ ہائے اقتدار حاصل ہو جائیں گے جو فرانس اور برطانیہ کے اذیتی مہم برسات کے لئے ایک مستقل اور شدید خطرے کا باعث ثابت ہوں گے۔

(۳) میڈرڈ، روم اور برلن کے درمیان ایک اتحادِ ثلاثہ قائم ہو جائے گا جو فرانس کی طاقت کو بہت نقصان پہنچائے گا اور اسے اپنی باقی ماندہ تیسری سرحد کی حفاظت بھی کرنا پڑے گی۔

(۴) اسپین کی درآمد اور برآمد پر جو اقتدار برطانوی ملوکیت کو حاصل ہے وہ جرمن اور اطالوی ملوکیتوں کے اقتدار سے بدل جائے گا۔

ان چار خطرات کی بنا پر برطانوی اور فرانسیسی ملوکیتیں اس میثاق کے لغاؤ کی آرزو مند تھیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ اگر بحرِ ہند اور اٹلی نے اسے منظور کر لیا، اپنے رشتہ کار اسپین سے واپس ہلائے اور وہاں سامانِ جنگ بھیجنے بند کر دیا تو انجیل فرماؤ جس کی فتح کا دارومدار ان دونوں کی امداد پر ہے فوراً شکست کھا جائے گا اور اسپین کی عنانِ حکومت پھر جمہوریہ کی ہمتوں میں آ جائے گی جو پہلے کی طرح ان کے مفاد کی ان کے حسبِ منت نگہبانی کرے گی۔ قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں یہ دونوں ملوکیتیں تلوار کے بجائے ان پُر امن طریقوں سے کام نہ لانا چاہتی تھیں؟ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی ملوکیت اس وقت تک اڑنے کے لٹے تیار نہیں جب تک اس کا متبع ہونے کا پروگرام مکمل نہ ہو جائے کیونکہ وہ اپنے موجودہ سامانِ جنگ کے ساتھ اٹلی اور بحرِ ہند کو شکست نہیں دے سکتی۔ یہی فرانسیسی ملوکیت تو یہ برطانوی ملوکیت کی امداد اور تائید کے بغیر نہ اڑے گی کیونکہ وہ تنہا ایک لمحے کے لئے بھی ان دونوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں ملوکیتیں بہت ہی پُر امن ذرائع سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ مگر اٹلی اور بحرِ ہند بھی ان کی اس کمزوری سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے پہلے تو اس مجوزہ میثاق کی خوب مخالفت کی اور اسے منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا مگر جب برطانیہ اور فرانس

نے ان کی اس امن سوزی کے خلاف ایک کامیاب پروپیگنڈا شروع کیا تو انہوں نے بھی اپنی امن پسندی کا سکہ ہلانے کے لئے اسے منظور کر لیا اور عدم مداخلت کمیٹی میں شامل ہو گئے۔ لیکن امن پسندی کی یہ سند حاصل کر لینے کے بعد بھی جب کبھی ضرورت پڑتی تھی جنرل فرانکو کی خوب مدد کرتے تھے۔

لکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غائب ترے بے ہر کینے سے وہ تجھ پر ہواں کہوں تو

میشاق عدم مداخلت پر کل تیس حکومتوں نے دستخط کئے تھے۔ یہ تو سب کو یقین تھا کہ اٹلی اور جرمنی اس میثاق کی کچھ پروا نہیں کرتے اور جنرل فرانکو کو برابر امداد پہنچاتے رہتے ہیں مگر اس فریب ہی کا راز اس روز قطعی طور پر فاش ہو گیا جس روز جرمن بحری بیڑے نے اپنے بحری جہاز *Deutschland* پر بمباری کا بدلہ لینے کے لئے جمہوریہ کی بندرگاہ الٹیا پر بمباری کی۔ اس جہاز کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جمہوریہ کے طیاروں نے اسے باغیوں کا کوئی جہاز خیال کرتے ہوئے اس پر بمباری کی تھی مگر اس کے بعد جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ ایک جرمن جہاز تھا تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا پھر بھی جرمن بحری بیڑا الٹیا پر بمباری کرنے سے باز نہ آیا۔ یہ حادثہ ۲۹ مئی ۱۹۳۲ء کو پیش آیا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد یوگ جہاز کا حادثہ پیش آیا۔ یہ بھی ایک جرمن جہاز تھا۔ اس پر کسی گم نامہ آبدوز کشتی نے حملہ کیا تھا۔ اکثر مدبرین یہی کہتے ہیں کہ یہ حادثہ کبھی مصر میں وجود ہی میں نہیں آیا۔ بلکہ اسے ہٹلر نے محض اپنے دل سے گھڑ دیا تھا۔ خیر جو کچھ بھی ہو۔ اس کے بعد ٹیلیٹن اسپین سے متعلق بحیرہ روم میں ایک بین الاقوامی فوجی مظاہرے کا مطالبہ پیش کیا۔ جسے فرانس، برطانیہ اور سوویت روس نے مسترد کر دیا اور اٹلی اور جرمنی عدم مداخلت کمیٹی کے مستغنی ہو گئے اور ان کے مستغنی ہونے کے بعد یہ کمیٹی بھی ایک بے کار سہمی چیمبر ہو گئی۔

اب اس کے بعد بحیرہ روم میں غیر ملکی جہازوں پر حملوں کا دوسرا شروع ہوتا ہے جو آج تک جاری ہے۔ یہ ایک بہت ہی واضح حقیقت ہے کہ حملہ کرنے والے اطالوی اور جرمن جہاز ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں جب تک بڑا فوجی اور فرائسی جہاز ان حملوں کا نشانہ بنے ہے۔ یہ ملکیتیں انہیں خاموشی سے برداشت کرتی رہیں مگر جب دوسری جہازوں پر حملہ ہوا تو روس نے اس کا الزام منطائی اٹلی کو دیا اور اس سے بدلہ لینا چاہا۔ اس وقت فرانس اور برطانیہ نے سٹورٹولینڈ میں نیون کے مقام پر ایک کانفرنس کا انعقاد کیا تاکہ ان حملوں کو روکنے کے لئے کوئی متحدہ قدم اٹھایا جائے۔ اس کانفرنس میں اٹلی اور جرمنی نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ لیکن اب برطانیہ اور فرانس نے جرأت کر کے ایک کامیاب ”بحری نگرانی“ شروع کی۔ اٹلی اور جرمنی نے جب یہ دیکھا کہ اسپین کے ساحلِ بحر پر برطانیہ اور فرانس کا قبضہ ہو گیا ہے تو انہوں نے بھی اس نگرانی میں شرکت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جسے برطانیہ نے بخوشی منظور کر لیا اور انہوں نے اس نگرانی میں شریک ہو کر اسے بھی

ایک بے اثر چیز بنا دیا۔

تین چار مہینے ہوئے پھر اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ عدم مداخلت کمیٹی میں مداخلت بھونکنی جائے۔ رضا کاروں کو واپس بلانے کی تجویز سے انٹی اور جرمنی نے بھی اتفاق کر لیا تھا۔ فرانس، برطانیہ، روس، اٹلی اور جرمنی ہر ایک نے ایک معینہ رقم بھی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دی تھی اور اگست ۱۹۳۷ء میں ایک برٹش کمیشن اس تجویز پر عمل درآمد کرنے کے لئے اسپین روانہ ہو گیا تھا کہ پھر یہ خبریں آنا شروع ہوئیں "جنرل فرانکو نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا ہے اور انٹی اس کوشش میں ہے کہ کمیشن کا کام شروع ہونے سے پہلے ہی جنرل فرانکو جمہوریہ کو ایک فیصلہ کن شکست دینے میں کامیاب ہو جائے۔"

اب صورتِ حالات یہ ہے:-

(۱) برطانوی ملوکیت کا اقتدار مائل بہ تنزل ہے اور وہ اس وقت تک کسی سے بھی روٹنا نہیں چاہتی جب تک اس کا سامحہ ہونے کا پروگرام مکمل نہ ہو جائے۔

(۲) فرانسیسی ملوکیت جرمنی اور اٹلی سے گھری ہوئی ہے وہ بھی اس وقت تک نہ روٹے گی جب تک برطانیہ کی امداد کا اسے پوری طرح یقین نہ ہو جائے۔

(۳) سوویٹ روس مشرقی ایشیاء میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہے کیونکہ وہاں جاپانی اسپر پڑم اس کے لئے ایک مستقل خطرہ بن چکا ہے اس کے علاوہ اس ملک میں جیسا کہ وہاں کئے وافر کے پھانسی کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے سیاسی بد امنی کے آثار نمایاں ہیں جو اس کی قوت میں بہت انتشار پیدا کر رہے ہیں۔

دہم، اٹلی کے فائدہ اٹھاکر اطالوی اور جرمن ملوکیتیں بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس میں اپنی حیثیت کو بہت مضبوط بنا رہی ہیں انہوں نے دورانِ غلبہ جنگی میں ان دونوں سمندروں کے تمام قدیم سپانوی مقبوضات پر اپنا قبضہ کر لیا ہے اور اپنے اٹلی اور برطانیہ کے افروغی اور ایشیائی مقبوضات کو جانے والے تمام بحری راستے ان کے رحم و کرم پر ہیں۔

(۵) اگرچہ میڈرڈ، بارسلونا، ویلیا ابھی تک فتح نہیں ہوئے مگر پھر بھی جرمن فرانکو روز بروز سپین میں فتوحات حاصل کر رہا ہے جرمنی اور اٹلی کی امداد کا سلسلہ راجح رہا ہے۔ جنرل فرانکو کی پالیسی یہ ہے کہ منگورہ بالائینوں شہروں کے دریاں سلسلہ آمد و رفت منقطع کر کے اور ایک وسیع محاذ پر لڑکر سپک کی افواج کو بہت وزن کم پھلادیا جائے تاکہ ان کی طاقت کئی حصیوں میں تقسیم ہو کر کمزور ہو جائے اور وہ بہت جلد شکست کھا جائیں۔ واقعات کی فائز تدریج ہے کہ اگر فرانسیسی اور برطانوی ملوکیتوں نے متحد ہو کر جرمنی اور اٹلی کی اس جابجاء شکست عملی کے خلاف کوئی مؤثر اقدام نہ کیا جس کی ابھی تک کوئی امید نہیں ہے تو اسپین میں نازی اور فسطائی قوتوں کی فتح یقینی ہے۔

عبدالحمید

سلاویک کے ماحول کے جدید وقوع سے کہ اسپین میں بھی کسی بھڑکے کی صورت نکلائے گی مگر کچھ اور پھر وہ بھی باعزت اسپر پڑم کے مناد کے بالکل متاثر ہے۔ اگر کوئی سمجھتا ہو سکتا ہے تو اس وہ ایک ہی ہے یعنی اسپین کی حکومت فرانکو کے لئے کردی جائے۔

فکر و عمل

عمل کا نام ہے ناداں! فروغ مستقبل
اُلٹ بھی پردہِ لقا دیر سوچتا کیا ہے

یہ حادثات کی دُنیا، یہ کارزارِ حیات
عمل کے جذبہ پر جوش کے ہو اکیا ہے

نظر کو پست نہ کر، عشق کو ہوس نہ بن
چمن میں لالہ و گل کے ہوا دھرا کیا ہے
خدا جمود کی ہرگز مدد نہیں کرتا،

ترے لبوں پہ یہ مہنگامہ دُعا کیا ہے
ہے اک گناہ غلاموں کی پارسائی بھی

تجھے خبر ہے کہ فطرت کا متقضا کیا ہے؟
تجھے تو خاک کے ذروں سے کام لینا ہے

فدک کے چاند ستاروں کو دکھتا کیا ہے
کہیں خیال سے ہوتی ہے مُنقلب دُنیا

تو کس خیال میں ہے یہ تجھے ہوا کیا ہے
تجھے تو عشق کے طوفان میں گود پڑنا ہے

عبث نہ سوچِ محبت کی انتہا کیا ہے
بفیضِ حضرتِ رومیؒ سفالِ ماہر میں
فروغِ بادِ اقبال کے ہوا کیا ہے

ماہرِ قادری

فارسی شاعری میں ظرافت

عام طور پر Humour کے لئے فارسی زبان میں دو لفظ بولے جاتے ہیں۔ اول خرافت، دوم مزاح۔ پھر ظرافت کے معنی دو ہیں۔ اول دانائی، دوم خوش طبعی۔ اور اس کے مقابلے میں لفظ مزاح کے معنی صرف خوش طبعی کے ہیں۔ اس لئے فارسی ادب و شعر میں مزاح کی نسبت ظرافت اور Humourist کے لئے ظریف کے الفاظ مستعمل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خوش طبعی کا اظہار ایسے بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں دانائی کا عنصر کم ہو مگر دانائی کے ساتھ خوش طبعی کا اظہار ایک کمال ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سخروں کی کمی نہیں، ظریف بہت کم لوگ ہوا کرتے ہیں۔

جس طرح ہم ہر کردار کو لفظ نہیں کہہ سکتے اسی طرح ہم ہر خوش طبعی یا ہنسی کی بات کو ظرافت یا Humour نہیں کہہ سکتے، گو ہنسا ہنسانا تمام قوموں میں عام ہے لیکن ان کی ہنسی یا ان کی خوش طبعی کے درجے مختلف ہیں۔ طبی و ذہنی و اخلاقی لحاظ سے جس درجہ کا آدمی ہوگا اسی درجہ کی اُس کی خوش طبعی و ظرافت ہوگی، اُن کبھی کوئی نشانہ بنائے گا اور کبھی زخمی بھی ہوگا۔ نہ ہر جائے مکر ب تو ان تافعن کہ جا ہا سپر باید انداختن

ظرافت پر سیاست کا بھی اثر پڑتا ہے اور مذہب کا بھی، جس قسم کا سیاسی ماحول ہوگا اُسی قسم کی ظرافت ہوگی، جہاں استبداد ہوگا وہاں اکثر و بیشتر ظریف، مغفہ آئید و در حدیث دیگران پرمیل کریں گے، ورنہ شعراء ان لوگوں کو اپنے طریقہ انداز و فکر کی نشاندہ بنایا کرتے تھے جو کسی نہ کسی حیثیت سے بادشاہوں پر اثر رکھتے، چنانچہ فارسی شاعری میں بنے ہوئے صوفی اور چھوٹے و اعظم سے شاعروں کی جنگ کے جو مناظر اکثر نظر آتے ہیں، اُن کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بادشاہوں کو ایسے لوگوں کی اندرونی حالت سے کسی قدر آگاہ کر دیں، اور جہاں آزادی و انکار و گفتار عام ہوگی وہاں بڑی سے بڑی شخصیت کے رد و رد و فرائض کے پیرائے میں حکمت کے موتی پروئے جائیں گے۔ غلط مذہبیت سے لوگوں میں زہد ریائی اور تشنگ خشک آجائے گا، ایسے زاہدان خشک کی سرکے جینی ظریفوں کو بذلہ سخی پر آمادہ کرے گی اور یہ لفظوں کے ہتھیاروں سے ان کے پندار کے قہوں کو مسما کر ڈالے گی ورنہ صحیح طور پر مذہب اور دھرم کو سمجھنے والے حکمت کی بات کہہ کر غور و نظر لیں گے اور دوسروں کے دلوں کی دنیا کو آباد و مددگانی پریم کی کھیتوں کو سیراب کریں گے، فارسی ادب میں جس کا بہترین نمونہ سعدی شیرازی کا زندہ جاوید کلام نظم و نثر ہے۔

پہلی ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء بروز جمعہ شب ۱۱ بجے شام پہلی ریڈیویشن سے براڈ کاسٹ کیا گیا اور اب بھارتی ریڈیو صاحب شائع کیا جاتا ہے۔ "شباب"

جہاں سیاسی استبدادہ زور ہو جیسا کہ فارسی ادبیات کے عہد زریں میں تھا، شاعر اپنے مدوح بادشاہوں اور لہریں کی تعریف ایسی کرتا ہے کہ مدوح اگر غور کرے تو شرمائے اور اگر ایسی تعریف کرنے میں ذرا بھی بے احتیاطی سے کوئی کھٹکتی ہوئی بات جو ردِ پہلو رکھتی ہو شاعر کی زبان سے نکل جائے تو غریبِ عمر زندگی سے محروم ہو جاتا ہے جیسا کہ ہمارے ہندوستان میں نواب سعادت علی خان والی لکھنؤ اور میر انشاء اللہ خان کے تعلق شمس العلماء آزاد مرحوم کی روایت عام طور پر مشہور ہے، ایسے درباروں میں نہ علم و ادب کا کام ہوتا ہے نہ حکمت و شعر کا بلکہ اچھے اچھے عالموں اور دانائوں کو نقال بننا پڑتا ہے، چنانچہ آزاد مرحوم ہی کا بیان ہے کہ انشاء اللہ کے علم و فضل کو ان کی شاعری نے ڈلوایا اور ان کی شاعری کو سعادت علی خاں کی دربار داری نے کھوایا۔

فارسی شعروں پر بھی دربار کا یہی اثر پڑا تھا، بہت سے اہل علم نے جب دیکھا کہ شاہی دربار میں علم و ادب کا کوئی پرسان حال نہیں تو انہوں نے فارسی کے مشہور عالم و شاعر عبید ذاکانی کی طرح کسی کی نصیحت "روسخی گیشہ کی موطری آموز" پر عمل کر کے اکبری دربار کے روایتی ملا دوپازہ کا لباس پہن لیا تھا۔

ایسے دور میں جو لوگ حق بات کہنا چاہتے تھے وہ تمام شاہی درباروں سے الگ رہتے تھے، ایسے حق گو یا مجذوب اور دیوانے بن جاتے تھے یا ترک دنیا کر کے اپنے جھونپڑوں کو شاہی محلات و مناصب پر ہزار بار ترجیح دیتے تھے اور ان کی اسی گرین بائی کی وجہ سے اُمراء و وزراء و خدوان کے پاس آتے تھے اور حق و حکمت کی بات سُن کر جاتے تھے۔
خامد صمدیہ کے ہر زبان کے ادب کی طرح شعر و ادب میں بھی ہر قسم کے مزاح، ظرافت، استعز اور پھکڑوں کے نمونے بجز پائے جاتے ہیں، جیسا کہ قاعدہ ہے دوسری زبانوں کی طرح فارسی شاعری کی ظرافت لفظوں ہی میں نہیں ہوتی، بلکہ اشارے کئے اور کہنے کے لہجہ میں بھی ہوتی ہے۔

یہ مزاح و ظرافت و استعز ایسے ہیں کہ مدام پھکڑ شاعروں سے قطع نظر الوری و ذاکانی وغیرہ جیسے عالم و قدر الکلام شعر ابھی درباری یا زمانہ کے دیگر اثرات کے باعث لغویت اپنے کلام کو نہ پاسکے، بعض جگہ ان کی ظرافت، لطیف ظرافت نہیں رہتی بلکہ بدلو و گرفت ہو کر جاتی ہے، ہم اس وقت ایسی ظرافت کثیف سے قطع نظر کر کے چاہتے ہیں کہ مختصر و زندہ و ظرافت کے چند نمونے پیش کریں جس سے فارسی گو شعرا کی علمی و ادبی بلند نظری، پاکیزہ خیالی اور لطافت بیان اور شان کا ہلکا سا منظر سننے والوں کے سامنے آجائے۔

ظہیر فارابی اپنے مدح قمرل اربلان کے گھوڑے کا قدم عرش سے بھی اوپر بتاتا اور اتنا اونچا خیال کرتا ہے کہ قوت

خیال بھی اگر اس کی رکاب کو احتراماً چونا چاہے تو اسے پہلے نوافلک سے اُونچی ایورٹ پر چڑھنا پڑے گا۔
 نہ کسئی فلک نہ اندیشہ زیر پایے تا لبوس بر رکاب قزل اسماں زند
 یہ مبالغہ کیا ہے؛ اس شعر کا ممدوح پر کیا اثر ہوا ہوگا؛ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، سنو کہ اسی شعر کو سامنے رکھ کر معدی
 براہ راست بادشاہوں سے خطاب کرتا اور کہتا ہے کہ ممدوح کے قدموں کے نیچے تو آسمان رکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ اُسے
 یہ کہنا چاہئے کہ اگر تم تخت پر بیٹھے ہو تو خدا سے خلق کرو اور خدا کے اس احسان کے شکریہ کے جذبہ سے متاثر ہو کر سر بسجود ہو جاؤ۔
 چہ حاجت کہ نہ کر سخی آسماں نمی زیر پای قزل اسماں
 مگو پای عزت بر افلاک نہ بگوروی اخلاص برضاک نہ

(۲)

شاہجہانی دور کے مشہور شاعر ملا شیدائے ایک شعر میں شراب کو حُن کا خدا اور عشق کا بغیر کہہ دیا ہے
 حیثیت دانی بادۂ گلگون صفت جوہری؛ حُن را پروردگاری عشق را تنبیری
 دین پناہ شاہجہان نے نام لیا کہ شاعر میری مملکت سے نکل جائے، شاعر نے منظوم توبہ نامہ پیش کیا مگر شاہی غصہ فرو
 نہ ہوا، آخر شاعر نے جب ظرافت سے کام لے کر یہ کہا کہ اب "شاہ جہاں" ہی مجھے بتائیں کہ ان کی مملکت سے باہر کونسی جگہ
 ہے؛ تو بادشاہ نے اسے معاف کر دیا۔

(۳)

کسی سلطان کا گھوڑا بھرکا، سلطان کی ران اٹھ گئی، گرا، معمولی سی چوٹ بھی آئی، درباری شاعر نے فوراً اس حادثہ
 کو ظرافت سے رنگ میں پیش کر کے چوٹ کے درد کو کم اور گرنے کی شرمندگی کو ہلکا بنا دیا کہ شاہ آسمان نے بہت سزا عطا کیا ہے
 ذرا اس کو ادب سکھا کیونکہ اس نے بادشاہ کے روی مبارک کو گوندہ بچھایا، اگر گیند رو باجی کرتی ہے اور ادھر اُدھر جاتی ہے
 تو چوگان سے اس کو سرفراز کر اور اگر گھوڑے کی خطا ہے تو اسے میرے حوالے کر دے۔

شاہا! ادبی کن فلک بد خو را کافت برسانید رُخ نیکو را
 گر گوئی غلط کرد بچو گانش زَن ورا سپ خطا کرد بن بخش اورا

آسمان کی اصلاح معلوم، بال کو چوگان سے مارنا مستعمل، لیکن لطیفہ چوتھے مصرعہ میں ہے کہ اگر آپ گھوڑے کی خطا
 سے گرتے ہیں تو وہ مجھے دے دیجئے، اس آخری مصرعہ کے کم از کم تین معنی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً (۱) میری خاطر سے تلافی گھوڑے
 کو معاف کر دیجئے (۲) مجھے عطا کر دیجئے کہ یہ آپ کی سواری کے قابل نہیں مگر رباعی کے پہلے تین مصرعوں کے تیرکتے ہیں کہ

شاعر نے سخن طلب کو مزاج کے بائیک لباس میں یہ کہہ کر چھپا دیا کہ حضور یہ گھوڑا مجھے دیجئے، میں اسے سزاؤں گا۔ درباری شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے اسمان کی محمول نکالی، گیند کو سزا دلانی، گھوڑے کو گناہگار ٹھہرایا، مگر گرنے والے کی ناسترہ پر کاری کی طرف اشارہ بھی نہ کیا، گویا درباری کی خطا میں سوار کی خطا بھی چھپی ہوئی ہے، لیکن اصل لطیفہ کہ واہ کیا شہسوار ہے، اس کا لفظوں میں کہیں پتہ نہیں، شاعر نے اس کو اتنا چھپا دیا کہ پتہ لگانا مشکل ہو گیا۔

(۴)

ریا کاروں نے حافظ شیرازی پر زبانِ طعن کھولی کہ حافظ ایسا ہے اور ویسا ہے، پاک ہن حافظ ان کے جواب میں یہیں کتا کہ تم جھوٹ کہتے ہو یا میں خمر شہ ہوں بلکہ بظاہر ان کے اعتراضوں کو تسلیم کر کے اپنا وار ان کی پاک! امنی کے اظہار میں چھپا دیتا ہے کہ خیر میں بڑا ہی ماشاء اللہ آپ تو بے عیب ہیں،

من ارچہ عاشقم ورنہ دست و شاہد باز ہزار شکر کہ یار ان شہر بے گنہ اند

(۵)

ایک شخص نے کسی کو بڑا کہا، بھلا گایاں کس کو اچھی لگتی ہیں کہ اُسے اچھی لگتیں مگر اس نے بظاہر بڑا کہنے کا بڑا ناما ملکہ اس کے جواب میں اپنے بدگو کو چھپا کہا اسی کے ساتھ اتنا اور افناد کر دیا کہ ہم دونوں اپنے اپنے قول میں جھوٹے ہیں غور کرو کہ دونوں کے جھوٹ میں کتنا فرق ہے۔

گر خواجہ زہر مادی گشت ماچہ روز غم منی خراشیم
ماغیہ نگوئی آتش نگویم تاہر دو دروغ گشتہ باشیم

(۶)

کسی نے شاہجہان پر اعتراض کیا کہ صرف شاہ ہند، شاہ جہاں کیسے کہلا سکتا ہے، درباری شاعر نے بادشاہ کی زبان سے کہا کہ مترض بے خبر ہے ایسا بے خبر کہ آجید بھی نہیں جانتا، اگر جانتا تو اسے معلوم ہوتا کہ بجایا بجڑ "ہند" اور "جہاں" کے اعداد ایک یعنی انسٹھ ہی ہیں، اس لئے ہند کے بادشاہ کو شاہجہاں کہنا بالکل بجا ہے۔

"ہند و جہاں" زردی عدد و چوں برابر است بر مخاطب شاہ جہاں ز اں مقرر است

مگر جو باتیں سائے تین سو برس پہلے صرف ایجاد کا ایک لطیفہ تھی آج سیاسی حیثیت سے دیکھئے کہ ہند کا قبضہ ساری دنیا پر قبضہ رکھنے کے لئے کیسا اہم سیاسی سلسلہ بنا ہوا ہے۔

شاعر نے کسی اپنے پیارے کو کلفت کے ساتھ بولنے دیکھا تو کہا کہ یہ کلفت نہیں بلکہ لفظوں کو اس دہن شیریں سے
جدا فی ناگوار ہے۔

زکلفت نیست آل مرا سخن کند دیری آید
جدائی از وہاں اد سخن را عاری آید

(۸)

ایکے نذیران ہیں کال پڑا، پانی کی ایک ایک بوند کو جاندار بننے لگے۔ آسمان کی یہ سرور بھی دیکھ کر لوگوں کو خدا یاد آیا،
اپنے اپنے رنگ میں لوگ فریادیں کرنے لگے۔ ایک اسکول مدرس صاحب گردوں کا لشکر ساتھ لے کر جنگل کو چلے۔ راستہ میں ایک طوفان
طا، پوچھا حضرت کدھر کے ارے ہیں اور کس دشمن پر چڑھائی ہے، ماسٹر صاحب نے کہا کہ بچوں کو جنگل میں لے جا کر دُعا لائیں گا کہ ان
بے گناہوں اور محبوں بھالوں کی دُعا سے خدا مینہ برساے گا، طوفان نے کہا، بھائی کیا لیکن اتنا تو سچے لے گا کہ بچوں کی دُعا میں اتنی
بی قبول ہوگی جتنا کہ آپ سمجھتے ہیں تو پھر دُنیا میں غریب رسول کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا ہے
اگر ایزد دُعاے شال شنودی معلم در جہاں کے زندہ بودی

(۹)

شاید کوئی صاحب ہر وقت آرام آرام پکارا اور نکھتو بنے بہتر و پرار بنے کو زندگی سمجھا کرتے تھے، انہوں نے ایک مصرعہ کہا
ع بقدر ہر سکون راحت بود بنگر تفاوت را
شاعر نے تو جہت نہ کہا ع دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خنقن و مژدن
یعنی بھاریاں دہو کہ ہر سکون کے مطابق راحت ہوتی ہے، ملاحظہ ہو دوڑنے کے مقابلہ میں چلنا اور چلنے کے مقابلہ میں کھڑے ہونا اور کھڑے
ہونے کے مقابلہ میں بیٹھنا اور بیٹھنے کے مقابلہ میں سونا اور سونے کے مقابلہ میں مر جانا، یہ سب سکون و راحت کے مذاج ہیں، اس لئے
راحت طلبوں کے لئے موت بڑی نعمت ہے۔

(۱۰)

کہتے ہیں کہ مولانا جاجی نے کسی کو رزوق کے سامنے اپنا یہ شعر و طعاس
بس کہ در جان نگار چشم بیدارم توئی ہر کہ میدا می شود از دور سپندارم توئی
مطلب یہ کہ اے دوست تم میرے دیدہ و دل میں ایسے سامنے مجھے کوئی دُور سے آتا نظر آتا ہے تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ تم ہی ہو،
سننے والے نے اس ناز خیالی کی یہ یاد دہی کہ فرمایا اگر وہ آنے والا گدھا ہوا، شاعر کو بند تھا، بے ساختہ بولا کہ پندارم توئی

(۱۱)

کبھی نے اپنی مفید داؤسی پر بیاہ جفتاب کیا، زکلفت دوست نے دیکھ کر کہا کہ ماشاء اللہ آپ خضاب کی تباہی کی ہیں جوازی کئے اب کہتے ہیں

زندہ دل بوڑھے نے کہا۔ جی نہیں، میری دلاسی نے جوانی کے سوگ میں کالا لباس پہنا ہے۔

ریش سفید میں نہ سیاہ است از غضاب ورماتم شباب یہ پوش گشتہ است

۱۲۔ آنے والے بڑھاپے سے سیخڑ جوانی کے دنوں میں جھانکھنے کی جگہ بڑے بوڑھے کو دیکھ کر کہا کہ یہ بڑھاپہ کا زمانہ دیدہ بوڑھے جھکے جھکے کیا ڈھنڈھتے پھر رہے ہیں، نورجہاں نے سننے ہی کہا کہ اور کیا ڈھنڈھتے، بچا سے ٹپی ٹپی ہوئی اپنی جوانی کے دنوں کو ڈھنڈھتے پھر رہے ہیں چرخ گشتہ می گردند پیران جہان دیدہ بزرخاک می جویند ایا م جوانی را

۱۳۔ فرخزادی کی طرف یہ شعر منسوب ہیں، خدا کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔

در درگورم ہزار جا دام نہی گوئی گشت اگر درام گام نہی

بیک ذرہ زمیں زدام تو خالی نیست گیری دکشی و عاصیم نام نہی

ہر قدم پر چال بچا کر ارشاد ہوتا ہے بچ کر چلو جب ذرہ بھر زمین جال کے گھٹنوں سے خالی نہیں تو ہمارے قدم اٹھانے کے معنی موت کے ہیں، اقدم اٹھا اور پھینے، اس اہتمام کے باوجود پھر بھی کہا جاتا ہے کہ تم ہی گناہ گار ہو۔

۱۴۔ سعدی کہتا ہے کہ امیروں کے بنگلوں پر بے وسیلہ جانا نہ صرف ناکام رہنا ہے بلکہ اپنی آبروریزی کرانا، چور کھلا کر دہانوں کے دھکے کھانا اور کتوں سے گوشت چرانا ہے۔

در میر و وزیر و سلطان را بے وسلیت مگر د سپہ را من

مگ در باں چل یافتند غریب این گریاں گرفت و آں دامن

۱۵۔ ہماری ہندوستانی زبان کی کہاوت ہے کہ "سارا جانا دیکھئے آؤما دتجے بانٹ" جب جان جاری ہو تو مال کی فکر حیات نہیں تو اور کیا ہے، یہی معاملہ کسی ہمزغندی کو پیش آیا، سعدی نے اس کا نقشہ کھینچا ہے۔

مرد کی غرقہ بود در جیوں از مرقند بود پسندارم

بانگ می کرد و زار می نالید کای درینا کلاہ و دستارم

کسی ڈوبتے ہوئے کا "میری ٹوپی سنبھالو اور میری گڑبڑی بچاؤ" کس قدر دانائی کی بات ہے۔

۱۶۔ محض کتابیں پڑھ لینے کا نام علم نہیں، کتاب کے ساتھ عقل کی بھی ضرورت سمجھ رہے روز دیکھو لگے پڑھ کر کتابیں اٹھا کر بھی گدا ہی رہتا ہے، سعدی فرماتے ہیں۔

علم چند مال کہ بیشتر خوانی چلن عمل در توفیت نادانی

نہ محقق بود نہ دانش مند چارپائی براو کتابی چند

آن تہی مضمر را چہ علم و خبر کہ براو ہیزم است یا دفتر

مہر محمد خاں شاہاب

آئینہ حیرت

اُتر کر دل میں دل پر بار کیوں ہے
دوا ہو یا دُعا، بیکار کیوں ہے
یہاں دامن شوق و آرزو میں
ہست کچھ دیکھ لینے پر بھی دل کو
علاج دردِ دل ہوتے ہوئے بھی
یہ دل میں درد، یہ آنکھوں میں آنسو
یہاں تو سانس لینا بھی ہے مشکل
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کوئی
کسی کے نام سے منسوب ہو کر
زباں بھی جب نہیں مٹتی کسی کے
خطا کوئی نہیں، لیکن خطا کا
کسی کی سرفروشی سے کسی کو
کسی کو اس قدر اس بے رخی پر
کسی کے ظہمائے ناروا کی،
چلو، جانے بھی دوا اس گفتگو کو
نہیں سُننا اگر کوئی کسی کی

بھروسہ ہے اگر اپنے پہ حیرت
تو پھر یہ منتِ اغیار کیوں ہے

عبدالمجید حیرت

ساری

(ڈائری کا ایک ورق)

بعض لوگوں کو یہ مرض ہے کہ وہ خواہ مخواہ نئی تہذیب میں کیڑے ڈالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ پرانی دنیاوی تہذیب جسے تہذیب کے نام سے موسوم کرنا بھی درمسل بد تہذیبی میں داخل ہے تہذیب جدید کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن مادہ لوجی اور خوش فہمی کا کب علاج؛ اکثر لوگ آپس بھرتے ہوئے یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ ”پرانازما دنیا ہی اچھا تھا۔ پرانے بزرگوں کا کیا کتا، وہ تو معداری اور تہذیب کے محبتے تھے۔ بیسویں صدی! توہ!!“ اے تہذیب سے کیا تعلق؛ صاحبِ زمانے سے مرقت تو بالکل اٹھ ہی گئی ہے۔ خون سفید ہو گئے ہیں۔ شرم و حیا مفقود ہے۔ دیدوں کا پانی دھل گیا ہے۔ اس طویل اور دلدور مریضے کا اختتام ہیشہ ان الفاظ پر ہوتا ہے ”دنیا روز بروز فحش و لذت میں گرتی جا رہی ہے۔ تمام انسان (زہیں چھوڑ کر) جو ہر انسانیت سے عاری واقع ہوئے ہیں اور اللہ ہی جانتا ہے، اس کا انجام کیا ہوگا“

لیکن پرانے زمانے کو ”سنہری زمانہ“ کہنے والوں نے کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ جس طرح ہر ہمتی ہوئی چیز سونا نہیں ہو سکتی اسی طرح ہر سنہری چیز بھی درمسل سنہری نہیں ہوتی۔ آخر کسی چیز کے سنہری ہونے کا معیار کیا ہے؛ یہی ناکہ ہیں اس سے زیادہ سے زیادہ فواید حاصل ہوں۔ مادی و روحانی کی بے سنی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ رُوح اور مادہ کے امتزاج ہی سے پیکر انسانی تیار کیا گیا ہے، اگر جہد بے رُوح کسی کام کی چیز نہیں تو خالی رُوح بھی کوئی قدر قیمت نہیں رکھتی۔ رُوح اور مادہ لازم و ملزوم ہیں اس لئے مادی فواید بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے روحانی۔ اب اگر یہ معیار صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو پھر پرانازما سنہری نہیں بلکہ سیاہ زمانہ کہلانے کا ستھی ہے۔ آج سے ایک صدی پہلے جو کام سینکڑوں روپے صف کرنے پر بھی نہیں نکل سکتا تھا آج کل ایک آدھ دلفریب جملہ یا دو چار دلکش الفاظ کہہ دینے سے نکل آتا ہے۔ اُن دنوں خدمت کا مصلحتاً یا جس کی ضرورت میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ آج کل ان جھیلوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ کسی نے آپ پر احسان کیا ہے یا کوئی آپ کے کسی کام آیا ہے ایک بھدہ سکر کر ”تھینک یو“ کہہ دیجئے۔ چلتے ففدہ ختم ہوا۔ اور سچ پوچھتے تو اصلی رُوحانیت یہی ہے جو مزہد بے غرض خدمت میں ہے اور جو رُوحانی سسرت تھینک یو سنے سے ہوتی ہے، روپے

پیسے کا جھگڑا اور میانیاں میں آجائے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جو ترقی حین تک یو" میں ہے وہ روپوں کی جھنگداریں کمال اور صرف ایک لفظ پر منحصر نہیں نئی تہذیب نے ہمیں کئی اور لفظ دیئے ہیں جن سے وہ کام نکل سکتے ہیں جو پہلے نہ ملنے میں نہیم دوسرے نکل سکتے تھے۔ ذخیرہ وسائل سے مثلاً "ساری" سہ ماہی کے لفظ ہی کے لیے تارخ اس افسوسناک حقیقت کی شاہد ہے کہ پڑائے زمانے میں عرب قبائل ہولی ہولی باتوں پر ایک دوسرے سے الجھ پڑتے تھے۔ دو مختلف قبیلوں کے دوسرا اپنے اپنے گھوڑے کو لے کر کسی چشمہ پر پانی پلانے گئے۔ ایک گھوڑے نے ذرا بے صبری دکھائی اور دوسرے گھوڑے کو دعوت دیئے بغیر پانی پینا شروع کر دیا۔ پس پھر کیا تھا تلواریں میاؤں سے نکل آئیں۔ نینسے فضا میں چمکنے لگے ایک سو اڑھیں ڈمیر کر دیا گیا اور اس کے زخمی گھوڑے نے واپس جا کر اس کے قبیلے کو زبان حال سے اپنے بہادر آقا کے قصاص کے لئے ابھارا۔ "دانت کے بدلے دانت" اور "آنکھ کے بدلے آنکھ" کے اصول پر ایمان رکھنے والے عرب رجز پڑھتے ہوئے گھوڑوں سے نکل کھڑے ہوتے۔ اور مورخ کہتے ہیں کہ قبائل کی اس قسم کی باہمی لڑائیاں بیسویں سال ہری ہتی تھیں۔ حالانکہ اگر وہ بہادر سوار تہذیب کی مبادیات سے بھی واقف ہوتے تو ان میں سے کوئی بھی اپنا گھوڑا آگے نہ بڑھا پاتا۔ آپ پہلے۔" نہیں صاحب آپ پہلے۔" نہیں قبیلہ میں ریگستانی کیسے کر سکتا ہوں آپ پہلے۔" اسی جھگڑے گنارنہ کیجئے آپ پہلے" کی گردان شروع ہو جاتی۔ اور اگر کوئی بدستیر گھوڑا پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر پانی میں منہ ڈال دیتا تو اس مالک فوراً "یری ساری" کہہ دیتا۔ ان دو لفظوں میں اتنا جا دو ہے کہ تلواریں میاؤں سے باہر نکلتیں نہ نیرسے فضا میں چمکنے نہ ایک سو اڑھیں لاشیں زمین پر پڑتی ہوئی نظر آتی اور نہ اس کا زخمی گھوڑا اس کے قبیلے کو قصاص پر ابھارتا بلکہ دونوں سوار اپنے اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے کے بعد اکٹھے گاؤں کو لوٹتے اور راہ میں اس مسئلہ پر بحث و جمیع کرتے جاتے کہ کیا گھوڑوں کو آداب مجلس سکھانے کے لئے کوئی مدرسہ شہینہ نہیں کھولا جاسکتا؟

لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ ہم لوگوں کی زندگی کا اصول "دور کے دھول مہانے" پر مبنی ہے۔ ہم بیسویں صدی کو کہتے ہیں اور پندرہویں صدی کو تہذیب کے موضوع کا زمانہ گردانتے ہیں۔ پندرہویں صدی کے لوگ اپنے زمانے کو تاریک زمانہ سمجھتے تھے اور ہماری طرح کتب افسوس لال کر کہا کرتے تھے کہ آسے کاش ہم تیرہویں صدی میں پیدا ہوئے ہوتے! یہ "بیچھے دیکھنی عادت" ہی ہماری قنوطیت اور یاس انجیری کا سبب ہے۔ اس کا نفسیاتی اثر یہ ہوا ہے کہ ہمیں تہذیب قد کی کوئی قربانی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ دور کیوں جائے کل تک خود ہمارا ہی حال تھا۔ ہم ہر وقت پڑانے زمانے کی شان میں قصیدے پڑھتے رہتے تھے۔ اور یہ بات ہمارے دہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ کبھی ہم بھی نئی تہذیب کی خوبول کے معترف ہوں گے۔ لیکن آج کچھ اس قسم کے واقعات پیش آئے ہیں کہ ہمیں اپنی دنیاویت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نصیرا کوئی پڑی ہے۔

صبح چار بجے کے قریب آنکھ کھل گئی۔ دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی کیونکہ ہمارے پردوس میں ایک صاحب کے جسم میں تان سین کی رُوح حلول کئے ہوئے تھی اور وہ اپنے بھتے سروں میں داد و موسیقی دے رہے تھے۔ غائب کی ایک ادھ غزل ذبح "کرنے کے بعد وہ مطمئن" ہو جاتے تو خیر ایک بات بھی تھی مگر وہ تو آج یہ تمینہ کئے بیٹھے تھے کہ معتقدین و متاخرین میں سے کوئی بھی بچ کر نہ جانے پائے۔

میرا دماغ تعزیراتِ ہند کے اس نقص پر کھول رہا تھا کہ اس میں تین بجے رات کو اٹھ اٹھ کر گانے والے کیریلے فٹوٹ منقہ "کے لئے جس دوامِ لعبور دریائے شور کی سزائیوں پر جو نہیں کی گئی۔ آج کل فوج والوں کا دماغ ضرورت سے زیادہ آوارہ گرد واقع ہوا ہے۔ سلسلہ خیال کیس سے کیس جا پہنچا گھڑی نے پانچ بجائے تو ہم یہ سوچ رہے تھے کہ آخر ایم۔ اے پاس کوئے کا فائدہ ہی کیسا ہے؟ اس کی بجائے دس گول کی ایک آپ ڈوڈیٹ اور فشن ایل ڈکان کیوں نہ کھول لی جائے۔ بلا سے گاہک آئیں یا نہ آئیں خود پتھر کر س گئے کھانے کا موقع ملے گا۔ اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ انگریزی تہذیب کے دلدادہ لوگ اسے "ٹاک" کہتے ہیں۔ ہم نے کہا "تشریف لائیے"۔ دروازہ کھلا۔ ایک صاحب اندر داخل ہوئے لیکن ہمیں دیکھتے ہی کچھ گھبرا س گئے۔ اسی اضطراب میں ان کے منہ سے نکلا "اوہ ساری" اور پچھلے پاؤں لوٹ گئے۔ میں اس ساری کی شانِ نزول نہ سمجھ سکا۔ میں نے آواز دی "اجی صاحب ٹھہریے تو۔۔۔ بات تو سننے جائیے"۔ بچا سے اندر آئے لیکن بدستور گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے کہا "تشریف رکھیے۔ آخر آپ اس قدر گھبرا کیوں گئے؟"

کہنے لگے "میں سمجھا اختر صاحب اس کمرہ میں رہتے ہیں۔ میں نے آپ کو نایق تکلیف دی۔ میں بہت سادی ہوں میں نے کہا "آپ خواہ مخواہ" بہت ساری ہو رہے ہیں۔ مجھے تو قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اور آپ کے آنے سے پہلے جو تکلیفیں اٹھا چکا ہوں اس کے مقابلے میں ہر تکلیف میں راحت ہے۔ یہ تو نہائیے کہ ان صاحب کا جو ہر وقت گاتے رہتے ہیں کوئی علاج کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟"

ہمارے نئے دوست بھی تان سین صاحب سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے انہیں خوب ہی سلوائیں سنائیں اور اس طرح دل کی بھڑاس نکال لی۔

دس بجے کالج پہنچا تھا۔ خال صاحب نو بجے ہی آدھکے "اے میاں تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟ سستی کی گھی کوئی حد ہوئی چاہئے؟"

میں نے کہا "خال صاحب ابھی تو نو بجے ہیں۔ پانچ منٹ میں کالج پہنچ سکتے ہیں۔ آپ ابھی سے گھبرا گئے؟"

ارشاد ہوا "چند منٹ پہلے چلے جاؤ گے تو کوئی قیامت آجائے گی۔ اب اٹھو گے یا مجھے کان چپکڑکڑاٹھانا پڑے گا" ناچار ہم نے کپڑے بدلے۔ سائیکل لی اور خان صاحب کے ساتھ کالج کو چل پڑے۔

پچھلے ہفتے ہمارے ایک دوست نے ہمیں یہ طعنہ دیا تھا کہ ہماری قوتِ شاہدہ بہت کمزور ہے۔ وجہ یہ کہ ہم انہیں نہیں بنا سکے تھے کہ جو پڑی کے سامنے چارہ بھی بکنا ہے یا نہیں؛ ہم نے لاکھ کہا کہ چارے کی فروخت کو ہم سے کیا تعلق۔ لیکن وہ یہی فرمائے جاتے تھے کہ انسان آنکھیں کھول کر چلے تو ہر چیز خود بخود نظر آجاتی ہے۔ ہم نے سوچا چلو آج "آنکھیں کھول کر چلیں۔ پھر کبھی کوئی بات پوچھ بیٹھے تو جواب دے سکیں گے۔"

چوراہے پر رُہتے ہی دائیں ہاتھ ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی ہیں۔ سامنے ایک کمپنی کا دفتر ہے۔ اس سے آگے لڑکیوں کا ایک کالج ہے۔ بائیں ہاتھ پھر کواؤ کرنے والی ایک نوٹو کھڑی تھی۔ خان صاحب بولے "یہ تم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو؟ ذرا تیز چلاؤ سائیکل کو" میں نے کہا "خان صاحب ہم "آبزرویشن" *Observation* کر رہے ہیں، سنا آپ نے؟" شاہدہ ہورہا ہے شاہدہ!"

خان صاحب کہنے لگے "اے حق کبھی اس طرح بھی شاہدہ ہوا ہے؟ ہمارے ساتھ کسی دن کالج سے بھاگو پھرتاؤ گے تمہیں "آبزرویشن" کیسے ہوا کرتی ہے؟"

میں نے کہا "خان صاحب وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو یہ یاد رکھیے کہ ہمارے دائیں ہاتھ کینارڈ کالج ہے اور بائیں ہاتھ یونیورسٹی گراؤنڈ میں وہ ننگ دھڑنگ لالہ جی جنوں نے چھرا بچ لنگوٹی سے ستر ڈھانکنے کی ناکام کوشش کی ہے، غالباً "سن ہاتھ" فرما رہے ہیں۔"

"اے میاں ادھر دیکھو اس کتے کی ذہنیت کتنی بھرا مانہ واقع ہوئی ہے؟"

بات یہ تھی کہ سیو پیٹی نے ایک جگہ یہ نوٹس لگا رکھا تھا۔

"اس جگہ میٹاب کرنا منع ہے۔ خلاف ورزی کرنے والا حوالہ پولیس کیا جائے گا۔"

میں اس نوٹس پر ایک کتا اپنے مخصوص انداز میں ایک ٹانگ اٹھائے "شاخین" کی گردان کر رہا تھا۔ ہمارے خان صاحب کے لئے یہ منظر کچھ ایسا جاذبِ توجہ تھا کہ سائیکل روک دیں کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے۔

"دیکھو یہ کتا کتنا دلیر ہے؟"

"ہاں صاحب ویزوٹن میں قانون شکنی کر رہا ہے؟"

"اس کا سبب بھی سمجھو؟"

”آپ ہی سمجھا دیجئے“

”تم تنازع کے قابل ہو یا نہیں؟“

”اس کا یہاں کیا تعلق؟“

”یہی تو بات ہے۔ اس کتے نے پھیلے جنم میں بول نافرمانی کی تھی اور دفعہ ہم اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتار

ہوا تھا، اب یہ دفعہ ہم کو توڑ رہا ہے۔“

یہ کہہ کر خان صاحب نے میرے سرگرنے کا انتظار رکھے بغیر خود بخود ایک فلک شگاف قبضہ لگا دیا۔ میں سائیکل روکے بایاں پاؤں زمین پر ٹکائے کھڑا تھا۔ خان صاحب کا ایک ہاتھ اپنے سائیکل کے ہینڈل پر تھا دوسرا میرے کندھے پر یکایک ایک نہایت کرحش ”ساری“ کی آواز اس حالت میں سنائی دی کہ میں حالت سجدہ میں زمین پر پڑا تھا۔ مجھ پر سراسر نکل تھا اس کے بعد خان صاحب کا سائیکل اور سب سے آخر میں خان صاحب کا نمبر تھا دو سائیکل اور ان پر دو من کی ایک لاش میرا تو کچھ مری ٹک گیا۔ میں نے کپڑے بھاڑتے ہوئے کہا:-

”خان صاحب اگر آپ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکتے تھے تو قبضہ لگانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“

”کیا کہتے ہو؟“

”حضور میں نے یہ عرض کی کہ آپ اپنے ارد گرد دیکھ کر ہنسنا کیجئے کہ کوئی غریب آپ کے قریب ہی تو کھڑا نہیں؟“

”ہم نے ایک دفعہ ”ساری“ کہہ دیا۔ تم اس پر بھی مذاق کرتا ہے۔ اگر تم قتل کرنے کے بعد بھی ”ساری“ کہہ دیتا تو معاملہ

ختم ہو جاتا۔“

سبحان اللہ! کیا خوب منطق ہے۔ آخر پٹھان ہی نکلے۔ ابھی تک اچھی خاصی اردو بول رہے تھے۔ اب ”ہم“ اور ”کہہ دینا“ پر اتر آئے۔ اگر میں کچھ اور کہتا تو شاید کہیں سے چھپر بھی نکال لیتے۔

قصہ مختصر ہمارا شاہد ختم ہوا اور ہم نے سائیکل کو ”ہنگاماً“ شروع کیا۔ کالج کے دروازہ میں داخل ہوئے تھے کہ پھر ایک میس ”ساری“ کی آواز کانوں میں پڑی اور ساتھ ہی ایک سردار صاحب کا سائیکل اس زور سے ہمارے سائیکل کے ساتھ ٹکرایا کہ ہم تو ہم خان صاحب بھی جو ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھے چلے آئے تھے زمین پر جا رہے۔ میں تو چکا چڑا کیونکہ مجھے ابھی ابھی یہ سبق دیا گیا تھا کہ ”ساری“ کہہ دیا جائے تو قتل بھی معاف ہو جاتا ہے، اس لئے میں نے احتجاج کرنا مناسب سمجھا لیکن خان صاحب اس سبق کو جو چند منٹ پہلے مجھے دے چکے تھے بھول گئے اور انہوں نے زمین سے اٹھ کر بغیر کسی تمہید کے سردار صاحب کے ایک دنگا دیں۔ انہوں نے بھی جوابی حملہ کرنا چاہا لیکن جب یہ دیکھا کہ بڑے مقابل چوٹ لبا اور تین

فٹ چڑا ہوا ہے تو آپ نے خیریت اسی میں سمجھی کہ عدم تشدد کے سُہری اصول سے کام لیا جائے۔ اور کہنے لگے "خان صاحب میں نے دیکھا ہی نہیں۔ بانی گاڈ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔"

ادھر خان صاحب گرج رہے تھے "اگر تم جان بوجھ کر ایسا کرتا تو ہم تم کو زندہ دکھا جاتا؛ بیوقوف کو بڑیک بانٹنا بھی نہیں آتا اور کمین سائیکل سوار بنا بیٹھا ہے۔ گدھا کہیں کا؟"

میں نے کہا "ارے یار جھوٹو بھی، اس نے تو پہلے ہی ساری" کہہ دیا تھا، تم نے شاید سنا ہی نہیں؟

"چپ رہو جی۔ تم نیچ میں مست بولو؟"

خیر دوسرے لوگوں نے ہیج بجاؤ کر دیا، ورنہ خان صاحب کی نیت نیک نظر نہیں آتی تھی۔

کالج سے چھٹی ہوئی تو ہم نے خان صاحب سے کہا "آج آپ مجھے تو معاف کیجئے۔ اکیسویں واپس چلے جائے۔ مجھے دو بجے ایک دوست کے ہاں جانا ہے۔ نہایت ضروری کام ہے۔"

اُن سے اجازت لے کر اپنے دوست کے ہاں پہنچے۔ ملاقات کا وقت پہلے سے مقرر ہو چکا تھا، اس لئے خیال متاک وہ میرا انتظار فرما رہے ہونگے لیکن گھنٹی بجنے پر ان کے نوکرنے کھڑکی میں سے گردن نکالی اور کہنے لگا "صاحب ابھی باہر گئے ہیں، وہ کہہ گئے تھے کہ آپ دوبارہ پانچ بجے تشریف لائے" غصہ تو آیا لیکن بہت کم۔ میں نے سوچا کوئی ضروری کام پڑ گیا ہوگا ورنہ اتنا ہڈب درو ضد کار آدمی یہ حرکت کیسے کر سکتا ہے کہ کسی کو دو بجے آنے کو کہے اور خود پونے دو بجے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ خیر صاحب دوستی بُری بلا ہے۔ پانچ بجے ہم پھر پہنچے۔ لیکن "صاحب" ندارد۔ نوکرنے کا "صاحب آئے تھے۔ کہتے تھے آپ کو واپس نہ جانے دینا، بہت ضروری کام ہے، میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔ ہم نے جی میں کہا۔ "واقعی کوئی بہت ضروری کام معلوم ہوتا ہے، انتظار کرنا چاہئے"۔ میز پر تازہ اخبار پڑا تھا۔ اگرچہ ہم صبح اخبار پڑھ کر گئے تھے، لیکن اب کسی طرح وقت تو کاٹنا تھا ہم نے دوبارہ سارا اخبار پڑھ ڈالا۔ ایک ایک شمار کا ایک ایک نظر نہایت غور سے دیکھا لیکن "صاحب" کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ ناچار اٹھ کر دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں دیکھنی شروع کر دیں۔ یہ وہی تصویریں تھیں جنہیں میں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا لیکن اب میں نے نو نوکر افراد کے نام پڑھنے شروع کر دیے۔ پونے چھ بج چکے تھے لیکن ہمارے دوست کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ہم نے کہا "ہند رہ منٹ اور انتظار کرنے کے بعد چلے جائیں گے، لیکن چھ بج گئے اور وہ ابھی تک غائب ہیں۔" چلو پانچ منٹ اور یہی اب تو آتے ہی ہوں گے۔" چھ بج کر پانچ منٹ۔ سو اچھا، چھ بج کر میں منٹ، چھ بجیں۔" صاحب "تو غائب تھے ہی اب۔ نوکر بھی مفقود ہے۔" میں سخت غصہ آ رہا تھا۔ ساٹھ بجے

ہم مایوس ہو کر واپس چلے آئے۔ راستہ بھر اپنے دوست کی غیر مقبولیت پر غصہ آتا رہا۔ یہ حرکت اس شخص سے سرزد ہونی تھی جو بڑا
مہذب، بڑا انشائیہ اور بڑا خوش اخلاق ہے۔ ہم نے سوچا اب اگر یہ شخص ہوا رہا بلاتے تب بھی نہ جاؤں گا لیکن کم محنت دوستی کا
کیا کیا جائے پھر خود بخود یہ ترمیم کر دی کہ اگر جاننا ہی پڑا تو ایک سال بعد جاؤں گا۔ نہیں ایک سال زیادہ ہے چھ ماہ
ٹھیک رہیں گے۔ گھر پہنچ کر یہ چھ ماہ بھی گھٹنے گھٹنے ایک ماہ رہ گئے تھے۔

میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ نوکر نے کہا ”کوئی صاحب آپ کو ٹیلیفون پر بلا رہے ہیں“

میں نے پوچھا ”کوئی نام بھی بتایا یا نہیں؟“

”جی نہیں۔ آپ خود ہی جا کر بات کر لیجئے۔“

ٹیلیفون پر پہنچے ”کوئی صاحب“ غالباً سو گئے تھے کیونکہ دس بار ”ہیلو“ کہنے کے بعد ایک بار دیک ”سی ہیلو“ سنائی دی۔

میں نے کہا ”کون صاحب ہیں؟“

”میں ہوں۔“

ہمارے ڈبی دوست تھے۔

”کیئے پھر مکان پر حاضر ہونے کا حکم ہے؟“

”اچھا تو تم پانچ بجے بھی آئے تھے۔ تمہیں بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔“

”جی آ یا تو تھا۔ تکلیف ہوئی یا نہیں یہ آپ خود ہی سمجھ لیجئے۔“

”ساری۔“

میں نے دُور بند کر دیا۔ میں قتل معاف کر سکتا ہوں لیکن اتنی بڑی بدتمیزی محض ایک ”ساری“ پر معاف نہیں کی

جاسکتی!

حمید نظامی

کیلاش کنول

تراجم از پیام مشرق ————— حسب عبارت علامہ اقبالؒ

(۴۰) ————— (ترجمہ)

<p>کنشت و مسجد و بُت خانہ و دیر جز این مُشتِ گلے پیدا نہ کردی ز حکمِ غیر نتوالِ جُز بدلِ رست تو اے غافلِ دلے پیدا نہ کردی</p>	<p>مٹھ، مسجد، گرجے اور مندر بس یہی خاک کے ڈھیر بنائے دل ہی چھڑ پٹائے تو یہ سب پھوٹے دل ترا غافلِ بھٹتا جائے</p>
---	---

۴۱ ————— ترجمہ

<p>نہ پیوستم درین بستانِ سرا دل ز بندِ این و آن آزادہ رفتم چو بادِ صبحِ گر دیدم دمے چند گُلانِ را آبِ و رنگِ دادہ رفتم</p>	<p>دل نہ لگاؤں اس اُلوں سے دُور رکھوں یہ، وہ سب من سے بھیے ہوا، میں آؤں سویرے رنگِ دل بھولوں میں جاؤں خمیرے</p>
--	---

۴۲ ————— ترجمہ

<p>بخود باز آورد رندرِ کُن را منے برنا کہ من در جامِ کرم س مے چوں مغانِ دورِ پیشین ز چشمِ مستِ ساقی وامِ کرم</p>	<p>یہ نئی مَدِ رَا میرے من کی ہوش میں منِ موجی کو لائے ست گرین سے ریشیوں کی کھائی پریم کا رِس ہم بھی پی آئے</p>
--	---

(۴۳)

(ترجمہ)

سفالم را مئے او جام جم کرد
درون قطرہ ام پوشیدہ یکم کرد
خرد اندر سرم بتخانہ ریخت
خلیل عشق دیرم را سرم کرد

پریم نے اُس کے سنوارا جیون
اُمِرت سے بھر پور کیا مَن
گیان نے موہ کا دَپَن ڈھالا
پریم نے توڑ دیا یہ دَپَن

(۶۰)

(ترجمہ)

میا را بزم بر سارِ حل کہ آبخا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و بامو حبش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

کر نہ سجاساگر کے کناے
ہیں مدھم وٹاں جیون کے سر
پھاند پڑا اور بھر جالہروں سے
یہی ابرٹ جیون کا ہے گڑ

(۷۶)

(ترجمہ)

ہپائے خود مزمن زنجیر تقدیر
تہ ایں گنبد گرداں رہے بہت
اگر باور نداری خیز و دریاب
کہ چوں پاوا کئی جولاں گے بہت

ڈال نہ پیر میں بھاگ کی بیڑی
کھلی ہے راہ آکاش کے پنجے
چل تو سہی میدان پڑا ہے
کوئی نہ رو کے آگے پیچھے

گداگر

کھاتے ہیں اور خود ہی کھاتے ہیں اور کچھ عالی مرتبت اپنی مکملی سے ہم جیسے محتاجوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ اور کچھ ہم جیسے نادار دوسروں پر بوجھ بنے رہتے ہیں۔ اور ہر ایک کو کام بھی تو نہیں دیتا بابو جی۔

نوجوان۔ یہ بہانے ہی تم لوگوں کا۔ کام کرنے سے جی چڑاتے ہو، مانگنے کا چکا ہو گیا ہے تمہیں! کافی تمہاری ہڈیوں میں بچ گئی ہے۔ تم سے جبراً کام لینا چاہئے یہی تمہارا علاج ہے۔

گداگر۔ ٹھیک فرمایا آپ نے بابو جی۔ واقعی یہ کام تو آپ خوب کر سکتے ہیں۔ اختیار والے جو ہونے قیستوں کے بنانے والے۔ باقی آپ ہیں روٹی کھاتے ہیں نہ کام کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ہم بد بخت اگر عسک نہ لائیں گے تو چوری کریں گے ڈاکا ڈالیں گے۔ کمزور فرب سے کام لیں گے اس خراس فونش کو تو بھرنا ہو گا کسی نہ کسی طرح بابو جی!

نوجوان کا ہاتھ خود بخود جیب کی طرف بڑھتا ہے اور وہ چند پیسے نکال کر گداگر کے ہاتھ پر رکھ کر کہتا ہے آگے بڑھنا ہے۔ اُس کے بُشرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس نے اس معاملہ پر اس دن بنگاہ سے کبھی غور نہ کیا تھا اور یہ کہ اُس کا موجودہ طریقہ اس بیماری کا شافی علاج نہیں ہو سکتا۔

گداگر (پھر صبر لگاتا ہے) کچھ راہ خدا ہے جا۔ جائے بھلا ہو گا!

محمد حسین غازی

ایک گداگر بازار کے ایک بخنڈ پر کھڑا صدا لگا رہا ہے کچھ راہ خدا ہے جا۔ جائے بھلا ہو گا! اتنے میں مغربی لباس پہنے ایک نوجوان نہایت کمزور کے ساتھ پاس سے گزرتا ہے۔

گداگر۔ (لپک کر) بابا کچھ بھوکے فقیر کو بھی نوجوان (جھپٹتے ہوئے) صحت کرو اس وقت گداگر۔ کل سے بھوکا ہوں بابو جی! کھانا کھلا دیجئے۔ دُعاؤں کا نوجوان۔ سب یہی کہتے ہیں بھوکا ہوں کل سے کچھ نہیں کھایا! تم لوگوں کا یہی دَیرہ ہے۔

گداگر۔ دَیرہ نہیں بابو جی۔ حقیقت ہے، اکثر بھوکے ہی ہوتے ہیں ہم مغرب۔

نوجوان۔ تو کچھ کام کرو گداگر۔ بھیک جو مانگتے ہیں نوجوان۔ ہاتھ پھیلاتے شرم نہیں آتی تمہیں۔

گداگر۔ اور کچھ کام بھی تو نہیں آتا ہمیں نوجوان۔ کچھ سیکھو تو آئے گداگر۔ سکھائے کون؟

نوجوان۔ بد بختوں کا سارا جاتا ہے! سکھائے کون! (پھر نامحاذ انداز میں) دیکھو میاں دوسروں پر بھجھ ڈالنا اچھا نہیں۔ ہماری طرح لگا کر کھاؤ۔

گداگر۔ اس سنسار کا یہی طریقہ چلا آیا ہے بابو جی! کچھ لوگ

نعت

حامد بھائی !

اسلام علیکم ! چند نعتیں لکھی ہیں جو مغرب کتابی ضرورت میں شائع ہو رہی ہیں۔ ایک نعت ہمایوں کے لئے بیچ رہا ہوں جو گزشتہ میلا لکھی
کی تقریب پبلک سیکول ہرٹسڈ کے شاعر میں پڑھی گئی تھی۔ امید ہے میری اس کوشش کو آپ پسند فرمائیں گے۔
نیاز کش قیس

اے قیس ! انبیاء میں ہے شانِ مصطفیٰ قرآن میں خدا ہے ثنا خوانِ مصطفیٰ
اللہ سے یہ توبہ عرفانِ مصطفیٰ قرآن پاک مطلع دیوانِ مصطفیٰ
دونوں جہاں کی اُس کو میتز ہیں نعمتیں جو خوانِ مصطفیٰ پہ ہے مہمانِ مصطفیٰ
محتاج ہی نہیں ہیں کسی خضرِ راہ کا جب تک ہے میرے ہاتھ میں دامنِ مصطفیٰ
محشر کے روز اُمتِ عالمی کی مغفرت ارمانِ مصطفیٰ ہے یہ ارمانِ مصطفیٰ
سائل ہیں اُس کے در پہ زمانے کے بادشا جس کو ملا ہے رتبہ دربانِ مصطفیٰ
کاٹینگے جس قدر اسے اعدائے خیر و ہر پھولے پھلے گا اور گلستانِ مصطفیٰ
سچ یہ ہے سوا میر و گل وہ اک امیر ہے پائی ہے جس نے دولتِ ایمانِ مصطفیٰ

پڑھتا ہوں جب میں نعت تو کہتے ہیں اہل دل

اے قیس ! تُو ہے کلیلِ ہستانِ مصطفیٰ
امر چند قیس امرتسری

اوراقِ پارینہ

انگریزی زبان اور مسلمان

ہندوستان میں پہلے پہل انگریزی زبان کی تعلیم کا رواج ہوا تو بعض دقیانوسی علماءوں نے اس کی سخت مخالفت کی جس کی وجہ سے مسلمان زبان تیرگام سے بہت پیچھے رہ گئے۔ سر سید احمد خاں نے اس غلط نظریے کا ازالہ جس تندہی اور خلوص کے ساتھ کیا اس کا کچھ تحصیل حاصل ہے۔

قارئین! ہماری کی دلچسپی کے لئے "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" مؤرخہ ۱۷ نومبر ۱۸۸۸ء سے دو فارسی قطعے ذیل میں نقل کرتا ہوں جن میں ایک بزرگ مولوی صفدر حسین صاحب نے تفسیر کے رنگ میں مسلمانوں کی "انگریزی دشمنی" کا رد کیا دیا ہے۔ ان قطعات سے جہاں انگریزی زبان کی طرف سے مسلمانوں کی بریگنگی کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس زمانے میں رنگینہ زلف زندگی کے ہر شجر پر عادی تھا یہاں تک کہ پیرائے طنز میں ہندو نصائح کے لئے بھی اسی کا دامن پکڑا جاتا تھا۔ (ح - ۵)

(۱۲)
ہو گنگو نوبل کندی من بولتے او
دارم نظر جست و خون جگر بخورم
نہ خمد او زبانم نہ من زبان او
بج گنگو نوبل کندی من بولتے او
حصہ نظم ہوشیار پوری

(۱۱)
از زبان دانی زبان کیا
غیر از دہم زبان خداست
ترجمہ از غیر و این قیامت ہیں
کہ جہاں غیر تر جہاں خداست

"علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ"
۱۷ نومبر ۱۸۸۸ء

جوانی

زہے جنت رنگ بارِ جوانی	زہے گلشن پر ہزارِ جوانی
فداے جوانی، نثارِ جوانی	زہے قسمت کا مگارِ جوانی
ہر اک چیز پر ہے جوانی کا عالم	ہر اک شے میں ہے دستانِ کا عالم
فداے جوانی، نثارِ جوانی	خزاں میں بھی ہے کلفشانی کا عالم
ہر اک رخ پہ پڑنے لگی ہیں نگاہیں	ہر اک دل میں گرنے لگی ہیں نگاہیں
فداے جوانی، نثارِ جوانی	حسینوں سے لڑنے لگی ہیں نگاہیں
بیاباں بھی مثل چمن کلفشاں ہو	غم و رنج میں بھی خوشی کا سماں ہو
فداے جوانی، نثارِ جوانی	زمین بھی حوالا آسمان بھی حوالا ہو
طرب ہی طرب دل سے بیکر جگر تک	خوشی ہی خوشی شب بے لیکر سحر تک
فداے جوانی، نثارِ جوانی	فقط حُسن ہی حُسن حدِ نظر تک
جدھر دیکھے بیخودی چھا رہی ہے	نظر ہر طرف کیفیت برسا رہی ہے
فداے جوانی، نثارِ جوانی	فضا وجد میں ہے، ہوا گارِ ہی ہے
وہ دُکھ اداؤں کا ہر دل میں گزنا	وہ پیہم حسینوں کی نظروں کا پڑنا
فداے جوانی، نثارِ جوانی	وہ ضد اور وہ ہٹ و مچلنا وہ اڑنا
بلا خوف جنسِ جوانی کٹنا	نڈر دولتِ شادمانی کٹنا

